تلخیصِ مقالہ

مولانا حامد حسن قادری

سوانحِ حیات اور ادبی کارنامے

(تحقیقی و تنقیدی مقالہ)

برائے

پی ایچ ڈی۔ اُردو جامعۂ سندھ

۱۳۹۸ھ — ۱۹۷۸ء

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی

(ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

پروفیسر شعبۂ اُردو جامعۂ سندھ

مقالہ نگار

سیّد نُور مُحمّد سمّر سُہروردی

مُتعلّم پی ایچ ڈی۔ شعبۂ اُردو جامعۂ سندھ

مولانا حامد حسن قادری

(سوانح حیات اور ادبی کارنامے)

مولانا حامد حسن قادری اس صدی کے ممتاز اہل علم اور ارباب قلم میں سے ہیں آپ نے ساری عمر تعلیم و تعلم میں صرف کی ۔ علم و ادب کا ذوق آپ کو ورثے میں ملا تھا۔ لہذا اوائل عمر سے ہی آپ کی نظمیں اور مضامین اردو کے علمی و ادبی رسائل میں شائع ہونے لگے ۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کا نام بحیثیت محقق و نقاد تمام ملک میں مشہور ہوگیا۔

مولانا نے اپنے تنقیدی شعور و تجربے کے سہارے اردو ادب کی بڑی خدمت کی انہیں نہ صرف تحقیق و تدقیق سے دلی مناسبت تھی بلکہ ایک متبحر عالم ہونے کی حیثیت سے نقد و نظر میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتابیں اردو ادب میں بڑی وقعت و اہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ قدیم مکتب فکر اور قدیم طرز تنقید کے دبستاں سے متعلق ہیں لیکن انہیں جدید تحریکوں اور ادبی ترقیوں سے بھی لگاؤ رہا ہے ۔ ترقی پسند ادب کی تحریک ہو ، نظم و نثر میں مختلف اسالیب و جدتیں ہوں یا جدید تحریکیں اور رجحانات ان کو اس لیے ناپسند نہ تھیں کہ وہ قدیم روش کے خلاف تھیں۔ وہ ان پر بھی گہری تنقیدی نظر ڈالتے اور ان کے معائب کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے محاسن کو بھی ضرور سراہتے ۔ ان کی تنقید کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ وہ ہمیشہ علمی اصولوں پر مبنی ہوتی تھی اور اس میں ذاتیات کے شائبے کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔

مولانا قادری ۲۵ مارچ ، ۱۸۸۷ء میں بچھرایوں ، ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ اسٹیٹ ہائی اسکول رام پور سے ۱۹۰۹ء میں میٹرک کرنے کے بعد مدرسۂ عالیہ رام پور سے عربی و فارسی کی تحصیل کی ۔ ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل اور

۱۹۱۱ء میں اردو فاضل کے امتحانات نمایاں حیثیت سے پاس کیے ۔

قادری صاحب کے پردادا حضرت شیخ مقبول عالم صاحب کا سلسلہ نسب اٹھارہ پشتوں کے واسطے سے شیخ الشیوخ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے ۔ ان کے بڑے بوڑھے مولوی محمود عالم صاحب جو حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی کے خلیفہ اور سرشتہ دار تھے ۔ اپنے علم و فضل کی وجہ سے پھلواری کے مشہور علما و اکابر میں شمار کیے جاتے تھے ۔ ان کے سرسید احمد خاں اور مرزا غالب سے بڑے گہرے اور مخلصانہ مراسم تھے۔

مولانا قادری کا گھرانا ایک علمی و مذہبی گھرانا تھا جہاں عام طور پر شعر و سخن علم و ادب اور مذہب و ملت کا چرچا رہتا تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں جب خاندان کے سب لوگ پھلواری میں جمع ہوتے تو علمی و ادبی معرکے چھڑ جاتے ، مشاعرے و مباحثے منعقد ہوتے ، زود گوئی و بدیہہ گوئی کی محفلیں جمتیں ، طرح طرح کے الفاظ و محاورات ضرب الامثال و تلمیحات موضوع بحث بنتیں اور ان کی تشریحات و توضیحات ہوتیں ۔ قادری صاحب اور ان کا گھرانا ان علمی و ادبی بحثوں میں سب سے پیش پیش ہوتا۔

مولانا قادری بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لہذا شاعری و انشا پردازی کا شوق ہوا۔ ان کا پہلا مضمون ۱۹۰۲ء میں " انتخاب لا جواب" لاہور میں شائع ہوا۔ پھر " زمانہ " کان پور، " مخزن " لاہور اور " علی گڑھ منتھلی" وغیرہ میں بھی مضامین شائع ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے تین چھوٹی چھوٹی کتابیں " گل دستہ اخلاق"، " رفیق تنہائی" اور " حسنین " شائع کیں جس سے انھیں ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل ہوگئی ۔

تعلیم و تعلم سے دلی مناسبت کے سبب مولانا نے درس و تدریس کے مقدس پیشے کو

اپنایا ستمبر ۱۹۱۰ء میں ان کا تقرر بحیثیت معلم اردو و فارسی ریزیڈنسی ھائی اسکول اندور میں ہوگیا۔ اس کے بعد وہ زردشتی ھائی اسکول مہو، اسلامیہ ھائی اسکول اٹاوہ ، حلیم مسلم ھائی اسکول کانپور اور ۱۹۲۷ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں صدر شعبہ اردو و فارسی کے عہدے پر فائز ہوئے اور ملازمت سے سبکدوش ہونے تک اسی کالج سے وابستہ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی آگئے -

ادب اور تنقید لازم و ملزوم اور زندگی کی ناطق اقدار ہیں۔ ادب اگر ادیب کے احساسات و جذبات کا آئینہ دار ہے تو تنقید اس کے شعور و وجدان کی عکاس - تنقید مادی ارتقا اور ادبی شعور کو زیر بحث لاکر حقائق کو منکشف کرتی اور منطقی استدلال و قیاسات کو عملی زندگی پر منطبق کرتی ہے - اس لیے جہاں سے ادب کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے وہیں سے تنقید بھی وجود پاتی ہے -

مولانا کی تنقیدیں تنقیحی تنقیدیں ہیں جو غور و فکر کی دعوت دے کر ادبیات کو اک نئے انداز سے دیکھنے و پرکھنے کی طرف مائل کرتی ہیں۔ مولانا تنقید کے محور و مرکز سے بخوبی واقف ہیں - یہی سبب ہے کہ وہ خود بھی شعر و ادب اور نقد و تنقید کے قواعد و ضوابط پر سختی سے عمل پیرا رہتے اور اس کے مباحث و مسائل پر خصوصیت سے زور دیتے ہیں وہ صرف تنقید ہی نہیں کرتے بلکہ ادیب و شاعر کی ذات میں پختگی عقل و شعور اور بلندی فکر و نظر کے متلاشی بھی رہتے ہیں - وہ مصنّف کی خوبیوں کو سراہتے اس کے بیان کو پیش کرتے اور پھر اس پر تنقید کرتے ہیں۔ اگر کہیں انہیں مصنف سے اختلاف ہے تو وہ صرف اس کے نقائص و اختلاف کو بیان کر کے ہی ختم نہیں کردیتے بلکہ اپنے اعتراض اور موقف کی تائید میں دلائل و براہین بھی پیش کرتے ہیں۔ تنقید میں ہمیشہ ان کا مقصد یہی رہا ہے کہ ہمارے ادیب و شاعر قدروں کے نباض اور زندگی کے معمار ہوں، وہ ہم کو مغربی اقدار

و خیالات سے نجات دلاکر مشرقی فضا میں رہتے ہوئے بالیدگی و سربلندی کا درس دیں اور اگر مغرب کے توسل سے بھی کوئی مفید بات ہم تک پہنچتی ہے تو وہ اس کو بھی اپنا نے کے حق میں ہیں۔

مولانا کی تنقید میں ہمیں ماضی اور مستقبل دونوں کے صالح اور صحت مند عناصر مربوط نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنی فکر و نظر پر اعتماد اور اپنے اصول و اساس تنقید پر بھروسہ ہے اسی لیے ان کی رائے میں پختگی و اصابت ، ان کے خیالات میں گیرائی و گہرائی نظر میں وسعت و بلندی اور لب و لہجے میں ہم آہنگی و صداقت ہے ۔

ادب و تنقید کی طرح تحقیق و تنقید بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں ۔ تحقیق و تفحص کے بغیر تنقید کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور یہ ناقص رہ جاتی ہے ۔ مولانا قادری کا شمار بھی گذشتہ نصف صدی کے ماہر محققین و مورخین ادب کے زمرے میں ہے ۔ اپنے تحقیقی کارناموں میں سے جس کارنامے کی بدولت انھوں نے شہرت و مقبولیت حاصل کی وہ ان کی شہرۂ آفاق کتاب " داستان تاریخ اردو" ہے ۔ اردو نثر کی ترویج و اشاعت میں فورٹ ولیم کالج کی کوششیں لائق ستائش ہیں مگر " داستان تاریخ اردو" سے قبل یہ تاثر عام تھا کہ یہ تمام اقدامات اور کوششیں صرف کالج اور ارباب اقتدار ہی کی جانب سے ہوئیں۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج کے دور سے عہد سرسید تک ایک خلاء محسوس ہوتا تھا۔ جسے بعض اصحاب نے عہد تاریک کا بھی نام دیا ہے ۔ وجہ یہ تھی کہ کسی نے تحقیق کرکے ان مصنفین کے حالات بہم نہ پہنچائے جو فورٹ ولیم کالج سے غیر متعلق ہوکر ذاتی وانفرادی طور پر آزادانہ اردو کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولانا نے تحقیق کرکے ایسے مصنفین کا پتا لگایا اور پہلی بار " داستان تاریخ اردو" میں ایک پورا باب " مصنفین بیرون کالج " کا قائم کیا اور اس میں تفصیل سے ان مصنفین کا ذکر کیا جنھوں نے اس عہد میں بھی

علم و ادب کی شمعیں روشن کیں۔

بحیثیت مترجم بھی مولانا نے اردو کی نمایاں خدمت انجام دی ہے ۔ انھوں نے عربی و فارسی اور انگریزی کی بعض کتابوں و مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا ہے ۔ اور اگر وہ خود ہی آغاز میں یہ نہ بتادیں کہ یہ فلاں مصنف کی تصنیف کا ترجمہ ہے تو اس کو ترجمہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اس میں ایسی سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت ہے کہ خود مولانا ہی اس کے مصنف معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے بہت سی نظمیں اور افسانوں کے ترجمے بھی اسی انداز سے کیے ہیں کہ گویا یہ سب ان ہی کی تخلیقات ہیں۔

شاعری میں مولانا کو منشی امیر احمد مینائی کے شاگرد رشید منشی امتیاز احمد خاں راز رام پوری سے فیض تلمذ حاصل تھا۔ مولانا نے شاعری کی ابتدا غزل سے ہی کی مگر اس میں اس قدر جانی پہچانی آوازیں تھیں کہ ایک کو دوسری سے ممیز و ممتاز قرار دینا مشکل تھا لہذا انھوں نے غزل گوئی سے کنارہ کشی کرکے ایسے بہت سے قطعات کہے جو زندگی کے رموز و حقائق کے ترجمان ہیں۔ ان کی رباعیات بھی ان کے حکیمانہ و فلسفیانہ نظریات اور جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ اگر وہ نظم کے میدان میں اسی طرح تگ و دو جاری رکھتے تو شائد نثر کی خدمت نہ کر پاتے بہ ایں ہمہ انھوں نے متصوفانہ و عارفانہ رباعیات کہہ کر جو اخلاقی درس دیا اور فارسی کے دو عظیم شاعروں سلطان ابوسعید ابوالخیر اور عمر خیام کی رباعیات کے سلیس و سادہ زبان میں منظوم ترجمہ کرکے اردو رباعی کو جو فروغ دیا ہے اس کے سبب ان کا مرتبہ اردو شاعری میں بحیثیت رباعی گو شاعر ہمیشہ بلند رہے گا۔

فن تاریخ گوئی ایک ادبی امانت ہونے کے علاوہ ہماری انفرادی و اجتماعی اور سیاسی و سماجی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کا آئینہ دار ہے مولانا کو تاریخ گوئی سے بڑا شغف تھا وہ اس کو محنت محبت (Labour of love) کہا کرتے تھے ان کے ڈیڑھ ہزار تاریخی

مادین کو دیکھ کر اس فن میں ان کی مہارت تامہ اور قدرت و کمال فن کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے ۔

خطوط نویسی میں مولانا قادری اگرچہ مرزا غالب کی طرح مراسلت کو مکالمت تو نہ بناسکے مگر ان کے خطوط علمی و ادبی ، تحقیقی و تدقیقی اور فنی و تنقیدی شعور سے معمور ہیں۔ یہ خطوط خوش طبعی و بذلہ سنجی، بے تکلفی و برجستگی اور خلوص و محبت سے مملو ہونے کے علاوہ طنز و اسلوب کی شوخیوں و رعنائیوں اور ادبی موشگافیوں سے بھی پر ہیں۔

مولانا نے بچوں میں تحصیل علم و ادب کا شوق پیدا کرنے اور ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے بھی بڑا کام کیا ہے اس مقصد کے تحت انھوں نے بچوں کے لیے ایک پندرہ روزہ اخبار" سعید" جاری کیا اور ان کو علم و ادب کا شوق دلانے کے لیے قصے اور مضامین لکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی اور خود بھی مختلف موضوعات پر بچوں کے لیے پندرہ کتابیں لکھ کر شائع کرائیں۔

مولانا کی تحریروں میں سلاست و روانی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے ان کی تحریر کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ خواہ وہ تاریخ ادب لکھ رہے ہوں ، نثر نگار پر تبصرہ ہو یا شعر و شاعری پر تنقید ہرجگہ ان کی تحریر میں شگفتگی و دل کشی موجود ہے ۔ مولانا کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا اعتدال اور شائستہ و لطیف انداز ہے ، اسی میں ان کی مکمل شخصیت جھلکتی ہے ۔ ان کی تحریریں ٹھوس اور پر مغز ہوتی ہیں اپنے علم و فضل کی نمائش اور کمال و فن کے اظہار کے لیے وہ ثقیل و دقیق الفاظ استعمال کرنے میں پرہیز کرتے ہیں اور مغربی تحریکات اور مغربی مفکرین کے اقوال و افکار کا ذکر کرنے میں محتاط ہیں لیکن ان کے توسل سے بھی اگر کوئی ایسا عنصر و جزو مل جاتا ہے جو مشرقی انداز فکر اور مشرقی ادبیات سے مطابقت رکھتا ہے یا اس میدان میں مفید و کارگر ثابت ہوسکتا ہے تو اس کو وہ ضرور اپنا لیتے ہیں۔ ان کی تحریریں اگرچہ مشرقی انداز میں ہیں لیکن حقیقتاً وعملاً وہ اپنے دور کی وقیع تحریکات و رجحانات سے خالی نہیں ۔

٭٭٭٭٭

In the Name of Allah
The Most Gracious
The Most Merciful
Whose Help We Solicit

۷۸۶
۹۲

مولانا حامد حسن قادری

سوانحِ حیات اور ادبی کارنامے

(تحقیقی و تنقیدی مقالہ)

برائے

پی ایچ ڈی - اُردو جامعۂ سندھ

۱۳۹۸ھ
۱۹۷۸ء

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سیّد سخی احمد ہاشمی

(ایم-اے- پی- ایچ- ڈی)

پروفیسر شعبۂ اُردو جامعۂ سندھ

مقالہ نگار

سیّد نُور محمّد سرُور

مُتعلّم پی ایچ ڈی - شعبۂ اُردو جامعۂ سندھ

مقالہ ٹائپ کرانے میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے - لیکن
پھر بھی کہیں کہیں اغلاط رہ گئی ہیں جن کی تصحیح تنگئ
وقت کی بنا پر نہ ہوسکی، اس کے لیے میں اساتذۂ کرام سے بصد
ادب معافی کا خواست گار ہوں -

احقر

(سید شیر محمد سرور)

فہرست مندرجات مقالہ

نمبرشمار	تفصیل عنوانات	صفحات

دسواں - باب

بسم الرحمن الرحیم

دیباچہ

مولانا حامد حسن قادری اس صدی کے ممتاز اہل علم اور ارباب قلم میں سے ہیں باوجود قدیم مکتب فکر سے تعلق رکھنے کے ان کو جدید تحریکوں سے بھی لگاؤ رہا ہے ۔ ترقی پسند ادب کی تحریک ہو یا نظم و نثر میں مختلف اسالیب اور تجربات یا جدید تحریکیں اور رجحانات ۔ وہ ان سب تحریکوں سے بخوبی باخبر تھے اور بے تعصبّی کے ساتھ ہر تحریک اور ہر رجحان پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کے محاسن و معائب سے بحث کرتے اور خوبیوں و خامیوں کی بے تکلف نشان دھی کردیا کرتے تھے ۔ ان کا یہ ھی معاملہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ تھا ۔ ان کی تنقید ہمیشہ علمی اصولوں پر مبنی ہوتی تھی اور اس میں ذاتیات کا کبھی کوئی دخل نہیں ہوتا تھا ۔

مولانا نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دے کر اردو کے فروغ و بقا کے لیے کام کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذھنی و فکری کاوشوں کا مطالعہ کرکے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ مقالہ پیش کیا جارہا ہے ۔ مقالہ کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

پہلے باب میں مولانا کے سوانحی حالات ، تعلیم ، ملازمت ، اخلاق و عادات ، زندگی کی مختلف منازل اور ادبی زندگی کے آغاز کا ذکر ہے ۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ مقالے کا یہ حصہ جتنا جامع اور مدلل ہونا چاہئے تھا نہ ہوسکا وجہ یہ ہے کہ مولانا قادری کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں کا ذکر تاریخوں اور تذکروں میں نظر نہیں آتا اور اگر کہیں ہے بھی تو نہایت مختصر اور سرسری طور پر ۔ ان کی یہ سوانح حیات ان کے سلسلے میں اشتہارات و رسائل میں شائع ہونے والے ان تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات

کی مدد سے مرتب کی گئی ہے جو ان کے صاحب زادگان جناب ساجد حسن قادری ، جناب ڈاکٹر خالد حسن قادری ، جناب ماجد حسن فریدی و جناب راشد حسن قادری نے مرحمت فرمائے - کچھ مولانا کے شاگردان گرامی جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، جناب جمیل زبیری اور جناب پروفیسر کرار حسین صاحب کے توسل سے میرے علم میں آئے -

دوسرا باب مولانا قادری کے اسلاف اور بچھرایونی تہذیب و تمدن سے متعلق ہے - اس میں وہاں کی سماجی زندگی اور اخلاقی و مذہبی اقدار و تصورات کا نقشہ پیش کیا گیا ہے - اس کے لیے میں جناب ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تصنیف " مشاہیر بچھرایوں " سے استفادہ کرنے کا موقع مرحمت فرمایا -

تیسرا باب قادری صاحب کی تنقید سے متعلق ہے جس میں مولانا کے تنقیدی اصول و نظریات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے - مولانا کی تنقید میں ماضی و مستقبل دونوں کے صالح اور صحت مند عناصر ملے جلے نظر آتے ہیں جن کو واضح کرنے کے لیے ان کی تنقیدوں اور مباحثوں سے جا بجا امثال پیش کی گئی ہیں -

چوتھے باب میں مولانا قادری کے سب سے بڑے کارنامے اور ثبت دوام پانے والے نقش " داستان تاریخ اردو " پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے اور اردو ادب میں ان کا درجہ بحیثیت مورخ و محقق متعین کیا گیا ہے -

پانچویں باب میں مولانا کی تراجم نگاری سے بحث کی گئی ہے - اس باب میں انگریزی سے ترجمہ کردہ تنقیدی مقالات ، منظومات اور ڈراموں کے علاوہ جدید ایرانی افسانوں کے تراجم بھی شامل ہیں -

چھٹے باب میں مولانا کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے اور مولانا کی حمد و نعت نظم و غزل اور قطعات و رباعیات کا جائزہ لیا گیا ہے -

ساتویں باب میں فن تاریخ گوئی کی ابتدا و ارتقا کا ذکر اس کی اہمیت و افادیت اور مولانا قادری کی فن تاریخ گوئی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے -

آٹھواں باب مولانا قادری کی مکتوب نگاری پر مشتمل ہے - اس میں مکاتیبی ادب کی ابتدا و ارتقا ، اس کی اہمیت و افادیت اور مولانا قادری کی مکتوب نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے -

نویں باب میں بچّوں کے ادب کی تخلیق و ترویج کے سلسلے میں مولانا کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مولانا نے حصول علم کے لیے بچوں میں کس طرح تحریک و شوق پیدا کی اور خود بھی ان کی فطرت و جبلت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے ایسا ہی ادب تخلیق کیا جو ان کو مرغوب تھا۔ ساتھ ہی بچوں کے لیے مولانا کے پیغام اور بچوں پر اس کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے -

دسواں باب مقالے کا اختتامیہ باب ہے - اس میں مولانا قادری کی نثر نگاری پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے اور اردو ادب میں ان کی اہمیت و حیثیت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

بہر کیف ہر باب اور اس کی تفصیلات میں کسی نہ کسی افادی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے - اس مقالے کی تحریر کا محّرک ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ مولانا قادری جیسے عظیم ادیب و محقق اور بے لوث و بے باک نقاد پر اب تک کوئی جامع مقالہ نہیں لکھا گیا ہے ممکن ہے کہ اس ہیچ مداں کے مقالے میں اہل علم و ادب کو کچھ کام کی باتیں مل جائیں ورنہ " من آنم کہ من دانم " -

مجھے اپنی علمی بے بضاعتی و فرومائیگی کا احساس ہے - بے عیب خدا کی ذات ہے - اس میں یقیناً کچھ خامیاں و کوتاہیاں ہوں گی جن کی نشان دہی میرے لیے باعث مسرت اور موجب احسان ہوگی - اگر اس میں کچھ خوبیاں ہوں تو ان کو میرے مشفق اساتذۂ

کرام کا شکران حقیر تصور فرمایا جائے ۔

اس مقالے کی ابتدا استاذی جناب محترم پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ العالی کی رہنمائی میں ہوئی ۔ آپ کے بیرون وسٹی سے سبک دوش ہوجانے پر استاذی جناب محترم پروفیسر ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی صاحب سابق صدر شعبۂ اردو کی رہنمائی میں یہ سلسلہ آگے بڑھا ۔ موصوف نے قدم قدم پر نہ صرف یہ کہ میری حوصلہ افزائی و رہنمائی بلکہ اپنی چند در چند مصروفیات اور یونی ورسٹی کے کاموں میں انہماک کے باوجود میرے مقالے کو بغور ملاحظہ فرمایا اس کا ایک ایک لفظ پڑھا ، ہدایات دیں اور جا بجا اصلاح فرمائی ۔ موصوف کی شفقتوں اور عنایتوں کے لیے میں سراپا سپاس ہوں۔

اس کام میں جن بزرگوں اور استادوں نے میری رہبری فرمائی ان کا بھی میں تہہ دل سے ممنون و متشکر ہوں۔ جناب محترم مولانا حامد حسن قادری صاحب کے صاحب زادگان جناب ساجد حسن قادری، جناب ڈاکٹر خالد حسن قادری، جناب ماجد حسن فریدی و جناب راشد حسن قادری میرے دیرینہ محسنین میں سے ہیں انھوں نے اپنے والد بزرگ وار کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے مولانا کی کئی نایاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب اور قلمی تحریریں مرحمت فرمائیں جن کے لیے میں ان حضرات کا بے حد شکر گذار ہوں۔

کتابیات کی ترتیب و تدوین کے لیے میں سید امان علی صاحب نقوی کا ممنون ہوں جنھوں نے بڑی محنت سے اس کی ترتیب میں مدد دی ۔

سید نور محمد سرور

پہلا باب

سوانح ، سیرت اور شخصیت

پہلا باب

سوانح ، سیرت اور شخصیت

کسی انسان کو ڈھالنے اور اس کو ایک مخصوص طرز فکر و نظر بخشنے میں اس کی سیرت و شخصیت کو کافی دخل حاصل ہے کیوں کہ اس کے کردار اور شخصیت کی سحر انگیزی سے ہی اس کی زبان و بیان میں ایک انفرادی خصوصیت پیدا ہوا کرتی ہے ۔ یہ بات مسلّم ہے کہ سیرت و شخصیت مختلف اثرات کا مرکب ہے ۔ اس میں موروثی خصوصیات ، گھریلو ماحول ، خاندانی اثرات ، مذہبی و معاشرتی روایات اور اس دور کے سیاسی و سماجی نظریات سب کی ہی جھلک نظر آتی ہے ۔ مگر بعض اوقات انسان کو شخصیت کو نکھارنے کے لیے موروثی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے سماجی و معاشرتی حالات سے بھی برسرپیکار رہنا پڑتا ہے ۔

عموماً لوگ اپنے حسب و نسب پر فخر کرتے ہوئے آبا و اجداد کے علم و فضل اور روشن کارناموں کو اپنے ضعت کمال کی سپر بناتے ہیں۔ مولانا قادری اگرچہ ایک ایسے ممتاز خاندان کے فرد تھے جو اپنے حسب و نسب اور علم و فضل کے اعتبار سے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مگرانھوں نے کبھی اپنے حسب و نسب یا علم و فضل پر فخر نہیں کیا۔

ان کے اسلاف و خاندان کے متعلق مولانا شمس الحق نظامی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں :

" قادری صاحب کے جدّ امجد شیخ احمد اول (معروف بہ فرخ شاہ کابلی) تھے جن کے عہد تک سلطنت بلخ و کابل حضرت ابراہیم بن ادھم کی اولاد میں رہی اس کے بعد غزنہ کے بادشاہ وقت نے ان کے ممالک کو فتح کرلیا۔ شیخ احمد ثانی شہزادۂ کابل نے ٥١٩ھ مطابق ١١٠٠ع میں چنگیز خان سے جنگ کی اور شہید ہوئے ۔ ان کے صاحب زادے خواجہ شیخ شعیب اپنے خانوادے کے ساتھ پنجاب چلے آئے ۔ کچھ دن لاہور اور ملتان میں قیام کرکے پاک پٹن شریف جس کا پرانا نام اجودھن ہے وہاں مقیم ہوئے ۔ خواجہ صاحب کو سلطان کی طرف سے

"ملک العلماء" کا خطاب عطا کیا گیا اور ان کا نکاح سلطان محمود غزنوی کی ہمشیرہ سے ہوا۔

شیخ کمال الدین (والد ماجد حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ) کی صاحب زادی کا نکاح سادات میں سیّد عبداللہ سے ہوا ان ہی کے بطن مبارک سے صاحب زادہ مخدوم علی احمد صابر کلیری ہیں۔ یہی وہ مقدّس ہستیاں ہیں جن کے فیوض و برکات اور انوار و تجلّیات سے برصغیر ہند و پاک کا گوشہ گوشہ منوّر و معطّر ہے ۔

شیخ کمال الدین کی زوجہ بنت مولانا وجیہہ الدین حضرت عبّاس عمّ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہیں۔ اسی خاندان کے ایک نامور بزرگ اور قادری صاحب کے مورث اعلا حضرت بندگی میاں شیخ ڈھڈّہ ، ضلع مرادآباد میں تشریف لائے ۔ جہاں سے ان کے دبیرۂ بلند مرتبت حضرت شیخ مقبول عالم رحمتہ اللہ علیہ قصبۂ بچھرایوں (ضلع مرادآباد) میں آکرآباد ہوئے ۔ قادری صاحب قبلہ انہی کی نسل سے ہیں۔" (۱)

بچھرایوں ، ضلع مرادآباد (یوپی) یوں تو بظاہر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر بڑا مردم خیز خطّہ واقع ہوا ہے ۔ یہاں بڑے بڑے لائق لوگ ، علماء و فضلا اور دین دار بزرگ پیدا ہوئے ۔ جنھوں نے اپنی کوشش و کاوش اور جولانئ طبع سے میدان علم و ادب اور شعر و سخن میں نئی نئی راہیں استوار کیں۔

انسائی کلو پیڈیا آف برٹانیکا جلد ۱۵ میں مراد آباد کے سلسلے میں تحریر ہے :

"Moradabad:-

A city and district located in the Rohilkhand division of Utter Pardesh, India. The city headquarters of the district and 93 miles E.N.E. of Dehli,

---

(۱) شمس الحق نظامی، مولانا، " حامد حسن قادری"، (روزنامہ) " جنگ"، کراچی : ۵ جون، ۱۹۶۵ع ، ص ....

is built on a ridge that lies on the right bank of the Ramganga river. Population is (1961) 180,100, comprising that of the municipal area and the railway settlement.

Moradabad was founded in 1625 and named after Murad Baksh, son of the Mogul Emperor Shah Jahan, by his governor, Rustum Khan, who built the fort that overhangs the river bank, and the fine Jama Masjid or Principal Mosque (1631). There are four colleges affiliated to Agra University.

The city is known for the manufacture of metalware, especially ornamental brassware, which is coated with lac or tin and engraved, and cutlery. There is an electroplating plant; cotton weaving and printing are the principal cottage industries. The town lies on the main line of the Northern Railway.

Moradabad District forms the west central portion of Rohilkhand division. Area 2,289 sq.miles population (1961) 1,973,530. It is bounded on the east by Rampur district and west by the Ganges (Ganga). The Ramganga river crosses it on the east, cutting off a submountain section of the district towards the northeast. To the east of the Ganges lies the low "khadar" (new alluvium) land gradually rising towards the central plain area drained by the Sot river. Farther east the land drops gently towards the Ramganga. It is primarily an agricultural district, the chief crops being wheat, rice, millet, pulses and sugarcane. Moradabad has a greater number of Muslim (more then one third of the total population) than any other district in the state.

Besides Moradabad, the main towns are Sambhal to the Southwest, Amroha to the West and Chandausi to the South."(1)

---

(1) Encyclopaedia of Britannica, Inc. Volume 15 Printed in the U.S.A. published by William Benton.

بچھرایوں ہی کے صاحبان علم و فضل میں سے ایک پیشرو عالم مولوی محمد علی صاحب تحصیلدار کی ادبی خدمات کا تذکرہ خود مولانا حامد حسن قادری نے اپنی مشہور تالیف " داستان تاریخ اردو" میں بھی کیا ہے -

مولوی صاحب موصوف ایک جیّد مناظر و مقرّر تھے اور ہندوستان میں ہندوؤں کی مشہور مذہبی جماعت " آریہ سماج " سے متعدد بار مناظرے بھی کرچکے تھے - اس سلسلے میں انھوں نے کئی کتابیں بھی تحریر کی تھیں جن میں :" ردّ الشقاق فی جواز الاسترقاق"، " ظفرمبین" ، " سوط اللہ الجبّار" اور " البرہان" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

مولوی محمد علی صاحب تحصیلدار کے سلسلے میں مولانا قادری " داستان تاریخ اردو" میں لکھتے ہیں :

" سرسید کی مذہبی تحریروں نے علمائے ہند کو نہایت مضطرب کردیا تھا۔ ہر طرف سے ان کی مخالفت میں کتابیں اور اخبار و رسائل شائع ہو رہے تھے - حدّ اعتدال کو قائم رکھنا عالم و جاہل دونوں کے لیے دشوار ہوتا ہے - چناں چہ جوش مخالفت میں سرسید پر کفر کے فتوے لگادیئے گئے پھر جب ۱۸۸۰ء سے سرسید نے تفسیر قرآن کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو مخالفت اور بڑھ گئی - ان مخالفوں میں ایک زبردست مخالف مولوی محمد علی صاحب بھی تھے انھوں نے سرسید کے ایک ایک نکتے ، فقرے اور ایک ایک بات کا جواب لکھنا شروع کردیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحوں کی کئی جلدیں تصنیف کیں۔ یہ " مجلدات البرہان" کے نام سے مشہور ہیں۔ پورا نام یہ ہے " البرہان علی تجہیل من قال بغیر علم فی القرآن" اب نہ سرسید کی تفسیر کوئی پڑھتا ہے اور نہ اس کا رد دیکھنے کی کسی کو ضرورت ہے - لیکن اس قسم کا لٹریچر بھی انیسویں صدی کی عجیب و غریب پیداوار ہے -

مولوی محمد علی صاحب بڑے عالم و باخبر بزرگ تھے - اس زمانےمیں ایک طرف عیسائی اسلام پر حملے کر رہے تھے - دوسری طرف سرسید اور مولوی چراغ علی نے عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں اسلام کے بعض مسلم قوانین و اصول

کی توجیہہ اور رائے زنی شروع کردی ایسے معرکۂ آراء میں مطابق حدیث شریف " اختلاف اُمّتی رحمۃ" (میری امت کا اختلاف رائے و اجتہاد بھی رحمت ہے) کبھی ایک فریق حق پر ہوتا ہے کبھی دوسرا بہرحال مولوی محمد علی صاحب نے عیسائیوں اور (بقول خود) غیرمقلدوں دونوں کے جواب لکھے - ۱۸۷۳ء میں کان پور سے ایک رسالہ " نورالآفاق" اسی مذہبی مناظرے اور مناقشے کے لیے جاری ہوا تھا اس میں مولوی صاحب نے بھی مضامین لکھے -" (۱)

مولوی سیّد حامد علی صاحب جن کو قادری صاحب اور ان کے خاندانے سے بڑی گہری عقیدت و محبت ہے اور جو ایاّم طفلی سے ایام ضعیفی تک قادری صاحب کے دوش بدوش رہے ہیں قادری صاحب اور ان کے گھرانے کے متعلق بیان کرتے ہیں :

" قادری صاحب کا گھرانا ایک علمی و مذہبی گھرانہ تھا جہاں عام طور پر شعر و سخن علم و ادب اور مذہب و ملت کا چرچا رہتا تھا ان کے والد مولوی احمد حسن صاحب ایک ممتاز وکیل، ایک جیّد عالم، ایک متبحر محدثؒ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکمال شاعر اور منفرد تاریخ گو بھی تھے - عربی و فارسی دونوں زبانوں پر ان کو پورا پورا عبور حاصل تھا۔ قادری صاحب کے چچا مولوی محمد محسن فاروقی اسلامیہ کالج پشاور میں شعبۂ عربی کے صدر تھے اس کے علاوہ ان کے دیگر اعزّہ مثلاً مولوی نورالرحمن صاحب ، مولوی قیام الدین صاحب ، مولوی عبدالحفیظ صاحب ، مولوی محمود علی صاحب ، مولوی ظہور عالم چشتی (وکیل) ، مولوی فریدعالم چشتی (سیشن جج) ، مولوی محمد حسن صوفی ، مولوی حامد علی صاحب ، وغیرہ وغیرہ - جب موسم گرما کی تعطیلات گذارنے بھرایوں میں جمع ہوتے تو علمی و ادبی معرکے چھڑ جاتے - مشاعرے و مناظرے منعقد ہوتے - طرحی مصرعوں پر غزلیں لکھی جاتیں، تاریخیں کہی جاتیں ، زودگوئی و بدیہہ گوئی کی محفلیں گرم ہوتیں ، طرح طرح کے الفاظ و محاورات ، ضرب الامثال و تلمیحات موضوع بحث بنتیں اور ان کی تشریحات و توضیحات ہوتیں ، قادری صاحب اور ان کا گھرانہ ان علمی و ادبی بحثوں میں سب سے پیش پیش ہوتا۔"

---

(۱) حامد حسین قادری، " داستان تاریخ اردو"، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، ایجوکیشنل پریس، (تیسرا ایڈیشن) ص ۳۹۳

اسی طرح راشد حسن قادری ان کے اسلاف کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

" قادری صاحب کے پر دادا حضرت شیخ مقبول عالم صاحب کا سلسلۂ نسب اٹھارہ پشتوں کے واسطے سے شیخ الشیوخ حضرت بابا شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے ۔ ان کے بڑے پوتے مولوی محمود عالم صاحب جو حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی کے خلیفہ اور سرشتہ دار تھے اپنے علم و فضل کی وجہ سے بچھرایوں کے مشہور علماء و اکابرین میں شمار کئے جاتے تھے ان کے سرسید احمد خاں اور مرزا غالب سے بڑی گہری اور مخلصانہ مراسم تھے ۔" (۱)

یہ حقیقت ہے کہ جب غدر کا ہنگامہ ہوا تو اس وقت سرسید بجنور میں تعینات تھے کہا جاتا ہے کہ اس وقت وہاں کے عوام نے سرسید سے کہا کہ اس وقت اگر آپ ہماری رہنمائی کریں تو ہم انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے اور آپ کو بجنور کا نواب بنالیں گے مگر سرسید تو پہلے ہی سرکاری ملازم تھے اور اس حقیقت کو بخوبی سمجھ گئے تھے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں قدم ایسی مضبوطی سے جمالیے ہیں کہ اب ان سے نپٹنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ چناں چہ وہ اس بات پر آمادہ نہ ہوئے جس کے باعث بجنور کے بہت سے لوگ ان کے خلاف ہوگئے اور ساتھ ہی یہ بھی خوف دامن گیر ہوا کہ سرسید ایک اعلا سرکاری افسر ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ ہم سے انتقام لیں اس لیے مناسب ہے کہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی ان کاکام تمام کردیا جائے ۔ ادھر سرسید نے بھی اپنے تدبر اور فہم و فراست سے بدلے ہوئے حالات کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بچھرایوں بجنور سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے ۔ مزید برآں مولوی محمود عالم صاحب سے ان کے اچھے خاصے مراسم بھی تھے لہذا وہ خفیہ طور پر کچھ عرصے کے لیے مولوی محمود عالم صاحب

---

(۱) راشد حسن قادری ، " مولانا حامد حسن قادری " ، (روز نامہ) " جنگ " ، کراچی : ۲۳ جولائی ، ۱۹۶۶ ء ، ص : ۳

کے یہاں آکر مقیم ہوگئے ۔

اس واقع کا ذکر خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب " حیات جاوید" میں صفحہ ۵۱ پر کیا ہے اور حیات جاوید ہی کے حوالے سے راشد قادری نے روزنامہ " جنگ " کراچی کی ۲۳ جولائی، ۱۹۶۶ع کی اشاعت میں اپنے مضمون؂ اس حوالے کو یوں نقل کیا ہے :

" سرسید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بچھتو سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں مگر موقع نہ ملتا تھا۔ میر صادق علی نے خود ساتھ ہوکر ان کو موضع مجولہ تک پہنچا دیا وہاں سے سرسید نے بچھرایوں پہنچ کر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان پر جو ان کے دوست تھے قیام کیا۔" (۱)

قادری صاحب کی ولادت اور نام رکھے جانے کا واقعہ بھی عجیب ہے جس کو راشد قادری صاحب نے یوں لکھا ہے :

" انہی مولوی محمود عالم کے بیٹے مولوی محمد علیم تھے جن کی اولاد میں پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں ۔ ان کے دوسرے بیٹے جن کا نام مولوی احمد حسن تھا ان کے یہاں جب پہلا بچہ لڑکا ہوا تو اس کا نام حامد حسن رکھا گیا مگر قضائے الٰہی سے وہ بچپن میں ہی فوت ہوگیا۔ دوسری بار پھر لڑکا پیدا ہوا اور اس بار اس کا نام بھی پھر وہی حامدحسن رکھا گیا مگر کچھ عرصے کے بعد وہ بھی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ ۲۵ مارچ، ۱۸۸۷ع ، جمعہ کے دن ان کے یہاں پھر ایک فرزند پیدا ہوا اور اس کا نام بھی انھوں نے پھر وہی حامدحسن تجویز کیا اور یہی رکھا ۔ اس زمانے کے طور و طریق اور توہمات و عقائد کے پیش نظر یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے ورنہ رسم و رواج اور عقائد و روایات کے لحاظ سے تو یہ نام سرے سے ہی خاندان کے کسی بھی بچّے کے لیے کبھی تجویز ہی نہ کیا جانا چاہئے تھا لیکن کیا کیا جائے کہ مولوی احمد حسن صاحب کو اس

---

(۱) راشد حسن قادری،" مولانا حامد حسن قادری"، محولہ بالا، ص۲ ...

نام کے علاوہ کوئی نام پسند ہی نہ تھا اللہ تعالیٰ کو بھی شاید ان کی یہی بات پسند آگئی اور اس نے اس تیسرے حامد حسن کو زندگی عطا فرمائی -" (۱)

بعد میں یہی حامد حسن آسمان علم و ادب پر آفتاب بن کر چمکے اور مولانا حامد حسن قادری کے نام سے مشہور ہوئے -

قادری صاحب نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی اور جس ماحول میں پرورش پائی وہاں علم و ادب ، شعر و سخن اور دین و مذہب کا چرچا تھا لہذا قادری صاحب کو بھی یہ تمام چیزیں ورثے میں ملیں ان کے والد مولوی احمد حسن خود ایک صاحب دیوان شاعر تھے - ان کا فارسی دیوان " گل زار ارم" (مخطوطہ) مولانا قادری کے کتب خانے میں موجود ہے- علاوہ ازیں مولوی احمد حسن صاحب میں ایک یہ بھی خوبی تھی کہ وہ کسی کی فرمایش کو عموماً ٹالا نہیں کرتے تھے اکثر احباب ان سے نظمیں کہنے کی فرمائش کرتے اور وہ کہہ کہہ کر دے دیا کرتے تھے اور لوگ انھیں اپنے ناموں سے شائع کراکے خوش ہوا کرتے تھے اس سلسلے میں ایک واقعہ مولانا قادری نے خود نقل کیا ہے کہ:" مولوی سلطان احمد صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ ۱۸۸۸ء کو جب مرادآباد میں نمائش ہوئی تو چاند پور کے رئیس منشی محمد شکور صاحب نے والد سے قصیدے کی فرمائش کی والد نے قصیدہ کہا اور منشی محمد شکور ہی کے نام سے شائع کرادیا-" (۲)

اسی طرح ۱۹۰۳ء میں " نظم رنگین" کے عنوان سے موصوف نے ایک نظم خود مولانا

---

(۱) راشد حسن قادری،" مولانا حامد حسن قادری"، محولہ بالا ، ص ....

(۲) یہ قصیدہ راشد حسن قادری کے کتب خانے میں موجود ہے اور مولانا قادری کی مندرجۂ بالا عبارت حاشیہ پر تحریر ہے - (مقالہ نگار)

حامد حسن قادری کی تعلیم کے لیے کہی اور قادری صاحب کی طبیعت علمی مشاغل کی طرف مبذول کرانے کے لیے انھی کے نام سے " نظم رنگین یعنی قصۂ قاضی جون پور" کے عنوان سے شائع کرادی اس سلسلے میں خود قادری صاحب نے تحریر کیا ہے :

" نظم رنگین کہ والد ماجد راقم حضرت مولوی احمد حسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ برائے تعلیم خاکسار حامد حسن قادری نظم فرمودند و خاکسار از غایت شوق طفلانہ می جانب خود طبع گردانید و اسم تاریخی " نظم رنگین " موسوم کرد -" (۱)

۱۹۱۲ء سے مولوی سلطان احمد صاحب اور مولانا قادری نے مولوی احمد حسن صاحب کے قلمی مسودات سے ان کا دیوان مرتب کرنا شروع کیا اور اس کی مکمل تجلید و تزئین کا کام ۳۱ دسمبر، ۱۹۲۸ء کو مولانا قادری کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا -

یہ دیوان " گل زار ارم" کے نام سے موسوم ہے اور سرورق کے بعد پہلے صفحے پر مولانا قادری نے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے پہلے اپنی ہی ایک رباعی لکھی ہے جس کے آخری مصرعے سے مادۂ تاریخ ۱۹۱۳ء نکلتا ہے - رباعی یہ ہے :

جمع نظم والد مغفور کی

سعئی و شعری ازاں شائع مکی

مصرع سعدی ست حامد سال و فال

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

۱۹۱۳ء

(۲۸۰)

قادری صاحب کے والد ماجد مولوی احمد حسن صاحب کا یہ قلمی کلیات دو سو اسی

---

(۱) حامد حسن قادری، " نظم رنگین، یعنی قصۂ قاضی جون پور"، رام پور (بھارت) : س ن ، ذیلی تحریر از قلم حامد حسن قادری برسرورق -

صفحات پر مشتمل ہے - اس کی تمام منظومات فارسی میں ہیں۔ اول عربی خطبۂ جمعہ کا منظوم ترجمہ نہایت فصیح و بلیغ فارسی میں کہا ہے بعدہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں متعدد نعتیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں کئی منقبتیں ہیں جن میں بیشتر آیات قرآنی نظم کی گئی ہیں۔ اس کے بعد واقعات کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی منقبت ، اکثر اولیائے کرام کی منقبتیں ، احباب کی مدحت اور تاریخی قطعات ہیں۔

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ذیل میں دو نعتوں سے اخذ شدہ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

اے جان جہان آفرینش	دیدار تو جہان آفرینش
روشن شدہ نور مطلق تو	کا قبل زمان آفرینش
علم تو محیط عالم کُش	ذات تو بیان آفرینش
عشق تو غذائے جان عالم	نام تو زبان آفرینش
جز قلب تو هیچ دل نہ برداشت	این بار گران آفرینش
در قبضۂ قدرتت محاط است	هر سود و زیان آفرینش
برحال خراب من نظر کن	اے شاہ شہان آفرینش

===xxx====

صبح من می گرید از درد بلا افزائے من
شام من می لرزد از آہ جگر فرسائے من
از زمین تا چرخ گردد غرقۂ دریائے خون
گر بجوش آید سرشک چشم طوفان زائے من
مرحبا اے عشق فرہادت شوم خوش آمدی
کردیم آزادہ از دنیا و هم عقبائے من
درخم صہبائے من از بسکہ آتش ریختند
شعلہ می ریزد بجائے بادہ از مینائے من

آرزو دارم کہ حرفے سرکنم از نعت پاک   تا نشاط تازہ گیرد جان درد آلائے من

حق گذار مدح اوکس نیست جز یزدان پاک

رائے من این شد و شد روح الامین ہم رائے من

ہر دو عالم از فروغ روئے پاکش روشن است

بنگر از مراۃ امروزم رخ فردائے من

بسکہ سودم جبہہ را بر آستانش در خیال   رونق خورشید عالم تاب شد سیمائے من

●●●

تعلیم و ابتدائی ادبی سرگرمیاں :

بچپن میں حامد حسن قادری کی صحت اکثر خراب رہا کرتی تھی اور وہ عموماً علیل رہا کرتے تھے اس لیے بچپن میں ان کا منحنی سا جسم دیکھتے ہوئے ان پر تعلیم کا بوجھ ڈالنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی اس زمانے میں ان کے والد مولوی احمد حسن رام پور میں وکالت کیا کرتے تھے ان کا مکان محلہ کھنڈ سال کہنہ میں منشی امیر احمد مینائی کے مکان سے کچھ فاصلے پر تھا۔

جب نومبر ، ۱۸۹۹ع کو امیر مینائی کے مکان میں آگ لگی تو اس آگ کے سلسلے میں منشی امیر مینائی نے سہارن پور (یوپی) کے ایک رئیس زاہد حسین کو لکھا تھا :

" میں ایسی کاہشوں میں رہا ہوں کہ میری کوتاہ قلمی طول کے قابل ہے عرض سے رنجوری و معذوری تو ایک طرف نومبر کے مہینے میں آگ نے زنانے سے مشتعل ہوکر مردانے تک دوپہر میں تمام اسباب راحت و سامان معاشرت جلاکر خاک کردیا قلمی اور مطبوعہ کتابیں بھی بہت سی جل گئیں بڑا حصہ میرے غیر مطبوعہ کلام کا بھی نذر آتش ہوا۔" (۱)

اسی واقعہ کی نسبت مولانا قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں ایک جگہ لکھا ہے :

" بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ع درج ہے اگر ایسا ہے

---

(۱)   ثاقب اکبر آبادی ، پروفیسر احسن اللہ خاں ، " مکتوبات امیر مینائی " بحوالہ حامد حسن قادری ، " تاریخ داستان اردو " ، محولہ بالا ، ص ۲۱۲

تو ممکن ہے کہ وہ آگ پہلے لگی ہو - ۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے
میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلّے میں ان کے مکانات کے قریب ہی رہتا
تھا میرا لڑکپن کا زمانہ تھا آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے
میرا مکان فاصلے پر تھا پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اڑ اڑ کر میرے گھر آتے
تھے اس حادثے سے ہم سب پر عجیب سی ہیبت چھائی ہوئی تھی - امیر صاحب
اور جلیل صاحب کا دیکھنا مجھے اچھی طرح یاد ہے - بعض تقریبیں بھی
جن میں شریک ہوا یاد ہیں-" (۱)

ماحول سے متاثر ہونا ایک نفسیاتی بات ہے ان کا گھرانہ علمی و ادبی ذوق کی وجہ سے ایک اچھا خاصا " بیت الحکمت" تھا جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے - لہذا شاعری و انشا پردازی کا شوق ہوا اور دونوں میں طبع آزمائی کرنے لگے اور اس طرح ان کے مضامین و منظومات کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۰۲ء سے ہی مختلف رسائل میں شروع ہوگیا اس کا سبب گھر میں علم و ادب اور تعلیم و تعلّم کا چرچا تھا ان کے والد محترم جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے خود ایک بڑے جیّد عالم، محدّث اور فقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو و فارسی کے ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے - چناں چہ ان کا فارسی کلام ایک ضخیم کلیات کی شکل میں محفوظ ہے - ساتھ ہی تاریخ گوئی میں بھی انھیں کمال حاصل تھا- ہونہار بیٹے پر اثر پڑنا لازمی تھا لہذا شاعری اور مضمون نگاری کے ساتھ بچپن ہی سے تاریخیں کہنی بھی شروع کردیں اور اس فن میں بھی یدطولی حاصل کیا-

قادری صاحب کا پہلا مضمون ۱۹۰۲ء میں " انتخاب لاجواب" لاہور میں شائع ہوا پھر رسالہ " زمانہ " کان پور ، " علی گڑھ منتھلی" اور " مخزن" لاہور وغیرہ کے لیے مضامین لکھے اور ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کرلی- ۱۹۰۵ء میں جب وہ صرف آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے انھوں نے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھ کر شائع کرائیں اس زمانے میں

---

(۱) حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۳۰۰

ایک انجمن " رفیق الاسلام" کے نام سے قائم تھی جو پاکٹ سائز کی مذہبی و اخلاقی کتابیں شائع کرکے مفت تقسیم کیا کرتی تھی اس انجمن نے قادری صاحب کی تین کتابیں : " گلدستۂ اخلاق"، " رفیق تنہائی" اور " حسنین " شائع کیں ۔ " پیسہ اخبار" لاہور میں بھی ایک انگریزی افسانے کا اردو ترجمہ " جادو گردی" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں جب وہ دویں جماعت کے طالب علم تھے تو سر راس مسعود کے لندن جاتے وقت ان کو مخاطب کرکے ایک طویل نظم کہی جو " علی گڑھ منتھلی" کے ماہ دسمبر، ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور ادبی حلقوں میں بڑی مقبول ہوئی ۔ ۱۹۱۰ء میں وہ دہلی چلے گئے اور وہاں پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان دیا اور اپنی ذہانت و فطانت کے سبب تمام یونی ورسٹی میں اول آئے ۔ اس کے بعد ادیب فاضل کا امتحان بھی نمایاں حیثیت سے پاس کیا۔ حالاں کہ جس زمانے میں آپ امتحان کی تیاری میں مصروف تھے سخت نزلہ و زکام اور بخار میں مبتلا ہوگئے مگر فطری ذوق شعر گوئی اس پر بھی حاوی رہا کچھ اور نہیں تو نزلہ و زکام کی ہی تاریخ کہہ ڈالی ۔ ملا حظہ ہو :

امتحاں کے قرب میں نزلہ ہوا — یہ بھی ہے و اژونئی تقدیر و بخت

اس قدر اٹھتی ہے کھانسی زور سے — دل ہوا جاتا ہے گویا لخت لخت

فکر ہے تاریخ کی تم کو اگر — کہہ دو حامد ان دنوں نزلہ ہے سخت

۱۳۲۸ھ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جو انقلاب آیا تھا اس نے دہلی، آگرہ ، لکھنؤ اور گرد و نواح کے اہل ہنر، علما و فضلا اور شعرا و ادبا کو فرمانروائے رام پور کی علمی و ادبی قدردانیوں کے سبب رام پور میں لاکر جمع کردیا تھا اس زمانے میں رام پور علم و ادب کے اعتبار سے بغداد و مصر بنا ہوا تھا اور اس کا ہر گلی کوچہ علم و فن کا گہوارہ تھا۔

مدرسۂ عالیہ رام پور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں مولوی عبداللطیف

خاں صاحب کشتہ رقم طراز ہیں :

" بغداد کی جامعہ نظامیہ ، قاہرہ کی جامعہ ازہر، جون پور کا دارالعلوم اور رام پور کا مدرسۂ عالیہ اپنے نظام تعلیم اور لائق و فائق اساتذہ کے لیے تمام عالم میں مشہور ہیں۔ اگر ہم تمام اسلامی یونی ورسٹیوں کی تاریخ اٹھاکر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تعلیم کے وہ عظیم الشان ادارے ہیں جنھوں نے اکناف و اطراف عالم میں علم کی روشنی کو عام کر رکھا ہے اور یہی علم کے وہ عظیم الشان مراکز ہیں جو صرف اپنے قابل اساتذہ کی رہبری و علم دوستی کے سبب ہی ترقی کرسکے جو بھی طالب علم یہاں آیا وہ علم کا کبھی ختم نہ ہونے والا ایسا خزانہ و دریا لے کر گیا جس سے ہزارہا ضرورت مند مستفید اور لاکھوں تشنگان علم و ادب سیراب ہوتے رہے ۔" (۱)

مولانا قادری کو بھی " مدرسۂ عالیہ رام پور " میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے اور علم و ادب سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ ملا ۔ اسی شہرۂ آفاق درسگاہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اسٹیٹ ہائی اسکول رام پور میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۹ء میں میٹرک کے امتحان میں نمایاں حیثیت سے کام یابی حاصل کی ۔

قادری صاحب کے دل میں علمی لگن لگانے اور شعر و ادب کا ذوق پیدا کرنے میں وراثت کے ساتھ ساتھ ان کے گھر کے علمی و ادبی ماحول کا بھی گہرا دخل ہے ۔ جب انھوں نے آنکھ کھولی تو گرد و پیش شعر و سخن کی محفلیں گرم پائیں اور فضائے شہر کو غالب و مومن اور میر و داغ کی غزلوں سے گونجتے دیکھا ان کا اس سے متاثر ہونا اک امر لابدی تھا ۔ وہ بھی ان اساتذہ کی غزلوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ، طبیعت موزوں تھی

---

(۱) کشتہ، مولوی عبداللطیف خاں ، " مولانا حامد حسن قادری"، " اردو نامہ " (سہ ماہی) ، کراچی : جنوری تا مارچ ، ۱۹۶۵ء ، ج ، ش ۱۹ ، ص ۸۔

اس لیے شعر کہنے سے باز دہ رہی اور اس زمانے میں جب ان کی عمر بمشکل تیرہ یا چودہ برس کی تھی اور کسی کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہہ دہ کیا تھا ان کے نتائج فکر کا عالم یہ تھا :

کیا خوب تم نے ہم کو وفا کا صلا دیا فہرست سے بھی نام ہمارا اڑا دیا
آئینہ آگے رکھ کے کہا میں نے دیکھئے کیا تمہیں کو سامنے لاکر بٹھا دیا

=====xxx====

لحد سے اٹھ کے ظالم دیکھ لوں میں تیری صورت بھی
جو آیا ہے تو کردے چال سے برپا قیامت بھی
ترا غصہ بھی مجھ کو یاد ہے تیری عنایت بھی
مری آنکھوں میں پھرتی ہے یہ صورت بھی وہ صورت بھی
یہ کون آتا ہے ، وہ آتے ہیں شاید سیر گلشن کو
خبر کے ساتھ ساتھ اڑنے لگی پھولوں کی رنگت بھی
اٹھا ہے درد ان کا جب کبھی خنجر لگانے کو
تو دل میں پھانس بن کر چبھ گئی ہے ان کی حسرت بھی
کہا قاصد سے کہنا عمر بھر یونہی بسر ہوگی
کہاں کا خط، ہمارا پڑھ چکے وہ خطِّ قسمت بھی

====xxx====

نکالا آج اسے توکل اسے شانِ تلوّن ہے
بدلتے رہتے ہیں ہر روز نقشے ان کی محفل کے
دہ برہا اس کو تیوری سے ستم گر میں دہ کہتا تھا
کہ ساتھ اشکوں کے اب آنے لگے ٹکڑے ٹکڑے مرے دل کے

====xxx====

ہوتی رہتی ہے خلش ٹکڑ درد کی اکثر دل میں
گھر بنا لیتے ہیں یہ خنجر و نشتر دل میں

===xxx===

مولانا کی ابتدائی عمر کی شاعری کے سلسلے میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں :

"رسالہ " مخزن" کے فائل (File) میں، میں نے مولانا حامد حسن قادری

کی جوانی کو دیکھا۔ وہ جوانی جو غزل خوانی سے عبارت تھی مولانا کے بڑھاپے کو دیکھنے والے شائد کبھی اس پہلو کے بارے میں سوچیں بھی نہیں۔" (۱)

قادری صاحب کے چچا مولوی محمد محسن فاروقی جو اس زمانے میں اسلامیہ کالج پشاور میں عربی کے استاد تھے انھوں نے ان کے ذوق شعر گوئی کو دیکھتے ہوئے مولانا امیر مینائی کے ایک شاگرد رشید منشی امتیاز احمد خاں صاحب راز رام پوری سے اصلاح سخن کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں خود قادری صاحب اپنے دیوان" مراۃ سخن" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

" چند سال بعد چھوٹے چچا میاں (مولوی محمد محسن فاروقی لیکچرار اسلامیہ کالج پشاور) مجھے اپنے دوست منشی امتیاز احمد خاں راز کے پاس لے گئے اور ان کا شاگرد بنادیا۔" (۲)

خواجہ الطاف حسین حالی نے " حیات جاوید" میں سرسید کے متعلق لکھا ہے کہ

" وہ ابتدا سے تحریر و تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گریمر (Grammar) کی پابندی سے فطرتاً آزاد تھے - یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اول اول دلّی میں اپنے گرد شعرا کا جھمگٹا دیکھ کر ان کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا کچھ بہت دن نہ گذرے کہ وہ ان تکلفات لا یعنی سے جو شاعری کے لیے لازم ہیں اور حقائق نگاری میں مخل ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے دستبردار ہوگئے "۔

اسی طرح مولانا حامد حسن قادری نے بھی راز رام پوری سے فیض تلمذ حاصل کرنے کے بعد میر انیس کا تتبع کرتے ہوئے غزل گوئی کو اپنا شعار نہیں بنایا ان کا گھرانہ چوں کہ خالص علمی و مذہبی گھرانہ تھا والد بزرگ وار اگر محدّث تھے تو عم مکرم فاضل عربی لہذا

---

(۱) کشفی، ڈاکٹر سید ابوالخیر، " ہمارے عہد کا ادب و ادیب "، کراچی :جاوید پریس، س ن ، ص ۱۱

(۲) حامدحسن قادری، مراۃ سخن" (دیوان غزلیات خود) ، مخطوطہ مقبوضہ ڈاکٹر خالد حسن قادری، پروفیسر لندن یونی ورسٹی، ص ۲

انھوں نے بھی غزل گوئی سے احتراز کیا اورھمہ تن انشاء پردازی کی طرف مائل ھوگئے اس سلسلے میں وہ خود اپنے مضمون "حامد حسن قادری"، میں یوں رقم طراز ھیں :-

" حامد حسن قادری شاعر ھیں مگر شاعری نہیں کرتے ابتدا میں امیر مینائی کے ایک شاگرد کے شاگرد ھوئے غزلیں کہیں، مشاعروں میں پڑھیں لیکن جب حسرت موھانی کی غزلیں" زمانہ" و " نقاد" وغیرہ میں شائع ھونی شروع ھوئیں تو قادری ان سے نہایت متاثر ھوئے اور کہا کہ غزل یہ ھے باقی سب ھیچ ھے - " مخزن" میں شاد عظیم آبادی کی غزلیں چھپتی تھیں اور ان کو پسند آتی تھیں پھر فانی کا کلام دیکھا اور بہت پسند کیا اس کے بعد غزل کی کائنات ھی بدل گئی - امیر و داغ وغیرہ کے قدیم رنگ حامد حسن قادری کی نظر سے گر گئے قدیموں میں صرف ریاض و جلیل کو پڑھنے کے قابل سمجھتے تھے اب یہ متفرقات کے شاعر ھیں یا رباعیات و قطعات کے -" (١)

ان کی اس تحریر سے اندازہ ھوتا ھے کہ ان کی طبیعت بھی جدّت پسند واقع ھوئی تھی اور وہ چبائے ھوئے لقموں کو چبانا یا لکیر کا فقیر بننا پسند نہ کرتے تھے جیسا کہ سطور بالا سے ظاھر ھے کہ سابقہ ماحول کے باوجود انھوں نے پرانی ڈگر کو چھوڑ دیا اور عہد حاضر کے تجدّد پسند شاعروں کے کلام کو بنظر تحسین دیکھا اور بے حد پسند کیا- ان کی تحریر سے اندازہ ھوتا ھے کہ انھوں نے بھی غزل گوئی کے اس نئے رجحان کو پسند کرتے ھوئے اس کی پیروی کرنی چاھی مگر سابقہ ماحول اور امیر و داغ کے کلام کے اثرات نے ان کے دل و دماغ میں گھر کرلیا تھا اور انھوں نے یہ بھی یہ سمجھ کر کہ شائد وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے سکیں اور جدید طرز بحسن و خوبی نہ نبھا سکیں غزل گوئی ھی کو خیر باد کہہ دیا -

---

(١) حامد حسن قادری، " خود نوشت حالات"، " اردو نامہ"کراچی : جنوری تا مارچ، ١٩٥٥ع، ج ، ش ١٩، ص

مشاہیر سے رسم و راہ :

قادری صاحب نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ خود علم و ادب کے ایک گہوارے سے کم نہ تھا جہاں دن رات علمی و ادبی تذکرے رہتے تھے ان کے خاندان کے لوگوں کا شمار ملک کی مشہور و معروف ہستیوں میں ہوتا تھا لیکن قادری صاحب نے کبھی اس پر فخر و ناز نہیں کیا بلکہ خود اپنے دست و بازو کے بھروسے پر میدان ادب میں اترے اور اپنی ذاتی قابلیتوں اور اعلا علمی صلاحیتوں کی بدولت ایک بلند مقام حاصل کرلیا ملک کے بیشتر موقر جرائد و رسائل کے مدیراں کی نگارشات کو شائع کرنا باعث فخر تصور کرتے اور نئی تخلیقات کے خواہاں رہتے مگر وہ فطری طور پر صوفی مش اور عزلت گزین واقع ہوئے تھے اس لیے نمود و نمائش سے گریزاں رہتے تھے اگر اتفاق سے کسی کا سامنا ہو بھی گیا تو یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ حامد حسن قادری ہیں۔

مگر باوجود اس کے چوں کہ وہ یوپی کے ایک ممتاز کالج (سینٹ جانس کالج آگرہ) میں صدر شعبہ تھے اور مختلف یوپی ورسٹیوں اور تعلیمی بورڈوں کے ممتحن رہتے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ تعلیمی اداروں سے متعلق یا دیگر اہل علم حضرات سے ان کے اچھے خاصے مراسم ہوں گے لہذا وہ لوگوں کی نظر سے بچ کر کہاں جاسکتے تھے - بہت سے شعراء ادبا ان کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے اور خاص طور سے یوپی ورسٹی کے تحت جب مختلف شعبوں کے اجتماع ہوتے تو نہ صرف صوبۂ یوپی کے کالجوں کے اساتذہ بلکہ دوسرے صوبوں کے آئے ہوئے بیشتر دانشور و اساتذہ کرام قادری صاحب ، ان کے بھائی مولوی عابد حسن صاحب فریدی یا ڈاکٹر مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی کے یہاں مہمان رہتے اور کئی کئی روز علمی مباحث اور مجالس قائم رہتیں۔ ملک بھر کے بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں سے مختلف موضوعات و مباحث پر ان کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کون صاحب علم

ایسا ہوگا جو ان کی شخصیت سے متعارف اور ان کی لیاقت کا اعتراف نہ کرتا ہو لیکن با ایں ہمہ وہ تنہائی پسند کرتے اور لیے دیے رہنے کو ترجیح دیتے تھے اور ان کی اس گوشہ نشینی کا یہ عالم تھا کہ برسوں تک بعض اصحاب سے صرف غائبانہ خط و کتابت رہتی اور کوئی ملاقات نہ ہوتی اور اگر کبھی ملاقات ہوتی بھی تو وہ بھی کسی نہایت ہی خاص تقریب ، خاص موقع یا خاص سبب کی وجہ سے اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے :

" حامد حسن قادری کا نام کافی مشہور ہے ۔ مقالہ نگار بھی ہیں نقاد بھی ، شاعر بھی ، مصنف بھی ، کسی نہ کسی حیثیت و عنوان سے ان کا نام یا کام رسائل و جرائد میں آتا رہتا ہے لیکن" یہ بات بھی ہے لکھنے کے قابل کتاب میں" کہ بہت سے لوگوں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا اور انھوں نے بھی بہت سے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ اکبر الہ آبادی ، خواجہ حسن نظامی ، پریم چندر ، راشد الخیری ، چکبست ، ڈاکٹر اقبال ، شیخ عبدالقادر ، حفیظ جالندھری ، سجاد حیدر ، ڈاکٹر عابد حسین ، اثر لکھنوی ، فراق گورکھپوری ، علی عباس حسینی ، سعادت حسن منٹو ، کرشن چندر ، جگن ناتھ آزاد ، وغیرہ وغیرہ بے شمار مشاہیر ہیں جن کی زیارت و ملاقات کا حامد حسن قادری کو کبھی اتفاق نہیں ہوا ۔" (۱)

قادری صاحب کے اس نہ ملنے اور نہ دیکھنے کے سلسلے میں ایک لطیفہ کافی مشہور ہے جس کا ذکر خود مولانا حامد حسن قادری نے بھی کیا ہے ۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے جو اس وقت انجمن ترقی اردو ، دہلی کے سکریٹری تھے اور وہاں سے ایک رسالہ " اردو" کے نام سے نکالا کرتے تھے اس کی اکتوبر ، ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں پروفیسر آل احمد سرور اور مولانا حامد حسن قادری کو نوجوان نقادوں کی صف میں شمار کرتے ہوئے از راہ شفقت و محبت دعا دی کہ " یہ دونوں نوجوان خوب کام کر رہے ہیں

---

(۱) حامد حسن قادری ، " خود نوشت " ، " اردو نامہ " ، محولہ بالا ، ج ، شمارہ ۱۹ ص ۲۹

خدا انہیں نظر بد سے بچائے ۔"

اس وقت آل احمد سرور صاحب تو خیر بے ریش و بروت تھے ہی بلکہ آج بھی ہیں مگر اچھے خاصے جوان تھے ۔ البتہ مولانا حامد حسن قادری کو اپنے متعلق یہ دعائیہ جملہ پڑھ کر بہت ہی لطف آیا کیوں کہ ان کی عمر اس وقت بھی چھپن ستاون سال کے قریب تھی اور نورانی چہرے پر سپیدئی صبح کی طرح سفید ریش چکماکارہی تھی مولوی عبدالحق صاحب انہیں بھی نوجوانوں میں شمار فرمارہے تھے ۔ مولانا حامد حسن قادری اور ان کے احباب مولوی صاحب کا یہ تبصرہ پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے ۔ اتفاق کی بات کہ اسی دوران ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں ایک ادبی اجلاس منعقد ہونے والا تھا جس کے مہمان میں مولوی عبدالحق صاحب اور مولانا حامد حسن صاحب قادری کے علاوہ نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر عابدحسین وغیرہ بھی شامل تھے لہذا موقعہ کی مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا حامد حسن قادری نے مولوی عبدالحق صاحب کے تبصرے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی دعا نقل کی اور دعا پر آمین کہہ کر لکھا :

" میرا ارادہ اکیڈمی کے جلسے میں الہ آباد جانے کا ہے ۔ امید ہے کہ آپ بھی تشریف لے جائیں گے ۔ وہاں ملاقات ہوگی ۔ اس جلسے میں کچھ " جوان" بھی ہوں گے جیسے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور سید سلیمان ندوی اور " نوجوان" بھی ہوں گے مثلاً نیاز فتح پوری اور چند " اطفال" بھی ہوں گے جیسے ڈاکٹر عابدحسین اور رشید احمد صدیقی"۔

اور اس کے بعد لکھا کہ آپ اسی تبصرے میں میرے متعلق لکھ چکے ہیں کہ " طبیعت میں کسی قدر شوخی بھی ہے " مولوی عبدالحق صاحب اس شوخی کو سمجھ گئے بہت لطف لیا اور فوراً لکھا کہ معلوم ہوتا ہے مجھے کسی وجہ سے غلط فہمی ہوئی اور پھر جب الہ آباد کے جلسے میں دونوں الگ الگ پہنچے تو حامد حسن قادری نے مولوی عبدالحق صاحب کو پہچان لیا اس لیے کہ ان کی تصویریں بہت دیکھی تھیں لیکن مولوی صاحب نے قادری کی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی

اس لیے ذرا ادھر ادھر نظر میں دوڑا کر قیاس سے بھی پہچانا اور دور سے دونوں میں اشارے کنائے ہوئے ۔" (۱)

اس لطیفے سے پتا چلتا ہے کہ قادری صاحب کے مشاہیر سے خاندانہ طور پر بڑے گہرے مراسم تھے اور وہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی کرتے تھے مگر قادری صاحب کا نام و نمود سے نفور کم آمیزی، عزلت گزینی و کسر نفسی اکابرین سے ملنے میں ہمیشہ مانع رہی مگر بھی دیکھنے میں آیا کہ جب کوئی مشہور و معروف ادیب ، عالم یا شاعر قادری صاحب سے ملنے ان کے گھر آیا اور چندے مقیم رہنے کے بعد رخصت ہوا تو ان کی علمی و ادبی شخصیت سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے حسن اخلاق کا بھی دل سے معتقد ہوگیا۔

ارباب سیاست میں بھی بہت سے لوگوں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے بھارت کے وزیر آب پاشی حافظ محمد ابراھیم مرحوم ان کے بڑے گہرے دوست اور ہم جماعت تھے اسی طرح بھارت کے مرکزی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی ان کی خاصی بے تکلفی تھی اس سلسلے میں بھی انھوں نے ایک لطیفہ اپنے مضمون میں یوں لکھا ہے :

" ۱۹۰۳ء میں حامد حسن قادری کے وطن قصبہ بچھرایوں ، ضلع مرادآباد میں ایک قومی جلسہ ہوا اس میں تقریر کرنے کے لیے خواجہ غلام الثقلین اور مولانا ابوالکلام آزاد بلائے گئے ۔ آزاد صاحب نے بڑی دھواں دھار تقریر کی اور حامد حسن قادری نے ایک طویل نظم پڑھی ۔ اس زمانے میں ابوالکلام آزاد اور قادری دونوں ہم عمر لڑکے تھے ۔ سترہ (۱۷) سال کی عمر ہوگی دونوں بے ریش و بروت ، سرخ و سفید ، مگر ایک دراز قد ، ایک کوتاہ قامت یعنی قادری بڑھ کر بھی پانچ فٹ رہے اور آزاد ساڑھے پانچ فٹ سے نکل گئے ۔ ابوالکلام آزاد کی پرجوش و عالمانہ تقریر سن کر جلسے اور قصبے کے لوگ حیران تھے ۔ راستے چلتے لوگ ان سے پوچھتے

---

(۱) حامد حسن قادری،" خود نوشت حالات"، محولہ بالا ، " اردو نامہ"، [illegible] ش ۱۹، ص ۳۰

تھے-آپ کی کیا عمر ہے - آزاد کہتے تھے سترہ سال - لوگ یقین نہ کرتے تھے کہتے تھے کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی ڈاڑھی موچھ نہیں نکلتی - اس جلسے کے بعد آزاد اور قادری کا پھر کہیں کسی جلسے یا کسی شہر میں ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو پورے چھیالیس سال بعد ہوا- جب فروری، ۱۹۵۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت وزیر تعلیم آگرے آئے اور آگرہ کینٹ ریلوے اسٹیشن پر اپنے سیلون میں قیام کیا اور سینٹ جانس کالج کو ٹیلی فون کرکے حامد حسن قادری کو ملنے کے لیے بلایا- اس ملاقات میں پچھراہیں کے اس جلسے کا تذکرہ بھی رہا - یہ آزاد صاحب کے حافظے کا کمال ہے کہ انھوں نے اس جلسے کے وہ مناظر اور حالات بیان کیے جو قادری کو یاد بھی نہ رہے تھے-" (۱)

قادری صاحب اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی بلاکے ذہین، دور رس اور مردم شناس تھے - انھوں نے کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے حکّام یا صاحب اقتدار لوگوں کی تعریف میں مدحیہ قصائد یا منظومات نہیں لکھیں ، لیکن بزرگان دین ، مخلص سیاستدانوں یا اہل علم حضرات کی خدمات کو عوام سے روشناس کرانے اور ان کو اپنے فرائض منصبی کا احساس دلانے کے لیے ضرور نظمیں لکھیں اس سلسلے میں دو واقعات کا تذکرہ یہاں بے جا نہ ہوگا-

۱۹۰۳ء میں سرسید کے پوتے اور سرمحمود کے بیٹے راس مسعود تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں لندن گئے - سفر سے پہلے اخبار" وکیل" امرتسر نے ایک مضمون لکھا جس میں راس مسعود کو خطاب کرکے ان توقعات کو بیان کیا جو ان کی ذات سے وابستہ تھیں - جب اکابر قوم راس مسعود کو جہاز پر سوار کرانے بمبئی گئے تو نواب محسن الملک نے تقریر کی اور راس مسعود کو اخبار " وکیل" کا وہ پرچہ دے کر اس پر عمل کرنے کی ہدایت کی حامد حسن قادری کے گھر اخبار " وکیل" بھی آتا تھا اور " علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ "

---

(۱) حامد حسن قادری، " خودنوشت حالات"، مشمولہ " اردو نامہ"، محولہ بالا، ص ۳۰

بھی ان سے یہ حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے راس مسعود کو خطاب کرکے ایک طویل نظم لکھی جو دسمبر، ۱۹۰۲ء کے "علی گڑھ منتھلی" میں شائع ہوئی ۔

اسی طرح علامہ اقبال کی ذات سے بھی وہ بہت متاثر تھے کیوں کہ ان کے ترانوں نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک نئی لگن، نیا ولولہ اور جوش و خروش پیدا کردیا تھا جب علامہ اقبال لندن سے پی ایچ ڈی کرکے وطن آئے تو انھوں نے ایک نظم خیر مقدم کہہ کر مدیر "مخزن" شیخ عبدالقادر کو ارسال کی "مخزن" کا شمار اس وقت کے اعلا و موقر جرائد میں ہوتا تھا ۔ علامہ اقبال کی بھی اکثر نظمیں اور مضامین اس میں شائع ہوتے رہتے تھے ۔ "مخزن" میں نظم علامہ اقبال نے بھی پڑھی ۔ نظم یہ تھی :

اقبال کا خیر مقدم

ہو مبارک حضرت اقبال آنا ہند میں | ہو مبارک آپ کو تشریف لانا ہند میں

آئے ہو کر علم کی دولت سے مالا مال تم | بن گئے اقبال سے اب ڈاکٹر اقبال تم

ہوکے کامل فلسفہ کے علم میں آئے ہو تم | خوبیاں حکمت کی کیا کیا دل میں بھر لائے ہو تم

اب یہ مرضی پر تمہاری ہے کہ بیرسٹر بنو | یا کسی کالج میں جاکر تم پروفیسر بنو

ہند پر چھائی گھٹا ادبار کی نکبت کی ہے | اب ضرورت اس کو ایسے شخص کی خدمت کی ہے

جانتے ہو خوب اے اقبال حالت اس کی تم | دیکھیں ہم بھی کس طرح کرتے ہو خدمت اس کی تم

صرف اک پنجاب ہی تم پر نہیں نازاں کہاں | بلکہ ہو تم مایۂ صد فخر کل ہندوستان

مدتوں سے نظم ہم نے آپ کی دیکھی نہیں | سچ تو یہ ہے اس کی فرصت آپ کو تھی بھی نہیں

آپ کی نظموں کے اک مدّت سے ہم مشتاق ہیں | آپ فن شاعری میں شہرۂ آفاق ہیں

اب تو فرصت آپ کو تعلیم سے بھی ہوگئی | مرحبہ اب تو ہم دیکھیں گے نظمیں آپ کی

اب تو مخزن میں چھپیں گے آپ کے اشعار بھی
دیکھیں گے ہم آپ کے افکار گوہر بار بھی (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، "اقبال کا خیرمقدم"، "مخزن"، لاہور: ستمبر، ۱۹۰۸ء،

ڈاکٹر اقبال نے جب یہ نظم دیکھی تو مولانا حامد حسن قادری کو خط میں لکھا :

" میری آرزو بھی یہی تھی کہ قوم کی علمی و تعلیمی
خدمت کروں لیکن بعض مصلحتوں کی بنا پر میں یکسوئی
اختیار کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔" (۱)

اسی طرح ۱۹۱۳ء میں جب شاہ دلگیر اکبرآبادی نے اپنا مشہور رسالہ " نقاد" آگرے سے جاری کیا تو سب ہی یاران نکتہ داں کو صلائے عام دی ۔ شاہ صاحب بذات خود بھی ایک انجمن تھے ۔ تمام عمر علم و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں رہے اور بڑی پر خلوص خدمات انجام دیں ان کی صدا پر سب ہی نے لبیک کہا اور اس طرح " نقاد" میں نزدیک و دور کے بڑے بڑے شعراء و ادباء کی اچھی خاصی محفل جم گئی ۔ نیاز فتح پوری کی شہرت کا ذریعہ بھی یہی رسالہ ہوا۔ کیوں کہ حامد حسن قادری اور نیاز فتح پوری عام طور پر اس کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے اس لیے اسی کے توسل سے دونوں میں غائبانہ شناسائی شروع ہوئی اور یہ غائبانہ دوستی ایک ہی نہج پر مسلسل چلتی رہی اور اس میں اس وقت اور مزید استحکام پیدا ہوگیا جب اس دوران نیاز فتح پوری نے بھی لکھنؤ سے اپنا رسالہ " نگار" جاری کیا اور قادری صاحب اسی طرح جس طرح " نقاد" کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے " نگار" کے لیے بھی لکھتے رہے لیکن اس تیس، پینتیس (۳۰، ۳۵) سال کے عرصے میں دونوں میں سے کوئی ایک بھی ایک دوسرے سے غائبانہ دوستی کے علاوہ روشناس نہ ہوا۔

۱۹۳۸ء میں ایک سلسلے میں مولانا حامد حسن قادری کا لکھنؤ جانا ہوا وہاں انہوں نے پروفیسر آل احمد سرور کے مکان پر قیام کیا۔ قادری صاحب نے چوں کہ اپنے پروگرام سے نیاز صاحب کو مطلع کردیا تھا لہٰذا بجائے اس کے کہ قادری صاحب ملاقات میں سبقت کرتے نیاز صاحب یہ بازی جیت گئے اور دونوں غائبانہ دوستوں کی پینتیس (۳۵) سال بعد پہلی

---

(۱) مکتوب اقبال بنام مولانا حامد حسن قادری ، غیرمطبوعہ مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری پروفیسر لندن یونی ورسٹی ۔

مرتبہ روشناس ہوئی -

اسی طرح اور مشاہیر ہند و پاک جن میں علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء شامل ہیں اکثر سے مولانا حامد حسن قادری کے دیرینہ مراسم تھے۔

ملازمت :

مرزا غالب کا قول ہے کہ اگر کسی شخص کا مشغلۂ زندگی ہی اس کے لیے ذریعۂ معاش بن جائے تو گویا یہ اس شخص کے لیے ایک طرح کا عیش ہے - قادری صاحب اپنے اشغال کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

" حامد حسن قادری کا مشغلۂ زندگی بجز لکھنے پڑھنے کے کچھ نہیں رہا لڑکپن اور طالب علمی میں بھی کھیلوں اور میلوں میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ کھیلنا کیا معنی، ان کو کھیل دیکھنا بھی نہیں آتا - مثلاً شطرنج میں گھوڑے کی ترچھی اور آمد و رفت کے دام و دہیر ان کو نہیں آتے - تاش کے کھیل کی قسمیں اور ترکیبیں بھی ان کو معلوم نہیں - ان کی ورزش صرف ٹہلنا رہی ہے اب بھی روزانہ صبح کو تین چار میل کا چکر لگا آتے ہیں اس کے بعد دن رات یہ ہیں اور کتابیں۔" (۱)

ایسا شخص جس کا اوڑھنا بچھونا ہی کتابیں ہوں سوائے درس و تدریس کے اور کون سی خدمت کو ذریعۂ معاش بناسکتا تھا لہذا تعلیم و تعلم سے دلی مناسبت ہونے کے سبب مولانا حامد حسن قادری نے بھی درس و تدریس کے مقدس پیشے میں قدم رکھا اور ستمبر، ۱۹۱۰ع کو آپ کا تقرر بحیثیت معلّم اردو و فارسی ریزیڈنسی ہائی اسکول اندور چھاؤنی میں ہوگیا مگر اس سمت کاوش ہوتے ہی ان کی تشنگی علم اور بڑھنے لگی - انھوں نے یہ ملازمت ترک کردی اور ہمہ تن پڑھائی میں بھی مصروف ہوگئے - ۱۹۱۱ع میں انھوں نے لاہور جاکر

---

(۱) حامد حسن قادری، " خود نوشت حالات "، " اردو نامہ "، محولہ بالا ، شمارہ ۱۹، ص ۳۳

پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان دیا اور یونی ورسٹی بھر میں اول آئے اور جون ۱۹۱۱ء میں وہ خان بہادر فاضل جی پیسٹن جی زرتشتی ھائی اسکول مہو چھاؤنی میں بحیثیت ھیڈ مولوی ملازم ہوگئے -

نومبر ۱۹۱۲ء سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک وہ اسلامیہ ھائی اسکول اٹاوہ میں اردو و فارسی کے مدرس رہے - (یہ اب ایک کالج بن چکا ہے) - یہ درس گاہ اپنے حسن کارکردگی نظم و ضبط اور تعلیم و تعلّم کے لیے نزدیک و دور کافی مشہور تھی اس سلسلے میں قادری صاحب کے ایک دیرینہ رفیق کار مولوی عبداللطیف خان صاحب کشتہ رکھتے ھیں :

" قادری صاحب رام پور کی علمی و ادبی صحبتوں سے بچھڑ نے کے بعد جب شعبۂ تعلیمات میں پہنچے تو ابتدا جن درسگاھوں میں انھوں نے کام کیا ان میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ ایک بہت ھی اھم درسگاہ تھی اس کے منیجر خان بہادر مولوی بشیر الدین (ایڈیٹر " البشیر" اٹاوہ) سرسید کے رفیقوں میں بڑے پائے کے بزرگ اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے بدل و جان خواھاں اور ان کی سیاسیات سے گہری دل چسپی رکھنے والے آدمی تھے - سرسید کے ارادت مند ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور وھاں ھیڈ ماسٹر تھے مولوی سید الطاف حسین معلومات علمیہ کی زندہ انسائی کلوپیڈیا ، خود صاحب کمال اور اھل علم کے بڑے قدردان ، انھوں نے اپنی زندگی مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اسلامیہ اسکول اٹاوہ کو وقف کر رکھی تھی - جوھر قابل ھاتھ آتا تو چمکانے اور ابھارنے میں کسر نہ چھوڑتے - ان دونوں حضرات کی توجہ کی وجہ سے اسلامیہ اسکول اٹاوہ چھوٹا علی گڑھ بن گیا تھا- ھندوستان بھرکے ادیب ، شاعر ، مصنف اور قومی رھنما برابر اٹاوہ آتے جاتے رہتے تھے ان کا اور ان کی علمی صحبتوں کا پرتو وھاں کے طلبہ اور اساتذہ دونوں پر پڑتا رھتا تھا- مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم ، ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم (سابق صدر بھارت) ڈاکٹر محمود حسین خان اور اشتیاق حسین قریشی (وائس چانسلر کراچی یونی ورسٹی) جیسے بہت سے مشاھیر کی شخصیتوں کے بنانے میں اٹاوہ اسلامیہ اسکول کی تعلیم و تربیت کا ایک نمایاں حصہ ہے -" (۱)

---

(۱) کشتہ، مولوی عبداللطیف خان، " مولانا حامدحسن قادری"، " اردو نامہ"، محولہ بالا ، ش ۱۹، ص ۱۰

یہ بیان تو کشتہ صاحب نے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے حسن کارکردگی کے سلسلے میں سپرد قلم کیا تھا جو طلبہ کے کردار کو سنوار کر ان کو مشاہیر کی صف میں لا کھڑا کرتی تھی لیکن اس ادارے نے قادری صاحب پر جو بحیثیت مدرس وہاں گئے تھے کیا اثرات مرتب کئے یہ بھی xxxx کشتہ صاحب ہی کی زبان قلم سے سنیں تو بہتر ہوگا۔ لکھتے ہیں :

" کو قادری صاحب اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں نومبر، ۱۹۱۲ء سے دسمبر، ۱۹۱۳ء تک یعنی تھوڑے ہی عرصے رہے مگر ان کی علمی و عملی زندگی پر اٹاوہ کی روشن خیال صحبتوں کا بہت گہرا اثر پڑا اور ان میں ٹھوس علمی و ادبی خدمات انجام دینے کا جذبہ پیدا ہوگیا - رام پور کی صحبتوں میں شعرائے دہلی و لکھنو کی رقیبانہ چشمکوں اور متضادہ حقیقت شناسیوں کے سلسلے میں جو ادبی و فنی مباحثے اور موازنے ہوتے ، ہر لفظ و محاورہ گھس گھس کر پرکھا جاتا اس ماحول نے ان میں جو تحقیق و تنقید ادب کا ذوق پیدا کردیا تھا وہ موقعہ پاکر ابھرا اور انھوں نے ۱۹۱۵ء سے تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھنا شروع کردیے - اس سے قبل جنوری، ۱۹۱۳ء میں ان کا تقرر فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے ہوگیا تھا مگر جون، ۱۹۱۷ء میں انھوں نے کچھ تو ناسازگار فضا اور کچھ اور مصلحتوں کی بنا پر یہ ملازمت ترک کردی -" (۱)

راشد قادری نے جنگ کراچی کی ۲۳ جولائی، ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں " مولانا حامد حسن قادری " کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مولانا کا تقرر اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں نومبر، ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ مولوی عبداللطیف خاں صاحب کشتہ نے اس سلسلے میں لکھا ہے :

" ۱۹۱۷ء تک وہ ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھنے پائے اور خرابیٔ صحت یا دوسرے اسباب کے تحت تھوڑے عرصے کے بعد ملازمتیں ترک کرتے رہے مگر ۱۹۱۸ء میں جیسے ہی مولانا حسرت موہانی کی سیاسی و ادبی سرگرمیوں کا صدر مقام

---

(۱) کشتہ، مولانا عبداللطیف خاں، " مولانا حامد حسن قادری "، " اردو نامہ "، محولہ بالا ، ش ۱۹ ، ص ۱۰

کان پور ہوا تو قادری صاحب بھی حلیم مسلم ہائی اسکول کان پور کے ہیڈ مولوی ہوکر پہنچ گئے وہاں کی فضا طبیعت کو راس آئی ، جی لگ گیا تو طرح اقامت ڈال دی ۔ ادبی خدمات اور تصنیف و تالیف پر آمادہ ہوگئے ۔" (۱)

راشد قادری صاحب نے کان پور کی مدت ملازمت تیرہ سال بتائی ہے اور سن تقرر ۱۹۱۲ء بتایا ہے جب کہ مولوی عبداللطیف خاں صاحب کشتہ کی تحریر کردہ تاریخ تقرر سے وہاں کی مدت ملازمت صرف آٹھ سال ہوتی ہے مگر میں ان دونوں کے مقابلے میں ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کا بیان اور خود مولانا قادری کی ایک رباعی جو کان پور کے زمانۂ قیام کو صاف صاف بتاتی ہے اس کو معتبر سمجھتا ہوں ۔ کیوں کہ جس زمانے میں قادری صاحب سینٹ جانس کالج آگرہ میں پروفیسر تھے اسی دوران ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب بھی آگرہ کالج آگرہ میں صدر شعبۂ اردو و فارسی تھے اور دونوں حضرات کے مکانات بھی آگرے کے ایک ہی محلے نئی حکیماں میں تھے۔ فاروقی صاحب موصوف کے بیان کی تصدیق قادری اکادمی کی جانب سے شائع کردہ مولانا کی سوانح حیات سے بھی ہوجاتی ہے ۔ البتہ مولوی عبداللطیف خاں صاحب کشتہ کے بقول کان پور میں طرح اقامت ڈالنے اور کافی عرصے تک مقیم رہنے کی تصدیق خود مولانا قادری کی ایک رباعی سے بھی ہوجاتی ہے:

ہم سے کاہل جہاں میں پائے نہ گئے ۔ دس سال ہوئے کہیں نہ آئے نہ گئے
آخر اسکول چھوڑ دینا ہی پڑا ۔ لوہے کے چنے تھے یہ چبائے نہ گئے

مندرجہ بالا رباعی سے صاف ظاہر ہے کہ قادری صاحب ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۷ء تک حلیم مسلم ہائی اسکول کان پور میں بحیثیت مدرس خدمات انجام دیتے رہے اور اس سے ان کے دس سالہ یکجا قیام اور حالات کا اندازہ ہوجاتا ہے ۔

---

(۱) کشتہ، مولانا عبداللطیف خاں ، " مولانا حامد حسن قادری "، " اردو نامہ "، مجولہ بالا ، ش ۱۹ ، ص ۱۱-۱۰

مدیر کتابی دنیا کا وہ مضمون جو جولائی، ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں قادری صاحب کی وفات کے فوراً ہی بعد شائع ہوا اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ ۱۹۱۷ء کو حلیم مسلم ہائی اسکول کان پور میں ان کا تقرر بحیثیت ہیڈ مولوی ہوچکا تھا - پھر وہاں دس سال خدمت درس و تدریس انجام دینے کے بعد ۱۹۲۷ء کو سینٹ جانس کالج آگرہ میں پہنچے ہیں - مدیر کتابی دنیا کے تاثرات اور سن ملاقات انھیں کے الفاظ میں درج کرنا بہتر تصور کرتا ہوں:

" اس مہینے میں جن ادیبوں کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے ان میں حامد حسن قادری ایک خاص مقام کے حامل تھے - ان کا انتقال ۲ جون کو کراچی میں ہوا وہ بہت اچھے ادیب ، محقق اور شاعر تھے - سب سے پہلے میں نے ان کی نظم " مخزن" کے شمارہ ستمبر، ۱۹۰۸ء میں پڑھی تھی جو آمد اقبال کے موقعہ پر لکھی گئی تھی - لیکن ان سے میری پہلی ملاقات کان پور میں ۱۹۱۷ء کو ہوئی اس وقت وہ مقامی حلیم اسلامیہ اسکول میں ٹیچر تھے - اس کے بعد وہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں چلے گئے اور ملازمت سے سبکدوش ہونے تک اسی سے وابستہ رہے - پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آگئے -" (۱)

آگرے میں قیام:
=========

آگرے میں مولانا کا قیام مختلف مقامات پر مختلف محلّوں میں رہا اس سلسلے میں مولانا کے صاحب زادے ڈاکٹر خالد حسن قادری (پروفیسر شعبۂ اردو لندن یونی ورسٹی) سے جو تفصیلات ملی ہیں ان کے مطابق آگرے میں مولانا نے باوجود استطاعت و وسعت ہونے کے اپنے قیام کے لیے کبھی کوئی ذاتی مکان نہیں خریدا - جب آگرے کے سینٹ جانس کالج میں آپ کا تقرر ہوا تو اس وقت آپ کے برادر خورد مولوی عابد حسن فریدی صاحب سینٹ جانس

---

(۱) صلاح الدین، مولانا، " کتابی دنیا"، لاہور: جون، ۱۹۶۴ء، ج ، ش ص: ۲

کالج آگرہ میں صدر شعبۂ اردو تھے اور ان کا قیام بیل منڈی میں تھا مگر یہ مکان دونوں بزرگوں کی قیام گاہ بننے کے لیے کفالت نہ کرتا اس لیے بساون گلی میں لیڈی ڈاکٹر "تارا" کا خرید کردہ مکان کرایے پر لیا اور جولائی ۱۹۲۷ء سے قادری صاحب اور فریدی صاحب وہاں مقیم ہوئے - یہ مکان ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر عبدالغفار صاحب مرحوم کے صاحب زادے عبدالغنی صاحب (مرحوم) سے ڈاکٹر تارا نے خرید لیا تھا۔ کالا محل یا (کلاں محل) جہاں مرزا غالب کا لڑکپن گزرا یہاں سے قریب ہی واقع ہے تقسیم ہند کے بعد یہ ایک گرلز ڈگری کالج میں تبدیل ہوگیا ہے - اسی بساون گلی کے قیام کے دوران کا ایک واقعہ مولوی سید حامد علی نے یوں بیان کیا ہے :

" قادری صاحب آگرے میں بساون گلی والے مکان میں قیام پذیر تھے کہ ایک دن اتفاق سے ان کی ہمشیر بیمار ہوگئیں اور طے پایا کہ حکیم محمد حیات خاں صاحب کو بلا کر دکھایا جائے - حکیم صاحب موصوف ان کے خاندانی طبیب تھے - پہلے ہمشیر کو اور ان کے ساتھ دوسرے مریضوں کو ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا اور جب حکیم صاحب xxxxx کو ملازم کے ذریعہ بلایا گیا تو وہاں شفاخانے میں مریضوں کا ہجوم تھا جس کے باعث حکیم صاحب نے ملازم کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ " تم چلو ہم ابھی آتے ہیں" ۔ مگر شفاخانے میں مریضوں کی کثرت کے باعث وہ جلد نہ آسکے لہذا قادری صاحب نے پھر ایک آدمی کو بھجوایا مگر وہ بھی بے نیل مرام واپس لوٹ آیا اور اس ایرا پھیری میں سردی نے بیماروں کو گھیر لیا - بہت دیر کے بعد بدقت تمام حکیم صاحب آئے - مریضوں کا معائنہ کیا اور نسخے وغیرہ لکھے اور جب وہ سب مریضوں کو دیکھ بھال کر چلنے لگے تو قادری صاحب سے نہ رہا گیا اور کہا کہ " آپ ہمارے یہاں سے فیس یا نذرانہ تو لیتے نہیں ہیں لہذا اور کچھ نہیں تو یہ دو شعر آپ کی نذر کیے دیتا ہوں ، قبول فرمائیے :

ہنگام سحر بھی سہا سردی بھی سہی
اور ان کی گلی کی رہ نوردی بھی سہی
وہ آئیں نہ آئیں غل تو مچ جائے ذرا
دس پانچ منٹ حکیم گردی بھی سہی

شعر پڑھ کر حکیم صاحب بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے اب آئندہ یہ اشعار
مجھے حکمت سکھاتے رہیں گے ۔"

یہاں گلی کے مکان میں علمی صحبتیں بھی میسّر تھیں اور اعزہ و اقارب کا ساتھ
بھی رہتا تھا مگر یہاں رہنے میں یہ دقت درپیش تھی کہ یہ مقام کالج سے بہت دور تھا
اور انہیں کالج آنے جانے میں بڑی دقّت و دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا لہذا یہاں سے وہ
غالب پورہ کلاں میں منتقل ہوگئے اور ایک عرصے تک غالب پورہ کلاں میں ہی مقیم رہے ۔ اس
دوران مولوی عابد حسن فریدی صاحب کٹھیا اعظم خاں سے اٹھ کر گلی حکیماں میں چلے
گئے ۔ یہاں فریدی صاحب داروغہ احمد اللہ خاں صاحب کے مکان میں مقیم تھے اور چاہتے تھے
کہ قادری صاحب بھی ان کے قریب و جوارمیں آبسیں لہذا داروغہ احمد اللہ خاں صاحب نے
اپنے مکان کے قریب ہی حبیب اللہ خاں صاحب سے کہہ کر ان کا مکان قادری صاحب کو
دلوادیا ۔ کچھ عرصے قادری صاحب ان کے مکان میں رہے اس کے بعد کچھ عرصے تک ڈپٹی
باسط علی خاں صاحب صوفی کے مکان سے متصل داروغہ فریدالدین صاحب مرحوم کے مکان میں
قیام کیا اس کے بعد عمر [illegible] دراز خاں صاحب کے مکان میں جو اسی گلی میں ڈپٹی صاحب
کے مکان کے دوسرے پہلو پر تھا قیام کیا۔ جب مولوی عابد حسن صاحب فریدی عالم گنج میں
حویلی عالم خاں کے متصل جا بسے تو قادری صاحب بھی اس قدر دور کیسے رہ سکتے تھے
لہذا آپ بھی فریدی صاحب کے مکان کے نزدیک ہی حویلی عالم خاں میں منتقل ہوگئے ۔

۱۹۳۵ع میں اسی مکان میں مولوی عابد حسن صاحب فریدی نے داعئی اجل کو لبیک
کہا اور کچھ عرصے بعد قادری صاحب بھی وہاں سے مسجد معتمد خاں کے سامنے گڑہ خان
خاناں میں آبسے اور کراچی آنے سے قبل ۱۹۵۵ع تک اسی مکان میں قیام رہا ۔

مولانا قادری کی شخصیت :

عام طور پر دیکھا جاتا ھے کہ لوگ "پدرم سلطان بود" والی مثل پر عمل کیا کرتے ھیں اور ان کے قول و فعل میں مناسبت و مطابقت بہت کم ھوا کرتی ھے ۔ وہ شاید بھول جاتے ھیں کہ انسانیت ھی سب سے بڑا حسب نسب ھے اور بقول ایک مغربی مفکر کے کردار ھی ایک ایسا شجر ھے جس کے سائے تلے انسان کی شخصیت پروان چڑھتی ھے مقصد یہ کہ انسان کی سیرت ھی وہ معیار ھے جس کی بدولت کسی انسان کی عظمت و بزرگی ، ذلالت و پستی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ھے ۔ انسان کا کردار اور اس کی ظاھری شخصیت ھی عام طور پر اس کی زندگانی کا ترجمان ھوا کرتے ھیں۔ اس کا اسلوب نگارش و تخیلات اور طرز گفتار بھی اس کی فطرت کے آئینہ دار ھوتے ھیں کسی حد تک لباس کی وضع قطع بھی اس کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد و معاون ھوا کرتی ھے لہذا مولانا حامد حسن قادری کی شخصیت کے سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بہتر ھے کہ میں ھند و پاک کے نامور ادیب و ناقد پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے ذریعہ الفاظ میں کھنچی ھوئی مولانا حامد حسن قادری کی قلمی تصویر ھی آپ کے سامنے پیش کردوں ۔ وہ لکھتے ھیں :

> " خوب گورا چٹا رنگ ، معمولی ناک نقشہ ، موٹی سی عینک لگائے ھوئے سفید نورانی ڈاڑھی ، پست قد ، دبلے پتلے ، چھوٹی پٹی کے چکن کی بہت صاف اور دھلی ھوئی شیروانی ، بٹے کی بیل دار سفید ٹوپی ، جس کا کلف اسی طرح قائم تھا لیکن بخیے دار نہیں دھلی کی سی مولویانہ اور گھری ۔ علی گڑھ کا پاجامہ لیکن ٹخنوں سے اونچا آگری کا سیاہ پمپ شو سے بچے ھوئے ۔" (۱)

یہ تھے مولانا حامد حسن قادری ۔ جامہ زیبی ، نفاست اور بشاشت و فرحت کا

---

(۱) احمد فاروقی ، ڈاکٹر خواجہ : " حامد حسن قادری " ، (مضمون) : " نقوش " ، لاھور : جنوری ، ۱۹۵۵ء ، شمارہ جات ۴۸-۴۷ (شخصیات نمبر) ، ص ۲۸

مجسمہ ان کی یہ نفاست و پاکیزگی اور بشاشت و جامہ زیبی تا زیست یونہی قائم رہی اور یہ سادہ و پروقار شخصیت اپنی گوناں گوں خوبیوں کی وجہ سے آج بھی اسی طرح یاد کی جاتی ہے جیسے دورِ حیات میں پیشِ نظر رہتی تھی ۔ وہ دراصل تکلف و تصنع اور دکھاوٹ و بناوٹ کے قائل نہ تھے مگر اپنی سادگی اور وقار کو ہر حالت میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تمام زندگی تصنیف و تالیف ، تحقیق و تنقید اور قلم و کتاب سے عبارت رہی ہے ۔ شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ بے نیاز و بے پروا رہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب اعلا پیمانے پر اجلاس منعقد کیے جاتے ہیں تو بہت سے نام و نمود کے خواہاں لوگ صدارت یا مجلس استقبالیہ کی ممبری کے ہی جوڑ توڑ میں لگ جاتے ہیں مگر قادری صاحب نے کئی مرتبہ بڑے بڑے مشاعروں اور جلسوں کی صدارت سے لوگوں کے اصرار کے باوجود پہلو تہی کی ۔ وہ صحیح معنی میں ایک عالم با عمل اور درویش صفت انسان تھے ۔ علمی معاملات میں نہایت صاف گو ناقد اور بے لاگ مبصّر تھے۔ ان کی اعلا ظرفی اور وِدّائی کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا بھی علی الاعلان اعتراف کرلیا کرتے تھے۔ وہ احباب کے محب ، غیروں کے مددگار اور طلبہ کے بے حد شفیق استاد تھے ایک اور بڑا وصف ان میں یہ بھی تھا کہ کیسی ہی عظیم المرتبت ،مقبول ترین شخصیت کیوں نہ ہو انھیں بات برملا ، بلا جھجک اور بغیر کسی رو رعایت کے کہہ دینے میں عار نہ تھا خواہ اس کے عواقب و نتائج کچھ بھی ہوں۔

عام دنیوی معاملات میں بھی وہ کس قدر محتاط رہتے اور لحاظ و پاس داری سے کام لیتے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے ، جو ان کی مشہور تالیف " داستان تاریخ اردو" کی پاکستان میں اشاعت کے سلسلے میں واقع ہوا۔ اس کتاب کے حقوق طباعت انھوں نے آگرے کے ایک اشاعتی ادارے کے مالک لکشمی نرائن اگروال کو دے رکھے تھے۔ ہند و پاک کی راہیں مسدود ہونے کے سبب کتابیں پاکستان نہیں آسکتی تھیں اور یہاں بھی کسی قیمت پر دستیاب نہ تھیں۔ یہ دیکھ کر ان ہی کے خانوادے کے ایک عقیدت مند نے جو پاکستان کے

مشہور پبلشرز میں سے ہیں ان کے صاحب زادگان کے ذریعہ سے یہ عرض کرانا چاہا کہ وہ یہاں " داستان تاریخ اردو" کی اشاعت کی اجازت دے دیں کیوں کہ وہ کتاب پاکستان کی یونی ورسٹیوں کی ڈگری کلاسوں کے نصاب میں شامل ہے اور طلبہ کو اس کی بڑی ضرورت ہے - ہندوستان و پاکستان دو الگ مملکتیں ہیں اس کو یہاں شائع کرانے میں کوئی قانونی قباحت بھی نہیں اور جب خود مصنف یا مولف اجازت دے تو کوئی بات ہی پیدا نہیں ہوتی۔ رمضان شریف کا مبارک مہینہ تھا افطار کے وقت حسب معمول عقیدت مندان، تلامذہ اور صاحب زادگان سب جمع تھے۔ افطار کے بعد سب نے نماز ادا کی اور دسترخوان بچھ گیا۔ گفتگو کا سلسلہ چھڑا اس وقت ان کے صاحب زادگان میں سے ایک نے کہا :" میاں! آپ " داستان تاریخ اردو" یہاں شائع کرانے کی اجازت دے دیں۔" اتنا سننا تھا کہ قادری صاحب نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور نہایت برہمی سے کہا :" اچھا تو گویا اب آپ زندگی کے ان آخری ایّام میں مجھ سے بد دیانتی کرانا چاہتے ہیں۔ میں اس کے جملہ حقوق لکشمی نرائن کو سونپ چکا ہوں - اب کتاب ان کی اجازت سے تو چھپ سکتی ہے مگر میری اجازت سے نہیں -"

اور اس کے بعد باوجودیکہ دن بھر روزہ سے تھے اور سب کا شدید اصرار تھا مولانا نے کھانا نہیں کھایا اور خفگی کا اظہار کرتے رہے بعد میں یہی کتاب کراچی میں شائع ہوئی مگر اس وقت جب ان کے صاحب زادے ڈاکٹر خالد حسن قادری نے آگرے سے لکشمی نرائن اگر وال کا تحریری اجازت نامہ ان کی خدمت میں پیش کردیا۔

لہذا دنیاوی معاملات میں بھی ان کا ایسا محتاط اور معاملہ کا سچّا ہونا اور وہ بھی ایک غیر ملک اور غیرمذہب کے آدمی کے ساتھ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ ایک مومن و خداترس اور شان استغنا کے مالک تھے -

عموماً ایسے لوگ کم ہی نظر آتے ہیں جو کہ سختی کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم رہیں۔

لیکن بڑے انسانوں کی بڑائی کا ایک راز یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی خوف ، لالچ یا مفاد کی خاطر ذاتی اصولوں کا سودا نہیں کرتے ۔ قادری صاحب کے کردار میں یہ بات شامل تھی کہ جو بات منہہ سے نکلتی تھی نہایت ہی مناسب اور با اثر ہوتی تھی اور پھر وہ اس پر آخر تک قائم رہتے تھے مگر علمی و ادبی مجالس میں بطور کسر نفسی اور اخلاقاً اپنی غلطیوں کا برملا اعتراف کرلیا کرتے تھے ۔ وہ زندگی کے اور تمام ہنگاموں سے بھاگتے مگر علم و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ وہ ادبی جلسوں ، مشاعروں اور نشستوں میں شرکت کرنے سے بہت گھبراتے تھے کیوں کہ اس سے ان کے اوراد و وظائف اور علمی کاموں میں خلل واقع ہوتا لہذا یہ ادبی ہنگاموں سے بے زاری کسی کبر و نخوت کے سبب ہرگز نہیں تھی اس کی وضاحت ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کے قول سے بھی ہو جاتی ہے :

" مولانا حامد حسن قادری کچھ عمر اور کچھ تصوف کے سبب جیتے جی علائق دنیاوی سے اپنا رشتہ توڑچکے تھے ۔" (۱)

اور حقیقت یہی ہے کہ قادری صاحب ایک عالم باعمل تھے جن کے دل میں عشق رسول کی شمع روشن تھی ۔

وہ ایک درویش ، عارف باللہ ، صوفی با صفا اور فطری طور پر عاشق رسول اور عاشق خدا تھے جس کا اندازہ ان کے کلام سے بخوبی ہوسکتا ہے ۔ ان کے عادات و خصائل کے سلسلے میں مرزا مظہر جلیل شوق بیان کرتے ہیں :

" قادری صاحب اک ایسا پیکر انسانی تھے جس کی نگاہوں میں حسن ، دل میں خلوص ، طبیعت میں نزاکت ، مزاج میں صفائی ، جسم میں رعنائی چہرے

---

(۱) کشفی ، ڈاکٹر سید ابوالخیر ، " ہمارے عہد کا ادب و ادیب " ، کراچی : جاوید پریس ، ۱۹۷۱ء ، ص ۱۰۸

پر شگفتگی اور عادتوں میں دل ربائی وہ اوصاف ھیں جو صرف اسی ھستی میں
پیدا فرمائے جاتے ھیں جس کو اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت اور محبت میں
والہیت بھی عطا فرمائی گئی ھو۔"

وہ صرف ایک ادیب و عالم ھی نہ تھے بلکہ ایک عارف حق مگر بھی تھے گو کہ

وہ سلسلۂ نقشبندیہ قادریہ سے منسلک تھے مگر قادری کہلاتے تھے اس سلسلے میں پروفیسر

محمد ایوب قادری بیان کرتے ھیں :

" ایک روز میں نے قادری صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت آپ تو
نقشبندی مجددّی طریقے کے صاحب سلسلہ شیخ ھیں پھر نقشبندی کی بجائے
قادری کیوں لکھتے ھیں ۔ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ " بھئی یہ اس
وقت کی بات ھے جب میں نہ قادری تھا اور نہ نقشبندی ۔ میں نے جب لکھنا
شروع کیا اور میری چیزیں اخباروں اور رسالوں میں چھپیں تو میں نے اپنے نام کے
ساتھ کوئی نسبت لگانی ضروری سمجھی اور قادری لکھنا شروع کردیا۔ چناں چہ
اس روایت کو نبھا رہا ھوں۔"

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ مولوی سید حامد علی صاحب نے یوں بیان کیا ھے:

" ایک روز مولانا حامد حسن قادری ، مولانا عابد حسن فریدی اور
مولوی محسن فاروقی اور ظہیر عالم چشتی (وکیل) وغیرہ سب صاحبان بیٹھے
ھوئے تھے اور گفتگو ھورھی تھی کہ انگریز عام طور سے اپنے ناموں کے ساتھ اپنا
(Surname) نسبتی یا تعلقی نام بھی لکھا کرتے ھیں ھمیں بھی
اپنے لیے کوئی اس قسم کا نام تجویز کرلینا چاھئے تو سب کے مشورے سے یہ طے پایا
کہ مولوی محمد محسن صاحب اپنے نام کے ساتھ فاروقی لکھیں گے کیوں کہ وہ
حضرت بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ھیں اور ان کا
سلسلۂ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ سے ملتا ھے ۔ اور مولوی
عابد حسن صاحب اپنے نام کے آگے فریدی لکھیں گے کیوں کہ وہ بھی حضرت بابا
فرید گنج شکر کی اولاد میں سے ھیں۔ قادری صاحب کا بھی سلسلہ نسب تو
یہی تھا مگر انھیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے بے انتہا

عقیدت تھی اسی لیے انھوں نے اپنے لیے قادری کی نسبت کو پسند کیا اب رہے ظہیر عالم صاحب (وکیل) انھوں نے بتایا کہ مجھے تو خواجۂ اجمیری حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے گہری عقیدت ہے لہذا میں چشتی بننا پسند کرتا ہوں اور اس طرح یہ نسبتی یا اضافی ناموں کا سلسلہ طے ہوا اور پھر ان کے بعد ان کی اولاد امجاد بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتی رہی۔"

بعض مشاہیر سے مولانا کے بڑے پرخلوص و دوستانہ مراسم تھے مگر اپنی گوشہ نشینی کے سبب پہلوتہی کرتے رہتے ۔ اپنی اس عزلت گزینی کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں :

" بہت سے لوگوں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا اور انھوں نے بھی بہت سے لوگوں کو نہیں دیکھا ۔ ارباب سیاست میں انھوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد ، پنڈت پنتھ، آصف علی، محمد علی جناح ، لیاقت علی خاں وغیرہ بہت سے لیڈروں کو نہیں دیکھا گاندھی جی کو بھی پہلی اور آخری بار اس وقت دیکھا جب وہ ۱۹۳۰ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ کے ڈائس پر آکر بیٹھے تھے۔" (۱)

اسی طرح ادبی جلسوں یا مشاعروں میں جانے سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی ان کی شہرت کے سبب مختلف ادبی انجمنیں اور سوسائٹیاں اپنے سالانہ جلسوں کی تقریبات کی صدارت کے لیے کہتے تو وہ نہایت خوش اسلوبی سے ٹال دیتے ۔ بقول مولوی سید حامدعلی " ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ افکار نے کراچی میں " جشن جوش " کے موقعہ پر ایک شان دار نمبر نکالا اور اس موقعہ پر ایک شان دار تقریب کا پروگرام بھی ترتیب دیا گیا ۔ صدارت کے لیے قرعہ فال قادری صاحب کے نام نکلا اس تقریب کے روح رواں معین الحق صدیقی ، پیر حسام الدین راشدی اور مولانا رازق الخیری وغیرہ نے مل کر مولانا حامد حسن قادری صاحب سے درخواست کی کہ عہدۂ صدارت کو قبول فرمائیں مگر قادری صاحب نے اپنے روائتی

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "خودنوشت حالات"، " اردو نامہ"، محولہ بالا، ص ۲۹

انداز میں انھیں ٹال دیا اور مسکراتے ہوئے کہا :" بھئی میں تو ہمیشہ سے جشن و جلوس سے بھاگتا رہا ہوں اور اب آخر میں کیا اس جشن جوش میں شرکت کروں گا؟ "

اکثر یہ بھی ہوا کہ ملک کے موقر اخبارات و رسائل کے نمائندے آپ کا انٹرویو لینے آتے آپ سب سے نہایت ہی پر خلوص انداز سے ملتے اور خوب خاطر تواضع کرتے مگر انٹرویو دینے کو ہرگز تیار نہ ہوتے اور وہ بھی آپ کی منشاء و بزرگی کے آگے مجبور ہوجاتے ۔ "

ریڈیو پاکستان کے پروگرام منیجر جمیل زبیری جو سینٹ جانس کالج آگرہ میں مولانا کے شاگرد رہے ہیں بتاتے ہیں :" ۱۹۴۹ء میں جب آپ پاکستان آئے تو اپنے ایک عزیز راز مرادآبادی سے ملنے کے لیے ریڈیو پاکستان کراچی آئے ۔ راز صاحب نے ان کا تعارف ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان سے کرایا اس وقت وہاں کچھ اور بھی اہل علم و فن حضرات موجود تھے جنھوں نے اصرار کیا کہ قادری صاحب اپنی کوئی تقریر ریکارڈ کرائیں مگر قادری صاحب اس موقعہ پر راضی نہ ہوئے اور معذرت کرکے واپس چلے آئے ۔ "

جہاں تک ادبی جلسوں اور مشاعروں کی صدارت کا تعلق ہے اس سلسلے میں مولانا قادری خود یوں رقم طراز ہیں :

" ادبی جلسوں اور مشاعروں میں لوگ حامدحسن قادری کو صدر بنانا چاہتے ہیں اور ان سے تقریر کرانا چاہتے ہیں ۔ مقالے پڑھوانا چاہتے ہیں مگر یہ ہرکام سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ دہلی، آگرہ ، علی گڑھ وغیرہ میں یوم مومن، یوم اصغر ، اور یوم نظیر منائے گئے دو بڑے ادبی جلسے ہوئے حامد حسن قادری کو بھی مدعو کیا گیا بعض منتظمین نے خود آگرہ آکر اصرار کیا لیکن انھوں نے لکھنا پڑھنا تو درکنار خاموش شرکت بھی نہ کی ۔" (۱)

قادری صاحب کی ذات اک مجموعۂ خوبی ہائے گوناگوں تھی ۔ نماز کے علاوہ

---

(۱) حامدحسن قادری، مولانا " خودنوشت حالات"، " اردو نامہ"، محولہ بالا، شمارہ ۱۹، ص ۳۱

وہ دو تین باتوں کے نہایت سختی سے پابند تھے خواہ کچھ ہو مگر ان میں شاذ و نادر ہی فرق آتا تھا۔ اول چہل قدمی کرنا دوم روزنامچہ میں لکھنا۔ " کم خوردن و کم گفتن و خوابش حرام" والا مقولہ بھی ان پر صادق آتا تھا ۔ کہیں کہ ان کی خوراک بہت مختصر سی تھی ۔ صبح ھلکے سے ناشتے کے بعد وہ چائے پیتے ، ناشتے میں تھوڑا سا انڈے کا حلوہ اور ایک چھوٹا سا نرم بن (Bun) شامل ہوتا ۔ انڈے کے ذریعہ بنائی جانے والی اور دوسری چیزوں میں اس کا حلوہ انھیں بہت مرغوب تھا۔ کھانے میں چاول اور گوشت خوب پسند تھے مگر غذا کے معاملے میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ ایک آدھ چپاتی یا آدھی پلیٹ چاول حالاں کہ دسترخوان پر رنگارنگ کھانے چنے ہوتے تھے ۔ سیخ کے کباب ، کیک ، پڈنگ ، جیلی ، دھی بڑے وغیرہ بھی ان کو بہت پسند تھے اور اکثر شام کے وقت جب ان کی والدہ ماجدہ عصر یا مغرب کی نماز کے لیے باورچی خانے سے اٹھ کر جاتیں تو قادری صاحب باورچی خانے پر قابض ھوجاتے اور ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی مرغوب غذا کے تیار کرنے میں لگ جاتے۔تھ (١)

کھیل کود سے انھیں بچپن ھی سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ ان کی تمام زندگی ھی قلم و کتاب سے عبارت رھی ہے وہ پڑھنے اور مدام پڑھنے کے قائل تھے ۔ شب و روز پڑھنے اور لکھنے کے علاوہ کوئی اور کام ھی نہ تھا ۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک وہ ہوتے اور کتابیں۔ وہ نایاب و نادر کتابیں دوستوں اور احباب کو خطوط لکھ لکھ کر بھی منگواتے اور خود بھی جمع کرنے کی جستجو میں لگے رہتے اور سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے تمام عمر دشت علم و ادب کی سیّاحی میں گزار دی ۔ تمام عمر نہ کبھی سنیما دیکھا نہ تھیٹر ، نہ کوئی کھیل کھیلا ، نہ کسی سے کوئی بازی لگائی ۔ زمانہ طالب علمی میں بھی وہ کھیلوں

---

(١) بحوالہ مولوی سید حامد علی صاحب ہیڈ مولوی" وکٹوریہ انٹرکالج"، آگرہ

اور موجوں سے کنارہ کش رہے - شعر ، تاش اور شطرنج جیسے کھیلوں سے بھی ان کو کوئی مس نہ تھا البتہ روزانہ تین چار میل تک چہل قدمی کرتے اور بقیہ تمام دن کالج میں یا کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوجاتا -

قادری صاحب کے ڈائری لکھنے کے شوق کے متعلق ان کے صاحب زادے راشد حسن قادری لکھتے ہیں :

" روزانہ معمولات میں ڈائری لکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا سالہا سال سے ان کا یہ طریقہ رہا کہ روزانہ رات کو ڈائری لکھتے اور یہ ڈائریاں اب ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں - ان ڈائریوں میں گھریلو زندگی اور روزمرّہ کے علاوہ ادبی مسائل اور مختلف لوگوں سے متعلق ان کی رائیں ہیں وہ ڈائری لکھنے کا بڑا اہتمام کیا کرتے - ہر سال نومبر یا دسمبر میں نئی ڈائریاں منگوالیتے اور اس کے لیے تاریخوں سے مزّین سرورق بناتے اور سادے ورقوں پر لوگوں کے پتے اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کرلیتے .... ان ڈائریوں میں اپنی پیدائش کا حال ، خاندان میں گذرے ہوئے واقعات ، مختلف مقامات کے سفروں کا حال یہاں تک کہ حج کا حال جو انھوں نے ۱۹۳۲ء میں کیا پڑھنے کو ملتا ہے -" (۱)

قادری صاحب کو تصویریں کھنچوانے کا خاص شوق تھا - وہ سال میں کئی مرتبہ اپنی تصویریں کھنچواتے اور انھیں اپنی ڈائریوں میں چسپاں کرلیتے - عام طور پر بے تکلف (Natural) تصاویر انھیں بہت پسند تھیں - ان کی سینکڑوں تصاویر اب بھی یادگار کے طور پر موجود ہیں - تصویریں کھنچوانے سے ان کو اس قدر شغف تھا کہ سائیکل پر سوار ہیں تو تصویر اتروالی - چارپائی پر بیٹھے ہیں تو تصویر ، کسی باغ کی سیر کر رہے ہیں تو تصویر ، کسی نے کوئی تحفہ پیش کیا تو تصویر ، غرض یہ کہ وہ موقعہ بہ موقعہ اپنی تصویر کھنچواتے رہتے اور اپنے پاس محفوظ رکھتے - مگر انھوں نے یہ تصاویر

---

(۱) راشد حسن قادری ، " مولانا حامد حسن قادری " ، " جنگ " ، کراچی : ۳ جولائی ، ۱۹۶۶ء ، ص

نہ کبھی کسی دوست یا رشتے دار کو بھیجیں اور نہ کسی اخبار یا رسالے میں چھپوائیں شاہ اینڈ کمپنی آگرہ نے جب ان کی کتاب " نقد و نظر" شائع کی تو اس بات پر بڑا اصرار کیا کہ سرورق کے بعد قادری صاحب کی تصویر بھی شائع کی جائے ۔ اور جب پبلشر عو بہت بہ ضد ہوئے تو قادری صاحب نے فرمایا " کہ اچھا آپ فکر نہ کریں ، " میری تصویر" ضرور شائع ہوگی" اور پھر میری تصویر کے عنوان سے مختصر سی مندرجہ ذیل عبارت اور ایک قطعہ لکھ کر ان کو دے دیا۔ انھوں نے وہی من و عن شائع کردیا۔ ملاحظہ فرمائیں :

" میری تصویر "

" نقد و نظر" کے پبلشر عو سعید بشیر احمد شاہ صاحب مالک شاہ اینڈ کمپنی آگرہ کا بڑا اصرار تھا کہ میری تصویر بھی کتاب میں شامل ہو۔ یہ فرمایش پہلے بھی چند رسالوں کے ایڈیٹر کرچکے ہیں لیکن مجھے کبھی اپنی تصویر شائع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی - میرا جو جواب پہلے تھا وہی اب بھی ہے ــــ

وہ چھپواتے ہیں اخباروں میں تصویر
ذرا حضرت کو آئینا دکھانا
دکھا سکتے نہیں دل کی سیاہی
تو بالوں کی سفیدی کیا دکھانا " (۱)

بہرکیف تصویر کشی کا یہ سلسلہ ۱۹۰۲ع سے لے کر ۱۹۵۷ع تک جاری رہا اور اس عرصے میں انھوں نے بے شمار تصاویر کھنچوائیں وہ خود بھی ایک اچھے فوٹو گرافر تھے اور اکثر دوسروں کی تصویریں خود اتار کر دھوتے اور پرنٹ کرتے رہتے تھے - عورتوں، بچوں اور بزرگوں کی تصاویر کو وہ الگ الگ لفافوں میں احتیاط سے بند کرکے رکھا کرتے تھے۔ان کو تصویر کشی سے جو والہانہ دل چسپی تھی اس کا ذکر خود انھوں نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے:

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا" نقد و نظر"، آگرہ (بھارت) : اخبار پریس آگرہ ، ۱۹۳۲ع ، ص سرورق

" ایک خوبی یہ حامد حسن قادری میں یہ ہے کہ وہ اپنی تصویر چھپوانا پسند نہیں کرتے - اپنی کسی کتاب میں باوجود پبلی شروں کے اصرار کے کبھی اپنی تصویر شامل نہ کی - مختلف رسائل نے تصویر مانگی مگر نہ بھیجی لیکن حقیقت یہ ہے جس کا اعلان پبلک میں پہلی مرتبہ ہوتا ہے کہ حامد حسن قادری کو تصویر سے صرف شوق و دل چسپی ہی نہیں عشق و شغف ہے - وہ صرف مشاہیر ملک و قوم یا ارباب علم و فن یا مناظر فطرت کی تصاویر بلکہ خود اپنی تصویروں کو بنایا، دھویا اور چھاپا ہے - لوگوں کو تعجب ہوگا کہ جو شخص کہیں جاتا نہیں، ملتا جلتا نہیں، تصویر چھپواتا نہیں، اس کو اپنی تصویر کھنچوانے کا کیا موقعہ و محل لیکن شوق جو ٹھہرا-" (۱)

قادری صاحب ایک نہایت ہی باذوق اور سلیقہ شعار انسان تھے ان کے ہرکام سے ایک نفاست اور شائستگی جھلکتی نظر آتی تھی - کتابوں کی ترتیب اور جامہ زیبی کے معاملے میں بہت محتاط تھے کتابوں کی بڑی حفاظت کرتے اور لباس بھی ہمیشہ صاف ستھرا پہنتے گھر میں بچوں کو بھی صاف ستھرا لباس پہنانے کی تاکید کرتے جس پر سختی سے عمل کیا جاتا - اگر ڈائری لکھنے بیٹھتے تو بھی سو سو تکلفات کو برتتے - اگر کسی رسالے میں کوئی مضمون، نظم، یا غزل پسند آجاتی تو اسے بڑی خوب صورتی اور احتیاط سے کاٹ کر ڈائری میں چسپاں کرلیتے - انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے لے کر اب تک جو مقالات، مضامین، نظمیں اور غزلیں وغیرہ رسائل کو دیں اور وہ شائع ہوئیں ان سب کے تراشے ایک خوب صورت جلد میں ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی بھی کام میں بد سلیقگی کو پسند نہ کرتے تھے -

****

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " خود نوشت حالات"، " ارو نامہ "، محولہ بالا، ص ۳۲

دوسرا ۔ باب

مولانا قادری کے اسلاف اور

بھیراپچی تہذیب و تمدّن

دوسرا - باب

مولانا قادری کے اسلاف اور

بچھرایوںی تہذیب و تمدّن

"بچھرایوں ضلع مراد آباد کا ایک قصبہ ہے - تحریر میں عموماً اسے بچھرایوں ہی لکھا جاتا ہے مگر اس کا صحیح تلفظ " بچھراؤں" ہے - جیسے بدایوں لکھتے ہیں اور بولتے ہیں " بداؤں" - اسی طرح تحریر میں علی گڈھ اور اعظم گڈھ لکھتے ہیں اور بولنے میں یہ بھی " علی گڑھ " اور " اعظم گڑھ " بولے جاتے ہیں-" (۱)

جہاں تک مولانا قادری کے اسلاف کا تعلق ہے ان کا ذکر آگے آئے گا - یہاں بچھرایوں کی تہذیب و تمدّن کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انگریزوں کے ابتدائی زمانہ میں یہاں مولویوں اور چودھریوں کے خاندان آباد تھے- جن کا کام زمین داری اور تعلیم وتعلّم تھا- شام کو سب ایک جگہ جمع ہوتے ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں - مسائل حاضرہ پر تبصرہ ہوتا، تنازعوں و مقدمات کے سلسلے میں فیصلے دیے جاتے اس کے ساتھ ہی شعر و شاعری ہوتی- فارسی علمی زبان تھی اس لیے اس میں شاعری کرنا بھی شرافت کی ایک دلیل تھی- علم سے تعلق مولوی خاندان کے لوگوں کا ورثہ تھا- یہی سبب تھا کہ اس خاندان کے بیشتر افراد تعلیم و تدریس کی طرف راغب رہے اور زمین داری کی طرف کوئی توجہ نہ دی -

مولانا حامد حسن قادری کے آبا و اجداد موضع ڈھکّہ ، تحصیل حسن پور، ضلع مراد آباد (اتر پردیش ، بھارت) کے تھے- ڈھکّہ فریدی حضرات کا مستقل مسکن تھا- یہیں میں چار پانچ مقامات مستقل اور معدّدہ میں جہاں شیخ شیوخ العالم بابا

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد "مشاہیر بدایوں"، مخطوطہ ، مملوکہ مصنف،ص ۲

فریدالدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد امجاد آکر آباد ہوگئی تھی - ڈھگّہ کے یہ فریدی حضرات پیری مریدی کے علاوہ کاشت کاری اور زمین داری بھی کیا کرتے تھے - بعد میں ان کی حیثیت عموماً کاشت کاروں کی رہ گئی اور جو زمین دار باقی رہے وہ بھی معمولی حیثیت کے -

ان حضرات میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو باہر گئے - تعلیم حاصل کی اور برسرکار ہوئے - مولانا قادری کے جدّ امجد مولوی مقبول عالم صاحب جو پانچویں پشت میں دادا تھے ، یہ ڈھگّہ چھوڑ کر پھھرایوں آگئے تھے- ان کی اولاد یہیں رہی - اور یہاں کے عوام میں پیروں اور مولویوں کے خاندان کے نام سے مشہور ہوگئی - اس کا خاص سبب یہ تھا کہ یہ لوگ مذہب و شریعت کے سختی سے پابند تھے اور اخلاق و کردار بھی مثالی رکھتے تھے- ان میں سے بہت سے لوگ علم و فضل سے آراستہ ہوئے اور انھوں نے مختلف علمی و ادبی اور تعلیمی و تدریسی مشاغل اختیار کیے - زمینیں رکھتے ہوئے بھی ان میں زمین داری اور جاگیر داری کی بو باس نہ آئی بلکہ رفتہ رفتہ زمین داری بھی کاشت کاری تک محدود ہوکے رہ گئی -

پھھرایوں میں اس وقت دوسرے جو خاندان آباد تھے اور جن کو " مولویوں " کا خاندان کہا جاتا تھا - ان سے مولوی مقبول عالم صاحب کے خاندان سے رشتے ناتے ہوئے اور پھر یہ سب مل کر " مولوی" کہلائے - اس وقت پھھرایوں میں دوسرا بڑا قبیلہ چودھری صاحبان کا تھا- یہ دو مسلم راج پوت کہے جاتے تھے- مولویوں اور چودھریوں میں دوستانہ روابط و رواسم بھی تھے- مگر جاگیر دارانہ و زمین دارانہ رقابتیں و مخاصمتیں بھی پیدا ہوتی رہتی تھیں - تیسرا بڑا طبقہ ہندوؤں کا تھا- ان میں زمین داری سے زیادہ ساہوکاری تھی مگر عموماً مولویوں اور چودھریوں ہی کو پھھرایوں کی ناک سمجھا جاتا تھا-

انھی سے بچھرایوں کا سارا بھرم اور نام تھا ۔ ہندو کم تعداد میں تھے اور ان کے مقابلے میں کوئی مرتبہ نہ رکھتے تھے ۔ باقی آبادی مختلف پیشہ وروں اور چھوٹی ذات کے لوگوں کی تھی ۔ یہاں کی کل آبادی عموماً دس سے پندرہ ہزار تک رہی ہے ۔

بچھرایوں میں ایک قدیم مزار بھی ہے جو حضرت حاجی پیر رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ مزار سینکڑوں سال پرانا بتایا جاتا ہے مگر صاحب مزار کا نہ صحیح نام کبھی سننے میں آیا اور نہ ہی صحیح زمانہ معلوم ہوسکا۔ لیکن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ یہاں کے قطب تھے ۔ اب تک ان کے تصرفات نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ہمیشہ سے مشہور ہے کہ بچھرایوں کے لیے انھوں نے دعا کی تھی :

۱- یہاں کبھی شراب خانہ قائم نہیں ہوسکے گا ۔ چنانچہ آج تک کوئی شراب خانہ نہیں۔

۲- اس مقام پر کبھی پیشہ ور و بدکار عورتوں کے اڈے نہ بن سکیں گے ۔ یہ جگہ ان باتوں سے بھی محفوظ ہے ۔

۳- کبھی کسی غیر قوم کا خاندان یہاں آباد نہ ہوسکے گا۔ اور واقعی آج تک کوئی ایسا خاندان یہاں آباد نہ ہوا۔

۴- تقسیم ملک کے بعد کوئی شرنارتھی خاندان بھی یہاں آکے آباد نہ ہوسکا اور بچھرایوں ان کا مرکز نہ بن سکا اور ہر طرح امن و سکون رہا۔ یہ بھی بتایا انھی کی چوتھی کرامت ہے ۔

اتر پردیش (یوپی) ہندوستان کا ایک بڑا صوبہ ہے اور اس کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہر جگہ کم یا زیادہ شرنارتھی آباد ہوئے ، فیکٹریاں اور کارخانے قائم کئے اور کاروباری مرکز بنائے ۔ بچھرایوں سے صرف دو میل دور " دھنورہ" نامی گاؤں ہے ۔ تقسیم ملک سے قبل یہ ایک معمولی سی منڈی تھی۔ تقسیم کے بعد سے وہاں بڑی ترقی ہوئی ۔ بہت سے شرنارتھی خاندان بھی آباد ہوگئے۔ کاروباری مرکز بنا ۔ کارخانے بنے ، آبادی پھیلی اور یہ بچھرایوں سے قریب تر ہوتا گیا۔ بچھرایوں میں بھی شرنارتھی آئے ، کچھ دن رہ کر

کاروبار پھیلانے کی کوشش کی مگر اکتا گئے اور آباد ہونے کا ارادہ ترک کردیا اور آج تک کوئی بھی شرنارتھی یہاں آباد نہیں ہے -

گذشتہ صدی میں" مولوی خاندان" کے بھیراپور میں کئی قبیلے اور خانوادے تھے- حضرت شاہ عبدالغفور صاحب رحمتہ اللہ علیہ اعظم پور کے بڑے بزرگ تھے ان کا شجرۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا - ان کا مزار شریف اعظم پور ہی میں ہے - اعظم پور بھیراپور سے قریب ہی ہے - یعنی ڈھگہ پچیس کوس پر ہے تو اعظم پور اس سے بھی کم شاید پندرہ بیس کوس ہوگا - راستے ہی میں بھیراپور اور اعظم پور کے درمیان ایک گاؤں آتا ہے " کھاوڑی" اسے کھاوڑی شریف کہتے ہیں- اس لیے کہ وہاں ایک بزرگ کا نوگز لمبا مزار ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صحابی تھے - اور اس عہد میں تشریف لائے تھے- اعظم پور شاہی دور میں مشہور مقام تھا - امرائے عہد یہاں رہتے تھے - ابوالفضل اور فیضی کے مدرسے کی عمارت پینتالیس سال قبل تک محفوظ تھی- کہتے ہیں ان بھائیوں نے یہیں ابتدائی تعلیم پائی تھی- بعد میں شہروں میں گئے - اب یہ عمارت تو اصلی حالت میں نہیں البتہ آثار و نشان باقی ہیں -

غرض یہ کہ حضرت شاہ عبدالغفور کی ایک شاخ بھیراپور آکے آباد ہوگئی تھی ان حضرات میں بڑے زمین دار اور بڑے کٹّر اہل علم پیدا ہوئے - حضرت مفتی نوراللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اودھ کی نوابی میں لکھنؤ میں " مفتی اعظم" کے منصب پر فائز تھے - ان کے پوتے مولوی مظہر اللہ صاحب ، تحصیل دار تھے - اور ریاست رام پور میں نواب مشتاق علی خان صاحب کے قبل از وقت انتقال کے بعد (نواب حامد علی خان کی کم سنی کے سبب) منتظم اعلا رہے - یہاں یہ بتادینا بے جا نہ ہوگا کہ ریاست رام پور روہیلکھنڈ کمشنری میں بریلی اور مرادآباد کے درمیان میں لائن پر واقع ہے - کمشنر یہاں وائسرائے

کا نمائندہ یا ایجنٹ ہوا کرتا تھا۔ انرجی جو انتظامیہ ان دنوں میں یہاں قائم کی ،
مولوی مظہر اللہ صاحب اس کے ایک اہم رکن تھے۔ اسی لیے ان کے خاندان کے لوگ اور
قادری صاحب کے والد مرحوم وغیرہ ان دنوں رام پور آکر رہنے لگے تھے۔ اور سرکاری ملازمتوں
پر فائز تھے یا وکالت وغیرہ کرتے تھے۔

مولوی کریم اللہ خاں صاحب ، صدرالصدور (سب جج) تھے - مولوی مقبول عالم
صاحب کے پوتے (مولانا قادری کے پر دادا) مولوی محمود عالم صاحب سرشتہ دار تھے اور
بجنور میں تعینات تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرسید بھی بجنور ہی میں تھے -
دونوں میں اچھے دوستانہ مراسم تھے۔ ہنگاموں کے سبب جب سرسید کو بجنور چھوڑنا پڑا تو
مولوی محمود عالم صاحب کے ساتھ اول پھھرایوں ہی میں آکر مقیم ہوئے جس کا ذکر " حیات
جاوید" میں مولانا حالی نے بھی کیا ہے - ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب ان دنوں
کی سنی ہوئی گھریلو روایت یہ بتاتے ہیں :

" پہلی میں سرسید کی ایک جوتی کہیں گرگئی تھی۔ پھھرایوں
پہنچے تو کیا پہنیں۔ اس وقت کے پھھرایوں میں دلّی کی طرح کی جوتی
کہاں۔ مجبوراً پھھرایوں کے چمار کی بنائی ہوئی ادھوڑی(۱)استر والی
جوتیاں سرسید کو پہننی پڑیں۔ انھوں نے ایسا برا جوتا کبھی کا ہے کو
پہنا تھا بڑی تکلیف ہوتی ہوگی ۔"

مولوی محمد علی صاحب بھی پھھرایوں کے ایک بڑے رئیس تھے - ان کے پوتے
مولوی حامد علی صاحب سے مولانا قادری کی اکلوتی بہن منسوب تھیں۔ یہ مولوی کریم
اللہ خاں صاحب کے پوتے تھے - محمودالحسن صاحب جو کورٹ انسپکٹر ہے - انھی کے

---

(۱) لکھنؤ میں " چمرودھی" بولتے تھے۔

بھائی تھے ۔ خان بہادر مسعود الحسن جو لندن سے بیرسٹرایٹ لا ہوکر آئے اور مرادآباد میں نہایت کام یاب وکالت کی ۔ بعد میں نواب حامد علی خان صاحب کے انتقال کے بعد ریاست رام پور میں چیف منسٹر رہے ۔ مسعود صاحب کی شادی مشہور جج محمد علی صاحب کی دختر سے ہوئی تھی ۔ ان دونوں موخرالذکر حضرات کی پیدائش اگرچہ گذشتہ صدی کی ہے مگر ان کا شمار اسی صدی میں ہوتا ہے ۔

گذشتہ صدی میں بچھراؤں کی مشہور اور عظیم شخصیت مولوی ابراہیم علی صاحب ہیں ۔ ان کے متعلق ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" مولوی ابراہیم علی صاحب بچھراؤں کے بڑے عالم تھے اور بہت بڑے رئیس اور تعلق دار ۔ ان کا فیل خانہ ، بیل خانہ ، کتے خانہ وغیرہ سب ہمارے گھروں کے اطراف میں واقع تھا ۔ اور ان کی زنانہ محل سرا ہمارے مکانوں کے بالکل محاذ میں تھی ۔ بڑے کرّ و فر کے رئیس تھے ۔ داد و دہش کے لیے مشہور تھے ۔ سنا ہے کہ اس زمانے میں حجاز مقدس میں " خیرات و مبرّات و صدقات و خدمات " کے لحاظ سے دو نام سب سے زیادہ مشہور تھے ۔ ایک نواب کلب علی خان والی رام پور کا اور دوسرا مولوی ابراہیم علی صاحب کا (ظاہر ہے کہ نظام حیدرآباد اور والی بھوپال کے نام اس شہرت سے خارج نہ رہے ہوں گے مگر جو سنا وہ بیان کیا) ۔ مولوی ابراہیم علی صاحب کا کتب خانہ بہت بڑا تھا اس میں بڑے بڑے نوادر تھے ۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادگان کی بد انتظامی اور حماقتوں سے ایسی عظیم جائداد اور تعلقہ اور کتب خانہ اور سبھی کچھ تباہ ہوگیا ۔" (۱)

ان اصحاب کے بعد کے زمانے میں جو لوگ ہوئے ان میں مولوی سلطان حسن صاحب ، مولوی قیام الدین صاحب ، مولوی عبدالحفیظ صاحب وغیرہ بڑے زمین دار اور رئیس تھے ۔ ان حضرات کے بعد مولوی عبدالواحد صاحب ، مولوی خلیل الرحمن صاحب وکیل ، مولوی عبدالسلام صاحب ، مولوی عبدالرحمن صاحب اور وحیدالدین شاہ صاحب وغیرہ کے نام آتے ہیں ۔

---

(۱) طاہر فاروقی ، ڈاکٹر مولوی محمد ؛ " مشاہیر بچھراؤں " محولہ بالا ، ص ۳

ان حضرات کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب تحریر کرتے ہیں :

" یہ سب خوش حال اور اچھی حیثیت کے لوگ تھے۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب کی کوٹھی (جو شاہی دور کے محلات کی طرح عمارت در عمارت بنی ہوئی ہے) اور جس کے ملحق عظیم الشان باغ ہے اب تک بدستور قایم ہے اور ان کے عظیم مکانات اور حویلیاں (تقسیم ملک کے بعد) اب اس طرح آباد اور بارونق نہیں رہیں۔ بزرگ وہ تھے جنھوں نے ایسی عظیم حویلیاں بنائیں ۔ اولاد کو اب یہ بھی توفیق نہیں کہ ان کی مناسب مرمت کراسکیں ۔ رفتہ رفتہ سب ویرانی کی طرف مائل ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ ۔" (۱)

مولوی احمد سعید صاحب مولیؒ، ضلع بریلی کے رہنے والے بزرگ تھے مگر بچھرایوں میں قرابت ہونے کے سبب یہیں آن بسے تھے۔ ان کی زنانہ حویلی اور مردانہ دیوان خانہ اب بھی موجود ہے گو مکینوں کی قلت ہے نہ وہ آبادی ہے اور نہ وہ رونق ۔ مولوی احمد سعید صاحب لفٹیننٹ (لیفٹیننٹ گورنر ، یوپی) میں نائب میر منشی تھے ۔

مولوی غلام غوث بے خبر مرحوم جو غالب کے ہم عصر اور دوست تھے وہ میر منشی تھے یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آج صدرالصدور ، میر منشی ، سرشتہ دار یا کورٹ انسپکٹر قسم کے عہدوں کی کوئی وقعت و حیثیت نہیں مگر گذشتہ صدی میں یہی مناصب آج کل کے کمشنر، کلکٹر، منصف اور مجسٹریٹ کے عہدوں کی مانند تھے اور ان کی بڑی اہمیت و عظمت تھی ۔

آخر گذشتہ صدی سے اس صدی کے اوائل تک کے " مولوی خاندان" کے بزرگوں میں مولوی احمد علی صاحب (خلف اکبر مولوی محمد علی صاحب) مولوی خلیل الرحمن صاحب وکیل مرادآباد (خلف اصغر مولوی محمد علی صاحب) ، مولوی عبدالسلام صاحب رئیس ، چیرمین میونسپل بورڈ مرادآباد و بانی عبدالسلام گرلس ہائی اسکول مرادآباد وغیرہ دیگر

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد: " مشاہیر بچھرایوں"، محولہ بالا ، ص ۵

ممتاز ہستیاں ہیں۔

مولوی عبدالحفیظ صاحب مرحوم نے تحریک خلافت میں سرگرم حصّہ لیا۔ اور اس وقت سے جو کھدّر پہننا شروع کیا تو آخر تک اس کو نباہتے رہے ۔ مولوی عبدالسلام صاحب مرحوم نے بچھرایوں میں بستی کے باہر ایک عظیم باغ بنایا تھا جس میں کوٹھی بھی ہے اور " نوبہار" کے نام سے مشہور ہے ۔ مولوی عبدالسلام صاحب کے مرادآباد کے پھٹّی محلے میں دو عظیم مکانات تھے۔ ایسے تھے کہ ان میں سے ایک میں گرلس ہائی اسکول قائم کیا تھا لیکن بعد میں دوسرا مکان بھی اسی اسکول کے لیے وقف کردیا۔ مولوی عبدالسلام صاحب نیشنلسٹ خیالات کے آدمی تھے ۔ کھدّر پہنتے تھے ۔ ان کے مکانوں کی خصوصیت کے متعلق ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" ان کے مکانوں کی یہ عجیب خصوصیت لوگوں کو معلوم نہیں کہ خلافت، اور کانگریس کی سرگرمیوں کے زمانے میں مشہور قومی لیڈروں میں سے شاید ہی کوئی ہو جو یہاں آکے کم یا زیادہ دن قیام پذیر نہ رہا ہو۔ گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، علامہ اقبال، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں صاحب ، سرسکندر حیات خاں، پنڈت موتی لال نہرو، غرض اکابر کی بڑی فہرست ہے جنھوں نے کا یہاں آکے قیام کیا تھا۔" (۱)

بچھرایوں کے لوگ باہر کم جاتے تھے ۔ مگر مولوی مسعودالحسن صاحب بیرسٹر اور مولوی عبدالسلام مستقل مرادآباد میں رہنے لگے تھے۔ اور دونوں یکے بعد دیگرے میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے۔ اگرچہ مرادآباد میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی مگر پھر بھی اس صدی تک وہاں مسلمانوں کا اتنا اثر و رسوخ تھا کہ میونسپل بورڈ کا چیرمین ہمیشہ مسلمان ہی ہوتا تھا۔

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد ، " مشاہیر بچھرایوں" ، محولہ بالا ، ص ۷

مولانا قادری کی جوانی کے زمانے میں بچھرایوں کو یہاں کے مولوی رؤسا اور اکابر کے سبب بڑی عزّت اور شہرت حاصل ہوچکی تھی۔ مولوی قیام الدین صاحب ، مولوی عبدالحفیظ صاحب اور قادری صاحب کے عمّ محترم پروفیسر مولوی محسن فاروقی صاحب اور دیگر رفقاء کی بدولت محض شوقیہ طور پر بچھرایوں میں " بچھرایوں کلب" کے نام سے ایک علمی و ادبی انجمن قائم ہوئی ۔ مولوی خاندان کے سب بزرگ اس کے رکن اور سب نوجوان اس کے کارکن تھے۔ اس صدی کے اوائل میں کلب کی دعوت پر یہاں کئی بڑے جلسے ہوئے جن میں مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اکابرین نے شرکت کی اور ملّی و مذہبی جلسے ہوتے رہے مگر بعد میں یہاں نوجوانوں کی کوششوں سے ڈرامے، مشاعرے، انعامی مقابلے، بیت بازی، اور اسپورٹس وغیرہ بھی ہونے لگے۔ اس کلب کی رونقیں اور سرگرمیاں آخر دسمبر یا مئی و جون کی تعطیلات میں عروج پر ہوتی تھیں کیوں کہ ان اوقات کے علاوہ بیشتر نوجوان اور جوان سال افراد تعلیم یا ملازمت کے سلسلے میں بچھرایوں سے باہر ہوتے تھے۔

کلب کے قیام سے قبل بزرگوں کے دور میں بھی یہ سرگرمیاں ہوتی تھیں مگر یہ صرف " دیوان خانوں کی نشستوں" تک محدود تھیں۔ مولوی مظہر اللہ صاحب کا دیوان خانہ ایسی نشستوں کے لیے سب سے نمایاں اور ممتاز تھا۔ مولوی قیام الدین صاحب، مولوی عبدالحفیظ صاحب، مولوی سلطان حسن صاحب اور مولوی ابوالحسن صاحب کے دیوان خانوں میں نشستیں ہوتی تھیں ۔ کچھ لوگ خاص طور پر ایک ہی محفل میں بیٹھتے تھے۔ اکثر لوگ دنوں یا اوقات کی تعین کے ساتھ ان جگہوں میں آتے جاتے تھے۔

ان محفلوں میں نشست عام طور پر فرش کی ہوتی تھی۔ چاندنیاں ، قالین ، گاؤ تکیے ، صحن میں گرمی کے اوقات میں بیٹھتے تو تکیہ دار اور بغیر تکیے کے مونڈھے اور

کرسیاں ، آرام کرسیاں ہوتی تھیں - پان اور حقّے کا دور بھی چلتا رہتا تھا - چائے ابتدا میں مطلق نہ تھی- بعد میں اس کا رواج ہوجانے پر اس کا دور بھی چلنے لگا-

دیوان خانوں میں یا موسم گرما میں صحنوں میں جو نشستیں ہوتی تھیں عام طور پر خاصی طویل ہوتی تھیں اور عموماً پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے صرف ہوجاتے تھے- ان محفلوں میں ہر طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں- شعر و شاعری، قصّے کہانیاں، ذاتی تجربے، مقامی واقعات، اگر کوئی شاعر موجود ہے تو اس کا تازہ کلام اور اگر کوئی ادیب ہے تو اس کی تازہ تخلیق، اگر کوئی سفر سے واپس آیا ہے تو اس کے تجربات اور باہر کی دنیا کی نئی نئی باتیں- بعض اوقات اخبارات بھی پڑھے جاتے اور سب سنتے تھے ، کبھی اخبارات کی خبروں پر تبصرے ہوتے مثلاً جنگ بلقان، جنگ طرابلس ، پہلی جنگ عظیم کے تازہ حالات -

اسی طرح ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات اور حکومت کے نئے قوانین یا مرکزی اسمبلی کی کارروائیاں اور تقریریں زیر بحث آتیں- ایسے موقعوں پر بولنے والے اگر کئی افراد ہوتے تو وہ بھی باری باری سے آداب گفتگو کو ملحوظ رکھ کر بات کرتے - اس زمانے میں آج کل کی طرح بیک وقت کئی کئی آدمیوں کا بولنا بڑا معیوب تھا- کوئی دوسرے کی بات کو کاٹنے کی کوشش نہیں کرتا تھا- اول ایک بولتا اور دوسرے سنتے - اگر کوئی بات تفصیل طلب یا قابل بحث ہوتی تو سوال و جواب میں مکمل آداب اور توازن و شائستگی برقرار رکھی جاتی تھی- نیا آنے والا محفل میں شامل ہوتا تو آداب و سلام اور خوش آمدید کے باہمی مراسم عمر اور مرتبے کے لحاظ سے ادا کئے جاتے- اسی طرح اگر کوئی درمیان سے اٹھ کر جانے لگتا تو عذر خواہی اور آداب کے ساتھ رخصت ہوتا- اس دوران پان اور حقّے کا دور جاری رہتا- چھوٹے بڑوں کے سامنے حقّہ تو پی ہی نہیں سکتے تھے، پان بھی نظر بچاکے اور چھپاکے کھاتے تھے- البتہ بزرگ یا ان سے ذرا کم عمر کے مگر خاصے بڑے حضرات حقّے اور پان میں شریک رہتے تھے- اس زمانے میں چائے یا سوڈا لیمن وغیرہ کا رواج نہیں ہوا تھا- البتہ گرمیوں کے موسم میں

یہ ضرور ہوتا کہ شربت کا دور چلتا ۔ یا کوئی معزز شخص آکے شامل ہوتا تو اس کی ضیافت کے لیے شربت لایا جاتا جس میں دوسرے بھی شرکت کرتے ۔

مولانا قادری کی نوجوانی یا لڑکپن سے پہلے کے بزرگوں میں کھیل کود کا رواج نہ تھا۔ میدانی کھیل تو متوقع ہی نہ تھے۔ داخلی کھیلوں میں بھی گنجفہ ، شطرنج اور چوسر بھی عام محفلوں میں نہیں ہوتے تھے ۔ بزرگوں میں سے بعض شطرنج کے شوقین تھے۔ بقول مولوی سیّد حامد علی صاحب ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کے والد بزرگ وار پروفیسر مولوی محمد محسن فاروقی صاحب شطرنج کے بہترین کھلاڑی تھے مگر ان کے مخصوص احباب تھے اور وہ صرف انھی کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ وہ بھی اکثر بعض دوسرے احباب کی بیٹھکوں میں ۔ البتہ کبھی ان میں سے کوئی فاروقی صاحب کے یہاں آجاتا تو وہیں بساط بچھ جاتی تھی۔ دوسرے بزرگوں میں فاروقی صاحب جیسے شطرنج کے کھلاڑی دیکھنے سننے میں نہیں آئے ۔

دیوان خانوں میں یا نجی گھریلو محفلوں میں علمی ، ادبی اور شعری گفتگوئیں البتہ اکثر و بیشتر ہوا کرتی تھیں۔ جو اعزّہ باہر کے شہروں میں تھے ، جب وہ بچھرایوں آتے تو ان کی موجودگی میں عموماً ان سے ایسی باتیں سنی جاتیں۔ سوال کئے جاتے۔ اور تشریح و تنقیح طلب کی جاتی۔ اس گفتگو کے دوران چھوٹے اور کم عمر بھی محفل میں موجود ہوتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا تھا۔ کم عمروں کی تربیت اور تعلیم کے لحاظ سے یہ محفلیں نہایت مفید ہوا کرتی تھیں ۔ یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ کم عمر لوگ عموماً خاموش سامع کی حیثیت میں ہوتے تھے۔ ایسا شاذ ہی ممکن تھا کہ ان کے دل میں کوئی خیال اور سوال آئے اور وہ گفتگو میں مداخلت کی جرات کریں اس دور کے طریق و آداب آج کل کے آداب و اطوار سے قطعی مختلف تھے۔ اس زمانے میں آج کل کی سی رد و قدح اور نقد و جرح اور مداخلت بے جا کا تصوّر بھی

سکی نہ تھا۔

غرض کہ نشست و برخاست ، بات چیت ، آمد و رفت ، میل ملاقات میں اس زمانے کے رواج کے مطابق تمام ادب و آداب قایم تھے۔ بچھرایوں اور مرادآباد ہی کیا بلکہ میں شرفا کی محفلوں کا یہی دستور تھا۔ قصبات میں اور زیادہ اہتمام نظر آتا تھا۔ چھوٹے بڑوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے رہتے تھے - تمیز و سلیقہ سے آہستہ آواز میں بات کرتے تھے - بلا سبب اور اونچی آواز میں کوئی بات نہ کرتا تھا۔ اٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے میں بھی مکمل ادب و آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ بچوں کو تاکید تھی کہ سونے سے قبل آیتہ الکرسی ضرور پڑھ لیں اور صبح اٹھ کر سب بڑوں کو سلام کرنا ان کا فرض اولین تھا۔ کوئی شخص گھر سے باہر نکلتا حتی کہ اپنے گھر کے ہی مردانے حصّے یا دیوان خانے میں آتا تو بھی شیروانی اور ٹوپی پہننا لازم تھا۔ ٹوپی گھر کے اندر بھی ہمہ وقت سر پر ضرور رہتی تھی۔

ادب و آداب کی اس بزرگداشت کے سلسلے میں ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کے بیان کردہ چند لطیفے بھی سنا دیئے جائیں تو اس دور کی تہذیب و تمدن کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے -

" ایک بزرگ خاندان گرمیوں کے موسم میں صحن میں تشریف فرما ہیں۔ دوسرے رشتہ دار مختلف عمروں کے مونڈھوں ، چارپائیوں یا کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مئی جون کا زمانہ ہے - ہم لوگ تعطیلات گرما میں بچھرایوں گئے ہوئے ہیں۔ فریدی صاحب مرحوم بھی بیٹھے ہیں اور میں بھی مودب حاضر ہوں - اتنے میں زاہد میاں(۱) آئے - اس وقت کوئی نو دس سال کے ہوں گے - انھوں نے کڑک دار آواز میں " السلام علیکم" کہا۔ چچا میاں مرحوم نے پاس بلایا۔ شفقت سے سرپر ہاتھ پھیرا۔ اور محبت کے اظہار کے بعد کہا" بیٹا! تمہیں یہ

---

(۱) مولوی عابد حسن فریدی ، پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کے صاحب زادے جو آج کل چکوال کالج میں پرنسپل ہیں۔ (مقالہ نگار)

جلاھیں والا سلام کس نے سکھایا ھے ؟ دیکھو جب بڑے کے پاس جاتے ھیں تو
ادب سے جھک کر ھاتھ ماتھے تک لاکر " آداب عرض ھے " کہا کرتے ھیں۔"
زاھد میاں بے بسی سے اپنے والد اور چچا کی طرف دیکھ رھے تھے کہ آپ نے
ھی تو مجھے سلام کا یہ طریقہ سکھایا ھے ۔ اب دفاع کیجئے نا ! مگر ھماری
کیا مجال تھی جو یہ حرکت کرتے کہ ایسا کرنے سخت بے ادبی میں داخل تھا۔
یہ تقریباً آج سے سینتالیس سال قبل کی بات ھے ۔"

انھی دنوں کا ایک لطیفہ یہ ھے کہ انھی بزرگ کے دونوں بڑے صاحب زادے (اب
تو دونوں مرحوم ھوچکے ھیں۔ مجھ سے دونوں ھی بہت بڑے تھے مگر قادری صاحب سے چھوٹے)
مئی جون کا مہینہ اور گرم شیروانی پہنے پھرتے تھے۔ بغیر شیروانی کے باھر آنہیں سکتے تھے۔
اور شیروانی کے سارے بٹن مع کالر کے ھک کے بند۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا تو سخت تعجب
ھوا ۔ کسی اور سے سبب دریافت کیا۔ جواب ملا کہ ان کے پاس ٹھنڈی شیروانی نہیں ھے
اس لیے کہ باپ نے بنوائی نہیں ۔ اب مجبور ھیں کہ باھر آئیں تو گرم شیروانی پہنیں ۔
اس لیے کہ بغیر شیروانی کے باھر نکلنا (خود اپنے مردانے میں بھی) سخت عیب ھے۔
یہ ملحوظ رھے کہ یہ بہت اچھے خوش حال گھر کا ذکر ھے ۔ ھماری مالی حیثیت سے ان
کی مالی حیثیت بدرجہا بہتر تھی ۔ پھر یہ بھی خیال کیجئے کہ یہ حضرات جو ان عمر
کے تھے ۔ خود کپڑا بزاز سے منگواکے سلوا سکتے تھے ۔ مگر یہ بات بھی وضع ، رسم اور
ادب کے خلاف ھوتی ۔

انھی بزرگ کا ذکر ھے اور زمانہ بھی اب سے وھی تقریباً پچاس سال پہلے کا ھے ۔
کہ ایک بار (عزیزوں میں سے ایک صاحب) حکیم مشتاق احمد صاحب دھلی سے ھوکے آئے
تو انھوں نے ذکر کیا کہ حکیم اجمل خاں صاحب کے ھندستانی دواخانے نے طلائے ماثم
(سنہال سچا) بنایا ھے ۔ میں بھی ایک شیشی ساتھ لے آیا ھوں ۔ طلائے ماثم بڑی
مقوی چیز ھے ۔ خالص ھو تو اس کی خوراک بہت احتیاط سے استعمال کراتے ھیں ۔ ان

چچا صاحب نے سنتے ہی فرمایا۔" تو پھر لاؤ دیکھیں" اب حکیم مشتاق احمد صاحب گھبرائے مگر تعمیل ارشاد سے چارہ نہ تھا۔ گئے اور شیشی لے آئے - اس کی قوّت اور خوراک کے چند قطروں کی بابت طرح طرح سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے رہے - اس وقت صبح کا ناشتہ جاری تھا۔ (یہ بزرگ رئیس ناشتے کو خود بھی طول دیتے تھے - اور اس لیے بھی اس کی طوالت بڑھ جاتی کہ جو کوئی نیا آدمی آتا، حکم ہوتا کہ چائے اور لاؤ ، فلاں چیز اور لاؤ وغیرہ وغیرہ) غرض چچا میاں نے شیشی لے لی - باتیں کرتے اور سنتے رہے - پھر چائے کی چمچی اٹھائی اور اس میں سے اس سیّال سونے کو انڈیلنے لگے - مشتاق بھائی مرحوم نے اب پھر خوراک کے چند قطروں پر اصرار کیا۔ چچا میاں نے پورا چمچہ بھرا۔ اور غٹ سے پی گئے - مشتاق بھائی کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا دوسرا جاتا تھا۔ مگر یہ مجال نہ تھی کہ زبردستی ان کا ہاتھ پکڑلیں۔ یہ بھی بڑی جرات کی بات تھی کہ بار بار طلائے ماہم کی خوراک میں احتیاط کا ذکر کرچکے تھے۔ غرض ایسے لطائف بہت ہیں۔ اس صدی کے تیسرے دہے تک پھلواری میں جو ادب و آداب قائم تھے ان کا اندازہ ان لطیفوں سے بھی ہوسکتا ہے -" (۱)

یہ تمام باتیں اور لطائف بیسویں صدی کے اول ربع سے متعلق ہیں - بیسویں صدی کے اول ربع کے بعد یعنی ۱۹۳۰ء کے بعد سے پرانے ادب و آداب میں جو تغیر رونما ہوا اس کی رفتار بڑی تیز تھی۔ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تو یہ رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی - نئی روش اور مغربی تہذیب کا سیلاب اپنے ساتھ تمام پرانی اقدار کو بہا کر کہیں سے کہیں لے گیا۔ اسی سے متاثر ہوکر تو مجبوراً اکبر الہ آبادی کو کہنا پڑا :

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قایم   رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد، "مشاہیر پھلواری"، محولہ بالا، ص ۱۳

اور پھر قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے کھروں میں جو انقلاب نظر آیا - اس میں زمانے کے ساتھ اس بات کو بھی بڑا دخل ہے کہ یہاں " نو دولتیوں" کی کثرت ہوگئی۔ صنعت و تجارت نے دولت کی ریل پیل کردی۔ پشت پر کوئی " تہذیب اور ثقافت " نہ تھی۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی دوسرے جلد سے جلد بگڑے - حتّٰی کہ وہ بھی جن کے گھروں میں پرانے آداب اور قدیم تہذیب کو دخل حاصل تھا۔ پاکستان میں شہری زندگی صرف چند شہروں تک محدود ہے - اور ان میں ایسے ہی لوگوں کی کثرت ہے - بعض وہ شہر یا بڑے قصبے جہاں پرانے خاندان آباد ہیں، ان میں اب بھی قدیم روایات اور پرانے آداب کم و بیش نظر آجاتے ہیں۔

بچھرایوں میں قدیم رسم و رواج عام طور پر قائم تھے۔ عیدین پر مکمل اہتمام ہوتا۔ شب برات میں حلوا اور آتش بازی دونوں کا خصوصی انتظام ہوتا۔ محرم کے عشرے میں سبیلیں لگتیں۔ کھچڑے کی دیگیں پکتیں نذر و نیاز اور فاتحہ کا خصوصی انتظام ہوتا - البتہ مولوی خاندان کے حضرات تعزیہ داری نہ کرتے تھے۔ مگر اس پر اعتراض بھی نہ تھے بلکہ دوسرے محلّوں میں زیارت کے لیے تعزیوں پر جاتے - اسی طرح عشرہ کے دن جب تعزیے ٹھنڈے کرنے کے لیے کربلا لے جاتے تو سبیلیں لگاتے اور گھروں ہی سے سبھی تعزیوں کی زیارت کرتے - بعض خاندان یہاں ایسے بھی تھے جو ان باتوں اور ان کاموں میں شریک نہ ہوتے تھے - ان میں مولوی سلطان حسن صاحب ، حکیم محبوب حسن صاحب اور مولوی عبدالحفیظ صاحب کے خاندان خصوصیت سے مشہور تھے۔ ان حضرات پر دیوبندی عقائد کا اثر تھا لہذا ان سب کو لوگ " وہابی" کہا کرتے تھے۔

بچھرایوں میں میلاد شریف کی محفلیں بڑے اہتمام اور پابندی سے منعقد کی جاتی تھیں - بڑی محفلوں میں ساری برادری اور تمام خاندان کے لوگ مدعو ہوتے تھے جب کہ

چھوٹی محفلوں میں صرف گھر کے افراد اور قریبی رشتہ دار شرکت کرتے تھے۔ زنانی اور مردانی دونوں طرح کی محفلیں ہوتی تھیں۔ عموماً گھر کے بزرگ و نوجوان ہی " میلاد غلام امام شہید رحمتہ اللہ علیہ" پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں " میلاد اکبر " بھی پڑھا جانے لگا۔ میلاد شریف کی ان محافل کا اہتمام مولانا قادری کی اولاد امجاد نے کراچی میں بھی اسی شان و شوکت سے برقرار رکھا۔ راقم کو بھی اکثر ان محافل میں شرکت کا شرف ملا - یہ اکثر جمعرات اور اتوار کی شب کو منعقد ہوا کرتی ہیں ان میں مولانا کے صاحب زادگان خود ہی میلاد شریف پڑھتے ہیں - کبھی کبھی نوجوان لڑکے اور ننّھے بچّیاں بھی مل کر نعتیں پڑھتے ہیں۔

عشرۂ محرم کی مجالس کے متعلق ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب فرماتے ہیں :

" اکثر گھروں میں عشرۂ محرم میں مجلسیں ضرور منعقد کی جاتیں نیز دوسروں کے ہاں منعقدکردہ مجلسوں میں شرکت کے لیے جاتے تھے - رقص و سرود کی محفلیں مولویوں میں مروّج نہ تھیں (اسے مولویت کا اثر کہہ لیجئے) چودھریوں میں شادی بیاہ کے موقع پر باہر سے گانے بجانے والے ضرور بلائے جاتے۔ اور مولوی گھرانے بھی مدعو ہوتے - مگر بہت کم شرکت کرتے - ہمارے خاندان میں شادی بیاہ وغیرہ میں بھی صرف ایک دوبار امروہہ سے میراثیوں کا بلایا جانا مجھے یاد ہے - مگر اس قسم کی " رعایت" استثنائی بات ہے - عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ بچھرایوں کی ڈائنیں(۱) یا اس طرح کی دوسری عورتیں شادی بیاہ اور عقیقہ و ختنہ وغیرہ قسم کے مواقع پر مع ڈھولک کے محفل سجاتی تھیں۔ جس میں " کبھی کبھی " گھرکی لڑکیاں بھی حصہ لیتی تھیں - مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر " مولویوں کا خاندان اور " مولویت " کا بھرم قایم رکھا جاتا تھا۔ اور اس طرح کی باتیں خرافات میں شامل سمجھی جاتی تھیں۔" (۲)

---

(۱) لکھنو میں " ڈاریں" بھی کہتے ہیں ، جیسے " ڈاری" کی مونث " ڈائن" اور اس کی جمع " ڈائنیں" زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے -

(۲) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد ؛ مشاہیر بچھرایوں"، محولہ بالا ، ص ۱۵

مولانا قادری کا لڑکپن اور طالب علمی کازمانہ رام پور میں گذرا ۔ اس زمانے کی کچھ علمی و ادبی باتوں کا تذکرہ خود انھوں نے اپنے مضمون"موسومہ" حامد حسن قادر (خود نوشت حالات)" میں بھی یوں کیا ہے :

" حامد حسن قادری کو مضامین نثر و نظم لکھنے کا شوق لڑکپن ھی سے پیدا ھوگیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ گھر میں علم و ادب، تعلیم و تعلّم کا ھی چرچا تھا۔ ان کے والد عالم و فقیہ و محدّث تھے۔ فارسی کے شاعر تھے، ضخیم کلیات ان کی یادگار موجود ھے ، تاریخ گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ حامد حسن قادری کو تاریخ گوئی کا شوق ادبھی کا فیضان ھے ۔ ان کے چچا (مولوی محمد محسن فاروقی) اسلامیہ کالج پشاور میں فارسی و عربی کے پروفیسر ادیب و شاعر اور عالم و مصنف تھے۔ ان کے پاس اخبار و رسالے آتے تھے ۔ ان رسالوں کو پڑھ کر حامدحسن قادری کو بھی مضامین لکھنے کاشوق ھوا۔ سب سے پہلے انتخاب لاجواب لاھور میں ۱۹۰۲ع سے لکھنا شروع کیا پھر رسالہ " زمانہ" کان پور میں ۱۹۰۵ع سے"علی گڑھ منتھلی " (علی گڑھ میگزین کا پیش رو) ان کے علاوہ بھی اس زمانے کے اکثر رسائل میں مضامین لکھے مثلاً " زبان" دھلی، " شمس " کلکتہ ، " صبح بہار" میسور، " آزاد" لاھور، " تہذیب " رام پور، " تہذیب نسواں" لاھور۔ یہ تمام مضامین مدرسے و اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں لکھے گئے ھیں۔" (۱)

مولانا قادری کی شخصیت کو نکھار نے اور ان کو علم و ادب کا شیدا بنانے میں رام پور ، بچھرایوں کی تہذیب و ثقافت کا بڑا دخل رہا ھے ۔ اس کا اندازہ مولوی عبداللطیف خاں صاحب کشتہ کے اس بیان سے بخوبی ھوسکتا ھے :

" قادری صاحب نے آنکھ کھولی تو ایک علمی گھرانے میں باپ، چچا، (مولوی محمد محسن فاروقی پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور) سب علمی مشاغل میں مصروف ، مطالعہ" کے عادی اور تصنیف و تالیف کے شوقین ۔ ان کے والدعالم،

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "، حامد حسن قادری(خودنوشت حالات) "، " اردونامہ"، محولہ بالا ، ش ۱۹ ، ص ۳۲

محدث اور ایک کام یاب وکیل ہونے کے علاوہ ایک خوش گو شاعر اور بلند مرتبہ مصنف بھی تھے۔ قادری صاحب کا گھر ، ان کے بزرگوں کے علمی ذوق اور ان کی علم دوستی کی وجہ سے ایک اچھا خاصا " بیت الحکمت " تھا۔ جس میں اہل علم جمع ہوتے ، اخبارات و رسائل آتے اور پڑھے جاتے علمی بحثیں ہوتیں اور ہمہ وقت شعر و ادب کے چرچے رہتے تھے - تعلیم یافتی تو مدرسۂ عالیہ رام پور میں جو اس زمانے کے ہندوستان میں جامعہ ازہر(مصر) کا قائم مقام تھا۔ اور جس کے شہرۂ آفاق اساتذہ اپنے اپنے دائرۂ کمال میں، امام فن کا درجہ رکھتے تھے اور ممالک دور دراز کے شائقین علوم مشرقیہ ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنے کو اپنے لیے باعث فخر جانتے تھے۔" (۱)

مندرجہ بالا اقتباسات سے بچھرایوں کی تہذیبی اور تمدنی و علمی و ادبی اقدار کا بڑی حد تک اندازہ ہوگیا ہوگا - بچھرایوں تہذیب و تمدن کی بڑی خوبی خلوص و سادگی اور اسلاف کی اقدار کو برقرار رکھنا تھا۔ مولانا قادری بھی اس سے بڑی حد تک متاثر ہوئے البتہ تقسیم ملک کے بعد جو انقلاب آیا اس نے ان اقدار کو بڑی حد تک ختم کردیا۔

تقسیم ملک کے بعد جب زمین داری کا خاتمہ ہوا تو مولوی خاندان کی دوسری شاخوں میں جو زمین دار تھے وہ سب بھی اس سے متاثر ہوئے اور حالات میں بڑا انقلاب آگیا۔ جن حضرات کے باغات بڑے اور وسیع تھے ان کے لیے تو باغات بہت بڑا ذریعۂ معاش ہے - اس لیے کہ تقسیم سے قبل جس باغ کی " بہار" (فصل) پانچ سو روپے میں جاتی تھی - اب اس کی قیمت دس سے پندرہ ہزار تک ہوگئی ہے - جن کے باغات چھوٹے تھے یا کم تھے ان کا حال ضرور ابتر ہے -

مولانا قادری کے سب ہم جد کا وطیرہ یہ رہا کہ لکھو پڑھو اور کماؤ کھاؤ اسی لیے ان کے جدی اعزہ میں بڑے اہل علم بھی ہوئےان کے عم بزرگوار پروفیسر مولانا محمد

---

(۱) کشتہ، مولوی عبداللطیف خاں، " مولانا حامد حسن قادری"، " اردو نامہ "، کراچی :جنوری تا مارچ ، ۱۹۶۵ء، ش ۱۹، صص ۹-۸

محسن فاروقی صاحب بڑے روشن خیال اور آزاد منش انسان تھے۔ موصوف نے بچھراین کے عوام کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی خاطر ۱۹۱۳ء میں وہاں ایک مڈل اسکول بھی قائم کیا تھا۔ جو ایک عرصے تک چلنے کے بعد چند وجوہات کی بنا پر بند ہوگیا۔ خاندان کے لڑکوں کے علاوہ پیرزادوں اور چودھریوں کے جن بچوں نے یہاں تعلیم حاصل کی تھی وہ بعد کو یہاں سے مرادآباد کے رضا ڈگری کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی بھی گئے ۔ لیکن مولانا قادری کے خاندان کی تو روایت ہی یہ تھی کہ وہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک پہنچتے ہی تھے ۔ یہاں پاکستان میں بھی مولانا کے صاحب زادوں میں سے ماجد حسن فریدی صاحب نے خاندانی روایت کو قائم رکھتے ہوئے کئی اسکول قائم کئے جس میں سے غیو میتھڈ اسکول کا افتتاح خود قادری صاحب نے فرمایا اور قادری صاحب کی وفات کے بعد قادری صاحب ہی کے نام پر ایک مولانا "قادری اسکول" دستگیر کراچی میں بھی قائم کیا۔

مولانا قادری کے قمؔ بزرگ وار پروفیسر مولوی محمد محسن فاروقی صاحب کے اعلا خیالات اور مخلصانہ جذبات کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ خاندان اور بچھراین کی ترقی کا تو ان کو خیال تھا ہی مگر اسمتھ (Smith) نے اپنی کتاب "تاریخ ہند" (Indian History) میں خاکسار تحریک اور اس کے بانی علامہ مشرقی مرحوم کے لئے اسلامیہ کالج پشاور کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> " ان پر مولوی محمد محسن فاروقی کے خیالات کا بہت اثر پڑا تھا۔
> اور فاروقی صاحب علامہ جمال الدین افغانی رحمتہ اللہ علیہ کے ارادت مندوں
> میں سے تھے ۔"

اسمتھ کے اس حوالے کا ذکر جب پروفیسر مولوی محمد محسن فاروقی کے صاحب زادے جناب ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی سے کیا گیا تو انھوں نے فرمایا :

" علامہ جمال الدین افغانی رحمتہ اللہ علیہ کی تحریروں سے اور تحریک

سے اکثر تعلیم یافتہ روشن خیال مسلمان متاثر تو ضرور ہوئے تھے - مگر میں
اس کی تصدیق نہیں کرسکتا کہ والد مرحوم ان کے ارادت مند بھی تھے۔"

بلکہ اس سلسلے میں انھوں نے پروفیسر مولوی محمد محسن فاروقی صاحب کی روشن
خیالی اور سادگی کی ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا :

" والد مرحوم کی آزاد خیالی کا ایک نمونہ یہ بھی تھا کہ اس صدی
کے دوسرے اور تیسرے دہے میں وہ تعطیلات میں بچھرایوں جاتے۔ ظاہر ہے کہ
زمانہ گرمیوں کا ہوتا تھا - تو شام کو جب وہ مولوی عبدالحفیظ صاحب مرحوم
کے یا کسی اور کے گھر جاتے تو (مقامی روایت و وضع کے خلاف) بغیر شیروانی
کے چلے جاتے تھے۔ لوگوں کو تعجب ہوتا اور ان کے ہم عمر لوگ معترض بھی
ہوتے مگر والد مطلق پرواہ کرتے - یہی عادت ان کی دوسری غلط روایات و
رسوم کے بارے میں بھی تھی۔" (۱)

مولانا قادری کے خاندان کے اکثر افراد خانقاہ نیازیہ بریلی کے ارادت مندوں میں
سے تھے - اس لیے ان حضرات کے یہاں نذر و نیاز، فاتحہ، درود اور میلاد و ذکر اذکار کی
محفلوں کے علاوہ اولیائے کرام اور ■■■ بزرگان دین و بزرگان خاندان کی فاتحہ و ایصال ثواب
کے مواقع پر بھی بڑا تکلف و احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

بچھرایوں کے چودھری خاندان کے لوگوں میں بیشتر حضرات وارثی سلسلے میں تھے۔
ان میں خاص طور پر اوگھٹ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ قابل ذکر ہیں۔ آپ حضرت سیّد
وارث علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے جیّد خلفاء میں تھے۔ اور بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔
ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی فرماتے ہیں :

" حضرت اوگھٹ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ مولوی خاندان میں سب گھروں
سے مراسم قائم رکھتے تھے۔ والد مرحوم سے بہت بے تکلفی اور خصوصیت کی دوستی

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد " مشاہیر بچھرایوں"، محولہ بالا، ص ۲۸

تھی - مجھے ان کا اپنے گھر بہت دفعہ آنا بخوبی یاد ہے -"

پاکستان وجود میں آنے کے بعد حضرت اوگھٹ شاہ صاحب بھی پاکستان آگئے تھے کراچی ہی میں مقیم رہے اور کراچی ہی میں انتقال ہوا- یوں تو پاکستان میں ان کے بہت سے معتقدین و مریدین تھے مگر ان کے پاکستان آنے کا سب سے بڑا سبب جناب غلام محمد صاحب مرحوم گورنرجنرل پاکستان تھے- غلام محمد صاحب وارثی تھے اورحضرت اوگھٹ شاہ صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے- شاہ صاحب کراچی میں ان کے گھر انہی کے مہمان بن کر قیام پذیر رہے تھے-

غرض یہ کہ پرانے بزرگوں کے جو رسم و رواج ، تہذیب و تمدن ، ادب و آداب ، طور طریق ، میل جول ، معاشرت و مراسم ، گھروں اور محفلوں میں خصوصی شعائر کی پابندی، رہن سہن ، رکھ رکھاؤ اور خلوت و جلوت میں جو خصوصیات پائی جاتی تھیں وہ سب بچھرایوں میں بھی طرح نمایاں تھیں اور مولانا قادری کے خاندان (مولویوں کے خاندان) میں یہ تمام باتیں بخوبی نظر آتی تھیں- کراچی آنے پر بھی مولانا نے اپنی ان خاندانی روایات کو اسی طرح قائم رکھا جس کا ذکر اکثر اصحاب نے اپنے مضامین و مقالات میں بھی کیا ہے - لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کے اس زمانے میں اس دور کی تہذیب و تمدّن اور ثقافت و معاشرت کی جھلک نظر آنا تو کیا معنی آج کل کی اس نسل کے لیے اس کا تصّور و تخیّل بھی مشکل کام ہے - البتہ یا تو اوراق پارینہ میں اس کی جھلک ملتی ہے یا کچھ بزرگوں میں اب بھی اس معاشرت و مراسم اور طور طریق کی پابندی کی جاتی ہے -

ooo

تیسرا ۔ باب

========

تنقید

مولانا قادری بحیثیت نقاد

تیسرا - باب

تنقید

مولانا قادری بحیثیت نقاد

فن تنقید :

ادب اور تنقید دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ان دونوں میں ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے - ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اس لیے ہمارے لیے نہایت ہی دل کش و دل آویز اثر ہے اور جب ادب وجود میں آتا ہے تب ہی سے تنقید کا بھی آغاز ہوتا ہے ، یعنی اس کو پرکھنے کا شعور بھی بیدار ہوتا ہے - جس کے لیے بعد میں اصول و قوانین بناکر باقاعدہ فن کے زمرے میں شمار کرلیا جاتا ہے - اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک شاعر و ادیب اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے سے پہلے ہر ایک شعر و جملے کو جانچتا و پرکھتا ہے - اسی طرح وہ اپنی تخلیقات کا پہلا ناقد خود ہی ہوتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا قول ہے :

" جس وقت بھی انسان کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں بات کوفلاں انداز میں نہیں بلکہ فلاں انداز میں کہنا زیادہ بہتر ہے اور جب بھی اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کو فلاں چیز ، فلاں چیز سے زیادہ پسند ہے ، اسی وقت سے تنقید شروع ہوجاتی ہے - دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت ادب کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے تنقید وجود میں آجاتی ہے -" (۱)

وہ نقاد جو کسی ادیب و شاعر کی تخلیقات پر تنقید کرنے کی کوشش کرتا ہے درحقیقت ایک ایسی بات کو زیر بحث لاتا ہے جو زندگی سے نہایت قریب کا تعلق رکھتی ہے - اسی طرح نقاد کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات پر تنقید کرتے وقت خود پر بھی وہی کیفیات و جذبات مسلط کرلیا کرتا ہے جو شعر کہتے وقت ادیب یا شاعر پر مسلط

---

(۱) عبادت بریلوی ، ڈاکٹر، " اردو تنقید کا ارتقا"، کراچی : انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۱ء، ص ۵

رهے هیں گے -

ادب اور تنقید زندگی کی ناطق اقدار هیں۔ تنقید ادب کو سنوارتی و نکهارتی اور زندگی کے تجربات کو واضح کرتی هے - تنقید کی بنیاد اصول و قواعین اور فهم و ادراک پر قائم هے - ادبی تحریروں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکهنے کے بعد جو نتائج برآمد هوتے هیں ان کو بهی اس نظر سے دیکهنا که وه کس حد تک بجا اور درست هیں تنقید هی کا کام هے - ناقد تنقید کرتے وقت اجتماعی و انفرادی ذوق و میلان اور اقدار و وقت کو بهی مد نظر رکهتا هے - تنقید میں ناقد کی فکر و فن اور ذوق و پسند کو بڑا دخل حاصل هے کیوں که اس کے ذریعه هی وه ادب کی فنی حیثیت متعین کرتا اور اس کی قدر و قیمت کا اندازه کرکے ادبی احکام و فیصلے کرتا هے -

ادب اگر ادیب کے جذبات و احساسات کا آئینه دار هے تو تنقید اس کے وجدان کی عکاس - تنقید مادی ارتقا اور ادبی شعور کو زیر بحث لاکر حقائق کو منکشف کرتی اور منطقی استدلال و قیاسات کو عملی زندگی پر منطبق کرتی هے - تنقید کے سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز هیں :

" تنقید کا وجود زندگی کے لیے بہت هی ضروری اور اهم هے اگر انسان کو اچهائی برائی میں امتیاز کرنے کی تمیز نه هوگی، اگر برائیوں کو اچهائیوں میں تبدیل کردینے کا خیال نه آئے گا ، اگر اس کو اس بات کا علم نه هوگا که زندگی کی چیزوں سے زیاده بہتر ، زیاده مکمل ، اور زیاده خوش گوار بن جائے گی اور کن چیزوں سے غیر مکمل اور ناخوش گوار ، اگر اس کا شعور اس پر یه امر روشن نه کردے گا که کن اصولوں پر کاربند هونے میں اس کو طوالت کا سامنا کرنا پڑے گا ، تو گویا اس نے زندگی کی اصلیت اور حقیقت کو سمجها هی نہیں۔ یه خصوصیات هر انسان کے اندر هونی ضروری هیں۔ اسی کو تنقید کہتے هیں۔ اسی کے سہارے وه زندگی کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرتا هے - اور یه تنقید اس کے

مانعوں اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتی جب تک وہ زندگی کو پوری طرح نہ
سمجھ لے ۔ کیوں کہ جب تک زندگی کے متعلق اس کو علم نہ ہوگا وہ اس پر
رائے زنی کیسے کرسکتا ہے ؟ اس کو کسی خاص راستے پر کس طرح لگا سکتا ہے؟
یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ، زندگی کو بغیر پوری طرح سمجھے ہوئے اس کی
تنقید سکی نہیں اور تنقید کے بغیر زندگی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔"(۱)

ادب ماحول اور شخصیت سے وجود پاتا ہے ۔ تنقید ادب کے افادی اور جمالیاتی
پہلوؤں پر نگاہ رکھتی ہے اور پاکیزگی خیال کے ساتھ طرز و اسلوب کی طرف توجہ دیتی
ہے ۔ تنقید فکر و فن کو نکھار کر نظم و ضبط کے اصول سکھاتی اور قلب و ذہن کو
بیداری بخشتی ہے ۔ ناقد صرف ادب کا پارکھ ہی نہیں ہوتا بلکہ ادب کی تخلیق میں
ادیب و شاعر کے ذاتی مشاہدات و مطالعات پر اپنی طبیعت و بصیرت کی بنا پر گہری نظر
ڈالتا ہے ۔ ناقد اقدار کا نباض، تجربات کا مبصّر اور حالات و کیفیات کا شاہد ہونے کے
ساتھ ساتھ داخلی و خارجی حقائق اور عصری میلانات و رجحانات سے بھی بخوبی واقف
ہوتا ہے ۔

تنقید صرف عروس ادب کی مشاطگی ہی نہیں کرتی بلکہ وہ ایک رہبر کی طرح اس
کی رہنمائی اور ایک مصلح کی طرح اس کی اصلاح بھی کرتی ہے ۔ اور نہ صرف یہ بلکہ
وہ ایک ماہر حکیم و معالج کی طرح اسے صحت مند معاشرے سے بھی آشنا کرتی ہے ۔
شاعر یا ادیب کو بھی اکثر بقول سعدی :

" زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"

پر عمل کرنا پڑتا ہے اور یوں وہ دنیا کو بدلنے کی کوشش میں خود کو بھی بدلتا ہے۔
اور پھر اپنے افکار و خیالات اور نقطہ ہائے نظر کو اس انداز سے پیش کیا کرتا ہے جس سے

---

(۱) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، " اردو تنقید کا ارتقا"، محولہ بالا، ص ۲

اس کے جذبات و احساسات کا بھی بخوبی انعکاس ہوتا رہتا ہے اور اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس کے نظریات و خیالات بھی اس سے الگ نہیں۔ نقاد اس کی تخلیقات پر تنقید کرتے وقت یہ بات بھی مد نظر رکھتا ہے کہ اس ادیب و شاعر کے ذہن و دماغ پر کیا کیا افکار و تخیلات مسلط تھے ۔ اس کا ماحول کیا تھا؟ اس کے حالات گرد و پیش کیسے تھے اور اس کے عہد کی اقدار کیا تھیں اور آج ان میں کس حد تک تغیر و تبدل رونما ہوچکا ہے ۔

ماہیت کے اعتبار سے شاعر و نقاد میں کوئی واضح فرق نہیں بلکہ یہ دونوں ایک ہی ہیں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ نقاد عمداً تبصرہ و تجزیہ کا زیادہ ماہر ہوتا ہے جب کہ شاعر اپنے اصول فن اور اسالیب سخن کا غیر شعوری احساس رکھتا ہے۔

نقاد کسی فن پارے کے ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو بھی نظرانداز نہیں کرتا اور انہیں بڑی گہری نظر سے پرکھتا و جانچتا ہے ۔ اس کی نظر میں الفاظ کا زیر و بم در و بست ، لب و لہجہ کی نزاکتیں، معنی کی گہرائیاں اور بلاغتیں سب ہی ہوتی ہیں۔ نقاد میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ شعر و ادب کی ترجمانی کرسکتا ہے یا وہ ان ہی کیفیات و تخیلات کو خود پر محیط کرسکتا ہے ۔ جیسی کہ خود شاعر یا ادیب پر ہوتی ہیں۔ اور اس طرح وہ بہتر طور پر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے ۔

ہمارے ادب میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ شاعر بیک وقت شاعر بھی ہے اور نقاد بھی۔ اردو میں میر، سودا، قائم، لچھمی نرائن شفیق، صائب، مصحفی، میرحسن، شاعرہوتے ہوئے نقاد کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔

ہمارا اردو ادب فارسی ادب کا مرہون منّت ہے ۔ اس کے تمام اسالیب و روایات رموز و علائم، اشارات و کنایات فارسی کے ہی منت کش ہیں۔ تعبیر حقائق کے لیے تشبیہ و

استعارہ ، اشارہ و کنایہ اور صنائع بدائع کا وسیلہ بھی نہایت موثر و کار آمد ہے - فارسی والوں نے ان سب سے خوب استفادہ کیا ہے -

دراصل فارسی میں اول اول تنقید کے اصول مرتب و مدوّن نہ تھے اس لیے ابتدا میں اردو ادب بھی اس سے محروم رہا دیگر اور فنون لطیفہ کی طرح تنقید کا آغاز بھی سب سے پہلے یونان میں ہوا۔ اہل یونان اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار شعرا کے کلام کے محاسن و معائب بیان کرکے کیا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے پیش نظر تنقید کے کوئی خاص اصول وقوانین نہ تھے مگر اس میں ان کا ذوق اور پسند پیش پیش تھی - لہذا وہاں ذوق ہی معیار تنقید تصور کیا جانے لگا مگر ایلیڈ (Iliad) اور اڈیسی (Odyssey) کی تدوین کے بعد ان کے یہاں بھی تنقید کا بتدریج ارتقا ہونے لگا -

اردو کی پیدائش اور اس کے مولد و مسکن کے لیے بھی یوں تو کئی نظریے ہیں مگر سبھی لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد فارسی اور ہندوستانی کے اتّصال اور میل جول سے جو زبان وجود میں آئی وہ کبھی ریختہ ، کبھی ہندوی، کبھی ہندی اور کبھی ہندوستانی کہلائی - مسلمانوں نے ہندوستان میں بھی فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا اور جوں جوں ان کی سلطنت کی حدود وسیع ہوتی گئیں اس زبان کے جاننے والے اور بولنے والے پھیلتے گئے - عربی مثل ہے کہ " النّاس علی دین ملوکہم" اہل دربار نے فاتحین کی سی وضع قطع ، طرز و طریق ، گفتگو و لہجہ ، ادب و آداب ، نشست و برخاست اور تہذیب اور شائستگی کو اپنا لیا۔ ان کی طرح عوام نے بھی اپنا طرز زندگی انہیں فاتحین کی روش پر اختیار کیا اور ان کی اس تقلید پر فخر کرنے لگے -

فاتح قوم کا اثر مفتوح قوم پر بڑی عجلت اور تیزی سے ہوا کرتا ہے اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ہندوستان

کی معاشرتی فضاء اخلاقی اقدار اور شعور و مذاق میں ایک تغیر و تبدّل رونما ہونے لگا ۔ لوگ فارسی سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ شرفاء اور پڑھے لکھے لوگ فارسی میں شعر کہنا باعث فخر خیال کرنے لگے فارسی کے مشہور شعراء کا کلام اکثر لوگوں کی نوک زبان ہوگیا۔ اور وہ اس کو موقع و محل کی مناسبت سے استعمال بھی کرتے رہتے تھے ۔ فارسی ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہونا قدرتی بات تھی اور خط و کتابت کی زبان بھی فارسی تھی تو ثابت ہے کہ اس کو ترجیح دی جانے لگی ۔ فارسی ادب کے رواج اور مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے فارسی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں رہنے کے بعد جس نئے ادب کی پرورش ہوئی ہوگی وہ فارسی سے ضرور متاثر ہوا ہوگا اور اسے ہر ہر قدم پر اثرانداز ہونے والی زبان کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا ہوگا ۔

جب اردو شاعری کا آغاز ہواتو شعرا کے سامنے فارسی ادب کا پر بہار چمن لہلہا رہا تھا۔ فضائیں فارسی شعر و نغمہ کی صدائوں سے گونج رہی تھیں لہذا اردو شعرا نے بھی اپنے یہاں ان ہی باتوں کا التزام رکھاجوفارسی میں رائج تھیں بلکہ اس دور کے شعراء و ادباء کا مطمح نظر بھی یہی تھا کہ وہ فارسی کا مماثل و مقابل ادب پیش کریں اور فارسی شاعری کی تمام بلندیوں ، وسعتوں اور رنگینیوں کو اپنے ادب میں جذب کرلیں۔ یہی سبب تھا کہ اردو میں تمام بحور، اوزان، تراکیب ، خیالات اور رموز و علائم فارسی سے مستعار لئے گئے (اگرچہ فارسی میں بھی وہ عربی سے آئے تھے) ظاہرہے کہ ایسی صورت میں شعر و سخن کے نقد و نظر کا معیار اور اس کے حسن و قبح پر تبصرہ بھی فارسی کے ہی اصولوں کے مطابق ہوتا تھا لہذا نقدو نظر میں اردو فارسی سے بھی طرح متاثر ہوئی ۔

فارسی شاعری سے اردو شعرا کے متاثر ہونے کا سبب حصول زر اور قرب سلطانی بھی

تھا - اس دور کے اکثر شعرا کا کلام تقلیدی و تفریحی نظر آتا ہے - مگر اس دور میں بھی وہ شعر کے حسن و قبح پر نظر رکھتے تھے اس سلسلے میں ملا وجہی کی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے - وہ کہتے ہیں :

"کتا ہوں تجھے پند کی اک بات — کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بیتاں بتیس — بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیری بات میں — بڑیا جائے کیوں جز لے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا دام نیں — اسے شعر کہنے سے کچھ کام نیں
نکو کرتوں کئی بولنے کا ہوس — اگر خوب بولے تو یک بیت بس
اسی لفظ کو شعر میں لیائے بیں — کہ لیا یا ہے اوستاد جس لفظ کوں
اگر دام ہے شعر کا تجھ کوں چھند — چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور ہے — ولے بھی مزا بات کا ہور ہے
اگر خوب محبوب جوں سو رہے — سنوارے تو نور آ علی نور ہے
اگر لاکھ عیباں اچھے دار میں — ہنر ہور سے خوب سنگار میں

شعر اگرچہ کئی لوگ جوڑے اچھیں
پی بہوت ہور خوب تھوڑے اچھیں "(۱)

مندرجہ بالا اشعار سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ :

(الف) کلام سلیس اور مربوط ہو ،

(ب) بہت سے مہمل اور بے ربط اشعار کی بہ نسبت ایک شعر کافی ہے -

---

(۱) ابواللیث صدیقی ، ڈاکٹر، " اردو غزل "(مضمون) ، " نگار" (ماہنامہ) ، ، ۱۹۳۳ء (خاص نمبر) ، ص

(ج) زبان و بیان میں بیشتر اساتذہ کی تقلید بہتر ہے -

(د) آرائش و زیبائش سے اچھے شعر کے حسن میں تو اضافہ ہوجاتا ہے مگر بُرے شعر کے بھی بعض عیب چھپ جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی دور میں بھی شعر کے حسن و قبح کی تمیز موجود تھی اور اس کے کچھ اصول و قواعد مقرر تھے۔ دکن کے مرثیہ گو شعراء کے یہاں ایسے نقش ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں مندرجہ بالا صفات کے علاوہ شعر میں تاثیر کا جز ہونا بھی لازمی بات تھی اور کام یاب مرثیے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ دل پر اثر کرے اور آنکھوں سے اشک رواں ہوجائیں - مثلاً :

"اکھری جب یو مرثیہ بولے | سب بیٹے کے کیواڑیاں کھولے
گوہر اشک رات دن رولے | جب سوں جاری ہوئی افسوس" (۱)

یعنی مرثیہ لوگوں کے سینوں کے دروازے کھول دیتا ہے ، اس سے براہ راست دل پر چوٹ پڑتی ہے اور آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا ہے -

مرثیہ کہنا چوں کہ حصول ثواب کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا تھا اس لیے ہرکس و ناکس اس میں طبع آزمائی کرنے لگا۔ الفاظ صحیح ہوں یا نہ ہوں ، مصرع موزوں ہوں یا نہ ہوں ، مفہوم واضح ہو یا نہ ہو ، ہر شخص حصول ثواب کے لیے دو چار مرثیے لکھنا ضروری خیال کرتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے وزن ، بے تکی اور سست و بے جان شاعری کی بہتات ہوگئی اگر کسی کے یہاں کچھ قابل توجہ باتیں ہوتیں بھی تو وہ بھی ان بے تکی باتوں کے سبب دب کر رہ گئیں اور " بگڑا شاعر مرثیہ گو " کی مثل مشہور ہوگئی لہذا اس مثل سے اس زمانے کی مرثیہ گوئی کے سلسلے میں ایک عام رائے معلوم ہوجاتی ہے۔

---

(۱) نصیرالدین ہاشمی ، " یورپ میں دکھنی مخطوطات "۔

یوں تو مغربی تنقید سے پہلے اردو میں بھی تنقید کا وجود بیاضوں، تذکروں،
تقریظوں، دیباچوں اور مکاتیب کی شکل میں ملتا ہے مگر یہ نہایت محدود اور روایتی
ہے - مغرب کے اثر سے اردو میں جو خوش گوار اضافے ہوئے ان میں فن تنقید سب سے اہم
ہے - مغرب میں جس شخص نے سب سے پہلے نہایت جرات کے ساتھ اپنے تنقیدی خیالات
کا اظہار کیا وہ جان ڈرائیڈن (John Dryden) تھا۔

یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنے مقالات کے ذریعے انگریزی تنقید کا سنگ بنیاد
رکھا۔ یہ شخص السنۂ قدیم کا بھی ماہر تھا۔ اس لیے اس نے شکسپیئر کے ڈراموں کا
متاخرین کے ڈراموں سے موازنہ کرکے بتایا کہ یہ ان سے کسی طرح بھی کم مرتبہ نہیں ہیں۔
جان ڈرائیڈن (John Dryden) کو الزبتھ کے دور کے تنقیدی نظریات
اور فنی تخلیقات میں بعدالمشرقین نظر آیا۔ اس دور میں نقادوں کا کام نظریات پیش کرنا
اور تخیل نگاروں کا کام ان کو رد کردینا تھا۔

ڈرائیڈن کو بھی اس دور کے ادب اور تنقیدی اصولوں میں مفاہمت پیدا کرنے
میں بڑی دقّت کا سامنا ہوا۔ لیکن اس کے بعد آنے والے دوسرے نقاد بھی یہ کہے بغیر نہ
رہ سکے کہ ہر صنعت اور ہر تصنیف اپنا معیار خود مقرر کرتی ہیں کیوں کہ کسی تصنیف کی
کام یابی یا ناکامی کا دار و مدار اس کے قارئین کی اثر پذیری کی نوعیت پر منحصر ہے -
ڈرائیڈن ہی کی تحریروں کے اثر سے دیگر فنون لطیفہ کے انتقاد نے انگریزی ادب
کی تاریخ میں پہلی بار ایک اہم فن کی حیثیت اختیار کی - چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ
ڈرائیڈن کے بعد انگریزی میں تیزی سے لوگ تنقید کی طرف مائل ہونے لگے۔

جب ادب اور سیاست کے اثرات بڑھنے شروع ہوئے تو ان اثرات کے تحت ادب اور
زندگی کا چرچا ہونے لگا - تنقید نگاری کے بھی اصول و طریق اور قواعد و ضوابط ترتیب
دیے جانے لگے - مغربی تنقید کے اثر سے اردو تنقید بھی نئی راہوں اور نئی منزلوں سے

آشنا ہوچلی تھی اور تنقید نگاروں نے ادبی مسائل و پیچیدگیوں کو سلجھانا شروع کردیا تھا - جو اس سے قبل ہماری نگاہوں سے بالکل پوشیدہ تھے -

اس میں کوئی کلام نہیں کہ صحیح معنی میں تنقید کی ابتدا حالی ہی سے ہوتی ہے اور حالی کی "مقدمۂ شعر و شاعری" ہماری اردو ادب میں پہلی تنقیدی تصنیف ہے - لیکن اس سے قبل بھی جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے تنقید ہمارے یہاں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی -

مقصد یہ کہ ہمارے ادب میں ایسی آثار/اوّلیات ہیں جن کو مد نظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کا وجود بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود شعر و ادب کا - شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات کا خود ہی ناقد بھی ہوتا ہے - اس کے ذہن میں بلند و پست ، زشت و خوب اور حسن وقبح کا معیار ضرور ہوا کرتا ہے - بغیر تنقیدی شعور کے اس کے ذہن کا عروج و اوج کی منازل تک پہنچنا مشکل ہی کیا بلکہ نا ممکن ہے -

انسان میں تنقید کا مادّہ فطری طور پر ودیعت کیا ہوا ہے اور یہ ہر عمر کے انسان یعنی ہر بچے ، بوڑھے اور جوان میں پایا جاتا ہے مثلاً ایک بچہ یہ کہے کہ " میں یہ آم نہ کھاؤں گا وہ سا کھاؤں گا" یا ایک جوان کہے کہ " مجھے گلاب کے پھول پسند ہیں" یا ایک بزرگ یہ فرمائیں کہ " میں پان کی بجائے سونف کھانا پسند کرتا ہوں-" تو بظاہر یہ عام فقرے ہیں اور عموماً بولے جاتے ہیں مگر ان کے ذریعہ ہمیں بچے، بوڑھے اور جوان کی پسند و ناپسند کا بخوبی علم ہوجاتا ہے - یوں تو یہ الفاظ کا ہیر پھیر ہے مگر بہ نظر حقیقت دیکھیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تنقید کا میلان موجود ہے -

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ تنقید کی کارفرمائی دنیا میں قدیم سے ہے - ادب سے متعلق ہوکر اس کارفرمائی نے متمدن و مہذب ممالک میں ایک مستقل فن ، ایک جدا شعبۂ ادب اور ایک اہم صنفۂ علم کی صورت اختیار کرلی ہے - اس فن کی ترقی یافتہ شکل آج

یہ ہے کہ فن تنقید کو شعر و ادب کی جان کہا جاتا ہے - شعراء اشعار لکھتے اور ادیب مضامین تحریر کرتے ہیں مگر ان کی تخلیقات کو جانچنا ، تولنا ، پرکھنا اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور پھر عوام پر ان خصوصیات کو واضح کرنا نقاد ہی کا کام ہے - لہذا جس قدر اہمیت شعر و ادب کی ہے اس سے کہیں زیادہ اہم فن تنقید ہے - اسی لیے مہذب و متمدن معاشرے میں نقاد کی قدر و منزلت وہی ہے جو کسی بڑے شاعر و ادیب کی ہوا کرتی ہے -

ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آئیں گے جو تعلیم سے تو سراسر نا آشنا ہیں لیکن شاعری کے ذوق سے ناآشنا نہیں- یہ غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی اشعار سن کر ان سے لطف اندوز ضرور ہوتے ہیں- ہمارے یہاں کے عوام اکثر بلند آواز یا نرم لہجے میں مختلف اشعار گاتے نظر آئیں گے اگرچہ وہ ان اشعار کے معنی نہیں سمجھتے مگران کا تغزّل و ترنّم اور کیف و سرور ان کے دلوں پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے - ان لوگوں میں سے بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنی پسند و ناپسند کی وجوہات بتاسکتے ہیں یا الفاظ دیگر وہ کسی حد تک اپنی پسند کے اشعار پر تنقید کرنے کے اہل ہوتے ہیں- آرٹ اور فن کے سلسلے میں جہاں پرکھنے اور انتخاب کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے وہیں سے فن تنقید کی کارفرمائی شروع ہوجاتی ہے -

اگرچہ فن تنقید کی ابتدا پسند و ناپسند کے ذریعہ وجود میں آئی مگر اس کے اصول وضع کئے گئے اور یہ فن ترقی کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اس کی تعریفات و نظریات بھی تبدیل ہوتے رہے اور اس پر سینکڑوں کتابیں بھی تصنیف کی جاتی رہیں- انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اس دور میں فن تنقید پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں -

دراصل موجودہ دور پرانے زمانے سے بالکل مختلف و متضاد ہے پہلے کا دور اعتقادات

کا دور تھا۔ ہر بات پر آنکھ بند کرکے یقین کرلیا جاتا تھا اور کسی شاعر کے کلام پر کوئی تنقید نہ ہوتی تھی۔ لیکن اب اقدار بڑی حد تک بدل چکی ہیں ذہن میں نئے نئے سوالات اور نئے نئے خیالات موجزن رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پرانے شاعروں اور ادیبوں کے کلام و تصانیف کا ازسر نو جائزہ لیا جارہا ہے ۔ کل جن کا فرمایا ہوا بالکل مستند تھا آج اس کی تردید کی جارہی ہے ۔ اور ان پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں ہورہی ہیں۔ زمانے کے انہی ذہنی رجحانات کا نتیجہ ہے کہ آج تنقیدی لٹریچر اور ادب کا سرمایہ بہت ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ حالی سے قبل اردو میں باقاعدہ تنقید مفقود تھی لیکن جیسا کہ عرض کیا میر، سودا، صائب ، مصحفی، میرحسن او گردیزی ، قائم و قدرت وغیرہ کے تذکروں سے بھی اردو میں تنقید کا سراغ ملتا ہے ۔ مگر اس وقت اشاروں سے بات کرنے ، تفصیل سے بچنے اور ہر ذہن کو ایک سانچے میں ڈھال دینے کا طریقہ رائج تھا۔ یا یوں کہا جائے کہ نقد و تبصرہ کی ایک سرسری و غیر منظم سی روایت موجود تھی ۔ شاعرانہ خوبیوں اور خامیوں کا معیار تو تھا مگر واضح نہ تھا۔ حالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دی ۔ انھوں نے اصول و قواعد اورمعیار و مقاصد شاعری متعین کیے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے شعر و ادب ، زندگی و اخلاق ، تہذیب و معاشرت اور نظم و غزل کے سلسلے میں بھی اصولی سوال مدنظر رکھ کر شعر و ادب ، فکر و فن اور نقد و نظر کے بنیادی اصول و قوانین بنائے ۔ انھوں نے شعر و ادب کی ترویج و اشاعت اور فروغ و بقا کے لیے اس کا ایک معیار مقرر کرنا چاہا اور اس معیار سے اردو کے ادبی سرمائے کا جائزہ لینے کی کوشش کی ۔ اگرچہ معیار کے سلسلے میں وہ مغرب سے متاثر تھے مگر ان کا معیار خالص مغربی نہ تھا وہ " خذ ماصفا دع ماکدر " کے قائل تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی روایات کو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں جن مطالب و مقاصد اور جن مباحث و اصول کو بیان کیا ہے ان سے ان کی دقت نظری،

تبحّر علمی ، ژرف نگاہی اور تنقیدی شعور کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے ۔ انھوں نے اردو تنقید
کو جو لب و لہجہ ، زبان و بیان اور طرز و اسلوب بخشا وہ آج بھی اپنے اندر ایک
کشش اور لطف و اثر رکھتا ہے ۔

حالی کی یہ کوشش بڑی مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ۔ ان کا سماجی و اجتماعی
احساس بیدار تھا وہ زندگی اور اس کے حقائق پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ انھوں نے جو
تنقیدی اصول وضع کئے ان سے بحث و تمحیص کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک اعلا درجہ کا نقّاد کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات
کا بار بار مطالعہ کرکے اس ادیب یا شاعر کے دل کی دھڑکن کو چھولینے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔
وہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اترنے اور اس کی ذہنی کیفیتوں کا سراغ لگانے کی کوشش
کرتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ ان تمام واردات قلبی اور کیفیات ذہنی کو بھی اپنے اوپر
بالکل اسی طرح طاری و مسلّط کرلیتا ہے جس طرح وہ خود اس شاعر یا ادیب پر طاری
تھیں پھر وہ اس کو جانچتا پرکھتا اور اس کو زندگی و زمانے سے ربط دے کر اس کی
قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگاتا ہے ۔

اس طرح وہ نقاد اپنے قارئین میں بھی وہی جذبات و احساسات اور ذوق جمالیات
پیدا کردیتا ہے جو خود کسی ادب پارے کی تخلیق کے وقت ادیب یا شاعر پر مسلّط تھے ۔
صحیح و سچی تنقید اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے اخذ کرتی ہے اس لیے اس اعتبار سے
وہ بھی تخلیق ہے ۔

غرض یہ کہ تنقید کو دوسرے درجے کی چیز سمجھنا غلط ہے اچھی تنقید محض معلومات
فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام انجام دیتی ہے جو ایک ماہر نفسیات ، مؤرّخ ، شاعر،
یا پیغام بر کیا کرتا ہے ۔

اس سلسلے میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا قول ہے کہ :

" نقاد کے لیے بھی کائنات اور انسانی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا شاعر کے لیے ورنہ وہ یہ نہ سمجھے گا کہ شاعر نے اپنی تخلیق کے لیے مواد کہاں سے حاصل کیا ہے ، اور اس مواد کو اس نے جو صورت دی ہے وہ کس حد تک موزوں اور ناگزیر ہے ۔ نقاد کو زندگی کے خارجی و داخلی واقعات و واردات کا ویسا ہی حقیقی اور بھرپور شعور ہونا چاہئے جیسا کہ فن کار کے لیے ضروری ہے ، نہیں تو فن کاری میں زندگی کی جو نمائندگی کی جائے گی نقاد اس کا احاطہ نہ کرسکے گا۔" (۱)

اس سے یہ مقصد نہیں کہ نقاد حالات و واقعات کے اضطراری نقوش و ارتسامات کو ہی زندگی کے شعور سے تعبیر کرلے بلکہ شاعر کے ساتھ ساتھ اس کو بھی زندگی کی ارتقائی منازل کا بخوبی علم ہو وہ ماضی و حال کے ساتھ مستقبل کے امکانات کا تصور بھی رکھے ۔ زندگی ایک متحرک حقیقت ہے ، اس میں ماضی، حال اور مستقبل کے نقوش ہرجگہ نمایاں ہیں۔ جب ہی تو ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ :

" حال کے شعور میں ماضی کی بھی آگاہی کام کرتی ہوتی ہے ، اور مستقبل کا تصور حال کے شدید احساس سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔"

اس سے یہ بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ فن کار و نقاد دونوں ہی کے لیے یہ امر لازم ہے کہ وہ ماضی کے مطالعے ، حال کے مشاہدے اور مستقبل کے اشارے ذہن میں واضح رکھتے ہوں ۔ اس سے ایک طرف فن کار کو تخلیقی کارناموں میں تو دوسری طرف نقاد کو تنقیدی محاکموں میں بڑی مدد مل سکتی ہے ، اس طرح تخلیق و تنقید میں جو ایک گہرا ربط ہے وہ بھی برقرار رہ سکتا ہے ۔

ماہر نفسیات کی حیثیت سے تنقید ، فن اور فن کار کی شخصیت میں جو ربط ہوتا ہے اس کو پہچانتی اور اس کی وضاحت کرتی ہے ۔ مورخ کی حیثیت سے تنقید ادب کے ادوار

---

(۱) مجنوں گورکھپوری، " ادب اور زندگی" ، کراچی :مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۶۹ء ، ص ۳۵

متعین کرکے اس کے عہد بعہد ارتقا کا جائزہ لیتی اور ادب جن خارجی حالات سے متاثر ہوتا ہے ان کی بھی عکاسی کرتی ہے ۔

شاعر کی حیثیت سے تنقید یہ واضح کرتی ہے کہ کسی فن پارے کی باز آفرینی کیوں کر ہوسکتی ہے یا اس کو اپنے ذہن میں دوبارہ کس طرح تخلیق (   ) کیا جاسکتا ہے ۔

تنقید کی پیشہورانہ حیثیت یہ ہے کہ وہ فن پارے کی خوبی و خامی اور اس کے حسن و قبح کو ظاہر کرے تاکہ قاری اس کی خامیوں سے بچ کر خوبیوں سے رہنمائی حاصل کرسکے ۔

اس طرح ایک اچھے نقاد کا فرض ہے کہ وہ ادیب اور ادب کا حقیقی ترجمان ہو۔ وہ ادب کی عظمت کا صحیح اندازہ کرکے ادیب کی تخلیقات کو فنون لطیفہ کی کسوٹی پر کسے اور پرکھے ۔ ان میں جو محاسن ہیں ان کو اجاگر کرے اور جو معائب ہیں ان کے دور کرنے میں مدد و معاون ہو اور بتائے کہ کسی تخلیق کی اصل اور اس کا جوہر کیا ہے۔ ایسی ہی تنقید سے ہمارے ادبی مزاق کی تربیت ہوسکتی اور تہذیب و تحریر کو ترقی مل سکتی ہے اور ایسی ہی تنقید ادب کے لیے مشعل راہ بن کر ہماری رہنمائی کرسکتی ہے۔

مقاصد تنقید :

تنقید کے مقصد و منصب کو واضح کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ تنقید نگار کے فرائض کیا ہیں اور تنقید کا کام کیا ہے ۔ تنقید کے سلسلے میں یوں تو سیکڑوں نظریے اور ہزاروں اقوال نظر آتے ہیں ۔ کوئی کہتا ہے تنقید کا کام فیصلہ کرنا ہے۔ کوئی بتاتا ہے کہ تنقید ادب میں جدتیں پیدا کرتی ہے اور اس کی حفاظت کرتی ہے ۔ کسی کا قول ہے کہ تنقید تشریح ، حکم اور تعین مراتب ہے ۔ کسی کا خیال ہے کہ تنقید وضاحت ہے ۔ کسی کی رائے میں تنقید تحلیل و تجزیہ ہے ۔ کسی کا نظریہ ہے کہ تنقید کے بغیر ادب ایک جنگل کی مانند ہے ۔ تنقید کی یہ سب تعریفیں اس کے کسی نہ کسی

پہلو کو اجاگر کرتی ہیں اس لیے یہ سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ہر نقاد ان میں سے کسی نہ کسی پہلو پر کاربند رہا ہے ۔ لیکن نقاد کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ خود کو ادیب و شاعر کا ہم نوا اور رفیق کار تصور کرے ورنہ وہ اس کی تخلیقی کوششوں پر صحیح تنقیدی حکم نہ لگا سکے گا۔

پرانے زمانے میں جب کسی ادب پارے یا کتاب پر تنقید کی جاتی تھی تو صرف اس کے موضوع و مضامین پر سرسری سی نظر ڈال لی جایا کرتی تھی اس کے لغت و معانی، صرف و نحو ، وغیرہ کے سلسلے میں زیادہ بحث نہ ہوتی تھی لیکن موجودہ فن تنقید بہت بلند ہے آج جب کوئی شخص تنقید کرتا ہے تو اسے یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ علم و ادب کی تاریخ میں یہ کتاب کس درجے پر رکھے جانے کی مستحق ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے۔ اس کے مضامین کو موضوع سے کہاں تک تعلق و مناسبت ہے اور اس تصنیف کو مصنف اور اس کے عہد و ماحول اور عصر حاضر سے کیا ربط و تعلق ہے ۔

دور حاضر کا نقاد سب سے پہلے مصنف کے حالات و سوانح پر نظر ڈالتا ہے ، اس کی قوم و وطن اور خاندانے کو بھی پیش نظر رکھتا ہے اس کے بچپن اور عہد شباب کا بھی جائزہ لیتا ہے اس کے حالات گرد و پیش بھی اس کی نظر میں رہتے ہیں ۔ اس کی زندگی کے تجربات و مشاہدات پر بھی کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور پھر نقاد ان تمام باتوں کے پیش نظر اس کی تصنیف کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے ۔

سب سے پہلے ارسطو نے یونان کے عظیم انشاپردازوں کی تحریروں کو دیکھ کر اصول انتقاد ادبیات مرتب کئے یونان میں ہومر (Homer) عظیم شاعر تسلیم کیا جاتا تھا لہذا ارسطو نے دیکھا کہ ہومر کی نظموں میں پہلے تمہید یا تشبیب ہوتی ہے اس کے بعد وہ اصل واقع کی طرف رجوع کرتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ پیش کردیا کرتا ہے لہذا

اس نے ہر رزمیہ نظم (Epic poem) کو ان ہی تین حصوں (تمہید ، اصل واقعہ ، نتیجہ) میں تقسیم کرنے پر زور دیا - ارسطو کے بعد ہوریس وغیرہ نے کچھ اور اصول مرتب کئے - سولہویں صدی کے ایک نقاد ارٹینو (Aetino) کا تنقید کے سلسلے میں خیال تھا کہ " شخص و انفرادی ذوق کے سوا نقد و انتقاد کا کوئی معیار نہیں ہے "-

میتھیو آرنلڈ کا خیال ہے کہ " تنقید وہ کوشش ہے جو ہم عالم خیال کی بہترین پیداوار کے سیکھنے کے لیے کرتے ہیں - اور اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ہم تازہ اور سچے خیالات کی ایک لہر پیدا کردیتے ہیں -"

ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) نے تنقید کو دو حصّوں میں تقسیم کردیا ہے - پہلے حصے میں وہ دو سوال کرتا ہے کہ :

۱- اشعار کیوں لکھے جاتے اور کیوں گائے جاتے ہیں ؟

۲- یہ اشعار ہماری کون سی خواہشات کو تسکین دیتے ہیں ؟

دوسرے حصے میں وہ شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور اس کی چند منزلیں بھی متعین کی ہیں :

۱- شاعری سے لطف اندوز ہونا - اور

۲- شاعری پر تبصرہ کرنا -

(اس میں جذباتی طریقے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ذہنی تنقید کا عنصر بھی شامل ہوجاتا ہے)

۳- شاعری کو کما حقّہٗ سمجھنا - اور

۴- خیالات کو از سر نو ترتیب دینا -

یعنی نئی نظم یا غزل چند نئے تجربات بخشتی ہے ان نئے تجربات کو اپنے دیرینہ تجربات سے ہم آہنگ کرنا اور ان کے لیے اپنے عالم خیال میں مناسب مقام تجویز کرنا -" (۱)

---

(۱) عبدالشکور ، " اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ "، آگرہ : عزیزی پریس ، ۱۹۵۱ء ، ص ۱۵

ایلیٹ نے اپنے خیالات کو قدرے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ اس کا انداز بیان بھی دل کش ہے ، لیکن اس نے اشعار سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھا بلکہ نفسیاتی تحلیل پر زیادہ زور دیا ہے ۔ نفسیاتی تحلیل ضروری اور بڑی حد تک ضروری ہے لیکن اشعار کو ان کی عبارت اور الفاظ کو سراسر نظر انداز کرنا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ اشعار اور نظمیں عام طور سے بہت زیادہ مرتب صورت میں پیش نہیں کی جاتیں ، ان کے بعض گوشے بالکل تاریک ہوتے ہیں ۔ اکثر مقامات پر الجھاؤ ہوتا ہے کہیں کہیں الفاظ کا صحیح مفہوم بھی واضح نہیں ہوپاتا ۔ یا کہیں اشعار کی وضاحت و تصحیح کی ضرورت بھی درپیش آتی ہے ۔

نقاد کا کام ہے کہ وہ ان سب خامیوں کو دور کرے اور قاری کو شاعر کے صحیح مفہوم و جذبے سے آشنا کرے ۔ اشعار میں شاعر کے دل و دماغ دونوں ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے لہذا نقاد کے لیے دل و دماغ دونوں کی تحلیل کرنا ضروری ہے ۔ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ زندگی کے تجربات کو ادب کے تجربات سے ہم کنار کرے تاکہ ہر دو نوع کے تجربات میں اتحاد و ارتباط پیدا ہوسکے ۔ انسان زندگی میں بہت سے تجربات سے گذرتا ہے شاعر بھی اک انسان کی حیثیت سے انہیں تجربوں سے متاثر ہوکر شعر تخلیق کرتا ہے چناں چہ شاعر کے بعض اشعار اس نوع کے تجربات کی یاددہانی کراتے ہیں اور قاری، سامع شعر پڑھ کر یا سن کر بقول سیماب اکبرآبادی کہہ اٹھتا ہے کہ :

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

نقاد کا کام تخلیقات کو جانچنا اور پرکھنا ہوتا ہے ۔ اور یہ جانچنے و پرکھنے کی صلاحیت اک عطیۂ خدا وندی ہے جو ہر اک کو میسر نہیں ہوتا ۔ شاعر، مصور اور سنگ تراش فن کار ہوتے ہیں اور فن کارانہ صلاحیتیں اکتسابی نہیں ہوا کرتیں ۔ اس طرح فن تنقید کے لیے بھی فن کارانہ صلاحیتوں کی ضرورت ہے اور جس طرح ہر فن کار کے فن پر اس کی

شخصیت اور کردار کا نقش ثبت ہوتا ہے اسی طرح ناقد کے فن سے بھی اس کی شخصیت و کردار کے نقوش جھلکتے نظر آتے ہیں ۔ وہ ایک چابکدست باغبان کی طرح چمن بندی کرتا ہے اور ادب و زندگی کا ایک معیار پیش کرتا ہے ۔

شعرا و ادبا ہی پر کچھ موقوف نہیں ہے بلکہ ہر فن کار معمولی انسان سے کچھ مختلف ہوتا ہے ۔ وہ زیادہ ذَکی اَلحِسّ ہوتا ہے اس کے حسّیات زیادہ بیدار ہوتے ہیں اس کی نگاہ تیز تر ہوتی ہے ۔ اس کی نظر اس گوشے پر پہنچ جاتی ہے جہاں تک عام لوگوں کی نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں۔ اس کے کان ان آوازوں کو سن لیتے ہیں جو دوسروں کی قوت سامعہ سے کہیں دور ہوتی ہیں۔ اس کے جذبات زیادہ قوی اور پائیدار ہوتے ہیں، ایسے قوی اور پائیدار جو دوسروں کے دلوں میں بھی وہی جذبے پیدا کردیں جو خود اس کے دل میں موجزن ہوتے ہیں ۔ اور پھر ان کلک سب کے ساتھ ساتھ فن کار کی آواز اپنی شان دل نشینی کے ساتھ صدیوں تک فضا میں گونجتی رہتی ہے ۔ فن کار اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنے فن پاروں کی تشکیل کرتا ہے ۔ کسی ادیب و شاعریا فن کار کے فن پر تنقید کرنے سے پہلے ناقد کے لیے بھی یہ بات لازم ہے کہ وہ ان تخلیقات کے سلسلے میں بخوبی علم رکھتا ہو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو چیز یا جو بات ہماری سمجھ سے بالا ہوتی ہے ہم اس پر توجہ ہی نہیں دیتے اور معمولی معمولی باتوں کی وضاحت و صراحت کرنے لگتے ہیں جو شعر یا جو عبارت سمجھ میں آگئی اس پر واہ! واہ! کے دفتر کھول دیئے اور جو سمجھ میں نہ آسکا اس کو مہمل و بے معنی گرداننے لگے ۔ جیساکہ اکثر لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ :

" ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے "

اس تمام طول کلامی کا مقصد صرف یہی ہے کہ ناقد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تنقید کرنے

سے پہلے کسی فن پارے کے متعلق پہلےاپنی معلومات کو وسیع کریں - اس سے متعلق کتب کا مطالعہ کریں اور جو کچھ پڑھیے اس پر خوب غور و خوض بھی کریں - صرف کتابوں کے مطالعہ سے ہی نقد و نظر کا مادّہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ مطالعہ کے ساتھ ساتھ غور و فکر بھی لازمی چیز ہے - کام یاب ناقد ایک چلتا پھرتا قاموس ہوتا ہے -

اردو ادب کے سلسلے میں یہ بات واضح ہے کہ پہلے یہ فارسی و عربی ادب سے متاثر رہا اور اب انگریزی ادب اس پر اثر انداز ہے لہذا جس طرح پہلے فارسی و عربی پر عبور حاصل کئے بغیر اردو ادب کی تنقید دشوار تھی اسی طرح اب انگریزی ادب سے بھی واقفیت ضروری ہے - آج کے اس دور کا ادب نہایت سنسنی خیز اور نئی نئی اقدار کا ترجمان ہے - لہذا آج کے ادب پر تنقید کرنے کے لیے ناقد کا فرض ہے کہ وہ فنی لطیفہ اور شاعری پر گہری نظر رکھتا ہو اور وہ صرف یہ بلکہ موجودہ دور کے سیاسی نظریات و میلانات اور معاشرتی و اقتصادی حالات سے بھی بخوبی باخبر ہو کیوں کہ ان تمام باتوں کی جھلک اس کو ادب میں ضرور نظر آئے گی - غالب کے زمانے اور ماحول کا عکس ہمیں گویا ان کے ادب میں جھلکتا نظر آتا ہے اور اکثر ناقدین کا یہ قول ان کے سلسلے میں حق بجانب ہے کہ ان کی تحریروں سے اس دور کی ایک تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے - علامہ اقبال کے یہاں ان کے مذہبی و سیاسی نظریات اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور اصال و افکار کا مکمل نقشہ نظر آجاتا ہے - یہ اور اسی قسم کی تمام باتیں ہمیں اپنے ادب میں نظر آتی ہیں ان سب پر ناقد کی کڑی نظر ہونی چاہئے-

ناقد کا کام نہایت اہم ہے اور اس کو اپنا کام بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے بڑی ضبط و ضبط اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے اس کے یہاں نہ دوست کا پاس ہو اور نہ دشمن سے عناد نہ دولت کا لحاظ ہو نہ غربت سے تنفر نہ وہ جذبات سے مغلوب ہو اور نہ

کسی کے جاہ و حشم سے مرعوب اور یہ باتیں کسی عام کردار کے انسان میں ملنا نہایت دشوار ہیں ۔ نقاد کی حیثیت ایک جج یا منصف کی سی ہوتی ہے اور اسی حیثیت سے اس کا ایک اہم فرض صحیح فیصلہ صادر کرنا ہے ۔ فیصلہ کرنے کے لیے غیر جانب داری ضروری ہے۔ اگر اس نے ذرا بھی لحاظ و پاس داری سے کام لیا تو اس پر حرف آجانا لازمی بات ہے ۔ اس کو دو متضاد اقدار کو سامنے رکھ کر کھوٹے کھرے، اچھے برے، جدید و قدیم ، بلند و پست، غرض ہر چیز کے دونوں پہلوؤں کو واضح کرکے صرف ایک کی اہمیت کا اقرار و اعتراف کرنا ہوتا ہے ۔

اس طرح نقاد تاریخی شعور کی روشنی میں تحقیق کرکے واقعات کو بیان کرتا اور فن کار و فن پارے کی ترجمانی کرکے قاری کے ذہن کی رہنمائی کرتا ہے ۔ وہ قاری کے ذہن کی تربیت کرتا چلنے کے ساتھ ساتھ اقدار کی تخلیق، تجربوں اور روایات کا فرق ، ان کا معیار کے مطابق یا معیار سے ساقط ہونا، ان کی جدّت و قدامت ، ان کی ابدیت و عصریت وغیرہ تمام ہی باتوں سے قاری کو روشناس کراتا جاتا ہے ۔

ناقد کے فرائض کے لیے اسکاٹ جیمس (Scot James) کا قول ہے کہ :

" ناقد خاموش نہیں رہ سکتا ، وہ ایک وقت میں کئی چیزیں ہوتا ہے ۔ اس کی آواز دراصل قاری کی آواز ہوتی ہے جو مصنف کی آواز سے ہم کلام ہوتی ہے ۔ اب وہ تخلیقی مصنف کے مقام پر فائز ہوجاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ بعض امور کی یا تو تحلیل کرے یا ان کا جواز بیان کرے ، اب وہ اکھاڑے میں اترتا ہے جہاں خیالات کی جنگ برپا ہوتی ہے ۔ وہ کسی اونچے مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں سے وہ زمانے کی روح پر کچھ محسوس کرنے والا اثر پیدا کرسکتا ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی تحریک کے مرکزی نقطے پر جا پہنچے اور آرنلڈ کی طرح اس کا قصد کرے اور وہ خود تازہ اور سچے خیالات کی ایک نئی لہر پیدا کردے اب وہ ترجمانی اور وضاحت کرنے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ وہ ایک مجاہد کی حیثیت سے اس کی کوشش کرے گا کہ وہ صداقت اور سنجیدگی جو دنیا میں سب سے افضل

ہے جلد سے جلد عالم گیر ہوجائے ۔" (۱)

اسکاٹ جیمس کے اس نظریے سے مترشح ہوتا ہے کہ ناقد بیک وقت مبصر بھی ہے ترجمان بھی ، محقق بھی ہے مورخ بھی ۔ اسی طرح فن کار کا بھی کمال اسی میں مضمر ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا عکاس ہو اور جو ہمیں امید و رجا اور مسرت و شادمانی سے ہم کنار کرسکے ۔ کیوں کہ بقول اقبال ــــ

"شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو

جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا ؟"

ہم اُن ہی شہہ پاروں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ جن میں حقائق زندگی کی صحیح اور مکمل ترجمانی ہوتی ہے ۔ اگر فن پاروں میں یہ مندرجہ بالا باتیں نہیں ملتیں تو وہ فن کی بلندی کو نہیں چھوسکتے ۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں " روح اقبال" کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں :

" شعر جیسی لطیف چیز جس کی پرورش آغوش وجدان میں ہوتی ہے منطقی تنقید و تجزیہ کی گراں باری کی متحمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ نقد و نظر کرنے والا اپنی فکر کو شعر کی طرح تخلیقی نہ بنالے وہ اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا ۔ ضرور ہے کہ اس پر بھی کم و بیش اسی قسم کی قلبی واردات گزرچکی ہو جس سے شاعر کو شعر کہتے وقت واسطہ پڑا تھا ورنہ اس کی تنقید خلوص سے عاری رہے گی ، جس کے بغیر ادب عالیہ کی تخلیق ممکن نہیں ، اور اس ضمن میں شعر کہنے والے اور شعر سمجھنے والے دونوں کو شامل سمجھتا ہوں ، تنقید تخلیقی ہونی چاہئے اس واسطے کہ اس کا مقصد و منتہا ان کیفیات کی باز آفرینی ہے جو شاعر پر گذری تھیں ، تجزیہ میں جب تک

---

(۱) عبدالشکور، " اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ "، محولہ بالا ، ص: ۳۹-۳۸

تخلیقی عنصر شامل نہ ہو نقد و نظر کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔" (۱)

لیکن ان تمام کیفیات کو خود پر طاری کرنے کے بعد شاعر کے کلام کی وضاحت و صراحت تو ہوسکتی ہے لیکن تخلیقی تنقید ممکن نہیں کیوں کہ نقاد اپنا ایک الگ وجود ، ایک الگ شخصیت اور ایک الگ شعور رکھتا ہے - وہ ادیب و شاعر سے اس بات کا متقاضی رہتا ہے کہ اس نے کہاں کہاں حقائق زندگی سے نبرد آزمائی کی ہے - تخلیقی تنقید ہمیں اسی نقاد کے یہاں مل سکتی ہے جو خود اپنی شخصیت و بصیرت اور شعور و تجربے سے کماحقہ کام لے اس کا منشا صرف کیفیات کی آفرینش نہ ہو بلکہ وہ ادیب و شاعر کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے جذبات کی ترجمانی کرے - اس طرح تنقید کے مقاصد علماء و فلاسفہ نے اپنے اپنے خیال کے مطابق پیش کیے ہیں لیکن نقاد کو کسی تصنیف پر تنقید کرتے وقت صرف چند بندھے ٹکے اصولوں پر ہی کاربند نہیں رہنا چاہئے بلکہ اپنی عقل سلیم، علمی و ادبی ذوق، قوّت استدلال و قوّت تمیز سے کام لے کر اس کے حسن و قبح کو بلا کم و کاست بیان کرنا چاہئے -

تنقید کسی تصنیف کی لفظی و معنوی دونوں ہی حیثیتوں سے بحث کیا کرتی ہے - پہلی چیز مواد کی صحت و صداقت ہے اگر نقاد کو اس کا صحیح علم نہیں تو اس کی بنیادیں ناقص ہیں۔

ہر اچھے و اعلا نقاد کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ " قدیم روایات کے ساتھ جدید نظریات کا بھی قائل ہو ایسا نہ ہو کہ وہ قدیم سے نفرت کرتا ہو اور جدید پر جان دیتا ہو - مقصد یہ ہے کہ وہ نہ قدیم کا پرستار ہو اور نہ جدید سے منحرف بلکہ اس کا فرض ہے کہ قدیم و جدید ادب میں جو صالح عناصر اور اعلا اقدار موجود ہیں وہ

---

(۱) یوسف حسین خان، ڈاکٹر "روح اقبال"، حیدرآباد (دکن): ادارہ اشاعت اردو، (بزاقی مشین پریس)، ۱۹۴۲ع، (طبع ثانی)، (دیباچہ)، ص: ۱۶-۱۵

قاری کے سامنے پیش کی جائیں ۔ ایک اچھا نقاد اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا کہ ہر عہد اور ہر دور کا ماحول دوسرے عہد و زمانے سے مختلف ہوا کرتا ہے اور چوں کہ ماحول ادب پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ایک عہد کا ادب دوسرے عہد کے ادب سے مختلف ہوا کرتا ہے ۔ نقاد کا کام ہے کہ وہ ہر دور کے ادب کو اس کے پس منظر کے ساتھ سمجھے اور قبول کرے ۔

اردو تنقید کے سلسلے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ دور جدید کی پیداوار ہے اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے خیال میں تو اردو تنقید کا وجود محض فرضی و خیالی ہے اور اس سلسلے میں وہ اردو کے قدیم تذکروں کو بھی خیال میں نہیں لاتے اور لاتے بھی ہیں تو اسے ادنا درجے کی تنقید کہتے ہیں ۔ حالاں کہ ان میں سے بیشتر میں صحیح انتقادی فیصلے ملتے ہیں ۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اردو کے ابتدائی دور کی تنقید ہے مگر اس دور کا تنقیدی شعور کچھ ایسا ہی تھا کہ عروض و قواعد کی کلک موشگافیوں ، محاورات و روزمرہ کے استعمال اور زبان و بیان کی نوک پلک سنوارنے پر زیادہ زور صرف کیا جاتا تھا۔ اور شاعر بھی ایہام گوئی ، مبالغہ آرائی اور صنعت گری وغیرہ کی طرف زیادہ مائل تھے۔

قدیم زمانے میں تنقیدی شعور کا پتا ہمیں مشاعروں یا تذکروں سے مل جاتا ہے ۔ جس طرح مشاعروں میں شعراء کے کلام کے خوب و ناخوب ہونے کا اندازہ داد و تحسین اور سکوت و خاموشی سے ہوجاتا تھا۔ اسی طرح تذکروں میں بھی تحسین و تکریم اور تنقیص و تعریض کی شکل میں اظہار خیال کرکے تنقید کا حق ادا کیا جاتا تھا۔ اس وقت کے تذکرے کسی تہذیبی یا تنقید کی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ یہ ادبی یادداشتیں یا غیر رسمی قسم کی ادبی تاریخیں ہوا کرتی تھیں جن میں ہر چیز سرسری اور مختصر طور پر بیان کردی جاتی تھی ۔ قدیم تذکروں میں نہ شعراء کے مفصل حالات ہیں نہ ان کے عادات و اطوار کا کوئی

خاص ذکر ہے کہ ان میں اس دور کی تہذیب و تمدن، معاشرت و سیاست ، اقتصاد و اقدار اور تصورات و خیالات کی کوئی خاص جھلک نظر آتی ہے - شعراء کے کلام کو منتخب کرنے میں بھی کوئی معیار و اصول پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے - بہترین یا بدترین جیسے بھی اشعار جہاں سے بھی مل گئے وہ پیش کردیے گئے ہیں- اس وقت کوئی تنقیدی اصول و نظریہ یا کوئی کلیّہ و قاعدہ تذکرہ نگار کے پیش نظر تھا ہی نہیں اس لیے جہاں کہیں اس نے مناسب و موزوں خیال کیا ہے سرسری طور پر اپنی رائےکا بھی اظہار کردیا- اس طرح یہ تذکرے تنقیدی طور پر بالکل تہی داماں نہیں بلکہ بعض میں مفروضات و قیاسات سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اس دور کے تذکرہ نگاروں کے ذہن میں بھی شعر و ادب اور فکر و فن کے کچھ اصول و معیار ضرور تھے جن کو مدنظر رکھ کر ہی وہ شعراء کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتےتھے - اور یہی اس دور کی تنقید تھی -

دکنی دور سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک ہمارا تنقیدی سرمایہ صرف ان ہی تذکروں کی صورت میں تھا- لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اردو میں سرسید احمد خاں کی ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے سبب تخلیقی و تنقیدی دونوں ہی قسم کے ادب میں اضافہ ہوا- ۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خاں نے " تہذیب الاخلاق" جاری کیا - اس ماہوار رسالے کے اجرا نے اردو ادب کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی - سرسید کی یہ تحریک ایک نئے دور کا پیش خیمہ تھی یہی وہ دور ہے جب زندگی و ادب کے نئے نئے معیار متعین کیے گئے - سرسید نے ہر چیز کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا- تہذیب و تمدن اور سماج و معاشرے کی اصلاح کے لیے زبان و ادب کو اک بڑا وسیلہ و ذریعہ سمجھ کر اس کا سہارا لیا لیکن سرسید احمد خاں خالص ادب کے قطعی حامی نہ تھے - یہی وجہ ہے کہ خالص ادبی تنقید ان کے یہاں نظر نہیں آتی -

سرسید کے زمانے میں ادب کی حالت ایسے خوش نما کاغذی پھولوں کی سی تھی جن کا رنگ تو بڑا شوخ اور گہرا تھا مگر خوش بو نام کو نہ تھی ۔ ادب کی اس خامی کو دور کرنے کے لیے کچھ خدمات فورٹ ولیم کالج نے بھی انجام دیں لیکن سرسید نے ادب میں مقصدیت کا پہلو خاص طور سے پیش نظر رکھا اور "تہذیب الاخلاق" کے اجراء کا مقصد بھی یہی تھا ۔ "تہذیب الاخلاق" نے جہاں ادبی و ثقافتی اور سیاسی و سماجی خدمات سر انجام دیں وہاں اس نے تنقید نگاری جیسی اہم صنف ادب کو بھی ہم سے روشناس کرایا۔ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے نواب محسن الملک ، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسی ہستیوں کے افکار کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی نشو و نما کا کام کیا۔ لیکن اس کے علاوہ "تہذیب الاخلاق" کا خاص مقصد تنقید نگاری کو بھی فروغ دینا تھا۔ اور بقول ڈاکٹر محی الدین قادری، زور، یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ "اردو میں تنقیدی ادب کی ابتدا کا سہرا سرسید ہی کے سر ہے ۔ "(۱)

سرسید احمد خاں نے اصلاح مذاق اور آزادئی خیال کی جس تحریک کو شروع کیا تھا اس میں شعر و ادب کے سربراہ حالی ، شبلی اور آزاد بھی تھے ان ہی ہستیوں کے ہاتھوں سرسید کے نظریات کی روشنی میں شعر و ادب کی تنقید کے معیار وضع ہوئے اور انہی لوگوں نے جدید تنقید کی بنیاد ڈالی۔

حالی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب پرانی اقدار مٹتی جارہی تھیں اور ان کی جگہ نئی قدروں نے لینی شروع کردی تھی ہر اک قوم کی گرتی ہوئی بنیادوں کو سنبھالنے کی فکر میں تھا ۔ حالی ان تمام باتوں کے بہترین ترجمان و نقاد ہیں۔ حالی نے ادب و تنقید کو اک پر خلوص مزاج اور نئے تغیرات و تخیلات سے روشناس کیا۔ لیکن انھوں نے

---

(۱) زور، ڈاکٹر محی الدین، "روح تنقید"، ص ۱۹

قدیم روایات و اقدار سے مکمل انحراف بھی نہیں کیا۔ ان کےلب و لہجے سے خلوص و انس متانت و سنجیدگی اور گہرائی و گیرائی نمایاں ہے - ان کا مقصد تنقید یہی تھا کہ جو لوگ ادب کو صرف تفریح طبع کا سامان تصور کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں - ہر ادب کوئی نہ کوئی مقصد لئے ہوتا ہے اور اس سے سماج و معاشرے کی عکاسی ضرور ہونی چاہئے - قدرت نے حالی کو تنقید نگاری کی جملہ صلاحیتیں ودیعت کی تھیں - ان کی تنقیدوں سے ان کی بے لوثی وضعداری ادب داری اور اعلا ظرفی و سنجیدگی کا پتا چلتا ہے -

مولانا شبلی اگرچہ مذہب کی طرف مائل تھے مگر ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا وہ بیک وقت شاعر و فلسفی ، نقاد و سوانح نگار تھے - آزاد کے یہاں بھی کم و بیش ایسی ہی چیزیں نظر آتی ہیں - غرض جذبۂ اصلاح اور نیا تنقیدی رجحان ان دونوں حضرات کے یہاں بھی کارفرما ہے اور انھوں نے بھی حالی کی طرح قدیم و جدید کے درمیان کا راستہ اختیار کیا ہے - اس طرح یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ان تینوں حضرات کے یہاں سماجی اصلاح کے خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے - اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی تحریر کرتے ہیں :

> " حالی شبلی اور آزاد کی تنقید کے اثرات بہت گہرے اور ہمہ گیر تھے۔ ان کی تنقید کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں تنقید سے دل چسپی بڑھنے لگی اور ہر طرف تنقید اور تنقیدی خیالات کے چرچے نظر آنے لگے علم و ادب سے دل چسپی لینے والے افراد نے اس طرف خاص طور پر توجہ کی - اچھے ادب سے دل چسپی لینے کی ایک فضا بھی سرسید کی تحریک کے زیر اثر پیدا ہوچکی تھی - اس بات نے تنقید سے دل چسپی کو اور بھی بڑھایا اور کئی لکھنے والوں نے اپنی دوسری مصروفیتوں کے باوجود تنقید بھی لکھنی شروع کی -" (۱)

اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز مولانا حالی سے ہوتاہے - ان کے تنقیدی کارنامیں

---

(۱) عبادت بریلوی ، ڈاکٹر ، " اردو تنقید کا ارتقا" ، محولہ بالا ، ص ۲۱۶

میں" مقدمۂ شعر و شاعری" اردو تنقید کا پہلا شہپارہ ہے جو آج بھی اردو زبان و ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اردو ادب کے طالب علموں کے ذہن کی آب یاری کے لیے نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے ۔ جس طرح یورپ میں ارسطو کی " بوطیقا" یا " فن شاعری" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسی طرح حالی کے " مقدمۂ شعر و شاعری" سے استفادہ کرنا بھی آج کے ہر نقاد کے لیے نہایت اہم اور ضروری ہے ۔ اس میں حالی نے شعر و سخن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے ۔ " مقدمۂ شعر و شاعری" کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

" مقدمۂ شعر و شاعری میں شاعری کی ماہیت ، حیات و سماج سے اس کا تعلق اس کے لوازم، زبان کے مسائل ، اردو شاعری کی اصناف سخن ، ان کے عیوب و محاسن ، اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث کی ہے ۔ اردو زبان پر تنقید کی یہ پہلی کتاب ہے اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ۔" (۱)

اپنی اس کتاب " مقدمۂ شعر و شاعری " کا خاکہ خود مولانا حالی نے بھی اپنے مکتوب میں یوں پیش کیا ہے :

" میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانۂ جاہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی اور عربی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائے گی ۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو شاعری جو نہایت خراب اور ابتر ہوگئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بتائے جائیں اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کسی قدر قوم و وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے ۔" (۲)

حالی کے نزدیک شاعری کا مقصد جذبات کو بھڑکانا ہے ۔ اچھی شاعری ان کے

---

(۱) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی :" یاد حالی"(مضمون) ، " سہ ماہی" اردو"، دہلی : جولائی ، ۱۹۳۵ء ، ج۲۵ ، ش ۳ ، ص ۳۷-۲۳۶

(۲) غلام مصطفی خان ، ڈاکٹر :" حالی کا ذہنی ارتقاء"، لاہور : مکتبہ کاروان ، ۱۹۵۶ء ، ص ۳۵-۲۳۳

نزدیک وہی ہے جو دلوں میں جوش و ولولہ اور امنگ پیدا کرے - ایسی شاعری کے لیے

انھوں نے تین شرطیں قرار دی ہیں :

۱- تخیل

۲- مطالعۂ کائنات

۳- تفحص الفاظ -

اس سلسلے میں حالی کا خیال ہے کہ اگر شاعر اپنے خیالات و جذبات سے کام لے اور دیکھے و سمجھے تو صبح سے شام تک سینکڑوں عبرت خیز مناظر نظر سے گذرتے رہتے ہیں- شاعری کے سلسلے میں بھی حالی بڑی حد تک انگریزی کے شاعر ملٹن(Milton) سے پورا پورا اتفاق رکھتے ہیں - یعنی یہ کہ شاعری میں سادگی ، اصلیت اور جوش ہونا ضروری ہے - اس کے علاوہ حالی صوری و معنوی دونوں پہلوؤں کو شاعری کے لیے ناگزیر خیال کرتے ہیں- ان کے نزدیک شاعری کو سماج کا تابع ہونا چاہئے اور زمانہ کی رفتار کے موافق شاعری کو بھی ارتقائی منازل کی طرف گامزن رہنا چاہئے -

حالی نے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں عملی اور نظریاتی دونوں قسم کی تنقید کی ہے اور انھوں نے جن مطالب و مباحث کو پیش کیا ہے ان کے مطالعے سے حالی کی ژرف نگاہی ، فکر کی بالیدگی، تبحّر علمی، فنی بصیرت اور تنقیدی شعور کا پورا ثبوت ملتا ہے- اور ان کے نظریات بھی وقت کی آواز سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں - اگرچہ ان کے تنقیدی نظریات مشرقی علوم و ادبیات سے گہری واقفیت پر مبنی ہیں تاہم انھوں نے مغرب کے تنقیدی اصولوں کو بھی اپنایا ہے -

حالی کے بعد دور سرسید کے دوسرے بڑے نقاد مولانا شبلی نعمانی ہیں جنھوں نے اپنے اعلا ذوق سے تنقید میں اچھا خاصا اضافہ کیا- وہ سرسید احمد خان اور مولانا حالی

سے متاثر ضرور ہیں مگر انھوں نے ان کی بعض باتوں سے اختلاف بھی کیا ہے - وہ ادب میں صوری و جمالیاتی پہلوؤں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ شبلی کے نزدیک شاعری ذوقی وجدانی چیز ہے وہ احساس یا جذبے کو شاعری کا دوسرا نام دیتے ہیں لہذا وہ " شعرالعجم" جلد چہارم میں لکھتے ہیں :

" جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے -" (۱)

مولانا شبلی بیک وقت ایک شاعر، عالم ، نقاد ، مورخ ، سوانح نگار اور ماہر زبان و لسان ہیں - انھوں نے اپنی تنقید میں زبان و لسان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ زندگی اور اس کے حقائق پر ان کی نظر گہری ہے جس سے ان کے تنقیدی شعور اور علم و تجربے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے - وہ مغربی علوم سے متاثر تو تھے مگر مرعوب نہ تھے وہ اہل مغرب کے علم و فن ، تلاش و تفحص کے مداح بھی تھے مگر اسلامی تہذیب کو مٹتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف خود تحقیق و تنقید کی اعلا روایات قائم کیں بلکہ اپنے بعد ایسے ادارے اور شاگرد بھی چھوڑ گئے جو ان کی قائم کردہ روایات کو آگے بڑھا سکیں - ان کی تنقیدی تصانیف میں " شعرالعجم"، " موازنہ انیس و دبیر"، ان کے بلند و پاکیزہ ادبی ذوق کی ترجمان ہیں۔

حالی و شبلی کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف " آب حیات" کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہے - یہ ان کی ادبی کاوش کا ثمر نورس ہے - بعض لوگ اس کو اردو تنقید و تبصرہ کی ایک اہم کتاب سمجھتے ہیں۔ وہ بیک وقت محقق ، نقاد ، اور صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کے تحقیقی و

---

(۱) شبلی نعمانی ، علامہ: " شعرالعجم"، اعظم گڑھ : ندوۃ المصنفین ، ، ج چہارم، ص ۳۰۲

تنقیدی رجحان کا پتا چلتا ہے ۔ ناقدین کا قول ہے کہ ان کی نثر میں بھی نظم کا سا لطف آتا ہے یہ بات اپنی جگہ بجاسہی مگر ایسی نثر جس میں نظم کا لطف آتا ہے تحقیقی و تنقیدی موضوعات کے لیے کسی صورت میں مناسب و موزوں قرار نہیں دی جاسکتی یہی سبب ہے کہ ان کی " آب حیات" نے بہت سے مصنفین کو آب حیات بخش کر زندۂ جاوید بنادیا ہے ۔

آب حیات میں آزاد نے اردو شاعری کی تاریخ مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ شاعری کے مختلف موضوعات پر بھی تبصرہ کیا ہے ۔ " نگارستان فارس" اور " سخن دان فارس" کے مطالعہ سے بھی ان کے تنقیدی رجحان کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے ۔ اگرچہ سرسید کی تحریک سے براہ راست متاثر نہیں تھے مگر ان سے ایک دلی تعلق ضرور رکھتے تھے۔ آزاد بھی ادب میں سماجی اہمیت کے خاص طور پر قائل ہیں وہ شعر کے لیے خیال ، موزونیت ، اسلوب بیان کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

آزاد کی عملی تنقید کو ان کے اسلوب بیان کی رنگینی و لفاظی نے بہت نقصان پہنچایا انھوں نے مغرب سے بھی اثر قبول کیا لیکن اس سے مکمل طور پر استفادہ نہ کرسکے ۔ البتہ انھوں نے شاعروں کے حالات و خصوصیات کلام ، عادات و اطوار اور ان کے دور کی عکاسی بخوبی کی ہے ۔

غرض اس طرح حالی، شبلی اور آزاد کے ذریعہ صحیح قسم کی تنقید کی ابتدا ہوئی ۔ اس سے قبل تخلیقی تصانیف میں تنقیدی اشارے ضرور ملتے تھے مگر کوئی ایسا اہم تنقیدی کارنامہ نہ تھا جس کو بجا طور پر تنقیدی فن پارے کا نام دیا جاتا۔ حالی اور شبلی و آزاد نے نہ صرف فن تنقید کی داغ بیل ڈالی بلکہ اس میں نئے نئے رجحانات و خیالات کا بھی اظہار کیا مثلاً نئے رجحانات کے اعتبار سے نظریاتی ، عملی اور سائنٹفک تنقید

کی ابتدا حالی سے ہوئی جب کہ جمالیاتی اور تقابلی تنقید کا آغاز مولانا شبلی نعمانی نے کیا۔

حالی شبلی اور آزاد کے بعد دوسرے دور میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، نیاز فتح پوری، عبدالسلام ندوی، محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین زور، عبدالقادر سروری، آل احمد سرور، ڈاکٹر احتشام حسین، مولوی محمد یحییٰ تنہا جیسے مورخین ادب کے کارناموں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔ ان نقادوں کی تنقیدوں میں تحقیقی رجحان زیادہ نمایاں ہے ۔ ان حضرات کی تنقیدوں میں تبصرے کا عنصر تحقیق سے کہیں زیادہ ہے مگر قدر (Value) سے کم ہے ۔ کیوں کہ ان کے زمانے میں اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور یہی روش سالہا سال تک جاری رہی ۔ تحقیقی تنقید کا تعلق ادبی تاریخ سے زیادہ ہوتا ہے اور ادب میں تنقیدی رجحان کو فروغ دینے اور تنقید کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں ان مورخین ادب کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے ۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمات کے ذریعہ اردو میں محققانہ تنقید کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے ۔ ڈاکٹر احتشام حسین کا شمار اردو کے ان نقادوں میں ہے جو تنقید کے مباحث و مسائل اور شعر و ادب کے قواعد و ضوابط پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے رومانیت و جذباتیت سے زیادہ اثر لیا ہے اور ایک مخصوص انداز سے زبان و بیان پر تنقید کی ہے مگر ان کے احساس جمال کی شدت نے ان کو سماجی مسائل کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ ڈاکٹر محی الدین زور نے مغربی فن تنقید سے متاثر ہوکر مشرقی ادب کو بھی اس کی افادیت و اہمیت سے روشناس کرایا ہے مگر اس سے بے جا طور پر متاثر نہیں ہوئے ۔ پروفیسر آل احمد سرور نے تنقید کو ادبی سلیقہ اور تخلیقی رکھ رکھاؤ بخش کر ایک وقیع فن کی حیثیت دی وہ تنقید میں افہام و تفہیم کے قائل ہیں اور اپنی رائے کو زبردستی منوانے کے حق میں نہیں ۔

ان ہی تنقید نگاروں کے زمرے میں ایک شخصیت مولانا حامد حسن قادری کی نظر آتی ہے - وہ اپنی تحقیقی تنقید کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اردو ادب میں ان کا مرتبہ بھی وہی ہوگا جو مذکورہ بالا مورخین و ناقدین ادب کا ہے - ان کے یہاں نہ خیال خاطر احباب کا گزر ہے اور نہ مصلحت بینی کی روش - وہ نہ مشرق کے پرستار ہیں اور نہ مغرب سے منحرف - البتہ انھیں برصغیر پاک و ہند کی روایات کو معدوم ہوتے دیکھنا گوارا نہیں- یہی وجہ ہے کہ وہ غالب جیسے عظیم شاعر اور علامہ سیماب اکبر آبادی جیسے عزیز و مخلص دوست سے بھی مرعوب نہ ہوسکے - انھوں نے دونوں کے کلام پر دل کھول کر بے لاگ تنقیدیں کیں اور ہر ایک کے محاسن و معائب کو بخوبی واضح کیا ہے -

مولانا قادری کے تنقیدی رجحانات و تصورات کا جائزہ لینے سے قبل بہتر ہوگا کہ شعر و ادب کے سلسلے میں ان کے نظریات کا بھی مختصر سا بیان کردیا جائے - کیوں کہ تنقید میں خود تنقید کے اصول و نظریات کا مطالعہ بھی لازمی ہے - اور ادبی تصانیف کے مطالعے میں بھی اصول و نظریات کا ادب و زندگی سے رشتہ ، حقیقت و تخیل ، افادیت و اہمیت ، ابلاغ و تبلیغ ، مواد و ہیئت کا تعلق ، حسن و عشق کا مفہوم ، شعر و ادب میں زبان کی حیثیت ، طرز و اسلوب ، فنی اصول اور روایات و تجربات سب ہی شامل ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ کسی تنقید نگار کے تنقیدی تاثرات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے اس کے تنقیدی نظریات کا علم ہونا نہایت ضروری ہے -

مولانا قادری بنیادی طور پر ایک بلند پایہ نقاد و محقق ہیں اور بڑی حد تک حالی و شبلی کے قبیل کے ایک فرد نظر آتے ہیں- وہ انگریزی ادب اور جدید مغربی تنقید کے اصول و نظریات سے واقفیت رکھتے ہیں - روزمرہ و محاورہ ، زبان و بیان اور عروض و قواعد کی غلطیاں ان کی طبیعت پر گراں ہوتی ہیں اور اگر دیکھا جائے تو یہی چیز مشرقی تنقید کا طرۂ امتیاز ہے اسی لیے مغربی تنقید سے واقف ہونے کے باوجود ان کی تنقید میں مشرقی

اثر زیادہ نمایاں ہے اور اس کا اعتراف وہ خود بھی بعض کرتے ہیں :

"انقلاب جدید کے اثرات سے اردو شاعری کے موضوعات میں تغیر ہوجائے۔
قدیم اصناف تبدیل ہوجائیں، نئے تجربات کئے جائیں ، نئی افادی حیثیت پیدا
کی جائے، کوئی مضائقہ نہیں مگر ہندوستانیت فنا نہ ہونی چاہئے ، مشرقیت نہ
تباہ ہوجائے ۔" (۱)

نقطۂ نظر کے سلسلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا بڑا احساس رہا ہے اور
محاسن و معائب دونوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، اور کیا مجال کہ تنقید میں کہیں بھی
ذاتی تعصب یا بے جا طرف داری شامل ہوجائے ۔ ان کی تنقید اول و آخر تنقید ہوتی
ہے اور تقریظ کا رنگ اختیار نہیں کر پاتی ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض ناقد کسی بڑے
شاعر کی شخصیت و بڑائی کے رعب سے اس کی ادنیٰ تخلیقات کو بھی اعلیٰ قرار دے دیا کرتے
ہیں ۔ مولانا قادری اس بات کے قائل نہیں انہوں نے بغیر کسی رو رعایت اور لاگ لپیٹ کے
وہی بات کہی ہے جسے وہ جائز و حق تصور کرتے ہیں ۔ قادری صاحب کی مشرق پرستی کا
رنگ ان کی مشہور تنقیدی کتاب "نقد و نظر" میں جا بجا نظر آتا ہے ۔ آج غالب کی غالبیت
اور اَلّٰہیت و اَولیتُ سے کسے انکار ہے مگر مولانا قادری "نقد و نظر" میں غالب پر تنقید
کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"دیوان غالب سے زیادہ کوئی دیوان نہ پڑھا گیا، نہ سمجھا گیا، نہ
چھاپا گیا اور یہ جو کچھ بھی ہوا بالکل بجا ہوا، انیسویں صدی کا کوئی شاعر
غالب سے زیادہ اس کا حق دار نہیں تھا۔" (۲)

اور یہ حقیقت ہے کہ آج غالب حلقۂ شام و سحر سے نکل کر زندۂ جاوید ہوگئے ہیں۔

---

(۱) کشتہ، مولوی عبداللطیف خان، "حامد حسن قادری" (مضمون) ، "اردو نامہ"، کراچی :
جنوری تا مارچ، ۱۹۶۵ء، شمارہ ۱۹، ص ۱۶

(۲) حامد حسن قادری، مولانا، "نقد و نظر"، آگرہ : آگرہ اخبار پریس، ۱۹۳۲ء، ص ۱۲-۱۱

مگر مولانا قادری غالب کی غالبیت سے قطعی مرعوب نہیں وہ ان پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" غالب پرست یہ بات بھول گئے کہ غالب شاعر ہونے کے ساتھ انسان بھی تھے اور ذرا ٹیڑھے آدمی تھے - اوروں سے بچ کر چلنے اور اپنی راہ الگ نکالنے کی ان کو ایسی دھن تھی کہ جدّت آفرینی میں قواعد زبان، اصول شاعری وغیرہ کسی چیز کی پروا نہ کرتے تھے - جو لوگ ان سے مرعوب ہوچکے تھے ، انھوں نے کلام غالب کو آیت و حدیث سمجھا اور ایک ایک لفظ ، محاورے ، خیال ، اسلوب کو اٹل ، محکم اور ملہم سمجھ کر اس کو معنی پہنانے شروع کردیے - کم نقاد ایسے تھے جنھوں نے بجائے خود غور کرکے فیصلہ کیا اور اغلاط غالب بیان کئے - حقیقت یہ ہے کہ غالب نے وہ سب غلطیاں کی ہیں جو شاعری میں ہوسکتی ہیں اور شاعر سے نہیں ہونی چاہئیں-" (۱)

اس ضمن میں انھوں نے غالب کے یہاں محاورں کا غلط استعمال تعقید لفظی و معنوی، غرابت الفاظ اور غیر مانوس تشبیہات وغیرہ کی متعدد مثالیں " نقد و نظر " میں پیش کی ہیں- اس سے ان کا مقصد غالب کی مخالفت کرنا نہیں بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک اعلا شاعر کے تو وہ غالب کے مدّاح و قدردان ہیں مگر جہاں جہاں غالب کے یہاں خامیاں ہیں وہاں بحیثیت ایک ناقد کے ان پر تنقید کئے بغیر نہیں رہتے - مگر یہ حقیقت ہے کہ ~~غالب کہ~~ غالب ان کے ذہن پر بھی غالب تھے جس کا اعتراف وہ خود بھی یوں کرتے ہیں :

" مجھے غالب ہمیشہ سے پسند ہے ، بہت پڑھا ہے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے - میں اس کو قدیم غزل کا مجدّد اور جدید غزل کا محسن مانتا ہوں غالب نے اپنے دیوان فارسی کو " دین سخن" کی " ایزدی کتاب" کہا ہے - میں اس قول کو اردو دیوان کے حق میں درست سمجھتا ہوں-" (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " نقد و نظر"، محولہ بالا ، ص ۱۲

(۲) ایضاً، ص ۱٦

وہ غزل گو شعراء سے جس قسم کا طرز و اسلوب (Diction) طلب کرتے یا جو

جو توقعات رکھتے اور غزل میں جو جو خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں اس کے سلسلے میں لکھتے

ہیں کہ :

" غزل کا لطف و اثر اس بات پر منحصر ہے کہ صحیح جذبات، اصلی
واردات اور سچّی معاملات بیان کئے جائیں، پیرایۂ بیان موثر ہو، تخیل کا رنگ
دیجرل ہو، الفاظ شیریں، بندشیں چست، معانی صحیح اور صنائع لفظی و
معنوی قریب الفہم ہیں۔" (۱)

قادری صاحب چوں کہ قدیم طرز تنقید کے دبستان سے متعلق ہیں اس لیے وہ
الفاظ کی صحت و موزونیت کا بہت خیال رکھتے ہیں - زبان و محاورہ کی غلطیاں جیسا کہ
اوپر بیان کیا ان کو فوراً کھٹک جاتی ہیں اور یہی چیز مشرقی تنقید کے لیے بڑی اہم اور
امتیازی حیثیت رکھتی ہے -

اس سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ :

" پہلے تنقید کا مدار شعر کے ظاہر پر ہوتا تھا مثلاً محاورہ درست ہے
یا نہیں۔ زبان کی کوئی غلطی تو نہیں، بندش کیسی ہے، قافیہ ٹھیک بیٹھا ہے
یا نہیں -" (۲)

اس معاملے کے سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے
لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انھوں نے حسرت موہانی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا اور ایک خط میں
مولانا قادری کو لکھا کہ " حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کے بے نقاب
کرنے کے لیے مندرجہ ذیل عنوانات انتخاب کئے گئے ہیں۔" قادری صاحب نے لفظ " بے نقاب" کے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " نقد و نظر"، محولہ بالا، ص ۱۶

(۲) عبدالحق، ڈاکٹر مولوی " یادحالی" (مضمون) " اردو" (سہ ماہی)، جولائی، ۱۹۳۷ء

استعمال کو پسند نہیں کیا اور جواباً خط میں تحریر کیا کہ :

" محاوروں کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے - ان کی صحت ، رواج عام، اور قبول خاطر پر منحصر ہوتی ہے اور محاورے کے مختلف پہلو اور مختلف استعمال معنی میں فرق پیدا کردیتے ہیں ..... آپ نے " بے نقاب" کے حقیقی اور مجازی معنی پر غور نہیں کیا اور چار شاعروں کی مثالیں لکھ دیں جن میں سے ایک بھی آپ کے لیے مفید نہیں، اس لیے کہ ان سب میں حقیقی معنی مراد ہیں۔ یعنی چہرے سے نقاب اٹھانا ، طالب الوری، اور جوش کے اشعار میں تو حقیقی معنی ظاہر ہیں۔ اقبال کے شعر میں " از رخ معنی " کے الفاظ نے مجاز کو حقیقت سے مشابہ کردیاہے - یعنی نقاب بہرحال رخ سے اٹھایا گیا ہے - اگرچہ معنی کا رخ ہے - چہرے کا بے نقاب ہونا ، سیرت کا بے نقاب ہونا ، زندگی کا بے نقاب ہونا ، قابلیت کا بے نقاب ہونا ، دعوے کا بے نقاب ہونا اور بات ہے - ان میں لا محالہ معائب ومثالب کا بھی بے نقاب ہونا مفہوم ہوتا ہے بلکہ ذہن سب سے پہلے معائب ہی کی بے نقابی کی طرف منتقل ہوتا ہے اس لیے اس محاورے کو کسی ایسے شخص کے متعلق استعمال کرنا مناسب نہیں جس کا احترام مد نظر ہو - مثلاً اگر زید نے غالب کے متعلق لکھا ہے تو میرے نزدیک درست ہے اس لیے کہ اس کا کوئی خاص احترام مجھے مد نظر نہیں اور مجھے اس کی زندگی اور شاعری دونوں میں معیوب پہلو نظر آتے ہیں اور بعض پہلو اب تک واقعی پوشیدہ بھی ہیں یا تھے لیکن یہ فقرہ حسرت موہانی کے لیے لکھا جائے تو میں پسند نہ کروں گا -" حسرت موہانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنا"- اس کو بار بار پڑھئے ، دیکھئے اور سوچئے - صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مذموم پہلو بیان کرنے ہیں - ایک عرصہ ہوا "نگار" اور" نیرنگ خیال" میں مضمون بازی ہوئی تھی آرگس نے ایک مضمون لکھا تھا -" غالب بے نقاب" اس کا جواب دیا گیا " آرگس بے حجاب " - " غالب بے نقاب" کے الفاظ ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غالب کے معائب کا بیان ہے - یہ ہماری زبان ، محاورے اور رواج کی بات ہے ، ہو سکتا ہے ایران میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہ لیا جائے -" (۱)

---

(۱) خواجہ احمد فاروقی ، ڈاکٹر ، " حامدحسن قادری" ، (مضمون) ،" نقوش " لاہور : جنوری ، ۱۹۵۵ ع، ش ۴۷ و ۴۸ ، (شخصیت نمبر) ، صص ۹۱-۲۸۹

خواجہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ اس خط کے بعد انہوں نے پھر لکھا کہ کیا حسرت کی زندگی اور شاعری کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ ہم ان میں سے کسی رائے سے متفق ہوں اور کسی رائے سے نہ ہوں - کم از کم ان کی شاعری پر تو " منحرفانہ " نظر بھی ڈالی گئی ہے اور ابھی حال میں ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بعض اعتراضات ایسے کئے ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتے - اس کے جواب میں پھر مولانا نے تحریر کیا کہ :

" میرا اب بھی وہی خیال ہے زندگی کو بے نقاب کرنے اور شاعری کو بے نقاب کرنے میں فرق ہے - حسرت کی شاعری کو جتنا چاہئے بے نقاب کیجئے لیکن جب کہئے گا حسرت کی زندگی کو بے نقاب کرنا ہے تو فوراً ذہن ان کے عیوب اخلاقی کی طرف جائے گا -" (۱)

ڈاکٹر شادانی نے حسرت پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ میں نے حرف بہ حرف کئی بار پڑھے ہیں اور ان کا جواب ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا ہے - آپ کہتے ہیں اٹھائے نہیں اٹھتے - میں نے سب اٹھادئے کوئی پڑا نہ رہا - ڈاکٹر صاحب سے میری پرانی شناسائی ہے ۲۶ سال کی وہ مجھ سے بڑا خلوص رکھتے ہیں - ان کے اعتراضات ایک خاص نظر کی بنا پر ہیں اور صرف حسرت کی ذات پر نہیں بلکہ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر جگر و حسرت تک ہزاروں شاعروں پر ہیں بلکہ ایران ، عرب اور مصر وغیرہ سب ان کی زد میں ہیں۔" (۲)

قادری صاحب کی تنقید نگاری سے پتا چلتا ہے کہ ان کی تنقیدیں غور و فکر کی دعوت دے کر ادبیات کو اک نئے انداز سے دیکھنے و پرکھنے کی طرف مائل کرتی ہیں۔ وہ تنقید کے محور و مرکز سے بخوبی واقف ہیں یہی سبب ہے کہ وہ خود بھی شعر و ادب اور نقد و تنقید کے قواعد و ضوابط پر سختی سے عمل پیرا رہتے اور اس کے مباحث و مسائل پر خصوصیت سے زور دیتے ہیں۔ تنقید کا صحیح ذوق رکھنے کے ساتھ خود بھی ایک ادیب و

---

(۱) خواجہ احمد فاروقی ، ڈاکٹر: حامد حسن قادری "،(مضمون) ،" نقوش" محولہ بالا ، ص ۹۱ -۲۸۹

(۲) ایضاً ، ص ۹۱-۲۸۹

شاعر ہیں لہذا وہ صرف تنقید ہی نہیں کرتے بلکہ ادیب وشاعر کی ذات میں پختگئی عقل و شعور اور بلندئ فکر و نظر کے متلاشی رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارا ادیب و شاعر قدروں کا نباض اور زندگی کا معمار ہو، وہ ہم کو مغربی اقدار و خیالات سے نجات دلاکر مشرقی فضا میں رہتے ہوئے بالیدگی و سربلندی کا درس دے ۔ عصمت چغتائی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ :

" تنقید کرنے والے کا مرتبہ اگر وہ ایمان داری سے اپنا فرض انجام دے تو بہت بلند ہے ایک طرف وہ ادیب کے دماغ کو خوراک پہنچاتا ہے تو دوسری طرف وہ ادب کی حفاظت کرتا ہے ۔" (۱)

مولانا مشرقی ادب پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر بھی اچھا خاصا عبور رکھتے ہیں۔ وہ ایک دقیقہ سنج ، نکتہ رس اور سنجیدہ ذوق کے حامل ہیں۔ ان کی تنقید میں علمی و شعوری پہلو نمایاں ہے ۔ اس کےعلاوہ ذہانت و فطانت ، بے باکی، و دراکی اور نگاہ کی دور رسی ایسی خصوصیات ہیں جو ایک کام یاب تنقید نگار کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں اور یہ ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ تنقید میں ادھیں ابھی ذمہ داری کا بڑا احساس رہتا ہے ۔"نقد و نظر" کے موقع پر وہ محاسن و معائب دونوں پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور کی رائیں نہایت صائب اور مدلل ہوتی ہیں۔ رائے دینے میں وہ بڑے نڈر اور بے باک ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ مگر ساتھ ہی شریف النفسی کا بھی عالم یہ ہے کہ ادبی حیثیت کو کبھی ذاتیات کی طرف مائل نہیں ہونے دیتے ۔ علامہ سیماب اکبر آبادی سے ان کے بڑے بڑے علمی مجادلے ہوئے لیکن دونوں ایک دوسرے کا دل و جان سے ادب کرتے رہے ۔ مولانا سیماب اکبر آبادی کی وفات پر بھی

---

(۱) عصمت چغتائی، " " (مضمون) ، " جائزہ"، کراچی : اگست ، ۱۹۵۹ء ، ص ۱۰۷

جیسی نئی و نادر تاریخ مولانا قادری نے کہی کوئی دوسرا نہ کہہ سکا۔ ان کی ان ہی خصوصیات سے پتا چلتا ہے کہ ان کا مقصد خوردہ گیری نہیں بلکہ اصلاح ہے -

علم عروض کی اصطلاح میں شعر کی کامل تعریف یہ ہے کہ وہ موزوں اور با اثر ہو، بعض لوگ کہتے ہیں کہ شعر کے لیے موزونیت ضروری نہیں کیوں کہ شاعرانہ خیالات نظم کی بجائے نثر میں بھی ادا کیے جاسکتے ہیں - کلام کا موزوں اور اثر انگیز ہونا اس کا سب سے بڑا جوہر ہے - اس طرح شاعری بظاہر تو دلی جذبات کے اظہار کا نام ہے لیکن اس میں ذوق و شوق ، سرمستی و سرشاری ، جذب و اثر کشش و کم قرار و بے قراری گویا زندگی کی تمام تلخیاں اور راحتیں ملتی ہیں۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر شاعری کو ساحری بھی کہا گیا ہے مولانا قادری نے بھی شاعری کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

" نفس شاعری ردیف و قافیہ وزن و بحور کی قید سے بھی آزاد ہے - ہر اچھوتا خیال ایک شعر ہے اور ہر خوب صورت اظہار جذبات ایک غزل - لیکن شاعری بحر ، وزن، قافیہ و ردیف کی محتاج ہے اور بلا شبہ یہ چیزیں اس کے لیے زینت و آرائش ہیں۔ شاعری اصل میں جذبات کو نغمہ کی شکل دینے کا نام ہے - یا دل کو الفاظ کی شکل میں منتقل کردینے کے لیے جو مناسب ہو یا الفاظ کو جو موزوں ہیں لیکن اس میں شاعری اس طرح کی جاتی ہے کہ ایک قافیہ کو ذہن میں رکھ کر اس کے متعلق مضمون تلاش اور نظم کیا جاتا ہے اور یہ صورت بھی شاعر کے مخصوص اسلوب بیان، اور پایۂ تخیل کے اظہار کرنے میں مانع نہیں ہوتی ، شاعر ہر حالت میں شاعر ہے اور اس کی خصوصیات ہر جگہ نمایاں۔" (١)

اس بیان سے ہمیں مولانا کے نظریۂ شعر و سخن کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ شعر و سخن کے محاسن و معائب پر کس قدر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر

---

(١) حامد حسن قادری، مولانا ؛ غالب، مومن، ذوق"، (مضمون) ؛ نگار" لکھنو: جون، ١٩٢٧ء، ص: ٦٣

یہ ہے کہ شعر میں صحت زبان ہو، حسن بیان ہو، لطافت تخیل ہو اور عروض و قوافی کی پابندیاں ہوں -

ادب میں بحیثیت تنقید نگار کے مولانا کا مقام متعین کرنے کے لیے ہمیں ان کی ان تنقیدی کتب کا جائزہ لینا ہوگا جو ان کے تنقیدی اصول و نظریات کی آئینہ دار ہیں۔

مولانا قادری کی تنقیدی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :

۱- تاریخ و تنقید ،

۲- نقد و نظر ،

۳- تاریخ مرثیہ گوئی ،

۴- شاہکار انیس ،

۵- انتخاب دیوان مومن ،

۶- کمال داغ ، اور

۷- کمال فانی -

تاریخ و تنقید :

" تاریخ و تنقید " مولانا قادری کی اہم اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی وقیع تصنیف ہے - کیوں کہ اس میں انھوں نے اردو زبان کی اہمیت و افادیت ، سیرت و قبولیت اور وسعت و گہرائی کے سلسلے میں علمی و تاریخی اعتبار سے بحث کی ہے اور ہر دور کے مشاہیر شعرا کے حالات اور نمونہ ہائے کلام کو پیش کرتے ہوئے ان پر تبصرہ بھی کیا ہے - شاعری میں عہد بعہد جو تغیرات رونما ہوتے رہے ان کی بھی نشان دہی کی ہے - دہلی اسکول ، لکھنو اسکول اور جدید اسکول کا فرق واضح کیا ہے - اصناف شاعری کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے اور نظم اردو پر تنقید بھی کی ہے - مختصر یہ کہ اس میں شاعری

کے تمام پہلوؤں پر سیدھے سادے انداز میں تنقید کی گئی ہے ۔

یہ کتاب دراصل مولانا قادری کے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے سینٹ جانس کالج آگرہ میں طلباء کی سہولت کے پیش نظر ترتیب دئے ۔ اس کے متعلق وہ" تاریخ و تنقید" کے دیباچے میں خود رقم طراز ہیں :

" ان مضامین تاریخی و تنقیدی کے متعلق مجھے ایجاد و جدت کا دعوا نہیں ان میں سے بعض مضامین میں نے اپنے کالج کے طالب علموں کے لیے بطور کلاس نوٹس کے تیار کئے تھے۔ بعض کسی تحریک یا فرمائش سے لکھے ہیں اور " نگار" لکھنو، عالمگیر" لاہور" " کنول" آگرہ ، " تسنیم" آگرہ وغیرہ رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان مضامین میں کہیں کہیں ایک ہی موضوع یا بیان کی تکرار ملے گی لیکن عام شائقین ادب کی دل چسپی اور فائدے سے خالی نہیں ہے ۔"(۱)

مولانا کا پہلا مضمون "مسئلہ زبان اردو" سے متعلق ہے اس میں وہ اردو کی ابتدا و ارتقا کے متعلق تحریر کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

" اردو زبان تیرھویں صدی عیسوی میں بننی شروع ہوئی لیکن وہ شروعات ہی تھی سولھویں صدی تک بول چال میں داخل ہوگئی اور اردو نثر و نظم کی تصنیف کا آغاز ہوگیا ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کو جس قدر وسعت اور سہولت حاصل ہوئی ، حیرت انگیز ہے ۔ اور آج بیسویں صدی میں ہماری زبان اور ہمارا لٹریچر دنیا کی بڑی اور بہترین زبانوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہونے کے قابل ہے ۔ اپنی ایک شان انفرادی رکھتا ہے اور اپنے امتیاز خصوصی کا حامل ہے ۔" (۲)

اس مضمون میں انھوں نے اردو کی ارتقا کے سلسلے میں ولندیزوں ، پرتگالیوں ، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے متعلق بتایا ہے کہ اگرچہ ان لوگوں نے تجارتی اغراض اور سیاسی

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا" تاریخ و تنقید"، آگرہ : آگرہ اخبار پریس، ۱۹۳۹ء
(دیباچہ) ، ص ۱

(۲) ایضاً ، ص ۲

مقاصد کے لیے اردو زبان سیکھی مگر ان میں ہی ایک ایسا محقق و شیدا بھی نکلا جس نے پیرس کے السنۂ شرقیہ کے کالج میں اس ہندوستانی زبان کی پروفیسری سنبھالی اور اس نے اردو کی متعدد کتابوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ۔ اردو ادب و تاریخ اور صرف و نحو پر بھی کتابیں لکھیں اور اردو زبان کی ابتدا و ترقی پر متعدد لکچر بھی دئے۔ یہ لیکچر تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہیں اور انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے " خطبات گارسین دتاسی" کے نام سے شائع کئے ہیں۔

خطبات گارسین دتاسی کا مقدمہ تحریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں :

" ان خطبوں کو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے اردو زبان سے دلی لگاؤ ہے وہ اسے ہندوستان کی ترقی پذیر اور عام زبان خیال کرتا ہے اور ہر موقع پر ہندی کے مقابلے میں اس کی حمایت کرتا ہے اور اس کے فروغ اور ترقی کا دل سے خواہاں ہے ۔" (۱)

مولوی عبدالحق صاحب نے اسی مقدمۂ خطبات میں ایک اور مقام پر اردو زبان و ادب سے گارسین دتاسی کا ذوق و شوق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

" ہندوستانی زبان سے اس کا شغف عشق کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا کارنامہ اس قدر وسیع ہے کہ وہ ہماری زبان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ ایک لمحے کے لیے سوچئے اور دیکھئے کہ یہ منظر کس قدر عجیب اور دل چسپ ہے کہ ایک بڈھا فرانسیسی عالم ہندوستان سے کالے کوسوں دور پیرس کی بڑی یونیورسٹی میں اپنے یورپین شاگردوں کو (جن میں فرانسیسیوں کے علاوہ دوسری اقوام کے لوگ بھی شریک ہیں) ہندوستانی زبان پر بڑے جوش اور شوق سے لیکچر

---

(۱) عبدالحق، ڈاکٹر مولوی: " خطبات گارسین دتاسی" دہلی : انجمن ترقی اردو (ہند)، ، (مقدمہ)، ص

دے رہا ہے اور ان کے دلوں میں اس غریب زبان کا شوق پیدا کر رہا ہے ۔ اپنی فرصت کا تمام وقت اسی زبان کی تحقیق میں صرف کرتا ہے اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں سے خط و کتابت کرتا ہے ، ایک ایک کتاب ایک ایک اخبار اور رسالے کا حال پوچھتا ہے ۔ قلمی نسخوں کی نقلیں منگواتا ہے ، ان کی تصحیح کرتا ہے ۔ مرتب کرکے چھپواتا ہے خود اس کی زبان کی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتا ہے، اور ہندوستانی ادب کے مختلف شعبوں پر بحث کرتا اور اس کی مفصل اور مبسوط تاریخ لکھتا ہے ۔" (۱)

اردو کی قدردانی و قبولیت کے سلسلے میں گارسیں دتاسی ، ڈاکٹر جان گل کرائسٹ، ڈاکٹر فیلن اور کرنل ہالرائڈ کی خدمات تو عام اردو داں طبقہ پر بھی ظاہر و آشکار ہیں لیکن مولانا تحقیق و تفحص سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

" اردو کے لطف سخن نے اہل یورپ کو بھی گرویدہ کیا ، انگریزوں اور فرانسیسیوں میں درجنوں اردو شاعر ہوئے ہیں ۔ جن میں سے بعض صاحب دیوان بھی ہیں ۔ ان اہل یورپ میں شاعر خواتین بھی شامل ہیں انگریزی خاتوں نے ملکہ ، حجاب ، مخفی وغیرہ تخلص اختیار کئے اور شعر گوئی میں اساتذہ کی شاگردی کی ۔" (۲)

مس بلیک متخلصہ بہ خفی کاایک دل چسپ شعر ہے :

" خود شوق اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ تری ایک بھی دانے کے نہیں ہم "

مولانا کے تحقیقی رجحان کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ اعداد و شمار کا ذکر کرتے وقت بھی وہ تحقیق کو مد نظر رکھتے ہیں مثال کے طور پر غیر منقسم ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد کے متعلق تحریر کرتے ہیں :

---

(۱) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی ، " خطبات گارسیں دتاسی"، محولہ بالا ، (مقدمہ) ص
(۲) حامد حسن قادری ، مولانا " تاریخ و تنقید"، محولہ بالا ، ص ۳

"اس حساب سے ان مقامات کے اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ہوئی - اس میں غیر زبان والے صوبوں کے اردو سمجھنے والوں کو شامل کرلیا جائے تو اردو سمجھنے والے کم سے کم ۲۵ کروڑ ہوتے ہیں یعنی ہندوستان کی آبادی کا $\frac{۳}{۴}$ حصّہ .... ہندوستان سے باہر بھی اردو بولنے اور سمجھنے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں ان ممالک میں سے بلخ، بخارا، گلگت، ختن، عرب، عدن، وغیرہ میں اردو کے مدرسے قائم ہیں۔ افریقہ، زنجبار، سیلون میں بھی بعض مقامات پر اردو پڑھائی جاتی ہے - انگلستان، جرمنی، جاپان وغیرہ متعدد ممالک میں وہاں کے باشندے اردو کے قدردان و ماہر ہیں۔ بعض یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے - ڈاکٹری کے ڈپلومے کے لیے اردو لٹریچر بھی ایک مضمون تسلیم کیا گیا ہے - جس کے متعلق علمی و تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے -"

کسی زبان کی وسعت و مقبولیت کا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترویج و اشاعت کا سلسلہ جاری رہے اس کے علاوہ قبول عام کا ایک معیار کسی زبان کے رسائل و اخبارات بھی ہوا کرتے ہیں - اردو کی ترویج و اشاعت اور مقبولیت کے سلسلے میں اخبارات و رسائل کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے :

"ہندوستان کی زبانوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور علمی و ادبی زبانیں پانچ ہیں : " اردو، ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی"- ان میں سب زبانوں کے اخباروں سے پہلے اردو زبان کا اخبار جاری ہوا- ۱۸۱۰ع میں پہلا اردو اخبار مولوی اکرم علی کی ایڈیٹری میں کلکتے سے نکلا - ۱۸۳۵ع میں اخبارات کو از روئے قانون آزادی حاصل ہوئی تو تین سال کے عرصے میں تین اخبار دہلی سے جاری ہوئے -"سراج الاخبار"، "دہلی اخبار"، "سید الاخبار" - ۱۸۳۷ع ہی میں اردو کا سب سے پہلا ماہوار رسالہ "خیر خواہ ہند" ایک پادری نے مرزا پور سے نکالا - ۱۸۳۵ع سے ۱۸۵۷ع تک کم سے کم ۳۵ اردو اخبار و ماہوار رسائل کے علاوہ جاری ہوئے - پھر ۱۸۵۷ع سے ۱۹۰۰ع تک ۲۵، اخبار اور شائع ہوئے - اردو کے روزانہ اخبارات ہندوستان تقریباً نکلے ہیں - ہفتے وار نکلے

سے زیادہ اور رسائل ڈیوڑھے - مجموعی تعداد دگنی کے قریب ہے -" (۱)

اخبار پائنیر(Pioneer) مورخہ ۱۸ اپریل، ۱۹۳۳ع کے حوالے سے اردو زبان کی قبولیت اور دور رسی کا ایک دل چسپ و مثالی اور قابل ذکر واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

" لندن میں ایک انگریز اور ایک ڈچ (باشندۂ ہالینڈ) کے درمیان ایک اہم کاروبار طے کرنے کے سلسلے میں ملاقات کا وعدہ ہوا، لیکن جب ملے تو دونوں ایک دوسرے کی زبان سے نا آشنا نکلے اور چوں کہ انگریز کو یہ خیال تھا کہ ڈچ کو انگریزی زبان آتی ہوگی اس لیے کسی ترجمان کا بھی انتظام نہ تھا۔ جب ڈچ نے اٹھ کر جانے کا ارادہ کیا تو آخر میں انگریز کو خیال آیا کہ لاؤ ہندوستانی زبان کی آزمائش کرلیں - اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ ڈچ یہ زبان سمجھ گیا اور معاملہ انجام پاگیا-" (۲)

اردو زبان و ادب کے وہ کس قدر شیدائی تھے اس کی ایک زندہ اور قابل ذکر مثال یہ ہے کہ وہ اتر پردیش بھارت کے ایک عظیم الشان اور مثالی کرسچین کالج " سینٹ جانس کالج آگرہ " میں پروفیسر تھے جہاں ملک کے مقتدر لیڈر اور بڑے بڑے دانشور اور علماء و فضلاء آنے پر بڑا فخر محسوس کرتے تھے مگر جب مولانا کو اردو رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں گاندھی جی کے خیالات کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی تردید نہایت ہی واشگاف و واضح انداز میں کی اور کہا :

" زبان و ادب کا جیسا گہرا تعلق اس کے رسم الخط سے ہے ایسا ہی گہرا تعلق اس کے مخصوص نام سے ہے - یہ نظریہ کم سے کم اردو زبان پر نہایت منطبق ہے - اردو زبان اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب اس کا رسم الخط قائم رہے اور اس کا رسم الخط اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اس کا نام اردو باقی رہے-" (۳)

---

(۱) حامدحسن قادری، مولانا "تاریخ و تنقید"، محولہ بالا، ص ۱۱

(۲) ایضاً، ص ۱۱

(۳) ایضاً، ص ۱۸

اور جب انھوں نے مدراس کے ھندی سمیلن میں کی گئی گاندھی جی کی تقریر سنی جس میں انھوں نے کہا تھا :

" ھندی اس زبان کا نام ہے جسے ھندو اور مسلمان دونوں بولتے ھیں، اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ھے - اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ھندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ھندی پر مشتمل ھو -"(۱)

گاندھی جی کی ان باتوں کی بھلا مولانا جیسا مرد مومن کہا تاب لاتا مولانا نے کہا " کہ گاندھی جی کی یہ تعریف اردو زبان کی حیات و بقا کے لیے تو مضر ہے ھی ساتھ ھی اس کا تسلیم کرنا ھندو اور مسلمان دونوں کے ضمیر کے خلاف ھے اس لیے ھندو اور مسلمان دونوں کو اس کی مخالفت کرنا لازم ہے اور اردو کی امتیازی حیثیت کو قائم رکھنا دونوں پر فرض ھے -" لہذا انھوں نے گاندھی جی کی تقریر پر تبصرہ کرتے ھوئے لکھا :

" گاندھی جی کی تعریف و توضیح کے مطابق میر، سودا، ھندی کے شاعر تھے - ناسخ و آتش ھندی کے شاعر تھے- مومن و غالب ھندی کے شاعر تھے - حالی و اقبال ھندی کے شاعر تھے ، جگر و جوش ھندی کے شاعر ھیں- فراق گورکھپوری اور جگر بریلوی ھندی کے شاعر ھیں- مولانا آزاد کی آب حیات ھندی زبان کی تاریخ ہے - مولانا شبلی کی شعر العجم ھندی کی تصنیف ھے - مولانا عبدالحق کے مقدمات و تنقیدات ھندی کتابوں کے ریویو، ھندی زبان میں ھیں، زمانہ کان پور، معارف اعظم گڑھ ، نگار لکھنؤ، نیج دھلی، انقلاب لاھور، ھندی کے رسائل و اخبارات ھیں-" (۲)

اسی سلسلے میں آگے چل کر تحریر کرتے ھیں :

" ھر زبان چند عناصر کا مجموعہ ھوتی ہے رسم الخط ، الفاظ کا املا ،

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " تاریخ و تنقید"، محولہ بالا، ص ۱۹
(۲) ایضاً، ص ۱۹

انشاء کا طریقہ، بیان کا اسلوب ، محاورات ، روزمرہ ہر زبان کے لیے الگ اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک چیز کا بھی بدلنا زبان کے امتیاز و اعتبار کو کم کردیتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہرزبان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ۔ ایک علمی و ادبی دوسری عام فہم و کاروباری دنیا کی ہر زبان ان دونوں صورتوں کے ساتھ قائم ہے اور دونوں قسموں کا ایک ہی نام ہے ۔ عربی زبان میں حماسہ ، مقامات حریری کا قدیم و ادق لٹریچر بھی باقی و رائج ہے اور جرجی زیدان کے ناول بھی مقبول ہیں اور ان کی زبان کا نام عربی ہے ۔ فارسی میں خاقانی و ظہوری کی مشکل نظم و نثر بھی درسیات میں شامل ہے ۔ اور بہار مشہدی و سیاحت نامہ ابراہیم بیگ بھی مطالعہ میں داخل ہیں اور دونوں کی زبان فارسی ہی کہلاتی ہے ۔ انگریزی میں شیکسپیئر و ملٹن ، ایمرسن و اسٹیونسن کی تصانیف بھی برقرار ہیں۔ اور برناڈ شاہ، ہارڈی ، ولیم لیکے اور چارلس گاروس کے فسانے بھی عام پسند ہیں۔ اور ان کی زبان کا ایک ہی نام انگریزی ہے ۔ ان سب زبانوں میں اخبارات جاری ہیں اور ان کی زبان اس قدر آسان ہوتی ہے کہ تھوڑا سا لکھا پڑھا مزدور اور شوفر بھی سمجھ لیتا ہے اور یہ فارسی یا انگریزی ہی کے اخبارات کہلاتے ہیں۔

اسی طرح اردو زبان کا عالم و طالب علم، غالب و اقبال ، شبلی و عبدالحق کی ادبیات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ، اور معمولی اردو خواں کو ناول ایجنسی اور دارالاشاعت پنجاب کے فسانوں اور ڈراموں کی ضرورت ہے ۔ رسالہ " معارف " و " اردو" کے عالمانہ و ادیبانہ مقالات بھی ناگزیر ہیں اور روز نامہ زمین دار و تیج کے بغیر بھی کام نہیں چل سکتا ۔ اور یہ تمام لٹریچر ایک اردو کے نام سے موسوم ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے ۔"

مولانا قادری کی ابتدائی ہوشی آواز کارگر ثابت ہوتی اور اثر لائے بغیر نہ رہ سکی مسلمان تو گاندھی جی کی رائے سے کسی طرح اتفاق کر ہی نہ سکتے تھے خود اس دور کے ہندو رہنما بھی ان کے ہم نوا نہ ہوئے اور سر تیج بہادر سپرو نے " بزم اقبال آگرہ " کے سکریٹری ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کو " بزم اردو" کی تقریب کے موقع پر لکھا :

" جس اختراع و صرف کے ساتھ آج کل اردو کے اوپر ہاتھ ڈالا جارہا ہے اس پر مجھے سخت اعتراض ہے اور میں ہرگز یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ جس زبان کو دہلی اور لکھنو کے اساتذہ نے دو ڈھائی سو برس مانجھ کر اس مرتبہ پر پہنچایا ہے ، اس طرح سے برباد کیا جائے۔ میں اردو کو مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا یہ ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان ہے اس کی پیدائش و نشو و نما میں دونوں نے حصہ لیا ہے اور میں اس کو ترکۂ مشترکہ ناقابل تقسیم سمجھتا ہوں ۔ یہ ہی ایک زبان تھی جس نے سترھویں ، اٹھارویں ، انیسویں صدی میں ہندو اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خیالات اور مذاق کو سمجھنے کی قابلیت پیدا کی ۔ مجھے اردو میں بلا ضرورت غیر مانوس الفاظ سنسکرت اور عربی کی آمیزش پر یکساں اعتراض ہے ۔ اس وقت بھی ہندو اور مسلمانوں میں ایسے عالم موجود ہیں کہ جو دقیق سے دقیق خیالات کو نہایت آسان اور عام فہم اردو میں ادا کرسکتے ہیں ۔ دیہاتی اور شہری زبان میں ہر ملک میں اور ہر زمانے میں فرق رہا ہے ۔ اگر اردو کے اوپر یہ اعتراض ہے کہ بعض الفاظ دیہاتیوں کی سمجھ سے باہر ہیں تو ہندی میں اور خصوصاً اس ہندی میں جو آج کل بولی جاتی ہے صدہا الفاظ ایسے ہیں جو دیہاتی نہیں سمجھ سکتے اور میں سے کم گشتہ ہندو جنھوں نے دوسری فضا میں تعلیم پائی ہے نہیں سمجھ سکتے۔ میں ایک زمانے میں یہ خیال کرتا تھا کہ لفظ " ہندوستانی" بجائے " اردو " کے زیادہ مناسب ہوگا مگر اس عرصے میں جو تجربہ ہوا اس نے مجھے اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کیا ہے ۔ مجھے ہندی کی ترقی پر اعتراض نہیں ہے ۔ انسان جتنی زبانوں سے واقف ہو اس کے لیے اچھا ہے مگر جو مثالیں " ہندوستانی" کی میری نظر سے گذری ہیں ان کو نہ تو میں اردو کہہ سکتا ہوں اور نہ وہ غالباً ہندی ہیں۔" (۱)

مولانا قادری یہ بات خوب سمجھتے تھے کہ ہندوستانی نام رکھنے کی تجویز صرف اس لیے ہے کہ زبان عام فہم ہوجائے ۔ زبان اردو تو جب بھی مقبول تھی اور اب بھی اس سے کہیں زیادہ مقبول ہے ان کا کہنا بھی صرف یہی تھا کہ زبان کو زیادہ ہر دل عزیز

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "تاریخ و تنقید"، محولہ بالا ، ص ۲۶

اور عام پسند بنانے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس کو زیادہ سہل اور سلیس بنایا جائے اس معاملے میں مفکرین و مصلحین کی تجاویز ایک دوسرے سے مختلف تھیں ۔ مولانا قادری بھی اس کے متعلق لکھتے ہیں :

" بات یہ ہے کہ زبان بنائی نہیں جاتی بن جاتی ہے ۔ عام الفاظ ، روزمرہ اور طرز ادا کے لیے کوئی انجمن ، انتظامیہ اور مجلس شوریٰ منعقد نہیں ہوا کرتی۔ یہ چیزیں زبانوں اور کاغذوں پر آتی رہتی ہیں ، اور رواج کی کسوٹی ان کو کھرا یا کھوٹا ثابت کرتی رہتی ہے ۔ مشورہ اور قرار داد کی ضرورت علمی و تعلیمی اصطلاحوں کے لیے ہوتی ہے ۔ فلسفہ و منطق و ریاضی وغیرہ کی فرہنگوں کے لیے دارالترجمہ اور ماہر لسانیات کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اخباری و ملکی اصطلاحیں ، تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہونی شروع ہوتی ہیں اگر ان کو قبول عام حاصل ہوجاتا ہے تو رواج پاجاتی ہیں اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ مثلاً ترک موالات ، مظاہرہ ، مقاطعہ ، احتجاج ، اصرار وطن ، زعیم ملت وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جو بیسویں صدی سے پہلے رائج نہ تھے اور اب نہایت عام ہیں۔" (۱)

قادری صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے مغربی تہذیب و تمدن اور انگریزی تعلیم کے اثر سے بہت سے انگریزی محاورے اور طرز کلام بھی ہماری زبان اور تہذیب میں داخل ہوگئے ہیں مثلاً جب ہم کسی دوست سے کوئی چیز حاصل کرتے ہیں تو انگریزوں کی تہذیب کی طرح تھینکس (Thanks) کی بجائے شکریہ کہتے ہیں یہ اسی دور حاضر کی ایجاد ہے ۔ اسی طرح جب کسی کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے (I beg your pardon) تو ہم کہتے ہیں " معاف فرمائیے " ۔ اسی صورت سے لینا اور دینا کے معنی ہیں ۔ انگریزی میں دینا کے معنی درج کرنا یا لکھنا ہے لہذا ہم اب اردو میں بھی یہی کہتے ہیں کہ یونی ورسٹی نے طلبہ کے

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا : تاریخ و تنقید " ، محولہ بالا ، ص ۳۱

ناموں کی لسٹ نہیں دی وغیرہ (یعنی درج نہیں کی) اس طرح کے بہت سے الفاظ آج کل رائج ہیں ۔ مگر یہ سب زبان کے دائرے کے اندر اور زبان کی فطرت کے مطابق ہیں کیوں کہ کسی کی گفتار پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی اور پھر ہر علاقے کے لوگوں کی بولی اور طرز ادا کچھ مختلف ضرور ہوتی ہے ۔ اس طرح گفتگو میں تو کوئی قید لازم نہیں ہوتی مگر ادبیات کے لیے اس کی صحت و استناد لازم ہے اور جب کسی زبان کا شعر و ادب اساتذہ کے کلام و تحریر سے کوئی مطابقت نہ رکھتا ہو اور ٹکسال باہر ہو تو اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوا کرتی ۔ اس سلسلے میں قادری صاحب کا قول ہے :

" زبان کو آسان و عام فہم بنانے کے لیے نہ اردو کا نام بدلنے کی ضرورت ہے نہ حروف تہجی کو گھٹانے بڑھانے کی نہ املا تبدیل کرنے کی نہ مروج و مقبول الفاظ کی تصحیح کرنے کی ، نہ ہر غلطی کو بہ اصول جائز رکھنے کی ۔ ہاں املا و انشا میں تمام ممکن سہولتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ املا کی آسانی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی جو سالہا سال ہوئے پنجاب کے ماہران تعلیم نے تجویز و رائج کردی ہے ۔ یعنی نون غنہ پر نقطہ نہ لگایا جائے ۔ ہائے مخلوط کو دو چشمی لکھا جائے مشدد حرف پر تشدید لکھا جائے ۔ واؤ معروف پر الٹا پیش لگایا جائے۔ لفظوں کو الگ الگ اور برابر برابر لکھا جائے ۔ اوپر نیچے نہ لکھا جائے وغیرہ وغیرہ ۔ نیز انگریزی رموز و اوقاف استعمال کیے جائیں "(۱)

رفتار اردو کے سلسلے میں پہلے مولانا نے اردو نثر کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کے حملے سے قبل ہندوستان میں جتنی بھی زبانیں رائج تھیں اس میں برج بھاشا سب پر چھائی ہوئی تھی یعنی یہ زبان متھرا کے علاقے سے شروع ہوکر پنجاب ، سندھ، بہار، اور مالوہ تک عام تھی اور حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانے سے قبل علمی زبان بن چکی تھی یعنی اس میں تصانیف اور تالیفات ملتی تھیں ۔ مسلمان چوں کہ سب سے پہلے سندھ و پنجاب میں پہنچے اس لیے سب سے پہلے ان کی زبان کے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " تاریخ و تنقید "، محولہ بالا ، ص ۳۶

الفاظ برج بھاشا ہی میں شامل ہوئے ۔ اس اعتبار سے اردو وہ زبان کہلاتی ہے جو برج بھاشا میں عربی ، فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ ملنے سے بنی ہے ۔

اس سلسلے میں قادری صاحب کا قول ہے :

" زبان کی تشخیص و تمیز کا اصول یہ ہے کہ کسی مخلوط زبان میں جس زبان کے افعال ضمائر اور متعلقات فعل کا غلبہ ہوتا ہے وہی زبان اس مخلوط زبان کی اصل اور ماخذ قرار دی جاتی ہے ۔ اردو میں مذکورہ بالا اجزا برج بھاشا کے شامل ہیں اس لیے برج بھاشا اردو کی ماں ہے ۔" (۱)

اردو کو عام طور پر اردو اس لیے کہتے ہیں کہ اردو کے معنی لشکر کے ہیں اور جب سے لشکر اسلامی ہندوستان میں آیا تو اسی کے ذریعہ اسلامی زبانوں عربی ، فارسی اور ترکی کے الفاظ برج بھاشا میں شامل ہونے شروع ہوگئے ۔ مغلوں کے زمانے سے لفظ " اردو" لشکر و لشکر گاہ کے معنی میں استعمال ہونا شروع ہوا اس زمانے میں اردو زبان کا آغاز و رواج شروع ہوگیا اردو زبان کو زبان اہل اردو کہا جانے لگا۔ اور پھر اہل کا لفظ بھی درمیان سے نکل گیا اور " زبان اردو" ہی عام طور پر رائج ہوگیا۔ ۹۸۶ھ میں سبکتگین نے پنجاب پر حملہ کیا تقریباً دو سو سال تک غزنوی خاندان پنجاب پر حکومت کرتا رہا اور اس دوران مختلف ممالک کے مسلمان ترک ، افغان ، مغل اور عرب وغیرہ پنجاب میں مقیم رہے اور اہل ہند کے ساتھ ان کے لین دین و شادی بیاہ کے تعلقات رہے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے برج بھاشا کے الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کئے اور اہل ہند نے عربی ، فارسی ، ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کئے اس طرح اردو بننی شروع ہوئی اور دو سو برس کی مدت میں یہ زبان ترقی کرتے کرتے اس قابل ہوگئی کہ بول چال کے علاوہ شاعری کی بھی ابتدا ہوگئی ۔

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا " تاریخ و تنقید " ، محولہ بالا ، ص ۳۶

سلطان محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی کے زمانے میں جب ایران کا مشہور شاعر منوچہری ہندوستان آیا تو اس نے فارسی کلام میں بھی ہندی کے الفاظ شامل کئے مثلاً اس کا شعر ہے :

" الانا مومنان دارند روزہ
الانا ہند وان کردند لنگھن

اسی طرح مسعود سعد سلمان اور عبداللہ الکتش بھی فارسی زبان کے شاعر تھے مگر ہندی زبان میں بھی شعر کہتے تھے اور ہندی کے دیوان بھی مرتب کئے تھے اگرچہ آج ان کا کلام موجود نہیں لیکن امیر خسرو وغیرہ نے اس کی تصدیق کی ہے -(۱)

۱۱۷۵ء سے ۱۱۹۲ء تک سلطان شہاب الدین محمد غوری اور پرتھوی راج کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری رہا - ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج مارا گیا۔ محمد غوری نے پرتھوی راج کے بیٹے گوبند راج کو اجمیر کا راجہ بنایا اور دہلی کی حکومت قطب الدین ایبک کو بخشی اور غزنی واپس چلا گیا۔ اس طرح مسلمانوں کے ساتھ ان کی مادری زبان ہر جگہ پہنچتی رہی اور اک نئی مخلوط زبان (اردو) کو ترقی ملتی رہی - مسلمان بول چال میں تو فارسی ہی استعمال کرتے تھے مگر ضرورت پڑنے پر اہل ہند کے ساتھ نئی مخلوط زبان (اردو) سے بھی کام چلاتے تھے۔

اس سے قبل پنجاب و گجرات پر مسلمانوں کا تسلط تھا یہاں اردو کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا جب ۱۱۹۲ء میں دہلی کی حکومت قطب دین کے سپرد ہوئی تو اس کی فوج میں زیادہ تعداد ایسے مسلمانوں کی تھی جو سالہا سال سے پنجاب میں رہتے بستے تھے اور پنجاب کی مقامی زبان جو برج بھاشا سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی تھی بولتے تھے۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " تاریخ و تنقید"، محولہ بالا، ص ۳۵

اب دھلی میں دھلی کی بھاشا ، پنجاب کی بھاشا، عربی ، فارسی سب زبانیں ملنی شروع ھوگئیں اور دھلوی اردو کی ابتدا ھوئی -

اردو کی ترویج و اشاعت اور عروج و ترقی میں اولیائے کرام کا بھی بڑا دخل ہے- بزرگان دین کا اصل کام ھی یہ تھا کہ وہ اپنے مریدین اور عقدت مندان اور خصوصیت سے نو مسلموں کی تعلیم اور تزکیہ نفس کے لیے مذھبی باتیں عام و سہل زبان میں سمجھائیں اور یہ کام مقامی بولیوں کی مدد کیے بغیر انجام پانا ممکن نہ تھا- ان ھی اولیائے کرام کے فیض و برکت سے اردو میں بہت سے اخلاقی و مذھبی الفاظ جمع ھوگئے اس سلسلے میں حضرت داتا گنج بخش علی ھجویری رحمتہ اللہ علیہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیارکاکی ، حضرت بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ اور امیر خسرو کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ھیں-

امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ ۱۲۵۵ء کو پٹیالہ ، ضلع ایٹہ میں پیدا ھوئے - حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ سے شرف بیعت اور تربیت باطن حاصل کی غیاث الدین بلبن سے لے کر محمد تغلق تک گیارہ شاھان دھلی کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاھوں کے دربار سے منسلک رھے- فن موسیقی میں کمال رکھتے تھے ، عربی ، فارسی ، ترکی اور ھندی زبانوں میں بڑی مہارت تھی - فارسی اور ھندی میں انھوں نے کئی دیوان ترتیب دئیے انھوں نے ھندی فارسی و اردو ملی جلی زبانوں میں شعر کہے ھیں- مثلاً

شبان ھجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چوعمر کوتہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اردو میں پہلی تصنیف نظم بھی امیر خسرو کی خالق باری ہے اس سے پہلے نظم میں اردو

زبان کی کوئی تصنیف ثابت نہیں ہوئی جس کا پہلا شعر ہے :

خالق باری سرجن ہار
واحد ایک بدا کرتار

اسی طرح اردو میں سب سے پہلی نثری تصنیف خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ " اخلاق و تصوف" ہے جو ۱۳۰۸ء میں تصنیف ہوا۔

اس رسالے کی تصنیف سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ دکن میں اردو کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر سمنانی نظم و نثر کی بنیاد ڈال چکے تھے جس کے ثبوت کے لیے " خالق باری" اور " رسالہ اخلاق و تصوف" پیش کئے جاسکتے ہیں ۔ لہذا اب محققین کا یہ نظریہ بھی تبدیل ہوگیا کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی سے (بارھویں صدی ھجری) سے پہلے تصنیف و تالیف نثر کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

دکن میں اردو کے آغاز کے سلسلے میں مولانا تحریر کرتے ہیں :

" ۱۳۰۲ء میں علاء الدین خلجی بادشاہ دہلی کے غلام سردار ملک کافور نے دکن پر حملے شروع کیے اور چند سال میں تمام دکن کو سلطنت دہلی میں شامل کرلیا۔ یہ اسلامی لشکر جو دہلی سے دکن گیا اردو زبان بولتا تھا اس نے اہل دکن کو اردو سکھائی ۔ اس زمانے سے پہلے دکن میں اردو کا رواج نہ ہوا تھا واقعات سے ثابت ہوچکا ہے کہ اس وقت تک پنجاب دہلی اور تمام شمالی ہند میں اردو رائج ہوچکی تھی اور تصنیف و شاعری کا بھی آغاز ہوچکا تھا ۔" (۱)

مولانا دکن میں اردو کا سب سے پہلا مصنف شیخ عین الدین گنج العلم کو قرار دیتے ہیں جو دہلی میں ۱۳۰۶ھ پیدا ہوئے انھوں نے فارسی کے علاوہ دکنی اردو میں بھی کئی مختصر رسالے مسائل شرعیہ کے متعلق تحریر کئے تھے ۔ اور اردو کی سب سے قدیم کتاب جو شائع ہوئی وہ خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز کی کتاب معراج العاشقین ہے۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " تاریخ و تنقید"، محولہ بالا ، ص: ۵۱

گجرات میں اردو کا آغاز یوں ہوا کہ مسلم فاتحین کے ساتھ ساتھ ہر ملک میں مسلمان علما و فضلا اور اولیا اللہ بھی پہنچتے رہے اس طرح گجرات میں بھی مسلمانوں کے سبب سے اردو کی ابتدا ہوئی اور آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی ۔

اردو کی اہمیت و مقبولیت کے سلسلے میں مولانا ابن بطوطہ ، کبیر داس ، تلسی داس ، گرونانک ، ہمایوں ، اکبر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" یہ سب واقعات اردو زبان کے رواج عام ، کثرت اشاعت ، مقبولیت و اہمیت کے ثبوت میں معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کے زمانے سے اردو مستقل زبان بن کر بول چال اور لین دین کا ذریعہ بن گئی اگرچہ شاہی زبان ، دفتری زبان ، کتابی زبان مدت تک فارسی رہی لیکن کاروباری زبان اور رعایا کی زبان عام طور پر اردو ہی رہی ۔" (۱)

اردو نظم کے سلسلے میں مولانا قادری نے شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے :

" (اول) شعرائے متقدمین ، (دوم) شعرائے متوسطین ، اور

(سوم) شعرائے متاخرین ۔"

اور پھر ہر طبقے کو تین ادوار میں بانٹا ہے یعنی دور اول ، دور دوم اور دور سوم ۔ اس کے بعد شعرائے عصر حاضر کا ذکر ہے ۔

شعرائے متاخرین کے دور اول کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :

" یہ دور دہلی کی شاعری کے لیے میر و مرزا کے بعد بہترین دور اور زریں عہد ہے ۔ میر کا سوز و گداز ، درد کا درد دل ، مصحفی کا راز و نیاز ، جرات کا جوش و شوق ، اس سادگی بیان اور شیرینی ادا کے ساتھ باقی نہ رہا تھا لیکن اس کی جگہ جو چیز آگئی وہ بجائے خود شاعری کا جوہر ہے ۔ یعنی لطافت بیان ، جدت ادا ، نزاکت خیال ، وسعت نظر ، رفعت تخیل ۔" (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ؛ "تاریخ و تنقید" ، محولہ بالا ، ص ۵۹

(۲) ایضاً ، ص ۷۳

مشہور شعرائے دہلی میں وہ مومن ، ذوق ، غالب ، ظفر ، شیفتہ ، سالک ، تسکین ، اصغر ، تسیم ، نظام رام پوری ، کو تسلیم کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا دہلی کی شاعری کو تو سراہتے ہیں اور اس کی خصوصیات بڑے اہتمام سے بیان کرتے ہیں مگر لکھنو کے رنگ تغزل سے بددل ہیں لکھنو کی شاعری میں وہ سوائے انیس و دبیر کے کسی سے متاثر نظر نہیں آتے ۔ اس بات کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں :

" لکھنو میں اس دور کی غزل کا پایۂ اعتبار تغزل سے بالکل ساقط ہے ۔ ناسخ کے رنگ کو ان کے شاگردوں نے بد سے بدتر کردیا۔ اس دور کی خاص چیز زبان و بیان کے لحاظ سے نواب مرزا شوق کی مثنویاں ہیں۔ لیکن اس زمانے کی جس چیز نے لکھنو کو غیر فانی بنادیا وہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے ہیں۔"(۱)

دور دوم کو مولانا دور اول کا ضمیمہ قرار دیتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں دہلی کی شاعری میں غالب کا تخیل مفقود ہے ۔ مومن کے جذبات ختم ہیں۔ ان کی جگہ داغ نے ایک نیا تغزل پیدا کردیا ہے ۔ جو نہ سچا دہلوی ہے اور نہ سچا لکھنوی اس میں ابتذال ، بوالہوسی و رندی کے جوش نے معیار تغزل نہایت پست کردیا ہے ۔ البتہ جدید شاعری میں حالی انھیں ایک نمائندہ بلند اور غیر فانی شاعر نظر آتے ہیں۔

مولانا کے اس قول کے جواز میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقعی اس دور میں لکھنو کی شاعری ناسخی رنگ میں رنگی ہوئی تھی ۔ اگر اس کو کچھ خوش نما بنایا تو وہ امیر اور جلال ہیں کیوں کہ جیسے حقیقی جذبات جلال نے پیش کئے ہیں وہ دوسروں کے یہاں نہیں ملتے ۔ قصیدے کو اگر امیر و منیر سے ترقی ملی تو نعت میں محسن کاکوری نے اپنی جدت طبع سے کام لیا۔

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا "تاریخ و تنقید" ، محولہ بالا ، ص ۴۷

دور سوم :- ۱۸۹۰ء سے ۱۹۳۵ء تک محیط ہے لکھتے ہیں :

" اس دور میں دھلی کی غزل کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔ داغ کا رنگ داغ کے ساتھ مخصوص تھا ان کے صدھا شاگردوں میں سے کوئی ان کا سچا جانشین نہ ہوسکا۔ چوں کہ داغ نے اپنے رنگ کو ترقی کی آخری حد تک پہنچادیا تھا اس لیے ان کے بعد اس حد تک پہنچنا محال تھا۔ امیر مینائی کے رنگ میں البتہ ترقی اور صفائی، وسعت اور خوش نمائی ممکن تھی۔ چناں چہ ان کے تلامذہ نے اس رنگ کو نہایت روشن کردیا۔ جلال نے لکھنوی ہوکر دھلوی رنگ اختیار کیا۔ بعض داغ کا رنگ نہیں بلکہ دھلی کا اصلی رنگ اور جذباتی شاعری، ان کے بعض شاگردوں نے ان کے اس رنگ کو قائم بھی رکھا اسی بنا پر اس دور میں لکھنو کی شاعری کا پلّہ دھلی سے گراں تر ہے۔ اس دور میں ایک ہستی ریاض خیرآبادی کی ایسی ہے کہ اردو شاعری اس پر جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ امیر کے رنگ میں بھی کہا ہے لیکن امیر کے اور شاگردوں سے نہ بڑھ سکے البتہ داغ کے رنگ میں داغ کے شاگردوں سے بہتر کہا ہے۔ خمریات (مضامین شراب) میں جدتیں اور لطافتیں پیدا کی ہیں۔" (۱)

اس دور کے مشہور شعرائے دھلی میں بیخود دھلوی، ثاقب بدایونی، رسا فرخ آبادی، سائل دھلوی، حسن بریلوی، نوح ناروی اور احسن مارہروی ہیں۔ جب کہ شعرائے لکھنو میں ریاض خیرآبادی، شادعظیم آبادی، جلیل مانک پوری، حفیظ جون پوری، مضطر خیرآبادی، علی حیدر نظم طباطبائی، صفی، محشر اور آرزو لکھنوی وغیرہ کے نام آتے ہیں مولانا نے ان کا نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے۔

اس طرح شعرائے عصر حاضر کا دور جو انھوں نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک ترتیب دیا ہے، اسے وہ دور اصلاح و انقلاب قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس میں ایک انقلاب تو ناسخ کے زمانے میں آیا تھا جس میں انھوں نے اصلاح زبان کی۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " تاریخ و تنقید "، محولہ بالا، ص ۷۸

مگر رعایت لفظی ، مبالغہ آرائی، ابتذال و سوقیانہ پن، ادنا جذبات و معاملات تذکرہ
و لباس اور خیال آرائی و مضمون آفرینی کے سبب غزل کا وقار مجروح ہوکر رہ گیا۔

دوسرا انقلاب یہ رونما ہوا کہ جلال لکھنوی اور شاد عظیم آبادی نے صحیح جذبات
نگاری اور اصلی رنگ تغزل کی طرف توجہ دی ۔ انھوں نے غزل کے لیے دہلی کے ہی رنگ
کو مناسب و ضروری خیال کیا لیکن اس کو پایۂ تکمیل تک اس صدی کے شعراء نے پہنچایا۔
اور یہ حقیقت ہے کہ شعرائے دہلی نے اپنی غزل کی بنیاد صحیح جذبات نگاری، اصلی
واردات قلبی، سوز و گداز اور لطف و اثر پر رکھی ۔ غالب و مومن نے اس میں علوئے تخیل
اور وسعت نظر کا اضافہ کیا اور خوب صورت فارسی تراکیب ایجاد کیں ۔

دہلی اسکول کی مقبولیت کے پیش نظر شعرائے لکھنو نے بھی اپنے رنگ کو ترک
کرکے دہلوی طرز اختیار کرلیا۔

اس تغیر کے وجوہ و اسباب یہ تھے کہ اعلا تعلیم کے فروغ سے ذہنوں کو جلا ملی
اور وسیع النظری پیدا ہوئی ۔ سائنس و فلسفے کی ترقی نے بھی تجزیے و تجربے کی راہیں
دکھلائیں ۔ مغربی شاعری کے اثر سے نئے طرز و اسلوب اور اظہار بیان کا موقع ملا۔
اور اس طرح قدیم و جدید کے امتزاج نے غزل کو شراب دو آتشہ بنادیا اور اب غزل نے
جدید غزل کا لبادہ اوڑھ لیا۔

جدید غزل کے سلسلے میں بھی اس موقع پر اتنا عرض کردینا بے جا نہ ہوگا کہ
اٹھارویں صدی کے آخر تک غزل کے دو نظریاتی اسکول قائم ہوگئے تھے اور جیسا کہ اس سے
قبل بیان کیا گیا یہ دہلی اسکول اور لکھنو اسکول کے ناموں سے موسوم تھے ۔ شاعری
اپنے ماحول اور معاشرے کی عکاس ہوا کرتی ہے لہذا ہم بہ نظر غائر دیکھیں تو ایک طرف
ہمیں دہلی اسکول میں اس دور کی سیاسی و سماجی اور معاشی و اقتصادی زندگی کی

جھلکیاں ملتی ہیں تو دوسری طرف لکھنؤ اسکول میں آسودگی و فارغ البالی اور عیش پسندی و بے فکری نظر آتی ہے ۔ انھیں عیش پسندیوں اور نشاط افروزیوں کے بعد جب مشرق کی آنکھیں کھلیں تو نہ کوئی ملک تھا اور نہ کوئی ملت ، البتہ مغربی تہذیب و تمدن کے سائے دن بدن لمبے ہوتے چلے جارہے تھے ملک و قوم کو تو اس انقلاب سے واقعی نقصان پہنچا تھا مگر اردو شعرا و ادب کے لیے یہ انقلاب اک شگون نیک ثابت ہوا۔

اردو شعر و ادب میں ابتدا ہی سے یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے دیگر زبانوں کے الفاظ و خیالات کو لبیک کہا ہے اور حسب ضرورت اپنے مزاج کو وقت کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہے لہذا شعرا نے بھی اندازہ لگالیا کہ اب وقت سے مصالحت کرنی ہی ہوگی۔ اس لیے اس انقلاب سے اردو شعر و ادب میں بھی ایک نیا انقلاب رونما ہوا ۔ انقلاب سے پیشتر کی شاعری سراسر تقلیدی و رسمی تھی جو عموماً لفظی صناعی مبالغہ آرائی، خارجی حالات ادنا جذبات نگاری اور یاس و قنوطیت سے بھری ہوئی تھی اس انقلاب نے ایک نئے طرز معاشرت کو جنم دیا جس سے علم و ادب شعر و سخن اور تہذیب و تمدن سب ہی متاثر ہوئے ۔ زندگی کے مسائل و معاملات میں انقلاب آیا۔ روایت سے بغاوت ہونے لگی ، نئے نئے خیالات و تصورات ابھرے۔ فکر و نظر کی نئی نئی شمعیں روشن ہوئیں ، شاعر کا احساس و ادراک اور شعور و وجدان ایک نئی راہ پر گامزن ہوگئے ۔ ان تاثرات کے تحت شعرائے جو غزلیں کہیں وہ سب جدید اردو غزل کی صنف میں شمار کی جاتی ہیں۔

جدید اردو غزل یا جدید اردو شاعری کا جہاں ذکر ہو وہاں آزاد و حالی کا ذکر نہ کرنا اک ناسپاسی ہے ۔ آزاد و حالی نے بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ بغور سے کیا بقول جگر قدیم غزل کے لیے ان کا نظریہ کچھ ایسا تھا :

ذکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

یہ دونوں حضرات قدیم غزل گو شعراء کے خیالات سے قطعی مطمئن نہ تھے اور اردو غزل کو اک نئے سانچے میں ڈھال کر نئے نئے موضوعات و مضامین پیش کرنا چاہتے تھے۔ لہذا اب اظہار و ابلاغ کے نئے سانچے بنے، نئے نئے رموز و علائم وجود میں آئے - نئی نئی تشبیہات و استعارات سے کام لیا گیا اور نئے نئے اشارات و کنایات تشکیل ہوئے اور اس طرح زبان و بیان اور رمز و ایما کا انداز یکسر بدل گیا۔

یہ ماننا پڑے گا کہ جدید اردو غزل قدیم اردو غزل سے مختلف اور ممتاز و ممیز ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ ان دونوں کا رشتہ منقطع ہوگیا۔ یہ ضرور ہے کہ جدید غزل نے روایت سے بغاوت کے نتیجے میں وجود پایا مگر اس نے اس سے اپنا ربط قائم رکھا البتہ نئی نئی تحریکات و تجربات کی طرف ضرور مائل رہی - دوسری طرف قدیم غزل گو شعرا نے بھی نئے تجربات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں نئے نئے مضامین جگہ پانے لگے - ادنا خیالات اور سوقیانہ و ابتذال کی باتوں کی جگہ تخیل میں بلندی و گہرائی پیدا ہوئی اور شعرا نے اشعار کے ذریعہ فلسفیانہ مسائل کے حل پیش کرکے بہت سے لاینحل عقدوں کی گرہ کشائی کی -

اس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد سے غزل کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا۔ اور ہم دیکھتے ہیں، کہ غالب و مومن بھی کہیں کہیں اس کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ شاعر حالات و واقعات سے ضرور متاثر ہوتا ہے - ۱۸۵۷ء کی شورشیں اور ہنگامے اس کی نشو و نما کے لیے اور بھی مفید اور ممد و معاون ثابت ہوئے - لہذا بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوکر حالی و آزاد نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی اور یہیں سے جدید اردو شاعری اور جدید اردو غزل کا آغاز ہوا۔ یہ حالی و آزاد ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اکبر و اسمعیل، حسرت و عزیز، ثاقب و صفدر، اقبال و اثر، اصغر و جگر، چکبست و فانی اور سیماب و شوق جیسے شعرا

منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگئے -

دہلی اسکول اور لکھنو اسکول کا مختصر سا ذکر پہلے کیا گیا - مولانا نے شاعری کے تین اسکول قرار دیے ہیں :" ایک دہلی اسکول، دوسرا لکھنو اسکول اور تیسرا جدید اسکول۔"

دہلی اسکول :

دہلی اسکول کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا رواج اورنگ زیب عالم گیر کے آخری زمانے سے ہوا۔ اردو شاعری چوں کہ فارسی شاعری کی تقلید ہے فارسی شاعری میں فیضی ، عرفی، نظیری، طالب ، صائب، ابوطالب ، کلیم اور بیدل وغیرہ کے اثر سے مضمون آفرینی اور خیال آرائی عام تھی۔ لیکن اردو شاعری فارسی کی تقلید ہونے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے خصوصی حالات ، سیاسی نظریات اور انقلابات حکومت سے متاثر ہوئی - اس زمانے میں بدامنی و بے چینی چھائی ہوئی تھی۔ شعرا جو درد و غم کے خوگر ہونے کے سبب سادہ طبیعت اور خلوص و انس کے شیدائی تھے - اس لیے اب اردو شاعری میں سادہ و سلیس طرز بیان، صحیح معاملات و واقعات ، حقیقی جذبات ، اخلاق و تصوف، رومانیت اور سوز و گداز بھی جھلکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی شعرا نے لطیف تشبیہات و استعارات اور جدید معنی خیز تراکیب کے لگ امتزاج سے چھوٹی چھوٹی اور مختصر غزلیں کہیں۔ کسی کسی شاعر نے اس سے انحراف بھی کیا مگر دہلی کے زیادہ تر شعرا اس روش پر گامزن رہے -

لکھنو اسکول :

لکھنو کا ماحول عیش و نشاط ، راحت و سکون اور آرام و چین کا آئینہ دار تھا۔ یہاں سادگی و بے تکلفی کی بجائے ، تکلف و تصنع کا دور دورہ تھا - اگرچہ دہلی کے وہ چند شعرا جو لکھنو گئے مثلاً میر، سوز اور مصحفی وغیرہ انھوں نے اپنی دیرینہ آن بان کو

قائم رکھا لیکن ان شعرا کے بعد اٹھارویں صدی کے آخر میں لکھنو میں جس شاعری کا آغاز ہوا وہ وہاں کی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کی عکاس ہے ۔ ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ کے کلام نے شاعری کے اک نئی اسکول کا آغاز کیا جس کی خصوصیات یہ تھیں کہ بے لطف مضمون آفرینی، مبتذل تخیل، سوقیانہ معاملات و جذبات، اعضا و لباس کا تذکرہ اور وہ بھی نہایت ناشائستہ و غیر مہذب ۔ زنانہ زبان و محاورات، چوٹی و مسّی کا ذکر یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں لکھنو اسکول میں داخل تھیں۔ دہلی اسکول کے برخلاف غزلیں بھی طول طویل ہوا کرتی تھیں بلکہ شعرا کے یہاں ایک ہی بحر میں دو دو تین تین غزلیں بھی مل جاتی ہیں۔

ان خامیوں کے باوجود لکھنو اسکول کو یہ خصوصیت و برتری بھی حاصل ہے کہ اصلاح زبان کا کام بھی اسی اسکول کے اک نمائندہ شاعر ناسخ کے ہاتھوں شروع ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ دکنی شاعروں کی زبان میں میر و سودا کے زمانے تک کافی اصلاح ہوچکی تھی۔ پھر بھی صدہا ثقیل الفاظ، غیر فصیح محاورات، غلط تلفظ اور قواعد کی اغلاط ملتی تھیں ناسخ نے ان سب باتوں کی طرف توجہ دی اور بڑی حد تک ان کی اصلاح کردی۔ انھوں نے صرف و نحو اور عروض و قواعد کی پابندیاں عائد کیں اور خود بھی ان پر سختی سے عمل پیرا رہے ۔

ناسخ کی اس کوشش کو شعرا نے بنظر استحسان نہیں دیکھا اور ان کی مخالفت کی گئی مگر ان کا خلوص و محنت رنگ لائے بغیر نہ رہ سکےان کی یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی اور رفتہ رفتہ مقبول ہوتی گئی ۔

اصلاح زبان کے سلسلے میں یہ بتادینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ دکنی اردو میں ولی کے زمانے تک جو الفاظ استعمال کئے جاتے تھے ان کو میر و سودا نے تبدیل کردیا تھا۔ مثلاً

" درپن (آئینہ) ، درسن (معشوق) ، دستار (مانند) ، نمن (طرح) ، کدھی (کبھی) ، آنجھو (آنسو) ، دوج (دوسرا) ، بجا (بہتر) تجنا (چھوڑنا) ، اتا (اتنا) ، سبھی (سبھی) ، سیتی (سے) ، لگ (تک) ، وغیرہ ۔"

اسی طرح بہت سے ایسے الفاظ جو میر و سودا کے زمانے میں مستعمل تھے اور وہ مصحفی و انشا کے زمانے تک مروج رہے ان کو ناسخ نے بدلا مثلاً :

" ٹک (ذرا) ، جوں (جس طرح) ، ندان (ہمیشہ) ، بن (بغیر) ، نیے (الگ) ، نپٹ (بہت) ، جگ (دنیا) ، اور (طرف) ، ولے (مگر) ، ایدھر (ادھر) ، جیدھر (جدھر) ، کبھو (کبھی) ، واں تئیں (یہاں تک) ، میں کہا (میں نے کہا) ، تو کہے (گویا جیسے) مجھ پاس (میرے پاس) ، لگے ہے (معلوم ہوتا ہے) وغیرہ ۔"

ناسخ کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعرائے لکھنؤ نے اپنی زبان و شاعری کو ان الفاظ سے پاک کرلیا اور انھوں نے خود یا ان کے تلامذہ نے ان متروکات کو استعمال نہیں کیا مگر ضرورت شعری یا کسی مصلحت سے میر و سودا اور مصحفی و انشا اپنی اصلاحات پر خود عمل پورا نہ رہ سکے اور انھوں نے قدیم و جدید دونوں الفاظ اور محاورات کو استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سلسلہ دہلی اسکول میں غالب اور ان کے بعد آنے والے بہت سے دوسرے شعرا کے یہاں بھی جاری رہا ۔ مثلاً غالب کہتے ہیں :

" میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے" (بغیر آئے)

ذوق کا شعر ہے :

" قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ (ناچار)
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا (ہر فن)"

اسی طرح کی بہت سی اور بھی مثالیں ہیں ـ ناسخ نے الفاظ کی کاٹ چھانٹ کے علاوہ نظم و شاعری کے بھی اصول مقرر کئے تھے یعنی یہ کہ الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ نظم کئے جائیں اور تخفیف و تشدید یا حرکت و سکون میں لفظ کی اصلی حالت قائم رہے۔ عربی و فارسی الفاظ کا کوئی حرف تقطیع میں نہ گرے نامانوس روزمرہ استعمال نہ کیا جائے مثلاً : " دیوانہ " کو " دوانہ " نہ لکھیں ـ جیسے میر ہی کا شعر لے لیجئے ، کہتے ہیں :

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر

کیا دوانے نے موت پائی ہے

اسی طرح عربی و فارسی الفاظ کے آخری حروف علت " الف ، و ، ی ، " دبنے یا گرنہیں جائیں جیسے میر ہی کا ایک اور شعر ہے :

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے

اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اس شعر کے دوسرے مصرع میں " زندگی " کی " ی " صاف نہیں پڑھی جاتی مگر ہندی الفاظ میں حرف کا دبنا روا رکھا گیا ہے ـ مثلاً میر کہتے ہیں :

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا

سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس شعر کے پہلے مصرع میں تیسری " کہتے " اور دوسرے مصرع میں " کی " ، " ی " صاف نہیں پڑھی جاتی مگر ہندی حروف کا دب جانا جائز ہے ـ

اگر ہم بہ نظر تعمق دیکھیں تو اساتذۂ فن نے یہ اصول و قواعد بڑی غور و خوض اور ذوق سلیم کو مد نظر رکھتے ہوئے مقرر کئے ہیں اور ان کی پابندی نہ صرف شاعر کو ماہر و مشاق بنادیتی ہے بلکہ اس کی شعری تخلیقات میں بھی اس سے چار چاند لگ جایا کرتے ہیں ـ اسی طرح اگر ہندی الفاظ بھی خاص خاص محاورات و امثال کے علاوہ استعمال

کئے جاتے ہیں تو بات نہیں بنتی مثلاً "رات گذری" کی جگہ "رات بیتی" لکھ دیجئے تو وہ بات پیدا نہ ہوگی البتہ "آپ بیتی" لکھا جاسکتا ہے ۔ دو ہندی الفاظ یا ایک ہندی اور ایک فارسی یا عربی لفظ میں فارسی و عربی ترکیب جائز نہیں۔

جدید اسکول :

جدید اسکول کو مولانا قادری کوئی نیا اسکول قرار نہیں دیتے بلکہ اس مثل کے مطابق کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اسی طرح یہ بھی قدیم دہلی اسکول کا احیائے جدید ہے اور موجودہ بیسویں صدی کے آغاز سے جاری ہوئی ہے ۔ غالب و مومن کے بعد ان کے تلامذہ میں تو دہلی اسکول کی خصوصیات ملتی ہیں مگر عام شعرا لکھنوی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ داغ ، سائل ، اور ثاقب دہلوی بھی اس سے مستثنا نہیں وہ بھی لکھنوی طرز تخیل اور اسلوب بیان سے دامن نہ بچا سکے کیوں کہ لکھنؤ کا رنگ بھی عام طور پر شعر سازی کو لفظی کاریگری، اور ابتذال و سوقیت لئے تھا اس لیے ہمیشہ رہنے کے قابل نہ تھا اور اس کے ثبوت میں ہم ناسخ کو پیش کرسکتے ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز انیسویں صدی کے اوائل سے ہوا اور ایک ہی صدی میں ختم ہوگیا۔ آج لکھنؤ میں بھی ناسخ کے رنگ کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس دہلوی رنگ باوجود درمیان میں بگڑ جانے کے دو صدیاں گذرنے پر بھی ولی اورنگ آبادی کے وقت سے آج تک باقی ہے اور نہ صرف یہ کہ اکثر شعرائے لکھنؤ کے یہاں بھی رنگ دہلی کی نمود ہے بلکہ بر صغیر ہند و پاک کی تمام اردو شاعری پر دہلوی رنگ چھایا ہوا ہے ۔

لیکن مولانا قادری نے ان کو جس معنی میں جدید کہا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس رنگ تغزل میں جو بیسویں صدی سے عام ہوا اور قدیم دہلوی رنگ غزل میں ایک خاص بات مابہ الامتیاز ہے اور اسی امتیاز کے سبب وہ اس کو "جدید اسکول" کہتے ہیں ۔ ہم یہ بھی کہہ سکتےہیں کہ لکھنویت کا رنگ اترنے کے بعد جو رنگ رہ جاتا ہے وہی دہلوی رنگ ہے۔

دھلی کی اصلی شان سادگی و سلاست ، حلاوت و شیرینی اور درد و اثر ھے - اگرچہ یہ چیزیں مصحفی کے بعد ختم ہوچکی تھیں مگر چند اور خوبیاں مثلاً واقعیت ، متانت، اور لطافت باقی رھیں جن کو مومن و غالب نے اور بھی وسعت و فروغ دیا -

غالب کے بعد کا دور بھی بڑی کشاکش و تذبذب کا دور تھا اس دور کو بھی اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو داغ وغیرہ کے یہاں کچھ کچھ ابتذال جھلکتا ھے لیکن اس کے برعکس لکھنو کے امیر و جلال وغیرہ کے یہاں دھلی کی سی متانت و لطافت نظر آتی ھے - یہ دھلی کی فتح تھی اور اس فتح کا سہرا اسی جدید اسکول کے سر ھے -

اس سلسلے میں مولانا قادری رکھتے ھیں :

" دھلی کا رنگ کسی زمانے میں بالکل مفقود نہیں ھوا - پہلی مرتبہ جب انشا و جرات نے اس رنگ کو بگاڑا تھا تو اس وقت بھی میر اثر، میرحسن، بیان، حسرت، وغیرہ اس رنگ کو باقی رکھے ھوئے تھے اور پھر دوسری بار جب داغ نے اس میں تغیر پیدا کیا تو اس وقت بھی ثاقب ، زکی، ظہیر، انور، ابھی قدیم رنگ وضع پر قائم تھے- وھی رنگ موجودہ زمانے یعنی بیسویں صدی میں ذرا نئی شان سے ابھرا ھے - شاعری یہ ھے کہ اخلاق، فلسفہ ، تصوف، الہیات وغیرہ کا کوئی مسئلہ شاعرانہ تخیل اور شاعرانہ اسلوب کے ساتھ بیان کیا جائے - اس کے بھی مختلف پیرائے ھیں - ایک یہ کہ باوجود شاعرانہ انداز بیان کے شعر پڑھنے سے یہ معلوم ھو کہ کسی علم وفن مثلاً تصوف و اخلاق کا کوئی نکتہ بیان کیا گیا ھے- یہ بات آسان ھے اور کثرت سے اسی کا رواج ھے -" (۱)

اس سلسلے میں وہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی غزل سے مندرجہ ذیل مثالیں دیتے ھیں :-

آرام سے ھے کون جہان خراب میں　　گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں (اخلاق)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " تاریخ و تنقید " ، محولہ بالا ، ص ۹۳

سب اس میں محو اور وہ سب سے علحدہ
آئینہ میں ہے آپ نہ آئینہ آپ میں (تصوف)

معنی کی فکر چاہئے صورت سے کیا حصول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں (اخلاق)

ذات و صفات میں بھی یہی رمز سمجھئے
جو آفتاب و روشنیٔ آفتاب میں (الہیات)

اس کے علاوہ ایک پیرایہ یہ بھی ہے کہ اکثر شاعر کے شعر میں کوئی شاعرانہ یا عاشقانہ مضمون - نظر آتا ہے مگر جب غور کرکے دیکھیں تو اس میں فلسفۂ اخلاق ، نفسیات ، تصوف کا مسئلہ بھی ملتا ہے مگر یہ انداز نہایت لطیف و نازک ، بلند و باریک ، دل چسپ و حیرت انگیز اور شاعر کے عمیق تجربے و مشاہدے کا نچوڑ ہوتا ہے -

شعرائے جدید میں یہ فلسفیانہ انداز ، وسعت نظر اور رفعت تخیل غالب کے تتبع اور علوم جدیدہ کی روشنی سے پیدا ہوئے ہیں۔ جدت ادا اور رفعت تخیل کے لیے نئی و نادر تراکیب ، جدید تشبیہات اور لطیف و نازک استعارات بھی لازمی ہیں یہ چیزیں دہلی اسکول کی خصوصیات میں شامل ہیں مگر لکھنؤ اسکول ان سے محروم ہے -

جدید شعرا کے کلام سے مولانا قادری نے اس کی مثالیں یوں دی ہیں :

فانی
کل تک ہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دنیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشیمن نے (نفسیات)

فانی
لذت فنا ہرگز کلفتی نہیں یعنی
دل شہر کیا فانی موت کی دعا کرکے (فلسفہ اخلاق)

فانی
نگاہ شوق کے دم تک تھیں آنکھیں
اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی (تصوف)

==xx==

اصغر
تم دید کو کہتے ہو آئینہ ذرا دیکھو
خود حسن نکھر آیا اس کیف تماشا سے (تصوف)

اصغر — رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی
لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تماشا سے — (فلسفۂ جذبات)

===xx===

حسرت — عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا — (تصوف)

===xx===

عزیز — تنگ تھا مجھ پر قفس کیا جانئے کیسی بھی
ہم صفیرو اک ذرا آواز تو دیجے مجھے — (تشبیہات)

===xx===

جگر — ذرات دل پہ اپنی نظر کر تو عندلیب
کتنے دبے پڑے ہیں خزانے بہار کے — (تصوف)

ایسی تراکیب، تشبیہات ، استعارات اور جدتیں جدید اسکول کی شاعری کا طرہ امتیاز ہیں۔ ان تراکیب کے قطع نظر بھی اگر ہم دیکھیں تو دورِ حاضر کے شعرا کے یہاں حسن تخیل اور جدت ادا ہر جگہ نمایاں ہے جو اس سے قبل بیسویں صدی کے شعرا میں سے معدودے چند کے یہاں تو نظر آتی ہے مگر عموماً مفقود ہے ۔ مولانا قادری اس کو جدید اسکول کی ایک اہم خصوصیت قرار دیتے ہیں اور مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل اشعار پیش کرتے ہیں :

حسرت — مجھ کو خبر نہیں مرا مرتبا ہے کیا
یہ تیری التفات بے آخر کیا ہے کیا؟
گر جوش آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا؟

===xx===

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد ؛ ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں ؛ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

===xx===

عزیز　　آنکھوں سے دم نکلتے ہوئے دیکھتا ہوں اب
　　چپکا کھڑا ہوا ہوں ترے انتظار میں

==xxx===

اگر کبھی وہ دم واپسیں چلے آتے　　ہم ایک سانس میں تفصیل آرزو کرتے

==xxx===

ہے ضبط گریہ میرے لیے اک محال بات　　گو آنسوؤں میں دل کی حقیقت ہی کہیں نہ ہو

===xxx===

فانی　　موت آتی ہے تم نہ آؤ گے　　تم نہ آئے تو موت آئی ہے
　　مژدۂ جنت وصال ہے موت　　زندگی محشر جدائی ہے
　　آرزو پھر ہے درپئے تدبیر　　سعی ناکام کی دہائی ہے

==xxx====

جگر　　پھر کوئی مہرباں نہ ہوجائے　　سعی غم رائگاں نہ ہوجائے
　　دل میں ڈوبا ہوا ہے جو نشتر　　میرے دل کی زباں نہ ہوجائے
　　قسمتوں سے ملا ہے درد ہمیں　　کہیں آرام جاں نہ ہوجائے

===xxx===

شاعر کا رنگ :

کسی عالم یا نقاد کا فن شاعری، سخن فہمی اور نکتہ سنجی سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے اس کے بغیر کسی شاعر کے کلام کو سمجھنا اور اس کے طرز کلام کا دوسرے شاعر سے مقابلہ و موازنہ کرنا مشکل ہوتا ہے ۔ کسی شاعر کے طرز و انداز یا رنگ کلام کو سمجھ کر ہی اس کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا جاتا اور اس کے حسن و قبح اور معائب و محاسن بیان کئے جاتے ہیں۔ مشاعروں میں یا رسائل میں شعرا کی غزلیات سن کر یا پڑھ کر اکثر کہا جاتا ہے اس شعر میں غالب کا رنگ ہے اور یہ شعر میر کے رنگ سے ملتا جلتا ہے کوئی مومن کے رنگ سے رنگا ہوتا ہے تو کسی میں امیر کا رنگ جھلکتا ہے ۔ اس سے کیا مراد ہے؟

اس سلسلے میں مولانا قادری رقم طراز ہیں :

" کسی شعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں میر کا رنگ ہے کسی شعر میں مومن کا رنگ بتایا جاتا ہے کوئی رنگ داغ کا رنگ کہلاتا ہے - کوئی رنگ امیر کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے - اس رنگ کو طرز و انداز بھی کہتے ہیں -"

اس رنگ کی مثالیں مولانا نے شعرا کے اشعار سے بھی دی ہیں :

بے شک کوئی ولی تھا اثر میر نکتہ سنج
سب شاعروں سے خاص ہے اس با خدا کا رنگ

اے وفا شیفتۂ مومن و غالب ہیں ہیں   میں نے کچھ رنگ اڑایا ہے غزل خوانی کا
قائم ہے تری دم سے یہ رنگ سخن قائم   پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگ غزل خوانی

پھر اس رنگ یا طرز یا انداز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ مزید اشعار سے اس کی وضاحت کرتے ہیں :

شعر میرے بھی ہیں پر درد ، لیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

شوخیٔ نسیم ہے سوز و گداز میر   حسرت تری سخن پہ ہے لطف سخن تمام
شعر میں یے مثال ہے مجروح   معنیٔ غالب و سلاست میر

پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ میرکے کلام میں درد و الم ، سوز و گداز اور سلاست ہے - غالب کے کلام میں معنی یعنی ان کے یہاں ایک طرح کی باریک و بلند معنویت ملتی ہے - نسیم کے کلام میں شوخی ہے کہیں یہ صرف اشارے ہیں ان سے کسی شاعر کا رنگ و انداز مکمل طور پر معلوم نہیں ہوتا اور باہم امتیاز بھی قائم نہیں کیا جاسکتا - مگر ہر شاعر کے رنگ و انداز کا اندازہ اس کے چند اشعار سے لگایا جاسکتا ہے - مثلاً میر تقی میر کے ان اشعار سے ان کا اصلی رنگ سمجھا جاسکتا ہے :

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہوسکے   پچھتاؤ گے سنو ہو ، یہ بستی اجاڑ کے

کیا چال یہ نکالی تم نے جوان ہوکر　　اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگاتی ہے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر　　کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر　　کیا دوانے نے موت پائی ہے

==xxx===

حکیم مومن خاں مومن کا رنگ یہ ہے :

وہ ہنسنے سن کے نالہ بلبل کا　　مجھے رونا ہے خندۂ دل کا

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا　　وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے

کیا کہیئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں　　وہ جتنے بے حجاب ہیں ہم شرم سار ہیں

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　اس کا نہ دیکھنا نگۂ التفات ہے

مرزا غالب کے رنگ پر غور کیجئے :

تنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے　　اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

نالۂ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں　　ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

===xxx===

امیر مینائی لکھنوی کے اشعار دیکھئیے :

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی

وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو   ہربات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

غیروں کے حال پر تو بہت لطف ہے تمہیں

ہم پر بھی لطف حال ہمارا بتر ہے

انگور میں تھی یہ پانی کی چار بوندیں

جس دن سے کھینچ گئی ہے تلوار ہوگئی ہے

ہم رند ہے بھی پیتے ہیں تو کانپتے ہوئے   توبہ بڑی ہوئی ہے ہمارے گناہ میں

مرزا داغ دھلوی کا رنگ یہ ہے :

وعدے یہ ہیں ان کے قیامت کی ہے تکرار   اور بات ہے اتنی کہ ادھرکل ہے ادھر آج

کس سے وعدہ ہے جو گھبرائے ہوئے پھرتے ہو

یہ وہ گردش ہے جو میری بھی مقدر میں نہیں

کیا کہوں گا اگر اس بت نے کہا محشر میں   داور حشر تری ہاتھ ہے عزت میری

شرکت غم بھی نہیں چاھتی غیرت میری   غیرکی ہوکے رہے یا شب فرقت میری

لٹے ہوش تیرے زاھد جو وہ چشم مست دیکھی

مجھے کیا الٹ نہ دیتی جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب اور مومن کے یہاں بہت سے پیچیدہ و دشوار اشعار بھی ملتے ہیں مگر مولانا نے یہاں صرف ان کے صاف اشعار کو مد نظر رکھا ہے کیوں کہ کسی شاعر کے رنگ و طرز کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اس کے ان ہی اشعار کو مد نظر رکھنا جن میں مغلق الفاظ اور پیچ دار تراکیب ہوں کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

یہاں جو اشعار منتخب کئے گئے ہیں وہ سب رومانی شاعری سے متعلق ہیں، تصوف، اخلاق، فلسفہ، وغیرہ کے مضامین نظر انداز کردئیے گئے ہیں یہ چیزیں بھی اگرچہ غزل کے دائرہ میں آتی ہیں اور ہر شاعر نے اپنی اپنی بساط کے اعتبار سے لکھی ہیں مگر غزل کا اصل محور حسن و عشق اور رومانیت ہی ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعر کا رنگ کسی خاص موضوع میں محدود نہیں ہوتا۔

شعرا کے رنگ و طرز کی صراحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

" ہر شخص کی طبیعت الگ ہوتی ہے - مزاج جدا ہوتا ہے، احساس مختلف ہوتا ہے، مشاہدہ علاحدہ ہوتا ہے - تجربہ نرالا ہوتا ہے، بیان مخصوص ہوتا ہے - ایک کی طبیعت میں سوز و گداز ہوتا ہے، دوسرے میں نہیں ہوتا۔ ایک جلد اثر قبول کرتا ہے دوسرا دیر میں - ایک کی نظر اشیاء و حالات پر گہری پڑتی ہے دوسرے کی نہیں - ایک کو زیادہ مصائب و انقلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے دوسرے کو کم - ایک کے دل میں جو خیالات و جذبات آتے ہیں ان کو وہ سادہ اور اصلی صورت میں بیان کرتا ہے تاکہ سننے والے پر بھی وہی اثر ہو جو خود اس پر ہے - دوسرا سادگی و اثر کو اہمیت نہیں دیتا بلکہ بیان سے اپنا علم و فن ظاہر کرنا چاہتا ہے -" (۱)

مولانا کے خیال میں ان اختلافات طبعی کا سبب یہ ہے کہ عشق و محبت کے جذبات و واقعات اور معاملات تو سب نے لکھے ہیں مگر میر و داغ کے ہاں الفاظ و بیان کی سلاست و سادگی کے ساتھ جذبات و معاملات بھی حقیقی و اصلی اور سادہ و سچے ہیں اور ان کے ادا کرنے میں بھی ذہن پر کوئی خاص زور دینے اور دور سے مضمون لانے کی ضرورت نہیں، جب کہ اس کے برخلاف غالب، مومن اور امیر کے یہاں جو خیالات ملتے ہیں اور ان کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ نہ اس طرح ہر شخص اور ہر شاعر کے ذہن میں وارد ہوتے اور نہ ہر شخص ان کو اس طرح بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے - مقصد یہ ہے کہ میر نے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "تاریخ و تنقید"، محولہ بالا، ص ۱۵۷

دل کے فگر یا دل کی بستی کے متعلق جو بات کہی ہے یا میر نے محبوب کی چال کا جو
نقشہ کھینچا ہے یا داغ نے کھبرائے ہوئے پھرنے کا جو حال لکھا ہے یہ سب اصلی و حقیقی
اور سچے جذبات ہیں سیدھ باتیں اسی طرح ذہن میں آتی ہیں اور ان کے بیان کرنے کا
سیدھا و سچا انداز یہی ہے - لیکن اس کے برعکس مومن کے بخت خفتہ پر پاسبان کا اعتماد
یا " جادوئے نگاہ " کے اندیشہ سے جانب دشمن نہ دیکھنے کی تاکید اور اس حیلے سے اپنے
حسن مدعا کی طلب یا غالب کے دل تنگ نہ ہونے کا نتیجہ پریشان ہونا یا نالہ کا جفا کے لیے
حسن طلب ہونا یا امیر کے ہاں آنکھ چراکر تیر نگاہ کو جگر کے پار نہ ہونے دینے کی شکایت
یا مے کا کھینچ کر تلوار بن جانا - یا توبہ کا گناہ میں پڑا ہونا - یہ باتیں نہ اس طرح
دلوں پر وارد ہوتی ہیں اور نہ ہر شخص ان کو اس انداز میں بیان کرسکتا ہے -

اس تجزیے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ میرو داغ اصلی اور صحیح جذبات
کو سادہ و سلیس انداز سے بیان کرتے ہیں جب کہ مومن و غالب اور امیر اپنے طرز ادا میں
کچھ پیچیدگی و مضمون آفرینی چاہتے ہیں اس کے باوجود بھی ان دونوں اور ان تینوں
کے یہاں ایک باہمی فرق ہے کیوں کہ میر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اک درد مند
دل سے نکلی ہوئی صدا ہیں - لفظوں سے نہ سہی لیکن انداز بیان سے آہیں نکلتی محسوس
ہوتی ہیں داغ کے ہاں یہ بات نہیں ان کے ہاں غم و الم اور حسرت و یاس نہیں بلکہ
معاملات و ادائیں اور جوش و خروش ہے - مضمون میں بھی تازگی و شگفتگی اور بیان میں
بھی لطافت و نزاکت ہے -

غالب و مومن اور امیر اپنے خیالات کا اظہار روشِ عام سے ہٹ کر کرنا چاہتے ہیں -
ان تینوں شعرا کے یہاں بھی ایک اک فرق واضح ہے وہ یہ کہ غالب و مومن کے یہاں مضمون کی
گہرائی و گیرائی اور تخیل کی بلندی ہے تو امیرؔ کے رعایات و مناسبات کا التزام کیا ہے -

مثلاً ان کے یہ الفاظ کہ " اگر دل میں مزا ہو" - " حال ہمارا بھی غیر ہے " یا " تلوار اور شراب کے کھینچنے " کے معانی سے جو لطف و اثر پیدا ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ورنہ دیکھا جائے تو مضامین اور تخیل میں کوئی خاص بلندی نہیں ہے - لیکن مومن و غالب کے یہاں بھی ایک خاص فرق واضح ہے مثلاً مومن اپنے مضمون کا کچھ حصہ چھوڑ دیتے ہیں جس سے مضمون میں ندرت و جودت اور لطافت کا اضافہ ہوجاتا ہے - مثلاً انھوں نے نالۂ بلبل کو سن کر دوست کے ہنسنے کی وجہ اور خندۂ گل پر اپنے تاسف کا سبب بیان نہیں کیا لیکن پڑھنے و سننے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ عشق کی شعلہ بیانی اور حسن کی رنگین نگاری جس جوش و جذبے کے ساتھ مومن کے یہاں ملتی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے اور یہی مومن کا خاص رنگ ہے - غالب کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے یہاں علوئے تخیل معنی آفرینی ، جدت ادا اور ندرت بیان ہے -

اس طرح مولانا قادری نے ہر شاعر کے رنگ و طرز کی وضاحت و صراحت بہ خوبی واضح کی ہے - یہ ان کی دقیقہ سنجی اور نقد و نظر کی اعلا مثال ہے -

نقد و نظر اور سخن فہمی کے لیے بڑے علم اور تجربے کی ضرورت ہے - مولانا بڑے نکتہ سنج اور دور رس آدمی تھے - اور بات کی تہہ تک پہنچ جایا کرتے تھے اپنی اس سخن فہمی کے سبب انھوں نے ادب کی بہت ہی پیچیدہ گتھیاں سلجھائیں ، اکثر رسائل میں شعر و ادب کے مسائل حل کئے جاتے اور استفسارات وغیرہ کے جوابات دئے جاتے رہے ہیں مگر بعض اوقات جواب دینے والے صاحب کی نظر اصل نکتے اور مسئلے کو نہیں سمجھ پاتی اور سوال کچھ اور جواب کچھ والی بات ہوجاتی ہے مولانا نے جوابات کی فوراً تردید کی اور غلط باتوں کو شائع ہونے سے روکا - انھوں نے ایسا صرف اس لیے کیا کہ لوگوں میں اس کا وہی مطلب و مفہوم عام نہ ہوجائے جو بعض رسائل نے شائع کردیا ہے اس سے انھیں نہ کسی کی تنقیص و تضحیک مقصود ہے اور نہ ہی اپنے نقد و کمال فن کا سکہ جمانا - اس میں

صورت ایک اصلاحی جذبہ کارفرما ہے -

ایک رسالے میں کسی نے غالب کے اس شعر کا مطلب دریافت کیا ہے :

" رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ

اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا "

ایڈیٹر صاحب نے یہ جواب دیا :

" مرزا غالب کے دیوان میں یہ شعر میری نظر سے نہیں گزرا - اطلاع دیجئے کہ کس نسخہ میں ہے - مجھے اس کی صحت میں شک ہے اور اسی لیے معنی پیدا کرنا مشکل - غالب بریدہ کو تشدید کے ساتھ کبھی نہیں لکھ سکتے تھے - ترشے ہوئے ناخن سے ذوقِ فنا پیدا ہونا یا عقل کو کسی قسم کا اشارہ ملنا بعید از عقل سا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کیا نکتہ پوشیدہ ہے - اہل فکر و نظر بھی توجہ فرمائیں -" (۱)

ایک علمی و ادبی رسالے کے ذمہ دار ایڈیٹر کی یہ سخن فہمی جیسا دل چسپ لطیفہ ہے اہل فکر و نظر سے پوشیدہ نہیں - یہ شعر غالب کے مشہور دیوان میں نہیں ہے " نسخۂ حمیدیہ " میں ہے - لیکن اس کی صحت میں شک کی گنجائش نہیں- شعر درست نقل ہوا ہے اور بامعنی ہے - "بریدہ" کی تشدید پر اعتراض کرنا فارسی سے ناواقفیت کا ثبوت ہے -" بریدہ " ، برّد ، بُرّش - میں و نیز دَرّد ، و ، بزّد وغیرہ میں تخفیف و تشدید دونوں جائز ہیں - فارسی میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں مثلاً قاآنی لکھتا ہے :

" ز بیمش مرغ جان بپّرد ، ز سہمش زہرہ ہا دَرّد

چو او چون اژدہا غرّد ، و یا چون دو کشد آوا "

ایڈیٹر صاحب فارسی نہ جاننے کے سبب سے دوسرے مصرع کی ترکیب کو نہ سمجھ سکے- اس لیے لکھ دیا - " عقل کو کسی قسم کا اشارہ ملنا بعید از عقل سا ہے " - یعنی انہیں

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " تاریخ و تنقید "، کراچی : ٹائمز پریس ، ۱۹۶۶ء ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۱۶۹

نے غالب کے الفاظ کے یہ معنی لیے کہ " فہم کا اشارہ تھا" حالاں کہ " اشارت فہم " اسم فاعل سماعی ہے (اشارہ سمجھنے والا) مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم اپنی غفلت سے بیگانۂ ذوق فنا رہے ورنہ اشارت فہم و عاقل کے لیے ہر ناخن بریدہ مثل ابرو کے اشارہ کر رہا تھا کہ دیکھو اس طرح فنا ہوتے ہیں - ترشے ہوئے ناخن کا ابرو سے مشابہ ہونا شعر میں خاص لطف پیدا کر رہا ہے - اسی طرح کسی نے مومن خان کے اس شعر کا مطلب دریافت کیا :

بے زار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے

شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

مدیر گرامی نے مطلب یہ لکھا :

" یعنی اگر اپنی جان سے بے زار نہ ہوتے تو دشمن نے جو تیری شکایتیں ہم سے کی ہیں ان پر اس سے گواہ طلب کرتے لیکن ہم تو خود اپنی زندگی سے بے زار ہیں-"

مولانا قادری شعر کا مفہوم واضح فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :

" مومن خان کے مقطع میں جو لطیف نکتہ تھا اس پر مجیب صاحب کی نظر نہ پہنچی- مطلب یہ ہے کہ جیسی شکایتیں تجھ سے مدعی کو ہیں ایسی ہی ہم کو بھی ہیں- تیرے جور و ستم نے خود ہم کو جان سے بے زار کردیا ہے - ہم خود شاہد ہیں پھر مدعی سے کیا گواہ طلب کریں-" (۱)

اس شعر کے سلسلے میں مولانا قادری مزید لکھتے ہیں :

" اس شعر کا مطلب پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم - اے نے اپنے مرتبہ دیوان مومن کے حاشیے میں کچھ اور ہی لکھا ہے وہ بھی سننے سمجھنے کے لائق ہے - فرماتے ہیں :-

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " تاریخ و تنقید"، (کراچی ایڈیشن)، محولہ بالا، ص ۱۲۹

" مدعی (رقیب) نے معشوق سے کہا کہ عاشق (مومن) تمہاری شکایتیں کرتا پھرتا ہے اس پر معشوق آمادۂ قتل ہوگیا۔ عاشق کہتا ہے کہ مدعی مدعی کا الزام جھوٹا ہے اور اگر میں خود جان سے بے زار نہ ہوتا تو اس ناکردہ جرم کے مواخذے سے بچ نکلنے کے لیے اس سے ضرور گواہ (شاهد) طلب کرتا۔ لیکن میں تو خود مشتاق قتل ہوں۔"

قادری صاحب کہتے ہیں :

" اس مطلب کو ماننے میں مجھے تامل ہے کہ مشتاق قتل ہونے کو جان سے بے زار ہونا نہیں کہہ سکتے - جان سے بے زار ہونا محاورہ ہے انتہائے مصائب کے لیے لیکن اگر لفظی معنی مراد لیے جائیں تو اشتیاق قتل کا مضمون بیان نہ کرنا چاہئے بلکہ یوں کہا جائے کہ ہم تو خود ہی جان سے بے زار تھے اب مدعی کے جھوٹے الزام سے وہ ہمارے قتل پر آمادہ ہوگیا تو اچھا ہوا۔ اسی بہانے سے سہی - ہم قید حیات و بند غم دونوں سے آزاد تو ہوجائیں گے -"

ایک اور ایڈیٹر کی سخن فہمی کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں :

" کسی نے استفسار کیا کہ مندرجہ ذیل شعر کے مفہوم سے آگاہ فرمائیے:

محمد بھی ترا، جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا (اقبال)

مجیب محقق نے یہ جواب ارشاد فرمایا :

" اقبال کا یہ شعر بھی ان ہی اشعار میں سے ہے جن میں وہ بہ حیثیت شاعر کے نہیں بلکہ ایک مفکر کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہیں مطلب یہ کہ محمد، جبریل اور قرآن تیرے قول کے مطابق جب تیرے ہیں تو ثابت ہوا کہ یہ تینوں تیرے واجب الوجود ہونے کی دلیل ہیں۔ لہذا وجود مطلق کے مقابلے میں کسی اور کو یہ طاقت کہاں کہ وہ دعوا وجود کرسکے یعنی تمام صور عامیہ جن میں شاعر بھی ہے محض دھمی وجود ہیں اور ہر وجود مجازی واجب الوجود کا ترجماں ہے - پس لا موجود الا اللہ کا نعرہ لگاتا ہوں۔" (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا؛ "تاریخ و تنقید"، (کراچی، تیسرا ایڈیشن) محولہ بالا، ص ۱۷۳

مجیب محقق کی اس شرح پر مولانا تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" لا الہ الا اللہ کا کیا مطلب بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی روح بھی خوش ہوگئی ہوگی کہ میری کلام کا ایک مفسر تو پیدا ہوگیا۔ پہلے مجیب کی طرح ان حضرت کو کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہ تھی - صرف اقبال کا مجموعہ کلام " بال جبریل" کھول کر دیکھ لیتے - دوسری نظم میں یہ شعر ہے - یہی نظم پانچ شعر کی ہے - اس نظم میں ڈاکٹر اقبال اللہ تعالی کو طعنے دیتے ہیں کسی شعر سے لا موجود الا اللہ کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا - اس نعرے سے اور اس مسلک " وحدت الوجود" سے ڈاکٹر اقبال کے پیغام کو دور کا تعلق بھی نہیں- یہ ان کے مقصود و پیام کو نہ سمجھنے کی بات ہے کہ ہمارے محقق صاحب نے اقبال کے شعر کا وہ مفہوم بیان کردیا جو نہ اس شعر سے نکلتا ہے نہ اقبال کے مسلک کے مطابق ہے - اگر اقبال کو سمجھے ہوئے ہوتے تو اس نظم کو دیکھے بغیر بھی اس شعر کا وہ مطلب نہ لکھتے - لا موجود الا اللہ کا نعرہ لگانا کیسا اقبال تو وحدت الوجود ہی کے سخت مخالف ہیں - تھیں برس ہوئے سب سے پہلے " اسرار خودی" میں اقبال نے اسی مسلک کی تسلیم و تبلیغ کی بنا پر افلاطون یونانی اور حافظ شیرازی پر جرح و قدح کی تھی اور ان کے " از گروہ گوسفندان قدیم" قرار دے کر ہدایت کی تھی کہ ---

بے نیاز از محفل حافظ گذر

الحذر از گوسفندان ، الحذر

اس پر اس زمانے میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا اور اقبال پر کفر کے فتوے لگادیئے گئے تھے آخر انہوں نے رفع شر کے لیے " اسرار خودی" سے وہ اشعار خارج کردیے لیکن اقبال اپنے مسلک پر قائم رہے اور اس کی تبلیغ کرتے رہے - وحدت الوجود کا مسئلہ اور مسلک بجائے خود اور بحدّ خود بالکل صحیح و درست ہے لیکن ڈاکٹر اقبال نے اور ان سے پہلے حضرت امام ربانی مجددؒ الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ العزیز نے جن اسباب و نتائج کی بنا پر اس کی مخالفت کی ہے وہ بھی اپنی جگہ پر قابل تسلیم ہیں بلکہ ناقابل تردید " (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " تاریخ و تنقید"، (کراچی، تیسرا ایڈیشن) ، محولہ بالا، ص ۱۷۳

اس مسئلے پر مولانا نے اپنے ایک اور مقالے " ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حافظ " میں
بھی اظہار خیال کیا ہے :

" ڈاکٹر اقبال نے " اسرار خودی" میں ایک جگہ افلاطون یونانی اور
حافظ شیرازی کے تخیلات کا اثر اقوام اسلامیہ کے تصوف و ادبیات پر دیکھ کر
ان دونوں کے مسلک و تعلیم کو قابل احتراز بتایا ہے - " زاہدان خشک "
نے اقبال کے کلام کا سیاق و سباق نہ دیکھا اور مضمون پر غور نہ کیا۔ خواجہ
حافظ شیرازی کے متعلق اقبال کی رائے پڑھ لی اور کفر کے فتوے لگادیئے اگر
واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس تمام بحث کا مطالعہ کرتے تو نظر آتا کہ یہ کفر کا
فتوی بہت دور تک پہنچتا ہے - اس کی تشریح طویل ہے مگر مختصر یہ ہے کہ
اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے :

" مسئلہ نفی خودی از مخترعات اقوام مغلوبہ است کہ بایں طریق
مخفی اخلاق اقوام غالبہ را ضعیف می سازند "

آن شنیدستی کہ در عہد قدیم
گوسفندان در علف زاری مقیم

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان گوسفندوں پر شیروں نے حملہ کیا اور ان کو
تباہ کرنا شروع کردیا۔ یہ حالت دیکھ کر ایک گوسفند زیرک و کہنہ سال نے وہی
ترکیب سوچی جو غلام قوم سوچا کرتی ہے ــــ :

نیست ممکن کز کمال وعظ و پند
رنگ سبعیت پذیرد گوسفند

شیر نر را میش کردن ممکن است
غافلش از خویش کردن ممکن است

چناں چہ اس گوسفند نے شیروں کے سامنے پیغمبری کا دعوی کیا اور کہا کہ :

" بہر شیران مرسل یزدانیم "

اور پھر انھیں نصیحت کی کہ :

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است
زندگی مستحکم از نفی خودی است

روح نیکاں از علف یابد غذا　　　تارک اللحم است مقبول خدا

جنت از بہر ضعیفاں است و بس　　　قوت از اسباب خسران است و بس

اے کہ می نازی بذبح گوسفند

ذبح کن خودرا کہ باشی ارجمند

چوں کہ :

قوم شیر از فتح پیہم خستہ بود

دل بذوق استراحت بستہ بود

اس لیے شیروں کو یہ وعظ خواب آور خوب پسند آیا اور انھوں نے " دین گوسفندی" اختیار کرلیا۔ گوشت کھانا چھوڑ دیا گھاس چرنے لگے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تیزیٔ دندان رہی اور نہ ہیبت چشم شیر افشاں رہی ۔ زور تن گھٹ گیا ، خوف جان بڑھ گیا بے ہمتی کے سبب سے " کوتہ دستی، بیدلی ، دُوں فطرتی پیدا ہوگئی۔

اور :

شیر بیدار از فسون میش خفت

انحطاط خویش را تہذیب گفت " (۱)

مولانا نے علامہ اقبال کی نظم کردہ اسی حکایت کے اشعار بطور امثال پیش کیے ہیں اور واضح کیا ہے کہ علامہ اقبال نے بھی یہی بات واضح کرنی چاہی ہے کہ افلاطون یونانی اور حافظ شیرازی دونوں اسی مسلک گوسفندی کے پیرو ہیں اس لیے ان سے احتراز واجب ہے۔

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا نظم کے چند اشعار یہ ہیں :

راہب اول فلاطون حکیم　　　از گروہ گوسفندان قدیم

گفت سرّ زندگی در مردن است　　　شمع را صد جلوہ از افسردن است

گوسفندے در لباس آدم است　　　حکم او برجان صوفی محکم است

بسکہ از ذوق عمل محروم بود　　　جان او وارفتہ معدوم بود

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر صوفی محمد ؛ سیرت اقبال، آگرہ : اخبار پریس آگرہ ، ۱۹۳۲ء، ص: ۱۰۳

منکر هنگامهٔ موجود گشت
خالق اعیان نا مشهود گشت

زنده جان را عالم امکان خوش است
مرده دل را عالم اعیان خوش است

هوشیار از حافظ صهبا گسار
جامش از زهر اجل سرمایه دار

رهن ساقی خرقهٔ پرهیز او
می علاج هول رستاخیز او

نیست غیر از باده در بازار او
از دو جام آشفته شد دستار او

چون خراب از بادهٔ گلگون شود
مایه دار حشمت قارون شود

مفتی اقلیم او مینا بدوش
محتسب مستی پیر می فروش

طوق سا غر کرد مثل رنگ می
خواست فتوی از رباب و چنگ و نے

در رموز عیش و مستی کاملے
از خمے خمے در دلے بادو گلے

رفت و شغل ساغر و ساقی گذاشت
بزم رندان و می باقی گذاشت

چون جرس صد نالهٔ رسوا کشید
عیش هم در منزل جانان ندید

در محبت پیر و فرهاد بود
بر لب او شعلهٔ فریاد بود

تخم نخل آه در کهسار کاشت
طاقت پیکار با خسرو نداشت

مسلم و ایمان او زنار دار
رخنه اندر دینش از مژگان یار

آنچنان مست شراب بندگی ست
خواجه و محروم ذوق خواجگی ست

دعوی او نیست غیر از قال قیل
دست او کوتاه و خرما بر نخیل *

آن فقیه ملت می خوار گان
آن امام امت بے چارگان

گوسفند است و نوا آموخت است
عشوه و ناز و ادا آموخت است

دل ربائی هائے او زهر است و بس
چشم او غارت گر شهر است و بس

ضعف را نام توانائی دهد
ساز او اقوام را اغوا کند

از نو (۱) یونان زمین زیرک‌تر است
پردهٔ عودش حجاب اکبر است

نغمهٔ چنگش دلیل انحطاط
هاتف او جبرئیل انحطاط

بگذر از جامش که در مینائے خویش
چون مریدان حسن (۲) دارد حشیش

---

(۱) " یونان زمین " سے مراد افلاطون یونانی ہے جن کے متعلق وہ پہلے بتاچکے ہیں کہ
راہب اول فلاطون حکیم — از گروہ گوسفندان قدیم

(۲) فرقہ باطنیہ کے پیشوا حسن بن صباح سے مراد ہے ۔ اس نے جبل الموت پر ایک حسین باغ بنایا تھا جس میں بہت سی حسین عورتوں کو لاکر رکھا تھا۔ حسن بن صباح کے مرید لوگوں کو بھنگ پلاکر بے ہوش کردیتے اور اس باغ میں لے جاتے تھے نشہ اترنے پر وہ سمجھتے کہ ہم بہشت میں آگئے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد پھر اسی طرح بے ہوش کرکے انہیں پہاڑ سے نیچے لے جایا جاتا اور کہا جاتا کہ اب تم نے

(باقی فٹ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

بے نیاز از محفل حافظ گذر   الحذر از گوسفندان الحذر

علامہ اقبال کی اس نظم سے " زاہدان خشک" بہت برہم ہوئے اور ان پر کفر کے فتوے عائد کیے گئے مگر اقبال ایک مصلح قوم اور صلح پسند فطرت کے حامل تھے انہوں نے رفع شر کے لیے یہ اشعار " اسرار خودی" سے حذف کردیے - لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان اشعار سے ان کا مقصد نہ حافظ شیرازی کی تحقیر و تضحیک ہے اور نہ ہی سچے تصوف پر کوئی ضرب لگائی گئی ہے بلکہ بقول آقائے محیط طباطبائی ایرانی :

" در آن مثنوی به عرفان سست و تصوف را کد و خاموشی کنایت بود "

اس سلسلے میں مولانا قادری رقم طراز ہیں :

" اقبال نے عرفان سست اور تصوف را کد و جامد پر حملہ کیا ہے - کلام حافظ کی تعلیم اور اس کے اثر پر انتقاد کیا ہے - افلاطون کے فلسفے اور اس کے نفوذ پر تبصرہ کیا ہے - حافظ کے متعلق جو الفاظ علامہ اقبال نے ان اشعار میں لکھے ہیں وہ بھی اقبال کے اپنے نہیں ہیں بلکہ خود خواجہ حافظ کے ہیں - حافظ کے خرقہ کا رہین ساقی ہونا ، مے کا علاج ہول رستاخیز ہونا ، جام و بادہ سے حافظ کی دستار کا آشفتہ ہونا ، جام و بادہ سے حافظ کی دستار کا آشفتہ ہونا وغیرہ سب مضامین حافظ کے اشعار سے لئے گئے ہیں -" (۱)

ان تمام باتوں کی تائید حافظ کے مندرجہ ذیل اشعار سے بھی ہوتی ہے - کہتے ہیں :

در رہ مغان نیست چوں شیدائے   خرقہ جائے گرو بادہ و دفتر جائے

(صفحہ گزشتہ کا بقیہ فٹ نوٹ) زندگی میں ہی جنت دیکھ لی - اگر ہمارے کہنے پر عمل کیا تو مرکر بھی یہیں پہنچ جاؤ گے اس فریب میں آکر لوگ جان دینے کے لیے آمادہ ہوجاتے اور اس طرح حسن بن صباح ان کے ذریعہ بادشاہوں ، وزیروں ، عالموں اور زاہدوں کو قتل کراتا رہتا تھا - (مقالہ نگار)

(۱) طاہر فاروقی ، ڈاکٹر مولوی محمد " بزم اقبال " ، محولہ بالا ، ص ۱۰۸

خرقۂ زھد مرا آب خرابات بہ برد　　　خانۂ عقل مرا آتش خم خانہ بسوخت

اس طرح خرقہ و سجادے کے آلودہ و گروی ہونے اور طرہ و دستار کے آشفتہ و پراگندہ ہونے کے مضامین حافظ کے یہاں کثرت سے نظر آتے ہیں ۔

" اسرار خودی کے مندرجہ بالا اشعار میں اقبال کا یہ مصرع :

" دست او کوتاہ و خرما بر نخیل "

بھی دراصل خواجہ حافظ ہی کا مصرع ہے جس کو یہاں اقبال نے ایک لفظ بدل کر تضمین کردیا ہے اس سے اقبال کا مقصود یہی ہے کہ خواجہ حافظ صرف قیل و قال اور باتیں بنانے کے آدمی ہیں اور سعی و عمل سے جی چراتے ہیں ، جیسا کہ خود ان کے کلام سے ظاہر ہے :

من نمی یابم مجال اے دوستان　　　گرچہ او دارد جمالے بس جمیل

پائے مالنگ است و منزل بس دراز　　　دست ما کوتاہ و خرما بر نخیل

اقبال نے بھی ان کو امام امت بے چارگان اسی باعث کہا ہے کہ وہ عزم و حوصلے کی بجائے بے چارگی و درماندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں مولانا قادری تحریر کرتے ہیں :

" اقبال کو مسلک حافظ پر اعتراض کرنے میں حافظ کی نفس ذات اور ان اخلاق اور اس تعلیم سے بحث نہیں جو فی الواقع ہوگی ۔ وہ تاریخی و تنقیدی نظر میں نہ محقق و مسلّم ہے اور نہ اب اس کا کوئی اثر ہے ، بلکہ حافظ کی اس ذات اور ان اخلاق اور اس تعلیم سے اقبال کو تعلق ہے جو " تصوف اور ادبیات اسلامیہ" پر موثر رہی ہے اور اس بات سے مطلق انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ افلاطون ، " منکر ھنگامۂ موجود" اور " خالق اعیان نامشہود" تھا ۔ افلاطون کے فلسفے نے شروع ہی سے اسلامی علم و ادب اور مذہب و تصوف پر اثر کیا ۔ اس

فلسفے سے " وحدت وجود " یا " توحید وجودی" کا مسلک نکلا اور تمام عالم طریقت پر چھا گیا۔ اور شعر و ادب میں بھی یہ مسائل عام ہوگئے -" (۱)

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ غالب اور دوسرے شعرا کے یہاں یہ مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ جن میں ذوق عمل سے محرومی اور نفس تمنا یقینی ہے اور ہرچا بھی چاہئے کیوں کہ تمنا اور عمل انسان کے فطری تقاضے ہیں اسلام تمام امل و عمل ہی ہے لیکن حافظ کا مسلک سب کو غرق مئے ناب کرنا اولا سمجھتا ہے - وہ کہتے ہیں :

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد است　　بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است

ساقیا برخیز و دردہ جام را　　　　خاک برسر کن غم ایام را

عہد و پیمان فلک را نیست چندان اعتبار

عہد با پیمانہ بندم شرط با ساغر کنم

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

حافظ کے ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

" مسلمان کے لیے راز دہر کوئی معمہ نہیں، مسلمان اسی راز کی جستجو کرنے اور سمجھانے کے لیے آیا ہے بلکہ مسلمان خود اس معمے کا حل ہے خواجہ صاحب کے شعر میں یہ تعلیم نکلتی ہے کہ علم و حکمت میں نہ پڑو مسائل فلسفہ کی بحث چھوڑو۔ مگر یہ تعلیم ناقص اور مضر ہے کیوں کہ مسلمان کو تعلیم دی گئی ہے کہ " الحکمۃ ضالۃ المومن" خواجہ حافظ اس کے بجائے " حدیث مطرب وے" کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں جو مجازی معنی میں بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے - میں یہ نہیں کہتا کہ حافظ صہبا گسار تھے یا ان کی صہبا سے مراد شراب معرفت نہیں ہے - انہوں نے پیالہ میں عکس رخ یار دیکھا

---

(۱)　طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد : یوم اقبال"، محولہ بالا، ص ۱۱۰

ہوگا۔ لیکن ان کا پیالہ اور ان کا دیکھنا ان کے ساتھ گیا اب ہمارے لیے ان کا کلام اور اس کا اثر ہے - ان مسائل کے بیان میں حافظ تنہا نہیں ہیں۔ دوسروں نے بھی لکھے ہیں لیکن اتنا شیریں بیان کوئی نہ تھا۔ اس کثرت سے کسی نے نہیں لکھے - اسی لطف سخن کے سبب سے خواص و عوام سب میں حافظ کو قبول خاطر حاصل ہوا۔ حافظ کا یہ پیام کہ " در عیش کوش و مستی " ، " بمے سجادہ رنگین کن" ، " در عیش نقد کوش"، " حدیث از مطرب و مے گو و راز دھر کمتر جو" اور طریقت و معرفت کی طرف اس کا اشارہ صرف ارباب معرفت اور اہل راز سمجھ سکتے تھے - عوام کی نظر اس کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک نہیں پہنچ سکتی۔ حافظ کے اس پیام اور اس بیان کی شیرینی و دل آویزی عوام پر جیسا اثر کرسکتی ہے ظاہر ہے - اسی بنا پر اقبال نے صرف حافظ کا نام لیا ہے - ورنہ ان کے اعتراض کی زد میں اس طرح کے سب شاعر ہیں۔ حافظ کی ذات سے اقبال کو بحث نہ تھی بلکہ صوفیوں اور صوفی شاعروں کے اس مسلک سے بحث تھی - یہ مسلک جس کو خواجہ حافظ ان اشعار میں بیان کرتے ہیں :

مقام امن و مے بیغش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہے تو فیق
جہان و کار جہان جملہ ہیچ در ہیچ است
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق

اصل میں صوفیوں کا ایک " حال" تھا ، " مقام " نہ تھا ، منزل مقصود نہ تھی اور محض " حال" کے اعتبار سے خواجہ حافظ کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن صوفی کا یہی حال اس کا " مقام" ہوجائے جیسا کہ خواجہ عطّار وغیرہ کا ہوگیا تھا تو بلا شبہ یہ بڑے مرتبے کی بات ہے اس لیے کہ " حال" کا " مقام " ہونا بہت دشوار بات ہے - یعنی یہ مرتبہ آسان نہیں ہے کہ ایک کیفیت جو کبھی کبھی دل پر وارد ہوتی ہے اور " حال" کہلاتی ہے ، جم جائے اور مستقل طور پر قائم ہوجائے گویا صوفی کا " مقام" اور جائے قیام بن جائے - لیکن اگر اس " مقام " کو منزل مقصود سمجھ لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اب اس سے آگے کوئی درجہ اور مقام نہیں ہے تو پھر نہ صرف حافظ و عطّار پر بلکہ خود شیخ اکبر محی الدین ابن عربی پر بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے - اور کیا گیا ہے - تصوف کی کتابیں اس رد و قدح سے بھری پڑی ہیں - صرف علمائے ظاہر نے نہیں ، بڑے بڑے صوفیائے کرام نے بحثیں

کی ہیں ۔ پھر ایک اقبال نے حافظ پر اعتراض کردیا تو کیا عجیب بات تھی لیکن بات وہی تھی کہ حافظ کی مقبولیت نے اقبال پر کفر کے فتوے دلوائے ۔ اگر حافظ کی جگہ حکیم فارابی یا بو علی سینا کا نام لیتے تو کوئی توجہ بھی نہ کرتا۔" (۱)

مولانا قادری نے حافظ کے اس مسلک پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان سب باتوں کا سلسلہ مسئلہ وحدت الوجود اور اس کے تاثرات سے ہے ۔ اس مسلک کی بنیاد حکمائے یونان، سقراط و افلاطون وغیرہ کا فلسفہ تھا۔ دوسری صدی ہجری سے یہ فلسفہ اسلامی تصوف پر بھی اثر انداز ہوا۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اس کے سب سے بڑے مبلغ ہوئے ۔ رفتہ رفتہ صوفیوں کے تمام فرقے اس کے زیر اثر آگئے ۔ مولانا قادری چوں کہ خود صاحب سلسلہ اور اہل طریقت میں سے تھے لہذا اس مسئلے کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتے تھے اس سلسلے میں وہ خود یوں رقم طراز ہیں :

" اہل راز اور ارباب نظر نے وحدت الوجود کی صداقت و حقیقت کو چشم باطن سے دیکھا ہے اس لیے اس میں کسی کو مجال گفتگو نہ ہونی چاہئے ۔ میں اولیا اللہ کو نائب رسول مانتا ہوں اور بجز نبوت اور خصائص نبوت کے تمام صفات نبوت کا حامل یقین کرتا ہوں یہ وصف نبوت اور مدح الٰہی کہ " ما زاغ البصر و ما طغیٰ" اور " ما کذب الفواد ما رای " بلا شبہ کمال صداقت کے ساتھ تو صرف حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہی کے لیے موزوں ہے ۔ لیکن اس کا پرتو اولیا اللہ پر بھی پڑا ہے ۔ ان کی نگاہ بھی اسرار الٰہی کو دیکھنے میں غلطی نہیں کرتی اور ان کا دل بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ انھوں نے وحدۃالوجود کی حقیقت کو جیسا دیکھا اور پایا بلا شبہ درست ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ سلوک و طریقت کی ایک " راہ منزل" تھی " منزل " نہ تھی ۔" (۲)

مولانا قادری بھی اس کو راہ منزل بتاکر اقبال کے اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد " بزم اقبال"، محولہ بالا، ص ۱۱۲

(۲) ایضاً، ص ۱۱۳

ابھی عشق کے امتحان اور جہان اور بھی باقی ہیں ان تمام باتوں کا تعلق صوفیائے کرام کی ذات سے تھا اگر یہ ان ہی کے حال و مقام تک رہتا تو دنیا والوں کو اس کی خبر نہ ہوتی اور نہ کوئی تعلق خاطر ہوتا اور نہ انہیں دخل دینے کا موقع ملتا لیکن شعراء و ادبا کے طفیل یہ تمام مضامین و مسائل نئی نئی تراکیب و استعارات اور عبارات و بیانات کے ذریعہ عام ہوئے اور ان کا اثر ہونا لازمی بات تھی ۔ علامہ اقبال اور مولانا قادری کا موضوع بھی یہی اثر ہے ۔

خواجہ حافظ نے مندرجہ بالا اشعار میں بقول ان کے توفیق و تحقیق فرمایا ہے :

" میں نے خوب تحقیق کرلیا ہے کہ جہان و کار جہان سب ہیچ ہے اس لیے اگر تجھے مقام امن اور معرفت الٰہی (مے بیغش) اور شیخ کامل (رفیق شفیق) کی صحبت میسر ہوجائے تو اس سے بڑھ کر کیا توفیق الٰہی ہوگی۔" (۱)

مولانا قادری حافظ کے اس مسلک پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" حافظ کا یہ مسلک اسلامی تعلیم ، اسوۂ حسنۂ نبوی ، مقصد خلافت الٰہی اور مدعائے تخلیق عالم کے سراسر خلاف ہے ۔ یہ تعلیم خود نبی کریم (صلعم) نے ارشاد نہیں فرمائی " خیر القرون قرنی" میں بھی اس کی تلقین نہیں ہوئی۔ پہلی صدی ہجری میں بلکہ دوسری صدی ہجری تک بھی صوفیائے کرام نے یہ ہدایت نہیں فرمائی ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس قسم کا زہد رہبانیت تک پہنچتا ہے ۔ دنیا دارالعمل ہے ۔ انسان عمل کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے ، تمام دنیا بلکہ تمام عوالم انسان کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ تمام موالید و عناصر کی تسخیر کے لیے انسان کو بھیجا گیا ہے ۔ کیا یہ مقصد " جہان و کار جہان کو ہیچ در ہیچ " سمجھنے سے پورا ہوسکتا ہے ۔ انسان کے لیے سب سے پہلے اس کی جان اور اس کا جسم ہے اس کی خواہشیں ، قوتیں اور قدرتیں ہیں۔ ان میں سے کسی سے غافل رہنا یا کسی کو بے کار رکھنا مقصد خداوندی نہیں ہے ۔ ان سے بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ کام لینے کا حکم دیا گیا ہے ۔ ان کے بعد

---

(۱) طاہر فاروقی ، ڈاکٹر مولوی محمد " بزم اقبال " ، محولہ بالا ، ص

انسان کے سامنے تمام دنیا ہے اور اس کے حقوق و ذمہ داریاں ہیں۔ ان سے بہتر سے
بہتر طریقے پر عہدہ برآ ہونا انسان کا مقصد حیات ہے ۔ یہی مذہب ہے اور
یہی تصوف ہے ۔" (۱)

مولانا کے نظریے کے مطابق انسان کی زندگی آرزو اور عمل سے عبارت ہے ۔
آرزوں کی تحدید اور عمل کی تہذیب ہر مذہب کا اور سب سے بڑھ کر مذہب اسلام کا کام
ہے ۔ مولانا کی دانست میں یہی چیز تصوف ہے ۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو حسین
ترین اشکال میں انسان کے سامنے پیش کرنا اور دل کے لیے مرغوب و محبوب بنانا تصوف کا
مقصد و مدعا ہے یہ تصوف ہی کی کرامت ہے کہ عبادات و معاملات انسان کی نظر میں مہیب
و خوف ناک نہیں رہتے بلکہ حسین و محبوب بن جاتے ہیں ان پر عمل کرنا گراں نہیں گذرتا
بلکہ عمل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس سے زندگی کے کسی مرحلے پر کوئی رکاوٹ پیش
نہیں آتی ۔ حضور نبی کریم (صلعم) ، خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین
سے بڑھ کر صوفی کون ہوسکتا ہے لیکن یہ سب ہستیاں تمام شعبہ ہائے حیات اور تمام لوازم
و مشاغل زندگی پر عامل تھے۔ ان ہستیوں کا اتباع کرنا اور اسی طرح دنیا میں عمل کرنا
اور پیہم کرتے رہنا اسلام بھی ہے اور تصوف بھی ۔ لیکن یہاں سوال یہی پیدا ہوتا ہے
کہ کیا یہ اتباع خواجہ حافظ کے قول پر عمل کرنے سے ممکن ہے ۔

اس سلسلے میں مولانا قادری کی رائے یہ ہے :

" بلا شبہ انسان کا مقصد اولین خدا کی محبت، معرفت اور عبادت ہے ۔"
" وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون " (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف
اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) لیکن کیوں؟ اس لیے کہ خدا کی محبت، خدا کی
معرفت اور خدا کی عبادت سب سے پہلے انسان کی موجودہ زندگی اور اس دنیا کے
اعمال و اشغال میں کام آتی ہیں۔ سب سے زیادہ ان کی ضرورت اس حیات فانی

---

(۱) طاہرفاروقی ، ڈاکٹر مولوی محمد ،" بزم اقبال"، محولہ بالا ، ص ۱۵-۱۱۳

کے لیے ہے - خداکا کوئی حکم، رسول خدا کا کوئی ارشاد، اسلام کا کوئی قانون، تصوف کا کوئی ذکر و شغل ایسا نہیں جس کی انسان کو دنیوی زندگی کے لیے ضرورت نہ ہو۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ کہ روزمرہ کے مشاغل زندگی میں حاصل نہ ہوتا ہو بلکہ اگر " زاہدان خشک " کفر کا فتوی نہ لگادیں تو شاعرانہ اسلوب بیان میں کہنا چاہئے کہ خود خدا بھی انسان ہی کے لیے ہے (چوں کہ میں بھی اقبال کی طرح زاہدان خشک سے ڈرتا ہوں اس لیے اس جملے کی تشریح کرتا ہوں کہ حقیقت میں تو خدا اپنے ہی لیے ہے - خود بخود ہے ، بخودی خود مستقل و حیّ و قائم ہے لیکن اس کا اپنے آپ کو خدا کہنا اور کہلوانا انسان کے لیے تھا اس کو اس کہنے اور کہلوانے ، بتانے اور منوانے کی اپنے لیے ضرورت نہ تھی لیکن انسان کے لیے ضرورت تھی - اس کا وجود کسی کے لیے نہیں - لیکن اس کا ظہور انسان کے لیے ہے) غرض فوق ثریا سے تحت ثری تک جملہ کائنات انسان کے تصرف کے لیے خلق کی گئی ہے - فرشتوں پر انسان کو برتری ہے - عناصر پر انسان کو غلبہ ہے وہ زمین پر اس کا خلیفہ و نائب ہے خدا نہیں ہے مگر اور سب کچھ ہے - اوپر خدا نیچے انسان - خدا کی خدائی اور انسان کی خودی۔ اقبال نے " خودی" کی اصطلاح انہی معنوں میں استعمال کی ہے - " خداکی خدائی" کا جو مفہوم ہے وہی " انسان کی خودی" کا ہے - خدا" حقیقی خدا" ہے - انسان" مجازی خدا" - یہ نظریہ اقبال کی ایجاد نہیں وہ صرف اس کے مبلغ و مفسر ہیں۔ انسان کو اپنا خلیفہ بنانا اور اپنی صورت پر پیدا کرنا یہی معنی رکھتا ہے - اس مفہوم کے لیے خودی سے بہتر لفظ نہیں مل سکتا تھا - جس طرح خدا سے اس کی صفت خدائی جدا نہیں ہوسکتی - اسی طرح انسان سے اس کا وصف خودی بھی جدا نہ ہو نا چاہئے - یہ میں نے اس لیے لکھا کہ خداکی صفات قدیم و واجب وغیرہ منفک ہیں۔ لیکن انسان کی صفات حادث و ممکن اور قابل ~~انفکاک~~ انفکاک - خدا اپنی خدائی کے منافی کام نہیں کرسکتا لیکن انسان اپنی خودی کے خلاف کرسکتا ہے - اگرچہ پھر وہ انسان کے درجے سے گر جاتا ہے - انسان اسی وقت انسان ہے جب تک اپنی خودی کو قایم رکھے ، خلافت الٰہی کا حق ادا کرے اور اپنی خودی سے خدائی کرتا رہے -" (۱)

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد "بزم اقبال" ، محولہ بالا ، ص ۱۷-۱۱۶

حافظ کے اس مسلک اور اقبال کی خودی کی وضاحت کرنے کے بعد مولانا اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ کیا یہ " خودی و خدائی" زہد خشک اور ترک دنیا سے قائم و کارفرما رہ سکتی ہے ؟ اور ظاہر ہے کہ ایسا نا ممکن ہے انسان کی خلافت اور نیابت الہی ، عالم بالا کے لیے نہیں ، مابعد الحیات کے لیے نہیں ، عقبی و آخرت کے لیے نہیں۔ وہ ایسی مادی زندگی ، عالم مجاز اور حیات ناپائیدار کے لیے ہے ۔ اسی گوشت و پوست اور آب و خاک کی دنیا کے لیے ہے ۔ انسان اس زمین پر خلیفہ بناکر بھیجا گیا ہے اس کو اس زمین پر خلافت کرنی ہے اس کو پہلے اس عالم اور اس زندگی سے گذرنا ہے دوسرا عالم اور دوسری زندگی اس کے بعد کی بات ہے ۔ اور وہ بھی حقیقت میں اسی زندگی کے لیے ہے ۔ اسی زندگی کے سبب سے ہے اور اسی زندگی کا نتیجہ ہے ۔ قیامت میں حساب و کتاب ہوگا مگر وہ بھی اسی زندگی کا محاسبہ ہوگا۔

اس دنیا میں انسان کو جمادات و نباتات یا حیوان بن کر نہیں رہنا بلکہ انسان اور خلیفۃ اللہ بن کر رہنا ہے ۔ اور انسانوں میں سب سے زیادہ یہ حق " مسلمان" کو پہنچتا ہے ۔ جس طرح انسان اشرف المخلوقات ہے اسی طرح مسلمان انسانیت میں اپنی اشرف ہے ۔ شخصی انسانیت کی تکمیل حضور نبی کریم (صلعم) کی ذات اقدس سے ہوتی ہے اور قومی انسانیت کی تکمیل مسلمان سے ۔ مسلمان کی تکمیل انسانیت بھی اسی مادی دنیا کے لیے ہے ۔ اگر کوئی مسلمان عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار ہے ۔ سکر و صحو میں رہتا ہے ، مجاہدے و ریاضت اور مراقبے کرتا ہے اور معتکف ہوتا ہے مگر اپنے ماحول سے بے خبر ، اپنے اہل و عیال ، دوست و دشمن ، ہم سایہ و ہم نشین اور ملک و قوم سے بے نیاز ہے اور اپنے مجاہدے و اعتکاف کے سبب بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اتباع سنت میں قاصر ہے اور حقیقت میں وہ خلافت الہی اور نیابت نبوت کے منشا و مقصد کو پورا نہیں کرتا اور تکمیل انسانیت کا منصب نہیں رکھتا۔

یہاں خواجہ حافظ کا نظریہ یہ ہے :

حاصل کارگہہ کون و مکان این ہمہ نیست

بادہ پیش آرکہ اسباب جہان این ہمہ نیست

مولانا قادری حافظ کے اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" حافظ کا خیال ہے کہ کون و مکان کے کارخانے سے کچھ ملنے والا نہیں اور اسباب جہان سب بے کار ہیں۔ ہروقت یادالہی میں رہو " بادہ پیش آر" یہاں میں اہل تصوف کی تعبیر و تشریح کے مطابق حافظ کے ساغر و بادہ ، رند و مے خانہ ، شاہد و معشوق سے محبت و معرفت الہی ، صوفی و سالک ، مرشد و شیخ مراد لے رہا ہوں۔ لیکن خدا اور خدا کے رسول اور قرآن و اسلام بلکہ خود اولیائے کرام و صوفیائے عظام نے کہیں جہان و اسباب جہان سے قطع نظر کرنے کا حکم نہیں دیا مسلمان کو " دل بیار و دست بکار" رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ اسی قسم کی بلند ہمتی اور استحکام خودی کی تعلیم کے سبب اقبال حافظ کے مقابلے میں عرفی کو ترجیح دیتے ہیں ورنہ اقبال کو دونوں کی ذات اور اخلاق سے کچھ بحث و تعلق نہیں۔ حافظ نے ہر جگہ پست ہمتی ، بے سودی عمل ، ترک دنیا ، اور سکر و محویت کی تلقین کی ہے اور ایسے ایسے لطیف و شیرین طرز و بیان میں کہ عوام و خواص سب گرویدہ ہیں۔ کچھ آج نہیں ہمیشہ سے حافظ کا کلام مقبول رہا ہے ۔ اس کا سبب شاعرانہ خوبیوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ حافظ کی تعلیمات و پیامات اس زمانے کی حالت سے مطابق تھے ۔" (۱)

یہ حقیقت ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی ایران و ہندوستان میں سیاسی انقلابات کے سبب مسلمان پست ہمت ، تارک العمل و عافیت پسند ہوگئے تھے ۔ صوفیوں نے بھی ایسا ہی مسلک اختیار کرلیا تھا۔ امراء و روساء اور ان کے اثر سے متوسط طبقے کے اخلاق بھی برباد ہو رہے تھے ۔ حافظ کی شاعری ان ہی تاثرات کا نتیجہ تھی جس نے طبائع پر اثر کیا۔

---

(۱) طاہرفاروقی ، ڈاکٹر مولوی محمد ، " بزم اقبال" ، محولہ بالا ، صص ۲۱-۱۲۰

حافظ کی بزرگی و ولایت کے سبب لوگوں نے ان کے کلام کو قرآن و حدیث کی تفسیر سمجھا اور صوفیا کے کچھ گروہ اپنے اهل سلسلہ کو دنیا سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسی هی تعلیمات دینے لگے ۔ اس دور کی مکمل تفصیل و تصویر مولانا قادری کے الفاظ میں یوں هے :

" خواجہ حافظ آٹھویں صدی هجری میں تھے۔ ان کے بعد دوسو برس کے اندر اسلام اور تصوف کی کایا پلٹ گئی ۔ یہاں تک کہ ایران میں شاهان صفویہ اور هندوستان میں سلاطین مغلیہ کے عہد سے اسلام و تصوف کی اصلی روح پر پردہ پڑگیا۔ جمود ، بے عملی ، پست همتی ، عیش پسندی ، تقریباً تمام دنیا کے مسلمانوں میں عام هوگئی تھی ایران و هند میں شاید سب سے زیادہ تھی۔ قومی عصبیت اور فرقہ پرستی کا زور سب سے زیادہ اسی زمانے میں هوا ۔ هندوستان میں اکبر و جہانگیر کے عہد اس لحاظ سے دور ابتلا تھے ۔ امرا کا تعیش حد سے گذر گیا تھا اور رعایا بھی اسی رو میں بہی جارهی تھی ، ملکی سیاست نے اخلاقی تباهی پیدا کردی تھی ۔ هندوؤں کی آمیزش سے مذهب ، معیشت اور معاشرت میں اسلامی صفائی و بے لوثی نہ رهی تھی۔ اهل باطن اور ارباب تصوف خود اپنے جہاد نفس میں ایسے مشغول تھے کہ ملک و ملت کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت نہ پاتےتھے ۔ خانقاہ نشینی ، عافیت گزینی ، ترک لذات ، مجاهدات و ریاضات ان کے اشغال تھے۔ عالم و پرهیزگاری مسلمانوں میں قرآن و حدیث کا درس و تدریس اور احکام شریعت کی پابندی تو بہت تھی لیکن اتباع سنت کا اهتمام شاذ و نادر تھا۔ عام مسلمانوں میں اسلامی احکام سے غفلت ، اسلامی اخلاق سے بے پروائی ، نفس پرستی ، دنیوی دول فطرتی حقوق العباد کو سمجھنے اور ادا کرنے سے بے توفیقی شائع و عام تھی۔" (۱)

ایسے هی زمانے میں اعلائے کلمۃ الحق اور احیائے دین اسلام کی خاطر کسی مجدد کی ضرورت هوا کرتی هے لہذا قدرت نے ایسے عالم میں حضرت مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرهندی رحمتہ اللہ علیہ کا ظہور فرمایا۔ یہ وہ وقت تھا جب اکبر کی بے دینی اور جہانگیر کی عیش کوشی و غفلت شعاری نے سرمایہ ملت کو بکھیر کر مسلمانوں کو نہایت پست همت بنادیا تھا ۔ ان بے توفیق اور پست همت لوگوں کے لیے حضرت مجدد الف ثانی جیسی

---

(۱) طاهر فاروقی ، ڈاکٹر مولوی محمد ، " بزم اقبال" ، محولہ بالا ، ص ۲۳-۱۲۲

ہی ہمہ صفت موصوف اور [illegible] خدا ترس و برگزیدہ ہستی کی ضرورت تھی اور یہ حقیقت ہے کہ سرمایۂ ملت یعنی ایمان ، اخلاق ، معاشرت، شریعت ، طریقت ، اتباع سنت کی بروقت جیسی نگہبانی حضرت مجدد نے فرمائی وہ اظہر من الشمس ہے - آپ نے جہانگیر کے سامنے کبھی گردن نہ جھکائی - اور مسلسل حق گوئی و صداقت کا نعرہ بلند کرتے رہے آخر جہانگیر کو خود جھکنا پڑا اور تمام غیر شرعی قوانین منسوخ کر دیے گئے - آپ نے صرف اصلاح شریعت ہی نہ کی بلکہ تصوف و طریقت کی بھی تجدید کر دی- اس دور کے صوفیوں اور تصوف کا وہی رنگ تھا جو خواجہ حافظ کے کلام میں نظر آتا ہے اور اس کا سرچشمہ وہی " وحدت الوجود" کا مسئلہ یعنی اس کو منتہائے سلوک سمجھنا تھا - حضرت مجدد الف ثانی نے صوفیوں کے اس خیال کی مدلل اور پر زور تردید کی - بڑے بڑے اولیائے کرام آپ کے مسلک اور روحانیت کے معتقد ہیں -

حضرت مجدد کا قول تھا :

" میں تمام مقامات سلوک سے گذرا ہوں- " وحدت الوجود" کے مقام پر بھی پہنچا اور وہاں ایسی کیفیت پائی کہ دل چاہتا تھا کہ یہیں رہئیے لیکن اللہ تعالی نے توفیق بخشی اور معلوم ہوا کہ مقام " وحدت الوجود" منتہائے عروج نہیں ہے - اس سے آگے سالک کو سفر کرنا ضروری ہے - میں آگے بڑھا اور آگے بڑھا - سب سے آخر میں مقام " عبدیت " میں پہنچا اور وہاں یہ معلوم ہوا کہ آخری مقام یہی ہے اس سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں - یہی مقام محمود ہے اور یہی مقام محمدی (صلعم) ہے - مومن و سالک کی معراج یہی ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی و اتباع کرے اور ان کا سا عبدہ (بندہ خدا) بن جائے - شریعت و طریقت کا منتہائے کمال یہی ہے - دوسرے تمام مقامات وحدت شہود ، وحدت وجود ، ظلّیت وغیرہ اس سے پست تر ہیں اور سب اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے درمیان راہ کی سیرگاہیں اور منزلیں ہیں- سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ مومن کی باز گشت محمد الرسول اللہ کی طرف ہو-" (۱)

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد " بزم اقبال"، محولہ بالا ، ص ۱۲۵

اس زمانے کے علما اور اہل طریقت باز گشت محمد الرسول سے غافل تھے ۔ اس لیے حضرت مجدد نے کامل اتباع شریعت اور مستحکم پیروی سنت پر زور دیا اور صوفیوں کے جتنے عقائد سنت کی راہ میں حائل تھے سب کو ناجائز قرار دے کر اپنے سلسلے سے خارج کردیا۔ آپ کے نزدیک ہر مسلمان کی زندگی سراسر سعی و عمل ہے ۔ اخلاق کی برتری، معاملات کی درستگی و صفائی خلق خدا کی خدمت اور یہی اصل الاصول ہے ۔ حضور نبی کریم (صلعم) اور صحابہ کرام کا عمل بھی یہی تھا۔ وہاں نہ ترک ذات تھا نہ ترک علائق دنیا، نہ گوشہ نشینی نہ چلہ کشی ۔ خدا کے ساتھ ان کا یہ معاملہ تھا کہ رات رات بھر جاگتے اور عبادت و ذکر و شغل میں مصروف رہتے اور بندوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا کہ دن بھر ارشاد و ہدایت خدمت خلق ، ادائے حقوق العباد، ایثار و جاں نثاری میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن صوفیوں کے یہاں صدھا سال سے وحدت الوجود ، ترک خودی، فنافی الذات، عزلت گزینی، مجاہدہ و چلہ کشی ایسے مرغوب مشاغل تھے کہ لاکھوں بندگان خدا ان پر عمل پیرا تھے ۔ لیکن عوام کی نظر میں ایک مرتبہ ایسا بھی ہے جو کشف و یقین اور معرفت و دین سے بھی بلند ہے اگرچہ یہ لوگ کشف و معرفت کو تو نہیں سمجھ پاتے مگر اتنا ضرور سمجھ لیتے ہیں کہ کوئی ایسی بھی صورت ممکن ہے کہ اکثر دین کی بھی ضرورت و اہمیت باقی نہیں رہتی اور جب دین و مذہب سے غافل رہنے کی تاکید خود خواجہ حافظ کا کلام سحر نظام بھی کر رہا ہو ۔ جب ایسا مشہور و مقبول کلام لوگوں تک پہنچے تو کچھ عجب نہیں کہ ان کے اذہان بھی بدل جائیں ۔ حافظ کے کلام میں شیخ و واعظ، صلاح و تقوی، دین و مذہب کے طعن و استخفاف اور رندی و سرمستی ، عاشقی و آشفتہ سری، عیش و نشاط ، نغمہ و سرود ، ترک عمل سب ہی قسم کے مضامین مل جاتے ہیں۔ ان کے بیشتر

اشعار ایسے ہیں جن کے لفظی و ظاہری معنی نہ لیے جائیں بلکہ مجازی معنی اور صوفیانہ تعبیر سے کام لیں تو بھی ان کو صرف اہل باطن اور ارباب معرفت ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لوگ عیش و نشاط اور رندی و سرمستی کی طرف مائل ہوگئے ۔

ان تمام باتوں کے متعلق اور اقبال کی حافظ پر نکتہ چینی کے سلسلے میں مولانا رقم طراز ہیں :

" تمام دنیائے اسلام میں عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و طبائع پر یہی نقوش جم گئے ۔ اور ان میں بے دلی، بے عملی، بے ہمتی اور دون فطرتی پیدا ہوگئی۔ اس حالت کے پیدا کرنے کے ذمہ دار صرف افلاطون اور خواجہ حافظ نہیں ہیں جن کا نام اقبال نے لیا ہے ۔ بلکہ سلاطین و امراء ، علماء و صوفیاء ، مبلغین و واعظین، شعرا و مصنفین ، سب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے ۔ نظامی، خسرو، سعدی و جامی، سب نے وہ لکھا ہے جو حافظ نے لکھا ۔لیکن اور سب نے صرف یہی نہیں لکھا ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے ۔ اور دوسرے موضوعات و مضامین میں ان کے ایسے مضامین ایک دفعہ کو کم اور غائب بھی ہوجاتے ہیں ۔ لیکن حافظ نے صرف یہی لکھا ہے اور کچھ نہیں لکھا۔ سب سے زیادہ لکھا ہے اور سب سے بہتر و شیریں تر ، سب سے زیادہ مقبول ہوا ہے اور سب سے زیادہ اثر انداز ۔ اس لیے اگر تمام شاعروں میں سے اس بحث کے اندر کسی ایک فرد کا نام انتخاب کیا جائے گا تو وہ بلا شبہ حافظ کا نام ہوگا۔ اس بنا پر اگر اقبال نے اس سلسلے میں حافظ کانام لیا تو ہرگز قابل الزام بھی نہیں بن جائے کہ مستوجب فتوائے کفر ہو ۔

کلام حافظ کے متعلق ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے ایک مضمون مطبوعہ " ساقی" میں مولانا حالی کی رائے لکھتےہیں کہ " بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی اور رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے ۔" ڈاکٹر صاحب اپنے اسی مضمون میں یہ حوالہ بھی دیتے ہیں کہ شیر خاں لودی نے جو امرائے عالم گیر میں سے تھا اپنی کتاب " مرآت الخیال" میں لکھا ہے :

" حضرت عالم گیر شاہ در اوائل ایام سلطنت حکم کردہ بود کہ دیوان خواجہ

حافظ شیرازی را مردم از کتاب خانه ہائے خود برآرند و معلمان ممالک محروسہ به صبیان خود تعلیم نه نمایند"۔

یعنی عالم گیر بادشاہ نے دیوان حافظ کا رکھنا اور پڑھانا ممنوع قرار دے دیا تھا۔ حافظ کے یہ مضامین جن کا اقبال نے حوالہ دیا اور جن نے مثالیں لکھیں یقیناً محل نظر اور قابل بحث ہیں۔ میں تو یہاں تنگیٔ جا کو تعار ہوں کہ حافظ نے اپنے زمانے کے صوفیائے کرام کے جو معتقدات و معمولات بیان کیے ہیں اور جو آج تک تمام عالم اسلام اور ہندوستان کے شیوخ طریقت میں مقبول و رائج ہیں وہ بھی لائق نقد و نظر ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ان پر بحث کی ہے اور اپنے طریقے سے ان کو خارج کردیا ہے ۔ مثلاً " سماع دشمنہ" ، کا تذکرہ حافظ کے کلام میں شراب و شاہد سے دوسرے نمبر پر ہے ۔ یہ سماع آج بھی رائج ہے مگر حضرت مجدد کے نزدیک یہ شغل نامحمود ہے ۔" (۱)

خواجہ حافظ نے اپنے اشعار کے ذریعہ اکثر چلہ کشی اور مراقبے و مجاہدے کی تعلیم دی ہے ۔ یہ سچا ہے کہ چلہ کشی ، فاقہ کشی ، ترک حیوانات ، اشغال مالایطاق ، مجاہدات طاقت آزمااپنے اثرات و فوائد میں نہایت سود مند ہیں اور ان پر عمل پیرا رہ کر سالکان راہ خدا نے بڑی بڑی منازل طے اور بڑے بڑے مراتب حاصل کئے ہیں۔ لیکن تزکیہ نفس ، بالیدگی روح اور عشق خدا و رسول میں کام یاب ہونے کے اور بھی بہت سے ذرائع تھے ۔ ان مجاہدات و ریاضات پر عمل پیرا رہنا اب اہل زمانہ کے لیے ممکن نہ تھا کیوں کہ اب زمانہ وہ تھا جب لوگ نماز و روزہ کو بھی گراں جانتے تھے تو ایسے عالم میں مجاہدے و ریاضت کی طرف کون متوجہ ہوتا ان حالات کو دیکھ کر حضرت مجدد الف ثانی نے سلوک کے طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ کو رواج دیا جس کے ذریعہ سخت و صعب مجاہدات کے بغیر بھی تزکیہ نفس اور تصفیۂ قلب اور خلوص عبادات و صفائے معاملات حاصل ہوسکتا تھا اور اس طرح آپ نے

---

(۱) طاہرفاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد ، " بزم اقبال"، محولہ بالا ، صص ۳۳-۱۳۲

معرفت الٰہی کی اک سہل و آسان راہ لوگوں کو بتلادی ۔ اس طرح حضرت مجدد الف ثانی کی طرح خواجہ حافظ کے مسلک و تعلیم کو اقبال نے بھی مناسب تصور نہ کیا اور تنقید کئے بغیر نہ رہے ۔

اس سلسلے میں مولانا قادری تحریر کرتے ہیں : " میری رائے حافظ و کلام حافظ کے متعلق یہ ہے کہ حافظ کی بزرگی و پاک دامنی میں کوئی شک نہیں۔ حافظ کے کسی ہم عصر یا قریب العصر مورخ و مصنف نے ان کی رندی و عشق بازی کی شہادت نہیں دی صرف ایک " مفتاح التواریخ" میں ایک دو واقعات حافظ کی شراب خواری کے لکھے ہیں۔ لیکن یہ صدہا سال بعد کی تصنیف ہے اور تاریخ کی نہیں بلکہ لطائف تاریخی کی کتاب ہے ۔ اس لیے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے ، علامہ شبلی نعمانی کا یہ خیال کہ " خواجہ حافظ پر رندی و سرمستی کا جذبہ غالب تھا" مگر یہ صرف ان کا قیاس ہے جو کلام حافظ پر قائم کیا گیا ہے ۔ خواجہ حافظ کا رندی و عاشقی کے مضامین رکھنا کچھ عجیب و جدید نہیں ہے ۔ ان سے پہلے اور بعد کسی نے کیا نہیں لکھا؟ خسرو، سعدی، جامی، وغیرہ بہت سے مسلّم بزرگ و اولیاء اللہ ہیں جو شاعر بھی تھے ۔ اپنے زمانے کی رفتار شاعری کے ساتھ سب چلے ہیں۔ لیکن کسی نے خسرو، و جامی کے متعلق یہ بحث نہیں اٹھائی ۔ ہمارے سامنے اردو کے شاعروں کی مثالیں موجود ہیں۔ مرزا مظہر جانجاناں، خواجہ میر درد، امیر مینائی، شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری، وغیرہ مانے ہوئے پاک باطن، متقی پرہیزگار اصحاب طریقت تھے ۔ لیکن ان سب نے کیا کیا ناگفتنی و ناشنیدنی نہیں کہا ہے ؟ داغ و ریاض کی خمریات مشہور ہی ہیں۔ ریاض نے تو کمال کردیا ہے کہ فارسی اور اردو کے تمام شاعروں میں شاید حافظ کے مقابلےمیں ریاض کا دوسرا نمبر ہے ورنہ اور سب سے اول ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ریاض نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ شاعروں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں " یقولون ما لایفعلون" کے مصداق ہیں۔ جہاں اچھی باتیں کہتےہیں اور خود ان پر عمل

نہیں کرتے ، وہاں یوں باتیں بھی ایسی لکھدیتے ہیں جو ان کی معمولات نہیں ہوتیں اور اچھی شاہزادہ فطرت و عادات سے پڑھنے والوں کو عجیب عجیب دھوکے دیتے ہیں ۔ مثلاً ریاض خیر آبادی کہتے ہیں ــــ

گناہ کوئی نہ کرتے ، شراب ہی پیتے
یہ کہا کیا کہ کئے سب کئے شراب نہ پی

اس پر کچھ لوگ تو کہیں گے کہ غلط کہا۔ شراب بھی پی اور گناہ بھی سب کیے۔ اور بعض آدمی کہیں گے کہ جب سارے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں تو بے شک شراب نہ پی ہوگی۔ ورنہ ضرور اس کا بھی اقرار کرتے ۔ لیکن ثقہ گواہوں کی زبانی واقعہ یہ ہے کہ ریاض عشق بازی سے بھی عمر بھر ایسے ہی پاک رہے جیسے شراب خواری سے ۔

یہ یہی کیفیت خواجہ حافظ کی ہے ۔ ان کے زمانے میں شراب و شاہد ایران میں گویا لازمۂ زندگی سہی لیکن یہ نہ تھا کہ سب مبتلا ہوں۔ ہزاروں لاکھوں محفوظ بھی تھے۔ ان میں حافظ بھی ہوسکتےہیں اور بلا شبہ تھے ۔ ان کے کلام میں بعض پوری غزلیں اور صدہا اشعار یقیناً ایسے ہیں جن میں خالص صوفیانہ مضامین ہیں اور صدہا ایسے جن میں شاہد و شراب سے حقیقت و معرفت کی طرف اشارہ ہے یہی ان کے ذاتی واردات ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بڑی کثرت سے ایسے اشعار بھی ہیں جن میں صاف صاف رندی و ہوس ناکی کے جذبات و حالات ہیں۔ یہ سب محض تقلیدی و رواجی ہیں۔ سب کہتے تھے انھوں نے بھی کہدیئے ۔ شوخ مزاج و خوش طبع آدمی تھے اس لیے اوروں سے زیادہ کہے اور زیادہ شوخ کہے ۔ ہمارے ہاں کے پاک باز و پرہیزگار شاعروں نے حافظ سے شوخ تر کہا ہے ۔" (۱)

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد ، " بزم اقبال"، محولہ بالا ، ص۔ ۳۷-۱۳۶

مولانا قادری کے اس قول اور امیر وریاض کی شاعری و باطنی زندگی سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جب امیر و ریاض کی ہستیاں بے لوث تھیں تو حافظ کیوں نہ پاک دامن ہوتے وہ تھے اور ضرور تھے - ان کے رندی و سرمستی کے اشعار صرف شاعرانہ لطافت اور اس دور کی روش کا تقاضا ہیں۔ ~~کہا جاسکتا ہے~~ لہذا ان اشعار کو دیکھنے کے بعد حافظ کو رند و بوالہوس نہیں کہا جاسکتا - بلکہ انہیں ایک زندہ دل اور سچا شاعر کہنا چاہئے - ان کے یہاں خوش فکری و بذلہ سنجی کی جھلکیاں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں - ان کا خود کا قول ہے :

" در حق من بہ دُرد کشی ظنّ بد مبر
کآلودہ گشت خرقہ ولے پاک ~~....~~ دامنم (حافظ)

حافظ کے یہ دعوے حقیقت پر مبنی ہیں اور ان کے یہ استعارے و کنایے معرفت کی طرف ہیں یا پھر شاعرانہ رسم پوشی و تقلید - لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے یہاں بہت سے اشعار ایسے بھی مل جاتے ہیں جو رندی و ہوس ناکی کے مضامین سے پر نظر آتے ہیں۔ لیکن حافظ رندانہ شعر کہنا بھی کوئی عیب نہیں گردانتے -

حافظ و اقبال کے علاوہ مولانا نے متعدد معروف شعرا کے کلام پر بے لاگ و مدلل تنقید کی ہے - ذیل میں اول غالب ، مومن اور ذوق و داغ کے کلام پر ان کی تنقید کے نمونے پیش کیے جارہے ہیں جس سے ان کی تنقید شعری کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

یہ چار شعرا مسلم الثبوت استاد ہیں۔ قادری صاحب نے ہر ایک کے کلام کا بخوبی مطالعہ و مقابلہ کرکے اس کے فن کے حسن و قبح کو بخوبی واضح کیا ہے - مولانا گہرا تنقیدی شعور رکھتے تھے - ان کی نظر زندگی کے ایک ایک پہلو پر تھی اور وہ ہر پہلو کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے - شعر و ادب سے انہیں ایک دلی مناسبت تھی - عربی و فارسی

ادبیات کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا لیکن مغربی ادبیات سے بھی ناواقف نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے مولانا نے تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر توجہ دی اگرچہ وہ ایک مورخ ، نثر نگار اور تاریخ گو کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں مگر ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے - مولانا کی رائے میں سخن گوئی کے لیے صرف شاعرانہ مشّاقی ، پرگوئی یا خوش گوئی ہی کافی نہیں بلکہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

" شاعری ذہن کا کارنامہ زریں ہے وہ تخیل کے پروں سے اڑتی اور فضائے امکانی میں چکر لگاتی ہے شاعری ایک نغمہ ہے کہ ہر شخص اس کو سن سکتا ہے۔ لیکن کم ہیں جو اس سے حقیقی لطف حاصل کرسکتے ہیں اور بہت کم ہیں جو اس کو گا سکتے ہیں۔ نفس شاعری ردیف و قافیہ ، وزن و بحر کی قیود سے بھی آزاد ہے - ہر اچھوتا خیال ایک شعر ہے اور ہر خوب صورت اظہار جذبات ایک غزل ، لیکن شاعری کو بحر و وزن اور قافیہ و ردیف کا محتاج کردیا گیا ہے اور بے شبہ یہ چیزیں اس کے لیے زینت و آرائش ہیں - شاعری اصل میں جذبات کو نغمہ کی شکل دے دینے کا نام ہے یا دل کو الفاظ کی صورت میں منتقل کردینے کا اس کے لیے پیرایہ جو مناسب ہو اور الفاظ جو موزوں ہوں لیکن شاعری عموماً اسی طرح کی جاتی ہے کہ ایک قافیہ کو ذہن میں رکھ کر اس کے متعلق مضمون تلاش اور نظم کیا جاتا ہے - یہ صورت بھی شاعر کے مخصوص اسلوب بیان اور پایۂ تخیل کے اظہار میں مانع نہیں ہوتی - شاعر ہر حالت میں شاعر ہے اور اس کی خصوصیات ہر جگہ نمایاں "- (۱)

غالب کا تو قول تھا :

" من نہ بودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما"

یوں سمجھئے کہ غالب تو پیدا ہی شاعری کے لیے ہوئے تھے اور شاعری ان کے لیے۔ غالب کی بلندیٔ فکر، معنی آفرینی اور طرزِ تخیل کا عالم یہ ہے کہ ولی سے لے کر آج تک

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا؛ "تاریخ و تنقید"، محولہ بالا، ص ۱۶۱

ایسی بلندی کوئی کو نہ ملی جو غالب کے نصیب میں آئی ۔ مولانا قادری نے " نقد و نظر" میں ایک جگہ غالب کے سلسلے میں لکھا ہے :

" قدیم اردو شاعری میں میر تقی میر کی فضیلت میں کسی کو کلام نہیں، نواب مرزا داغ کا سا دنیاوی جاہ و جلال کسی کو نصیب نہ ہوا، اور مرزا غالب کے کلام سے زیادہ کسی سے کلام کی قدر نہ ہوئی ، دیوان غالب سے زیادہ کوئی دیوان نہ پڑھا گیا، نہ سمجھا گیا، نہ سمجھایا گیا اور نہ چھاپا گیا اور جو کچھ ہوا بالکل بجا ہوا۔ انیسویں صدی کا کوئی شاعر غالب کے زیادہ اس قدردانی کا حق دار نہ تھا۔" (۱)

غالب کے بعد لطافت تخیل، رفعت فکر اور جدت بیان میں اگر کوئی دوسرا شاعر ہے تو وہ حکیم مومن خاں مومن ہیں۔ مومن کے بعد ذوق کا مرتبہ ہے ۔ ذوق بھی ایک مسلّم الثبوت استاد، ماہرفن اور قادرالکلام شاعر تھے ۔ مگر ان کے یہاں وہ طرفہ تخیل اور بلند پروازی نہیں ہے جو غالب و مومن کے یہاں جا بجا نظر آتی ہے ۔ ماوراء الحساب اور مافوق السماء ان کی رسائی سے بہت بعید اور بلند تر ہیں۔ شعر و سخن پر ان کے بڑے احسانات ہیں مگر حقیقت شعری ان کی ممنون نہیں ۔

قادری صاحب نے ذیل میں تینوں ہم عصر شعرا کے زمین مقابلہ کے اشعار (زبان کے لیے نشان کے لیے) پیش کیے ہیں جن سے ہر ایک کی رفعت فکر اور حسن تخیل کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے ۔

ذوق نے آسمان کے قافیہ کو اسی زمین میں چارجگہ پر نظم کیا ہے :

نہیں ثبات بلندی و عزو شان کے لیے   کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسمان کے لیے

ہزار لطف ہیں جو ہرستم میں جان کے لیے   ستم شریک ہواکیں آسمان کے لیے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا" نقد و نظر"، محولہ بالا، ص ۱۶۱

دم عروج ہے کیا فکر نردباں کے لیے   کمند آہ تو ہے بام آسماں کے لیے

بلند ہو وے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ   تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لیے

ذوق کے ان اشعار میں سے " ہزار لطف" والے شعر میں تو البتہ اک لطف ہے ورنہ بقیہ تینوں اشعار میں کوئی نیا و نادر خیال یا اچھوتا مضمون نہیں ہے ۔

اس قسم کے مضمون کو غالب کے حسن تخیل اور رفعت فکر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ۔ کہتے ہیں :

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے   رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

ذوق کے " ہزار لطف " والے شعر اور غالب کے اس شعر کے موازنے سے اہل سخن خود ہی خوب لطف اندوز ہوسکتے ہیں ۔

اسی طرح مومن نے بھی اپنی جدت طبع کے جوہر آسماں ہی کا قافیہ باندھتے ہوئے بھی دکھائے ہیں :

وہ پائے یار کے بوسے وہ آستاں کے لیے   جبیں میں خاک ہوا میل آسماں کے لیے

اس میں بھی شعریت و معنویت کے ساتھ ساتھ مومن نے اپنے منجم و اختر شناس ہونے کی طرف بھی بڑی خوش اسلوبی سے اشارہ کیا ہے ۔ جہاں تک زبان و بیان کا معاملہ ہے وہاں بھی تینوں شعرا کی زبان آرائی بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے ۔

ذوق کہتے ہیں :

مرے دل کے لیے تھے وہ تھے زبان کے لیے

سو دل میں ہم نے مری سوزش دہان کے لیے

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو   زبان وہ دل کے لیے ہے وہ دل زبان کے لیے

ذوق کی زبان آرائی اور پرواز فکر دیکھنے کے بعد ، مومن کی لذت کام و دہن بھی ملاحظہ کیجئے اور ان کے اس بلند و بامزہ شعر کے مزے سے لطف اندوز ہوئیے - کہتے ہیں :

مزہ یہ شکوہ میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ   میں تلخ کام رہا لذت زبان کے لیے

مومن کے یہاں نہ صرف مضمون ہی لطافت و شگفتہ ہے بلکہ "مزہ" و " بے مزہ " کا واضح فرق اور " تلخ کامی" و " لذت زبان" بھی اپنی جگہ خوب مزہ دے رہے ہیں۔ غالب نے اگرچہ یہ قافیہ اک مدحیہ قطعہ میں نظم کیا ہے مگر اس میں بھی رنگ تغزّل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اسی لیے ان کے اس شعر کی مقبولیت میں اور بھی چار چاند لگ گئے ہیں اور عموماً لوگوں کے نوک زبان رہتا ہے - کہتے ہیں :

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

" آشیان" کے قافیہ کو بھی تینوں شعرا نے نظم کیا ہے مگر ذوق کے یہاں وہی قافیہ پیمائی کارفرما ہے :

صبا جو لائے خس و خار گلستاں کے لیے   قفس میں کیوں کہ نہ تڑپے دل آشیاں کے لیے

مومن کے یہاں مضمون کوئی نیا نہیں ہے مگر پھر بھی ایک کلیہ و قاعدہ کی بات اور شعر میں اک طرح کا لطف بیان ہے :

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ اس قفس
ہے بہیم تنگ بلا روز آشیاں کے لیے

غالب اور ان کی کوشش کی مثال یہ ہے :

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

" جاوداں " کے قافیے میں ذوق نے واقعی اک بات پیدا کی ہے :

اگر امید نہ ہم سایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لیے

مومن نے بھی اس قافیہ میں اپنی جدت ادا دکھائی ہے اور مضمون کو دل چسپ بنادیا ہے - کہتے ہیں :

خلاف وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں

امید یک شبہ ہے پاس جاوداں کے لیے

غالب نے بھی بڑی بے ساختگی و برجستگی سے اک بات کہی ہے - ان کی شوخی و جدت طرازی نے خضر علیہ السلام کے مشہور اور عام مضمون کو بھی چور بنے والی بات کہہ کر نہایت لطیف اور نرالا بنادیا ہے - زندہ اپنے اور روشناس خلق ہونے والی بات بھی ان کے یہاں خوب ہے - کہتے ہیں :

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

" امتحاں " کا قافیہ ذوق کے یہاں ان کے ذوق کی عکاسی یوں کرتا ہے :

وہ مول لیتے ہیں جس دم کوئی نئی تلوار

لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے

مومن کا طرز و اسلوب یہاں بھی ملاحظہ فرمائیے :

بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے

ہمیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کے لیے

غالب کا طرز بیان بھی ان کے رنگ کا عکاس ہے - کہتے ہیں :

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں

دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کے لیے

" جہاں " کا قافیہ ذوق نے یوں نظم کیا ہے :

بنایا آدمی کو ذوق اک جز و ضعیف

اور اس ضعیف سے کل کام دو جہان کے لیے

اس شعر سے نظیر اکبر آبادی کی نظم " آدمی نامہ " اور بھی واضح ہوجاتی ہے - مومن کہتے ہیں :

جنون عشق ازل کہیں نہ خاک اڑائیں کہ ہم

جہان میں آئے ہیں ویرانی جہان کے لیے

جنون میں خاک اڑانے کے علاوہ اور کیا بھی کیا جاسکتا ہے - مومن نے خوب توجیہیں رکھی ہیں -

غالب کا انداز بیان اور ہے وہ رشک و رقابت کے مضامین کو بھی اس ڈھنگ سے باندھتے ہیں کہ دوسرے شاعر اس انداز میں بات کہنے سے عاجز رہتے ہیں - یہ شعر ملاحظہ کیجئے :

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک

بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہان کے لیے

قادری صاحب نے تینوں شعرا کے دو صرف یہ ہم قافیہ اشعار منتخب کرکے تینوں کی ذھنی کیفیات کا اندازہ کرانے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کے علاوہ ذوق و مومن و اور ذوق و غالب کے دو دو اشعار کا بھی موازنہ پیش کیا ہے - کہیں کہ بعض قوافی مومن و ذوق نے تو لکھے ہیں مگر غالب نے نہیں لکھے اسی طرح بعض قوافی غالب و مومن کے یہاں تو ہیں مگر ذوق کے ہاں نہیں -

اس موازنے سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ غالب کی جودت ہے نرالی ہے - انہوں نے ایسے ایسے عجیب و غریب مضامین پیش کیے ہیں کہ اکثر شاعروں کا خیال و تصور بھی وہاں

نہ پہنچ سکا۔ مومن کے یہاں بھی بلندی فکر اور جدت ادا کارفرما ہے ان دونوں شعرا کے مقابلے میں ذوق کے یہاں سامنے کی اور عام باتیں نظر آتی ہیں اور نتیجہ کوہ کندن و کاہ برآوردن رہتا ہے ، ان کے یہاں موجیں تو اٹھتی ہیں مگر وہ سطح آب سے بلند نہیں ہونے پاتیں - اسی لیے تو غالب کو بھی تعلی سے کام لیتے ہوئے کہنا پڑا :-

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

لوگوں کو غالب کے یہاں بہت کچھ مل بھی جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تقلید کی جاتی رہی - اس کے کلام کے محاسن بیان کئے گئے - تقریروں اور تحریروں میں اس کے اشعار کے حوالے دیئے جانے لگے - اخباروں اور رسالوں میں اس پر تنقید و تبصرے ہوئے کیوں؟ اس لیے کہ غالب کا خود کا قول تھا کہ :

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اور کچھ عرصے کے بعد غالب کی " ولی" ہونے والی پیش گوئی پوری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو مگر اس کی یہ پیش گوئی ضرور پوری ہوگئی :

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

=====xx===

داغ کو اگرچہ ذوق سے فیض تلمذ حاصل تھا مگر ان کا زمانہ دہلی کا وہ زمانہ تھا جو اردو شاعری کے لیے عہد زریں کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے - مومن و غالب جیسے بلند خیال ، ذوق و عیش جیسے باکمال اور صہبائی و آزردہ جیسے عالموں کا مجمع تھا۔ جن مشاعروں میں یہ شعرا شریک ہوتے تھے داغ بھی اپنے استاد ذوق کے ساتھ ان میں شرکت کرتے تھے - جب غدر میں انتشار ہوا تو داغ رامپور کا رخ کیا۔ دہلی میں اگرچہ مہندی و

مو آموز تھے مگر رام پور میں ان کے لیے مقابلہ و مسابقت کا میدان موجود تھا۔ یہاں آکر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو بڑا فروغ ملا۔ ان کی شاعری کے جوہر ایسے کھلے کہ دور دور کلام کی شہرت پہنچنے لگی۔ رام پور میں ان کے لیے شہرت کا ایک ذریعہ " پیام یار" ثابت ہوا جو ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ امیر، داغ ، جلال ، تسلیم ، وغیرہ کی غزلیں اس میں شائع ہوتی تھیں۔ ان تمام باتوں نے داغ کی ہمت افزائی کی اور وہ کمال غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوگئے ۔ داغ کے اس دور کے کلام میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو بجز غالب و مومن کے کسی اور کے حصے میں نہیں آئیں زبان و بیان ، شوخی و شگفتگی ، محاورات و ضرب الامثال توازن ، و ترنم جس نئے انداز سے داغ کے یہاں جلوہ گر ہیں وہ ان کے ہم عصروں کے یہاں نہیں ملتیں ۔

مثلاً یہ اشعار دیکھئے :

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں کہنا نہیں مانتے کسی کا

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

یہیں رہنا ، یہیں سکھنا ، یہیں مرنا ، یہیں بھرنا

یہی در ہے ، یہی سر ہے ، گذاریں گے ، یہیں برسوں

اگر غافل نہ ہوتے ہم تو کب کے مرچکے ہوتے

کسے یہ یاد کل کیا تھا ، کسے معلوم کل کیا ہو

داغ کے سلسلے میں مولانا حامد حسن قادری کی رائے یہ ہے کہ :

" داغ کو اپنے تمام ہم عصروں پر یہ فضیلت ہے کہ وہ لطف زبان ، شوخی

بیان، معاملہ بندی اور بانکپن کے ساتھ جدّتِ ادا ایسی عجیب و دل کش رکھتے ہیں کہ بقول مصنف " گل رعنا" کے " جس کو سن کر عوام سر دھنتے اور خواص مزے لیتے ہیں" یہ وہ خاص رنگ ہے جس میں کوئی ان کا حریف و ہم سر نہیں، شوخ و متین دونوں قسم کے مضامین میں انھوں نے اپنی مخصوص جدت بیان کے ساتھ ایسے اشعار کہے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کہیں نظر نہیں آتے -"(۱)

جس کی چند امثال یہ ہیں :

ہر دل میں ہے درد سے ہے یاد کسی کی

فریاد سے ملتی نہیں فرصت کسی کی

چٹھیوں اس نے لکھا ہے حرفِ تسلی   وہ کم بخت برسوں تڑپتے رہے ہیں

لوگ کہتے تھے چپ لگی ہے تجھے   حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا

اے جنوں خاک بیاباں کو بیاباں سمجھوں

میری آنکھوں میں ابھی پھرتی ہے گھرکی صورت

در و دیوار کا جلوہ نہیں دیکھا جاتا

ان کے آتے ہی بدل جاتی ہے گھر کی صورت

ہم مٹ گئے تو پرسش نام و نشاں ہے اب

اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

غزل کے عناصر اربعہ کے اعتبار سے مولانا حامد حسن قادری ، داغ کا مرتبہ متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" داغ انتخاب الفاظ، حسن بندش ، لطف محاورہ، صفائی و روانی میں کسی اردو شاعر سے کم نہیں اور اپنے زمانے میں بے نظیر ہیں- جدت ادا، رفعت فکر و لطافت تخیل میں مومن و غالب اور امیرمینائی کے بعد داغ کا نمبر ہے-

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا" کمال داغ"، آگرہ :آگرہ اخبار پریس، ۱۹۵۹ئ ، ص ۹۰

کی بلندی و پستی کا انحصار ہے ۔ یہ نعمت اکتساب اور علم و فضل سے حاصل نہیں ہوا کرتی ۔ ناسخ و ذوق حالاں کہ استاد فن تھے مگر ان کے حصے میں یہ نعمت بہت ہی کم آئی ان دونوں کے کلام میں وہ دل کشی نہیں جو ہونی چاہئے تھی ۔ میر انیس کو یہ ملکہ وصت آبا و اجداد سے ورثے میں ملا تھا۔

میر انیس کے سلسلے میں مولانا رقم طراز ہیں :

" انیس آغاز شباب ہی میں فن شعر و سخن اور فنون سپہ گری کی طرف متوجہ ہوئے ، جسمانی ورزش ، آلات حرب کے استعمال اور اسپ رانی میں مہارت بہم پہنچائی ، اپنی شرافت نسبی پر نہایت فخر تھا۔ عزت نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے ۔ وسیع الاخلاق تھے ۔ باوضع تھے ، احباب اور مشتاقان زیارت سے ملاقات کے لیے اصول و اوقات مقرر کرلیے تھے جن میں امراء و حکام تک کے لیے استثنا نہ تھا۔ حتی کہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی مجلس میں بھی مرثیہ پڑھنے کے لیے اس وقت تک نہ جاتے جب تک خاص قاصد شاہی حاضر نہ ہوتا تھا۔ ان میں یہ خاص کمال تھا کہ باوجود نہایت اعلا کہنے کے بہت جلد کہتے تھے ۔ طرز بیان کی خوب صورتی میر انیس سے بہتر کسی اردو شاعر میں نہیں ہے ۔" (۱)

مولانا نے اپنی کتاب " تاریخ مرثیہ گوئی" میں میر انیس کے کلام کی ایک ایک خوبی مثلاً حسن ادا ، روزمرہ و محاورہ ، زبان و بیان ، مناظر قدرت ، جذبات نگاری ، فصاحت و بلاغت ، صنائع و بدائع ہر اک کو تفصیل کے ساتھ مع امثال بیان کیا ہے ۔

مرزا دبیر کے سلسلے میں مولانا رقم طراز ہیں :

" مرزا دبیر کا جو کلام اچھا ہے بعض بعض جگہ میر انیس سے بھی بہتر ہے ۔ اکثر حصہ انیس کے برابر ہے بہت سے ایسے بند ہیں کہ میر انیس کے

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " تاریخ مرثیہ گوئی" ، کراچی : سپر آرٹ پریس ۱۹۶۳ء
صص ۳۲-۳۳

کلام میں شامل کردیئے جائیں تو امتیاز نہ ہوسکے۔ دقت آفرینی و شوکت الفاظ جہاں حد اعتدال سے نہیں بڑھی ہے ، بہت پر زور و شان دار ہے ۔ بلند مضامین ، جدید استعارے ، عجیب تشبیہیں ، جہاں ذوق سلیم کی مدد سے تیار ہوئی ہیں ۔ نادرات ادبی کا درجہ رکھتی ہیں۔ روزمرہ و محاورہ ، سلاست و صفائی ، جہاں عامیانہ و مبتذل انداز سے محفوظ ہے ، سہل ممتنع کی حد تک پہنچ گئی ہے ، یہ خوبیاں کتنی ہی کم سہی ، قابل قدر ہیں۔ مرزا دبیر کا کلام اس قدر کثیر ہے کہ تھوڑی خوبیاں بھی مل کر بہت ہوجاتی ہیں ۔ اس لیے ساتھ برائیوں کے سبب سے چالیس خوبیوں پر بادی پھیردینا انصاف کے خلاف ہے ۔ مختصر میر انیس کو بلا شبہ مرزا دبیر پر ترجیح و فضیلت حاصل ہے ۔" (۱)

مندرجہ بالا تنقیدی اقتباسات سے مولانا کی ژرف نگاہی ، اور بے لاگ تنقید نگاری کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے ۔

مولانا کو تنقید میں ہی کمال حاصل نہ تھا بلکہ علم عروض و بیان میں بھی وہ دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔ عربی علم اللسانیات پر بھی انہوں نے ایک طویل اور مدلل مقالہ تحریر کیا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جس کا حوالہ مولوی عبداللطیف خاں صاحب کشتہ نے مولانا قادری کی ادبی خدمات کے سلسلے میں رقم کردہ مقالے میں یوں دیا ہے :

" ۱۹۲۶ء میں ندوۃ العلماء لکھنو کا ایک جلسہ حلیم مسلم ھائی اسکول کان پور میں حکیم اجمل خاں مسیح الملک مرحوم کی صدارت میں ہوا۔ قادری صاحب نے ایک مقالہ ، عربی کی لسانی خصوصیات سے متعلق پڑھا تو ایسی موشگافیاں کیں کہ بعد ختم جلسہ حکیم صاحب نے انہیں گلے سے لگالیا۔ نواب صدر یار جنگ نے کہا " مولانا ! ہمارا کام آپ نے کیا" اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ نے بھی اس کی بہت داد دی۔" (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " تاریخ مرثیہ گوئی " ، محولہ بالا ، ص ۱۳۵

(۲) کشتہ ، عبداللطیف خاں ، " مولانا حامد حسن قادری" (مضمون) ، " اردونامہ " ، محولہ بالا ، شمارہ ۱۹ ، ص ۲۰-۱۹

اسی طرح ان کی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی لسانیات اور عروض و قواعد

میں مہارت کا اندازہ ، راشد حسن قادری کے ایک مضمون کے اس اقتباس سے ہوسکتا ہے

جو انھوں نے مولانا کی کتاب "Oriental Rhetorics" سے اخذ کیا ہے ، مولانا

کی یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اب نایاب ہے - اس میں انھوں نے چاروں زبانوں کی

مختلف صنائع و بدائع کا موازنہ کیا ہے اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے اردو صنائع بدائع کی

عربی فارسی اور انگریزی کی صنائع بدائع سے مماثلت ہی بیان کی ہے بلکہ ان کا نیا کارنامہ

یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی زبان کی بعض ان صنائع بدائع کی بھی نشان دہی کی ہے

جو اردو میں نہیں ملتیں اور صرف مولانا قادری کی دریافت کردہ ہیں۔

راشد حسن قادری لکھتے ہیں :

There are some beautiful and interesting figures of speech in theEnglish language which are not given in Arabic and Persian books of rhetoric. Maulana Qadiri has introduced them in those languages. Alliteration and Onomatopoeia are among them. He has named the former ______ توزیع ______ and the latter ______ حکایۃ الصوت ______

In some places he has differed from old authors and has, for examples, treated the figure of ______ ایہام ______ and ______ توریہ ______ as two separate figures and given examples of each in all the four languages.

In books on English Rhetoric simile has no kinds, but in the oriental languages there are more than a dozen kinds of it, and Maulana Qadiri has given English examples also for almost all of them. In the same manner he has described fifteen divisions of Metonymy with examples, while in English books there are only eight or nine kinds of it.

Having given special features of the work on Oriental Rhetoric by Maulana Qadiri I now give one or two quotations from the book ______ قلب مستوی ______ Qalbi Mustawi or Palindrome occurs when a line may be equally read forward or backward.

Examples - Arabic (a) ______ ربک فکبر ______ "So magnify God"

(b) ______ کل فی فلک ______ "All in their orbits"

(c) ______ ارانا الالہ ہلالا انارا ______ " God showed us a bright crescent"

Persian (a) امید آزادی ما "Hope of our liberty"

(b) آرام داد مارا "He gave us comfort"

(c) I here quote an excellent example of Palindrome composed extempores by Qazi Abdul Wahab Mashhadi.

Once Syed Imaduddin Musavi came to him and uttered a sentence containing Palindrome مرادی دارم I have a desire. The Qazi retorned off hand بر آید یارب O God! may it be fulfilled

Urdu (a) یارب آرزوی وزرا برآئے O God, may the desire of the ministers be fulfilled.

(b) آج وہ شوخ آیا خوش ہوجا Be glad that the sprighthy fellow is come today.

(c) آرام ہمارا ہے یہ آرام ہمارا This Ar'am of ones is a comfort to us.

English (a) Able was I are I saw Elba - Napolean I.

(b) Lewd did I live; evil I did dwell - Taylor

(c) Egad a base tone denotes a bad age.

حکایة الصوت Hikayat-us-Saut (Producing sound) occurs when the sound of words of a verse echoes the sound of a musical instrument or a bird or something else. It is called Onomatopoeia in English.

This figure is not found in any book on Rhetoric in the oriental languages, but as examples of it are found in Persian and Urdu poetry we propose to give it the name of حکایة الصوت Examples - Arabic example is not found.

- Persian (a) صدا طبل دادہ بر آئین او

کردین دین او دین او دین او Firdousi

the drum proclaimed for the constitution of his law, the religion is his religion and his only.

Urdu - The sound of Jala'jil is produced in the couplet given below. Jala'jil is an instrument comprising two circular pieces of metal, which are taken in both hands and struck against each other giving a sound like "Jhan Jhan". It is similar to cymbal.

a) دیکھو یہ کہہ رہے ہیں جلاجل بہ‌ترِّی

میرزا جہاں قدر لشکر جہنمی ہے یہ لشکر جہنمی

Look here, the Jalajil are saying merrily. "This army is destined to Hell, This army is destined to Hell.

English (a) The sound of drum:-

The double double double beat
of the thundering drum
Cries bark: the foes come!
Charge, Charge, 'ts too late to retreat

__________ Dryden

(b) The sound of bees:-

The moon of doves in immemorial elms,
And murmuring of innumerable bees

__________ Tennyson

"علم بیان" اور "علم بدیع" پر مولانا کی یہ کتاب بڑی معرکۃ الآرا تصنیف ہے - صنائع بدائع میں ہر اک کی مثال عربی، فارسی، اردو اور انگریزی سے دی ہے - اور یہ امثال بھی ہر زبان کی مستند ترین امثال ہیں۔ اس سے مولانا کی قابلیت اور تبحّر علمی کا پتا چلتا ہے -

ڈاکٹر ٹریٹن(Triton) پروفیسر و صدر شعبۂ عربی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے اس کتاب کا نمونہ دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور مولانا کو تحسین وآفرین کا بڑا خط لکھا - ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی، مولوی عبداللطیف خان کشتہ، مظہر جلیل شوق ، اور مولانا شمس الحق نظامی و دیگر اکابر نے بھی اس کی بڑی مدح و ستائش کی ہے -

چوتھا ۔ باب

تاریخ و تحقیق

مولانا قادری بحیثیت محقق و مورخ ادب

چوتھا ۔ باب

تاریخ و تحقیق

مولانا قادری بحیثیت محقق و مورخ ادب

پروفیسر کلیم الدین احمد نے "اردو تنقید پر ایک نظر" میں لکھا ہے :

" دماغ انسانی کی دو تحریکیں ہیں اور ان دونوں کو ہم ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کرسکتے کیوں کہ تنقید ، تحقیق کے بغیر پیدا ہی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی تحقیق تنقید کا سہارا لیے بغیر ایک قدم آگے بڑھاسکتی ہے ۔" (۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ جس طرح تنقیدی شعور کے بغیر تحقیقی کاوش نا ممکن ہے ۔ اسی طرح تحقیق و تفحص کے بغیر تنقید کا بھی حق ادا نہیں ہوسکتا اور یہ ناقص رہ جاتی ہے ۔

تحقیق و تنقید کی ہم آہنگی کے سلسلے میں پروفیسر کلیم الدین احمد مزید رقم طراز ہیں :

" اگر تحقیق کو تنقید سے علاحدہ کردیا جائے تو پھر اس کی حالت اس گم کردہ راہ کی سی ہوگی جو کسی صحرا میں بھٹکتا پھرے اور جسے اس کی خبر نہ ہو کہ وہ بھٹک رہا ہے ۔" (۲)

پروفیسر کلیم الدین احمد کا یہ قول اپنی جگہ بالکل درست ہے کیوں کہ ہر زبان کے شعر و ادب میں تحقیق و تنقید لازم و ملزوم نظر آتی ہیں ۔

اردو زبان و ادب میں بھی اول اول تو اس طرف لوگ بہت کم متوجہ ہوئے

---

(۱) کلیم الدین احمد ، پروفیسر، " اردو تنقید پر ایک نظر"، لاہور : ، ص ۱۲۶

(۲) ایضاً ، ص ۱۲۷

کیوں کہ اس وقت تحقیق و تنقید کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی مگر آج بھی اس دور کے تذکروں اور تبصروں یا تقریظوں کو جمع کردیا جائے تو ان سے اس دور کے تحقیقی و تنقیدی شعور کا سراغ ضرور مل سکے گا۔

دنیا کی ہر قوم کا شعر و ادب اس کی تہذیب و تمدن ، عروج و زوال اور ثقافت و معاشرت کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔

عرب کے مسلمانوں نے ادب اور ادیب اور شعر و شاعر کو زندۂ جاوید بنانے کے لیے تذکرے لکھنے کی بنیاد ڈالی ۔ چناں چہ عربی میں تیسری صدی کے اوائل سے قاسم بن سلام الجمحی اور ابن قتیبہ نے عربی شعرا کے حالات و نمونۂ کلام کو یکجا کرکے کتب ترتیب دیں۔ جن میں الصولی کی " اخبار الشعرا" ثعالبی کی " یتیمۃ الدھر" اور باخرزی کی " دمیۃ القصر" فن تذکرہ نویسی کی مشہور کتابیں تسلیم کی جاتی تھیں اور عربی کے ادب العالیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

عربوں کے اثر سے اہل ایران کی توجہ بھی فن تذکرہ نویسی کی جانب مبذول ہوئی لہذا فارسی میں سب سے پہلا تذکرۂ شعرا محمد عوفی نے ۶۰۰ھ میں " لباب الالباب" کے نام سے لکھا اس کے بعد ۹۰۰ھ میں دولت شاہ نے اپنا تذکرۂ شعراء مرتب کیا۔ اس کے بعد فارسی میں شعرا کے کئی تذکرے لکھے گئے ۔ اہل ایران اور اہل ہندوستان کے میل جول اور ربط و ضبط سے ہندوستان میں بھی فارسی شاعری مقبول ہونے لگی تو یہاں بھی شعرا کے تذکرے مرتب ہونے لگے ۔ ہندوستان میں فارسی شعرا کے تذکرے دسویں صدی سے پہلے نہیں پائے جاتے۔ مغلیہ دور حکومت میں بعض مورخین نے اپنی تاریخوں میں شعرا کے مختصر تذکرے مع نمونۂ کلام تحریر کرنا شروع کیے ۔ چناں چہ ملا عبدالقادر بدایونی اور ابوالفضل نے اپنی تاریخوں میں اکبری دور کے فارسی شعرا کا مختصر تذکرہ لکھا ہے ۔ ان ابتدائی

تذکروں میں میر تقی میر کے تذکرہ "نکات الشعرا" کا ذکر خصوصیت سے قابل ذکر ہے - جس میں تحقیقی و تنقیدی اشارے جا بجا نظر آتے ہیں- یہ ضرور ہے کہ قدیم تذکروں میں تحقیق کا معیار نہایت پست ہے اور ہر ایک میں تذکرہ نگار نے اپنی جولانیٔ طبع اور عبارت آرائی کے جوہر دکھائے ہیں- میر تقی میر بھی جو خود صفائی اور سادگی کے دل دادہ تھے اپنے تذکرہ میں سادگی سے کام نہ لے سکے تو پھر میر حسن ، گردیزی ، قائم، مصحفی اور شیفتہ کا تو ذکر ہی کیا ہے - یہ سب لفاظی و عبارت آرائی سے بھرے ہوئے ہیں- ان کے بعد غالب کے خطوط سے بھی ایک تحقیقی و تنقیدی جھلک نمایاں ہوتی ہے - ان باتوں کے مدنظر یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو میں تحقیق و تنقید پہلے سے چلی آرہی ہے مگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو سرسید کے زمانے سے قومی و ملی شعور کی بیداری کے سبب لوگ اپنی زبان و ادب کی طرف خصوصیت سے راغب ہوئے - سرسید کا مقصد حیات ہی یہ تھا کہ وہ قومی و ملی شعور کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کو فروغ دیں- سرسید نے اپنے رفقائے کار کی مدد سے جو آج اردو ادب کے عناصر خمسہ کہلاتے ہیں ، زبان و ادب کے گم شدہ خزانوں کو تلاش کیا- انھوں نے خود بھی کتابیں لکھیں اور دوسرے لوگوں سے بھی لکھوائیں - ان میں حالی، شبلی، نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں- سرسید کے یہاں بھی تحقیقی شعور کارفرما نظر آتا ہے جس کی زندہ مثال ان کی کتاب " آثارالصنادید" ہے - یہ کتاب ان کے تحقیقی کارناموں میں سر فہرست رکھی جاسکتی ہے - لیکن سرسید کا دور وہ دور تھا جب ایک نظام دم توڑ رہا تھا تو دوسرا نظام انگڑائیاں لیتا ہوا ابھر رہا تھا اس افراتفری اور بے اطمینانی کے دور میں تحقیقی کاموں کی طرف توجہ دینا کوئی آسان بات نہ تھی- یہی سبب ہے کہ اس دور کے ہر محقق کے یہاں ایک انتشاری کیفیت جھلکتی ہے -

ادبی اور لسانی تحقیق کے میدان میں اگر کوئی باین ہمہ وجوہ بھی سرگرم و مستعد رہا تو وہ صرف مولانا محمد حسین آزاد کی ذات ہے ۔ ان کو ادبی اور لسانی تحقیق کی صف میں اولیت و اولیت حاصل ہے ۔ سرسید ، حالی، شبلی اور نذیر احمد نے تو ہر صنف ادب کی طرف توجہ دی مگر آزاد نے خصوصیت سے ادب ہی کو اپنی جولان گاہ ٹھہرایا اس لیے ان کے یہاں تحقیقی اور تنقیدی پہلو اوروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ نظر آتا ہے ۔ ان کی کئی علم شعر دوس " آب حیات" ہے ۔ ان کی اس مشہور زمانہ تصنیف کے لیے اگرچہ محققین ادب نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ بہت سی تحقیقی اغلاط پر مشتمل ہے مگر پھر بھی آزاد کی یہ تصنیف ادبی تحقیق کا نقطۂ آغاز ہے ۔ اس میں آزاد نے ادوار بھی قائم کئے ہیں اور ان کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔

آزاد کے بعد تاریخ کے میدان میں علامہ شبلی نعمانی نے مستشرقین مغرب کے علمی و ادبی کارناموں کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیق و تدقیق کی طرف خصوصیت سے توجہ دی ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں حالات کا رخ بدلا تو مصنفین و محققین پھر تحقیق و تدقیق کی طرف مائل ہوئے ۔ نئے نئے افکار و خیالات اور نئی و نادر کتب منظر عام پر آئیں اس زمانے کے سب سے بڑے محقق و مصنف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہیں جنھوں نے ادبی تحقیق کی مہم نہایت باقاعدگی کے ساتھ شروع کی اور اپنی تمام عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزار دی ۔ اردو ادب میں تحقیق و تنقید کا باقاعدہ رجحان و میلان انھی کے ذوق و شوق اور سرگرمی و مستعدی کے سبب پیدا ہوا اور پھر " راہ رو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا" ۔ اس دور کے محققین میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، نواب صدر یارجنگ ، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، رام بابو سکسینہ ، پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر سید عبداللہ ،

سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا حامد حسن قادری خاص طور پر مشہور و معروف ہیں۔

مولانا حامد حسن قادری کا شمار بھی گزشتہ نصف صدی کے نامور محققین و مورخین ادب کے زمرے میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے مولویوں اور صوفیوں کے گھر میں آنکھ کھولی اور رام پور کی علمی و ادبی فضا میں تعلیم و تربیت پائی جس کی حیثیت اس وقت مصر کے جامعہ الازہر کی سی تھی یہاں دھلی و اکبر آباد اور لکھنو و مرادآباد کے علماء و فضلا ، اور شعراء و ادبا کا اجتماع تھا۔ دن رات علمی و ادبی تذکرے رہتے اور شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتیں۔ شعرائے دھلی و لکھنو کی معاصرانہ چشمکوں کے متعلق علمی و ادبی مجادلے ہوتے ، مباحثے چھڑتے اور موازنے کئے جاتے تھے۔ اس ماحول سے مولانا حامد حسن قادری میں بھی تحقیق و تنقید کا ذوق/ور تجسس و تفحص کا شوق پیدا ہوا اور وہ موقع پاکر ابھرا۔ انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں تحقیقی و تنقیدی اور علمی و ادبی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کردیا اور جب یہ مضامین ملک کے مختلف مقتدر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے تو ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی ۔ تحقیق و تنقید کا شعور تو پہلے ہی فطری و اکتسابی تھا تاریخ ادب کے وسیع مطالعہ سے اس کو اور بھی جلا ملی اور اب انھوں نے ادبی تاریخ کے ان گم شدہ گوشوں کی سراغ رسانی شروع کی جن پر پہلے کسی کی نظر نہ پڑی تھی اپنے تحقیقی کاموں میں سے جس کارنامہ کی بدولت انھوں نے شہرت و مقبولیت حاصل کی وہ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف " داستان تاریخ اردو" ہے ۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ دسمبر، ۱۹۴۱ع کو اکبر آباد(آگرہ) میں شائع ہوئی اور چند مہینوں میں ہی کتاب کو اتنی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی جس کا مولانا کو تصور بھی نہ تھا۔

اس کتاب کی مقبولیت کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ مولانا قادری سے پہلے کسی مورخ

نے اردو زبان و ادب کی تاریخ ایسے بسط و کشاد اور تفصیل و تحقیق سے نہ لکھی تھی -

مولوی محمد یحییٰ تنہا غازی آبادی نے ۱۹۱۴ع میں " سیرالمصنفین" کی پہلی جلد اور ۱۹۲۴ع میں دوسری جلد شائع کی - اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں مصنفین نثر اردو کے حالات اور طرز تحریر کے ساتھ تصانیف کے نمونے بھی درج کئے گئے تھے- لیکن تنہا نے پہلی جلد میں اردو کے قدیم کو روا روی و عجلت میں لکھا اور تشنہ چھوڑ دیا- اور دوسری میں یہ کیا کہ صرف سات آٹھ مشہور و معروف مصنفین کو منتخب کرکے سرشار و شرر پر کتاب ختم کردی- مولوی محمد یحییٰ تنہا سے پہلے کسی نے نثر اردو کا تذکرہ نہیں لکھا تھا ان کے بعد کے آنے والوں نے اس طرف توجہ کی - ان کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو نظم و نثر کی کئی یکجا تاریخیں لکھی گئیں جن میں رام بابو سکسینہ کی " تاریخ ادب اردو" ، ڈاکٹر گراہم بیلی پروفیسر لندن یونی ورسٹی کی " Urdu Literature " اور پروفیسر اعجاز حسین کی "مختصر تاریخ ادب اردو" قابل ذکر ہیں-

ان کتابوں میں ایک نقص یہ تھا کہ یہ سب صرف زبان و ادب کی تاریخیں اور مصنفین کے حالات پر مبنی تھیں اور تصانیف و تحریرات کے نمونے کسی ایک میں بھی نہیں دیے گئے تھے- اس کمی کو مولانا احسن مارہروی نے اپنی کتاب " نمونۂ منثورات " لکھ کر پورا کردیا- انھوں نے اپنی کتاب میں صنف وار نمونے دئے ہیں مثلاً تصنیف و تالیف ، تقریظ ، عدالتی تحریر، اشتہار اور خطوط وغیرہ کے نمونے صدی وار مرتب کئے ہیں اس طرح یہ ایک طرح کی تاریخ نثر اردو بھی ہے اور اپنی قسم کی ایک منفرد تالیف بھی -

کسی مصنف کے طرز تحریر اور اس کے تجزیے و خصوصیات کا بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی تحریر کی مثالیں سامنے نہ ہوں اور ساتھ ہی ان پر تنقید و تبصرہ بھی نہ کیا گیا ہو - تبصرہ و انتقاد مطالعہ کی رہنمائی اور مضمون کو ذہن نشین کرانے کے لیے نہایت ضروری ہے -

مولانا قادری نے " داستان تاریخ اردو" مرتب کرتے وقت ان تمام خامیوں کو مد نظر رکھا اور تاریخ وار ارتقائے اردو، ہر دور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفین کے حالات اور ان کی تحریرات کے نمونے بھی درج کئے اور ان پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا۔ تبصرے کے وقت ان کے پیش نظر جو اصول تھا اس کے سلسلے میں دیباچہ میں یوں رقم طراز ہیں :

" بے لاگ اور بے باک تنقید کرنا نہ صرف تصنیف پر بلکہ ذات مصنف پر بھی (مصنف کی حیثیت سے) اب تک " پل صراط " پر گذرنے سے کم نہیں ہے - لیکن میں نے اس کی " جسارت " کی ہے - میں نے تصنیفوں اور مصنفوں پر اعتراضات کیے ہیں ، دوسروں کے اعتراضات نقل کرکے حسب موقع ان کی تائید یا تردید کی ہے - میری تنقیدیں شاید تلخ و بے باک نظر آئیں لیکن بے لاگ و بے لوث بھی ثابت ہوں گی - میں نے صحیح تعریف اور جائز حمایت بھی ایسی کی ہے کہ کسی دوسرے مورخ و تذکرہ نویس نے نہیں کی - میرے نزدیک یہ سب ایک تاریخ و تذکرے کے لیے ضروری اجزاء تھے ، بغیر اس روشنی کے کسی تصنیف و مصنف کے مطالعہ کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا -" (۱)

بے لاگ تنقید و تبصرہ کی یہ روح ان کی تصانیف میں ہر جگہ جاری و ساری نظر آتی ہے - بہرکیف اب ہم ان کی کاوشوں کے ثمر نویس " داستان تاریخ اردو" کو پیش نظر رکھ کر قادری صاحب کی محققانہ کوششوں پر روشنی ڈالیں گے -

" داستان تاریخ اردو" مولانا حامد حسن قادری کا سب سے بڑا ادبی شاہ کار ہے اردو ادب میں شعرائے اردو کے تذکروں کی تعداد تو اچھی خاصی ہے مولانا محمد حسین آزاد کے شعرائے اردو کے تذکرے سے قبل میر تقی میر کی تصنیف " نکات الشعرا" ، فتح علی گردیزی کا تذکرہ " تذکرۂ ریختہ گویاں"، اور خواجہ خان حمید کا " گلشن گفتار" وغیرہ تھے۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، کراچی : ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۶ء ، (تیسرا ایڈیشن) ، (دیباچہ) ، ص

اور ان کے بعد ۱۱۶۸ھ میں قاسم چاند پوری کا " مخزن نکات"، ۱۱۷۵ھ میں لچھمی نرائن شفیق کا " چمنستان شعرا" اور ۱۱۹۸ھ میں نواب علی ابراھیم خان خلیل کا " گلزار ابراھیم" جیسے تذکرے منظر عام پر آئے - اسی طرح دھلی و دکن میں بھی تذکرے لکھے گئے مگر وہ بھی شاعروں کے متعلق تھے لہذا ہم دیکھتے ھیں کہ تذکرہ نگاروں نے نثر نگاروں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی -

۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں بھی ایک عظیم انقلاب برپا ھوا- اس انقلاب کے سبب اردو کو بھی عروج و ارتقا نصیب ھوا اور لکھنے والوں نے ادھر توجہ کی - ان اصحاب میں مولوی محمد یحیی تنھا کا نام سر فہرست ھے، جنھوں نے ۱۹۱۳ء میں " سیرالمصنفین" شائع کی لیکن یہ نقش اول ھونے کے سبب سرسری طور پر لکھی گئی - ۱۹۲۳ء میں جب انھوں نے اس کی دوسری جلد شائع کی تو اس میں بھی عجلت یا سہل انگاری کے سبب کئی مشہور نثر نگاروں کا تذکرہ نہ کیا جاسکا- پھر بھی وہ اردو نثر کی تذکرہ نگاری میں اولیت کا سہرا ان کے سر ھے -

مولوی محمد یحیی تنھا کے بعد ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ۱۹۲۷ء میں " History of Urdu Literature" (تاریخ ادب اردو) انگریزی میں شائع کی اس میں اردو نظم و نثر کی تاریخ کو انگریزی ادب کی تاریخوں کے مطابق جائزہ لیا گیا تھا ، اور تنقید کا طرز بھی تاثراتی سا تھا- اس میں بھی اگرچہ بہت سی اغلاط ھیں پھر بھی ادب میں ایک اھم مقام رکھتی ھے -

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے بعد ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر گراھم بیلی پروفیسر اردو ، لندن یونی ورسٹی نے بھی اردو ادب پر انگریزی میں ایک کتاب "History of Urdu Literature" مرتب کی - اس کے بعد ڈاکٹر سید اعجاز حسین پروفیسر

اردو الہ آباد یونی ورسٹی نے ۱۹۳۲ع میں " مختصر تاریخ ادب اردو" لکھی - مگر یہ سب کتابیں ، تذکروں ، تاریخوں اور حالات پر منحصر ہیں ان میں نثر نگاری کی نثر کے نمونے نظر نہیں آتے اس کمی کو مولانا احسن مارہروی نے اپنی مشہور تالیف " نمونۂ منثورات" سے کسی حد تک دور کردیا۔ انھوں نے اس کتاب میں تصنیف و تالیف ، تقریظ و عدالتی تحریر اور خطوط وغیرہ کے صدی وار نمونے دیئے ہیں اس اعتبار سے یہ اپنی قسم کی منفرد کتاب ہے - مولوی سید محمد صاحب نے بھی " ارباب نثر اردو" لکھ کر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے حالات اور نمونہ ہائے منثورات سے روشناس کرایا - مرزا محمد عسکری بھی ۱۹۲۹ع میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی کتاب "History of Urdu Literature" کا بہت عمدہ ترجمہ کرچکے تھے اس میں بھی شعرا و ادبا کے حالات تو ہیں مگر نمونہ نثر و نظم مفقود ہے۔

مولانا حامد حسن قادری کی " داستان تاریخ اردو" نے اس کمی کو بڑی حد تک دور کردیا۔ انھوں نے مصنفین کے حالات بھی لکھے، تحریروں کے نمونے بھی دیے اور ان پر ریمارک تبصرے بھی کئے جو در حقیقت بڑی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کا کام ہے -

" داستان تاریخ اردو" کے دیباچوں سے پتا چلتا ہے کہ مولانا قادری کے ذہن میں اس کو مرتب کرنے کا خیال مدت سے تھا اول تو فطرت ہی کی طرف سے تفحص و تجسس کا مادہ ودیعت کیا گیا تھا مزید برآں یہ کہ ان کے علمی و ادبی ذوق و شوق نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر واقعی ایک گران قدر ادبی خدمت انجام دی ہے کیوں کہ اردو زبان کی تاریخ جیسے خشک وغیر دل چسپ موضوع پر اور پھر حوالوں کی کتاب کی کم یابی و نایابی کے باوجود ایک ایسی مبسوط اور ضخیم کتاب ترتیب دینا ان کی دیدہ ریزی اور علمی لگن کا بین ثبوت ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں کس قدر محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے - ان کی محنت و جاں کاہی

کی تصدیق ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی کے اس قول سے بھی ہوسکتی ہے ۔ موصوف فرماتے ہیں :

" داستان تاریخ اردو کی ترتیب کے لیے قادری صاحب نے بیشتر تذکروں اور تبصروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور وقتاً فوقتاً جو جو مناسب مواد انھیں ملتا رہتا تھا وہ اسے بحفاظت جمع کرتے جاتے تھے۔" (۱)

یہی سبب ہے کہ مولانا کی کتاب میں بہت سے مصنفین کے حالات اور نمونۂ ہائے نثر انھوں نے تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔

داستان تاریخ اردو کا پہلا ایڈیشن علاوہ دیباچہ کے آٹھ سو باون (۸۵۲) صفحات پر مشتمل تھا اور ہر صفحے پر تقریباً بیس اکیس سطریں اور ہر سطر میں تقریباً پندرہ الفاظ تھے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں انھیں خیال خاطر احباب کے سبب حک و اصلاح اورحذف و اضافے سے کام لینا پڑا ۔

مقابلے کے لیے یہاں پہلے ایڈیشن کی فہرست مضامین درج کی جاتی ہے اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے :

تاریخ آغاز تالیف

داستان تاریخ اردو

۱۹۳۸ء

نثر کے متعلق ابتدا سے بیسویں صدی کے شروع تک اردو زبان و ادب کے نشو و نما کی تاریخ ، مصنفین نثر اردو کے حالات اور تصنیفات کے نمونے ۔

تاریخ اختتام تالیف

بوستان تاریخ اردو

۱۹۴۱ء

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد (سابق صدر شعبۂ اردو ، پشاور یونی ورسٹی) ،

مؤلفہ

حامد حسن قادری ، پروفیسر، سینٹ جانس کالج ، آگرہ

ناشر

لکشمی نرائن اگروال ، تاجر کتب آگرہ

===xxx====

فہرست مضامین داستان تاریخ اردو

===

حضرت بابا فرید شکر گنج ،

حضرت شاہ بو علی قلندر پانی پتی،

حضرت نظام الدین اولیا،

حضرت امیر خسرو،

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری،

حضرت شیخ سراج الدین عثمانی اخی سراج ،

حضرت شیخ شرف الدین یحیی منیری ،

اردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر :

(خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی)

دکن میں اردو کا آغاز :

گجرات میں اردو کا آغاز :

حضرت قطب عالم ،

حضرت شاہ عالم،

شیخ وجیہہ الدین گجراتی،

اردو کی اہمیت و مقبولیت :

ابن بطوطہ کا سفر نامہ ،

لغت اداۃ الفضلاء ،

لغت شرف نامہ ،

لغت مؤید الفضلاء ،

کبیر داس ،

گرو نانک ،

تاریخ داؤدی ،

تزک بابری،

بہادر شاہ گجرات کا خطبہ،

تلسی داس ،

اکبر بادشاہ ،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی،

<u>شمالی ہند میں اردو شاعری کا دور قدیم :</u>

دوری اعظم بخری،

کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کاکوری،

محمد افضل جھنجھانوی،

ناصر افضلی الہ آبادی،

پنڈت چندر بھان برہمن اکبر آبادی،

معز الدین خان فطرت ،

مرزا عبدالقادر ، بیدل ،

جعفر زٹلی،

میر عبدالجلیل بلگرامی،

میرزا عبدالغنی قبول کشمیری،

میرزا محمد رضا خان ہمدانی ، امید ،

<u>دکنی اردو کا پہلا دور :</u>

<u>سلطنت بہمنی ،</u>

دکن کا سب سے پہلا اردو مصنف شیخ گنج العلم ،

اردو کی سب سے قدیم کتاب جو شائع ہوئی ، معراج العاشقین،

<u>سلطنت عادل شاہ :</u>

شمس العشاق شاہ میراجی،

شاہ برہان الدین، جانم ،

شاہ امین الدین اعلا ،

<u>سلطنت قطب شاہی :</u>

شاہ میران جی خدا نما ،

مولانا عبداللہ ،

ملا وجہی مصنف " سب رس "،

میران یعقوب مترجم شمائل الاتقیا ،

<u>دکن بعہد مغلیہ :</u>

سید شاہ محمد قادری،

شاہ ولی اللہ قادری،
سید شاہ میر،
مترجم طوطی نامۂ قادری،
مترجم طوطی نامۂ "ابوالفضل"،

دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کا دور :

محمد باقر آگاہ ،
شرف الملک ،
قاضی بدرالدولہ ،

نثر کا دوسرا دور

شمالی ہند میں :

فضل علی مصنف دہ مجلس یا کربل کتھا ،
میرزا رفیع سودا دھلوی،
شاہ رفیع الدین دھلوی مترجم قرآن مجید ،
میر عطا حسین تحسین مصنف " نوطرز مرصع "،

یورپین مصنفین اردو :

قدیم اھل یورپ اور ھندوستان،
اھل یورپ کی آمد(تاریخ اھل یورپ و انگلستان ھندوستان میں)
گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے اشاعت تعلیم ،
اھل یورپ اور اردو ،

پہلا یورپین مصنف اردو :

جان جوشوا کٹلر (ڈچ) ،
پادری بنجمن شلز کی قواعد اردو،
پادری بنجمن شلز کا ترجمہ بائبل،
مل کی ھندوستانی حروف تہجی،
جی لے فرگثر کی تصنیف ،
پادری کیسیا نو بیلی گاتی کا رسالہ الفائیم برھمانکم ،
ھیڈلے کی اردو گرامی،

پرتگالی زبان میں قواعد اردو،

ڈن کی ہندوستانی گرامر،

<u>ڈاکٹر گلکرائسٹ</u> :

حالات و ذکر تصانیف ،

کپتان جوزف ٹیلر مصنف اردو انگریزی لغت ،

گلیڈون مصنف فارسی ہندوستانی ڈکشنری،

کپتان ٹامس روبک مصنف ترجمان ہندوستانی،

جان شیکسپیئر، مصنف اردو لغت ،

ولیم ئیسٹ مصنف مقدمہ زبان ہندوستانی،

ایس ڈبلیو برٹین مصنف قواعد زبان ہندوستانی،

اسٹیم فورڈ آرنات مصنف جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی،

اسٹیم فورڈ آرنات مصنف قواعد اردو ،

جیمس آر بالن ٹائن مصنف ہندوستانی گرامر،

ڈنکن فوربس مصنف ہندوستانی لغت ،

ایف فیلن و مولوی کریم الدین دہلوی، مصنفان تذکرۂ شعرائے ہند،

برٹریفڈ مصنف اردو لغت ،

ریورنڈ جی اسمال مصنف ہندوستانی گرامر،

جی دت لو پراخترز جرمن) مصنف ہندوستانی گرامر،

ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن مصنف منتخب لغات ہندوستانی،

پروفیسر <u>گارسین دتاسی</u> (فرانسیسی) مصنف کتب کثیرہ

<u>ایف فیلن کا تذکرہ طبقات</u> شعرائے ہند،

<u>ولیم میکفرسن کا دستورالعمل عدالت</u>

<u>جان ولیم ییل کا رسالہ آلات طبعی</u>

جان پارکس لیڈلی مصنف علم المعیشت

<u>عیسائی مشنری</u> :

نمونہ ترجمۂ انجیل ،

<u>گراہم بیلی مصنف ہسٹری آف اردو لٹریچر</u> :

نثر کا تیسرا دور

مصنفین فورٹ ولیم کالج :

چھاپے خانے کی مختصر تاریخ

میر امن دہلوی :

سید حیدر بخش حیدری ،

میر شیر علی افسوس ،

میرزا علی لطف ،

میر بہادر علی حسینی ،

مظہر علی خاں ولا ،

مرزا[1] کاظم علی جوان ،

مولوی امانت اللہ شیدا ،

شیخ حفیظ الدین ،

خلیل علی خاں اشک ،

اکرام علی ،

نہال چند لاہوری ،

بینی نرائن جہاں ،

للو لال جی ،

مرزا جان طپش ،

فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر مختصر تبصرہ :

مصنفین بیرون کالج فہرست مصنفین

---

(۱) اس جگہ مرزا کا املا اسی طرح ہے جب کہ دوسری جگہ میرزا لکھا جاتا رہا ہے۔

(اس فہرست میں سولہ (۱۶) نام ہیں ان کے علاوہ مشہور مصنفین کے نام حسب ذیل ہیں[1]) :

محمد حسین کلیم دہلوی، حکیم شریف خاں دہلوی، سید انشاء اللہ خاں دہلوی، مرزا قتیل ، مولوی اسمعیل دہلوی، سید اعظم علی اکبر آبادی، مرزا رجب علی بیگ سرور، محمد بخش مہجور۔

نثر کا چوتھا دور

سدا سکھ لال، فقیر محمد خاں گویا، نیم چند کھتری، مولوی قطب الدین دہلوی، مفتی صدرالدین آزردہ، مفتی سعد اللہ رام پوری، عباس بن ناصر علی المورخ، امام بخش صہبائی ، مولوی صبح الزمان (۲) ، منشی عبد الکریم ، ماسٹر رام چندر، آغا امانت لکھنوی، منشی چرنجی لال، مولوی شہاب الدین، مرزا غالب دہلوی، خواجہ امان دہلوی، مولوی غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث بیخبر ۔

مصنفین دکن :

محمد ابراہیم بیجا پوری، شمس الامراء امیر کبیر ثانی، محمد عثمان میمن ، غلام امام خاں ترین حیدرآبادی، شاہ علی ۔

دور چہارم کی نثر پر تبصرہ :

نثر کا پانچواں دور

سرسید احمد خاں (تصانیف سرسید پر تبصرہ (۳))

اس دور کے غیر مشہور مصنفین (فہرست مصنفین)

---

(۱) میں نے طوالت کی وجہ سے غیر معروف مصنفین کے نام درج نہیں کئے البتہ کتاب میں موجود ہیں۔
(۲) ان کا ذکر دوسرے و تیسرے ایڈیشن میں حذف کردیا گیا ہے۔
(۳) اختصار کے سبب میں نے فہرست تصانیف تحریر نہیں کی ہیں البتہ کتاب میں موجود ہیں ۔

(اس فہرست میں سولہ ۱۶ مصنفین اور ان کی تصانیف کے نام درج ہیں)

سید محمد میر لکھنوی (۱) یوسف خان کمبل پوش، شاہ محمد قاسم دانا پوری، مفتی اکرام اللہ صدیقی، حکیم قطب عالم باطن اکبرآبادی، نیاز علی پریشان اکبر آبادی، مولانا عبدالحق خیرآبادی، منشی دیبی پرشاد بدایونی، مولوی محمد رضا لکھنوی، مولوی محمد علی تحصیل دار، مفتی امیر احمد مینائی، پنڈت گرواج کشور دت ۔

اس دور کے مشاہیر ادب :

نواب محسن الملک ، نواب وقارالملک ، مولوی چراغ علی ۔

پانچویں دور کی نثر پر تبصرہ ۔

نثر کا چھٹا دور (غدر کے بعد)

مولوی محمد حسین آزاد ، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، مولوی نذیر احمد دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی، علامہ شبلی نعمانی ، مولوی سید احمد دہلوی، میر ناصر علی خان دہلوی، خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی۔

اس دور کی نثر پر تبصرہ ۔

فہرست مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت انہوں نے ایکغیر معروف مصنف ناصر افضل الہ آبادی کاذکر حذف کردیا اور آخر میں ایک یہ اضافہ کیا کہ کتاب میں مستعمل تمام انگریزی اسماء و الفاظ انگریزی میں اور ان کا تلفظ ان کے مقابلے میں اردو زبان میں لکھا گیا ۔ لیکن اس کے باوجود بھی بہت سے الفاظ

---

(۱) ان کا ذکر بھی دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں حذف کردیا گیا ہے ۔

آسان اور عام فہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کردیے گئے ۔

ان کی اس مشہور و معروف کتاب " داستان تاریخ اردو" کا پہلا ایڈیشن دسمبر، ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ جس کے شائع ہوتے ہی بہت سے ادیبوں اور نقادوں کے تعریفی و تنقیضی اور تنقیدی خطوط انھیں ملے جن کا تذکرہ انھوں نے اپنی اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں خود یوں کیا ہے :

" سب سے پہلے ۳۱ دسمبر، ۱۹۳۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی ریڈیو پر اس کے متعلق تقریر نشر کی پھر دہلی ، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن سے دوسرے نقادوں نے بھی ریڈیو پر تبصرہ کیا۔" (۱)

اس کتاب کے سلسلے میں مولانا کو تعریفی و ستائشی خطوط ملنا تو یوں بھی قرین قیاس تھا کہ اس کتاب سے پہلے جتنے بھی تذکرے و تبصرے شائع ہوئے تھے ان میں سے کسی ایک میں بھی ایسی تفصیل و وضاحت کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ ان کے مرتبین نے وہ ایسے تجزیے ، موازنے اور اخاکے سے کام لیا اور وہ ایسی تحقیقی و تدقیقی راہ اختیار کی ۔ رہا نقائص کا معاملہ تو اس کوآپ مولانا قادری کی کسر نفسی کہیں یا ادبی دیانت و حقیقت پسندی کہ انھوں نے اس کے معائب و محاسن کے سلسلے میں بھی دوسرے ایڈیشن کے دوسرے ہی صفحہ پر واضح الفاظ میں لکھا ہے :

" مجھے بڑا اطمینان اس بات سے ہوا کہ تبصرہ نگاروں نے میری رعایت و مروت سے کام نہیں لیا اور میں ان ہی حضرات کا زیادہ شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے " ہنر" کے ساتھ میرے " عیب " بھی گنائے ۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الہ آباد یونی ورسٹی) نے میرے لیے زحمت گوارا فرمائی اور تبصرے میں کتاب کی کتاب لکھ کر روانہ فرمائی جس میں

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو"، آگرہ : عزیزی پریس ، ۱۹۵۷ء، ص ۲

اغلاط کتابت سے لے کر زبان و محاورہ ، موضوع و مضمون ، بحث و تنقید اور مواد و معلومات سب ہی پر نظر ڈالی، مشورے دیے ، تلافی مافات کی راہ بتائی اور معلومات فراہم کیں۔" (١)

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے تحریر فرمایا کہ :

" آپ نے بڑی محنت سے مواد جمع کیا ہے ، اور جو اور جگہ نہیں وہ آپ کی کتاب میں ہے ۔ خاص کر مختلف مصنفوں کے اسلوب بیان، ان کا تقابل اور ان پر محاکمہ اور یہ ساری مباحث ~~xxxxx~~ نہایت اہم ہیں۔ اپنی اپنی جگہ یہ چیزیں بہت مناسب ہیں۔ اس سے پہلے جو کتابیں اس مبحث پر شائع ہوئیں ان میں آپ کی کتاب ممتاز ہے ۔" (٢)

اسی طرح دوسرے مصنفین مثلاً ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، ڈاکٹر محی الدین قادری، زور، پروفیسر آل احمد سرور، نیاز فتح پوری، وغیرہ نے بھی بڑے بے لاگ تبصرے کئے ۔

سرسید احمد خاں کا قول ہے :

" دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر ، گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو، متفق ہوجاویں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو ۔" ایسا ہی کچھ مولانا قادری کی اس کتاب کے سلسلے میں ہوا بعض رائیں بڑی دل چسپ اور متضاد تھیں مثلاً بعض حضرات ان کی کڑی تنقیدوں پر خفا ہوگئے اور بعض نے بعض مصنفین پر کی گئی نرم تنقیدوں کو ناپسند کیا۔ کوئی صاحب کتاب میں غیر معروف مصنفین کو شامل کرلینے پر معترض ہوئے تو کسی صاحب نے اسی بات کو وسیع القلبی و ادب نوازی سے تعبیر کرتے ہوئے بہت سراہا ۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

" عرصے سے اردو زبان کی ایک جامع تاریخ کی ضرورت محسوس ہورہی تھی

---

(١) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا (دوسرا ایڈیشن) ، (دیباچہ) ، ص ٢

(٢) ایضاً، ص ٩

جو جدید ترین تحقیقات کو پیش نظر رکھ کر لکھی جائے، اور وسعت نظر، حسن ترتیب اور صحت تنقید کے لحاظ سے تاریخ ادب کی ان کتابوں سے جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں لکھی گئی ہیں، ٹکر لے سکے۔ یہ کتاب میری رائے میں اس ضرورت کو باحسن وجوہ پورا کرتی ہے - مصنفین کی کتابوں سے کافی اقتباسات دیئے گئے ہیں، اور ان کا انتخاب اس سلیقے سے کیا گیا ہے کہ مصنف کے طرز تحریر کی سب خصوصیات واضح ہوجاتی ہیں۔" (۱)

اس کتاب کی ایک عجیب بات یہ بھی تھی جو بات ایک کے لیے شکوہ کا سبب تھی وہی دوسرے کے لیے تحسین کا باعث مثلاً کتاب کے طویل ہوجانے نثر کو دیکھتے ہوئے اس کو ڈاکٹر محی الدین قادری نے یوں سراہا :

" ماشاء اللہ بہت ہی دیدہ زیب اور اہتمام سے چھپی ہے - اور اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب اردو کے دن پھر گئے ہیں - احسن مارہروی مرحوم نے جو نقش اول شائع کیا تھا، اس وقت کوئی بھی یہ خیال نہ کرسکتا تھا کہ اس موضوع پر کچھ دنوں بعد ہی ایسی اعلا پائے کی کتاب شائع ہوسکے گی -" (۲)

اسی طرح کتاب کی جامعیت و اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے نیاز فتح پوری نے تحریر کیا :

" سب کچھ باوجود اختصار کے اتنی تحقیق و کاوش کا حامل ہے کہ مجھے تو یہ کتاب تاریخ اردو کی اچھی خاصی انسائی کلو پیڈیا معلوم ہوتی ہے۔" (۳)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، (دوسرا ایڈیشن) ، ~~xxxxx~~ (دیباچہ) ، ص ۹

(۲) ایضاً ، (دیباچہ) ، ص ۳

(۳) ایضاً ، (دیباچہ) ، ص ۹

اور حقیقت یہ ہے کہ قادری صاحب بحیثیت ایک محقق و مورخ ادب اردو کے ایک ایسے بلند منصب پر فائز ہیں کہ ان کے بعد آج تک کوئی ان کے اس مرتبے تک نہیں پہنچ سکا وہ بغیر اختلاف تاریخ ادب اردو کے بلند مرتبہ محقق قرار دیے گئے ہیں۔

مولانا کی کتاب " داستان تاریخ اردو" کے سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

" قادری صاحب کی کتاب " داستان تاریخ اردو" اس طرح لکھی گئی کہ اسٹاف روم میں ایک قسط لکھی اور کاتب کو بھیج دی - پھر کلاس روم میں چلے گئے - شام کو دوسری قسط لکھی - خود کہتے تھے کہ حوالے کی کتابیں بھی مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں - مگر انھوں نے بڑی لگن اور محنت سے یہ قابل قدر کام کر ہی دیا۔ اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب محض مشاہیر کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے دوسرے درجے کے غیر معروف مصنفوں کا بھی ذکر ہے - خصوصاً انیسویں صدی کے نثاروں کا تذکرہ بہت مفید ہے - اس سے یہ خیال اور بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جو لوگ فورٹ ولیم کالج اور سرسید کے درمیان کے زمانے کو تاریکی کا دور کہتے تھے وہ کس قدر غلطی پر تھے -" (۱)

اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے سرسید سے لے کر فورٹ ولیم کالج کے دور کی ادبی تاریخ کے خلا کو اپنی تحقیق و تدقیق سے مکمل کر دکھایا جہاں تک ان سے پہلے کسی نقاد کی نظر نہ پہنچ سکی تھی۔

پروفیسر آل احمد سرور (۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۴ء) تک " سینٹ جانس کالج آگرہ " کے ہی طالب علم رہے - مولانا کا تعلق شعبۂ اردو سے تھا اور آل احمد سرور سائنس کے طالب علم تھے۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، (دیباچہ) ، ص ۹

لیکن اس کے باوجود سرور صاحب کو قادری صاحب کے بہت ہی قریب رہنے اور ان سے فیضیاب ہونے کا موقع ملتا رہا ۔ کالج کے ماہنامہ " میگزین شفق " میں سرور صاحب کی غزلیں اکثر چھپتی تھیں۔ سرور صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے پتا چلتا ہے کہ " داستان تاریخ اردو" ترتیب دیتے وقت قادری صاحب کو کن کن مشکلات اور دقتوں کا سامنا رہا ہوگا لیکن قدرت نے انھیں تفحص و تجسس کا اعلا ذوق عطا کیا تھا پھر لائق و فائق اساتذۂ کرام کی صحبت نے بھی اس ذوق کو چار چاند لگائے اور قادری صاحب نے بھی ان سے خوب استفادہ کیا اور " داستان تاریخ اردو" لکھ کر اردو کے نثری ادب میں اک گراں قدر اضافہ کیا۔ اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں انھوں نے تذکروں اور بزرگوں کے اقوال سے کام لینے کے علاوہ ہر ایک مصنف کے علمی کاموں کو خود ہی پرکھنے کی کوشش کی اور اس پر رائے دی یہ بڑی علمیت اور خود اعتمادی کا کام ہے کیوں کہ لوگوں کے کاموں پر رائے دینے میں انھوں نے کسی کی تقلید سے کام نہیں لیا ۔

انھوں نے صحیفوں اور مصنفوں پر اعتراضات بھی کئے ، تائید و تردیدیں بھی کی اور بے لاگ و بے لوث تنقید کی روایت کو برقرار رکھا۔ اور ان کا ایسا کرنا ضروری و حق بجانب بھی تھا کیوں کہ بہ ظاہر اس روشنی کے کسی تصنیف و مصنف کے مطالعے کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔ انھوں نے روایت و درایت دونوں سے کام لیا اور جن مصنفین کی تصانیف سے مدد لی ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بھی لکھا :

> " میں نے اس کتاب میں بے شمار تصانیف اور دوسری مطبوعات سے مدد لی ہے اور متن یا حواشی میں ان کا حوالہ دے دیا ہے اگر کہیں حوالہ رہ گیا ہے تو وہ میری عجلت و غفلت کا نتیجہ ہے قصداً و ارادہ شامل نہیں ہے - اردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق فاضل مصنفین حیدرآباد نے بہترین معلومات فراہم کردی ہیں - ہر مولف کے لیے ان سے استفادہ نا گزیر ہے میں نے بھی

" اردوئے قدیم " (مولفہ حکیم شمس اللہ قادری) ، " دکن میں اردو" (مولفہ نصیرالدین ہاشمی) ، " اردو شہپارے" (مولفہ ڈاکٹر محی الدین قادری، زور) ، " ارباب نثر اردو" (مولفہ سید محمد ایم اے) ، سے اپنی تالیف میں جا بجا مدد لی ہے ۔ " سیرالمصنفین" اور مولوی عبدالحق صاحب کی بعض تالیفات مثلاً " چند ہم عصر" اور کہ مجلہ " اردو" سے بھی میں نے بہت فائدہ حاصل کیا ہے اور بہت سے رسالے خصوصاً " مخزن" اور " زمانہ " کے قدیم و جدید فائل بھی بہت کام آئے ہیں۔" (۱)

سولہ سال بعد جب ۱۹۵۷ء میں دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت آئی تو مولانا نے گزشتہ (ایڈیشن پر کئے گئے تبصروں کو مد نظر رکھا جہاں چند ادھوں نے اپنی بعض رائیں بدل دیں ، بعض غیر مشہور مصنفین کو حذف کردیا ، بعض اقتباسات کو گھٹادیا اور بعض غیر ضروری حواشی بھی شامل نہیں کئے ۔

بعض دانشوروں اور مبصروں نے کتاب پر تبصرے و تنقید کے علاوہ کتاب کے نام "داستان تاریخ اردو" کو ہی غلط قرار دیا اور بعض یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ " داستان بھی اور تاریخ بھی چہ معنی دارد" ۔(۲)

اس کتاب کو اس نام سے موسوم کرنے میں بھی مولانا کے شوق تاریخ گوئی کو بڑا دخل ہے وہ اکثر گفتگو بھی تاریخی جملوں میں کیا کرتے تھے۔ اور جس طرح حضرت رابعہ بصری رضی اللہ عنہما متکلمہ بالقرآن تھیں ، اسی طرح قادری صاحب بھی متکلم بالتاریخ تھے ۔ ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کے قول کے بموجب" ادھوں نے محض یہ شوق تاریخ گوئی اپنی کتاب " تاریخ اردو" میں "داستان" کا لفظ بڑھاکر " داستان تاریخ اردو" کردیا تھا"جس کی وضاحت مولانا نے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں ان الفاظ میں کی ہے :

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا(دوسرا ایڈیشن) ص۲۳

(۲) " ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا اعتراض " بحوالہ حامدحسن قادری، مولانا" داستان تاریخ اردو"محولہ بالا ، (دیباچہ) ، ص ۲۶

" داستان تاریخ اردو" (۱۹۳۸ع) میں نے تاریخ گوئی کے شوق میں رکھدیا تھا۔ بعض نے اس پر اعتراض کیا اور سوال اٹھایا کہ یہ " داستان" زیادہ ہے یا " تاریخ " زیادہ ؟ لیکن اب اشاعت ثانی میں نام بدل دیا جائے تو کتاب پہچانی نہ جائے گی ۔ نام بہت مشہور ہوچکا ہے اس لیے اس " چیستان " کو باقی ہی رہنے دیا۔" (۱)

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو مولانا کی اس کتاب کو اہل علم و ادب نے بہ نظر استحسان دیکھا جس کے سلسلے میں بہت سے ادیبوں ، نقادوں اور عالموں کے خطوط انہیں ملے اور بہت سے اخبارات و رسائل اور ریڈیو وغیرہ سے اس پر تبصرے بھی کیے گئے ۔ اگر یہ سب تبصرے یکجا کردیے جائیں تو ایک خاصی دل چسپ کتاب بن سکتی ہے۔

بہرکیف شائع ہونے کے بعد یہ داستان محفل بہ محفل پہنچتی رہی اور سب نے بڑے شوق سے پڑھی و سنی۔ اس کی شہرت و مقبولیت کے متعلق مولوی عبداللطیف خاں کشتہ لکھتے ہیں :

" داستان تاریخ اردو" قادری صاحب کے ادبی کارناموں میں شاہکار کا حکم رکھتی ہے ۔ جس پر ہماری زبان اور ہمارا ادب ہمیشہ فخر کرے گا۔ یہ کتاب اردو زبان کی تخلیق و ارتقائی کیفیت کا آئینہ ہے اور اردو کے شعرا و مصنفین نثر کے تاریخی حالات کی اچھی خاصی اضافی کلو پیڈیا بھی جو جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں انتہائی کد و کاوش کے ساتھ مدون کی گئی ہے ۔ اس میں محض مشاہیر کا تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ ان غیر معروف مصنفین کا بھی ذکر ہے جنھوں نے دوسرے ہی درجے کی سہی مگر معقول خدمات ادب و زبان انجام دیں ، جس سے اردو زبان کی عہد بعہد ادبی کوششوں اور ترقیات کا وہ سلسلہ مربوط ہوجاتا ہے جس کی کڑیاں (سرسید سے لے کر فورٹ ولیم کالج تک) اس کتاب کی تصنیف سے قبل ناپید تھیں۔ اس کتاب میں مصنفین کے اسلوب بیان ، ان کا تقابل اور ان پر مدلل و منصفانہ بے لاگ محاکمہ نہایت شگفتہ عبارت اور دل کش انداز میں کیا گیا ہے ۔ اور ایک قابل ستائش و مستحسن کام یہ اور

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (دوسرا ایڈیشن) ، ص ۳

کہا گیا ہے کہ اس میں جا بجا مصنفین کے قطعات تاریخ وفات خود تصنیف کرکے درج کردیے گئے ہیں۔ غرض کہ یہ کتاب بہت جامع ہے اور اس وقت تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب اس پائے کی نہیں لکھی گئی ۔" (۱)

یہ حقیقت ہے کہ " داستان تاریخ اردو" کو اہل علم و ادب نے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور اس سلسلے میں اگرچہ قادری صاحب نے خود کہیں نہیں لکھا مگر اشاعت کے کچھ ہی عرصے کے بعد سے یہ کتاب آگرہ یونی ورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل کرلی گئی اور ان دو یونی ورسٹیوں کے بعد دوسری یونی ورسٹیوں نے بھی اس کو داخل نصاب کرلیا۔ اور آج یہ ہند و پاک کی ہر اس یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل ہے جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے ۔

قادری صاحب نقش ثانی کو نقش اول سے بہتر بنانے کے لیے کوشاں تھے چناں چہ دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں :

" میں چاہتا تھا کہ دوسرے ایڈیشن میں صرف نظر ثانی اور ترمیم و درستی ہی نہ ہو بلکہ کتاب کو دوبارہ لکھ دوں لیکن یہ بڑا کام تھا ۔ سوچتا اور ارادہ ہی کرتا رہا ۔ حتی کہ پاکستان چلا آیا اور کراچی میں آکر بس گیا۔ یہاں آکر کتاب کی اس قدر مانگ دیکھی کہ میں حیران رہ گیا ۔ ادھر آگرے کے پبلشر کا اصرار ، ادھر یہ مانگ میرے ارادے کتاب کو ازسر نو لکھنے کے متعلق سب رہ گئے اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب جیسی کچھ ہے دوبارہ چھپوادی جائے چناں چہ نظر ثانی میں درستی و ترمیم اور حذف و اضافہ کرتا گیا اور پچاس پچاس ، سو سو صفحے چھپنے کے لیے بھیجتا گیا۔ آخر کتاب دوبارہ چھپ گئی ، الحمد للہ ! " (۲)

مولانا کی اس تحریر سے یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے طبع دوم میں درستی و ترمیم

---

(۱) کشفتہ عبداللطیف خاں ، " حامد حسن قادری" ، "اردو نامہ" کراچی : جنوری تا مارچ ، ۱۹۶۵ء ، شمارہ ۱۹ ، ص ۱۳-۱۲

(۲) حامد حسن قادری ، مولانا ،" داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (دوسرا ایڈیشن) ، (دیباچہ) ، ص

اور حذف و اضافہ کیا اور یہی کتاب از سر نو ترتیب نہیں دی البتہ اس کو دوبارہ غور سے دیکھا اور جن جن باتوں کو اور ضروری و اہم سمجھا وہ بھی اس میں شامل کردیں۔ اگر کسی نقاد نے لکھا تھا کہ " انداز بیان سادہ و بے مزہ ہے " تو مولانا نے اس کی دل دہی کے لیے اپنی زبان اور بیان پر بھی نظر ثانی کی اور اس طرح ان ترامیم و اضافوں کے بعد دوسرا ایڈیشن اپریل، ۱۹۵۷ء میں عزیزی پریس آگرہ سے شائع ہوا۔

تیسرا ایڈیشن بھی دوسرے ایڈیشن کے مطابق صرف نئے دیباچے کے اضافے کے بعد جون کا تین ۱۹۶۶ء میں ایجوکیشنل پریس کراچی سے شائع ہوا۔

طبع اول اور طبع دوم کے تمام اختلافات کی فہرست میں تو طویل ہوجائے گی مگر یہاں صرف خاص خاص اختلافات پیش کئے جاتے ہیں :

۱- طبع اول میں " عربی و ہندوستانی الفاظ کا مبادلہ" کے عنوان سے عربی اور ان کے ہم معنی ہندوستانی الفاظ کی ایک فہرست تھی جو طبع ثانی میں شامل نہیں کی گئی ۔

۲- طبع دوم میں " سنسکرت اور پراکرت" اور " برج بھاشا" ان دو عنوانات کا اضافہ صفحۂ ۱ اور ۲ پر ہوا۔ مگر طبع اول کے نفس مضمون میں کوئی رد و بدل اور اضافہ نہیں کیا گیا۔

۳- طبع اول میں صفحہ ۲ " گوتم بدھ" اور " مہاویر" کے سلسلے میں یہ فقرے لکھے گئے تھے :

" گوتم بدھ کا زمانہ حضرت عیسی سے چھ صدی قبل ہے - مہاتما بدھ کی زبان یہی سورسینی پراکرت یا برج بھاشا تھی، اسی زمانے میں مہاتما مہاویر نے جین مت پھیلایا، ان کی زبان بھی یہی تھی۔"

طبع ثانی میں مندرجہ بالا فقرے حذف کردیے گئے اور طبع سوم میں بھی

ایسا ہی کیا گیا۔

۳- طبع اول میں " اردو زبان کی اصل" کے عنوان کے ذیل میں صفحات

۵ و ۶ پر یہ عبارت تحریر ہے :

" زبان کی تشخیص و تمیز کا اصول یہ ہے کہ کسی مخلوط زبان میں جس زبان کے افعال و ضمائر و متعلقات فعل کا غلبہ ہوتا ہے وہی زبان اس مخلوط زبان کی اصل و ماخذ قرار دی جاتی ہے ۔ اردو زبان میں مذکورہ بالا اجزاء برج بھاشا کے ہیں اس لیے برج بھاشا اردو کی ماں ہے ۔ "

" فارسی و عربی کو اردو کی اصل سمجھنا غلطی ہے ۔ یہ اتفاق تھا کہ ہندوستان میں غیر ملک سے آنے والے سب سے پہلے مسلمان تھے اور ان کی زبانوں کی آمیزش سے برج بھاشا سے اردو پیدا ہوگئی اگر مسلمانوں سے پہلے ڈچ ، یا فرنچ یا انگریز آتے تو ان کی زبانوں کے اسماء و صفات برج بھاشا کے افعال و متعلقات فعل میں مل کر کچھ اور زبان بن جاتی۔"

اس کے بعد " لفظ اردو کی تحقیق " کے ذیلی عنوان کے تحت یہ

عبارت درج ہے :

" اردو زبان کو " اردو" اس لئے کہتے ہیں کہ " اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی لشکر کے ہیں اور لشکر اسلامی کے ورود ہندوستان کے بعد اسلامی زبانوں (عربی ، فارسی ، ترکی) کے الفاظ برج بھاشا میں شامل ہوئے ۔ لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کے لیے اردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا ۔ لفظ " اردو" کا " لشکر و لشکر گاہ ، بلکہ دارالسلطنت " کے معنوں میں استعمال ہونا ، علاء الدین بن عطا ملک جوینی کی تاریخ " جہان کشائے " (صفحہ ۲۶۰ (ع مطابق ۶۵۸ ہجری) سے ثابت ہے ۔ علاء الدین نے اپنی تاریخ میں چنگیز خان اور اس کے خاندان کےحالات لکھے ہیں اور ان کے لشکرو

لشکرگاہ کے لیے اردو کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ چنگیز خاں ۱۱۶۳ء مطابق ۵۵۳ھجری میں پیدا ہوا اور ۱۲۲۷ء مطابق ۶۲۴ھجری میں مرا۔ مغلوں میں سب سے پہلے چنگیز خاں نے سلطان شمس الدین ایلتمش (۱) کے زمانے میں ۱۲۲۱ء مطابق ۶۱۸ ھجری میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن یہ حملہ فتح ملک اور تاسیس حکومت کے لیے نہ تھا۔ چنگیز خاں کے بعد مغل برابر ہندوستان پر حملے کرتے رہے ۔ "

طبع دوم میں مندرجہ بالا عبارت حذف کردی گئی ہے اور لفظ " اردو کی تحقیق" کے ذیلی عنوان کے تحت ان جملوں کو شامل کیا گیا ہے :-

" یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کے لیے اردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔"

۵- طبع اول میں صفحہ ۲۷ پر " شمالی ہند میں اردو شاعری کا دور قدیم" کے سلسلے میں " ملا ناصر افضلی الہ آبادی" کا ذکر ہے مگر طبع دوم میں اس کو حذف کردیا گیا ہے ۔

۶- طبع اول میں صفحہ ۲۷ پر ولی اورنگ آبادی کے سلسلے میں کوئی خوشت نہیں ہے مگر طبع دوم میں احمد میاں اختر جوناگڑھی کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کا اضافہ کیا گیا ہے :-

" ولی کو اکثر اہل تذکرہ نے دکنی یا اورنگ آبادی لکھا ہے لیکن اب احمد میاں اختر جوناگڑھی نے طویل بحث کے بعد یہ دلائل ثابت کردیا ہے کہ ولی احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے اورنگ آباد (دکن) میں رہے لیکن وہ ان کا وطن نہ تھا گجرات سے لے کر مدراس تک کے حصے کو قدیم زمانے میں دکن کے لفظ سے تعبیر کردیا کرتے تھے۔ اس لیے بھی

---

(۱) میں نے کتاب ہی کے املے کو ترجیح دی ہے اور وہی لکھا ہے ۔(مقالہ نگار)

بعض اہل تذکرہ نے ولی کو دکنی لکھدیا ہے ۔ گجرات اور دکن کی زبانوں میں اشتراک بھی ہے لیکن ولی کے کلام میں ایسے الفاظ و محاورات موجود ہیں جو خاص گجرات میں رائج ہیں ۔ دکن میں کوئی ان کو جانتا بھی نہیں۔ ولی کے خاندانی حالات اور ان کے زمانے کے بعض لوگوں کے اقوال سے بھی ولی کا گجراتی ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ اختر جوناگڑھی صاحب نے اس طرح کی بہت سی دلیلیں قائم کی ہیں ۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی یہاں ولی کو احمد آبادی لکھدیا ہے ۔ یہ مشہور ہے کہ ولی کے دہلی میں آنے سے پہلے اور ان کے دیوان غزلیات اردو کی دہلی میں شہرت ہونے سے پہلے دہلی اور شمالی ہند میں غزل گوئی شروع نہ ہوئی تھی ۔ ہم نے اسی مضمون میں مختلف غزل گو شاعروں کے نمونوں سے اس کی تردید کی ہے ۔"

۷- طبع اول میں صفحہ ۲۹ پر جعفر زٹلی کا حال چھ سات سطروں میں ہے اور ان کے کلام کا کوئی نمونہ نہیں دیا گیا ہے مگر طبع دوم میں نہ صرف جعفر زٹلی کے کلام کے نمونے کا اضافہ کیا گیا ہے بلکہ ان کے ایک اور ہمعصر شاعر سید عبدالجلیل زٹل" کا بھی ذکر ہے :

" میر جعفر زٹلی عالم گیر بادشاہ کے شہزادوں (محمد سلطان محمد اعظم اور محمد معظم) کے درباروں سے توسل رکھتا تھا۔ اعظم و معظم کی لڑائیوں سے پریشان ہوکر عالم گیر کے زمانے کو یاد کرتا ہے اور ان بھائیوں کی خانہ جنگی کا مضحکہ اڑاتا ہے :-

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

الٹ کے آنچھوں دل روتا ہے	نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
دواد و ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے	بچہ درگور سر کھٹیا کھڑی ہے
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم	زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
بیا جعفر زباں کو مختصر کر	ز دور مختلف دل میں حذر کر

شہر آشوب

کیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

دہ بولے راستی کوئی ہر سب جھوٹ میں کھوٹی

اتاری شرم کی ~~کوئی~~ لوٹی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی

بھلا دی بات سب ہرکی عجب یہ دور آیا ہے

جعفر زٹل کے ہم عصر سید عبدالجلیل اثل ہیں۔ ماردول سے دکن کو زٹل کے نام

خط لکھتے ہیں :

" چاہ بوائی و چوائی میر جعفر بڑے بھائی ہر روز کتک از یاد حق سکھی باشد

زٹل تیری جعفر جہانگیر شد زٹل کلتی اندر توشی میرشد

سید اثل کی ایک غزل یہ ہے :

غزل اثل

رخسار پر بہار سجن رشک چمن | یاگل گلاب کا کہوں یا لالہ یا سمن

یا حقّہ جواہر و یا درج درکہوں | یا غنچۂ گلاب کہوں یا کہوں دہن

گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھجنگ | یا زلف مشک ناب ہے یا نافۂ ختن

بالا خوش خرام چلے جب لٹک لٹک | شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن

ہر کس کرشمہ سوار است نازنین

سید اثل زیادۂ دیدار او مکن

۸- طبع اول کے عنوان " نثر اردو کا دور اول " کے تحت " دکن میں اردو "

کے ذیلی عنوان میں جہاں دکن کی ادبی خدمات کو سراہا ہے وہیں

انہوں نے سلطنتوں کے جلد جلد تبدیل ہونے والے سخنین کو بھی حذف کردیا

ہے مگر عبارت میں تسلسل قائم رکھا ہے ۔

۹- طبع اول میں فضلی کی "کربل کتھا " سے کوئی اقتباس نقل نہیں کیا گیا ہے

لیکن طبع دوم میں تقریباً ڈیڑھ صفحے کا ایک طویل اقتباس " کربل کتھا" کی مجلس چہارم سے اخذ کرکے شامل کیا گیا ہے ۔

۱۰- صفحہ ٦۰ پر طبع اول میں میر عطا حسین تحسین کی " نوطرز مرصع" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا قادری نے آخر میں یہ فقرے بھی لکھے ہیں:

" قدیم محاوروں اور متروک لفظوں کے علاوہ کہیں کہیں پرانا غلط املا بھی پایا جاتا ہے ۔ مثلاً "مردے کے تئیں" کی جگہ " مردے کا تیئں" ۔ لیکن طبع دوم میں یہ عبارت حذف کردی گئی ہے۔

۱۱- صفحہ ۸۳ پر طبع اول میں گراھم بیلی کے سلسلے میں لکھتے ہوئے آخر میں یہ فقرے ہیں " بعض شعرا کا تذکرہ حصۂ نظم میں آئے گا ۔" طبع ثانی میں یہ فقرے بھی حذف کردیے گئے ہیں۔

۱۲- طبع اول میں " باغ اردو " میں ایک حکایت کا ترجمہ یہ ہے کہ بصورت ایک سطر میں لکھا ہے کہ " ایک فقیر کو میں نے سنا کہ فاقہ کی آگ میں جلتا ، پیوند پر پیوند گانٹھتا اور تسلی اپنی خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا :

" لباس فقر و نان خشک پر میں   بلا لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت
ہر اک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا   ہے بہتر یا کہ اپنا بار محنت "

اس کے بعد اس مذکورہ فقرے کے سلسلے میں بڑی حکایت ہے مگر طبع ثانی میں ان اشعار اور حکایت کی بجائے نوشیروان کی نقد قیمت دے کر لینے والی حکایت درج کی گئی ہے۔ اشعار بھی دوسرے درج کیے گئے ہیں ۔

۱۳- طبع اول میں صفحہ ۱۲۵ پر مولوی امانت اللہ کے تذکرے میں :

" تاکہ طالب علموں کو اس سے فائدہ پہنچے اور ماسی کو ثواب ملے" کے بعد

طبع ثانی میں یہ فقرے بڑھادیے گئے " اس فقرے کے بعد غلام حیدر نے کتاب کی تعریف میں ایک قطعہ بہت خوب صورت لکھا ہے " ۔ اس کے بعد اس قطعے کا بھی اضافہ کیا گیا ۔ "

قطعہ

ہر اک حکایت ہے حدیث لب شیریں　　　ہر اک ورق اس کا نقاب رخ لیلی

گرخواں یہ تحسین کے سخن کی ہو مدارات

مہمان ہو یہ اور ہوں سب اس کے طفیلی

۱۴- طبع اول میں صفحہ ۱۹۷ پر مفتی صدرالدین آزردہ کے تذکرے کے بعد مفتی سعداللہ رام پوری کا اور صفحہ ۱۹۹ و ۲۰۰ پر عباس بن ناصر علی الموج کا ذکر شامل ہے مگر طبع ثانی میں ان ہر دو حضرات کے تذکروں کو حذف کردیا گیا ہے ۔

۱۵- طبع اول میں صفحہ ۲۰۵ پر مولوی صبح الزمان کا ذکر ہے طبع ثانی میں یہ بھی حذف کردیا گیا ہے۔

۱۶- طبع اول میں نثر کے پانچویں دور میں صفحہ ۳۳۱ پر سید محمد میر لکھنوی کا ذکر ہے مگر طبع ثانی میں یہ حذف کردیا گیا ہے۔

۱۷- مولوی ذکاء اللہ کے متعلق طبع اول میں دو تاریخیں ہیں مگر طبع ثانی میں دوسری تاریخ یافت قرب " شفیع امم ذکاء اللہ " شامل نہیں کی گئی ہے ۔ ۱۳۲۸ھ اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کے لیے کہی گئی دوسری تاریخ جو طبع اول میں تھی طبع ثانی میں شامل نہیں ہے ۔

۱۸- طبع اول میں اخبار نویسی اور اس کے فرائض کے متعلق مولانا حالی کے مضامین سے اخبار "رفیق ہند" سے دو اقتباسات ہیں مگر طبع ثانی میں صرف ایک ہی اقتباس شامل کیا گیا ہے ۔ اسی طرح مولوی سید علی صاحب کے سلسلے میں طبع اول میں دو تاریخیں ہیں مگر طبع ثانی میں صرف ایک پر ہی اکتفاکیاہے۔

۱۹- طبع دوم میں مولوی سید علی صاحب کی دوسری تصنیف "تمدن ہند" کے اول دو اقتباسات حذف کردیے گئے ہیں۔

۲۰- طبع اول میں صفحہ ۶۶۹ پر مولانا شبلی کی وفات کی دو تاریخیں تھیں ایک سن عیسوی میں دوسری سن ہجری میں - طبع دوم میں صرف سن ہجری والی تاریخ پر اکتفا کیا ہے اور سن عیسوی والی تاریخ حذف کردی ہے-

۲۱- طبع اول میں مولوی سید احمد دہلوی کی تاریخ وفات بحساب ابجد نکالی اور لکھی نہیں گئی ہے مگر طبع دوم میں شامل ہے -

۲۲- طبع اول میں خواجہ سید ناصر نذیر فراق کے ذکر میں "بیگموں کی چھیڑ چھاڑ" سے ایک اقتباس دیا گیا ہے مگر طبع دوم میں ان کی تاریخی خیال آرائی ظاہر کرنے کے لیے ان کے ایک اور مضمون "قوت مجاز" سے تین صفحے کے ایک اقتباس کا اور اضافہ کیا گیا ہے -

۲۳- طبع اول میں صفحہ ۸۵۲ پر اس کا باقی تبصرہ "داستان تاریخ اردو" کے دوسرے حصے کے لیے رکھا جاتا ہے اس فقرے کے بعد اختتام کے بعد دو نئے پیراگراف مولوی عبدالحق صاحب کے کراچی آنے انجمن ترقی اردو کے قائم ہونے "قومی زبان اور سہ ماہی" اردو" کے اجراء کا ذکر ہے - دوسرے پیراگراف میں پروفیسر آل احمد سرور اور علی گڑھ کے ہفت روزہ "ہماری زبان" وغیرہ کا تذکرہ ہے -

۲۴- ان دو پیراگرافوں کے بعد وہی طبع اول والی عبارت شامل کرکے کتاب کو تمام کیا گیا ہے -

طبع اول اور طبع دوم کے اختلافات کی تفصیل سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تبصرہ نگاروں نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا ان کا انھوں نے پورا پورا

خیال رکھا بہت سی چیزیں حذف کردیں ۔ اور اس کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے کوشاں رہے ۔ وہ ہر بات کو ناپ تول کر کہنے کے عادی تھے لہذا اول تو خودہی انھوں نے اس پر ناقدانہ نظر کی اور سونے پر سہاگا یہ کہ دوسرے ناقدین ادب نے بھی اپنی آراء کا اظہار کیا۔ انھوں نے سب کی باتوں پر دھیان دیا اور جہاں کہیں مناسب سمجھا ترمیم و اضافے سے کام لیا۔

لہذا دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں وہ خود لکھتے ہیں :

" بات صرف اتنی تھی کہ کسی نے اردو زبان و ادب کی تاریخ اس تفصیل ، اس تجزیے، اس موازنے اور اس محاکمے کے ساتھ نہ لکھی تھی ، اسی کی ضرورت تھی اور اسی کو لوگوں نے سراہا ورنہ یہ کتاب تمام پہلوؤں سے مکمل نہ تھی ، بلکہ خود میری نظر میں اس کے اندر خامیاں اور کوتاہیاں موجود تھیں اور بعد کو تبصروں سے اندازہ ہوا کہ غلطیاں بھی واقع ہوگئی تھیں جن کا مجھے لکھتے وقت علم نہ تھا۔" (۱)

" داستان تاریخ اردو" کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے بہتر ہے کہ ہم نثر اردو کے تذکروں پر بھی نظر ڈال لیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ مولانا قادری نے ان سے کس حد تک استفادہ کیا اور کیا کیا اضافے کیے۔ اس سے " داستان تاریخ اردو" کی تحقیقی و تنقیدی حیثیت متعین کرنے میں بھی آسانی ہوگی ۔ اور مولانا کی کوشش و کاوش اور جدت و جودت کا بھی اندازہ ہوسکے گا۔

مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ دو سو برس سے اب تک متعدد تذکرے تالیف ہوئے مگر ان میں سے بیشتر شاعری اور شاعروں کے متعلق ہیں کسی نے مصنفین نثر اردو کی طرف توجہ دینے کی کوشش نہ کی ۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انیسویں صدی

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا(دوسرا ایڈیشن) ص

عیسی میں غدر ۱۸۵۷ع سے پہلے اردو نثر اتنی اور ایسی نہ لکھی گئی تھی کہ مفصل اور مسلسل تاریخ و تذکرے کے قابل سمجھی جاتی اور ایسے تذکرے سے عام دل چسپی کی بھی امید مشکل تھی لیکن آخری صدی تک صاحبِ نثر اور انشا پردازی نے اتنے مدارج ارتقا طے کرلیے تھے کہ کسی تاریخ کا مرتب نہ ہونا اہل علم کی بد نصیبی اور اور اہل قلم کے تغافل علمی کا ثبوت تھا۔

مولانا حامد حسن قادری نے اس طرف خصوصیت سے توجہ دی ۔ انھوں نے " آغاز اردو سے پہلے کا حال" اور " آغاز اردو کا حال" ؛ داستان تاریخ اردو" میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے ۔

آغاز اردو سے قبل کا حال تحریر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

" حضرت عیسی علیہ السلام سے صدہا سال قبل گوتم بدھ، بانئی مذہب بدھ اور مہابیر ، بانئی جین مذہب سے سینکڑوں برس پہلے آریہ قوم کے ورود ہندوستان کے وقت ہندوستان کے قدیم اور اصلی باشندے مختلف صدیوں میں مختلف زبانیں بولتے تھے ۔ آریا لوگوں نے اپنی زبان سنسکرت کو رواج دیا۔ سنسکرت میں وسعت و تکمیل کے جوہر تھے۔ ہندوستان میں اس زبان کو اس قدر ترقی ہوئی کہ لسانی و ادبی و علمی حیثیت سے دنیا کی بہترین زبانوں میں اس کا شمار ہے۔ لیکن گردش زمانہ سے صدہا سال حکومت کرنے کے بعد سنسکرت کو زوال شروع ہوا ، اور مختلف صوبہ وار زبانیں جن کو پراکرت کہتے ہیں ، سنسکرت کی جگہ لینے لگیں۔

ان پراکرت زبانوں میں ایک سورسینی پراکرت تھی جو برج یعنی متھرا کے علاقے سے شروع ہوکر پنجاب ، سندھ ، بہار اور مالوہ تک شائع و عام تھی۔ اسی کی ایک شاخ کو برج بھاشا کہتے ہیں یعنی متھرا کی زبان ۔ یہ سب سے زیادہ وسیع تھی اور حضرت عیسی کے زمانے سے قبل علمی زبان بن چکی تھی ، یعنی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ حضرت عیسی سے نصف صدی قبل اجین کے راجہ وکرماجیت کے دربار کے ایک پنڈت داروجی نے برج بھاشا کے قواعد صرف و نحو مرتب کئے تھے ۔ یہ کتاب اب تک موجود ہے ۔ اس دو ہزار سال قبل

کی کتاب میں برج بھاشا کے ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں جو آج بھی ہماری موجودہ زبان اردو میں شامل ہیں۔" (۱)

تاریخ سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ سکندر اعظم نے حضرت عیسی سے ۳۲۵ سال قبل ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت بھی یہاں برج بھاشا رائج تھی - ۵۶۹ع سے عرفہ اسلام کا دور شروع ہوتا ہے لیکن ورفہ اسلام سے قبل بھی عرب و ہندوستان کے مابین سلسلہ تجارت قائم تھا۔ عرب سواحل ہند پر تجارت کی غرض سے آتے تھے اور اپنا مال فروخت کرکے ہندوستانی مال خرید کر لے جایا کرتے تھے لیکن یہ صرف تجارتی لین دین ہی نہ تھا بلکہ الفاظ کا بھی ادل بدل ہوتا تھا - اور اس طرح بہت سی چیزوں کے عربی نام ہندوستان کے لوگوں کی زبان میں گھل مل جاتے تھے۔

۶۳۷ع سے ۷۱۲ تک مسلمانوں نے ہندوستان پر کئی بار حملے کئے ۷۰۵ عیسوی مطابق ۸۶ ہجری میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ پر حملہ ہوا اور پھر ۷۱۲ع مطابق ۹۶ ہجری تک ملتان کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور پھر مسلمانوں کی سلطنت سندھ پر صدیوں تک قائم رہی -

چنانچہ ابن حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے اپنے سفر نامے میں تحریر کرتے ہیں :

" سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی وضع اور معاشرت اس قدر یکساں ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے - دونوں قوموں میں نہایت اتفاق و ارتباط قائم ہے - عربی و سندھی دونوں زبانیں رائج ہیں - اور ملتان میں ملتانی کے ساتھ فارسی زبان بولی جاتی ہے -" (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا (تیسرا ایڈیشن)، صفحہ ۸

(۲) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، کراچی : ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۶ع (تیسرا ایڈیشن)، ص ۹

۹۸۶ع میں سبکتگین نے پنجاب پر حملہ کرکے پشاور تک کا علاقہ اپنے قبضہ میں کرلیا تھا اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ع تا ۱۰۲۷ع یعنی ستائیس (۲۷) سال میں سترہ (۱۷) حملے کرکے پشاور، ملتان، کالنجر، قنوج ، گجرات اور متھرا پر قبضہ کرلیا تھا۔

خاندان غزنوی نے تقریباً دو سو برس تک حکومت کی ، لاھور اس کا دارالحکومت رھا۔ مختلف اقوام و ممالک کے مسلمان مثلاً عرب ترک، افغان، مغل اور ایرانی پنجاب میں مقیم رھے اور اھل ھند کے ساتھ تمدنی و معاشرت ، لین دین شادی بیاہ ھر قسم کے تعلقات قائم رھے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے مقامی الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کئے اور اھل ھند نے بھی عربی، فارسی و ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کرلیے۔

اردو زبان

اردو زبان کی ابتدا کے لیے مختلف نظریات ھیں - اور یہ بات بھی تحقیق طلب ھے کہ اس زبان کےلیے اردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا - یہ بات تحقیق سے ثابت ھے کہ مغلوں کے زمانے سے ھندوستان میں اردو کا لفظ لشکر و لشکر گاہ کے معنی میں استعمال ھوا شروع ھوا اسی زمانے کے کسی شاعر کا شعر ھے :

" یک شمّہ بہ ایوان تو خورشید منّور
یک خیمہ در اردوئے تو گردون معلیٰ"

اس سلسلے میں حکیم سید شمس اللہ قادری تحریر کرتے ھیں :

" امیر علاء الدین جو ینی کی تاریخ " جہانکشا" اور وزیر رشیدالدین فضل اللہ کی " جامع التواریخ " سے معلوم ھوتا ھے کہ چنگیز خان اور اس کی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاھوں اور بادشاھزادوں کے فرودگاھوں اور لشکرگاھوں

کو اردو کہا کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا مستقر حکومت بھی اردو کہلاتا تھا اور قراقرم کا قدیم نام اردو بالیغ تھا ۔

چنگیز خاں کے فرزند جوجی‌خان کی اولاد نے دشت قپچاق اور روس و بلغار میں ایک وسیع حکومت قایم کرلی تھی۔ اس کے حکمران جب کسی مہم پر مستقر سے روانہ ہوتے تو زریں خیموں میں قیام کیا کرتے تھے جس کے باعث ان کی لشکر گاہیں اردوئے معلّٰی (Golden Horde) کہلاتی تھیں اور خود انھیں خواتین اردوئے معلّٰی کے لقب سے شہرت ہوگئی تھی۔" (۱)

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ خروج چنگیز خاں کے بعد سلطان شمس الدین ایلتمش کے زمانے سے سلطان محمد بن تغلق کے دور حکومت تک مغلوں نے ھندوستان پر کیارہ حملے کئے اور تقریباً سو سال تک ھندوستان کا شمالی خطّہ ان کی تگ و تاز کا میدان بنارھا ۔ یہی زمانہ تھا جب ھندوستان میں اردو کا لفظ"لشکر و لشکر گاہ کے لیے استعمال کیا جانے لگا جس کی تصدیق قاضی منہاج الدین کے اس قول سے ہوتی ہے :

" چون ملک اعظم الغ خان لشکر ھا بطرف ناگور برد و با ملک شیرخان ایشان را مکاوحت رفت در حوالی سندھ ملک شیر خان از آنجا عزیمت ترکستان کرد و بطرف اردوئے مغل رفت و بدرگاہ منکوخان پیوست ۔" (۲)

شمس الدین عفیف نے بھی اپنی کتاب " تاریخ فیروز شاھی" میں جو ۸۰۱ھ میں تحریر کی گئی ہے اس میں بھی لفظ " اردو " کو " لشکر گاہ " کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ ۹۳۲ھ میں جب بابر نے ھندوستان فتح کیا تو دھلی‌وآگرہ کی فتح کے بعد فتح نامے روانہ کرتے وقت اپنے لشکر کو" اردو ئے نصرت شعار کے نام سے موسوم کیا۔

---

(۱) شمس اللہ قادری، حکیم سید ،" اردوئے قدیم"، لکھنو : نول کشور، سن ، ص ۷

(۲) جوزجانی، قاضی منہاج الدین،" طبقات ناصری" ، کلکتہ : س ن ، ص ۲۷۷

بابر ، اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں جو مورخ گزرے ہیں وہ بھی اردو کو لشکرگاہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ان تینوں مغلیہ بادشاہوں کے زمانے میں جو سکے ڈھالے گئے ان پر بھی لفظ اردو لشکر کے معنی میں لکھا ہوا ہے -

جہانگیر نے مالوہ (۱۰۲۵ھ) اور کشمیر (۱۰۳۶ھ) کے دوران سفر جو سکے بنوائے ان پر علی الترتیب مندرجہ ذیل اشعار تحریر ہیں :

" باردو سکہ زد در راہ و کی شاہ بحر و بر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

=======

باد رواں تاکہ بود مہر و ماہ
سکۂ اردو ئے جہانگیر شاہ

====

شہنشاہ اکبر کے زمانے سے شاہی لشکر و لشکر گاہ کو اردوئے معلی کہتے تھے اور لشکر کے بازار کو " بازار اردو" یا " اردو بازار" کہا جاتا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اردو عام طور پر لشکر گاہوں میں بولی جاتی تھی جس کے سبب اس کا نام " زبان اردو" یعنی اہل لشکر کی زبان مشہور ہوگیا اور بعد میں کثرت استعمال اور سہل انگاری کے سبب لفظ زبان بھی ترک کردیا گیا اور صرف اردو ہی کہنے لگے - اس قول کی تصدیق سید انشا اللہ خاں انشا کے اس قول سے بھی ہوتی ہے :

" خوش بیانان آنجا (دارالخلافت شاہ جہان آباد) متفق شدہ از زبان ہائے متعدد الفاظ دل چسپ جدا نمودہ و در بعضے عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبانے تازہ سوائے زبان ہائے دیگر بہم رسانیدند و بہ اردو موسوم ساختند"۔(۱)

---

(۱) انشا ، سید انشا اللہ خاں ، " دریائے لطافت "، ~~بحوالہ سلطان تاریخ اردو،~~ ~~محولہ بالا ص~~

لیکن امیر خسرو کے دیوان کے دیباچہ سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنے دیوان کے دیباچے میں اردو کلام کو " کلام ہندوی" کہا ہے - اور اس زمانے میں بول چال کی مخلوط زبان یعنی اردو کو بھی ہندوی ہی کہا جاتا تھا اس سلسلے میں مولانا قادری رقم طراز ہیں :

" شاہان مغلیہ کے زمانے میں شاہی لشکر و لشکر گاہ کو اردوئے معلی کہتے تھے اور بازار لشکر کو بازار اردو یا اردو بازار لیکن اس زمانے تک زبان کے لیے اردو کا لفظ مستعمل نہ ہوا تھا۔ سب سے قدیم تحریر حضرت امیر خسرو دہلوی کی ملتی ہے وہ اپنے دیباچۂ دیوان میں اپنے اردو کلام کو کلام ہندوی فرماتے ہیں - دوسری قدیم کتاب " سیرالاولیا" ہے جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے ایک خاص مرید حضرت سید مبارک معروف بہ میر خورد کی تالیف ہے - اس میں حضرت بابا فرید شکر گنج کے ایک قول کے متعلق لکھا ہے " فرمود بہ زبان ہندی" اور بھی بعض قدیم تحریروں میں اردو زبان کوزبان ہندی کہا گیا ہے -" (۱)

قادری صاحب نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک جہاں جہاں ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے وہ اس طرح پر ہے کہ پنجاب کے بزرگوں کے اقوال کو پنجابی یا ملتانی کہا گیا ہے - اہل گجرات کی زبان کو گجراتی ، اہل دکن کی زبان کو دکنی اور کبھی بلا امتیاز ان سب زبانوں کو زبان ہندی بھی کہدیا گیا ہے - لیکن نواح دہلی و آگرہ کی زبان کو اکثر زبان " ہندی" ہی کہا گیا ہے - اس سلسلے میں قادری صاحب لکھتےہیں :

" سورسینی پراکرتوں نے قدیم زمانے ہی سے مختلف علاقوں میں مختلف

---

(۱) حامدحسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۱۱

مشکلیں پیدا کرلی تھیں جو امتیاز کے لیے مقامی ناموں سے معروف تھیں، اردو زبان اگرچہ ان سب بولیوں سے مل کر بنی ہے ، پھر بھی اس کا صلی سانچا دہلی اور نواح دہلی کی زبان ہے ۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ دوسرے صوبوں کی مخصوص زبانیں اب بھی الگ الگ رائج ہیں ، لیکن موجودہ صوبجات متحدہ کی زبان وہی زبان ھندی ہے جس نے اب اردو کی شکل اختیار کرلی ہے۔" (۱)
لیکن ھندی کے ساتھ ہی اب زبان کو ریختہ بھی کہا جانے لگا۔ اس وقت نظم اردو کو بھی ریختہ ہی کہا جاتا تھا ۔ چنانچہ ولی دکھنی کا شعر ہے :

" یہ ریختہ ولی کا جاکر اسے سنادو
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

" ریختہ " کے معنی گری پڑی چیز کے ہیں ۔ چنانچہ خواجہ کمال خجندی کہتے ہیں :

" خجم چو شود ریختہ مستی کند آن چشم
از ریختہ ذوق است و طرب دو سر ھندو

ریختہ کو ان معنی میں استعمال کرنے کے علاوہ فارسی شعرا اس کلام کو بھی ریختہ کہتے تھے جو مختلف زبانوں سے مرکب ہو ۔ قدیم شعرائے اردو کے کلام میں فارسی و ھندی دونوں زبانیں ملی جلی ہوتی تھیں اس لیے اس کو ریختہ کہا جانے لگا ۔ اور یہ لفظ اس قدر عام ہوا کہ ہر قسم کی نظم اردو کو ریختہ ہی کہا جانے لگا۔ اور چوں کہ عربی و فارسی اور ھندی و ترکی سے مل کر بنی ہے اسی مناسبت سے اس کا نام بھی زبان ریختہ ہوگیا۔ اور انیسویں صدی عیسوی تک اس کو ریختہ ہی کہا جاتا رہا۔ اس امر کے ثبوت میں سعدی کاکوری ، قائم چاندپوری، میر تقی میر اور مرزا غالب کے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں ۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۱۲-۱۱

سعدی کاکوری نے اپنی ایک مخلوط غزل کے مقطع میں غزل کی زبان کو ریختہ کہا ہے ، کہتے ہیں :

" سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے"

قائم چاندپوری کہتے ہیں :

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

میر تقی میر کہتے ہیں :

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

غالب بھی میر کے تتبع میں کہتے ہیں :

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

یہاں میر کے شعر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ ریختہ گوئی کا رواج دہلی سے پہلے دکن میں ہوا۔

مولانا قادری نے یہ تحقیق یہ بات ثابت کی ہے کہ واضح طور پر زبان کے لیے لفظ " اردو" کا استعمال شاہجہاں کے زمانے یعنی سترھویں صدی سے ملتا ہے اور شاہجہاں کی تحریر اپنے زمانے کی اردو زبان میں لکھی ہوئی ملتی ہے ۔ اس کے متعلق عالم گیر شاہجہاں کو لکھتے ہیں :

" آں فرمان عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است " (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۱۳

اٹھارھویں صدی کے دوران شعرائے اردو کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان میں بھی اردو کو ھندی یا ریختہ ھی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے بعض لوگوں کی تحریروں سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اکثر دوسرے صوبوں کے لوگ دھلی اور اس کے اطراف و اکناف میں بولی جانے والی زبان کو اردو کہتے تھے چناں چہ مولانا محمد باقر آگاہ ملفوی دکنی نے جب دکنی اردو میں نظمیں لکھیں تو دیباچے میں ان کی وجہ تصنیف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا ہوں - کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں - لے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں-" (۱)

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں " اردو" صرف دھلی اور اس کے گرد و نواح کی زبان کو تصور کیا جاتا تھا-

مولانا قادری نے بیان کیا ہے کہ جب شاھجہاں نے دھلی کی تعمیر و ترقی اور وسعت و آباد کاری کی طرف توجہ کی تو ایک عظیم الشان لال قلعہ تعمیر کیا دھلی کو شاھجہان آباد کے نام سے موسوم کیا گیا قلعہ کو قلعہ معلی اور شاھی لشکر گاہ کو اردوئے معلی کہا جانے لگا اور جب اردو زبان بھی قلعہ معلی میں داخل ہوئی تو اردوئے معلی کے خطاب سے نوازی گئی-

مولانا قادری کے بیان کی تصدیق سرسید احمد خاں اور مولوی عبدالغفور خاں نساخ دونوں کی کتب سے ہوتی ہے - سرسید احمد خاں لکھتے ہیں :

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو "، محولہ بالا ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص

" جب کہ شاہجہان بادشاہ نے ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ع میں شہر
شاہ جہان آباد، آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا اس زمانے میں فارسی
زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے
لفظوں میں بسبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدیلی ہوگئی غرض کہ لشکر بادشاہی
اور اردوئے معلی میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہوگئی اور
اسی سبب سےزبان کا اردو نام ہوا پھر کثرت استعمال سے لفظ زبان کا محذوف
ہوکر اس زبان کو اردو کہنے لگے - رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی
ہوتی گئی یہاں تک کہ تخمیناً ۱۱۰۰ھ مطابق ۱۶۸۸ع کی بعض اورنگ زیب
عالم گیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔" (۱)

مولانا قادری اور سرسید احمد خان دونوں کے بیانات کی تائید مولوی

عبدالغفور نساخ کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوجاتی ہے :

" زبان اردو روزمرۂ شہر دہلی کو کہتے ہیں - اس شہر میں
قدیم الایام سے برابر زبان ہندی مروج تھی۔ ہر شخص اس زبان میں کلام کرتا
تھا - جب ۵۸۸ھ میں سلطان معزالدین مشہور بہ شہاب الدین محمد غوری نے
ملک ہند پر چڑھائی کی اہل ہند کو شکست دی - رائے پتھورا کا کام تمام کیا
ملک ہند سلاطین غور کے قبضے اختیار میں آیا۔ رفتہ رفتہ زبان قدیم میں لفظ
فارسی، عربی و ترکی ملتا گیا۔ جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت
ہوئے تو باشندگان دہلی پر یہ ایک تازہ، ظلم کیا کہ ان کو شہر میں رہنے نہ
دیا۔ دیوگیر معروف بہ دولت آباد میں بھیج دیا۔ اور پھر قبل سلطنت کے
زوال کے ان لوگوں کو دہلی میں بلالیا۔ اس نقل و حرکت کے باعث بہت سے
الفاظ دکھنی بھی زبان دہلی میں مل گئے - یہی انداز گفتگو آخر عہد
جہانگیر بادشاہ تک رہا - لیکن جب شاہجہاں بادشاہ نے ۱۶۵۸ع میں
شاہ جہان آباد کو آباد کیا تو شاہ جہان آباد میں اطراف و جوانب عالم
سے ہرقسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ مجتمع ہوئے قدیم ہندی

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، کان پور: نامی پریس، ۱۹۰۴ع، ص ۵-۱۰۴

متروک ہونے لگی۔ محاورے میں فرق ہونے لگا - زبان اردو کی ترقی شروع ہوئی -" (۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف قوموں کے میل جول اور اتحاد و اتفاق سے زبان ضرور متاثر ہوتی ہے اس لیے اردو بھی اس اختلاط کے سبب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ جب آریہ ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ "وید" لائے جو بعد میں سنسکرت کے نام سے موسوم ہوئی - بودھ مذہب کے دور میں پالی زبان کو عروج ملا - اور جب ہندوستان میں عربوں کی آمد ہوئی تو یہاں برج بھاشا کا دور دورہ تھا اور یہ پنجاب و سندھ ، یوپی و بہار وغیرہ میں عام تھی اس کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں :

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے - اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو -" (۲)

مسلمان اول اول سندھ و پنجاب میں وارد ہوئے ان کی زبان سے برج بھاشا بھی متاثر ہوئی اور بہت سے اسلامی الفاظ اس میں شامل ہوتے گئے - اس طرح برج بھاشا کے بھی بہت سے الفاظ مسلمانوں کی زبان میں گھل مل گئے - منوچہری، سنائی، مسعود سعد سلمان اور ابو عبداللہ وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے زبانوں کے باہمی اختلاط و ارتباط کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے -

جب مسلمان فاتحین آگے بڑھے تو پنجاب و گجرات اور دہلی تک اردو کی اشاعت

---

(۱) دساغ ، مولوی عبدالغفور خاں ، " رسالہ ، تحقیق زبان ریختہ" ، مطبوعہ ۱۸۹۰ء ، بحوالہ " داستان تاریخ اردو" ، محولہ بالا ، ص ۳-۳

(۲) آزاد ، محمد حسین ، " آب حیات" ، بحوالہ " داستان تاریخ اردو" ، محولہ بالا ، ص ۲

ہوگئی - حضرت امیر خسرو (۱۲۵۵) اردو زبان کے سب سے پہلے شاعر اور ان کی تصنیف خالق باری اردو کی سب سے پہلی تصنیف جاتی ہے - ان کے ہی ایک اور ہم عصر بزرگ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بھی ۱۳۰۸ھ میں اردو کا ایک رسالہ " اخلاق و تصوف " پر تصنیف کیا میر نذر علی درد کاکوری کے بقول یہ اردو کی پہلی تصنیف ہے - اس کے متعلق لکھتے ہیں :

" سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں زبان ہندی کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے - میں نے اپنے بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحے کی ہے - اس کے ۱۱۸ صفحے کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے :

" اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے - ہوا سب خدا میں ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات ہے -" (۱)

مولانا آزاد کے اس نظریے پر کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے ڈاکٹر مسعود حسین خان تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ان کی نظر شمالی ہند کی بولیوں کے باریک اختلافات پر نہ تھی اسی لیے برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دے بیٹھے، حالاں کہ اردو اور برج بھاشا میں صوتی ، صرفی اور نحوی اختلافات کے علاوہ اسماء افعال اور مصادر کا بڑا فرق ہے -" (۲)

حافظ محمود خان شیرانی بھی آزاد کے نظریے سے اتفاق نہیں رکھتے وہ بھی

---

(۱) درد کاکوری، میر نذر علی،" اردو کی ابتداء" (مضمون) " نگار"، لکھنو : دسمبر، ۱۹۲۵ع ، ش ، ص

(۲) مسعود حسین خان، ڈاکٹر، " تاریخ زبان اردو"،

اپنی کتاب " پنجاب میں اردو" میں برج بھاشا اور اردو کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے

رقم طراز ہیں :

" جب ہم اردو کے ڈول ، اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے ۔ دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریبہ رکھتی ہے ۔ برج سے چند ترمیمیں قبول کرلینا یا الفاظ مستعار لے لینا دوسری بات ہے لیکن جہاں برج سے اس نے الفاظ مستعار لیے ہیں وہاں برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے ۔ برج پر کیا موقوف ہے ، ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں ۔" (۱)

جس وقت مسلمان دہلی میں وارد ہوئے تو دوآبہ (گنگا اور جمنا کے درمیان کا علاقہ) میں برج بھاشا بولی جاتی تھی۔ دہلی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان ہریانی، برج بھاشا اور راجستھانی کا سنگم ہے ۔ گریرسن نے ہریانی زبان کو دہلی میں شامل کردیا حالاں کہ وہ کوئی علاحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے کیوں کہ وہ پرانی اردو ہے جو گیارھویں صدی میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے ۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۹۳۵ھ) اور امیر خسرو (۷۲۵ھ) دہلی کی زبان کو " دہلوی" لکھتےہیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی ابتدا کہاں سے ہوئی ۔ حافظ محمود خاں شیرانی اور مولوی محمد یحیی تنہا مصنف " سیرالمصنفین" باعتبار صرف و نحو اردو کو ملتانی زبان کے مماثل بتاتے ہیں چناں چہ ان دونوں حضرات کے بیان سے یہ

---

(۱) محمود خاں شیرانی، حافظ :" پنجاب میں اردو"، لاہور: انشا پریس، س ن ، صص: ۳۹-۳۸

نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اردو کا مولد تو پنجاب ہے مگر یہ دہلی میں پل کر جوان ہوئی ہے -

مولانا حامد حسن قادری کا نظریہ اس سے مختلف ہے وہ اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی کیوں کہ پنجاب میں مسلمانوں کے مستقل قیام مختلف ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں اور ان کی زبانوں کے اجتماع، اہل ہند سے تعلقات نے ایک مخلوط زبان کی ضرورت و صورت پیدا کردی، اہل ہند دوسری زبانیں بولتے تھے ، مسلمانوں کی زبان فارسی تھی ضرورت پیدا ہوتے ہی ایک نے دوسرے کی زبان سیکھنی شروع کردی ہوگی لہذا وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آزاد سے بھی متفق نظر آتے ہیں اور اردو کے سانچے کو دہلی و متھرا کے گرد و نواح کی زبان قرار دیتے ہیں- اور وہ زبان جس کا ذکر دہلی اور متھرا کا گرد و نواح تھا دراصل برج بھاشا ہی تھی-

ل - احمد اکبر آبادی کا خیال ہے کہ اردو کی تشکیل متھرا اور آگرہ (اکبرآباد) میں ہوئی ہے اپنے اس قول کے جواز میں وہ لکھتے ہیں :

" اس امر کے ثبوت میں کافی حوالی شہادت ملتی ہے کہ اس مخلوط زبان نے عہد اکبری میں ایک شکل اختیار کرنا شروع کردیا تھا- جس میں اکبر کا مینا بازار بھی ایک معقول حد تک ممد و معاون ثابت ہوا- یہ حقیقت ہمارے پیش نظر ہے کہ تقریباً اسی زمانے میں یہی کام دکن میں بھی جاری تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی تشکیل میں مغلیہ اور قطب شاہی درباروں کو برابر کا درجہ حاصل ہے - لیکن دقّت نظر سے دیکھنے پر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو جس زبان کا نام ہے وہ برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت ہے یا جو برج بھاشا کی بنیاد پر کھڑی ہوئی ہے - اور اس کی تشکیل آگرے ہی میں ہوسکتی تھی - کیوں کہ آگرہ خود برج میں شامل ہے - دکن میں جو زبان بن رہی تھی اس کی بنیاد پر دکھنی بولی پڑتی جو پراکرت ہوسکتی ہے کیوں کہ اس وقت دکن میں پراکرت ہی بولی جاتی تھی - مولف"آب حیات" کو بھی اس معاملے میں مغالطہ ہوا

اور مورخین مابعد بھی آنکھ بند کرکے اسی ڈگر پر چلتے رہے -" تو سپہر"
میں امیر خسرو کے بیان سے یہ بات مصدق ہوجاتی ہے کہ دکھنی ایک
جداگانہ بولی تھی-" (۱)

ل - احمد اکبر آبادی کے اس قول کو مدنظر رکھتے ہوئے بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب اکبر و جہانگیر کے بعد شاہجہان نے دہلی کو دارالخلافہ بنایا تو اس کے بعد بھی عرصے تک آگرہ نہ صرف اہل علم و ادب اور اہل شعر و سخن کا مرکز بنا رہا بلکہ تمام سیاسی امور و تدابیر اور منصوبے بھی آگرے ہی میں عملی جامہ پہنتے رہے- اس لیے یہ بات قرین قیاس ہی نہیں بلکہ یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ شمالی ہند میں تشکیل اردو کا کام آگرے ہی نے انجام دیا - اب اس کو سوائے اکبر آباد کی بدقسمتی کے اور کیا کہا جاسکتا ہے اور پھر وہ دور بھی کچھ ایسا افراتفری اور انتشار کا تھا کہ ہمارے محققین و مورخین کی توجہ بھی اس طرف مبذول نہ ہوسکی ایک خاص بات یہ کہ آگرے سے مرکز دہلی منتقل ہوچکا تھا اس لیے اس کی ویسے بھی کوئی اہمیت نہ رہی تھی- اگر آگرے کے ساتھ یہ بے اعتنائی و مغایرت نہ برتی گئی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ارتقائے زبان اردو کی یہ گم شدہ کڑی از خود مل گئی ہوتی -

باین ہمہ تفحص و تجسس سے آج بھی اس قول کی تصدیق کے سلسلے میں ہم صفیر بلگرامی نے اپنی کتاب " جلوہ خضر" میں ارتقائے اردو کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں :

" امیر خسرو نے اس طفل ہونہار کو نظر توجہ سے دیکھا مگر اکبر نے اس کے سر پر ہات رکھا اور چاہا کہ اس کو سرفرازی کا خلعت بخشا جائے- اور خلعت کی تیاری میں مصروف ہوا- راجاؤں کی بیٹیاں گھر میں لایا - ہزاروں

---

(۱) ل - احمد اکبر آبادی، " ادبی تاثرات"، کلکتہ : انجمن ترقی اردو(ہند) ، ۱۹۶۳ع ، ص ۲۷

سہیلیوں سے اپنا محل بھردیا۔ علما سے ہندی کتابوں کا فارسی ترجمہ کرایا۔ ہندو کو دربار میں دخل دیا اور ان سے بات چیت کا موقع ہر طرح رکھا۔ بیربل کی شوخیاں مشہور عام ہیں ، مکانات ، اوقات اور اشیاء کے نام ہندی، یا ہندی فارسی آمیز رکھ لیے اور محل میں (مینا) بازار بنوایا۔ یہ سب خلعت اردو کے سامان ہیں۔ مگر اس کو بھی زندگی نے مہلت نہ دی ابھی خلعت نا تیار تھا کہ اکبر تمام ہوا۔ حقیقت میں جیسی توجہ اکبر نے ہندیوں کی طرف کی تھی اگر وہ اور زندہ رہتا تو اردو کی صورت اسی وقت میں سب کو نظر آجاتی اور دربار میں یہی زبان شائع ہوجاتی۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ اکبر نے اپنا پایہ تخت اکبر آباد میں مقرر کیا تھا اور ہمیشہ وہیں رہتا تھا۔ دہلی کو اس فیض اکبری سے چنداں حصہ نہ ملا ۔ جہانگیر کے وقت میں بھی مینا بازار قائم رہا۔ شاہجہاں کے دور میں اور ترقی ہوئی کہ یکایک اکبر آباد سے شاہجہاں کا دل اچاٹ ہوا اور دہلی جا بسایا۔ آگرے میں شاہجہاں کے وقت میں اردو کی صورت قائم ہونا اچھی طرح ثابت ہوتا ہے ۔ بادشاہ کے دربار و دفتروں کی زبان فارسی تھی مگر اردو اس کے عہد میں زبانوں پر آچلی تھی۔" (۱)

یہ ایک تاریخی بات ہے کہ اکبر آباد (آگرہ) میں مغلیہ دربار کے قائم رہنے تک زبان میں روانی آچلی تھی دور اول کے شعرا کے کلام میں ہندی فارسی اور اردو کے الفاظ صریحاً ملتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو کو بلاواسطہ عروج ملا اور یہ دکھنی شعرا کی مرہون منت نہ تھی۔

صفیر بلگرامی نے ایک اور جگہ "تزک جہانگیری" کے حوالے سے اپنی کتاب " جلوہ خضر" میں اکبر کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں جو اس نے جہانگیر کی درخواست پر جواباً لکھے تھے:

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت

---

(۱) صفیر بلگرامی، " جلوہ خضر"، ص ۵۵ ، بحوالہ " ادبی تاثرات"، از ل ۔ احمد اکبر آبادی، محولہ بالا ، ص ۲۸

ہوجاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہو سات

"مغل اور اردو" میں بھی " جلوۂ خضر" کے حوالے سے نورجہاں کے یہ دو شعر نقل کئے گئے ہیں :

دیں جگہ زخم وفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بے باک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق
تیری قدموں سے جدا ہوکے ملے خاک میں ہم

اردو کی ابتدا اور ارتقا اکبر ہی کے زمانے سے ہو چلا تھا اس کی مثال خود اکبر کے کلام سے ہمیں ملتی ہے کہ جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبر و جہانگیر دلہن کی پالکی کو اپنے کندھوں پر اٹھاکر لے چلے تو راجہ نے کہا:

"ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم باندگلام ہے "

یہ سن کر اکبر نے برجستہ جواب دیا :

"تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار ہے" (۱)

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ اگرچہ شاہی و کتابی زبان مدت تک فارسی رہی لیکن کاروباری اورعوامی زبان اردو ہی تھی۔ اس کے علاوہ ہندی شعراء مثلاً کبیرداس ، تلسی داس ، گرونانک اور سورداس وغیرہ کے دوہوں میں بھی عربی فارسی زبان کی شمولیت نے اردو کے رنگ کو نکھار دیا تھا جس کو ہم شمالی ہند میں اردو شاعری کا سنگ بنیاد کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن اردوشاعری کے لیے ایک اور چیز جو ضروری ہے اس میں فارسی بحریں بھی شامل ہیں ۔ مگر اس اعتبار سے بھی شمالی ہند پیچھے نہیں ہے ۔

---

(۱) عبدالغنی، پروفیسر محمد ، " تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطین مغلیہ " ج سوم ، بحوالہ "داستان تاریخ اردو" ص ۳۰

دوری اعظم پوری اکبر بادشاہ کے زمانے کا شاعر ہے اس کا یہ شعر میر حسن کے تذکرۂ شعرا سے نقل کیا جاتا ہے :

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد

بے چارۂ دوری نہ کری ہے نہ ڈری ہے

سعدی کاکوری بھی اکبر کے زمانے میں تھے ان کی غزل کا ایک شعر ہے :

ہم نا تمی کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ بہت ہے

افضل جھنجھانوی ، تلسی داس کے ہم عصر تھے انھوں نے بھی اکبر و جہانگیر کا زمانہ دیکھا تھا انھوں نے ایک اردو مثنوی اور ایک طویل اردو نظم " باوہ ماسہ" کے نام سے لکھی ہے ۔ انھوں نے ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا۔

پنڈت چندربھان المتخلص بہ برہمن اکبر آبادی بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ آگرہ (اکبر آباد) ہی میں پیدا ہوئے ۔ اول شاہجہان بادشاہ کے دربار میں منشی تھے۔ پھر شاہ زادہ دارا شکوہ کے میر منشی رہے ، ۱۶۶۲ء میں انتقال کیا ان کی غزل کا ایک مطلع ہے :

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے

نہ دل بر رہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے، نہ پیالا ہے (۱)

شہزادی زیب النساء کا ایک مشہور شعر ہے :

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے

خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا (تیسرا ایڈیشن) ، ص۳۲

(۲) خیال، نواب نصیر حسین خان، " مغل اور اردو"، بحوالہ " ادبی تاثرات"، از ل ۔ احمد اکبر آبادی، محولہ بالا ، ص ۲۹

ان امثال سے پتا چلتا ہے کہ دکن میں شاعری کے آگینا نزو متعارف ہونے سے پہلے شمالی ہند میں شعری معیار خاصا تھا اور زبان صاف و شستہ ہوچلی تھی بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ ولی دکنی کی اس زبان سے شستہ تر تھی جو وہ دہلی کا اثر قبول کرنے سے پہلے استعمال کرتے تھے یہ بات بھی خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ اس وقت تک اگر شاعری دکن ہی میں تھی تو پھر دہلی کو وہ کون سی اہمیت و خصوصیت تھی جس کی جانب شاہ گلشن سے ولی کی توجہ دلائی تھی اور ولی نے بھی شاہ صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شمالی ہند کے اسلوب بیان کو اپناتے ہوئے اپنی زبان کو نکھار بخشا ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمالی ہند کا وہ کون سا مقام تھا جس نے زبان و بیان کو یہ سلاست و روانی بخشی لہذا اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجائے گی کہ وہ مقام سوائے اکبر آباد (آگرہ) کے کوئی اور نہ تھا کیوں کہ خان آرزو، مرزا مظہر جانجاناں، مضمون، اور آبرو وغیرہ کی شعری تربیت یہیں ہوئی ۔ انھوں نے آگرے ہی سے زبان و بیان کے اصول سیکھے اور دہلی جاکر جگمگائے ۔

محمد شاہ کا عہد حکومت واقعی بڑے انتشار کا دور تھا لہذا آگرے کی بھی بساط علم و فن بچھی نہ رہ سکی کچھ شعرا و ادبا شاہجہاں کے ساتھ دہلی گئے ، کچھ نے اورنگ آباد کا رخ کیا جو رہ گئے تھے وہ بھی یہ سوچ کر کہ اب آگرہ پایہ تخت نہیں رہا اور شعرا و ادبا کی ایسی ~~قدرو~~ قدردانی جو شاہی دور میں ہوتی تھی ممکن نہیں تو وہ بھی بادل ناخواستہ دہلی جا بسے ۔ لہذا جب ان باکمال لوگوں نے دہلی پہنچ کر بساط شعر و سخن پھر سے بچھائی تو مقامی جوہر قابل کو بھی ابھرنے کا موقع ملا ۔

آگرے سے نقل وطن کرنے والوں میں سراج الدین خان آرزو اور مظہر جانجاناں کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں کیوں کہ اردو کے فروغ و بقا اور عروج و ارتقا میں دور متقدمین

میں جو مقام سراج الدین علی خان آرزو کو حاصل ہے اس کی مزید صداقت کا ثبوت میرحسن کے تذکرے سے بھی مل جاتا ہے:

" سراج الدین علی خان آرزو بعد امیر خسرو و دہلوی ، چنین صاحب کمال و پرگو و خوش گو ، بسامع عالمیان نرسیدہ ہفت دیوان دارد کہ ہریکے پہلو بہ ظہوری و فغانی میزند۔ فکرِ صائب او تزلزل در مکانِ خامیں منتقل انداختہ شاعر فارسی گو ، عالمِ فاضل شہرۂ آفاق در سخن فہمی طاق اُستاد اِین ریختہ شاگرد اُوییند۔" (۱)

خان آرزو کے سلسلے میں میر " نکات الشعرا" میں لکھتے ہیں :

"ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آن بزرگ وار اند"۔

خان آرزو کے سلسلے میں مولانا محمد حسین " آب حیات" میں رقم طراز ہیں :

" خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعوا پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے - تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے - خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پاکر اٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذومعنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی انداز کے مطلب پر لے آئے یعنی مرزا جان جانان مظہر، مرزا رفیع سودا ، میر تقی ، خواجہ میر درد۔" (۲)

مرزا مظہر جان جانان کے سلسلے میں مصحفی " گل رعنا" تحریر کرتے ہیں :

" مرزا مظہر جان جانان نے اس خار زار کو ایسا چھانٹا کہ شاعری بیاض بن گئی - پھر اپنے زور طبع و خدا داد قابلیت سے اچھوتے مضمون اور فارسی ترکیبیں اور اردو کے دل کش محاورں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ

---

(۱) میر حسن،" تذکرہ شعرا"، بحوالہ " ادبی تاثرات " از ل۔ احمد اکبرآبادی، محولہ بالا ، ص ۳۲

(۲) آزاد ، مولانا محمد حسین، " آب حیات" ، بحوالہ " ادبی تاثرات " از ل۔ احمد اکبر آبادی، محولہ بالا ، ص ۳۳-۳۲

خوبی پیدا کی گئاکہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہوں کی بہار تھے اسے سب بھول گئے ۔ حزیں، بیاں، حسرت ، فقیہہ و درد مند نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کرکے اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچادیا۔"

ان دو حضرات کے بعد خدائے سخن میرتقی میر ، اور پیغمبر سخن مرزا غالب کی شخصیتیں ابھریں ان دونوں حضرات کے سلسلے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے ۔ غالب نے اردو شاعری کے علاوہ اردو نثر کو جیسا سلیس و سہل بنادیا جو نیا اسلوب و انداز بخشا اس کی تقلید و تحسین آج تک جاری ہے اور جاری رہے گی ۔ یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ خطوط غالب سے چار سال قبل خواجہ غلام غوث بیخبر اکبر آبادی نے اپنے رقعات کا مجموعہ " خونابہ جگر " کے نام سے مرتب کیا جو ۱۸۹۱ع میں شائع ہوا۔ غالب بھی بیخبر کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور ان کو " قبلہ و مولانا" کے القابات سے یاد کرتے تھے ۔

جرات بھی آگرے سے نقل وطن کرکے گئے تھے اور پھر دنیائے شعر و سخن میں نام پیدا کیا ۔ بہرکیف گیسوئے اردو کو سنوارنے میں اہل اکبر آباد کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے ۔ مگر ان میں سے بیشتر کی عزلت گزینی و گوشہ نشینی کے سبب ان کی شعری و ادبی خدمات منظر عام پر نہ آسکیں ۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر بھی اس عہد میں توجہ دی جانے لگی ہے مگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو نظیر سب سے پہلے فطری و عوامی شاعر ہیں اور آج کی وہ شاعری جسکا شمار جدید اردو شاعری کے ضمن میں ہوتا ہے اس کی داغ بیل حالی و آزاد سے بہت پہلے نظیر اکبر آبادی ڈال چکے تھے۔

تمام اساتذہ اکبر آباد کی خدمات کا جائزہ اک طول امل ہوگا میں اس مقالے میں صرف ان ہی معروف حضرات کا ذکر کروں گا جن کا تذکرہ مولانا قادری نے بھی اپنی کتاب

" داستان تاریخ اردو" میں کیا ہے ۔ ان میں ایک ہستی سید اعظم علی اعظم اکبرآبادی کی ہے ان سے بھی مرزا غالب کے مراسم تھے۔ غالب کے پنج آہنگ میں آپ کے نام بھی فارسی کا ایک رقعہ موجود ہے ۔

مرزا رجب علی بیگ سرور جو لکھنو کے سب سے پہلے مصنف نثر اردو شمار کئے جاتے ہیں اکبر آباد ہی میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اکتساب علم و فن کے بعد لکھنو پہنچے جس کی تصدیق مولانا عبدالحلیم شرر کے مضمون کے ایک اقتباس سے بھی ہوجاتی ہے جو مئی ، ۱۹۱۹ء کو " نقاد" آگرہ میں شائع ہوا ۔ لکھتے ہیں :

" واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان آگرہ و دہلی میں پیدا ہوئی ، اردوئے معلی میں نشو نما پاکے اس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کرلی ۔ شجاع الدولہ ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے زمانوں میں دربار دہلی کی بے استطاعتی اور لکھنو کے نوابی درباروں کی دولت مندی و قدردانی کی وجہ سے تمام صاحبان کمال لکھنو پہنچ گئے ۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اکبر آبادی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی ۔ نثر پر ہمنا بننے کے بعد لکھنو میں آئے ۔" (۱)

دوسرے مصنفین کی طرح مولانا قادری بھی اردو کی ابتدا کے متعلق کوئی ٹھوس نظریہ پیش نہیں کرتے اور نہ ہی وہ کسی ایک نظریے سے متفق نظر آتے ہیں کیوں کہ وہ ایک طرف تو اردو کا مولد و منداو پنجاب کو قرار دیتے ہیں مگر دوسری جانب وہ اس کا سلسلہ برج بھاشا سے بھی ملاتے ہیں۔

پھر کیف اردو زبان کے آغاز کا مسئلہ ابھی تک متنازع فیہ مسئلہ ہے اور اس مسئلے میں اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے اگر اس خاص لسانیاتی الجھن کو قادری صاحب دور نہ کرسکے تو اس سے بحیثیت ایک محقق و مورخ ان کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ انھوں نے " داستان تاریخ اردو" میں اپنی تحقیقی کاوشوں سے بہت سے نئے انکشافات کئے ہیں اور تاریخ ادب کے کئی تاریک گوشوں کو اجاگر کیا ہے ۔ ہم یہاں ان کی تحقیق جدید کی چند نمایاں مثالیں پیش کرتے ہیں۔

اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف :

تاریخ ادب اردو میں دکن کی اولیت ایک مسلمہ حقیقت سمجھی جاتی تھی لیکن

---

(۱) ل ۔ احمد اکبر آبادی ، " ادبی تاثرات " ، محولہ بالا ، ص ۳۷

مولانا حامد حسن قادری کی تحقیق کے مطابق اردو میں سب سے پہلی نثری تصنیف خواجہ
سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ" اخلاق و تصوف " ہے جو ۷۰۸ھ مطابق ۱۳۰۸ع میں
تصنیف کیا گیا ۔ خواجہ صاحب ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ع میں پیدا ہوئے ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی
عمر میں ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ع کو رحلت کی آپ کا مزار کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں ہے
جو آج کل اتر پردیش کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ ۲۰۷ صفحات کی کتاب ایک قلمی نسخہ
کی شکل میں ہے اور خواجہ صاحب کے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات
پر مشتمل ہے ۔ اس کا ایک اقتباس گزشتہ صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے ۔

قادری صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مذکورہ رسالہ اردو نثر کی ہی نہیں بلکہ ار
اردو زبان و ادب کی پہلی کتاب ہے ۔ وہ " داستان تاریخ اردو" میں رقم طراز ہیں :

" نثر اردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے ۔ سید اشرف
صاحب ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ع میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ سال کی عمر کو (بحساب قمری)
پہنچ کر ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ع میں وفات پائی ۔ اب تک ارباب تحقیق متفق الرائے
تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارھویں صدی سے پہلے تصنیف و تالیف نثر کا کوئی
وجود نہ تھا ۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چارسو سال
پہلے اردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگیر کے رسالۂ تصوف کی
دریافت سے وہ نظریہ باطل ہوگیا اور ثابت ہوگیا کہ دکن میں اردو زبان کی
بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیرخسرو اور سید اشرف جہانگیر سمنانی نے
نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔" (۱)

"خالق باری " کا سال تصنیف معلوم نہیں ، لیکن امیر خسرو (۶۵۳ھ/۱۲۵۵ع)
تا ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ع) سید اشرف سے بڑے ہیں اس لیے"خالق باری"کو مقدم رکھا گیا ۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا" کلا داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۳
(تیسرا ایڈیشن)

ممکن ہے کہ سید اشرف جہانگیر کی کتاب پہلے لکھی گئی ہو اور اردو زبان میں تصنیف اولین ہی ہو بہرحال اولیت ان دونوں میں دائر ہے ۔ بعض محققین کی نظر میں " خالق باری " کسی بعد کے مصنف کا کارنامہ ہے تو پھر سید اشرف جہانگیر کی تصنیف رسالہ " اخلاق و تصوف " ہی اردو کی پہلی کتاب ہے ۔

اردو ادب میں نظم و نثر کی تصنیف و تالیف کا سہرا دکن کے سرباندھا جاتا ہے۔ تذکرہ " گل رعنا " کے مولف حکیم عبدالحئی صاحب کے بقول اردو زبان کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے مگر اس سلسلے میں علامہ نیاز فتح پوری تحریر کرتے ہیں :

اگر اردو زبان یا اردو شاعری سے اس کا ترقی یافتہ دور مراد ہے تو اس کا زیادہ سے زیادہ شاہ جہاں کے عہد سے شمار کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے مقصود وہ ابتدائی تغیر ہے جسے ہندوستان کی پراکرت نے فارسی کے امتزاج سے قبول کیا تو اس کا زمانہ یقیناً غزنوی عہد قرار دیا جائے گا جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں کافی ارتباط ہوگیا تھا اور جس کا نہایت قوی ثبوت مسعود سلمان اور ابو عبداللہ کا وہ ہندی کلام ہے جس کا ذکر عوفی نے کیا ہے یہ دونوں پانچویں صدی ہجری کے دوسرے نصف حصے میں پائے جاتے تھے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ارتباط کی زیادتی ہوتی گئی یہاں تک کہ ساتویں آٹھویں صدی میں عام طور پر اس کا رواج ہوگیا اور مشائخ و علما بھی اس میں گفتگو کرنے لگے ۔" (۱)

اگر علامہ نیاز فتح پوری کا یہ قول مد نظر رکھا جائے تو حکیم عبدالحئی کا نظریہ باطل ہوجاتا ہے کیوں کہ دکن میں اردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہندوستان میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیادیں ڈال دی تھیں۔

مولانا قادری نے " داستان تاریخ اردو " میں دکنی ادبیات اردو کا بالتفصیل سلسلہ وار

---

(۱) نیاز فتح پوری ، (مضمون) " نگار " ، لکھنؤ : ۱۹۲۵ء ، ج ، ش ، ص ۸۳

اور عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے ۔ سلطنت بہمنی ، سلطنت عادل شاہی و قطب شاہی وغیرہ کے سب ارباب نثر کی تصنیفات کا اجمالاً ذکر کیا ہے اور سند کے طور پر تحریروں کے نمونے بھی پیش کئے ہیں ۔ شمس العشاق شاہ میران جی کی تصانیف نثر میں سے " شرح مرغوب القلوب " ، " جل ترنگ" اور " گل باس " کا ذکر کیا ہے ۔

اسی طرح ملا وجہی کی " سب رس " میران یعقوب کی ترجمہ کردہ شمائل الاتقیاء جس کے مصنف شیخ برہان الدین اورنگ آبادی تھے۔ ان کا تذکرہ ملتا ہے ۔ " سب رس " کے قصے کے ماخذ پر بحث کرتے ہوئے قادری صاحب رقم طراز ہیں :

" اگرچہ وجہی نے اس کتاب (سب رس) میں کہیں اس امر کا اظہار نہیں کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اصل قصہ اس کے دماغ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے محمد یحیی ابن سیبک فتاحی نیشاپوری (متوفی ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) نے فارسی نظم میں لکھا تھا اس کا نام " دستور عشاق" ہے ۔ فتاحی نے اس قصے کو مختصر طور پر فارسی نثر میں بھی لکھا تھا اور اس کا نام حسن و دل رکھا تھا۔ جس میں ادنا سا تصرف کرکے وجہی نے اردو میں لکھ دیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حسن و دل کی فارسی نثر مقفا و مسجع ہے وجہی نے بھی سب رس میں ایسی ہی نثر لکھی ہے ۔" (۱)

فتاحی کے اس قصے کو بہت شہرت و قبولیت حاصل ہوئی ۔ چارترکی مصنفوں نے اس کو اپنی زبان میں لکھا۔ لامعی اور آہی نے اس کو نثر میں اور والی و خدقی نے نظم میں تحریر کیا۔ دو انگریزوں اور ایک جرمن ڈاکٹر نے بھی اسے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور مع اصل کے شائع کیا۔ ہندوستان میں صلاح الدین صرفی اور داؤد ایلچی نے ۱۰۵۳ھ/ ۱۶۴۳ء میں اس کو فارسی میں بہ شکل مثنوی لکھا ۔ شہنشاہ عالمگیر کے عہد حکومت میں ملا بجاری بیخود (متوفی ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء) نے بھی اس کو نظم کیا پھر ۱۰۹۵ھ/ ۱۶۸۳ء میں خواجہ محمد بیدل نے پر تکلف فارسی نثر میں تحریر کیا۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۳۸

اس سے فتاحی کی تصنیف کی دل کشی اور قدر دانی کا اندازہ ہوسکتا ہے - وجہی کی "سب رس" کی بھی دکن کے شعرا نے قدردانی کی اور وہاں کے دو شاعروں ذوقی اور مجرمی نے بھی اس کو اردو نظم میں لکھا - چناں چہ یہ کہنا کہ "سب رس" ملا وجہی کی تخلیق اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے غلط ہے -

مولانا قادری نے اردو نثر کے اولین دور یعنی دکنی دور کی مکمل اور جامع تفصیلات مع نمونہ ہائے نثر پیش کی ہیں- انھیں جہاں کہیں بھی کسی سے اختلاف رائے ہوا ہے وہیں انھوں نے برملا اپنی رائے کا اظہار کیا ہے - مثلاً "طوطی نامہ" جو "الف لیلی" اور "کلیلہ و دمنہ" کی طرح نہایت مشہور و معروف کتابیں ہیں- اس کے مصنف کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے - یہ کتاب دراصل سنسکرت میں لکھی گئی تھی جس میں طوطے کی زبانی ۷۰(ستر) کہانیاں بیان کی گئی تھیں - مولانا ضیا الدین نخشبی بدایونی نے ان ستر کہانیوں میں سے باون(۵۲) کہانیوں کا انتخاب کرکے ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء میں بزبان فارسی لکھا اور "طوطی نامہ" نام رکھا- نخشبی کے "طوطی نامہ" کو بھی یہ قبول عام حاصل ہوا کہ فارسی میں ابوالفضل نے شہنشاہ اکبر کے عہد میں اس کا خلاصہ لکھا پھر سید محمد قادری نے بھی ان ۵۲ کہانیوں میں سے صرف ۳۵ کہانیوں کو منثور اور بامحاورہ فارسی میں گیارھویں صدی ہجری میں لکھا اور "طوطی نامہ" ہی نام رکھا - ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۹ء میں اسی "طوطی نامہ" کا اردو ترجمہ کیا گیا مگر اس کے مترجم کے سلسلے میں ابھی تک کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی اور وہ ابھی تک پردۂ خفا میں ہے -

ترکی زبان میں اس کا ترجمہ عبداللہ صابری نے کیا- دکنی اردو میں ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۳۹ء کو غواصی نے نظم کیا- ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۵ء میں ابن نشاطی نےبھی نظم کیا- ۱۷۹۲ء کو انگریزی میں جیرانس (Jerance.) نے اس کا ترجمہ کیا- ملا محمد قادری کے فارسی "طوطی نامہ" کا ایک ترجمہ ۱۷۲۹ء میں ہوا - دوسرا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں

سید حیدر بخش حیدری نے کیا اور اس کا نام " طوطا کہانی" رکھا ۔ انگریزی میں گلیڈون

(Gladwin) نے بھی ترجمہ کیا جو فارسی کے ساتھ ۱۸۰۰ع کو کلکتے میں

شائع ہوا۔ جرمنی زبان میں اس کا ترجمہ ۱۸۲۲ع میں کیا گیا۔ ہندی میں حیدر بخش

حیدری کے اردو ترجمے کا ترجمہ ۱۸۸۶ع میں ہوا۔

بہرحال ملا محمد قادری کے اسی " طوطی نامہ " کا اردو ترجمہ جو ۱۱۳۲ھ/

۱۷۲۹ع میں کیا گیا تھا اور جس کا مترجم ابھی تک پردۂ خفا میں ہے اس کی عبارت کا نمونہ

یہ ہے :

" بوجھے سبھی طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان
کی کیفیت و حقیقت یو ہے کہ داستان قصہ ہا و حکایات حضرت نخشبی رحمتہ
اللہ علیہ کی بیچ طوطی نامے کے، ساتھ عبارت سخت موقوف کے لکھے ہیں اس
کے تئیں مفصل و بیان وار واسطے معلوم ہونے تمام لوگوں کی محمد قادری
نیک کرے اللہ تعالی مرتبہ اوس کا بیچ عبارت سلیس اور آسان کے کہ ملی ہوئی
اوپر عبارت خطاب کے ہے و روزمرہ جواب و سوال کہ دولت مندان کے تئیں
لائق ہے لکھے ہیں۔" (۱)

یہ عبارت نہایت عجیب و دل چسپ ہے جس نے لوگوں کو تذبذب میں ڈال رکھا ہے۔

کہ وہ ملا محمد قادری کو اس کا مترجم قرار دیں یا کسی اور کو ، مولانا احسن مارہروی کا

استدلال اس سلسلے میں درست تسلیم کیا گیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اول تو پرانے طریقۂ بیان میں اپنے نام کے ساتھ مترجم و مولف انکسار
آمیز الفاظ ضرور لکھتے تھے ۔ دوم یہ کہ اپنے لیے تعظیمی ضمائر جمع کا استعمال
نہ ہوتا تھا۔ یہ دونوں پابندیاں اس ترجمے میں نہیں ہیں اور اس بنا پر یہ
ترجمہ محمد قادری کا نہیں ہے ۔" (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "داستان تاریخ اردو" بحوالہ بالا تیسرا ایڈیشن) ، ص ۵۱

(۲) احسن مارہروی ، " نمونہ منثورات"،

مولانا قادری اس عبارت کے اس طرح واقع ہونے کے سلسلے میں کوئی قیاس قائم نہیں کرتے اور وہ اس کا مصنف محمد قادری ہی کو تسلیم کرلیتے ہیں اس لیے کہ عبارت کے مفہوم سے یہ ظاہر ملتا ہے کہ مترجم نے یہ عبارت بطور تمہید (دیباچہ) اپنی طرف سے لکھی ہے اسی لیے مصنف کا نام تعظیم سے لیا ہے لیکن جب عبارت کے مفہوم پر غور کیا جاتا ہے تو وہ فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں جس کی مثال یہ ہے :

" بعدهے سعی طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کے کیفیت و حقیقت پر ہے ، بعد از کوشش کی صفت و ثنائے خالق زمین و آسمان کیفیت و حقیقت آں است "

مولانا قادری کے نزدیک مولانا احسن مارہروی کا یہ استدلال درست معلوم ہوتا ہے۔ مگر ترجمہ کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ قیاس باطل ٹھہرتا ہے اس کےمتعلق مولانا قادری کی رائے ہے :

" اگر لکھنے والا اپنی طرف سے لکھتا تو ایسی عبارت نہ لکھتا ۔ اٹھارھویں صدی میں زبان بہت کچھ صاف اور باقاعدہ ہوگئی تھی۔ ترجمے کی یہ حالت البتہ اس کے بعد تک رہی ہے اس لیے یہ عبارت ضرور ترجمہ ہے ۔ اب ان مشکلات کا حل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ترجمہ کرتے کرتے جب نام پر پہنچا تو اس کا جی نہ چاہا کہ محمد قادری نے جس طرح اپنا نام لکھا تھا اس کا بجنسہہ ترجمہ کردیا اس لیے تعظیمی طریقے سے نام لکھا نہ یہ کتاب ایسی تھی نہ یہ مقام ایسا کہ اپنی طرف سے کوئی تصرف جائز نہ ہو ۔" (۱)

یہ مولانا قادری کی ادبی تحقیق کا ایک نمایاں پہلو ہے کہ وہ محض سنی سنائی باتوں اور غیر مستند حوالوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جب تک وہ فراہم شدہ مواد کی پوری طرح تحقیق و تصدیق نہیں کرلیتے اس پر قلم نہیں اٹھاتے ۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، (تیسرا ایڈیشن)، ص ۵۱

دکنی دور کی ادبی نثر کے بعد نثر کا دوسرا دور شمالی ہندوستان میں ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۲ء سے ۱۲۱۵ھ / ۱۷۹۹ء تک ہے - اس سلسلے کی ابتدائی اردو تصنیف " دہ مجلس" یا " کربل کتھا" ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب " روضتہ الشہدا" کا ترجمہ ہے - قادری صاحب کا خیال ہے کہ اس کا مصنف لا معلوم ہے - عام طور پر فضل علی فضلی ہی کو اس کا مصنف تصور کیا جاتا ہے مگر تذکرہ نویس اس سلسلے میں اختلاف رکھتے ہیں مولانا احسن مارہروی نے بھی فضلی کے متعلق صرف تحقیقات کا خلاصہ بیان کیا ہے -

قادری صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" جب مسٹر فیلن (FALLON) یا مولوی کریم الدین اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ " اس کتاب کو تمام میں نے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھی -" اور انھوں نے فضل علی نام لکھا ہے تو مولانا نے فضل اللہ نام کو کیوں ترجیح دی - دوسرے یہ کہ جب اس فضلی کا شیعہ ہونا ظاہر ہے تو مولانا نے اس کو حنفی و نقشبندی کیوں تسلیم کرلیا - تذکرۂ " محبوب الزمن" میں جن بزرگ شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی ، حنفی نقشبندی کا ذکر ہے وہ یقیناً یہ فضلی نہیں کوئی اور ہیں" -(۱)

" دہ مجلس ، یا " کربل کتھا" کے اس تحقیقی مطالعہ کے بعد مرزا محمد رفیع سودا کے دیوان مرثیہ کا اردو میں لکھا ہوا دیباچہ ،"مولانا شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن اور شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کا ذکر کیا گیا ہے - قادری صاحب میں بحیثیت مورخ ادب اک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی ادبی تصنیف کو پیش کرتے وقت اس کے عہد اور سن تصنیف کا تعین ضرور کرتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ہر طرح کے نمونہ ہائے تحریر بھی پیش کرتے جاتے ہیں تاکہ قاری کو خود بھی تجزیہ کرنے میں مدد ملےاور ساتھ ہی وہ اسلوب نگارش

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ،(تیسرا ایڈیشن) ، ص ۵۷

کے محاسن و معائب پر بھی یہ لوگ تبصرہ کرتے چلتے ھیں ۔ مثلاً میر عطا حسین تحسین کی نو طرز مرصع ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں مکمل ھوئی ۔ اس کے اسلوب کی وضاحت کے لیے انھوں نے ایک دو نھیں بلکہ تین قسم کے نمونے پیش کئے ھیں۔ ایک مقام پر عبارت ثقیل و دشوار فہم ہے دوسرے مقام پر اس سے کچھ سہل ہے اور تیسرے مقام پر اس سے بھی صاف و سلیس ہے اور آخر میں خود بھی اس پر یوں تبصرہ کرتے ھیں :

" نو طرز مرصع میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کی اتنی کثرت ہے کہ بعض فقرے دشوار فہم ھونے کے علاوہ مذاق سلیم کے لیے نہایت ثقیل و مکروہ ھیں ۔ ھرجگہ دو چار فقروں کے بعد عربی و فارسی ترکیبیں اور صنعتیں ضرور آجاتی ھیں، محاوروں کے علاوہ کہیں کہیں پرانا غلط املا بھی پایا جاتا ہے۔" (۱)

قادری صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ان یورپین مصنفین اردو کی تصنیفات و تالیفات کا تذکرہ ہے جو اوراق پریشاں کی صورت میں ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ انھوں نے تلاش بسیار کے بعد یورپین مصنفین کے سلسلے کی تمام کڑیاں دریافت کیں۔ قادری صاحب نے تحقیق سے پتا چلا یا کہ انگریزوں نے اردو نثر بھی لکھی ، اردو زبان میں شاعری بھی کی اور بعض صاحب دیوان شاعر بھی ھوئے ۔ ملکہ وکٹوریہ نے بھی اردو زبان کی تحصیل کے لیے منشی عبد الکریم کو آگرے سے لندن بلوایا اور اردو سیکھنے کے بعد وہ اس زبان میں لکھنے پڑھنے اور دستخط کرنے لگیں ۔ قادری صاحب کی تحقیق کے مطابق جان جوشواکیٹلر (JOHN JOSHWA KATTER) وہ پہلا یورپین اردو مصنف ہے جو ۱۷۱۱ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ھندوستان آیا اور تین سال سورت میں رہا اس نے ۱۷۱۵ء میں " صرف و نحو ھندوستانی" کے نام سے اردو زبان کی گرامر

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۶۹

لکھی جسے بعد میں ڈیوڈ مل (David Mill) نے ۱۵۴۳ع میں شائع کیا یہ کتاب لاطینی زبان میں ہے اور ہندوستانی الفاظ و عبارتیں رومن حروف میں لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عیسی کی مشہور دعا کا اردو ترجمہ بھی درج ہے جسے نمونے کے طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے :

" ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے ، پاک ہوئے تیرے نام، آئے ہم کن ملک تیرا ہوئے راج تیراجوں آسمان تر جمیں (زمین) میں روٹی ہمارے دہ تمی، ہم کو آج دے اورمعاف کر تقصیر اپنی ہم کوں، جو معاف کرتے اپنے (اپنے) قرض داروں کو، نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں، بلکہ ہم کوں کھس کر اس برائی سے ، تیری پہنچتی سواری عالم کیری حمایت میں، آمین۔" (۱)

اس کے بعد قادری صاحب نے ان مختلف اہل یورپ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اردو زبان کی کتب اور لغات لکھیں مثلاً پادری بنجمن شلز (BENJAMIN SHULZ) نے زبان اردو کی قواعد لاطینی زبان میں لکھی جو ۱۷۴۴ء میں طبع ہوئی - اسی مصنف نے ۱۷۴۸ع میں بائبل کا اردو میں بھی ترجمہ کیا۔ ڈیوڈ مل (DAVID MILL) نے ۱۷۴۳ع میں ہندوستانی حروف تہجی پر ایک کتاب تصنیف کی - ۱۷۴۸ع میں جی اے فرٹز (G.A. FRITZ) نے اردو کے حروف تہجی اور دیگر زبانوں کے حروف تہجی سے (KASIANO, BAILEY GATEY) نے بھی حروف تہجی پر ایک رسالہ الفابیٹم برہمانکم (ALPHA BETAM BRAHMANICUM) کے نام سے ترتیب دیا۔ ۱۷۷۲ع میں ہیڈلے (HEADLEY) نے اردو کی گرامر (صرف و نحو) لکھی - پرتگالی زبان میں بھی ۱۷۷۸ع میں اردو کی قواعد لکھی گئی اور گرمیٹیکا اندوستانا

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، (تیسرا اڈیشن) ، ص ۸۲

گریمیٹکا اندوستانا (GRAMMATICA INDOSTANA) کے نام سے شائع ہوئی -
ڈف (DEFF) نے بھی تمام ہندوستان کے دوران ہندوستانی گرامر لکھی جو
لندن میں شائع ہوئی - اس شخص نے کلکتے میں رہ کر اردو ، سنسکرت اور بنگالی کی
تحصیل کی تھی- ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی رائے ہے کہ اس نے اردو قواعد میں بہت
غلطیاں کی ہیں- کپتان جوزف ٹیلر (CAPTIN JOSEPH TAYLOR) نے اردو
انگریزی لغت اور گلیڈون (GLADWIN) نے فارسی ہندوستانی لغت ترتیب دی-
کپتان تھامس روبک (CAPTIN THOMS ROEBECK) نے ایک کتاب " ترجمان
ہندوستانی" لکھی جو لندن میں ۱۸۲۴ء کو اور پیرس سے ۱۸۳۱ء کو شائع ہوئی - جان
شیکسپیئر (JOHN SHAKESPEARE) نے اردو لغت لکھی اور منتخبات ہندی دو
جلدوں میں ترتیب دی - ولیم ٹیٹ (WILLIAM TATE) نے ایک کتاب " مقدمہ
زبان ہندوستانی" لکھی جو ۱۸۲۷ء کو کلکتے سے شائع ہوئی - یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل
ہے - پہلا حصہ قواعد ، دوسرا حصہ لغت اور تیسرا حصہ زباندانی - ایس ڈبلیو برٹن
(S.W. BRITTON) نے " قواعد زبان ہندوستانی لکھی " - اسٹیم فورڈ ارنات
(STAMFORD ARNOT) نے بھی " جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی"
اور " قواعد عربی فارسی و دیو ناگری " لکھی - جیمس آر- بالن ٹائن
(JAMES R. BAUENJNE) نے " ہندوستانی گرامر" لکھی - ڈنکن فاربس
(DUNCAN FORBLES) نے ہندوستانی لغت - برٹرینڈ (BERTRAND)
نے " اردو لغت " اور ریورنڈ جی اسمال (REVEREND G. SMALL)
نے ہندوستانی گرامر" لکھی - ایف - فیلن (F. FALLEN) نے مولوی کریم الدین
دہلوی کی شرکت میں شاعروں کا تذکرہ " شعرائے ہند" کے نام سے ترتیب دیا جو ۱۸۴۸ء میں

شائع ہوا۔ ایک جرمنی عالم جی ۔ ڈی۔ لوپرا ختوکا نے ہندوستانی گرامر لکھی۔ ڈاکٹر ایس ۔

ڈبلیو ۔ فیلن (DR. S.W. FALLEN) نے " ہندوستانی انگلش ڈکشنری" ،

" انگلش ہندوستانی ڈکشنری" ہندوستانی " انگلش قانونی ڈکشنری" ، " انگلش ہندوستانی

قانونی ڈکشنری" چار لغات لکھیں ۔

ان سب یورپین مصنفین میں دو شخصیتیں بڑی نمایاں و ممتاز ہیں ۔ اول ڈاکٹر

جان گل کرائسٹ (DR. JOHN GIL CHRIST) اور دوم فرانسیسی عالم پروفیسر

گاسین دتاسی (Prof. Garcian DeTaccy) ہیں۔

ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی ادبی خدمات :

اردو زبان و ادب پر ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کا بڑا احسان ہے ۔ انھوں نے بیس[۲۰]

سال تک مسلسل اردو کی خدمت کی اور بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں ۔ وہ

فورٹ ولیم کالج کے پہلے پرنسپل تھے ۔ اس میں انھوں نے اردو کی تصنیف و تالیف کا بھی

ایک شعبہ قائم کیا ۔ لغات، قواعد اور تاریخ کی کتب خود بھی لکھیں اور ہندوستان کے

لائق و فائق اہل قلم مسلمانوں اور ہندوؤں کو جمع کرکے ان سے اردو میں بہت سی کتابیں

ترجمہ و تالیف کرائیں ۔ اس طرح انھوں نے اس زمانے میں ایسا ادب پیدا کردیا جو آج بھی

اردو میں اپنی نوعیت و افادیت کے سبب بڑی قبولیت و اہمیت رکھتا ہے ۔ اس کالج کے

مصنفین میں میرامن دہلوی، میر شیر علی افسوس ، میر مہدی علی حسینی ، سید حیدر بخش

حیدری، مرزا کاظم علی جوان ، نہال چند لاہوری، للو لال جی، بینی نرائن ، مظہر علی

خان ولا ، مرزا علی لطف وغیرہ نے بہت سی کتابیں مثلاً " باغ و بہار" ، " باغ اردو" ،

" آرائش محفل" ، " طوطا کہانی" ، " سنگھاسن بتیسی" اور" گلشن ہند" وغیرہ لکھیں۔

جان گل کرائسٹ نے اردو کی مندرجہ ذیل کتب لکھیں :

۱۔ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری(مطبوعہ ۱۷۹۳ء)

۲- هندوستانی گرامر، (مطبوعہ ۱۷۹۶ع)
۳- اورینٹیل لنگوئسٹ (مشرقی زبان داں) ، (مطبوعہ ۱۷۹۸ع)
۴- خلاصۂ مشرقی زبان داں ، (مطبوعہ ۱۸۰۰ع)
۵- فارسی فعل کا نظریۂ جدید مع مترادفات هندوستانی ،
(مطبوعہ ۱۸۰۱ع)
۶- قصص مشرقی ، (مطبوعہ ۱۸۰۲ع)
۷- رہنمائے زبان اردو ، (مطبوعہ ۱۸۰۳ع)
۸- هندی عربی کا آئینہ ، (مطبوعہ ۱۸۰۳ع)
۹- قواعد اردو ، (مطبوعہ ۱۸۰۹ع)
۱۰- اردو رسالہ گل کرائسٹ ، (مطبوعہ ۱۸۲۰ع)
۱۱- انگریزی هندوستانی بول چال ، (مطبوعہ ۱۸۲۰ع)

یورپین مصنفین میں اردو کا سب سے بڑا مصنف و عالم فرانسیسی پروفیسر گارسین دتاسی (GARCIN DETASSY) ہے - یہ فرانسیسی عالم و مستشرق تھا اس کو اردو زبان و ادب سے اس قدر لگاؤ تھا کہ فرانس میں رہتے ہوئے بھی وہ اردو زبان کی روز افزوں ترقی اور وسعت و ہردلعزیزی کا جائزہ لیتا - اپنے دوستوں ، عزیزوں و حکام کی مدد سے اردو سے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرکے لیا کرتا تھا اور ہرسال کے آخر میں اپنی یونی ورسٹی میں اس سال کے دوران ہونے والی اردو کی تمام ترقی و رفتار پر ناقدانہ انداز سے روشنی ڈالتا - وہ اپنے ان لیکچروں میں شعر و ادب، تصنیف و تالیف اخبارات و رسائل اور مصنفین کے اذکار و افکار سب کا احاطہ کرلیا کرتا تھا- اس طرح اس نے ۱۸۵۰ع سے لے کر ۱۸۶۹ع تک انیس لیکچر دئیے[19] جن کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن نے" خطبات گارسین دتاسی" کے نام سے شائع کیا ہے - اس کے علاوہ اس نے " اردو زبان کی تاریخ " اور دیگر کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جو مذہب ، فلسفہ ، علوم و فنون ، تصوف ، تاریخ ، سیرت ، قصص ، شاعری اور تذکرہ شعرا پر مشتمل ہیں-

گارسین دتاسی کے ان خطبات نے اردو کے سرمایے میں خاصا اضافہ کیا ہے اس سے اردو کے بہت سے کارنامے نمایاں ہوئے ہیں اور تحقیقی و تاریخی کام کرنے والوں کو ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں جو بظاہر نایاب معلوم ہوتی تھیں۔ بخوف طوالت ہم ذیل میں صرف اس کی ان تصنیفات و تالیفات کی فہرست پیش کرتے ہیں جو مولانا قادری نے اپنی کتاب " داستان تاریخ اردو میں پیش کی ہے -

		سن طباعت
۱-	پند آمیز حکایات کا ترجمہ	(۱۸۲۱ع)
۲-	انتخاب کلام میر تقی میر مع ترجمہ زبان فرنچ	(۱۸۲۶ع)
۳-	قصہ کامروپ مصنفہ تحسین الدین(فرنچ ترجمہ)	(۱۸۳۴ع)
۴-	انتخاب کلام ولی اورنگ آبادی	(۱۸۳۶ع)
۵-	کتب جات عربی، فارسی ، اردو	(۱۸۲۶ع)
۶-	ذکر تذکرہ جات مشتمل برحالات شعراء و مصنفین ہندی اردو	(۱۸۳۸ع)
۷-	مسلمانان مشرق کا علم عروض عربی، فارسی و اردو	(۱۸۳۴ع)
۸-	ہندوؤں کے کہانی جن کا ذکر اردو کتابوں میں ہے	(۱۸۳۳ع)
۹-	انتخاب قصہ گل بکاؤلی مع ترجمہ زبان فرانسیسی	(۱۸۳۵ع)
۱۰-	اردو زبان کا ابتدائی رسالہ	(۱۸۳۳ع)
۱۱-	سعدی دکھنی (۱) ہندوستان کا ایک مشہور شاعر	(۱۸۳۳ع)
۱۲-	تذکرہ شعرائے اردو (دو جلدوں میں)	(۱۸۳۷ع)
۱۳-	انتخابات اردو ہندی	(۱۸۵۴ع)
۱۴-	تذکرہ مصنفین و تصانیف اردو	(۱۸۶۸ع)
۱۵-	خطبات متعلق زبان اردو ۶۹-۱۸۵۰ع	(۱۷۷۴ع)
۱۶-	خطبات متعلق زبان اردو ۸۷-۱۸۷۷ع	
۱۷-	تذکرہ شعرائے اردو(تین جلدوں میں) پہلے تذکرہ مذکورنمبر۱۲ کا ترمیم شدہ اڈیشن مع اضافہ مقدمہ مشتمل بر تاریخ زبان و	

---

(۱) اس سعدی کو دکھنی ماننے میں گارسین دتاسی نے غلطی کی۔ یہ شاعر مخدوم کمال الدین سعدی ہیں اور کاکوری کے رہنے والے ہیں۔

اصناف شاعری ۔ اس میں تین ہزار اردو هندی شعرا ٔ
و مصنفین کا تذکرہ هے ۔ (۱۸۷۰ء)

گارسین دتاسی (GARCIN DETACCY) کی جملہ تصنیفات شعر و ادب سے متعلق تھیں لیکن ولیم میکفرسن (WILLIAM MACPHERSON) نے ایک قانونی کتاب " دستورالعمل عدالت " کے نام سے مرتب کی ۔ اسی طرح علم طبیعات (PHYSICS) کے سلسلے میں ایک کتاب آگرہ کالج آگرہ کے اسسٹنٹ پروفیسر جان ولیم پیل (JOHN WILLIAM PEAL) نے ترتیب دی جو مطبع مصور آگرہ سے ۱۸۵۴ء میں شائع هوئی ۔ مولانا قادری نے یورپین مصنفین کے علاوہ اردو کے عروج و ارتقا کے سلسلے میں عیسائی مشنریز کا بھی ذکر کیا هے ، جنھوں نے بالواسطہ اردو زبان کی وسعت اور اردو لٹریچر کی کثرت میں سعی کی ۔ کیوں کہ انیسویں صدی میں اردو کے ٹائپ اور لیتھو کے چھاپے خانے قائم هوجانے کے سبب بائبل کی اشاعت کثرت سے هونے لگی جن کا ذکر سرسید احمد خاں اور گارسین دتاسی نے اپنے خطبات میں کیا هے ۔

بیسویں صدی میں اگرچہ انگریزوں کی اردو تحریروں کا سلسلہ ختم هوگیا لیکن اردو زبان سے دلچسپی اور اس سے متعلق تالیفات کا سلسلہ جاری رها۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں گراهم بیلی (GRAHAM BAILEY) نے ایک مختصر تذکرہ " هسٹری آف اردو لٹریچر" (HISTORY OF URDU LITERATURE) کے نام سے انگریزی میں لکھا اور لندن سے شائع کیا۔ اس سے اس دور میں اردو کی جو شمع گیری تھی اس کا اندازہ بخوبی هوسکتاهے۔ اردو کے دلدادہ خواہ وہ هندوستان میں هوں یا انگلستان میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہناتے رهے ۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے هوئے مولانا قادری لکھتے هیں :

" ابتدائے زبان اردو اور دکنی کی تصانیف اردو سے لے کر عصر حاضر تک کےمشہور اور خاص خاص شاعروں اور مصنفین کا مختصر حال اور ذکر تصانیف

درج کیا ہے - صرف نثر و نظم کچھ نہیں ہے - بعض جگہ غلطیاں بھی کی ہیں- لیکن کتاب کی ترتیب واضح و دل چسپ ہے اور اردو کی رفتار و ترقی کا مجمل اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے - مصنف نے اپنی تصنیف کے زمانہ (۱۹۳۲ء) کے زندہ و موجودہ مصنفین نثر میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا- راشدالخیری اور پریم چند تک کو چھوڑ دیا ہے - شاعروں میں سے صرف ڈاکٹر اقبال کو لیا ہے - حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کا بھی نام نہیں لیا-"

مولانا قادری نے تمام یورپین مصنفین کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں- یورپین مصنفین کی ان ادبی خدمات کا تذکرہ اردو ادب کی کسی تاریخ میں اتنا جامع اور مفصل نہیں ملتا- دکھنی دور کے نثری کارناموں اور اردو کے سلسلے میں یورپین مصنفین کی ادبی خدمات کا بیان قادری صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مزاج کا عکاس ہے - انھوں نے بڑی تحقیق و تلاش کے بعد ان ماخذوں اور نادر قلمی نسخوں کا پتا چلایا جو مختلف جگہوں پر بکھرے پڑے تھے-

اردو نثر کا تیسرا دور فورٹ ولیم کالج سے متعلق ہے اس دور کا پہلا جائزہ بھی قادری صاحب کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے - فورٹ ولیم کالج کے متعلق مولوی محمد یحییٰ تنہا کی " سیرالمصنفین " رام بابو سکسینہ کی " تاریخ ادب اردو" اور مولوی سید محمد صاحب کی " ارباب نثر اردو" میں ان کی ادبی خدمات کا تذکرہ تو ضرور ملتا ہے مگر مولانا قادری نے جو انداز اختیار کیا اور جس خصوصیت سے ان مصنفین اُردو یا ہی کے کارناموں پر روشنی ڈالی وہ ان ہی کا حصہ ہے - صاحب " ارباب نثر اردو" نے صرف چند مصنفین کا تذکرہ ہی ضروری سمجھا اور دوسروں پر کوئی خصوصی توجہ نہ دی مگر قادری صاحب نے اس سلسلے کے تمام مصنفین اور ان کی تصنیفات اور تالیفات کا بھی جائزہ لیا-

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا (تیسرا ایڈیشن)، ص ۹۳

فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں شائع ہونے والی کتابوں کی ادبی حیثیت متعین کی ، ان پر باقاعدہ نظر بھی ڈالی اور ان کا محاکمہ بھی کیا جس کے باعث نہ صرف تحقیق بلکہ اس کے دوش بدوش تنقید بھی پروان چڑھی ۔ فورٹ ولیم کالج کے زمانے کی کسی بھی کتاب کو لے لیجئے خواہ وہ میرامن کی " باغ و بہار" ہو یا حیدر بخش حیدری کی " آرائش محفل" ، میر بہادر علی حسینی کا " تذکرہ " ہو یا نہال چند لاہوری کی " مذہب عشق" کا بیان ، انہوں نے ہرجگہ مصنف کے حالات زندگی مع نمونہ تحریر و تنقید پیش کئے ہیں۔

اس زمانے میں جب کہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا برصغیر ہند و پاک کے دوسرے مقامات پر اصحاب علم و ادب انفرادی و ذاتی طور پر بھی اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں مصروف تھے اور اس طرح اردو نثر کی کتابیں لکھنے کا کام جاری تھا۔ اگرچہ یہ کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہ تھی مگر فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ایک خاص فائدہ یہ ہوا کہ سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کرکے کام شروع کیا گیا اور اس طرح یہ اپنی نوعیت کا پہلا علمی و ادبی ادارہ یا ندوہ قائم ہوگیا ۔ اردو ٹائپ کے پہلے مطبع کا قیام بھی کالج ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

اس کالج نے تقریباً بیس سال (۱۸۰۱-۲۰ء) تک علمی و ادبی خدمات انجام دیں اور اس عرصے میں کالج کے اٹھارہ مصنفوں نے اردو میں پچاس کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کیں جو کالج کے لیے ایک قابل فخر کارنامہ ہے کیوں کہ اس دوران فورٹ ولیم کالج سے باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اردو کی شاید ہی لکھی گئی ہوں بلکہ جو کچھ بھی لکھی گئیں ان میں سے بیشتر آج تک نہ تو منصۂ شہود پر آئیں اور نہ ہی ان کی اشاعت و طباعت ہوسکی ۔ ایک بات اور جو کالج کی تصانیف کو دیگر تصانیف سے ممیز و ممتاز بناتی ہے یہ ہے کہ پورے کالج کی کوشش تصنیف بھی زبان و بیان اور روزمرہ و محاورہ

کی سلاست کے اعتبار سے میر امن کی " باغ و بہار" اور حیدر بخش کی " آرائش محفل" کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکی -

بیرون کالج جو لوگ دھلی، آگرہ اور لکھنو میں کام کر رہے تھے ہیں تو ان کی فہرست طویل ہے مگر ان میں خاص طور پر جو حضرات قابل ذکر ہیں ان میں محمد حسین کلیم " مترجم فصوص الحکم" ، حکیم شریف خان دہلوی، مترجم " مشکوۃ شریف " موسوم بہ " کاشف المشکوۃ " رفتار اردو کے سلسلے میں ان کا کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ جو موصوف نے حضرت شاہ عبدالقادر دھلوی کے ترجمۂ اردو سے تقریباً بیس سال پہلے لکھا تھا۔ انشا اللہ خان، انشا اگرچہ بطور شاعر مشہور ہیں اور نثر کی تصانیف کا ان کے گرد و پیش کوئی رواج بھی نہ تھا مگر ان کی دو تصانیف اردو نثر میں ان کی ذھانت و فطانت کا ثبوت ھیں - اول " رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی" ، دوم " دریائے لطافت "- اول الذکر خالص ھندوستانی زبان میں لکھی ہے اور عربی و فارسی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا ھے ، جب کہ موخرالذکر فارسی زبان میں ہے لیکن مضمون و موضوع زبان اردو ھی ہے -

" بہ بیں تفاوت رہ از کجا تا بکجا است "

مرزا محمد حسین ، قتیل ، سے " نہرالفصاحت "، " چار شربت " اور دیوان یادگار ھیں - ان کا اردو کے متعلق یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے دریائے لطافت کا دوسرا حصہ جو منطق و معانی اور عروض و قافیہ سے متعلق تھا انھوں نے لکھا - جب کہ پہلا انشا نے - مولوی اسمعیل دھلوی کی " تقویت الایمان" بہت مشہور ہے - اور نہایت صاف و سلیس زبان میں لکھی گئی ہے -

سید اعظم علی اکبر آبادی آگرہ کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے اعلا علمی مذاق رکھتے تھے - ترجمہ "سکندر نامہ" اور " فسانۂ سرور افزا " اردو کی دو تصانیف ھیں - ایک

فارسی مثنوی بھی " اکبر اعظم" کے نام سے لکھی تھی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنؤ کے سب سے پہلے مصنف شمار کئے جاتے ہیں مگر ان کا وطن اکبر آباد تھا وہیں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے ۔ مولانا عبدالحلیم شرر ماہنامہ " نقاد" آگرہ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

" واقعہ یہ ہے کہ دولت مندی و قدردانی کی وجہ سے تمام صاحبان کمال لکھنؤ پہنچ گئے ۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اکبر آباد میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی ۔ شاعر بے ہمتا بننے کے بعد لکھنؤ میں آئے ۔" (۱)

مولانا عبدالحلیم شرر کے اس قول کی تصدیق جناب ل۔ احمد اکبر آبادی کے ایک مضمون" اردو کی شستگی و نفاست میں آگرے کا حصہ " سے بھی ہو جاتی ہے :

" فسانۂ عجائب کا قبول عام اس سے ثابت ہے کہ ایک مدت تک تالیف و تصنیف میں وہی طرز انشا اختیار کی جاتی رہی اور جس طرح آبرو، مضمون، آرزو، مظہر وغیرہ نے دہلی پہنچ کر زبان کو زبان اور شعر کو شعر کے درجے تک پہنچادیا اسی طرح سرور نے آگرے سے کان پور پہنچ کر" فسانۂ عجائب" لکھی اور اس طرح لکھنوی محاورے کی اساس قائم کردی ۔" (۲)

سرور کی تصانیف میں " فسانہ عجائب "، " سرور سلطانی"، " شرر عشق"، شگوفۂ محبت"، " گل زار سرور "، " شبستان سرور"، اور " انشائے سرور" شامل ہیں مگر " فسانہ عجائب" سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اسی سے ان کا نام زندہ ہے ۔ اس سے انھوں نے اردو انشا پردازی میں اپنے لیے ایک انفرادی درجہ قائم کرلیا ہے ۔ آج اس دور میں اس کے اسلوب و انداز کو کیسا ہی پر تصنع اور پر تکلف کیوں نہ سمجھا جائے مگر زمانۂ قدیم میں

---

(۱) ~~[illegible]~~ شرر، مولانا عبدالحلیم " (ایک مضمون) ، " نقاد" (ماہنامہ) ، آگرہ : مئی، ۱۹۱۹ع بحوالہ ادبی تاثرات ص ۳۸

(۲) ل ۔ احمد اکبر آبادی" ادبی تاثرات"، محولہ بالا ، ص: ۳۸

بھی طرز و روش مقبول تھی ۔ اگرچہ یہ داستانی لٹریچر کا جزو ہے مگر اس کے چالیس سال بعد اردو میں جدید ناول نے جنم لے لیا اور ۱۸۶۲ء میں ڈپٹی نذیراحمد نے پہلا ناول " مراۃ العروس" لکھا پھر ۱۸۷۸ء میں سرشار نے " فسانہ آزاد" پیش کیا۔

سرور کی طرح محمد بخش مہجور بھی نثر اردو میں مقفا و مسجع اردو کے قائل تھے اگرچہ یہ اس زمانے کے گم نام مصنف تک ہیں آج صرف " گلشن نوبہار" ان سے یادگار ہے۔

اردو ادب میں فورٹ ولیم کالج سے لے کر سرسید احمد خان کے زمانے تک ہندوستان کے مختلف مراکز میں بعض مصنفین اور ادیبوں نے اردو ادب کی بڑی خدمات سرانجام دیں مگر ان کی خدمات کا کسی مورخ ادب نے جائزہ نہیں لیا اس لحاظ سے اردو نثر کا یہ دور تاریکی میں پڑا ہوا تھا ۔ مولانا قادری نے اس دور کی درمیانی گم شدہ کڑیوں کو بڑی کوشش و کاوش سے ملایا اور کئی غیر معروف ادیبوں کا پتا چلایا جو ان کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے ۔ ان گم نام مصنفین میں سدا سکھ لال ،(۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء ، " مجموعہ قوانین) ، نیم چند کھتری(قصہ گل صنوبر) ، مولوی قطب الدین دھلوی(" ظفر جلیل" اور " مظاہر حق") ، منشی عبدالکریم (ترجمہ الف لیلی) ، ماسٹر رام چندر (" عجائب روزگار" ، اور " تذکرۃ الکاملین") ، منشی چرنجی لال(" مصباح المساحت " اور " تعلیم النفس ") ، مولوی ضیا الدین (" مخزن الطبیعیات ") ، ماسٹر بنسی دھر(" حقائق الموجودات") ، وغیرہ وہ قابل ذکر ہستیاں ہیں جنھوں نے بہت سی مفید اور یادگار کتابیں چھوڑی ہیں۔

بقول مولانا قادری " انڈیا آفس لائبریری ، (لندن)" میں یہ سب کتب موجود ہیں جن میں مطبوعہ بھی ہیں اور غیر مطبوعہ بھی ۔ موصوف نے مطبوعہ کتب کی ایک فہرست جو تیس (۳۰) کتب پر مشتمل ہے " داستان تاریخ اردو " میں شامل کی ہے ۔

انیسویں صدی میں جہاں شمالی ہندوستان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا

وہاں دکن میں بھی چند باکمال ادیبوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں ۔ محمد ابراہیم
بیجاپوری نے جو رجب علی بیگ سرور کے ہم عصر تھے " انوار سہیلی " کا اردو ترجمہ کیا۔
شمس الامرا امیر کبیر ثانی نظام حیدرآباد دکن کے درباری امرا میں سر فہرست تھے۔
علم ریاضی کے بڑے ماہر تھے " شمس الہندسہ " ان کی مشہور تصنیف ہے ۔ اس کے علاوہ
آپ نے کئی رسالے بھی تصنیف فرمائے ۔ محمد عثمان معین نے بھی " لازم الاسلام " کے نام سے
ایک کتاب ترتیب دی ۔ غلام امام خان ترین نے بھی دو کتابیں ایک " تاریخ رشیدالدین خانی "
اور دوسری " تاریخ خورشید جاہی " مرتب کیں۔ شاہ علی نے بھی " تذکرہ " اور " انوار بدیعہ "
دو رسالے ترتیب دیے ۔

مولانا قادری نے دکن کے کم نام ادیبوں کی خدمات کا بھی ذکر کیا اور ان کی
تصانیف سے ان کے اسلوب تحریر کے نمونے بھی پیش کیے اور اس طرح انھوں نے اپنی تحقیقی
کاوش سے " تاریخ اردو " کے خلاء کو پر کردیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا دور اردو نثر کا دور زریں کہلانے کا مستحق ہے ۔ مولانا
قادری نے اس دور کی نثر کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر خصوصی طور پر توجہ دی ہے ۔
مرزا غالب سے لے کر مولانا شبلی نعمانی تک انھوں نے اردو کے نثری ادب کا کوئی ایسا
نمونہ نہیں چھوڑا جو ان کی دسترس میں تھا۔ اپنی کتاب " داستان تاریخ اردو " میں
اس دور کی نثر کا جو تفصیلی جائزہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ مورخانہ و محققانہ حیثیت کا
حامل ہونے کے علاوہ ادبی تنقید کا بھی ایک اعلا نمونہ ہے ۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا
جائے تو ان مایۂ ناز و بلند پایہ مصنفین کے کارناموں کا جائزہ لینا اور ان کی شہرت و
مقبولیت سے مرعوب ہوئے بغیر ان کی تصانیف پر بے لاگ تنقید و تبصرہ کرنا انھیں اردو
ادب کے ممتاز مورخین و ناقدین کی صف میں جگہ دلانے کے لیے کافی ہے ۔ مگر بقول اقبال :

" بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا "[1]

غالب اور سرسید کے معاصرین میں بھی مولانا قادری نے بہت سے غیر معروف ادبا و مصنفین کا سراغ لگا کر ان کی ادبی خدمات پر تبصرہ کیا ہے مجو مندرجہ ذیل ہیں :

۱- یوسف خان کمبل پوش :- حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے - سیر و سیاحت کے لیے گھر سے نکلے اول ہندوستان کی سیر و سیاحت کی - ۲۰ مارچ ، ۱۸۳۷ع کو کلکتے سے لندن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۵ جولائی ، ۱۸۳۸ع کو واپس کلکتے پہنچے - ان کا سفر نامہ " عجائبات فرنگ" اول بار ۱۸۴۷ع میں دہلی سے اور دوبارہ ۱۸۷۳ع میں مطبع نول کشور لکھنو سے شائع ہوا- یہ سفر نامہ اردو میں پہلا سفر نامہ ہے - اس میں مصنف نے سفر اور سفر نامہ دونوں کا حق ادا کردیا ہے - اس کی زبان اگرچہ وہی ہے جو آج سے ڈیڑھ سو دو سو برس پہلے کی ہونی چاہئے یعنی عبارت اکثر مقامات پر مقفا و مسجع ہے لیکن مصنف کے ذاتی تاثرات اور واقعات کے بیان کے سبب ناول و افسانہ کا سا لطف آنے لگتا ہے - اس کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ صرف ایک سیاح کا سفر نامہ ہے جس کی کوئی قومی و ملکی یا مذہبی و تعلیمی غرض باعث سفر نہ تھی -

۲- شاہ محمد قاسم دانا پوری (ابوالعلائی) :- آپ دانا پور (حیدرآباد دکن) کے ایک ذی علم صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور سلسلۂ ابوالعلائیہ کے سجادہ نشین تھے - آگرہ صدر عدالت میں مسل خواں تھے - ایک مرتبہ انگریز حاکم کے روبرو مسل پڑھ رہے تھے ، واقعات مقدمہ نے دل پر ایسا اثر کیا کہ یکایک جذب طاری ہوگیا زور سے " اللہ" کا نعرہ مارا اور مسل پھینک کر باہر نکل گئے - بہت دنوں تک کچہری کا رخ نہ کیا- لیکن انگریز حاکم ان کا بہت مداح اور ان سے بہت خوش تھا - پھر بلوایا اور دفتر والوں کو تاکید کی کہ آئندہ کوئی " اللہ والی مسل" ان کو نہ دی جائے -

آپ نے دو کتابیں" اسرار قاسمی" اور " اعجاز غوثیہ " فارسی میں لکھیں - اول الذکر

کا اردو ترجمہ مفتی انعام اللہ خان نے کیا تھا۔ فارسی کی ان دو کتابوں کے علاوہ آپ نے ایک کتاب " نجات قاسم " بھی تصنیف کی ہے جس میں حضرت امیر ابوالعلا کے حالات و کرامات کا ذکر ہے جو ۱۸۵۷ع میں مطبع اشرف الاخبار آگرہ سے شائع ہوئی -

۳- مفتی اکرام اللہ صدیقی :- ۱۸۳۵ع کو اکبرآباد میں پیدا ہوئے - مفتی انعام اللہ خان کے فرزند تھے - الہ آباد میں مختار رہے تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا - متعدد کتابیں اردو فارسی میں لکھی ہیں مثلاً " لطائف اردو"، "اخبار الواصلین ، تذکرۂ مصنفین"، " قواعد اردو"، " فارسی جدید" ، " مفیدالطلاب " مگر ان میں " تصویر شعرا" خاص چیز ہے جو ۱۸۶۱ع میں مطبع حیدری آگرہ سے شائع ہوئی -

۴- حکیم قطب الدین باطن اکبر آبادی :- ان کے اسلاف طبیب شاہی تھے - آپ کے دادا حکیم سید واجد علی اکبر آبادی مشہور طبیب اور حضرت مولانا فخر الدین کے خلیفۂ خاص تھے- حکیم باطن خود بھی حضرت غلام نصیرالدین دہلوی کے مرید اور نظیر اکبر آبادی کے شاگرد تھے - حکیم باطن نے چار دیوان ، ایک مثنوی اور مختلف منظومات یادگار چھوڑی ہیں- اور ایک عجیب و غریب پرگوئی کا ثبوت یہ دیا ہے کہ تمام مثنوی میرحسن کو مخمس کی شکل میں لکھا ہے یہ مثنوی دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے - اس کا نام " اعجاز رقم " ہے یہ پہلی بار ۱۸۹۲ع میں مطبع ریاض ہند آگرہ سے شائع ہوئی - نثر کی ایک تصنیف بھی " تذکرہ گلستان بے خزاں" کے نام سے شایع کی جو نواب مصطفی خان شیفتہ ، گلشن بے خار" کے جواب میں لکھی گئی تھی کیوں کہ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں نظیر اکبر آبادی کو سوقیانہ و عامیانہ قرار دیا تھا۔

۵- نیاز علی بریشان اکبر آبادی :- شیخ رجب علی صدیقی کے فرزند اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے- ان کی بہترین یادگار " تذکرہ شعر و سخن" ہے - اس

تذکرہ کی ترتیب کے لیے انھوں نے ۱۶ اکتوبر، ۱۸۶۹ء کو آگرے میں ایک عظیم الشان مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ جس کی شہرت دور دراز کے ممالک تک پہنچی - چنانچہ فارسی مستشرق پروفیسر گارسین دتاسی نے اس کے متعلق اپنے خطبہ (۱۸۷۵ء) میں لکھا ہے :

" ایک بڑا مشاعرہ آگرے میں ۱۶ اکتوبر، ۱۸۶۹ء کو ہونے والا تھا
"اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر، ۱۸۶۹ء میں ان شعرا کے لیے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ہے جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔" (۱)

پریشان نے اپنے تذکرے کے لیے تاریخی نام " شعر و سخن" ۱۲۸۶ھ تجویز کیا - اس میں صرف اکبر آبادی شعرا کی ایک سو ایک غزلیات ہیں۔ الہ آباد وغیرہ کے شعرا کی بھی چودہ (۱۴) غزلیں شامل ہیں۔

۲- مولانا عبدالحق خیرآبادی :- مولانا فضل حق خیرآبادی کے خلف اکبر جو ایک متبحر عالم عربی کے بلند پایہ شاعر اور کثیرالتصانیف مصنف گزرے ہیں۔ سرسید احمد خا ن نے " آثارالصنادید" میں اور منشی امیر احمد مینائی نے " انتخاب یادگار" میں مولانا فضل حق کے عربی قصائد کا انتخاب درج کیا ہے -

مولانا عبدالحق ۱۸۲۸ء میں دھلی میں پیدا ہوئے - والد سے تحصیل علوم کی سولہ سال کی عمر میں سند فضیلت پائی - حکومت سے شمس العلماء کا خطاب ملا - آپ اپنے زمانے کے امام فلسفہ مانے جاتے تھے۔آپ نے تقریباً چالیس کتابیں تصنیف کیں جن میں اردو کی ایک کتاب " زبدۃ الحکمۃ " بہت مشہور ہے - یہ منطق کی ایک عمدہ کتاب ہے جو ایک کامل فن اور عالم علم منطق نے تحریر کی ہے - آپ نے اس کتاب میں علمائے سابق کا اختلاف اور ان پر اپنا محاکمہ بھی تحریر کیا ہے -

---

(۱) گارسین دتا سی، پروفیسر(مستشرق فرانسیسی) " خطبات گارسین دتاسی"، محولہ بالا ، ص: ۸۰۲

ان مصنفین کے علاوہ مولانا قادری نے منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی ، مولوی محمد رضا لکھنوی، مولوی محمد علی تحصیل دار وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے ۔ جن کی تصانیف بھی اردو کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہیں ۔ اگر مولانا قادری ان مصنفین کو نظر انداز کرجاتے تو آج دنیائے شعر و ادب میں کوئی بھی ان کے نامں اور کارناموں سے آشنا نہ ہوتا ۔ مولانا قادری کا ان مصنفین اور اردو ادب پر یہ ایک عظیم احسان ہے ۔ مذکورہ بالا یہ تمام حضرات نثر و نظم دونوں پر بھی طرح عبور رکھتے تھے۔ دیبی پرشاد سحر کو تاریخ گوئی میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی رحلت پر انہوں نے یہ تاریخ کہی تھی :

مرد چوں شاعر بے مثل سرور | در جہاں شہر و شعب کرد ظہور
هست جاری بزبان ہر کس | ہائے آمد " الم " و رفت " سرور" (۱)

۱۲۸۳ھ

مولانا قادری نے سرسید کے رفقا میں سے محسن الملک ، وقارالملک اور مولوی چراغ علی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے ۔ عام طور پر مورخین ادب سرسید کے رفقا میں حالی، شبلی اور نذیر احمد کی ادبی خدمات و کارنامے ہی بیان کرتے ہیں ۔ لیکن نثر اردو کے قصر کی تعمیر میں ان حضرات کا بھی بڑا حصہ ہے جسے نظرانداز کرنا کسی طرح سے مناسب نہیں تھا۔

مولانا قادری کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے نامور ادبا کے ساتھ ساتھ کم نام اور غیر معروف ادیبوں کو بھی تلاش و تفحص کے بعد اپنی شہرہ آفاق کتاب " داستان تاریخ اردو" کا جزو بنایا ہے ۔ سرسید احمد خان کے ممتاز رفقا کے کارنامے تو روز روشن کی طرح عیاں ہیں ۔ خواہ وہ مولانا محمد حسین آزاد ہوں یا ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی ہوں یا مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا قادری نے جدید تحقیق کی

---

(۱) سحر بدایونی، دیبی پرشاد ، " تاریخ مرزا رجب علی بیگ سرور" ، " زمانہ" ، مارچ ، ۱۹۱۰ع

روشنی میں اردو کے ان قدیم ادیبوں کی سیر و سوانح ، تصنیفات و تالیفات پر بہت گہری نظر ڈالی ہے اور تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے ۔ اگرچہ اردو نثر کے دور متاخرین کے ادیبوں کے کارناموں کے جائزے میں تنقیدی پہلو زیادہ نمایاں ہے لیکن یہاں بھی مولانا نے جا بجا اپنی محققانہ بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔

" داستان تاریخ اردو" مولانا قادری کی تحقیق و تنقید کا شاہکار ہے ۔ ان کی تحقیق و تنقید کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ناقدانہ بصیرت اور تحقیقی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کی صلاحیت اور تحریرات میں ناقدانہ بصیرت اور تحقیقی جستجو دونوں کا توازن ملتا ہے ۔ وہ نقاد ہوتے ہوئے بھی محقق معلوم ہوتے ہیں اور محققانہ روش پر گامزن رہتے ہوئے بھی نقاد دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیت کا یہ مختصر سا جائزہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے ۔ بقول ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی :" مولانا نے صحت مندی ادب کی پرورش اور ارتقا کے لیے صرف کردی۔ ان کے یہاں نظری اور عملی تنقید میں نہایت خوش گوار ہم آہنگی ملتی ہے ۔ وہ ان نقادوں میں سے نہ تھے جو مغرب کی تنقیدی کتابوں سے اصول و نکات نقل کرکے نہایت عالمانہ مضامین تو ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں لکھدیتے ہیں مگر کسی شعر کا مطلب پوچھئے تو پسینہ آجائے۔"(۱)

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب تک مولانا کی ادبی خدمات کا بجا طور پر اعتراف نہیں کیا گیا ، حالاں کہ مولانانے اردو ادب کی جیسی کچھ خدمات انجام دیں اور " داستان تاریخ اردو" کے ذریعہ جس طرح گم نام اور غیر معروف مصنفین اردو کو بھی زندۂ جاوید بنادیا ہے وہ ان کا ایک جیتا جاگتا کارنامہ ہے اور اس اعتبار سے وہ اردو ادب کے مورخوں اور محققوں

---

(۱) کشفی، ڈاکٹر سید ابوالخیر، " ہمارے عہدکا ادب اور ادیب"، کراچی : جاوید پریس، ۱۹۷۱ء ، ص: ۱۱۳

کی صف میں ایک نمایاں حیثیت کے مستحق ہیں ۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والا دور مولانا قادری کی ادبی خدمات کو یقیناً نظر انداز نہیں کرے گا۔

***

4

پانچواں - باب

مولانا قادری بحیثیت مترجم

پانچواں - باب

مولانا قادری بحیثیت مترجم

اردو نثر کے عروج و ارتقا میں تراجم کو بھی بڑا دخل رہا ہے - تراجم ہی کے ذریعہ سے سلیس اردو نثر نگاری کو فروغ ملا - اس سلسلے میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی خدمات قابل داد ہیں- اس کالج نے مسلسل بیس[۲۰] سال تک یہ خدمات نہایت سرگرمی سے انجام دیں اور اس دوران اٹھارہ ، انیس مصنفین نے پچاس (۵۰) کتابیں تیار کیں جن میں بیشتر کتب تراجم پر مشتمل تھیں- جو بے حد مقبول ہوئیں اور میر امن کی " باغ و بہار" کی پسندیدگی کا حال تو یہ ہے کہ یہ انگریزی، فرانسیسی ، پرتگالی اور لاطینی زبانوں میں بھی ترجمہ کی گئی - میر امن کی کتاب " باغ و بہار" ہی نے ان کے نام کو غیر فانی بنادیا ہے - اس میں انھوں نے دلی کی پر لطف زبان، دل چسپ بیان، اردوئے معلی کے روزمرہ و محاورے ، دل کش فقرے و مکالمے اور موقع بہ موقع طوالت و اختصار سے خوب کام لیا ہے - یہ تمام خوبیاں اس دور میں ان کے پیشرو مصنفین کے یہاں نظر نہیں آتیں-

مشہور فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی نے اپنے خطبات میں میر امن کی " باغ و بہار" کا ذکر بھی یوں کیا ہے :

> " اس کتاب کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کار آمد بات یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کار آمد ہوں گی -" (۱)

" باغ و بہار" کے متعلق مولانا حامد حسن قادری بھی ایک جگہ لکھتے ہیں :

---

(۱) " خطبات گارسیں دتاسی"، بحوالہ " داستان تاریخ اردو"، از حامد حسن قادری، کراچی : ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۶ء ، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۱۰۲

" باغ و بہار، اس زمانے کے تمدن و معاشرت کا آئینہ ہے ۔ اسلامی عقائد اور ضعیف الا عتقادیاں، رسم و رواج ، طعام و لباس، مشاغل و معمولات ، آداب و اخلاق ، غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے ۔" (۱)

غرض ولیم کالج سے قبل بھی اور اس کے قیام کے بعد بھی برصغیر میں اردو ادب کی خدمات ہوتی رہیں لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس امر کا انکشاف ہوگا کہ اردو نثر کی سب سے پہلی مستقل و مکمل تصنیف مولانا شاہ رفیع الدین رحمتہ اللہ علیہ کا اردو ترجمہ قرآن ہے ۔ یہ ترجمہ اگرچہ لفظی ، بے محاورہ اور دشوار فہم ہے اور آج تو کیا اس زمانے میں بھی بول چال اور گفتگو کی زبان ایسی نہ تھی اور اصل بات تو یہ ہے کہ عربی زبان کی وسعت و بلاغت اور قرآن کریم کی معجز نما عبارت ترجمہ کی گرفت کی متحمل نہیں ہوسکتی لہذا شاہ صاحب جیسی بزرگ ہستی کو بھی یہ خیال رہا کہ کوئی ایسی کمی بیشی نہ ہوجائے جس سے مطلب کچھ کا کچھ ہوجائے ۔ اس لیے انھوں نے ہر لفظ اور ہر حرف کا ترجمہ عربی کی ترتیب کے مطابق اسی موقع پر لکھدیا ۔

شاہ رفیع الدین نے ۱۲۰۰ھجری/ ۱۷۷۶ء میں جو قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا ہے اس کا نمونہ یہ ہے :

" اے رب ہمارے مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے اے رب ہمارے اور مت رکھ اوپر ہمارے بوجھ جیسا رکھا تو نے اس کو اوپر ان لوگوں کے کہ پہلے ہم سے تھے ۔ اے رب ہمارے اور مت اٹھوا ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اس کے اور معاف کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم کو ۔ تو ہے دوستدار ہمارا ۔ پس مدد دے ہم کو اوپر قوم کافروں کے" (۱) (سورۂ بقرۃ)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " داستان تاریخ اردو"، کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۶ء، (تیسرا ایڈیشن) ، ص ۱۰۳

(۲) ایضاً ، ص ۶۳

شاہ رفیع الدین کے ترجمے کے چند سال بعد ۱۲۰۵ھجری/۱۷۸۰ء میں شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا مگر یہ ترجمہ بھی سلیس و با محاورہ نہیں ہے لیکن آپ نے اس میں یہ اہتمام رکھا کہ شاہ رفیع الدین صاحب کی طرح ہر لفظ اور ہر حرف کا ترجمہ کرنے کی بجائے ادائے مفہوم اور تشریح مطالب کو خصوصیت سے مد نظر رکھا اسی لیے آپ کا ترجمہ پہلے ترجمے کی بہ نسبت مختصر اور صاف نظر آتا ہے یہی وجہ تھی کہ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور کثرت سے شائع ہوا اور پڑھا گیا۔ ذیل میں اس ترجمے میں سے سورۂ انعام کی چند آیات کا ترجمہ بطور نمونہ پیش ہے :

" اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم نہیں پہنچتے تھے رسول تمہارے اندر کے ، سناتے تم کو میرے ظلم اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ اور ان کو بہکایا دنیا کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔" (۱)

اس وقت ترجمہ کرنے کا یہی طور و طریقہ تھا اور پھر کلام الٰہی کی ترجمانی کے لیے ہر احتیاط مد نظر رہی ہوگی ۔ احترام موضوع بجا سہی مگر زبان و بیان میں دل کشی ہو اور روزمرہ بول چال کا لطف ملنے سے پڑھنے والے کا جی بھی لگتا ہے اور اسے ایک طرح کا کیف و سرور بھی ملتا ہے ۔

چناں چہ قرآن مجید کا وہ ترجمہ جو شاہ رفیع الدین کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب نے کیا تھا زیادہ مقبول رہا کیوں کہ شاہ صاحب نے اس میں بامحاورہ اور سلیس و سہل زبان کا استعمال زیادہ کیا تھااور پھر اسے ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے زور بیان سے آگے چل کر اور بھی چارچاند لگادیے ، مگر محاوروں کے شوق میں خوب گل کھلائے ۔

اس ذکر سے بیان کرنا مقصود یہ ہے کہ ترجمہ کی شرط اول تو صحت مضمون ہی ہے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۶۵

مگر یہ لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف ایسی نہ ہو کہ ترجمہ ، ترجمہ نہ رہ کر صرف گورکھ دھندا بن جائے۔ ترجمہ میں اصل عبارت کا مطلب و مفہوم بھی طرح سے واضح ہونا چاہئے اگر ترجمے میں کہیں نقص رہ گیا تو یہ کسی فتنہ و فساد کا سبب بھی ہوسکتا ہے۔

صحت مفہوم کے علاوہ ترجمہ میں زبان کی لطافت ہونی بھی ضروری ہے کیوں کہ مفہوم کی دلکشی و وضاحت اور لطف زبان و بیان بعض اوقات اصل کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے مگر اس کے لیے کوشش و کاوش اور علم و زبان دانی کی ضرورت ہے ۔ اچھے ترجمے کی ایک خاص پہچان ہی یہ ہے کہ یہ نہ پہچانا جاسکے کہ آیا یہ ترجمہ ہے یا اصل عبارت ۔

اس سلسلے میں میر امن دہلوی کی " باغ و بہار" ، حسن بلگرامی کی " تاریخ تمدن عرب " ، ڈپٹی نذیر احمد کا " مجموعہ تعزیرات ہند" ، ذکاء اللہ ، عنایت اللہ اور مرزا محمد عسکری کے تراجم ، نیاز فتح پوری کی " گیتان جلی" یا مولانا حامد حسن قادری کے " باغ بان " جن جن تراجم پر بھی نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب ہی بزرگوں نے تراجم کے نہایت کام یاب نمونے پیش کئے ہیں جو اردو زبان و ادب کے لیے ایک بیش بہا سرمایہ ہیں۔

مولانا قادری نے کئی زبانوں (انگریزی ، عربی اور فارسی) مختلف موضوعات پر ترجمے کیے ہیں۔ جو کئی کتابوں کی شکل میں موجود ہیں۔ بظاہر کسی مضمون کا ترجمہ کرنا کوئی مشکل نظر نہیں آتا مگر ترجمہ کرنے کا کام نہایت کٹھن و انتہا دشوار ہے ، بلکہ یہ تصنیف و تالیف سے بھی کہیں زیادہ دشوار ہے تجربات شاہد ہیں اور دلیلوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ در حقیقت ترجمہ کرنا طبع زاد مضمون لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ تصنیفاتی اور تالیفاتی تحریروں میں اظہار خیال کی آزادی ہوتی ہے مصنف و مؤلف جو کچھ لکھنا چاہے لکھتا چلا جاتا ہے مگر مترجم کے سامنے ہر قدم پر پابندی ہے ۔ وہ اس بات

کو ہر وقت پیش نظر رکھتا ہے کہ اصل مصنف کا طرز فکر، انداز تحریر، اظہار خیال اور انداز بیان اپنی جگہ قائم رہے ۔ بعض اوقات اس کو مصنف کے کسی خاص لفظ کے معنی کی لطافت و نزاکت کے پیش نظر یا اس کے مقصد و مفہوم کی وضاحت کے لیے الفاظ و محاورات کی جستجو کرکے عبارت کو سنوارنا پڑتا ہے تاکہ مصنف کے طرز و اسلوب اور زور بیان میں کوئی فرق واقع نہ ہونے پائے ۔

اچھے اور اعلا تراجم میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس میں مترجم مصنف کے خیالات و نظریات اور مقصد و منشا کو اپنی زبان کے توسل سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا اس کو مترجم کے نہیں بلکہ اپنے ہی حالات و خیالات سمجھتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے تراجم بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ایسے ہی ترجمے اصل تصنیف سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل کرلیا کرتے ہیں ۔ چیخوف ، موپاساں، میکسم گورکی ، ٹیگور اور نذرالسلام وغیرہ کی شہرت و مقبولیت میں ان کے شہپاروں کے ترجموں کو بھی بڑا دخل رہا ہے ۔ زبان و ادب کی ترویج ، خیالات و نظریات کی تبدیلی اور علمی و ادبی ذوق کو نکھارنے و سنوارنے میں بھی ترجموں کا بڑا دخل ہے ۔

تراجم کی اہمیت اور تراجم کرنے میں جو دقتیں اور مشکلات حائل ہوتی ہیں ان کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق تحریر کرتے ہیں :

" تین قسم کی کتابوں کے ترجمے میں خاص طور پر دشواری ہوتی ہے، آسمانی صحیفوں کے ترجمے میں کہ جس میں لفظ کے ذرا سے فرق سے مفہوم کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے ۔ دوسرے قدما کی امہات کتب (کلاسکس) کے ترجمے میں جن کا ایک وصف ایجاز ہوتا ہے ۔ قدیم اساتذہ و حکما علمی مسائل کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرتے تھے ۔ چناں چہ اسی وجہ سے بعد کے علما کو ان کتابوں کی شروح اور حواشی لکھنے پڑے ۔ آج کل کے اہل علم مسائل کے بیان میں اس قدر طوالت سے کام لیتے ہیں کہ ان کے خلاصے لکھنے پڑتے ہیں۔

ترجمے میں اس ایجاز کو قائم رکھ کر اپنی زبان کے مناسب الفاظ میں مصنف کے
صحیح مفہوم کو ادا کرنا آسان کام نہیں - نیسے فلسفہ اور سائنس کی امہات
کتب کا ترجمہ جن کے سمجھنے کے لیے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے ،
فلسفہ و سائنس کے پیچیدہ اور گہرے مسائل آدمی خود تو غور و فکر اور محنت
کے بعد سمجھ سکتا ہے ، لیکن ان مسائل کو اپنی زبان میں ترجمہ کرکے
دوسروں کو سمجھانا نہایت مشکل ہے اس میں بڑے صبر و محنت کی ضرورت ہے -"(۱)

کوئی مصنف اس بات سے بخوبی باخبر ہوتا ہے کہ اس کو کیا لکھنا ہے اور کس طرح
لکھنا ہے ، وہ زبان پر پورا پورا عبور اور قدرت رکھتا ہے اور وہ جس طرح اور جس انداز
سے چاہتا ہے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکتا ہے - لیکن مترجم کا کام اس کے
بالکل برعکس ہوتا ہے - اسے اپنے خیالات و نظریات کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے کے افکار و
نظریات کو سمجھنا پڑتا ہے - اسے مصنف کے انداز بیان اور طرز تحریر سے کماحقہ آگاہی
حاصل کرنا ہوتی ہے ، اس کو مصنف کی عبارت کا بغور مطالعہ کرکے اس کے صحیح مفہوم و
مقصد کو اخذ کرنا ہوتا ہے اور اس طرح وہ ایک دوسرے شخص کے مافی الضمیر کو ایک دوسری
زبان میں اور ایک مختلف انداز سے پیش کرتا ہے - اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی
خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ کی ہوئی عبارت کے معانی و مفاہیم اصل عبارت سے کسی طرح
بھی مختلف نہ ہونے پائیں - اس لیے ترجمہ کرنا واقعی کسی عام آدمی کے بس کی بات
نہیں اس کے لیے بڑے علم اور مہارت کی ضرورت ہے - لہذا یہ کام سوائے بلند پایہ ادیب
اور قادرالکلام انشا پرداز کے کسی اور سے بجا طور پر انجام ہی نہیں دیا جاسکتا۔

ترجمہ کرنے میں دوسری ایک اور دقت یہ ہے کہ ہر زبان کا جغرافیائی ، تاریخی ،
تمدنی اور معاشرتی اور روایتی ماحول ، الفاظ و محاورات اور جملوں کی ساخت و بناوٹ
ان کا لب و لہجہ اور طرز ادا سب مختلف ہوتے ہیں - مثلاً ہم اردو زبان کے ان الفاظ

---

(۱) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی ، " تراجم کی اہمیت " ، " قومی زبان " (ماہنامہ) ،
کراچی : اکتوبر ، ۱۹۵۸ء بحوالہ "ڈاکٹر عبدالحق" از آمنہ صدیقی ص ۳۲-۱۳۳

کا ترجمہ کسی اور زبان میں کرنا چاہیں آنتوں کا قل ھو اللہ پڑھنا ، ہتھیلی پر سرسوں جمانا ، آستین کا سانپ ہونا ، حاتم کی قبر پر لات مارنا تو ان کا ترجمہ فصیح و بلیغ نہیں ہوسکتا اور اگر کیا بھی گیا تو بڑی دشواری در پیش ہوگی - کیوں کہ بعض الفاظ اور روز مرہ و محاورات ایسے ہوتے ہیں جو ایک زبان میں تو عام ہوتے ہیں اور بلاتامل تحریر و تقریر اور بول چال میں استعمال کئے جاسکتے ہیں مگر دوسری زبان میں ان کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔ مثلاً انگریزی زبان میں آپ اردو کے بہت سے الفاظ کا ترجمہ کرنا چاہیں تو نہیں ہوسکے گا اور اگر کیا بھی گیا تو اس کی شیرینی و لطافت اور زور و اثر جاتا رہے گا اسی طرح انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہیں تو وہ بات پیدا نہ ہوسکے گی جو انگریزی الفاظ کی ادائیگی سے ہوتی ہے اس کے علاوہ ترجمے میں

ایک بات یہ بھی پیش نظر رہتی ہے کہ اکثر ایک ملک کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن دوسرے سے قطعی مختلف ہوتی ہے مثلاً لندن میں ماہ مئی کو نہایت خوش گوار اور فرحت بخش مہینہ تصور کیا جاتا ہے شاعر اور ادیب اس مہینہ کی دھوپ کی بہت تعریفیں کرتے ہیں اور یہ ان کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے - برخلاف اس کے ہمارے یہاں یہی مئی کا مہینہ سخت گرمی کا ہوتا ہے اور آگ برستی معلوم ہوتی ہے - لہذا ترجمہ کرتے وقت ایک بڑی دشواری یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ اگر خیال کی ترجمانی کریں تو زبان کی خوبیاں غارت ہوجاتی ہیں اور اگر لفظی ترجمہ کریں تو معنی و مفہوم مضحکہ خیز ہوجاتے ہیں اور ان دونوں باتوں کو برقرار رکھنا بڑا ہی دشوار طلب کام ہے -

اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ بہت سے محاورات اور ضرب الامثال کے مترادف و مماثل الفاظ دوسری زبانوں میں بھی مل جاتے ہیں مگر آپ بہ نظر غائر دیکھیں تو یہ بہت کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے اور بعینہ وہی مفہوم

ترجمہ میں شکل سے آتا ہے جو اصل زبان میں پایا جاتا ہے ۔ مصنف یا طبع زاد رکھنے والے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ صرف اسی زبان میں ماہر ہو جس میں مضامین تحریر کر رہا ہے مگر ترجمہ کرنے والے کے لیے یہ بات لازم و ضروری ہے کہ وہ دونوں ہی زبانوں پر کامل عبور رکھتا ہو (جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان میں وہ ترجمہ کیا جارہا ہے) یہ بات بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ اپنی زبان سے کسی دوسری اور غیر زبان میں ترجمہ کرنے کے مقابلے میں دوسری یا غیر زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنا زیادہ دشوار اور دقت طلب ہے ۔

ان تمام باتوں کے باوجود لوگ ترجموں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے اور انہیں حقیر گردانتے ہیں جب کہ تحریر کے سلسلے کا یہ سب سے مشکل کام ہے اور خاص کر ادبی مضامین کا ترجمہ کرنے میں تو دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

" ترجمے کو بعض اوقات حقارت سے دیکھا جاتا ہے ۔ لیکن ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے ، اس میں اسی قدر جان کاہی اور سر دردی کرنی پڑتی ہے جتنی نئی تالیف یا تصنیف میں ۔ ترجمے میں وہی کام یاب ہوسکتا ہے جو مضمون پر حاوی ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں میں کامل دسترس رکھتا ہو ، ادب کی نزاکتوں سے واقف ہو اور اصل مصنف کے صحیح مفہوم کو اپنی زبان میں اسی قوت سے بیان کرسکے ۔ یہ آسان کام نہیں اور ہر ایک کا کام نہیں ۔ ترجموں سے زبانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے ۔ یہی نہیں کہ ہمارے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ خود زبان بھی اس سے متمتع ہوتی ہے ۔ ایک اعلا درجے کی تصنیف کا عمدہ ترجمہ بہت سی معمولی تصنیفوں سے کہیں بڑھ کر مفید ہوتا ہے ، وہ ادب کا جز بھی ہوجاتا ہے ۔" (۱)

---

(۱) آمنہ صدیقی، " افکار عبدالحق"، کراچی : انجمن پریس ، ۱۹۶۲ء ، ص ۱۳۵

اور یہ حقیقت ہے کہ ترجموں کی بدولت اردو ادب کے سرمایے میں اک گراں قدر اضافہ ہوا ہے - لیکن اس میں وہی دقت ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو پہلے اس مضمون کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنا ہوتا ہے اور پھر وہ اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرتا ہے - اس طرح اس کو کوئی مضمون از سر نو ہی لکھنا پڑتا ہے - لیکن مولانا قادری کے تراجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگر وہ خود آغاز مضمون میں ہی یہ نہ بتادیں کہ یہ فلاں مفکر کے مضمون کا ترجمہ ہے اور یہ فلاں زبان کے افسانوں کا ترجمہ ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ ترجمے ہیں ورنہ ان میں ایسی سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت نظر آتی ہے جیسے کہ یہ خود اسی زبان کا مضمون ہے - اور خود مولانا ہی اس کے مصنف ہیں -

ان کی کتاب " نقد و نظر" کا سب سے پہلا مضمون ہی لے لیجئے -

" مطالعۂ شاعری" (۱) اس کا قادری صاحب نے لفظی ترجمہ کیا ہے یہ ضرور ہے کہ جا بجا اپنی طرف سے اشعار کا اضافہ کردیا ہے لیکن اگر وہ مضمون کے شروع میں ادبی دیانت داری کے طور پر خود یہ نہ لکھتے :

" یہ مقالہ ڈاکٹر میتھیو آرنلڈ کے مضمون (اسٹیڈی آف پوئٹری) کے ایک حصے کا لفظی ترجمہ ہے -"

تو یہ کہنا مشکل ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے - ان کی یہ کوشش و کاوش اردو ادب میں اپنی نوعیت کی واحد چیز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ کام انجام دے کر اور بھی دوسرے ادیبوں اور دانشوروں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے اس سلسلے میں ، یہاں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا قول دہرانا بے جا نہ ہوگا -

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " نقد و نظر" ، آگرہ : آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۳۲ء
ص، ۱

مولوی عبدالحق صاحب مولانا قادری کے اس کارنامے سے واقف تھے اور ان کی ادبی خدمات کو کئی بار سراہ چکے تھے لہذا وہ عام ادیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ اتنا دشوار نہیں ۔ اس میں صرف اس علم کا بخوبی جاننا لازم ہے ۔ لیکن ادب کی خصوصاً تخلیق ادب کی اعلا کتابوں کا ترجمہ نہایت دشوار اور صبر آزما ہوتا ہے ۔ اس میں معانی کے ایسے باریک اور نازک فرق ہوتے ہیں اور خیال میں ایسی لطافت اور ابہام ہوتا ہے جسے صرف ایک دقیق نظر نقاد یا نکتہ رس ادیب ہی سمجھ سکتا ہے ۔ اس لیے نادر روزگار جواہر پاروں کے ترجمے کے لیے منجملہ دوسری قابلیتوں کے ذوق ادب کا ہونا ضروری ہے کچھ عرصے قبل ان کتابوں کے ترجمے کے لیے قابل مترجموں کا دستیاب ہونا مشکل تھا لیکن اب ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جن میں یہ صلاحیتیں موجود ہیں اور اصل زبانوں سے ترجمہ کرسکتے ہیں ۔ لہذا ایسی حالت میں اس سے غفلت کرنا زبان کے حق میں ظلم ہوگا ۔" (۱)

اسی طرح ان کے افسانوں کے مجموعے ، " عہد و صباؔ" یا " ایرانی افسانے" کو پڑھ کر ایسا محسوس بھی نہ ہوگا کہ آپ ترجمہ پڑھ رہے ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا قادری نے عربی ، فارسی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے علمی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کو بھی کہنا پڑا تھا :

" مسلمانوں کی اس وقت جیسی کچھ حالت ہے اسے مد نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ علمی بیداری کا پہلا دور ترجمہ ہی ہے اگر غیرزبانوں کی علمی اور اعلا ادبی کتابوں کے ترجمے ہوجائیں تو آیندہ دور کی تالیف و تصنیف کے لیے بیش بہا سرمایہ اور پیش خیمہ ہوگا ۔" (۲)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عوام میں سیاسی شعور ، رومانی و اخلاقی بالیدگی اور علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے میں افسانوی ادب کا گہرا ہاتھ ہے ۔

---

(۱) آمنہ صدیقی ، " افکار عبدالحق" ، محولہ بالا ، ص ۱۳۶

(۲) ایضاً ، ص ۱۳۵

مولانا قادری نے افسانوں کے ترجمے اس انداز سے کیے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خود افسانہ نگار نے ان کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور یہی ان کے کام یاب مترجم ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے ۔

افسانہ ، ادب کی ایک اہم صنف ہے ۔ اس کے ذریعہ انسان اپنے دل کے بہت سے سے پوشیدہ گوشوں کو کھول کر رکھ دیا کرتا ہے ۔ افسانوں میں بہت سی باتیں " حدیث دیگراں" کی حیثیت رکھتی ہیں مگر تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں فوراً تاڑ لیتے ہیں کہ روئے سخن کس کی طرف ہے ۔ سماج و معاشرے کے خیالات و نظریات کو بدلنے اور اس کی زندگی کارخ بدلنے میں افسانہ نگار بھی بڑا اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ ایک کام یاب افسانہ نگار کو تین باتیں خصوصیت سے پیش نظر رکھنی ہوتی ہیں :

پہلی بات تو یہ کہ انسانی نفسیات اور فطرت سے بخوبی واقف ہو اور انسانی زندگی کے ہر معمولی سے معمولی گوشے پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔

دوسری بات یہ کہ وہ ایک مشاق اہل قلم کی حیثیت سے تحریر پر بڑی قدرت رکھتا ہو اور ہر واقعہ کو اس طرح پیش کرسکے کہ اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے ۔

تیسری چیز جو اک افسانہ نگار کے لیے نہایت ہی اہم اور ناگزیر ہے یہ ہے کہ وہ جن حالات و کیفیات کو بیان کرنا چاہتاہے اسی طرح کے احساسات و جذبات خود پر طاری و مسلط کرلے تاکہ تصنع کا شائبہ بھی نہ آنے پائے۔

سعید نفیسی ایران کے شہرۂ آفاق ادیب و افسانہ نگار ہیں۔ ایران کی ادبیات جدید میں ڈرامے یا تمثیلیں بہت پہلے سے اور کثرت سے لکھی گئی ہیں لیکن رومانی یا نفسیاتی افسانے اور خاکے بیسویں صدی سے پہلے نہیں لکھے گئے اور اب تک بھی جو کچھ

لکھے گئے ہیں لکھے گئے ہیں ان کی تعداد بھی کم ہی ہے - اردو میں طنزیہ و مزاحیہ طنز نگارش نے خاصی ترقی کرلی ہے - لیکن ایران میں ابھی طنز و روش عام نہیں ہوئی ہے- سعید نفیسی کا قول ہے کہ وہ ایران میں اس صنف ادب کے موجد ہیں -

ان کے یہ مختصر افسانے ایران کے مختلف اخبارات و مجلات میں شائع ہوئے ہیں اور ایران کی سوسائٹی سے متعلق ہیں - لیکن انسانی کردار و اخلاق کے تجزیے اور تجسس کے سبب اپنے اندر عام دل چسپی رکھتے ہیں - سعید نفیسی ان افسانوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :

" یہ مختصر افسانے کسی خاص مقصد کی تشریح اور کسی خاص خیال کے اظہار کے لیے لکھے گئے ہیں البتہ قوت تصور و اختراع سے کام لیا گیا ہے لیکن ان کی بنیاد ایسے لوگوں کے خصائل و کردار پر رکھی گئی ہے جن میں سے بعض کو شاید تم بھی پہچانتے ہو، لیکن اس حد تک ان کی روح کے اندر موشگافی نہ کی ہو -"

ان افسانوں کے متعلق مولانا قادری بھی اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

" ہمارے یہاں بھی پرخود غلط شاعر، بلند بانگ مصنف ، طبل تہی لیڈر ، عیش پرست دولت مند ، فرنگی مآب نوجوان ، آزادہ رو خواتین موجود ہیں- یہ طنزیہ خاکے ان کا بھی خاکہ اڑاتے ہیں- ان افسانوں میں بیان کا پیچ اور طول خاص طور پر عجیب و دل کش ہے جزئیات کی تفصیل ، نفس انسانی کا مطالعہ، اسلوب بیان کی قوت و قدرت ، طنز و مزاح کی لطافت نے ان افسانوں اور خاکوں کو بجا طور پر مصنف کے لیے باعث فخر بنادیا ہے ، خود مصنف کو بھی اپنے بیس سال کے ادبی کارناموں میں اگر فخر ہے تو " از ہمیں صحائف است و بس -"

سعید نفیسی کے افسانے اصلاحی بھی ہیں اور اخلاقی بھی اس کے افسانوں کی اسی خصوصیت نے مولانا قادری کو بھی متاثر کیا اور انھوں نے ان کا ترجمہ کرکے اپنی اصل سے بھی کچھ بڑھادیا- مولانا کوعربی و فارسی اور اردو و انگریزی زبانوں کے ادب سے ایک

دلی مناسبت ہے اور وہ ہر ایک زبان پر بخوبی قدرت رکھتے ہیں انھوں نے سعید نفیسی کے ان فارسی افسانوں کو اردو میں منتقل کرکے اپنی اعلا ادبی قابلیت اور حسن ترجمہ کی صلاحیت کا اعلا ثبوت دیا ہے ۔ ہمارے یہاں انگریزی زبان کے تو ہزاروں افسانے ترجمہ کئے جاتے اور آئے دن اخبارات و مجلات اور رسائل و ڈائجسٹوں کی زینت بنتے رہتے ہیں مگر عربی و فارسی کے افسانوں کو اردو میں منتقل کرنے کی طرف لوگ توجہ نہیں دیتے اس کا خاص سبب یہی ہے کہ عربی و فارسی کے افسانوں یا مضامین کا اردو میں ترجمہ کرنا اور اس میں حسن ترجمہ کو برقرار رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔ آپ ان کے ایرانی افسانے پڑھیں اگر وہ خود یہ نہ بتادیں کہ یہ سعید نفیسی کے فارسی افسانوں کا اردو ترجمہ ہیں تو آپ کو محسوس بھی نہ ہوگا کہ آپ ترجمہ پڑھ رہے ہیں اور ترجمہ کی اصل خوبی یہی ہے کہ کوئی یہ تمیز ہی نہ کرسکے کہ یہ طبع زاد ہے یا ترجمہ اور یہ بات مولانا قادری کے تراجم میں خواہ نثر کے ہوں یا نظم کے بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ اس سے اب اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کو اس فن میں کتنا کمال حاصل تھا۔ انھوں نے ایک نہیں بلکہ کئی زبانوں سے ترجمے کیے اور سب کے سب نہایت کامیاب و موثر ثابت ہوئے ۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ قادری صاحب کو کم از کم ان زبانوں پر تو یقیناً عبور حاصل تھا جن سے انھوں نے ترجمہ کیا اور جو شخص کئی زبانوں پر عبور رکھتا ہو اس کو ترجمہ کرنے میں ایک سخت دشواری یہ ہوتی ہے کہ اکثر و بیشتر مختلف زبانوں کے الفاظ و محاورات گڈ مڈ ہوکر عبارت کو ثقیل ، بھدا اور غیر مانوس بنادیا کرتے ہیں ۔ چنانچہ بڑے بڑے قادرالکلام شعرا و انشا پرداز بھی اس دشواری سے نہیں بچ سکتے ۔علامہ اقبال جیسا بلند پایہ شاعر بھی اس سے نہ بچ سکا اپنی مشہور نظم " خضر راہ" میں "سرمایۂ رحمت" کا موازنہ کرتے ہوئے وہ ایک مقام پر بہ زبان خضر کہتے ہیں :

لے گا تجھ کو کہا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آھو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

علامہ نے اس شعر کے دوسرے مصرع میں فارسی کے مشہور محاورے " برات عاشقاں برشاخ آھو " کا ترجمہ کیا ہے ، چوں کہ یہ لفظی ترجمہ ہے جس کا اردو زبان و ادب ، تجربے و روایت اور ماحول و معاشرے سے کوئی تعلق و مناسبت نہیں لہذا علامہ کا مصرع ایک چیستان کی سی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور جب تک کوئی شارح یا عالم اس کی تشریح نہ کرے کوئی عام قاری اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ مولانا قادری کے تراجم میں یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے سادہ و سلیس زبان میں ترجمہ کیا اور اصل و بے جوڑ الفاظ و محاورات کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ انھوں نے غیر زبان کے وہ الفاظ استعمال نہیں کئے جو ثقیل و نامانوس معلوم ہوں۔ بجز ان الفاظ کے جو ہیں تو غیر زبان کے مگر اردو والوں نے اپنا لیے ہیں اور زبان زد عام ہیں۔ ہم ذیل میں ان کے تراجم کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے اس فن میں ان کی مہارت و کمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

" اب آپ منتظر ہوں گے کہ میں اس دعوے کو کیوں کر ثابت کرتا ہوں۔ کسی دعوے کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ فطرت و طبیعت کی شہادت سے بہتر نہیں ہوتا ۔ یعنی انسانوں کی سیرت و سرگزشت سے کوئی مثال لائی جائے ۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے دوست علی رشید ادیب معروف کی زندگی سے اس مسئلے کا ثبوت مہیا کروں کہ مرد سبب بدبختی ہے ، اور تلک بدبختی بھی کس کی؟ اس ہستی کی بدبختی جس کو آپ اب تک اپنی بدبختی کا سبب سمجھتے رہے ہیں اس کی بدبختی جس کو شعرا صانع مطلق کا شاہکار کہتے ہیں ، جس کو مصور بہترین ماڈل بتاتے ہیں ، جس کو اہل تقوی مرکز فتنہ و فساد فرماتے ہیں ، جس کو علمائے اجتماعیات منشائے بدبختی و خوش وقتی تجویز کرتے ہیں ، غرض جس کو ہر شخص کچھ نہ کچھ جانتا اور کہتا ہے بجز میرے کرم فرما شیخ سمجھا کے کہ وہ اس کو کچھ نہیں جانتے ۔ اور یہ نہ جاننا اس لیے ہے کہ ہمارے شیخ صاحب اپنے اطوار و

کردار کو مشہور ضرب الامثال کے مطابق رکھتے ہیں ۔ چناں چہ ان کی یہ لا طمعی بھی " انگور کھٹے" والی مثل کو ثابت کرتی ہے ۔" (۱)

اسی مجموعے کے ایک اور افسانے " آدمی ہونا بہت دشوار ہے " کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے :

" خدا کا خوف نہ ہوتا تو ہمارا جانباز ایران کے تمام مصنفین اور انشا پردازوں کو دعوت دیتا کہ آئیں اور ثابت کریں کہ ان میں کون ایسا ہے، جس نے ڈیڑھ سو روپے مالیت کی کتابیں چالیس روپے میں فروخت کرنے کے باوجود دوسرے ہی روز بشمول لعنت و لعل کے ان کی قیمت وصول کرلی ہو، اس وقت مہر انگیز خانم رفیقہ آقا ابراہیم جانباز رئیس المصنفین طہران پر بھی روشن ہوجاتا کہ وہ اگرچہ کبھی آدمی نہیں بن سکتا ، مگر آدمی بننے سے بالاتر بھی ایک مرتبہ ہے ۔ پھر بھی ، یہ دو زہریلے جملے کہ " تم کبھی آدمی نہیں بن سکتے ، سب کے پاس موثر ہے سوا تمہارے" ابراہیم جانباز کے دل و دماغ کو مسموم کر رہے تھے، دو گھنٹے سے ایک قدیم و نادر کتاب " تاریخ خشت سازی" جو نو سو (۹۰۰) برس پہلے کی لکھی ہوئی تھی، ابراہیم کے ہاتھ میں تھی ، چاہتا تھا کہ نمونے کے طور پر اس کا ایک صفحہ خوش خط نقل کرے، اور حاشیہ پر ایک دو تین چار نمبر ڈال کر متن کی تصحیح کرے اور مولف کتاب اور کاتب نسخہ کے اغلاط بیان کرے لیکن خانم کے وہ دو جملے اس کے حواس گم کر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا ساری کتاب میں یہی لکھا ہے کہ تم کبھی آدمی نہیں بن سکتے"، سب کے پاس موٹر کار ہے سوائے تمہارے "۔(۲)

اسی طرح مولانا نے ایک ایرانی افسانے " دم وابسین" کا کس قدر صاف ، شستہ اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے :

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) " ایرانی افسانے"، آگرہ : آگرہ اخبار پریس، ۱۹۳۳ء، ص ۵-۳

(۲) ایضاً، ص ۱۸-۱۷

" چھے گھنٹے ہوگئے تھے کہ مریم ہر دروازے پر دستک دے رہی تھی موسم سرما کا
رنگ باختہ آفتاب، مریض جاں بلب کے دم واپسیں کی طرح عالم نزع میں تھا - مریم بھی
چلی جارہی تھی کہ اپنے رنگ باختہ چہرے کو لئے ہوئے کہیں ڈوب جائے -

دامن افق پر وسیع آسمان کے کنارے ، ڈوبتے آفتاب کی آخری خونی شعاعیں
پگھلے ہوئے تاروں کی طرح جو بھٹی لوہار کی بھٹی سے نکلے ہوں، فضائے گردا گرد کو
ارغوان زار بنارہی تھیں - آفتاب رفتہ رفتہ پردۂ افق کے پیچھے پنہاں ہورہا تھا - مریم
کی زندگی کا آفتاب بھی چھپنے کو جارہا تھا۔

کئی سال ہوئے مریم کے چہرے کی سرخی رنگ سفید کو الوداع کہہ چکی ہے۔
آج آفتاب طہران نے بھی اس کی تقلید کی اور مریم کے رخسار بے رنگ کے ہم رنگ ہوگیا۔

چھے گھنٹے سے مریم ہر دروازے کو کھٹکھٹارہی تھی۔ دو سال کا بچہ اس کی
بغل میں سو رہا تھا - بچوں کے لیے خواب بہشت جاودانی ہے - ان کی بے گناہ روح
خواب میں گھنٹوں نہایت آزادی کے ساتھ آرام کرتی ہے اور برہنگی و گرسنگی کے شکنجے
سے آزاد رہتی ہے - چرخ بریں کے پاک نہاد فرشتو! تم بے گناہ بچوں کو آغوش محبت میں
لیتے ہو - اور ہمیشہ کے لیے انسان کے جور و ستم سے آزاد کردیتے ہو، مریم بھی بہت
جلد اپنے فرزند عزیز کو تمہارے سپرد کردے گی -

چھے گھنٹے گذر چکے تھے کہ مریم ہر دروازے پر صدا دے رہی تھی لیکن کوئی
دروازہ اس کے لیے نہ کھلا - کوئی آواز ترحم ان دروازوں کے پیچھے سے سنائی نہ دی -
کوئی دست کرم ان دروازوں سے باہر نہ نکلا - مریم نے تین روز سے کچھ نہیں کھایا۔
اس کا بے گناہ بچہ بھی ماں کے رونے میں شریک ہے - ماں کی ممتا کب تک آنسو بہائے۔
آخر ایک لاغر چہرے کی دو نازک آنکھیں کتنے آنسو جمع رکھ سکتی ہیں۔

چھے گھنٹے سے ہر دروازے پر دستک دے رہی تھی - نہیں، اب کسی دروازے

پر نہ جائے گی - اب کسی گھر کے پاس جاکر کھڑی نہ ہوگی، اب کسی کو درد سر نہ دے گی - اور اپنی صدائے رقّت انگیز سے کسی کے آرام و راحت میں خلل انداز نہ ہوگی-

دروازۂ شمیران کے سامنے بنچ پر بیٹھ گئی - راہ گیر سرمائے طہران کی زیادتی کے ساتھ ساتھ کم ہونے لگے - تین چار بے کار آدمی جو سڑک کے کنارے دروازے کے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے، اب آفتاب کے غروب ہونے سے سامنے کے قہوہ خانے میں پناہ گزین ہوگئے - قہوہ خانہ کا پردہ بھی چھوڑ دیا گیا - اور مریم کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی -

فصل سرماکے چالیس روز گذر چکے ہیں- ان چالیس روز میں مریکم کو ایک دن بھی تاپنے کے لیے آگ میسر نہ آئی اس کی روح روشن اور دل گرم میں جس قدر آتش خدا داد تھی ، سب ختم ہوگئی - اور یہ آتشدان بھی سرد و خاموش ہوگیا- اگر مریم مرد ہوتی تو اتنی مجبور نہ ہوتی - ممکن تھا کہ کسی قہوہ خانے کے گوشے میں یا کسی رئیس کے اصطبل میں پناہ لے لیتی - لیکن ایک نوجوان عورت دو سال کے بچے کو لیے کہاں پناہ لے سکتی ہے - بجز اس جگہ کے جہاں اب جانے والی ہے -

جاڑوں کا ایک چلّہ گذرچکا ہے - یہ چالیس دن اپنی سردی کے تمام حربوں اور اپنے کینہ و عناد کے تمام جوش و خروش کے ساتھ تنہا بے چاری مریم پر حملہ کرچکے ہیں- آخر ایک بیس سال کی جوان عورت اور دو سال کا بچہ کہاں تک اس حرب و ضرب کی تاب لاسکتے ہیں-

نہیں بس کافی ہے! ممکن ہے جاڑے اور چالیس روز تک رہیں- ہوسکتا ہے کہ کل بھی مریم چھے گھنٹے تک ہر دروازے کو کھٹکھٹائے - کیا نہیں ہوسکتا کہ کل کا دن بھی آج کی طرح گذاردے اور ہوا اور سردی کو اپنے اور اپنے بچے کے گرد لپیٹے اس بنچ پر

دروازے کے سامنے بیٹھی رہے ؟

نہیں بس کافی ہے! کب تک ممکن ہے کہ روزانہ یہی زندگی از سر نو شروع کی جائے۔ مریم نے سوچتے سوچتے یکایک اپنا آخری سانس فضائے لامحدود کے سپرد کردیا اور اپنی زندگی کی آخری یادگار، اپنے دو سال کے بچے کو جو ابھی روتے روتے سوگیا تھا ، سردی کے حوالے کردیا۔ چھے گھنٹے سے مریم ہر دروازے کو کھٹکھٹا رہی تھی آخر ایک دروازہ کھل گیا۔ وہ شاید بہشت کا دروازہ تھا۔ معلوم نہیں ، اتنا معلوم ہے کہ آزادی و رہائی کا دروازہ تھا۔ " (۱)

مندرجہ بالا افسانے کے ترجمے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طبع زاد ہے۔ اسی طرح ان کے اسی مجموعے کے ایک اور افسانے " پردۂ حقیقت نما" کے ایک کردار "ملا علی" کا حال ملاحظہ فرمائیے - کیا مجال کہ ذرا بھی احساس ہوجائے کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ اس کے برعکس یہ مولانا قادری کا خود کا ہی تحریر کردہ افسانہ معلوم ہوتا ہے :

" نیک بختی اس عالم میں اس قدر نایاب ہے کہ جن لوگوں کو یہ شے کسی شخص سے حاصل ہوجاتی ہے وہ اس محسن ہستی کو کبھی فراموش نہیں کرتے - نیشاپور کے ٹیلوں کے پیچھے چھپی ہوئے اس گاؤں سراوند کے لوگ اب تک اسی بزرگ انسان کو یاد کرتے ہیں جس کا نام " ملا علی" تھا۔ اور جس کو ایران کے کسی شہر میں کوئی شخص نہیں جانتا - " ملا علی " ان مفکرین اور دانشوروں کی عقل و فرزانگی کا وارث تھا ، جنھوں نے اپنے خاندان میں علم و دانش کو بطور میراث چھوڑا تھا۔ اس کے آباد و اجداد وہ حکماء تھے جنھوں نے شہریوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی - حقیقت یہ ہے کہ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) " ایرانی افسانے"، محولہ بالا ، صص ۶۷-۷۱

کوئی شخص ایمان رکھتا ہے تو اس کو فروخت کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں پر نہیں جاتا۔ نیک بختی اور سعادت روحانی جس کی جستجو میں اہل دنیا سرگرداں رہتے ہیں۔ اس عالم میں موجود ہے لیکن اس کو متاع تجارت قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ شہر کے حکما جو گلی کوچوں میں اس متاع کا بلند آواز سے اعلان کرتے ہیں حقیقت میں اس کا ایک حصّہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے ۔

اسی وجہ سے ملا علی کی شہرت اس کے گاؤں سے باہر نہیں نکلی ۔ لیکن اس کے باوجود تمام حق آگاہ و حقیقت شناس لوگوں کی طرح ملا علی بھی خریدار رکھتا تھا۔ گاؤں میں سب لوگ جانتے تھے کہ وہ نیک بختی بلا قیمت و اجرت لوگوں کو بخشتا ہے ۔ اس لیے اکثر اس سے مشورہ کرتے تھے ، اس کی روحانیت اور جہان مادی سے بے نیازی ایسا چشمہ تھی جس کا ایک ایک قطرہ صحت بخش تھا ۔ لوگ آکر پیتے تھے اور شفا پاتے تھے۔ وہ نیک بختی مفت بانٹتا تھا اور لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے ۔ لیکن دوسرے طبیبوں کی طرح وہ اپنا نسخہ اور علاج کسی کتاب میں تلاش نہیں کرتا تھا ۔ اس کی دوا اس کا تجربہ تھا۔ وہ اسی سے ہر مزاج اور طبیعت کا علاج کرتا تھا۔ جو دوا ایک کو دیتا تھا وہ دوسرے کو سودمند نہ ہوتی تھی ۔ اس کا طریق علاج اور اصول مشورہ عام لوگوں سے جدا تھا۔ وہ کسی دین و آئین کا پابند نہ تھا ۔ کہا کرتا تھا کہ خدا کو اپنے اندر تلاش کرو۔ ہر شخص اپنے اندر ایک خدا رکھتا ہے جو اس کی خواہش طبع کے مطابق اس کو نیک بخت یا بد بخت بنا سکتا ہے ۔ گاؤں کے تمام لوگ اس کی امت یا اس کے مرید تھے۔ وہ گاؤں والوں کے لیے قانون ساز، منصف ، پشت و پناہ ، محرم راز، رہنمائے روحانی، سبھی کچھ تھا۔ جس شخص پر کوئی مصیبت پڑتی تھی وہ مدد کے لیے ملا علی کے پاس دوڑا آتا تھا اور ملا علی اس کو کچھ تعلیم و تلقین نہیں کرتا تھا ، پند و پند سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ

اس کا طریق عمل یہ تھا کہ جو شخص اس کے پاس آتا وہ اس سے حال پوچھتا تھا۔ اور لوگ اپنے طور پر جو کچھ کہنا چاہیں کہنے دیتا تھا۔ پھر یکایک کہنے والے ہی کے کسی قول و کلمے کو پکڑ لیتا تھا اور اسی سے اپنے مقصود اور اپنی تدبیر کی طرف چلتا تھا۔ اسی درد میں درماں کو ڈھونڈھ لیتا تھا۔" (١)

اسی طرح ایک اور ایرانی افسانے " طوق لعنت " کا ترجمہ انھوں نے کس قدر عمدہ کیا ہے کہ اس پر بھی طبع زاد کا گمان غالب ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے :

" میرے رفیق کار کی اس نئی زندگی کا ایک عجیب و دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اس کی نوجوان بیوی نئے نئے اور عجیب و غریب ستم ڈھاتی ہے ۔ ایک روز احمد زرین گھر سے باہر گیا ہوا تھا ۔ واپس آیا تو ایک نادر قلمی کتاب ؛ جو نہایت قیمتی تھی اور اس کو بے حد عزیز تھی میز پر سے گم ہوگئی ۔ ہرچند تلاش کی کہیں نہ ملی۔ بیوی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خانم صاحبہ نے اس کتاب سے آتشدان روشن کرلیا ۔ اور ہمارے دوست کے جوش غضب کے جواب میں نہایت سادگی سے کہا کہ " واقعی تم بھی عجیب چیز ہو ۔ ایک پرانی کتاب دیمک لگی ہوئی ، چوہوں کے ہاتھ سے چھدی ہوئی۔ جو اس کام کے علاوہ کسی فائدہ کی نہ تھی ، اس قدر اہمیت نہیں رکھتی کہ تم اس کے لیے اپنی اوقات تلخ کرو۔ لوگوں کی ہیرے کی انگوٹھی گم ہوجاتی ہے اور وہ اس قدر دل گیر نہیں ہوتے ۔"

خانم کی سخت گیریوں سے مجبور ہوکر بے چارے کو اپنے پرانے ستے ، جو مطالعۂ تاریخ کے لیے فراہم کر رکھے تھے گرو رکھنے پڑے ۔ میرے دوست نے جس وقت یہ واقعہ بیان کیا ، اس کی آواز کس قدر پر درد اور آنکھیں کس قدر پر آب تھیں ! اس لیے کہ بیوی کو

---

(١) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) ؛" ایرانی افسانے"، محولہ بالا ، ص ٥٩-١٥٨

اس روپے کی ضرورت دو جوڑی کپڑے خریدنے کے لیے تھی جب کہ بارہ جوڑے پہلے سے موجود تھے۔ یہ بات بیان کرکے احمد زریں نے بے اختیار ایک آہ کھینچی اور اعتراف کیا کہ وہ اس سے تو پہلے ہی زیادہ خوش اور مطمئن تھا۔ کہنے لگا کہ بد بختی یہ ہے کہ کتنے لوگ ہیں کہ حقیقت حال سے واقف نہیں اور مجھے بڑا خوش قسمت اور قابل رشک سمجھ رہے ہیں۔ کہتا تھا کہ شادی کے دن سے آج تک کوئی علمی و ادبی کام نہیں ہوسکا۔ اس لیے کہ اپنی اور بیوی کی آئندہ زندگی کے متعلق اس قدر تشویش رہتی ہے کہ دماغ کام ہی نہیں دیتا۔ شادی سے پہلے ایک ادبی کتاب کی تصنیف جاری تھی اکثر اس کا تذکرہ کیا کرتا تھا اور اس کارنامے پر ناز کرتا تھا۔ امید تھی کہ تھوڑے دنوں میں مکمل ہوجائے گی - لیکن اب تک ناتمام پڑی ہوئی ہے بلکہ اس کے چند صفحے خادمہ نے کمرے کی صفائی کے وقت گم کردیے - کتابوں اور کاغذوں سے بے توجہی کا مرض بیوی سے ماماتک متعدی ہوگیا تھا - اب قطعاً نا ممکن تھا کہ احمد زریں ان صفحوں کو دوبارہ لکھ سکے۔ اس لیے کہ عالم و ادیب کی فکر و طبیعت پھر وقت مساعد و سازگار نہیں ہوتی - ایک وحشی طائر کی طرح ہوتی ہے کہ دوبارہ دام میں لانا مشکل ہوتا ہے -" (۱)

مولانا قادری کے ان ایرانی افسانوں کو پڑھ کر محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے یا طبع زاد - ترجمے کی سب سے بڑی خوبی اور حسن یہی ہے کہ پڑھنے والا یہ تمیز نہ کرسکے کہ یہ طبع زاد ہے یا ترجمہ اور یہ خوبی قادری صاحب کے تراجم میں ہرجگہ نظر آتی ہے - ان کے ایک اور ایرانی افسانے " عشق کی غلطی" سے ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے، تاکہ ان کی ترجمے کی صلاحیت کا صحیح اندازہ ہوسکے:

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) " ایرانی افسانے"، محولہ بالا، ص ۷۳-۱۷۲

" باوجود عشق کے تمام معجزات کے ، یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قوت مقناطیس ، یہ کبھر بائے جذاب ، یہ کشش مردم فریب ، یہ سرمایۂ شادی و غم، یہ جذبۂ عشق کبھی خطا بھی ہوجاتا ہے - قدیم یونان میں عشق کو ایک دیوتا مانتے تھے- جو ہمیشہ کمان لیے رہتا ہے اور چند تیر تیار رکھتا ہے - لیکن تیر انداز کیسا ہی ماہر و کامل ہو، ہمیشہ اس کا تیر نشانہ پر نہیں پہنچتا ، کبھی شکار کے کان کے پاس سے گذر جاتا ہے- اور صرف اس کے گذرنے کی آواز کا احساس ہوتا ہے - اور کبھی بالکل ہی خطا کرجاتا ہے -

اس کمان دار شکار افگن کی ایک عجیب غلطی میرے مشاہدے میں آئی ہے - پندرہ سال ہوئے مدرسے میں دو بھائی میرے ہم سبق تھے - دو بھائی جو واقعی اس لفظ کا پورا مصداق تھے - ایسے دو بھائی جو ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے جن کی صورت ، قد ، رفتار، گفتار، لب و لہجہ ، کسی بات میں کسی طرح کی مغایرت نہ تھی - یہ دو بھائی صنعت الہی کا عجیب شاہکار تھے - دو شخصوں کا تصور کرو جو اندرونی و بیرونی شباہت میں ذرہ برابر اختلاف نہ رکھتے تھیں -

دیکھنے والے پہلی نظر میں متحیر ہوجاتے تھے کہ سمجھتے تھے کسی نے کوئی فریب کیا ہے یا جادو کے زور سے ایک کے دو دکھائے ہیں- شاید کچھ لوگ بے اختیار آنکھیں ملتے ہیں کہ کہیں نگاہ کا دھوکا تو نہیں، خواب تو نہیں دیکھ رہے ، یا احول تو نہیں ہوگئے کہ ایک کے دو نظر آرہے ہیں - بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کے سامنے ایک نا محسوس آئینہ رکھ دیا ہے - اور دوسرا شخص جو نظر آرہا ہے کوئی علاحدہ ہستی نہیں بلکہ اسی کا عکس ہے جو جادو کے غیبی آئینہ میں نظر آتا ہے -

لیکن ان میں سے کوئی بات نہ تھی- دو الگ الگ ہستیاں تھیں، دو توام بھائی تھے جو ایک دن ، ایک وقت ، ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے تھے - یہ دو پیکر جو

ایک قالب سے نکلے تھے ، یہ دو بھائی جن میں باہم شباہت تام تھی ، کسی حیثیت سے بھی ایک دوسرے سے متفاوت نہ رکھتے تھے - ہم لوگ جوان دونوں کے ہم جماعت و ہم سبق تھے، جانتے تھے کہ ان دونوں کے دل اور روح میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے - ہوش و خرد ، استعداد ، حافظہ ، حتی کہ خواہشات اور داعیات طبیعت بھی یکساں تھے - مدرسے میں استاد جو کچھ سمجھاتا تھا دونوں بیک وقت سمجھ جاتے تھے- اور ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں یکساں طور پر سمجھ گئے- اگر ایک بھائی کو غصہ آتا تھا تو قطع نظر اس کے کہ دوسرے کے لیے غصہ کا سبب ہو یا نہ ہو، وہ بھی بے اختیار غصہ و رنج کے آثار اپنے اندر محسوس کرتا تھا اور خواہ مخواہ غصہ میں آجاتا تھا- ایک کی خوشی، دوسرے کی خوشی اور ایک کا غم دوسرے کا غم تھا- افتاد طبع دونوں کی یکساں تھی- اچھائی برائی دونوں میں برابر تقسیم ہوئی تھی-" (۱)

فارسی کے افسانوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ مولانا نے انگریزی کے بھی بہت سے افسانوں کا ترجمہ کیا ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ " صید و صیاد" بھی ایسے ہی افسانوں پر مشتمل ہے - ہم ذیل میں ان افسانوں سے بھی چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جو انھوں نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کئے ان تراجم سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کو اردو ، فارسی اور انگریزی پر کس قدر مہور حاصل تھا- ان افسانوں میں وہی روانی و سلاست اور وہی لب و لہجہ ملتا ہے جو اصل افسانے میں پایا جانا ضروری ہے - ان کے ایک انگریزی افسانے کے ترجمے " آسمانی سوار" کا سے ماخوذ اقتباس ملاحظہ ہو :

" ۱۸۶۱ع کا موسم خزاں ہے، صاف و روشن سہ پہر کا وقت ایک سوار گھنے جنگل میں پڑا ہے - یہ مقام اس سڑک کے کنارے پر ہے جو مغربی ورجینا کو جاتی ہے -

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا(مترجم) " ایرانی افسانے"، محولہ بالا ، ص ۷۹-۷۸

سپاہی اپنی ڈیوٹی کے وقت سو رہا ہے ۔ اگر اس حالت میں اسے دیکھ لیا جائے تو انصاف و قانون کا تقاضا یہ ہے کہ یہی اس کی آخری نیند ہوجائے ۔

سوار کی آرام گاہ سے کچھ فاصلے پر اس کی فوج پڑی ہوئی ہے دن بھر کی مسافت کے بعد اسپ دم لیا ہے ۔ رات کے وقت پھر کوچ کی کی اور اس مقام سے گذرتی ہوئی جہاں اس کا یہ غافل سنتری پڑا ہواہے ۔ کوہستانی راستوں کو طے کرتی ہوئی سوتے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہوگی ۔ بے خبری میں دفعتاً حملہ کرنے پر کام یابی منحصر ہے ۔ اگر دشمن کا کوئی سپاہی کہیں چھپا ہوا ہو اور ان کی فرودگاہ اور نقل و حرکت سے آگاہ ہوجائے تو شکست ظاہر اور ہلاکت یقینی ہے ۔ ورجینیا ان کی منزل مقصد ہے اور اس کی تسخیر ان کا مقصد سفر ۔

محو خواب سنتری " کارٹرڈ روز" ورجینیا کا ایک نوجوان تھا متمول والدین کا ایک فرزند یگانہ جس عیش و راحت اور تعلیم و تربیت سے بہرہ ور اندوز ہوسکتا ہے وہ سب اس کو میسر تھی۔ ایک دن صبح کو ناشتہ کی میز سے اٹھتے ہوئے اس نے نہایت سکون و سنجیدگی کے ساتھ باپ سے کہا" ابا ! ایک یونین رجمنٹ گریفٹن میں آگئی ہے ، میں اس میں شامل ہونے کے لیے جاتا ہوں۔" باپ نے سر اٹھایا ، بیٹے پر ایک لمحہ نظر ڈالی اور کہا" جاؤ کارٹر۔ اور ہر حالت میں وہی کرنا جو تمہارا فرض ہو ۔ ورجینیا جس سے تم دغا کرتے ہو تمہارے بغیر بھی باقی رہ سکتا ہے ۔ اگر ہم دونوں جنگ کے بعد زندہ رہے تو اس معاملے پر گفتگو کریں گے ۔ تمہاری ماں کی حالت ، جیسا کہ طبیب تم سے بیان کرچکاہے نہایت نازک ہے ، چند ہفتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن یہ زمانہ نہایت قیمتی ہے ۔ بہرحال اس وقت اس کو پریشان کرنا مناسب نہیں۔"

کارٹر ڈروز کا سر اظہار تسلیم کے لیے خم تھا۔ باپ نے جس انداز سے رخصت کیا

وہ قلب مجروح کا پردہ پوش تھا ۔ کارٹر اپنے آبائی وطن اور گہوارۂ طفلی کے خلاف داد شجاعت دینے روانہ ہوگیا۔ احساس فرض و دلیری ، وفاداری و سر فروشی کے کارناموں نے اس کو تھوڑے ہی زمانے میں اپنے ہم عمروں میں ممتاز اور افسروں کی نظر میں قابل قدر بنادیا۔ یہی اوصاف تھے اور سر زمین وطن سے واقفیت کہ اس وقت اس کو دشمن کی سرحد پر پاسبانی کی خطرناک ڈیوٹی پر مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن کسل راہ اور خستگی سفر نے عزم واستقلال پر عارضی غلبہ پالیا تھا اور نیند نے آدبایا تھا۔

خدا جانے کس نیکی یا بدی کے فرشتے نے خواب میں آکر اس کو اس خواب مجرمانہ سے بیدار کردیا اس نے داہنے ہاتھ سے رائفل کی گرفت کو سخت کرکے درختوں پر نظر ڈالی تو چٹان کے آخری کنارے پر افق آسمان کے مقابل ایک سوار کا شان دار بت کھڑا تھا۔ سوار کا ہلکا سبز لباس فلک اخضر کے ہم رنگ تھا۔ اس کا چہرہ کسی قدر بائیں جانب مڑا ہوا تھا ۔ صرف کنپٹی اور داڑھی کا ایک حصہ نظر آتا تھا وہ نیچے کسی عمیق و وسیع وادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سوار کی فلک پیما بلندی اور قرب دشمن کے خوف و [illegible] احتمال نے کارٹر کی نظر میں اس مجسمے کو نہایت ہیبتناک بنادیا ۔

کارٹر کے حواس درست ہوگئے ، خواب خیال ہوگیا اور موقع کی اہمیت و نزاکت کو دیکھ کر اس نے رائفل کا نشانہ درست کیا۔ نال کو جھاڑی سے نکال کر گھوڑا چڑھایااور سوار کے سینہ کو ہدف کے لیے انتخاب کیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اسی وقت انگلی سے ایک اشارہ بھی کردیتا ۔ لیکن اسی لمحے سوار نے سر کو جنبش دی اور پوشیدہ دشمن سپاہی کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نگاہیں سپاہی کے چہرے ، آنکھوں اور دل کے اندر سرایت کر رہی ہیں ۔ کیا جنگ میں دشمن کو ہلاک کرنا اس قدر خوف ناک ہے ، اور

خصوصاً اس دشمن کو جس نے وہ راز معلوم کرلیا ہے جو ہماری فوج کی حفاظت کا ضامن ہے، اس دشمن کو جو اپنے علم و آگہی کی بنا پر اپنی کثیر فوج سے زیادہ خطرناک ہے! کارٹر پر موت کی سی زردی چھا گئی اسے چکر آنے لگے ، ہاتھ کی گرفت رائفل پر سست ہوگئی اور سر آہستہ آہستہ جھک کر زمین پر آرہا ۔

یہ حالت دیر تک نہ رہی ، دوسرے ہی لمحے میں اس کا سر زمین سے اٹھا ، دونوں ہاتھ رائفل پر اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ انگلی نے گھوڑے کو تلاش کرلیا۔ ہوش و حواس صحیح ہوگئے ۔ غنیم کے سوار کو گرفتار کرلینا ممکن نہ تھا اور ہوشیار کردینا اپنی ہلاکت کا موجب ۔ سپاہی کا فرض ظاہر تھا۔ جھاڑی کے اندر سے سوار کو ہدف بندوق بنادینا چاہئے۔ بغیر اطلاع کے ، بغیر ایک لمحہ تیاری مرگ کے ، بغیر ایک وقفہ دعائے آخری کے ، اس کو اس خطرناک مخبری و راز جوئی کی سزا ملنی چاہئے ۔ لیکن نہیں ۔ ایک ذرا سی امید باقی ہے ۔ ممکن ہے اس نے کچھ نہ دیکھا ہو ، ممکن ہے محض مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ آیا ہو ، اگر موقع دیا جائے تامل کیا جائے تو وہ الٹے پاؤں واپس چلا جائے گا۔ اور یقیناً اس کے انداز مراجعت سے ظاہر ہوجائے گا کہ کس نیت سے آیا تھا۔ اب کارٹر نے پھر مجسمۂ سوار و اسپ پر نظر جمائی اور اب کے نشانہ بنانے کے لیے گھوڑے کو تاکا۔ یکایک اس کے دماغ میں وہ ████ الفاظ گونجنے لگے جو اس کے باپ نے رخصت کے وقت کہے تھے کہ " ہر حالت میں وہی کرنا جو تمہارا فرض ہو ۔" ان الفاظ نے سکون پیدا کردیا ، دانت عزم و استقلال کے ساتھ بند ہوگئے ، اعضا سوتے بچے کی طرح ساکن ہوگئے ۔ نبض اصلی رفتار پر آگئی ۔ سانس کی آمد و رفت میں باقاعدگی پیدا ہوگئی ، فرض شناسی نے فتح پائی ، روح نے جسم سے کہا : " ٹھہر اور ساکن رہ ۔ اور اس نے فیر کردیا۔

کارٹر ڈروز نے فیر کرنے کے بعد رائفل کو پھر بھرلیا اور پاس بانی شروع کردی مشکل

سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کی فوج کا ایک سارجنٹ آہستہ آہستہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل سرکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ کارٹر نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور بدستور بے حس و حرکت لیٹا رہا ۔

" کیا تم نے فیر کیا تھا؟؟" سارجنٹ نے آہستہ سے پوچھا۔

" ہاں"

" کس پر "

" ایک گھوڑے پر جو سامنے کی چٹان پر کھڑا تھا۔ دیکھو اب نظر نہیں آتا نیچے غار میں جا پڑا ۔"

کارٹر کا چہرہ سفید تھا، لیکن اس نے اپنے تلاطم جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا اور جواب دے کر منہہ پھیر لیا۔ سارجنٹ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ایک لمحے سکوت کے بعد بولا۔

" ڈروز ، ادھر دیکھو چھپانے کی ضرورت نہیں میں حکم دیتا ہوں کہ رپورٹ دو۔ کیا گھوڑے پر کوئی سوار تھا ؟؟

" ہاں "

" کون"

" میرا باپ "

سارجنٹ اچھل پڑا۔ اور بے اختیار اس کے منہہ سے نکلا اللہ! اللہ! یہ کہا اور خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

===XXX====

انگریزی کے ایک اور مشہور افسانے " دی گفٹ آف مے گی " کا ترجمہ انہوں نے

" تحفۂ محبت" کے عنوان سے نہایت سہل و سلیس اور فصیح و بلیغ کیا ہے - اس کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

" ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ کبھی یہی سرمایہ تھا ان میں سے ۶۰ سینٹ پینی کی شکل میں تھے - ایک ایک دو دو پینی بنئیے ، بقال اور قصاب کے سودے میں حجت و اصرار کرکے بچائی گئی تھیں جو بظاہر بخل و دناءت کی حد کو پہنچ گیا تھا۔

ڈیلا نے تین مرتبہ گنا۔ ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ اور کل کرسمس کا دن ہے -

اب سوا اس کے کیا چارہ تھا کہ فرش کوچ پر گر پڑے اور رونے لگے - ڈیلا نے یہی کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی گریہ آہ اور تبسم سے مرکب ہے جس میں آہ کو غلبہ و کثرت حاصل ہے۔

آٹھ ڈالر فی ہفتہ کرایہ کا مکان فقر و تنگ دستی کا نمونہ تو نہ تھا لیکن عیش و راحت کی شان بھی نہ تھی دروازے پر لیٹر بکس لگا ہوا تھا مگر خطوط سے ہمیشہ بے نیاز رہتا تھا۔ برقی بٹن بھی موجود تھا لیکن کوئی انسانی انگلی اس میں سے آواز پیدا نہ کرسکتی تھی ، ایک تختی بھی آویزاں تھی جس پر " مسٹر جیمس ڈلنگھم ینگ " کا نام لکھا ہوا تھا۔ سائن بورڈ کے نقوش کبھی روشن و نمایاں بھی رہ چکے تھے جب اس کے مالک کی آمدنی تیس ڈالر فی ہفتہ تھی - اب جب کہ یہ رقم بیس ڈالر رہ گئی تھی تو حروف اسم کی تابانی نے بھی مسمی کی بے رونقی کا ساتھ دیا تھا۔

لیکن جب مسٹر جیمس ڈلنگھم دفتر سے گھر واپس آتا تھا تو مسز جیمس یعنی ڈیلا " جم " کہہ کر اس کا استقبال کرتی تھی اور جم بادۂ محبت سے سرشار ہوکر خمار افلاس کو بالکل بھول جاتا تھا۔

ڈیلا رو دھوکر اٹھی آنسو پونچھے اور کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی - سوچنے لگی کل کرسمس ہے اور صرف ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ موجود ہیں - اور جم کے لیے نئے دن کا

کا تحفہ خریدنا ہے دیر تک غور کرتی رہی ان ٹکڑوں سے دامن میں کیا چیز آسکتی ہے۔ چیز نفیس اور عمدہ ہو اور جم کے قابل ۔ کھڑکیوں کے درمیان شیشہ لگا ہوا تھا۔ ڈیلا کو کچھ خیال آیا اور وہ دفعتاً شیشہ کے مقابل جاکھڑی ہوئی ۔ آنکھیں ایک خاص کیفیت کے ساتھ چمک رہی تھیں ۔ لیکن چہرے کا عکس بیس سیکنڈ ہی کے عرصے میں فق ہوگیا۔ اس نے جلدی سے بال کھول کر چھوڑ دیئے اور شیشے میں دیکھنے لگی۔

ان میاں بیوی کی ملکیت میں دو چیزیں تھیں جن پر دونوں کو بجا طور پر فخر و ناز تھا۔ ایک جم کی طلائی گھڑی جو باپ دادا سے ترکے میں ملی تھی ۔ دوسری ڈیلا کے بال ۔ اگر ملکۂ سبا کا محل ڈیلا کے مکان کے مقابل ہوتا اور ڈیلا کھڑکی میں کھڑی ہوکر سکھانے کی غرض سے اپنے بال لٹکادیتی تو ملکہ کا کوئی مرصّع زیور ان کا مقابلہ نہ کرسکتا ۔ اور اگر حضرت سلیمان اپنا بیش قیمت خزانہ نکال کر بیٹھتے اور جم ادھر سے گزرتے وقت جیب سے اپنی گھڑی نکال کر دیکھتا تو ہر مرتبہ گھڑی کو دیکھ کر حضرت اپنی داڑھی کھجانے لگتے ۔

ڈیلا کے خوب صورت بال اس کے جسم کے گرد لٹکے ہوئے تھے گویا سنہری پانی کا دریا موجیں مار رہا ہے ۔ بال ڈیلا کے زانو سے نیچے تک پہنچتے تھے اور اس کے لیے لباس کا کام دیتے تھے ۔ اس نے جلدی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بالوں کو لپیٹ کر باندھ لیا۔ ایک مدت کے لیے ٹھٹکی ، خاموش کھڑی رہی اور ایک دو قطرۂ اشک میلی سرخ دری پر ٹپک پڑے ۔ لیکن یہ تامل صرف ایک لمحہ کا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میلی جیکٹ اور پرانی ٹوپی پہن کر زینہ سے اتری اور سڑک پر آگئی اور ایک طرف کو روانہ ہوگئی ۔" (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) "صید و صیاد"، ص: ۸۶-۸۷

مولانا کے ترجمہ کردہ ایک اور افسانے " غیبی سزا" کا ترجمہ ملاحظہ ہو ۔

اس میں اگرچہ کہیں کہیں نامانوس اور ثقیل الفاظ ہیں مگر ان کا مطلب بھی آسانی سے ذہن میں آجاتا ہے اور قاری کو ذہنی کاوش نہیں کرنی پڑتی ۔ اس کے علاوہ اس میں جا بجا محاورات اور روزمرہ کی آمیزش نے عبارت کو اور بھی عام فہم بنادیا ہے :

" شام کا وقت ہے دن میں بڑھیا جانی کی تجہیز و تکفین ہوچکی ہے ۔ ایلزبتھ گھر میں آتشدان کے سامنے بیٹھی سوچ رہی ہے کہ اب زندگی کے دن کیوں کر کٹیں گے۔ وہ رفیق جو شادی کے دن سے پچاس سالہ متاہل زندگی میں ایک دن کے لیے بھی اس کی نظر سے اوجھل نہ رہا تھا ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔ اس کو اس بات کے تصور سے اور بھی اذیت تھی کہ یہ چھوٹا سا گھر اور مختصر سا کھیت اسی ہفتے کے آخر تک فروخت کردینا پڑے گا۔ اس لیے کہ یہ ذراسی جائداد ایک بے ایمان و دغا باز عزیز کی ضمانت میں مکفول ہے ۔ اصل زر ضمانت ۳۵ پونڈ تھا۔ لیکن لیوک فلنٹ موچی نے جس سے یہ رقم قرض لی گئی تھی شرط کرلی تھی کہ تا ادائے قرض پچاس فی صد سود دینا پڑے گا رفتہ رفتہ سود کی رقم کھیت اور مکان کی قیمت سے بھی بڑھ گئی اور جان اس صدمے سے دل شکستہ ہوکر مرگیا ایلزبتھ نے تمام ہمسایوں کو رخصت کردیا تھا ۔ چاہتی تھی کہ جتنے دن اس مکان میں گزریں تنہا رہے اور یاد ایام رفتہ میں وقت گزارے ۔ وہ دنیا میں تنہا تھی۔ اس مصیبت میں کوئی اس کا شریک نہ تھا۔ لیکن حالات اس درجہ یاس افزا تھے کہ آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہوگئے تھے۔

اس نے آپ ہی آپ کہنا شروع کیا۔ " جانی بھائی! وہ منظر اس وقت میری نظر کے سامنے ہے جب شادی کے روز تم میرے ساتھ گرجا گھر سے واپس آرہے تھے ۔ گاؤں بھر میں ایسا خوب صورت جوان نہ تھا۔ لیکن تم اپنے کفن میں بھی جب تمہارے رخسار زرد اور بال سفید

ہوگئے تھے ایسے ہی حسین تھے کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلی جاتی! جب میں اپنی مسرور زندگی کا تصور کرتی ہوں - جب یہ خیال آتا ہے کہ تم باوجود اس قدر حسین ہونے کے بھی کہا کرتے تھے کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں - میں جو کچھ کرتی تھی ہمیشہ اس کی تعریف ہی کیا کرتے تھے تو میری حالت دیوانوں کی سی ہوجاتی ہے - آہ! اب میں اس گھر سے جہاں اس قدر پر لطف زندگی گذری ہے نکال دی جاؤں گی - یہ نہایت سخت بات ہے! نہایت روح فرسا ہے -

وہ اسی تصور میں محو تھی کہ کمرے کے کواڑ کھلے اور قرض خواہ لیوک فلنٹ موچی داخل ہوا- وہ نہایت کریہہ منظر شخص تھا- اندر قدم رکھتے ہی آتشدان کی طرف بڑھا اور بغیر اجازت کے اس آرام کرسی پر بیٹھ گیا جس پر ہمیشہ چارلی وھائٹ بیٹھا کرتا تھا- ایلزبتھ غضبناک ہوکر اٹھی - اس کا دبلا کم زور چہرہ سرخ ہوگیا- بے دانت کا جبڑا حرکت کرنے لگا - اس نے کہا " میں شکر گذار ہوں گی اگر تم اس کرسی پر سے اٹھ جاؤ گے اس پر ہمیشہ ایک ایمان دار آدمی بیٹھا کرتا تھا- اور میں کسی دوسرے شخص کو اس پر بیٹھا نہیں دیکھ سکتی اگر بیٹھنا ہی ہے تو اس اسٹول پر بیٹھ جاؤ-"

موچی تعمیل کرنا نہ چاہتا تھا مگر لیکن ایلزبتھ کی شکل ایسی پر غضب تھی کہ وہ اٹھ کر دوسری طرف جا بیٹھا اور بولا - " ایلزبتھ وھائٹ اس قدر بد مزاجی کی ضرورت نہیں - یہ مکان عنقریب میرا ہونے والا ہے - میں اس کو خریدنے والا ہوں اور تم اس دروازے پر آکر بھیک مانگو گی -"

" میں بھوکوں مرجاؤں گی مگر تم سے بھیک نہ مانگونگی - ان بیہودہ باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

" میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم اس جگہ سے کوئی چیز نہیں لے جاسکتیں - میں اپنی دستاویز کی رو سے تمام چیزیں نیلام کراسکتا ہوں - اگر تم نے کسی چیز کو ہاتھ

لگایا تو تم ہو اور جیل خانہ! "

" میں بہت خوش ہوں گی جب تمہارے قرضے سے سبکدوش ہوجاؤں گی - تمہاری زندگی کا انحصار ہی ایسے لوگوں کو دھوکا دینے پر ہے ، جیسا میرا جان تھا۔ سیدھا سادھا بھولا بھالا - مجھے یقین ہے کہ قانون تمہاری حمایت دکریگا۔"

یہ سن کر فلنٹ کا رنگ اول سفید پڑ گیا۔ لیکن پھر سرخی جھلک آئی اور بولا۔

" ایلزبتھ وھائٹ تم قانونی چارہ جوئی کر دیکھو - میرا بال تک بیکا نہیں ہوسکتا۔ تمہارے شوہر نے قرضہ کی تحریر لکھ دی ہے اور بہ صورت عدم ادائے قرض مجھے اختیار ہے کہ اس زمین کو نیلام کرادوں - میں اس کو زمین کہتا ہوں! صرف چند ایکڑزمین جس پر گھاس کا پتا نہیں - اس سے تیس (۳۰) پونڈ بھی وصول نہ ہوں گے - اور یقین ہے کہ تمام فرنیچر دس پونڈ کا بھی نہ ہوگا - پھر بھی تم میری قرض دار رہو گی جس کے بدلے تم کو جیل جانا پڑے گا - اور میں اپنی باقی رقم کو صبر کروں گا۔

" میں تمہارے مقروض رہنے کے مقابلے میں دو سو بار جیل جانا پسند کرتی ہوں - لیکن جب تک اس گھر میں بیٹھی ہوں تمہاری دھمکیاں نہیں سن سکتی۔ چلے جاؤ بد معاش آدمی! نکل جاؤ! "

ایلزبتھ نے دروازہ کھولا - اور فلنٹ کو جانے کا اشارہ کیا۔

رات تاریک تھی۔ باد خزاں سوکھی پتیوں میں حرکت پیدا کرکے منظر کو وحشت ناک بنارہی تھی۔

فلنٹ نے جواب دیا۔ " بڑھی چڑیل! تجھے اس حرکت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ جب تو اس مکان سے جیل خانے جانے لگے گی تو میں لوگوں کو تیرے پیچھے لگادوں گا جو تجھے دیکھ کر قہقہے لگائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا ۔ لیکن ایلزبتھ کے لکڑی اٹھانے سے اس کی رفتار تیز ہوگئی ۔

" جب تک میں اس مکان کی مالک ہوں تمہاری یہ باتیں گوارا نہیں کرسکتی۔ جان قرضے سے زیادہ روپیے ادا کرچکا ہے ۔ چلو دفع ہو یہاں سے! اللہم اس مردود کو اسی رات میں سزا دے! کم بخت اگر تیری ناپاک ہستی نہ ہوتی تو ابھی برسوں مجھے سوگ میں بیٹھنا نہ پڑتا۔ میری عادت نہیں کہ کسی کو بد دعا دوں ۔ لیکن تجھے جو کچھ سزا ملے مناسب ہے ۔"

فلنٹ دروازے سے نکل گیا۔ ایلزبتھ نے پھر کواڑ بند کرلیے اور اپنی جگہ بیٹھ کر پھر انہیں اندوہناک تصورات میں محو ہوگئی ۔ فلنٹ اندھیری رات میں ایک سمت کو روانہ ہوگیا۔ ایلزبتھ کے غضب ناک انداز نے اس کے اعصاب پر خاص اثر کیا تھا۔ اور اس وقت اس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے دل ہی دل میں کہنے لگا۔

" بے شک یہ کوئی چڑیل ہے ، جادو گرنی ہے ، آنکھیں کیسی سرخ تھیں ۔ یہ میرے پر دادا کے وقت میں ہوتی تو لوگ اس کو دیکھ کر ڈرا کرتے ۔"

فلنٹ کی رفتار یکایک رک گئی اور اس کو یہ معلوم ہوا کہ کوئی چیز پیچھے سے اس کی پیٹھ کو پکڑ کر اوپر کی طرف اٹھارہی ہے ۔ اس ناگہانی آفت سے اس کے حواس گم ہوگئے غور کیا تو دیکھا کہ وہ زمین سے بلند ہوکر درختوں کی چوٹی کے برابر پہنچ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے منھ سے چیخ نکل گئی " دوڑو لوگو دوڑو! مجھے بھوت نے پکڑ لیا۔ دانتوں میں پکڑے ہوئے دوزخ میں ڈالنے کے لیے لے جارہا ہے "۔ لیکن رات زیادہ گذرچکی تھی ۔ گاؤں والے نیند میں غافل تھے۔ کون سنتا اور کون دوڑتا ۔ فلنٹ برابر اوپر کو اٹھا جارہا تھا ۔ کوئی جن دانتوں میں دبائے دریا کی طرف لے جارہا تھا۔ اب فلنٹ نے کہا ۔

شروع کیا۔

" اے خدا مجھے معاف کر۔ مجھے معاف کر۔ میری توبہ ہے ، آئندہ بے گناہوں کو نہ ستاؤں گا۔ خدایا اگر تو اس مرتبہ مجھ پر رحم فرمائے تو میں اپنے ظلم کی تلافی کرلوں گا۔"

دعا فوراً مقبول ہوگئی اور وہ جن کے پنجے سے چھوٹ کر دھم سے دل دل میں گرپڑا۔ دیر تک بے ہوش پڑا رہا ۔ جب حواس بجا ہوئے تو بڑی مشکل سے نکل کر سڑک پر آیا، اور بجائے اپنے گھر کے ایلزبتھ کی طرف چلا ۔ آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ ایلزبتھ کرسی پر سوگئی تھی۔ کھٹکے سے اٹھی اور دروازہ کھولا۔ اس وقت مدھم روشنی کمرے میں اس کی ہیئت پہلے سے بھی زیادہ وحشت انگیز نظر آتی تھی۔ فلنٹ کو دیکھ کر بولی " تم پھر آگئے ؟ جاؤ ۔ اتنی رات گئے کیا کام ہے ۔"

فلنٹ کانپ رہا تھا۔ بولا

" ایلزبتھ وھائٹ کاغذ لاؤ ۔ میں تمہیں قرضے سے معافی لکھ دوں ۔ تم بہت بری عورت ہو ۔ میں آئندہ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔"

ایلزبتھ نے قلم دوات و کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا " معلوم ہوتا ہے تمہارے ضمیر نے ملامت کی ۔ جو لکھنا ہے لکھ دو اور رخصت ہو ۔"

فلنٹ نے قلم اٹھایا اور لکھا ۔

" میں لیوک فلنٹ اس تحریر کے ذریعہ سے ایلزبتھ وھائٹ کو اس کے شوہر کا قرضہ معاف کرتا ہوں ۔ اور امید کرتا ہوں کہ آیندہ مجھ سے کوئی کچھ نہ رکھے گی ۔"

کاغذ عورت کو دے کر رخصت ہوا اور دل میں بہت خوش تھا کہ آج ایک بڑی بلا سے نجات ملی ۔

دو روز کے بعد فلنٹ پھر ایلزبتھ کے پاس آیا اور کہا :

" وہ تحریر مجھے واپس دے دو۔ تم بڑی ایمان دار عورت ہو ضرور دے دو گی۔ میرا خیال تھا کہ تم جادو گرنی ہو اور تم نے مجھ پر کوئی جادو کردیا ہے ۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس رات کو ایک ہوائی جہاز کا کانٹا میری پیٹھ میں اٹک گیا تھا۔ جس کے زور سے میں اوپر کو اٹھتا چلا گیا۔ وہ ہوائی جہاز اشتہارات تقسیم کرتا جارہا تھا۔ رات ہوگئی اور مشین کچھ بگڑ گئی ۔ جہاز والے کہیں اترنا چاہتے تھے انھوں نے کانٹا لٹکادیا تھا کہ کسی مضبوط چیز میں اٹک جائے تو نیچے اترجائیں ۔ لاؤ وہ کاغذ میرے حوالے کردو تم بڑی خوش معاملہ عورت ہو ۔ مجھے یقین ہے کہ انصاف سے کام لوگی۔"

ایلزبتھ نے پھر وہی لکڑی اٹھائی اور کہا :" میں تمہاری کمر دھری کردوں گی اگر فوراً نہ چلے جاؤگے ۔ تم نے مجھے جادو گرنی سمجھا تھا لیکن بے وقوف نہ سمجھنا۔"(۱)

==xxx====

تراجم کے سلسلے میں ان کا ایک اور اہم کارنامہ ابراھیم لنکلن لنکن کی زندگی کا خاکہ ہے جس کو مولانا نے اسٹرلنگ ماتھ کی مشہور انگریزی تصنیف ABE LINCOLN (Log cabin to White House) " ابراھیم لنکن جھونپڑی سے ایوان صدارت تک " سے اردو میں ترجمہ کیا ہے ۔

لنکن کی ذات امریکی قوم میں بڑی محبوب و مقبول ہے ۔ اور اس قوم کا ہر فرد اس کا نام نہایت عقیدت و احترام اور خلوص و محبت سے لیتا ہے ۔ در حقیقت لنکن اس خراج عقیدت کا مستحق بھی ہے ۔ وہ ایک غریب مزدور باپ کا بیٹا تھا اور ایک جھونپڑی میں پیدا ہوا تھا مگر اپنی انسان دوستی، محنت و مشقت اور ذاتی صلاحیتوں کے ذریعہ امریکہ کے منصب صدارت تک جا پہنچا۔ اس کی کوششیں اور کاوشیں نے اس کی زندگی کو دوسری

---

(۱) حامدحسن قادری، مولانا(مترجم) " صید و صیاد"، محولہ بالا ، ص ۹۵-۹۱

کے لیے نمونہ بنادیا۔ یہی سبب ہے کہ آج اس کا شمار دنیا کے ان انسانوں میں ہوتا ہے جو نسل و قوم سے ماورا ہوکر صرف انسانیت کے نام پر جد و جہد کیا کرتے ہیں۔ دنیا میں جب کبھی اور جہاں کہیں بھی آزادی کی جد و جہد کاذکر ہوتا وہاں ابراہام لنکن کا نام بھی ضرور دہرایا جائے گا۔

اسٹرلنگ نارتھ نے یہ کتاب خصوصیت سے امریکی بچوں کے لیے لکھی تھی اس لیے اس کا انداز و اسلوب اور حوالے و اشارے پاکستان والوں کے لیے نامانوس تھے۔ امریکی بچوں کو چوں کہ بچپن ہی سے بڑی بوڑھیوں کے ذریعہ یا اسکول کی درسی کتابوں اور دیگر قصے کہانیوں کی کتابوں کے ذریعہ لنکن کی زندگی کے حالات سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے اس لیے ان کے واسطے اصل انگریزی کتاب کا انداز تحریر نامانوس نہیں ہے۔

مولانا نے چوں کہ یہ ترجمہ پاکستانیوں کے لیے کیا ہے اس لیے انھوں نے ترجمے کے وقت اس کتاب کے انداز کو بدلنے کی ضرورت محسوس کی اور اردو داں طبقے میں اس کو مقبول بنانے کے لیے جگہ جگہ انداز بیان میں تبدیلی کردی۔ اس کے باوجود بھی امریکی ناموں کی کثرت نے کہیں کہیں کتاب کو ثقیل بنادیا ہے۔ ایسا کرنا ناگزیر تھا۔

مولانا کے اس ترجمے سے ابراہام لنکن کی سادہ و دل کش شخصیت کے خد و خال کے ساتھ اس کی تصویر نظر کے سامنے ابھر جاتی ہے۔ مولانا ترجمہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

" ایب (ابراہام لنکن) اگرچہ اپنے ساتھیوں کی طرح طبع کا سامان بہم پہنچاتا تھا لیکن خود اس کا ذہن تشنہ رہتا اس کی دماغی قوتیں اور ذہنی صلاحیتیں اپنے ساتھیوں کی نسبت کہیں زیادہ تھیں۔ اس کے اندر علم کی جستجو برابر بڑھ رہی تھی۔ بعض دفعہ وہ کتابوں کی تلاش میں دور دور کا چکر لگاتا۔ اخبارات اورزمانے میں نہ اس قدر عام تھے اور نہ آسانی سے ملا کرتے تھے، کسی اخبار کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اکثر اسے

میلوں کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے اندر سیاسی شعور بیدار ہوچکا تھا۔ اور اب وہ قصبہ کی خاموش و منجمد فضا سے گزر کر ملک کی سیاست میں دل چسپی لینے لگا تھا۔ ابتدا میں اسے ڈیموکریٹک پارٹی سے دل چسپی تھی - لیکن بعد میں اسے وگ پارٹی کے خیالات اور اصول زیادہ موزوں معلوم ہونے لگے - اب تقریباً چوتھائی صدی تک اپنے سیاسی معتقدات کے لحاظ سے وگ رہا - اس کے بعد ۱۸۵۰ء کے وسط میں وہ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہوگیا۔ اسی پارٹی نے بالآخر اس کو امریکہ کے ایوان صدارت وائٹ ہاؤس تک پہنچایا۔ اس زمانے میں دو کتابوں نے لنکن کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان میں سے ایک ریاست انڈیانا کے ترمیم شدہ قوانین کی کتاب تھی اور دوسری کولمبین کلاس بک - ان دونوں کتابوں کو اس نے بڑی توجہ کے ساتھ بار بار پڑھا - ان میں سے پہلی کتاب نے اس میں قانون کے مطالعے کا شوق پیدا کیا اور اس کتاب سے اس کے دل میں اعلان آزادی اور اس کی مصنف ٹامس جیفرسن کی عزت بڑھی، اس کتاب کے مطالعہ سے لنکن کو دوسرے قانونی مسودات مثلاً امریکی دستور کی پہلی دس ترمیمات کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کتاب نے اسے یہ خیال دلایا کہ اولڈ نارتھ ویسٹ کے تمام علاقے میں جس میں انڈیانا کی ریاست بھی شامل تھی، غلامی کے رواج کو غیر قانونی قرار دینا چاہئے -

ان کتابوں کے مطالعے سے لنکن کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہوا - اس کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے ذہن میں علم کے نئے دریچے کھل گئے ہوں - اس کے ذہن میں بار بار "میثاق آزادی" کے یہ فقرے گونجنے لگے :

> "تمام انسان ایک دوسرے کے برابر پیدا کئے گئے ہیں ان کے پیدا کرنے والے نے انہیں بعض ایسے حقوق عطا کئے ہیں جو ان سے چھینے نہیں جاسکتے - اور ان حقوق میں زندگی، آزادی اور مسرتوں کی جستجو کا حق شامل ہے -" (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم)، "ابراہام لنکن"، کراچی: انجمن پریس، ۱۹۵۷ء، ص: ۲۱-۲۰

ان تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عربی و فارسی پر ہی مکمل طور پر عبور نہ رکھتے تھے بلکہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں بھی انہیں ید طولا حاصل تھا - ان کی ترجمہ کی ہوئی دو اور کتابیں " الکمل اور زندگی" اور " فطرت اطفال" بھی اپنی مثال آپ ہیں اور نہایت سلیس و سادہ زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

یہ بات مولانا کی فطرت میں داخل تھی کہ جس بات سے ان کے دل و نظر کو تقویت اور روح کو بالیدگی ملتی تھی وہ اس کو دوسروں تک پہنچاکر ان کو اپنی اپنی مسرتوں میں شریک کرنا یا کسی اچھی و مفید بات سے روشناس کرانا چاہتے تھے اسی مقصد کے لیے انھوں نے فارسی زبان کے مشہور بزرگ رباعی گو شاعر مولانا ابوسعید ابوالخیر کی رباعیوں کا اردو میں نہایت عمدہ و دل کش ترجمہ کیا ہے ، جس کا ذکر شاعری کے باب میں شامل ہے۔

۱۹۲۳ع کی بات ہے کہ مولانا کان پور سے بچوں کا اخبار " سعید" نکالا کرتے تھے۔ جو نہ صرف بچوں میں بلکہ بڑوں میں بھی بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں کلکتے کے ایک اشاعتی ادارے " میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ" نے بنگال کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب گارڈ نر (Gardener) " باغ بان" انگریزی میں شایع کی اور مولانا سے اس کا ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ مولانا نے یہ پیش کش منظور کرلی اور مصنف کے دیباچے سے لے کر تمت بالخیر تک ایسا عمدہ ترجمہ کردیا کہ اگر اس پر مولانا کا نام بحیثیت مترجم کے نہ ہوتا تو کوئی شناخت نہ کرسکتا تھا کہ یہ ترجمہ ہے یا اصل -

اول کتاب کے دیباچے کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

" دیباچہ مصنف

یہ نغمات محبت و حیات جن کا ترجمہ بنگالی زبان سے اس کتاب میں شائع کیا جاتا ہے ان میں سے اکثر ان مذہبی نظموں کے سلسلے سے جو " گیتان جلی"

میں شامل ہیں، بہت پہلے لکھے گئے تھے - ترجمہ ہر مقام پر لفظی نہیں رہا ہے بعض اصل کو کہیں مختصر کردیا گیا ہے اور کہیں صرف اس کا مطلب کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے -

رابندر ناتھ ٹیگور"

اگرچہ ایک طرف یہ دیباچہ مولانا کی ادبی دیانت داری کا آئینہ دار ہے کیوں کہ وہ دیباچہ اپنی طرف سے بھی لکھ سکتے تھے - اور اس میں اپنی تعریف و تعلی اور خود ستائی و خود نمائی بھی ہوسکتی تھی مگر مولانا نے مصنف کے الفاظ کو جوں کا توں رکھا بلکہ ترجمے سے انہیں اور بھی حسین و دل کش بنادیا- دوسری طرف مولانا نے اپنے مذہبی عقیدے اور خود داری کو بھی قائم رکھا اور کلکتے کی اس انگریزی فرم سے جو بنگال کے مایۂ ناز اور صف اول کے عالم و شاعر کی نظموں کا ترجمہ کرانا چاہتا تھا کہدیا کہ ترجمہ جیسا کچھ میں کروں گا وہ اول تا آخر حرف بحرف شائع کیا جائے گا اور کسی اور کو اس میں کچھ قطع برید کا یا ترمیم و تنسیخ کا اختیار نہ ہوگا - کمپنی نے مولانا کی یہ بات فوراً قبول کرلی-

مولانا نے سب سے پہلے کتاب کی لوح پیشانی پر خط نستعلیق میں بسم اللہ شریف لکھی پھر نظم کا عنوان لکھا اور ترجمہ شروع کردیا- ذیل میں (گارڈنر) " باغ بان" کی پہلی نظم کا ترجمہ بسم اللہ سے ہی شروع کیا ہے - اس نظم کا عنوان بھی باغ بان ہی ہے:

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

باغ بان

خادم : میری ملکہ! اپنے خادم پر مہربانی کیجئے -

ملکہ : دربار برخاست ہوگیا- میرے سب خدام چلے گئے - تم اتنی دیر میں کیوں آئے ؟

خادم : جب آپ اوروں کو نمٹا چکیں تو اب میری باری ہے - میں یہ درخواست کرنے آیا ہوں کہ اپنے آخری خادم کے لیے جو کچھ کرسکتی ہیں کیجئے -

ملکہ : تم کیا امید رکھ سکتے ہو جب کہ اتنی دیر ہوگئی ہے ؟

خادم : مجھے اپنے باغ کا مالی بنادیجئے ۔

ملکہ : یہ کیا حماقت ہے!

خادم : میں اپنے اور سب کام چھوڑ دوں گا ۔ میں اپنی تلواریں اور نیزے
پھینک دوں گا۔ مجھے دور دراز مقامات پر نہ بھیجئے ۔ نئی فتوحات
حاصل کرنے کا حکم نہ دیجئے ، بلکہ مجھے اپنے باغ کا مالی بنادیجئے ۔

ملکہ : تمہارے فرائض کیا ہوں گے ؟

خادم : آپ کے بے کار دنوں میں خدمت کرنا ، میں سبزہ زار کو ترو تازہ رکھوں گا
جہاں آپ صبح کو ٹہلتی ہیں۔ جہاں ہر قدم پر آرزو مند مرگ پھول
آپ کی قدم بوسی کریں گے ۔ میں درختوں کی شاخوں میں آپ کو جھولا
جھلاؤں گا۔ جہاں (ابتدائے شب) کی چاندنی آپ کے درشن کو
بوسہ دینے کے لیے درختوں کے پتوں سے جد و جہد کیا کرے گی ۔ میں
اس چراغ میں خوش بو دار تیل بھرا کروں گا جو آپ کی خواب گاہ میں
روشن رہتا ہے اور آپ کے پاؤں کو صندل اور زعفران کے عجیب عجیب
نقوش سے زینت دوں گا۔

ملکہ : تم انعام کیا لو گے ؟

خادم : آپ کے کنول کی کلیوں جیسے نرم مشت نازک کو پکڑنا اور آپ کی کلائیوں میں
پھولوں کی زنجیریں پہنانا ۔ اشوک کی پتیوں کے عرق سے آپ کے تلوؤں کو
رنگنا اور ان کو چوم کر مٹی کا داغ ان پر سے دور کرنا۔

ملکہ : میرے خادم! تمہاری درخواست منظور کی جاتی ہے ۔ تم میرے باغ کے مالی ہوگے۔

اسی مجموعے کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو :

" محبت پر اعتماد کرو اگرچہ وہ غم انگیز ہو۔ اپنے دل کو تنگ نہ کرو"

" آہ! نہیں میری دوست ، تمہارے الفاظ تاریک ہیں، میں ان کو نہیں سمجھ سکتا۔"

==XXX===

" پیاری! دل تو ایک آنسو اور ایک نغمے کے ساتھ دے دینے ہی کے لیے ہے ۔"

" آہ! نہیں میری دوست، تمہارے الفاظ تاریک ہیں، میں ان کو نہیں سمجھ سکتا۔"

==XXX===

" مسرت قطرۂ شبنم ناپائیدار ہے کہ جب ہنستا ہے مرجاتا ہے ۔ لیکن غم مضبوط اور دیرپا ہے ۔ غم ناک محبت کو اپنی آنکھوں میں بیدار ہونے دو۔"

" آہ! نہیں میری دوست تمہارے الفاظ تاریک ہیں، میں ان کو نہیں سمجھ سکتا۔

" کنول تو سورج کے سامنے کھلتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے سب کھودیتا ہے۔ موسم سرما کے دائمی کہر میں وہ غنچہ بنا نہیں رہتا۔"

" آہ! نہیں میری دوست ، تمہارے الفاظ تاریک ہیں، میں ان کو نہیں سمجھ سکتا۔" (۱)

===XXX====

ان کی ترجمہ کردہ ایک اور نظم دیکھئے اور حظ اٹھائیے :

اے دیوانے مست و مدہوش !

اگر تو ٹھوکر مارکر اپنے دروازے کھول دے، اور احمقانہ حرکات کرتا پھرے ۔

اگر تو اپنا کیسۂ زر ایک شب میں خالی کردے اور دانائی کو برباد کردے ۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) "(Gardener) باغ بان"، (منظومات رابندر ناتھ ٹیگور) ، کلکتہ :میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ ، ۱۹۲۳ء، ص ۳-۱ اور ۳۸-۴۷

اگر تو عجیب و غریب راستوں پر چلے اور فضول چیزوں کے ساتھ کھیلے -

اگر تو هوش و خرد کی پروا نہ کرے -

اگر طوفان میں اپنے بادبان کھول کر پتوار کے دو ٹکڑے کردے ، تو اے دوست !

میں تیرا ساتھ دوں گا ، مخمور رهوں گا ، اور خراب حال هوجاؤں گا ۔

میں نے اپنے دن اور راتیں مستعد ، عقل مند هم سایوں کی صحبت میں ضائع کردی هیں ۔

فراوانیٔ علم نے میرے بال سفید کردیئے هیں اور کثرت بیداری نے میری نظر کم زور ۔

برسوں میں نے بہت سی چیزوں کے ریزے اور ٹکڑے جمع کرکے انبار لگائے هیں ۔

ان کو کچل ڈال ، ان پر رقص کر اور ان کو هوا میں اڑادے -

کیوں کہ میں جانتا هوں کہ انتہائے دانائی مخمور رهنا - اور خراب حال هوجانا هے ۔

===XXX====

تمام ناراست اعتقادوں کو مٹ جانے دے - اور مجھے اس طرح راستہ بھول جانے دے

کہ پھر ملنے کی امید هی نہ رهے - جنوں وحشت ساماں کا طوفان اٹھنے دے اور مجھے

لنگری سے جدا هوجانے دے -

دنیا قابل ، محنتی ، مفید اور هوشیار آدمیوں سے آباد هے ، ایسے آدمی بھی هیں

جن کو آسانی سے سبقت حاصل هوگئی هے اور ایسےبھی جو عزت کے ساتھ ان کی متابعت

کرتے هیں ۔

ان کو شاد و آباد رهنے دے ، اور مجھے بے عقل و بے کار -

کیوں کہ میں جانتا هوں کہ تمام کاموں کا انجام مخمور رهنا اور خراب حال هوجانا هے ۔

===XXX====

میں اس وقت معزز لوگوں کا مرتبہ حاصل کرنے کے تمام حقوق سے دست بردار هونے کی

قسم کھاتا ہوں -

میں اپنے علم اور تمیز نیک و بد پر فخر کرنا چھوڑے دیتا ہوں

میں قوت حافظہ کے ظرف کو توڑ ڈالوں گا اور آنسوؤں کے آخری قطرے کو گرادوں گا۔

میں شراب سرخ کے جھاگوں سے نہاؤں گا ، اور اپنی ہستی کو روشن کروں گا۔

میں اس کام کے لیے تہذیب و سنجیدگی کے تمغے کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔

میں سچی قسم کھاؤں گا کہ بے کار رہوں گا اور مخمور و خراب حال۔

نہیں میرے دوستو! میں جوگی نہیں بن سکتا۔

تم جو چاہو کہو۔ میں ہرگز جوگی نہیں بن سکتا۔ اگر وہ وہ میرے ساتھ

(جوگی بننے کا) عہد نہ کرے -

یہ میرا مصمم ارادہ ہے کہ اگر مجھے کوئی سایہ دار جائے امن اور کوئی شہک

ریاضت نہ مل سکے گا تو میں ہرگز زہد اختیار نہ کروں گا -

===xx===

نہیں ، میرے دوستو! میں ہرگز اپنا گھر بار نہیں چھوڑ سکتا اور خلوت صحرا

اختیار نہیں کرسکتا ، اگر اس کے گونج پیدا کرنے والے سایہ میں کوئی خندہ رو زمزمہ سنج نہ

ہو، اگر کسی زعفرانی دوپٹے کا پلّو ہوا میں نہ اڑتا ہو ، اگر اس (خلوت صحرا) کا سکوت

آہستہ سرگوشیوں سے زیادہ گہرا نہ بن جائے -

میں ہرگز جوگی نہ بنوں گا - (١)

==xx====

---

(١) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) "باغ باں (ترجمہ منظومات رابندر ناتھ ٹیگور"،

محولہ بالا ، ص: ٣٣-٣٢

ایک اور نظم کا ترجمہ ہے :-

چراغ کیوں بجھ گیا؟

میں نے ہوا سے بچانے کے لیے اس کو اپنے دامن میں چھپالیا،

اسی سبب سے چراغ بجھ گیا۔

پھول کیوں مرجھا گیا؟

میں نے بے خودیٔ محبت میں اس کو دل پر رکھ کر دبادیا،

اسی سبب سے پھول مرجھا گیا۔

چشمہ کیوں خشک ہوگیا؟

میں نے اس سے کام لینے کے لیے اس پر پشتہ باندھا،

اسی سبب سے چشمہ خشک ہوگیا۔

ستار کا تار کیوں ٹوٹ گیا؟

میں نے اس سے وہ راگ نکالنے کی کوشش کی جو اس کی طاقت سے بعید تھا،

اسی سبب سے تار ٹوٹ گیا۔(۱)

==xxx===

مندرجہ بالا امثال سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مولانا کو دوسری زبانوں سے اردو نثر و نظم میں ترجمہ کرنے کی کیسی مہارت تھی۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے سعید نفیسی کے فارسی افسانوں، یا رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور معروف تصنیف "گارڈنر" (Gardener) کا عوام کے لیے ترجمہ کیا بلکہ انھوں نے خصوصیت سے بچوں

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) "باغ بان(ترجمہ منظومات رابندر ناتھ ٹیگور)"، محولہ بالا، ص ۸۳

کے لیے بھی کئی کتابیں انگریزی سے اردو میں نہایت سلیس و سہل زبان میں ترجمہ کیں۔ جس میں اسٹرلنگ نارتھ کی " ابراہام لنکن" خصوصیت سے قابل ذکر ہے اس ترجمے کی ابتدا بھی وہ ابراہام لنکن کے اس قول سے کرتے ہیں :

" میری زندگی کے ابتدائی واقعات کو اختصار مگر جامعیت

کے ساتھ صرف ایک فقرے میں بیان کیا جاسکتا ہے اور وہ فقرہ گرے

کے مرثیے میں موجود ہے :

" غریبی کی سادہ و مختصر کہانی"

ابراہام لنکن" (۱)

*****

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مترجم) ، " ابراہام لنکن"، محولہ بالا ، ص

چھٹا - باب

مولانا قادری بحیثیت شاعر

چھٹا ـ باب

مولانا قادری بحیثیت شاعر

جس زمانے میں مولانا قادری نے اپنی ادبی سرگرمیوں اور شعر و سخن کی ابتدا کی وہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس زمانے میں لکھنو اور دلی کی بساط شاعری الٹ چکی تھی - ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور رستخیز بے جانے مغرب و مشرقی تمدن کو کچھ اس طرح متصادم کیا تھا کہ اہل مشرق کو دنیا تاریک نظر آنے لگی تھی اور جب مشرق کی آنکھیں کھلیں تو نہ کوئی ملک تھا اور نہ کوئی ملت ، البتہ مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات بہت گہرے ہوتے جارہے تھے۔ ملک اور قوم کو اگرچہ اس انقلاب کے سبب سیاسی و سماجی اعتبار سے بڑا نقصان پہنچا مگر اردو شعر و ادب کے لیے یہ ایک فال نیک ثابت ہوا۔ کیوں کہ قدیم و جدید تہذیبوں کے تصادم سے ہندوستان میں ایسی تحریکیں کو ابھرنے میں بڑی مدد ملی جو آگے چل کر ملک و قوم اور شعر و ادب کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئیں -

اردو شعر و ادب میں ابتداہی سے یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے دیگر زبانوں کے الفاظ و خیالات کو لبیک کہا ہے اور حسب ضرورت اپنے مزاج کو وقت کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہے لہذا ہمارے شعرا و ادبا نے بھی اندازہ لگالیا کہ اب وقت سے مصالحت کرنی ہوگی اس لیے اس انقلاب سے شعر و ادب میں بھی ایک نیا انقلاب رونما ہوا - ادیب و شاعر تخیلات کی طلسمی فضاؤں کو خیر باد کہہ کر حقیقت و واقعیت کی دنیا میں آگئے -

انقلاب سے بیشتر کی شاعری سراسر تقلیدی و رسمی تھی جو صرفاً لفظی مداحی، مبالغہ آرائی، خارجی حالات ، ادنا جذبات نگاری اور یاس و قنوطیت سے بھری ہوئی تھی- اس انقلاب نے ایک نئے طرز معاشرت کو جنم دیا جس سے علم و ادب ، شعر و سخن اور

تہذیب و تمدن سب ہی متاثر ہوئے ۔ زندگی کے مسائل و معاملات میں انقلاب آیا، روایت سے بغاوت ہونے لگی، نئے نئے خیالات و تصورات ابھرنے لگے، فکر و نظر کی نئی نئی شمعیں روشن ہوئیں، شعراء کے ادراک و احساس، شعور و وجدان اک نئی راہ پر گامزن ہوگئے ۔ شاعری جو اب تک عشق و شباب ، حسن و جمال ، ہجر و وصال اور زلف و رخسار کی داستان تھی اس میں قومی و ملّی احساس کا جذبہ کارفرما نظر آنے لگا۔

مولانا کی شاعری پر عصری رجحانات کا اثر :

۱۸۵۷ء کے انقلاب اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دلّی و لکھنؤ کی فضا خانہ جنگیوں اور بد امنیوں سے مسموم تھی اہل علم و فن دھلی و لکھنؤ سے رخصت ہو رہے تھے۔ لہذا دلّی اور لکھنؤ کے بہت سے شاعروں نے رام پور اور حیدرآباد (دکن) میں پناہ لی۔ یہ دونوں ریاستیں اس زمانے میں شعر و ادب کا گہوارہ بنی ہوئی تھیں۔ فرماں روائے رام پور کی علم دوستی و ادب نوازی کے سبب اس چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل کمال اور ارباب فن جمع ہوگئے تھے۔ علماء کے گروہ میں علامہ عبدالحق خیرآبادی، اطبا میں حکیم احمد رضا اور شاعروں کی تو پوری ایک جماعت تھی نامور شعرا میں شیخ امداد علی بحر، منشی امیر احمد مینائی، داغ دھلوی، جلال لکھنوی، تسیم لکھنوی، تسلیم لکھنوی، منیر، قلق، ضیا، غنی، اور منشی امتیاز احمد خاں راز رام پوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

رام پور اس زمانے میں علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ نواب کلب علی خاں خود بھی شاعر تھے اور تمام شعرا کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ جس کے متعلق مولوی عبداللطیف خاں کشتہ لکھتے ہیں :

" فرماں روائے رام پور کی قدردانیوں کی کشش نے بعد انقلاب ۱۸۵۷ء دھلی، لکھنؤ اور گرد و پیش کے ارباب کمال خصوصاً علماء ، فضلاء، ادیبوں اور

شاعروں کو جمع کرکے اپنے اس دور کا بغداد بنادیا تھا۔ اس کا محلہ محلہ علم و فن کا ایک مرکز تھا، جہاں رات دن علمی تذکرے رہتے، شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتیں، گلی کوچہ امیر و داغ کی غزلوں کے نغموں سے گونج رہا تھا۔" (۱)

مولانا کے ہوش سنبھالتے سنبھالتے ایک نیا دور آچکا تھا جس میں حالی، آزاد اور سرسید جیسے مصلحین و محسنین اردو پیش پیش تھے۔ مولانا قادری کا بھی گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہونا اک امر لازمی تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں بچپن ہی سے شعر و ادب سے اک دلی مناسبت پیدا ہوگئی اور انھوں نے گیارہ بارہ برس ہی کی عمر سے شعر و شاعری کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی تحریر کرتے ہیں :

" قادری صاحب کے والد مولوی احمد حسن رام پور میں وکیل تھے، اس کی چمن بندی لکھنو اور دہلی کی خزاں سے ہوئی تھی۔ اور وہ غدر کے بعد اہل کمال کے لیے " دارالسرور" بن گیا تھا۔" ناظم مہر آئے یہاں، ہم ہیں قدرداں" مخصوص دعوت کے ساتھ صلائے عام بھی ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں امیر رام پور پہنچ گئے اور عدالت عالیہ کا منصب افتا ان کے سپرد کیا گیا۔ اس وقت ہر جگہ شاعری کے چرچے تھے۔ زبان کا کھرا کھوٹا پرکھا جارہا تھا اور ایک ایک لفظ کی تراش خراش دیکھی جاوہی تھی، قادری صاحب نے اسی ماحول میں ہوش کی آنکھ کھولی اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو خود اچھے شاعر، عالم اور محدّث تھے۔ ان کا گھر محلہ گھیر کھنتال کہنہ میں امیر مینائی کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا جب دوسرے ۱۸۹۹ء میں امیر کے گھر میں آگ لگی ہے اس وقت قادری صاحب کی عمر گیارہ برس کی تھی لیکن وہ امیر و داغ کے اشعار گنگناتے اور ان سے مزے لیتے تھے۔" (۲)

---

(۱) کشتہ، عبداللطیف خان، " حامد حسن قادری" (مقالہ) " سہ ماہی" اردو نامہ" کراچی : جنوری تا مارچ، ۱۹۶۵ء، شمارہ ۱۹، ص ۹

(۲) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ " حامد حسن قادری" (مقالہ)، " نقوش"، لاہور: جنوری، ۱۹۵۵ء، (شخصیات نمبر)، صص ۸۳-۲۸۲

رام پور کی علمی و ادبی فضا اور اندرونِ خانہ و بیرونِ خانہ کی ادبی سرگرمیوں نے قادری صاحب کے ذہن کو جلا بخشی اور انہوں نے بارہ تیرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کردیا۔ ان کے ابتدائی دور کی شاعری انہیں کے قول کے مطابق ۱۶ غزلیں اور ۹۳ اشعار پر مشتمل ہے - یہ وہ زمانہ تھا جب تک انہوں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ نہ کیا تھا۔ چوں کہ اس وقت ذہنوں پر عام طور سے امیر مینائی اور جلال لکھنوی کا رنگ سخن چھایا ہوا تھا اس لیے مولانا نے بھی وہی رنگ اختیار کیا اور راز رام پوری سے شرفِ تلمّذ حاصل کیا۔ اس سلسلے میں اپنی استادی و شاگردی اور شعر و سخن کی روداد مولانا خود یوں بیان کرتے ہیں :

" میرے استاد شاعری جناب منشی امتیاز احمد خاں راز رام پوری (رحمتہ اللہ علیہ) (عرف پیارے خاں) بہت کم آمیز و کم سخن بزرگ تھے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگرد رشید صحبت یافتہ ، ہم محلہ تھے۔ امیر صاحب کے ساتھ بھوپال کے سفر میں رہے۔" امیر اللغات "کی تالیف میں معاون رہے - امیر کے بڑے محبوب شاگرد تھے - امیر خطوط میں راز کو اکثر القاب " پیارے پیارے" لکھا کرتے تھے - استاد نے راز کی استادی کو تسلیم کرلیا تھا لیکن راز صاحب نے کبھی شاعری کو پیشہ نہ بنایا بلکہ رام پور میں مستاجری کا پیشہ کرتے رہے - سرکاری دیہات کا ٹھیکہ لیتے تھے اور نہایت خاموش زندگی بغیر دبدبہ و شان کے بڑے وقار کے ساتھ بسر کرتے تھے - اسی وجہ سے شاگرد بنانے اور اصلاحِ سخن سے نہایت بے نیازی برتتے تھے۔ گنے چنے شاگرد تھے جو زبردستی ان کے سر ہوگئے تھے - ان سے بھی یہ معاملہ تھا کہ ایک غزل کی اصلاح ہفتوں اور مہینوں ملتی رہتی تھی - کسی مشاعرے کی ضروری غزل ہوتی اور ان کو فرصت ہوتی تو ہاتھ کے ہاتھ درست کرکے دے دی - ورنہ میرے ساتھ چند بار ایسا ہوا کہ کچھ دن بعد غزل لینے گیا تو معلوم ہوا کہ اچکن کی جیب میں تھی - دھوبی کے یہاں دھلنے چلی گئی :-

---

فانی جو ہے کب تک وہ رہے گا باقی
سچ ہے کہ بقا تجھی کو ہے " یاباقی"
دشمن نے مری غزل کو کڑوا سمجھا
برچے یہ غزل رہی نہ پرچا باقی

راز صاحب کی اپنے تمام شاگردوں کو تاکید تھی کہ بغیر اصلاح کے اپنا کلام شائع نہ کرائیں ۔ کم سے کم میں ان کی اس ہدایت کو اپنے لیے بہت اہم سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ میرے کلام میں خامیاں تھیں اور مجھے ان کا احساس تھا۔ اسی لیے میں استاد مغفور کی نصیحت پر تک سختی سے عمل کرتا تھا اور ان کو دکھائے بغیر اپنا کلام چھپنے کو نہیں بھیجتا تھا۔

اب یہ صورت تھی کہ طبیعت میں شوق و جوش تھا کہنے کو جی چاہتا تھا اور چھپوانے کو بھی لیکن ہر غزل یا نظم پر فوراً اصلاح استاد کی بے نیازی کے باعث ممکن نہ تھی۔ آخر میں نے سوچا کہ کیوں اور فرضی نام سے چھپواؤں ۔ اس زمانے (۱۹۱۰ع) میں راز صاحب کے پاس ان کے استاد بھائی حکیم برہم گورکھپوری کا ہفتے وار پرچہ " فتنہ و عطر فتنہ " آتا تھا۔ میں نے اسی کو تختۂ مشق بنایا اور مشہور امثال اور کہاوتوں پر قطعے لکھ کر بھیجنے شروع کیے ۔ فتنہ میرے نام باقاعدہ آنے لگا ۔ کبھی برابر ہفتے وار اور کبھی مہینے میں ایک دو بار میرے قطعے چھپنے لگے ۔ " فتنہ" میں دو شاعر ضیادہلوی اور ضیا لکھنوی کا کلام چھپتا تھا۔ میں نے تیسرا شاعر پیدا کرنے کے لیے "ضیا رام پوری" اپنا فرضی نام رکھ لیا۔

جب یہ قطعے اکثر چھپے اور راز صاحب کی نظر سے گذرنے لگے (ان قطعات کی امثال آئندہ صفحات میں شامل ہیں) تو ان کو جستجو ہوئی کہ یہ رام پور کا کون شاعر ہے ۔ رام پور کے جتنے شاعر تھے وہ سب کو جانتے تھے۔ ضیا تخلص کسی کا نہ تھا۔ اس لیے راز صاحب نے بھی یہی سمجھا کہ کوئی شاعر اس فرضی نام سے لکھتا ہے ۔ مگر کون ہے ؟ مجھ سے بھی ذکر کیا اور قطعوں کی تعریف کی ۔ میں اپنی تعریف اپنے استاد سے سن کر بہت خوش ہوتا تھا اور جب کوئی قطعہ چھپتا تھا میں اسی دن استاد کے پاس بھیجتا تھا۔ وہ کبھی " فتنہ" میں سے خود وہ قطعہ سناتے تھے کبھی مجھے پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے۔

میں ان کو یہ علم بھی نہ ہونے دیتا تھا کہ " فتنہ" میرےپاس بھی آتا ہے ۔ میں یہ التزام رکھتا تھا کہ قطعے کہہ کہہ کر رکھ لیتا تھا اور سفر حضر میں برابر " فتنہ " کو بھیجتا رہتا تھا۔

آخر ایک دن بھانڈا پھوٹ گیا اور یہ غالباً اس وقت ہوا جب میں فروری، ۱۹۱۱ء میں اندور کی ملازمت ترک کرکے منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لیے رام پور واپس آیا۔ ایک دن استاد کے پاس گیا تو وہاں کوئی نئے شخص بیٹھے تھے جن کو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ میں جاکر بیٹھا تو استاد نے ان صاحب سے میرا تعارف کرایا کہ ان کا نام حامد حسن قادری ہے ۔ نام سنتے ہی ان حضرت نے راز صاحب سے کہا کہ ان سے پوچھیے " ضیا رام پوری" کے قطعے مجھے یہی بھیجا کرتے تھے۔ استاد کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی ۔ خوش بھی ہوئے اور افسوس بھی کیا ۔ کہنے لگے " حامد میاں! یہ تم نے بڑی نادانی کی ایسی اچھی نظمیں کو ضائع کردیا۔ گم نام رہیں۔ اپنے نام سے شائع کرنا تھا۔" میں ہنس کر خاموش ہوگیا، وہ مہمان حکیم برہم ایڈیٹر " فتنہ" تھے ۔ بعد کو میں نے استاد سے کہا کہ اصل میں ان نظموں کا یہ قصہ تھا کہ آپ جلدی اصلاح نہ دیتے اور میں بغیر اصلاح اپنے نام سے شائع نہ کراتا۔" (۱)

اپنے استاد راز رام پوری کے سلسلے میں خود مولانا کہا کرتے تھے کہ ان کی خاموش طبیعت کا ایک یہ بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنی شہرت نہ چاہتے تھے ، نام و نمود اور تصنع و نمائش کے قطعی قائل نہ تھے ۔ یہی سبب تھا کہ نہ وہ کہیں اپنا کلام چھپواتے تھے اور نہ بیرون رام پور اور مقامی مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ حد یہ کہ انھوں نے اپنے تمام شاگردوں کو بھی سخت تاکید کر رکھی تھی کہ وہ اپنا کلام چھپوائیں تو اپنے نام کے ساتھ استاد کا نام نہ لکھیں حالاں کہ دوسرے اساتذہ اپنے تلامذہ سے کہہ کہہ کر اور فرمائش کرکے اپنی استادی کا اعلان کراتے تھے اور اکثر اساتذہ کرام آج بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " قطعات جواہر امثال"، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ جناب ماجد حسن فریدی

اس طرح مولانا قادری نے ۱۹۱۰ء سے قبل شاعری شروع کردی تھی ان کے اس زمانے کا کلام شوخی و رنگینی میں ڈوبا ہوا ہے ۔ مولانا قادری زاہد و پرہیز گار اور صوفی صافی ہی ہونے کے باوجود ایک فطری شاعر تھے ۔ اور فطری شاعر کبھی زاہد خشک نہیں ہوتا۔ فطری شاعر کے لیے دل میں ایک درد ، طبیعت میں ایک گداز ، ذہن میں اک توازن اور اس کی فکر میں ایک لطافت ضرور ملتی ہے ۔ مولانا نے بھی اپنی شاعری کا آغاز اسی روایتی غزل سے کیا جس کا نمونہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔ اس میں اگرچہ ہجر و وصال ، حسن و جمال ، گھلاوٹ و دل سوزی کے مضامین ہیں مگر ان کی غزل میں حسن و عشق کے رموز ایسی صفائی و سادگی اور لطافت و پاکیزگی سے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری کے ذہن پر ایک سنجیدہ و پرکیف فضا مسلط ہوجاتی ہے ۔ اسکا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں جذبات و احساسات کی وہ شدت و گہرائی مفقود ہے جو غزل کے شعرا کا طرۂ امتیاز ہے۔

وہ بحیثیت ایک ناقد اس بات سے خود بھی بخوبی باخبر تھے کیوں کہ بقول پروفیسر آل احمد سرور :" اچھی غزل کہنا بڑا مشکل ہے اور اچھی غزل کہنے کی قدرت بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے ۔ اس میں اتنی جانی پہچانی آوازیں ہیں کہ کسی نئی آواز کا پہچاننا مشکل ہے ۔ اس کا پیدا کرنا بھی آسان نہیں۔" (۱)

لہذا شعر و شاعری کی طرف سے ان کا میلان کم ہوتا گیا اور اس کے بجائے وہ انشا پردازی کی طرف مائل ہوگئے ۔ تحقیق و تجسس اور تلاش و تفحص کے شوق نے ان کو ادب کی نئی نئی شاہ راہیں دکھائیں ۔ لیکن فطری ذوق ہلکا یا مدھم تو ہوسکتا ہے مفقود نہیں ہوتا ۔ یہی سبب تھا کہ وہ جب کبھی بھی کسی بات یا واقعہ سے متاثر ہوتے

---

(۱) سرور، پروفیسر آل احمد ، " تنقید کیا ہے "، دہلی: راجا ٹی پریس ، ۱۹۴۷ء ص ۱۰۷

تو یہ فطری ذوق شعر گوئی پر ابھارتا اور وہ شعر کہنے پر مجبور ہوجاتے - یہی سبب تھا کہ ۱۹۳۰-۳۵ء کے دوران انھوں نے دوبارہ شعر گوئی کی طرف توجہ دی - اسی سلسلے میں ان کی کئی سلسلے وار غزلیں ان کے قلمی دیوان " مراۃ سخن" میں موجود ہیں- شعر و شاعری میں مولانا قادری نے غزل کے علاوہ رباعیات و قطعات بھی لکھے ہیں- اور فن تاریخ گوئی کے تو وہ ماہرین میں شمار ہوسکتے ہیں- مولانا قادری کے شعری مجموعے تعداد میں کتا سات(۷) ہیں :

" ۱- مراۃ سخن، (غزلیات) ،
۲- جلوہ گاہ ،
۳- قطعات جواہر امثال ، (۱۳۶۷ھ) ،
۴- خزانہ رباعیات ،
۵- گل صد برگ ، (یہ مجموعہ سو رباعیوں پر مشتمل ہے) ،
۶- مثنوی نمونۂ عبرت (اک طویل مثنوی) ، اور
۷- شور محشر ، (ایک طویل نظم) -

مولانا قادری کی شاعری کو سمجھنے اور ان کے کلام پر تنقید کرنے کے لیے ان ہی کے بنائے ہوئے پیمانۂ " نقد و نظر" سے کام لینا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے کہ ہم ان کے نظریات و خیالات سے متفق نہ ہوں لیکن انھیں کے پیمانے پر شاعری کو پرکھنے میں زیادہ آسانی ہوگی - انھوں نے جس بات کو جیسا دیکھا، سمجھا اور پیش کیا ہوسکتا ہے ہم اس کو اس نظر سے نہ دیکھتے ہوں اور اس کیفیت کو اس طرح محسوس نہ کرتے ہوں جیسی انھوں نے محسوس کی ، لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کے زمانے کی تحریکات و انقلابات اور نظریات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات و احساسات اور انداز بیان کو ان کے زمانے سے مطابقت دیتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کریں - ان کی نظر میں :

" شاعری کام بھی ہے اور کھیل بھی ، شاعری برائے زندگی بھی ہے اور برائے شعر و ادب بھی اور برائے لاشے بھی۔ مشرق و ہندوستان کا نظریۂ شاعری مغرب سے بالکل مختلف رہا ہے ، اور ہے اور رہے گا۔ میرے نزدیک ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں تضاد نہیں ہے - ان کا اجتماع ممکن ہے خیالات تجربات اور موضوعات نئے نئے ہیں، بدلتے رہیں اور بدلتے رہتے ہیں لیکن ان کے اظہار کا بہترین طریقہ نہیں بدلتا۔" (۱)

اکثر شعرا و ناقدین کو راقم نے کہتے سنا ہے کہ قادری صاحب نے روایت و قدامت دونوں کو برقرار رکھا ہے یہ بات کسی حد تک بجا ہے اس کے لیے خود مولانا قادری نے ایک جگہ لکھا ہے :

" میں اپنے مذہب، اخلاق و معاشرت ، ادب اور شاعری میں نہایت کٹر واقع ہوا ہوں - میں اپنے مذہب کو الہامی ، اپنی تہذیب کو توفیقی اور اپنے شعر و ادب کو روایتی سمجھتا ہوں اور ان میں سے کسی کے متعلق اپنے نظریۂ ادب کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔" (۲)

لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ جدید شاعری اور نئے طرز و اسلوب کو پسند نہیں کرتے - وہ نئے نئے تجربات و موضوعات اور اسالیب کو خود بھی شعر و ادب کے لیے ایک فال نیک خیال کرتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ مغربیت اس قدر مسلّط نہ ہو کہ مشرقیت مکمل طور پر فنا ہوجائے - جدید انقلابی شاعری کے سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں :

" باوجود عریاں جذبات و بے باک لہجے کے انقلابی شاعروں نے اسالیب، موضوعات اور خیالات کا نہایت وسیع و کثیر سرمایہ شعر و ادب میں فراہم کردیا ہے کاش کو مذاکر صرف پھول چن لیتے ہیں۔" (۳)

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ : " حامد حسن قادری"، محولہ بالا ، ص ۲۸۶

(۲) ایضاً، ص ۲۸۶

(۳) حامد حسن قادری، مولانا : " تاریخ و تنقید"، کراچی : ٹائمز پریس، ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۳

غزل کے لیے مولانا قادری کی رائے ہے :

" غزل کے ہر شعر کو کیف و اثر سے بھر پور ہونا چاہئیے - تمام کائنات غزل میں انیسویں صدی تک صرف ایک غالب ہے جو بھرپور غزل گو ہے - جس کا دیوان بلا شبہ شاعری کا الہام ہے - بیسویں صدی کے دور اول کی غزل کے متعلق یہ ہے کہ حسرت موہانی اور فانی بدایونی عہدی دور کی غزل کا خاتمہ کرگئے - قدامت و جدت کی اتنی خوب صورت آمیزش نہ کسی شاعر میں ہے نہ ہوسکتی ہے - باقی یا شاعری میں کم ہیں یا شاعری ان میں کم ہے -
بیسویں صدی کے موجودہ دور میں غزل نے جو رنگ نکالا ہے ، نہایت دل کشا ہے، جو وسعت پیدا کی ہے ، نہایت دل کش ہے ، جو توانائی حاصل کی ہے ، نہایت حوصلہ افزا ہے - نہایت وثوق و اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ اب غزل کبھی فنا نہ ہوگی-" (١)

غزل کے سلسلے میں مولانا کے نظریات پیش کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے متعلق بھی کچھ عرض کردیا جائے -

اردو شاعری کے ہر دور اور ہر زمانے میں غزل کو ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے- جو دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں اس کی مقبولیت کی دلیل ہے - ولی سے لے کر حسرت و فانی تک اردو غزل کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ سب پر روشن ہے - غزل میں ایک ایسی نغمگی و ترنم آفرینی ہے جس نے اس کو آفاقی بنادیا ہے - غزل کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے جو جذبات و احساسات کو نوع بنوع اور رنگ برنگ کی غذائیں بخشتا ہے -

میر و سودا ، غالب و مومن اور ناسخ و آتش کے دور میں شاعری عشق و محبت ، حسن و جوانی ، ہجر و وصال اور گل و بلبل کی داستان بنی ہوئی تھی - ہر شاعر کے یہاں روحانیت کا فقدان تھا- شاعر محبوب کے قد و قامت ، لب و رخسار اور عارض و گیسو

---

(١) حامد حسن قادری، مولانا؛ حامد حسن قادری-خود نوشتہ" ، " اردو نامہ"، کراچی :جنوری تا مارچ ، ١٩٦٥ء؛ ش١٩، ص ٣١

میں الجھا رہتا تھا۔ میر درد نے اس کو تصوف کے مضامین سے سجایا تو ان کی راہ پر گامزن رہتے ہوئے امیرمینائی و محسن کاکوری نے بھی اس روایتی رنگ کو چھوڑ کر شاعری کے خارجی عناصر سے احتراز کرکے اس میں اک حد اعتدال پیدا کی ۔ انھوں نے اسے خارجی عناصر و تصوف کا آمیزہ بنادیا۔

غزل اگرچہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے عشق و محبت اور حسن و جمال ہی کے مضامین تک محدود تھی لیکن بعد میں مضامین کی کوئی قید نہ رہی اور مختلف و متضاد قسم کے مضامین لکھے جانے لگے یعنی کسی شعر میں نفرت ہے تو کسی میں محبت ، کسی میں مدح ہے تو کسی میں ذم ۔ کسی میں درس اخلاق ہے تو کسی میں عرفان و تصوف ۔ کسی میں منطق و فلسفہ ہے توکسی میں سیاست و تدبر۔ کوئی شعر جذباتی ہے تو کوئی نفسیاتی۔ غرض یہ کہ غزل مختلف مضامین و گوناگوں جذبات و خیالات کا آئینہ بن گئی ۔ اس میں ذوق و شوق ، جذب و کشش ، عزم و عمل ، سوز و گداز ، درد و الم ، یاس و حرمان ، ہمت و حوصلہ ، حیرت و موعظت ، تسلیم و رضا ، دیوانگی و فرزانگی ، اپنائیت و غیرائیت ، جور و جفا ، وصل و فراق ، سب ہی قسم کے مضامین ملتے ہیں۔ غزل کی یہی رنگا رنگی اور بو قلمونی اس کی پسندیدگی اور مقبولیت کا موجب ہوئی ۔

اس کی مقبولیت کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ اس کے ہر شعر میں ایک نیا مضمون ہوتا ہے جو مضامین جملہ اصناف سخن میں الگ الگ بیان کئے جاتے ہیں وہ مجموعی طور پر غزل میں مل جاتے ہیں۔ اس کی مثال ہیرے کی مانند ترشی ہوئی ایک صنف سخن کی سی ہے۔ اس میں تفصیل بھی ہے اجمال بھی ، رمز بھی ہیں علائم بھی ، رمزیت بھی ہے اور اشاریت بھی ، ساحری بھی ہے صداقی بھی ۔ تغزل بھی ہے اور ترنم بھی۔ حسن بھی ہے

اور مستی بھی اس طرح اسے پڑھ کر ایک ھی وقت میں ھر مذاق اور ھر طبیعت کے لوگ لطف اندوز ھوتے ھیں - یہ قطرے کو دریا بھی بناسکتی ھے اور سمندر کو کوزے میں بھی بند کرسکتی ھے -

غزل آج اپنے ارتقا کی ان منازل میں ھے کہ اس کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں فخریہ طور پر پیش کیا جاسکتا ھے - اس کا یہ عروج چند غیر فانی غزل گو ھستیوں کی کوششوں کا نتیجہ ھے - آج یہ اپنی تاثیر و ترنم، داخلیت و خارجیت، یکسانی و ھم واری اور جذباتی و ازدواجی کیفیات کے اظہار کے دوش بدوش زبان کی لطافت و شیرینی بیان کی جدت و ندرت اور علامات و اشاریت سے معمور ھے - لفظی بازی گری اور تصنع کی جگہ صفائی و سادگی اور برجستگی و روانی نے لے لی ھے ساتھ ھی لطیف و پرمعنی اشارات و کنایات، فلسفہ و رموز ھستی، تنقید حیات اور حقیقی جذبات زیادہ نمایاں ھیں-

غزل کے عروج و ارتقا میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب بھی کارفرما رھا ھے - کیوں کہ اس انقلاب کے بعد ملکی و ملی تقاضوں کے پیش نظر شعر و شاعری اور فکر و نظر کے انداز یکسر بدل گئے - اور وہ شاعری جو کبھی عشق و محبت کی ناکامیوں کی درد بھری داستان اور ھجر و فراق کے پر سوز قصوں کا مجموعہ تھی حالی و شبلی اور اکبر و آزاد کی کوششوں سے نئی راہ پر گامزن ھوگئی - حالی اپنی عمر کا بیشتر حصہ پرانی و فرسودہ شاعری پر صرف کر چکے تھے مگر زمانے کی بدلتی ھوئی اقدار کو دیکھ کرسخن میں سلف کی پیروی کرنا نہ چاھتے تھے - انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کی رفاقت اور سرسید کی رھبری میں اردو شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ایک عالم گیر تحریک شروع کی جس کا خاطر خواہ اثر ھوا - انھوں نے مولانا آزاد کے ساتھ مل کر لاھور میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی - اور اس کے زیر اھتمام عالی شان مشاعرے منعقد کرائے -

انگریزی تعلیم اور انگریزی شعر و ادب سے اردو ادب بھی متاثر ہوا اور اس دور کے اردو شاعر بھی اس قسم کے شعر کہنے لگے :

ہیرے کی چمک مشک کی مہکار دہن میں

سوداگر وینس (۱) ترا کردار دہن میں

اس سے حالی کی تحریک کو بڑی تقویت ملی۔ اگرچہ ان کی مخالفت بھی ہوئی مگر آخر لوگ ان کی کوششوں کو سراہنے پر مجبور ہوگئے ۔ اور ان کا انداز فکر و نظر اور طرز تخیل و کلام بھی بڑی حد تک بدل گیا۔ اب شاعری کے توسل سے جذبۂ حب الوطنی بیدار ہوا اور قوم کو ایک درس اخلاق بھی ملا ادھر اکبر نے بھی اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں مغربی تہذیب و تمدن پر نشتر زنی کی جس کو پڑھ کر لوگ ہنسے تو سہی مگر دل پر اک چوٹ پڑتی رہی ۔ حالی نے اپنی غزلوں میں عشق و محبت کی جھوٹی داستانیں بیان کرنے کے بجائے قوم کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کی طرف توجہ دی۔ مگر میدان غزل اتنا عریض و بسیط ہے اور اس میں اس قدر جانی پہچانی آوازیں ہیں کہ کوئی نئی آواز مشکل ہی سے پہچانی جاسکتی ہے لہذا مولانا حامد حسن قادری بھی میدان غزل میں کسی بلند مرتبے پر فائز نہ ہوسکے مگر انھوں نے عصری رجحانات اور تقاضوں کو محسوس کیا اور حالی کی طرح شعر و سخن میں غزل کی روایتی شاعری سے کسی حد تک احتراز برتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے یہاں کہیں کہیں عاشقانہ رنگ ہے مگر ابتذال سے پاک ہے ۔ اور عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کی حرارت بھی کارفرما ہے :

مرا شوق اس کی مستوری کا ہے فیض

مرا درد جگر دوری کا ہے فیض

---

(۱) " مرچنٹ آف وینس " اٹلی کا مشہور شہر ہے ۔ "یہاں " وینس " کا اشارہ شیکسپیئر کے ڈرامے " مرچنٹ آف وینس" کی طرف ہے ۔ (مقالہ نگار)

اپنی ہستی کا ہے یقیں پر وہ　　　اپنی آنکھوں پہ ہیں ہمیں پردہ

زندگی اک فریب تھی حامد　　　اٹھ گیا وقت واپسیں پردہ

تصوف کے سلسلے میں ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

مطلوب بشر اگر خدا ہو　　　ہوجائے فنا جو ماسوا ہو

زاہد ہو مگر طلب میں گردان　　　ذاکر بھی مثال آسیا ہو

اسی قسم کے اور بیشتر اشعار ان کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں جس سے انسان کو صفائے قلب اور روحانی تربیت حاصل ہوتی ہے اور وہ دنیا و موجودات عالم کو ان کے صحیح مقام پر دیکھ لیتا ہے پھر اس کا دامن نہ کانٹوں سے الجھتا ہے اور نہ وہ پھولوں کی مہک سے مسحور ہوتا ہے - اس کے بعد وہ خلّاق دوجہاں کی ہر صفت و کاری گری کو چشم بصیرت سے دیکھتا ہے اور اس کے جلوؤں سے فیض یاب ہوتا رہتا ہے - مولانا قادری نے تصوف اور حصول تصوّف کی خاطر دنوی زندگی سے کسی حد تک کنارہ کشی کرلی اور انہیں اس حقیقت کا جلد ہی پتا چل گیا کہ دنیا کے یہ حسین جلوے، دنیا کی یہ رونقیں انسان کے لیے ایک سبق اور امتحان ہیں اور یہ تمام عالم ایک گلفشہ حلقۂ وہم و خیال ہے :

جلوہ تا دیدی نہاں شد رنگ تا دیدی شکست

خدمت عرض تماشاہاں قدر دارد بہار

<u>روحانی شاعری :</u>

عشق و محبت کی رنگین داستانیں ، گل و بلبل کے افسانے ، ہجر و وصال کی باتیں یہ سب اردو غزل کا کلا لازمہ ہیں - خواہ وہ اردو کے صوفی شاعر خواجہ میر درد ہوں یا مصلح قوم مولانا الطاف حسین حالی کوئی اس سے بے نیاز نہ رہ سکا اور بقول مرزا غالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسی طرح غزل میں بھی عاشقانہ مضامین کا شامل ہونا لازمی بات ہے وہ غزل ہی کیا جس میں عاشق اپنی محرومی اور محبوب کے جور و جفا کا ذکر نہ کرے لہذا مولانا قادری بھی اس روش سے انحراف نہ کرسکے - کہتے ہیں :

وصل یار فتنہ خو کی آرزو | یاس کی یاس آرزو کی آرزو
آرزو کی جان بھی ایمان بھی | تم سے جان آرزو کی آرزو
ان کو فرصت ہوش اڑانے سے نہیں | ہم کو ان سے گفتگو کی آرزو
آرزوئے دل پہ دیتے جان ہم | گر نہ ہوتی پہ عدو کی آرزو

مولانا قادری کے ابتدائی دور کی شاعری پر امیر و داغ کا رنگ غالب ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے استاد راز رام پوری امیر مینائی کے شاگرد تھے اور خود ان کی شاعری کا خاص رنگ بھی یہی تھا اس لیے قادری صاحب کے یہاں بھی جا بجا امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے - منشی امیر مینائی کی شاعری قدیم مضامین سے مملو ہے - ان کے یہاں یہ عام باتیں لکھنو اور رام پور کے دربار سے وابستگی کا سبب ہیں وہ پرانی باتوں کو نہایت حسرت و یاس کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے- لہذا اس زمانے میں پرانی باتوں کو الٹ پھیر کرکے رنگین عبارات و اشعار میں ڈھال دینا ایک عام روش تھی یہی سبب ہے کہ ان کا ابتدائی کلام بڑی حد تک ناسخ کے رنگ میں رنگا نظر آتا ہے اس کے برعکس جب وہ داغ کا تتبع کرکے سادگی و بے تکلفی کی طرف آتے ہیں تو اس میں کہیں کہیں سوقیت و رکاکت اور ابتذال و ذم کا پہلو بھی جھلکنے لگتا ہے - امیر کے متعلق ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کہتے ہیں :

" امیر کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لیے مخصوص ہیں- اس میں کوئی چیز نئی و اوریجنل (Original) نہیں ہے بلکہ وہی پرانے و فرسودہ مضامین ہیں جو الٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کئے گئے ہیں- البتہ ان کا دوسرا دیوان" صنم خانہ عشق" ان کے نئے

حریف و معاصر داغ کی طرز پر ہے اور اس میں اعلا تخیل سلاست و روانی اور دل کش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔

ان کے نعتیہ اشعار گو کہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اعلا تخیل فصاحت و بلاغت اور جوش و اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں اور روانی و سلاست توازن الفاظ اور ایجاز کے لیے مشہور ہیں۔ حشو و زوائد اور صنائع بدائع کی کثرت سے ان کا کلام پاک ہے تصوّف کی چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے۔ جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب آموزی کی خاص پہچان ہے -" (۱)

مولانا قادری نے ہر دو قسم کی شاعری (عاشقانہ و صوفیانہ) میں امیر مینائی و جلال لکھنو کی پیروی کی یہی سبب ہے کہ ان کے ابتدائی دور کے کلام میں متانت کے بجائے شوخی کا اثر زیادہ نمایاں ہے اس زمانے میں عاشق و معشوق کے اختلاط کے مضامین اور انسانی جذبات کی عکاسی عام تھی اس لیے اس زمانے کے مذاق رجحان کو دیکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس زمانے کی روش کے اعتبار سے یہ بات بڑی حد تک روا تھی۔ اس جدید دور کے شعرا و ناقدین کو یہ طرز کلام پسند نہ ہو لیکن اس زمانے میں یہ روش عام تھی جس کی تصدیق اس دور کے دیگر تمام شعرا کے کلام سے ہوتی ہے -

مولانا قادری نے اس اثر کو قبول کیا اور جس قسم کے اشعار کہے ان کی چند مثالیں یہ ہیں :

کیا خوب تم نے ہم کو وفا کا صلا دیا فہرست سے بھی نام ہمارا اڑا دیا

آئینہ آگے رکھ کے کہا میں نے دیکھیے گویا تمھیں کو سامنے لاکر بٹھادیا (۲)

ایک اور غزل کا شعر ہے :

موا ذمّہ جو اسے کچھ بھی خبر ہو اس کی
آپ آئیں تو سہی غیر سے چھپ کر دل میں (۳)

---

(۱) عسکری، مرزا محمد (مترجم) "تاریخ ادب اردو"، از رام بابو سکسینہ ، لاہور: منظور پرنٹنگ پریس، س ن ، ص ۲۶۹

(۲) کشتہ، عبداللطیف خاں، "حامد حسن قادری"، محولہ بالا، ش ۱۹، ص ۹

(۳) حامد علی، مولوی سید، "مولانا حامد حسن قادری" "شفق" (ماہنامہ)، جون ۱۹۷۳ء، ص ۶۱

مولانا قادری خود کہہ چکے ہیں کہ استاد کی صحبت سے مجھ میں بھی امیر مینائی کا رنگ پیدا ہوگیا تھا اور فکر میں ایسے ہی مضامین و اندازآتے تھے لہذا پہلے امیر مینائی کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے اور پھر مولانا قادری کے اسی زمین میں اشعار پیش کیے جائیں گے تاکہ اندازہ ہوجائے کہ مولانا نے امیر مینائی کا اثر کہاں تک قبول کیا تھا۔

امیر کہتے ہیں :

" ہائے نازک یہ ہوا لوٹ گئی　　بال کھولے تو گھٹا لوٹ گئی

مولانا قادری کہتے ہیں :

کس مزے کی ہے طبیعت اپنی　　ایک بوسہ جو ملا لوٹ گئی
ان کے دامن کی جو پائی خوشبو　　کیف و مستی میں صبا لوٹ گئی

ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

وار پر وار کیے اس نے یہ کہہ کر مجھ سے
پھر تو کہنا کہ ستانے میں مزا ملتا ہے

" مرآۃ سخن" مولانا کا ترتیب کردہ مختصر سا قلمی دیوان ہے اور ترتیب دواوین کے سلسلے میں عموماً ملحوظ رکھنے والے قاعدے کے مطابق حروف تہجی کے اعتبار سے الف تا یائے ترتیب دیا گیا ہے جس کے لیے وہ کہا کرتے تھے کہ " صرف دو ماہ کی قلیل سی مدت میں ترتیب دیا گیا ہے - "(۱)

مولانا قادری اخلاقی اعتبار سے بڑے بلند پایہ بزرگ تھے مگر زہد و تقوی کے باوجود مزاج میں شوخی و رنگینی کا عنصر بھی تھا - بادۂ تصوف سے بھی سرشار تھے - زبان و بیان اور تغزل و تخیل کے اعتبار سے انھوں نے امیر کی تقلید تو کی مگر معاملہ کچھ ایسا ہی

---

(۱)　بحوالہ مولوی سید حامد علی، سابق لیکچرار وکٹوریہ کالج آگرہ

رہا جیسا کہ اکبر الہ آبادی میر کے سلسلے میں کہہ گئے ہیں :

" میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر

ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ (اکبر الہ آبادی)

لیکن اس سے مولانا کی شاعرانہ حیثیت تسلیم کرنے میں کوئی بات مانع نہیں ہوتی - وہ بہت کم گو اور کم سخن تھے اور انتہائی سا سرمایۂ شعری رکھنے کے باوجود بھی ان کے یہاں بڑی عمدہ اور معیاری اشعار مل جاتے ہیں - باوجود اس کے کہ ان کی ابتدائی شاعری پر تقلید اور تتبع کا عنصر غالب ہے اور ابتدائی شاعری میں ایسا ہوتاہی ہے اگرچہ وہ اپنے کلام میں امیر کی سی شیرینی و شگفتگی اور معنی آفرینی و بلند پروازی تو پیش نہ کرسکے لیکن ان کے یہاں روحانیت و تصوف اور حقائق و معارف کے رموز و نکات جا بجا نظر آتے ہیں جو مشرقی شاعری کی جان اور اخلاق و ادب آموزی کی خاص پہچان ہے نیز ایسے اشعار و خیالات بہ تغیّر الفاظ بیشتر شعرا کے یہاں مل جاتے ہیں مولانا قادری بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں رہے - مندرجہ ذیل اشعار میں قافیہ و ردیف کی پابندی اور معنویت و سلاست میں ان کا کلام کسی اچھے شاعر سے کم نہیں - کہتے ہیں :

بے خودی دیتی جو مہلت کوئی دم
ہم بھی کرتے جستجو کی آرزو
چاہیے گل کی حقیقت پر نظر
کر نہ حامد رنگ و بو کی آرزو

===xxx====

روئے زرد ، اشکِ سرخ ، نالۂ دل
اس خزاں کا نہیں بہار عوض

===xxx====

سوز دل چاہئے صفا کے لیے ہے یہاں شعلۂ چراغ میں داغ

===xxx===

ان کے اشعار میں ایک قسم کی موسیقی اور صفائی و پختگی ملتی ہے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:—

طبیعت میں پیدا مزا کردیا
محبت نے درد آشنا کردیا
ملا آج حامد عجب حال تھا
اسے عشق نے کیا سے کیا کردیا

===xx====

ایک اور غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :—

لحد سے اٹھ کے ظالم دیکھ لی میں تیری صورت بھی
جو آیا ہے تو کردے چال سے برپا قیامت بھی
کہا قاصد سے ، کہتا عمر بھر یونہی بسر ہوگی
کہاں کا خط ، ہمارا پڑھ چکے وہ خط قسمت بھی
یہ کون آتا ہے وہ آتے ہیں شاید سیر گلشن کو
خبر کے ساتھ ساتھ اڑنے لگی پھولوں کی رنگت بھی
بسر ہوتی ہے اپنی زندگی کس لطف سے حامد
خدا رکھے مزے کی چیز ہے درد محبت بھی

مولانا قادری کی بعض غزلیں جوش و اثر اور اس لب و لہجہ سے مزین ہیں جو غزل کے لیے مخصوص ہے - مولانا نے اساتذہ کے کلام کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا میر و مصحفی غالب و مومن اور حالی واکبر کو جس طرح مولانا قادری نے سمجھا اور پڑھا دوسروں کے لیے یہ بات آسان نہ تھی یہی سبب تھا کہ انھوں نے تنقید کرتے وقت غالب کے کُھلے اُڑانے میں کسی خوبی اور اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے میں کسی بخل سے کام نہ لیا۔ اکبر چوں کہ ایک مصلح قوم و ہمدرد قوم تھے مولانا ان سے بھی متاثر ہوئے -

اکبر الہ آبادی کی ایک غزل کا مقطع ہے :

" رند عالی مقام ہے اکبر   پوچھیے تقوی کی اور شراب کا رنگ "

مولانا قادری نے بھی اکبر کا تتبع کرتے ہوئے اس زمین میں غزل کہی ہے ملاحظہ ہو:

چشم ساقی میں ہے شراب کا رنگ — اب نہ پوچھو دلِ خراب کا رنگ

شراب نہ پوچھو دل خراب کا رنگ

عرق آلودہ ہے رخ گلگوں — آج بادے میں ہے شراب کا رنگ

روز ابھرتی ہیں روز مٹتی ہیں — آرزوؤں میں ہے حباب کا رنگ

رخ ہوا بے نقاب ، ہم بے ہوش — یہ بھی ہے اک نئے حجاب کا رنگ

کوئی حد بھی تھی سوزشِ دل کی — جلتے جلتے ہوا کباب کا رنگ

تھی وہ اک مے کی نیم وا بوتل — اف تری چشمِ نیم خواب کا رنگ

روئے گلگوں ہو یا گل رنگیں — نظر افروز ہے شباب کا رنگ

ابر میں چشم اشک بار کا طور — برق میں دل کے اضطراب کا رنگ

ہوگی واں حسرت گنہ زاہد — دیکھ کر عفو بے حساب کا رنگ

مست ہوکر اچھال بے حامد

اس عمل میں بھی ہے ثواب کا رنگ

مولانا قادری کی اکثر غزلوں میں متصوفانہ اشعار بھی ملتے ہیں اس کی وجہ ان کا وہ مذہبی اور مابعد الطبیعاتی رجحان تھا جو ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے - غزل کی روایات اور تجربات ان کے سامنے تھے - میر،درد ،غالب ، مومن ، حالی، اکبر اور اقبال نے ان کے افکار و تخیلات میں اور بھی وسعت و جلا بخشی- میر، درد کے صوفیانہ خیالات ، غالب و اقبال کا مفکرانہ انداز اور حالی و اکبر کے اصلاحی جذبے سے مولانا قادری کا متاثر ہونا ایک لازمی بات تھی - حالی اور اکبر اور اقبال کے اثر سے ان کے کلام میں بھی پند و نصائح اور اخلاق و موعظت کے مضامین نظر آنے لگے - غزل میں اخلاقی و فلسفیانہ باتیں بیان کرنا اور اس کے باوجود اس کے تغزّل و ترنّم اور موسیقی و شعریت میں کمی نہ آنے دینا یہ ایک مشّاق شاعر ہی کا کام ہے - مولانا قادری غزل کے اس سحر حلال سے بہرہ ور نہ تھے اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں اچھی شعر گوئی پر کوئی فخر بھی نہ تھا- شعر گوئی ان کے لیے صرف تسکین

ذوق کا سامان تھی۔ وہ اپنے کلام کو شائع کرانے کے بھی زیادہ شوقین نہ تھے - ان کے یہاں جو اخلاقی موضوعات ہیں وہ سپاٹ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کے مذہبی رنگ کے موضوعات میں بھی تصوف کا گہرا اثر اور دل کشی نہیں پائی جاتی اگرچہ مولانا نے اپنی غزلوں میں تصوف کا رنگ بھرنے کی بھر پور کوشش کی لگ مگر ان کو صرف مذہبی حیثیت ہی حاصل رہی -

مولانا کا مزاج شاعرانہ ضرور تھا مگر غزل گوئی کے لیے موزوں نہ تھا - یا یوں کہا جائے کہ انھوں نے غزل سے واجبی سا تعلق رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں وہ تغزل و موسیقی اور برجستگی و بے ساختگی نہیں جو غزل کا طرۂ امتیاز ہے - شاعری میں تغزل صرف روایات کے زیر اثر پیدا نہیں ہوتا اس کے لیے ایک خاص قسم کے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے اس کے علاوہ شاعر کی شخصیت میں بھی ان خصوصیات کا ہونا لازمی ہے جو غزل کی محرک ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ میر تقی میر کی طرح ہر شاعر کے یہاں سوز و گداز درد و الم ، اور بے ساختگی و برجستگی ملے۔ داغ جیسی شوخ و رنگین طبیعت کے آدمی اور حالی جیسے متین و سنجیدہ انسان بھی غزل کے اچھے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ غزل کے لیے جوش و جذبے کے علاوہ دل کی تڑپ اور حسن سے متاثر ہونے والی طبیعت بھی لازمی ہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف جوش و جذبے اور اضطراب و ہیجان کے تحت ہی غزل کہی جاسکتی ہے اس کے برعکس نہایت سلجھے ہوئے اور سنجیدہ اذہان رکھنے والے بھی نہایت بلند پایہ غزلیں کہتے ہیں۔ خواجہ میر درد ، اصغر، اور حسرت موہانی کا کلام اس کی بہترین مثال ہے - ان میں سے ہر ایک کا دل گرفتہ ہے اور میر و غالب کے نزدیک دل کی گرفتگی و گداختگی ہی شاعری کا اصل محرک ہے چناں چہ میر کا قول ہے :

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے   درد وغم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

مولانا قادری میں متاثر ہونے والی صلاحیتیں تو موجود تھیں مگر وہ کبھی اس کیفیت کے تابع نہ ہوئے اس میں ان کی خاندانی روایات اور اخلاقی اقدار کو بھی بڑا دخل تھا چنانچہ ان کا یہی تاثر اخلاقیات و مذہبیات کے رنگ میں روبنا ہوا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے حسن تغزل پر بھی نعت کا رنگ غالب ہے ۔ اور کلام میں حسن و دل کشی،لطافت و جاذبیت اور سوز و گداز کا پہلو بڑی حد تک دب کر رہ گیا ہے ۔

مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :

دل دردآشنا خدانے دیا — مجھ کو سب سے سوا خدا نے دیا
جان دینے کی ہے، وہ ہم دیں گے — درد دینے کا تھا خدانے دیا

===xxx===

ہے تری شان تلوّن بھی عجیب — اور وفا کی ہے مجھے دھن بھی عجیب
لطف کیا رکھتی ہے حامد یہ غزل — گرچہ منحمت ہے تلوّن بھی عجیب

===xxxx====

کیا دلکش ہے ان کی نعت میں بات — تھی یہی خلق کائنات میں بات
آہ کے ساتھ ساتھ دم -- نکلا — ہوگئی ختم ایک بات میں بات

====xxxx====

اُدھر در پر تری قدموں کی آہٹ — اِدھر بیمار غم کی مسکراہٹ
ترا پہلو سے اٹھنا کیا ہو معلوم — بھلا کیا جان کے جانے کی آہٹ

====xxx====

چشم ساقی میں ہے شراب کا رنگ — اب نہ پوچھو دل خراب کا رنگ
صاف فرد گناہ دھو ڈالی — دیکھنا دیدۂ پُر آب کا رنگ
ہے جہاں میں جو کچھ یہ رنگینی — کچھ نہیں ہے مگر حجاب کا رنگ

===xxxx====

حامد ان کی نظر نہیں ملتی — آپ کچھ کھوئے کھوئے بیٹھے ہیں

قلب مضطر لیے ہوئے ہوں میں | ساتھ محشر لیے ہوئے ہوں میں
وہ لیے جاتے ہیں مدینے کو | کیا مقدر لیے ہوئے ہوں میں

مولانا نے چند مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں جن میں جذبات کی شدت کی کمی محسوس کی جاتی ہے اگرچہ زبان سادہ ہے مگر وہ حسن و دل کشی نہیں جو غزل کے لیے ضروری ہے - کہتے ہیں :

دل حسینوں کو وہ دے جس کو نہیں پروائے دل
سر وہ مانے عشق میں جس کو خیال سر نہیں
ہیں جو عاشق جھیلتے ہیں سختیوں پر سختیاں
لوگ ان کو جانتے مجنوں سے بھی کم تر نہیں
ہیں جو عاشق جنگلوں میں چھانتے پھرتے ہیں خاک
ان کا کوئی گھر نہیں ہے ان کا کوئی در نہیں
کون ایسا ہے کہ جو کرتا نہیں آہ و فغاں
کون ایسا ہے کہ غم سے چشم جس کی تر نہیں

پھر کیف مولانا قادری بحیثیت ایک غزل گو شاعر اس سبب سے بھی کوئی خاص مقام حاصل نہ کرسکے کہ صنف غزل میں بکثرت شعرا طبع آزمائی کرچکے ہیں اور ہر خیال اور ہر جذبے کو مختلف رنگ اور انداز سے پیش کیا جاچکا ہے - اس میں بظاہر اتنی گنجائش نہیں کہ کوئی عام شاعر اپنے کو ممیز و ممتاز کرسکے - اب تک اردو غزل ایک ایسی راہ ہے جس سے بڑے بڑے کارواں گزرے ہیں اس کارواں کے ملککک رہرووں میں سے کسی ایک ایسے ہی رہرو کی چال ڈھال پر خصوصیت سے توجہ دینا بڑی مشکل بات ہے - اگر وہ کوشش کرتے اور خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہوتے تو ممکن تھا کہ اس میدان میں بھی اپنی جگہ بنا لیتے مگر وہ تو ابتدا ہی سے سرسید احمد خان کی طرح شاعری کو ترک کرکے انشاپردازی کی طرف مائل ہوگئے اس دوران اگر طبیعت کبھی راغب بھی ہوئی یا کسی کی فرمائش ہوئی تو چند شعر کہہ لیے ورنہ انھوں نے شاعری کو مشغلہ نہیں بنایا۔ پھر بھی ان کے دیوان

" مرآۃ سخن" میں بیشتر اشعار لاجواب ہیں ۔ جن کی امثال اگلے صفحات میں پیش کی جائیں گی ۔

ان کے کلام میں ایسے اشعار تو کثرت سے ہیں جس سے روحانیت و حقانیت کا درس ملتا ہے لیکن ان کی شاعری کا ایک خاص جز عشق خدا اور عشق رسول بھی ہے وہ بھی ولی کی طرح اس مقولے پر عامل تھے :

شغل اچھا ہے عشق بازی کا   کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

یہی سبب ہے کہ ان کی اکثر غزلوں کے مجازی اشعار سے بھی حقیقت جھلکتی ہے۔ اور دل و دماغ حمدِ خدا و مدحِ رسول کی طرف مائل نظر آتے ہیں اگر ایک طرف وہ مرد فاضل تھے تو دوسری طرف تصوّف میں بھی کامل تھے یہ واقعہ ہے کہ ان کا دل ہمہ وقت ذکر الہی اور عشق رسول سے سرشار رہتا تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی اس خصوصیت کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے :

مبارک تم کو موسیٰ طور کا عشق   ہمیں ہے گنبد پُر نور کا عشق

مرا دل ہے چراغ عشق موسیٰ   جسے ہو، ہو، چراغ طور کا عشق

چلیں گے سر کے بل گویائی تھک جائیں   نہیں پابند کچھ دستور کا عشق

کوشی دی اور لینا صبر سے کام   تو پھر تسلیم تھا منصور کا عشق

مدینے چل ، وہیں مر اور وہیں گو

نہیں تسلیم حامد دیر کا عشق

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدے اور نعتیں لکھنا ہر شاعر صرف اپنے لیے ذریعہ نجات تصور کرتا ہے اور بات بھی یہی ہے مگر ہر شاعر اس میدان کا مرد نہیں ہوتا غالب جیسا شاعر بھی اپنی بے بس عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے :—

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم

کاں ذات پاک مرتبہ داں محمد است

اسی طرح دور حاضر کا نعت گو شاعر عبدالعزیز خالد بھی کہتا ہے کہ حضور کی ذات مبارک تو ایسی ہے کہ جس کی تعریف و توصیف خود خداوند تعالی نے کلام پاک میں جا بجا فرمائی ہے لہذا جس کی تعریف خود خالق نے کی ہو اس کی تعریف انسان کی زبان و قلم سے کیا ہوسکتی ہے ۔ اس لیے شاعر اپنی ہیچ مدانی و معذوری کا اظہار اس طرح کرتا ہے :

صفات ہو قلمیں لا تعد لا و لا تحصی

ثنائے خواجہ سے معذور ہیں زبان و قلم

مگر وہ شعرا جن کی نگاہیں قرآن مجید اور احادیث نبوی کے مطالعے میں مصروف رہتی ہیں اور جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں وہ نعت گوئی کوہی شفاعت کا وسیلہ بنالیتے ہیں ۔ وہ دنیا میں مقبول ہوتے ہیں اور عقبی میں سرخ رو ۔

مولانا قادری کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے جو والہانہ محبت و عقیدت اور شیفتگی و وارفتگی تھی اس کا اظہار اکثر شعر و سخن کے ذریعہ سے ہوتا رہتا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ کی ایک طویل نعت " نور اسلام" کے عنوان سے شائع ہوئی جس کے چند اشعار یہ ہیں :

توحید ہو شائع دنیا میں، جب حق کو یہ منظور ہوا

اک پاک بشر اک خاص نبی اس خدمت پر مامور ہوا

تثلیث کو باطل جس نے کیا توحید کو کامل جس نے کیا

ظلمات کو زائل جس نے کیا، عالم جس سے پر نور ہوا

دنیا کو بتوں نے گھیرا تھا سب نے حق سے منہ پھیرا تھا

شرک و بدعت کا اندھیرا تھا اس نور سے وہ کافور ہوا

اک نور خدا ضو افگن تھا کل عالم وادیٔ ایمن تھا

وہ نور عرب میں روشن تھا ، جو ظاہر بوسر طور ہوا

خداوند تعالی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم کے لیے دین برحق بناکر حقانیت و وحدانیت کا سبق تعلیم فرمانے کے لیے مبعوث فرمایا تھا آپ کی بعثت ہی کے سبب تثلیثی عقائد باطل ہوئے اور دین اسلام کامل و اکمل ہوا۔ آپ ہی کی ذات اقدس کے پرتو سے ظلمت کفر کافور ہوئی ، بت سرنگوں ہوئے اور شرک و باطل کا زور ٹوٹا اور تمام عالم نور علی نور ہوگیا۔ مہر نبوت کی یہ ضیا پاشی کسی خاص قوم، نسل یا خطے کے لیے مخصوص نہ تھی آپ تو اپنوں ، بیگانوں کے لیے رحمت اور محسن انسانیت بن کر تشریف لائے تھے۔

حق و باطل ہمیشہ سے دست و گریباں رہے ہیں لیکن نصرت و فتح کامرانی ہمیشہ حق ہی کا مقدر رہی ہے قرآن پاک میں بھی جا بجا حق کی فتح کی بشارت ہے حق کے آتے ہی باطل مٹ جاتا ہے ۔ مولانا قادری اسی بات کی صداقت کے لیے کلام پاک سے گواہی دلاتے ہیں :

قرآن کہا حق نے نازل سب شرک و کفر ہوا زائل

" جاء الحق و ز حق الباطل" حق آیا باطل دور ہوا۔(۱)

اسی نعت کے ایک اور شعر میں قرآن کریم کی آیت " واعتصمو بحبل اللہ جمیعا" (اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مسلمان اتحاد و اتفاق سے کام لے کر حق کے لیے سینہ سپر ہوجائیں تو خداوند تعالی ان کا

---

(۱) "جاء الحق و زحق الباطل ان الباطل کان زھوقاہ" آیت ، سورہ پارہ

حامی و ناصر ہوجاتا ہے اور ایک ایک غازی ہزاروں پر بھاری پڑتا ہے ۔ کہتے ہیں :

مسلم کو دہ حُبِّ جاہ رہی جب ہاتھ میں حبل اللہ رہی

تائید خدا ہم راہ رہی ، ہر معرکہ میں منصور ہوا

اسی نعت شریف کا ایک اور شعر ہے :

" ذامقربۃ " پر انعام کیا ، " ذامتربۃ " پر اکرام کیا

" فک رقبۃ " کا کام کیا ، غم جس سے دلوں کا دور ہوا

اس میں سورہ واللیل کی آیت " فک رقبۃ او اطعم فی یوم ذی مسغبۃ یتیما" ذامقربۃ او مسکینا ذا متربۃ " کی طرف اشارہ ہے جس کا مطلب ہے کہ " گردن کو غلامی یا قرض کے پھندے سے چھڑادینا یا بھوک کے دن یتیموں کو اور خاص کر جب کہ وہ اپنا رشتہ دار بھی ہو یا محتاج خاک نشین کو کھانا کھلانا ۔" انسان اپنی نیکیوں اور اچھائیوں یا حسن سلوک سے ہی قرب الٰہی حاصل کرتا ہے خدا کا فرمان ہے کہ " ان اکرمکم عنداللہ اتقا کم" حضور کا اسوۂ حسنہ اس کی بہترین مثال ہے ۔ اسلام میں سائل سے سلوک کرنے اور یتیم پر شفقت کرنے کے لیے خصوصیت سے تاکید کی گئی ہے ۔

مولانا میں ایجاد و اختراع کا مادہ خاصا تھا ۔ ان کے یہاں عربی و فارسی کے الفاظ کے ساتھ ہندی و اردو کے بھی سبک و شیریں الفاظ کا حسین امتزاج و اشتراک ہے ان کے حسن عقیدت نے اس آمیزش کو اور بھی چار چاند لگادیئے ہیں ۔ شیخ سعدی شیرازی کے مشہور نعتیہ قطعہ کو جس کا مصرع اول " بلغ العلی بکمالہ " ہے بہت سے شعراء نے تضمین کیا ہے امیر مینائی کی تضمین تو بہت ہی مشہور ہے مولانا قادری نے خیال کیا کہ امیر مینائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک تضمین میں اردو کے قافیے ایسے اختیار کیے جائیں جو عربی کے قافیوں کے بالکل مشابہ و مماثل اور ہم آواز ہوں ۔ چناں چہ تضمین ملاحظہ ہو :

انھیں دل جو کردیں حوالے ہی　　تو کرم پھر ان کا سنبھالے ہی

انھیں جانیں جاننے والے ہی　　کہ ہیں وصف ان کے نرالے ہی

بلغ العلی بکما له

کشف الدجی بجماله

حسنت جمیع خصاله

صلوا علیه و آله

مولانا نے شیخ سعدی شیرازی کے اسی مشہور نعتیہ عربی قطعہ کا فارسی میں کس قدر سادہ، دل نشین اور بے مثال منظوم ترجمہ کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

بلغ العلی بکماله　　کشف الدجی بجماله

بہ علو رسید کمال او　　شدہ روز شب بجمال او

حسنت جمیع خصاله　　صلوا علیه و آله

ہمہ نیک بود خصالِ اُو　　رحمت بر او و بر آلِ اُو

اسی انداز سے ایک اور نعت شریف مسدس کی شکل میں لکھی ہے اس میں بھی عربی کے قافیوں کے مماثل و مشابہ اور ہم آہنگ و ہم آواز قافیے نظم کئے ہیں : ملاحظہ ہو :۔

ورد درود پاک ہے زمزمۂ مرانس و جن　　ذکر نبی سے دل کو رکھ مسلم خستہ مطمئن

ان کے کرم پہ رکھ نظر اپنی مصیبتیں نہ گن　　ان پہ سلام صبح و شام ان پہ درود رات دن

صل علی محمد ، صل علی محمد

ایک اور نعت مثلث کی شکل میں ہے جو بڑی طویل ہے ۔ اس کے چند بند یہ ہیں :

فخر رسل سردار دو عالم　　افضل اشرف اعظم اقدم

صلی الله علیه وسلم

کہتی ہے ان سے رحمت داور　　انا اعطینک الکوثر

صلی الله علیه وسلم

شمع سبل بھی ہادیٔ کل بھی فخر بشر بھی ختم رسل بھی

صلی اللہ علیہ وسلم

وہ حبیب کبریا کی ثنا خوانی نہایت ہی جذب و اثر میں ڈوب کر کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس کا اندازہ مندرجہ ذیل نعتیہ رباعیات سے بخوبی ہوسکتا ہے :

مرے دل میں ہے تصویر مدینہ — مری آنکھوں میں ہے تصویر مدینہ
لگا آنکھوں میں خاک روضۂ پاک — یہی حامد ہے اکسیر مدینہ

===xxx====

کامل ہے جہاں میں شک دین تیرا — کیوں بول نہ بالا ہو ابد تک تیرا
سرپر ہے تری تاج الم نشرح کا — طرہ ہے رفعنا لک ذکرک تیرا

==xxx====

دنیا میں رسول اور بھی لاکھ سہی — زیبا ہے مگر حضور کو تاج شہی
ہے خاتمہ حسن عناصر ان پر — ہیں مصرع آخر اس رباعی کا وہی

===xxx====

قلب مضطر لیے ہوئے ہیں میں — ساتھ محشر لیے ہوئے ہیں میں
وہ لئے جاتے ہیں مدینہ کو — کیا مقدر لیے ہوئے ہیں میں

===xxx====

پہنچائے در نبی پہ تقدیر مجھے — ہاتھ آئے نجات کی یہ تدبیر مجھے
اکسیر کی قدر ہو نظر میں کیا خاک — خاک در مصطفی ہے اکسیر مجھے

===xxx====

کیا بحر کرم حضور کا سینہ ہے — دل رافت و مرحمت کا گنجینہ ہے
انوار خدا دیکھ لو اس کے اندر — قامت نہیں قد آدم آئینہ ہے

===xxx====

جو ذات ہوئی فخر رسولان سلف — حاصل ہے مجھے اس کی غلامی کا شرف
مرقد میں فرشتوں سے کہوں گا حامد — کھڑکی کوئی کھول دو مدینے کی طرف

====xxxx====

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ مولانا اکثر اپنی زندگی میں اس رباعی کا ورد کرتے رہتے تھے۔ وفات کے بعد موصوف کے صاحب زادگان و عقیدت مندان نے بھی یہی رباعی لوح مزار پر کندہ کرانے کے لیے پسند کی اور اسی روز مولانا کے ایک شاگرد رشید اور مشہور شاعر و ادیب مظہر جلیل شوق قدوائی نے اسی رباعی کی وساطت سے مولانا کی وفات کا مادہ تاریخ بھی نکالا :

" تھا عشق رسول میں ہمیشہ جو شغف

مائل رہا دل سدا مدینے کی طرف

باقی نہ رہے بعد جو رحلت کے بعد
(بعد = ٤٦)

مل جائے لحد ہی میں زیارت کا شرف

١٤٣٠ - ٤٦ = ١٣٨٤ھ

مولانا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ عقیدت تھی دیار رسول میں حاضری کا اشتیاق انھیں اکثر مضطر و بے قرار رکھتا تھا اور وہ اکثر گنگناتے رہتے تھے :

طور پر حضرت موسی کو غش آیا جس سے

اک نظر دیکھ لوں میں ہے تو وہ جلوہ تیرا

یا شہنشاہ دو عالم یہی کہتا ہے دل

دیکھنے جاؤں میں سر آنکھوں سے روضہ تیرا

=====XXXX=====

اور کبھی بے قرار ہوکر کہہ اٹھتے تھے :

اے شہ کون و مکاں جلد بلا　　ہند میں شاق جدائی ہے بہت

آخر ان کا عشق رنگ لایا ، جادہ منزل کا فاصلہ مٹا - ۱۳۲۲ھ میں آقائے دو عالم کے دربار میں ان کی طلبی ہوئی اور وہ زیر لب صلی علی ، صل علی پڑھتے ہوئے دربار رسالت میں حاضری دینے کشاں کشاں چلے جاتے تھے - حضور کے دربار میں حاضری کے وقت بھی شیخ سعدی کا مشہور "قطعہ بلغ العلی بکمالہ "ورد زبان تھا - ذوق و شوق اور جذب و اثر عروج پر تھا وہاں سے واپسی پر ایک نعت شریف میں پھر یہ قطعہ تضمین کیا اس میں امیر مینائی کا نہ صرف رنگ نمایاں ہے بلکہ پورا پورا تتبع کیا ہے اور کہیں کہیں مفہوم میں بھی توارد ہوگیا ہے - ملاحظہ ہو :

ہُوَاَفْصَحُ بمقالہ　　ہو اکمل بحالہ
ہواعظم بجلالہ　　ہُوَاَفْخَرْ بمثالہ

بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلو علیہ و آلہ

ہو حا مد و محمد　　ہوا ماجد و مجد
ہوا مجد ہواحمد　　ہو مرشد ہوارشد

بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ
حسنت جمیع جصالہ
صلو علیہ و آلہ

وہ بشیر بھی وہ نذیر بھی　　وہی آپ اپنی نظیر بھی
وہ زمیں پہ شاہ و امیر بھی　　وہ فلک پہ عرش منیر بھی

بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

وہ قسیم بھی وہ جسیم بھی   وہ نسیم بھی وہ وسیم بھی

وہ رؤف بھی وہ رحیم بھی   وہ خلیل بھی وہ کلیم بھی

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

وہ رفیع اپنے کمال میں   وہ حسین اپنے جمال میں

وہ عزیز اپنی خصال میں   وہ فنا خدا کے وصال میں

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

وہی ارفع الدرجات بھی   وہی اکمل البرکات بھی

وہی جامع الحسنات بھی   وہ جدا بھی واصل ذات بھی

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

ہے انہیں کا فیض جہان میں   وہ نماز میں وہ اذان میں

وہ یگانہ آن میں شان میں   وہ گئے فلک پر اِک آن میں

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

یہ جو قصر سبز رواق ہے   یہ جو چرخ ہفت طباق ہے

یہ انھیں کے قصر کا طاق ہے   یہ انھیں کے زیر براق ہے

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

وہ ورائے ہفت فلک گئے   کہ جہاں نہیں وہ ملک گئے

وہ مقام قرب تلک گئے   جو نہاں تھے نور جھلک گئے

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

انھیں بے حجاب خدا ملا   انھیں مرتبہ یہ بڑا ملا

انھیں کیا دیا انھیں کیا ملا   جو دیا دیا، جو ملا ملا

بلغ العلی بکمالہ

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو علیہ و آلہ

قطعات :

غزل اور دیگر اصناف سخن کی طرح اردو میں قطعہ بھی فارسی کے ہی اثر سے داخل ہوا ہے ۔ اردو میں اس صنف سخن کی مقبولیت خصوصیت سے انیسویں صدی کے آخر سے شروع ہوتی ہے ۔ خاص طور پر اکبر الہ آبادی کے مزاحیہ قطعات سے اس صنف کو عروج ملا اکبر الہ آبادی کے بعد علامہ اقبال، احسان دانش، اور سیماب اکبر آبادی نے بھی اس صنف سخن کی طرف خصوصیت سے توجہ دی اور قطعات میں ہر قسم کے مضامین نہایت حسن وخوبی سے نظم کیے ۔

قطعہ، ہیت و معنی کے لحاظ سے قصیدے اور غزل سے مماثل ہے اکثر شعراء،

قصیدے یا غزل میں بھی چند ایسے اشعار جو ایک دوسرے سے مربوط و مسلسل ہوتے ہیں بطور قطعہ کے شامل کردیا کرتے ہیں۔ میر و غالب کے یہاں بھی اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں لہذا اصطلاح شاعری میں قطعہ ان چند اشعار کو کہتے ہیں جن میں ایک شعر کا مطلب دوسرے سے متعلق و مربوط ہوتا ہے - اس کے سب اشعار کے آخری مصرعے (دوسرے مصرعے) ہم قافیہ ہوتے ہیں ایک اور خصوصیت جو قطعے اور غزل کے لیے مابہ الامتیاز ہے وہ یہ کہ قطعہ میں غزل یا قصیدہ کی طرح مطلعہ نہیں ہوتا البتہ اس کا مضمون قصیدے یا مثنوی کی طرح مسلسل ہوتا ہے اس طرح وہ مضمون بھی جن کے پہلے مصرعے میں قافیہ نہیں ہوتا صرفاً قطعے کی ضمن میں شمار کی جاتی ہیں۔

اردو شعرا کے دواوین کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے غزلیات کے ساتھ ساتھ طویل قطعات بھی لکھے ہیں - چناں چہ ان کی وہ غزلیں جو مطلعوں سے عاری ہیں اور ربط و تسلسل کی حامل ہیں قطعات میں شمار کی جاتی ہیں - اسی طرح وہ قصائد بھی جن میں کہ مطلعے نہیں ہیں انھیں بھی ہم اصطلاحاً قصیدہ نہ کہہ کر قطعات ہی کہیں گے - قطعہ میں اشعار کی تعداد کم از کم دو ہوتی ہے مگر زیادہ اشعار کہنے کے لیے تعداد کی کوئی حد و قید متعین نہیں ہے - اس لیے اس کے اشعار کی تعداد صرف شاعر کی مرضی و منشا پر ہی منحصر ہے - شعر گوئی کے لیے کسی مخصوص بحر اور وزن کی بھی تخصیص نہیں ہے لیکن یہ بات لازمی ہے کہ اس کی بحر اور وزن رباعی کی مخصوص بحر اور وزن سے جدا ہو۔ اس کے لیے موضوع و مضمون کی بھی کوئی پابندی نہیں ہر قسم کے مضامین جن میں ربط و تسلسل ہو قطعے کے ذریعے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

مولانا قادری نے بھی قطعات کہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ زندگی کے وسیع تر حقائق کا جزو نہیں ہیں اور نہ ان میں اجتماعی شعور اور گہری سنجیدگی کارفرما ہے - یہ

چٹکلے ہیں پھر بھی ہر مصرع چست و برجستہ اور ہر فقرہ و محاورہ شوخ و برمحل نظر آتا ہے -

۷ فروری، ۱۹۳۷ع ، بروز جمعہ " انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ" کے زیر اہتمام علامہ میکش اکبر آبادی کی زیر صدارت کالج کے ہال میں سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا جس کا مصرعۂ طرح تھا :

" کہاں سوشی ہوتی ہے فطرت پروانہ پرستوں سے "

اس روز مغرب سے قبل ہی بادل چھائے بجلی کوندی اور بارش شروع ہوگئی لیکن مشاعرہ کے وقت تک سامعین و شعرا خاصی تعداد میں جمع ہوگئے - اکبر آباد کے اساتذہ میں سے علامہ میکش اکبر آبادی اور علامہ سیماب اکبرآبادی بھی تشریف لے آئے - مولانا بحیثیت صدر شعبہ اردو اور صدرانجمن ترقی اردو بڑے فکر مند تھے کہ اس موسم میں مشاعرہ کس طرح کام یاب ہوگا لہذا مولانا نے وقت کے مناسبت سے ہال میں بیٹھے بیٹھے یہ فی‌البدیہہ قطعہ کہا اور آغاز مشاعرہ و تحریک صدارت سے قبل بطور حفظ ماتقدم نذر سامعین و شعرا کیا ، آپ بھی ملاحظہ کیجئے :

ہمیشہ کاملاں فن یہاں تشریف لاتے ہیں — ہوا کرتی ہے یہ بزم سخن سنجانہ پرستوں سے
کمی مجمع کی شاید ابر و باران کے سبب سے ہے — مگر ہم کو ہوا تھا اتفاق ایسا نہ برسوں سے
سکوں سے آج تھوڑا کام لے لیتی تو کیا ہوتا — تڑپتی ہی رہی ہے برق پیمانہ پرستوں سے
دبا رکھنا ذرا سا آج اپنے جوش گریہ کو — یہ مانا ابر بھی ہے ضبط سے بیگانہ پرستوں سے
ذرا دلدل کو اپنی خشک رکھیں شہر کی سڑکیں — رہی ہیں عرصہ گاہ لغزش مستانہ پرستوں سے
مگر یہ مشکلیں ہیں امتحان شوق کی خاطر — ہوا تھا کب ظہور ہمت مردانہ پرستوں سے

یہ برسوں بعد لے حامد صلائے شمع اردو ہے

" کہاں سوجھی ہوئی ہے فطرت پروانہ برسوں سے "

یہ قطعہ سن کر اہل محفل مولانا کی بدیہہ گوئی سے خاصے محظوظ ہوئے -

ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی ایم اے، ۱۹۴۸ء میں بھارت سے مشرقی پاکستان کو ہجرت کی اور وہاں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے - کچھ وہاں سے جولائی، ۱۹۴۸ء میں مغربی پاکستان کے شہر پشاور تشریف لے آئے - اور پشاور پہنچ کر اسی جولائی میں ایک خاص کام یہ کیا کہ انہیں بیس سال پرانی داڑھی مونچھ ایک ساتھ صاف کردی - مولانا قادری نے اس " حادثے" کا حال ۱۲ اپریل، ۱۹۴۹ء کو سنا اور اگلی میں اسی وقت یہ قطعہ کہا اور تاریخ نکالی - (۱)

فصل خزاں ریش

۱۳۶۸ھ

وہاں جاکر جو مونڈی تم نے داڑھی دیا گویا یہ پاکستان کو باج
ذراسے بال تھے رشتے ہی دیتے وہ تھی آخر وہ عرض و طول میں چھاج
یہ ڈر تھا آتی جاتی ہے سفیدی مگر تھا یہ تو دور رب وہاج
اگر ریش کا گالا ہو بھی جاتی وہ آتا اس کو دھننے کوئی حلاج
منڈاتے یاں، وہاں رکھتے تو تھا ٹھیک ~~xxxxxxx~~ خدا کا ہے وہاں، یاں رام کا راج
یہ اخفش کہا تھا کیا کسی نے کہ چڑھ آیا غضب کا بحر مواج
کبھی قصاب سمجھا تھا کسی نے کہ ذبح ریش کو سمجھے حلال آج
ہوا پہچاننا صورت کا دشوار شناسا بھی تعارف کے ہیں محتاج
وہی آواز ہے صورت نہیں وہ کھڑے تکتے ہیں منہ احباب و ازواج (۲)

---

(۱) " بعد میں جناب ڈاکٹر طاہر فاروقی صاحب نے پھر داڑھی رکھ لی -"
(۲) " ازواج" کے قافیہ کے متعلق خود قادری صاحب کا نوٹ ہے کہ " بیوی تو ان کی ایک ہی ہیں مگر قافیہ کی ضرورت نے جمع لکھوادیا-"

مٹا ڈالا خط قدرت کو تم نے ــــ کیا ریزر سے ملک رخ کو تاراج
یہی تھی مرد مومن کی نشانی ــــ یہی زینت یہی سہرا یہی تاج
نہ کرتے تم جو منڈوانے کی غلطی ــــ تو کیوں بنتے یوں طعنوں کے آماج

اس سے قبل عرض کیا گیا ہے کہ مولانا قادری کے استاد راز رام پوری شاگردوں کے کلام کی اصلاح کرنے کے سلسلے میں عجلت کے ذرا قائل نہ تھے اکثر ایسا ہوتا کہ شاگردوں کی غزلیں غت ربود ہوجاتیں مگر اس بے نیازی کے باوجود اس بات کی سختی سے تاکید تھی کہ کوئی شاگرد بغیر اصلاح کے اپنا کلام شائع نہ کرے قادری صاحب بھی اس حکم کی سختی سے پابندی کرتے تھے - نوجوانی کا عالم تھا شاعری کا ابتدائی دور تھا جس میں ذوق و شوق جولانی و جولانی نمود و نمائش سب ہی متقاضی ہوتے ہیں لہذا قادری صاحب کا جی کہنے کو بھی چاہتاتھا اور چھپوانے کو بھی لیکن استاد کی بے نیازی و مصروفیت کے باعث ہر غزل یا نظم پر فوراً اصلاح ملنی ممکن نہ تھی لہذا قادری صاحب نے ایک ترکیب سوچی کہ کیوں نہ کوئی فرضی نام رکھ لیا جائے اور وہ ضیا رام پوری کے نام سے "گفتہ و عطر فتنہ" میں اپنے قطعات شائع کرانے لگے۔ ان قطعات میں کوئی نہ کوئی ضرب المثل ضرور نظم ہوتی تھی -

" ضرب الامثال " کے سلسلے میں یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کب اور کس طرح وجود میں آئیں - مگر یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ لوک ادب کی طرح خود بخود پھلتی پھولتی رہیں۔ ان کی شہرت کا ایک خاص سبب یہ بھی ہوا کہ ان میں حقائق زندگی اور تجربات انسانی کو ایجاز و اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے - اس طرح " ضرب المثل" تجربات کو تفصیل و طوالت کی بجائے اجمال و اختصار اور جامعیت سے بیان کردیا کرتی ہیں۔ اور جو کام نظم میں صنعت تلمیح انجام دیتی ہے ادیب و شاعر اسی سے نظم و نثر دونوں

میں وہی کام لے لیا کرتے ہیں۔ متمدن اور مہذب لوگ اس کی افادیت و اہمیت اور طریق استعمال سے خوب کام لیتے ہیں۔ اگر ضرب المثل حسب موقع ہو تو کارگر اور سود مند ثابت ہوسکتی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ قاری اور سامع بھی اس کے مخفی معنی سے بخوبی طرح آگاہ و باخبر ہوں ورنہ شاعرکی محنت بے کار جائے گی۔

ذیل میں ہم مولانا کے چند ایسے قطعات بطور نمونہ درج کرتے ہیں جن میں ضرب الامثال نہایت خوب صورت و سلیقے سے استعمال کی گئی ہیں ۔ مشہور مثل ہے : " اوکھلی میں سردیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا" (۱) اس مثل کے پیش نظر مولانا کہتے ہیں :

مجھ سے اک دن حضرت واعظ یہ فرمانے لگے
عشق اے ناداں کچھ اچھا نہیں بہتر نہیں
عشق میں ہر آدمی کی مت ہوتی ہے تباہ
کس لیے کرتا ہے کہنے کو تو باور نہیں
دین و دنیا دونوں ہوجاتے ہیں انساں کے خراب
چھوڑ تا ایماں تک یہ عشق غارت گر نہیں
یاد رکھ ہے عشق بازی اے شیدا بالکل گناہ
خوش نہیں رب اس سے ، راضی اس سے پیغمبر نہیں
دل حسینوں کو وہ دے جس کو نہیں پروائے دل
سر وہ ہارے عشق میں جس کو خیال سر نہیں
ہیں جو عاشق جھیلتے ہیں سختیوں پر سختیاں
لوگ ان کو جانتے مجنوں سے کم تر نہیں
ہیں جو عاشق جنگلوں میں چھانتے پھرتے ہیں خاک
ان کا کوئی گھر نہیں ہے ان کا کوئی در نہیں
ان کے دل پر کون سی آفت ہے جو آتی نہیں
کیا مصیبت ہے جو ان کی جان کے اوپر نہیں

---

(۱) اس طرح بھی ہے کہ " اوکھلی میں سردیا تو دھمک کا کیا ڈر "۔

کون ایسا ہے کہ جو کرتا نہیں آہ و فغاں
کون ایسا ہے کہ غم سے چشم جس کی تر نہیں
ہے سراسر فائدہ اس میں کہ باز آ عشق سے
الغرض بہتر یہی ہے ان بتوں پر مر نہیں
یہ نصیحت میری تجھ پر کارگر ہوگی ضرور
تیرے سینے میں اگر دل ہے کوئی پتھر نہیں
سن کے میں نے عرض کی خیر اب تو جو کچھ ہو سو ہو
اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا ڈر نہیں (۱)

ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو اس میں " بے وقت کی راگنی" اور " نقار خانے میں طوطی کی صدا" والی ضرب الامثال کی طرف توجہ دلائی ہے :

کسی جا منعقد تھا ایک دن اک جلسۂ قومی
جہاں تھا ایک ممبر منہمک لکچر سنانے میں
صدائے مرحبا و حبّذا آتی تھی ہر لب سے
وہاں جو شخص تھا ، مشغول تھا وہ غل مچانے میں
یکایک حضرت واعظ بھی اس جلسے میں جا کودے
جو اپنے وعظ سے مشہور تھے سارے زمانے میں
وہ جلسہ تھا " نیو فیشن" کا اس میں بے طلب پہنچے
یہی تو فرق ہوتا ہے نئے میں اور پرانے میں
لگے کرنے نصیحت مسٹروں کو مولوی صاحب
ہوئے مصروف ہیں لکچر میں اپنا سر ملانے میں
الاپا آپ نے بے کار راگ اپنی نصیحت کا
کہ وہ مشغول تھے سب اپنا قومی گیت گانے میں

---

(۱) " فتنہ عطر فتنہ"، گورکھ پور : ۲ فروری ، ۱۹۱۰ء ، ج ۲۵ ، ش ۵ ، ص ۹

ہوئے محجوب بے حد اور الٹے پاؤں پھر آئے
نظر آیا نہ کوئی فائدہ جب سرکھپانے میں
نہ جانا تھا انھیں کو ایسے جلسے میں خدا سچ ہے
" صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں" (۱)

" سفر وسیلۂ ظفر ہے " یہ مقولہ بھی بڑا معقول اور مشہور ہے - اس مقولے کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے " گھر کی مرغی دال برابر " والی مثل بھی مولانا نے خوب کام لیا ہے - فرماتے ہیں :

اہل ہند وطن سے نکلو — دیکھو دنیا کو چل پھر کر
نفع سفر میں ہے بے غایت — تجربہ ہوگا پاؤ گے زر
دیس میں جس نے قدر نہ پائی — قدر ہوئی پردیس میں اکثر
لعل نے کیسی قیمت پائی — نکلا جس دم کان سے باہر
تاج میں شاہوں کے جا چمکا — جب دریا سے نکلا گوہر
مے کو ملے غربت میں یہ دشمے — قدر تھی ہی میں شمۂ بھر ؟
کوہ سے کٹ کر سرمہ آیا — کرلیا سب کی آنکھوں میں گھر
پھول ہوئے گلشن سے نکل کر — زینت گردن، زیب سر
فتح کیا اس نے ہندوستان — آیا وطن سے جس دم باہر
گھر سے نکل کر انگریزوں نے — کرلیا قبضہ اک دنیا پر
تم بھی ہند سے گر نکلو گے — فائدہ حاصل ہوگا سراسر
ہند میں گو سب عیش ہیں لیکن
" گھر کی مرغی دال برابر " (۲)

ادبی پرچوں کا جاری رکھنا اور خصوصیت سے کسی ایسے ہفتہ وار ادبی پرچے کا جو اشتہارات سے بھی سراسر محروم ہو ، اک صبر آزما کام ہے - حکیم برہم گورکھپوری،

---

(۱) برہم گورکھپوری ، حکیم(مدیر) " فتنہ و عطر فتنہ" ، گورکھ پور : ۹ فروری ، ۱۹۱۰ع ، ج ۲۵ ، ش ۶ ، ص

(۲) ایضاً ، ۲ اپریل ، ۱۹۱۰ع ، ج ۲۵ ، ش ۱۵ ، ص ۱۳

"فتنہ و عطر فتنہ" کو بڑے نا مساعد حالات میں بھی جاری رکھے رہے اور اس کو " اودھ پنچ" کی طرح دل چسپ و دل کش بنانے کی کوششیں کیں اور اس کی اشاعت میں کسی تساہل سے کام نہ لیا۔ آٹھ دس سال تک مسلسل سیکڑوں روپے کا نقصان اٹھانے کے بعد آخر بند کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مولانا قادری کو جب اس کی خبر ہوئی تو مندرجہ ذیل قطعہ لکھ کر برہم کو ارسال کیا :

سنا ہے ہونے کو ہے بند فتنہ — ارادہ یہ گر ہم سے پوچھو برا ہے
رسالے تو ہیں اور بھی خوب لیکن — یہ سب سے انوکھا ہے سب سے نیا ہے
خریدار دیتے نہیں اس کی قیمت — شکایت یہ ہے اور بالکل بجا ہے
خریدار جو نادہند اس قدر ہیں — تو کیوں ان کے نام اس کو جاری کیا ہے
کریں بند فتنہ کو ہرگز نہ برہم — یہ سچ ہے کہ " کرتے کی سب بدبلا" ہے
یہ سچ ہے کہ چلتی کا ہے نام گاڑی — یہ سچ ہے کہ حرکت میں برکت سدا ہے

نہ ہاریں کبھی آپ ہمت خدارا
مثل ہے کہ " ہمت کا حامی خدا ہے" (۱)

کونسل کی ممبری، ملک کی لیڈری کے لیے بعض اوقات بڑی بڑی عجیب دستیاں نمودار ہوجاتی ہیں ۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اپنے کلام میں اکثر مقامات پر ایسے لوگوں کے لیے نئے اچھے الفاظ اور خوب صورت اصطلاحات وضع کی ہیں۔ لیکن مولانا نے صرف ایک عام سی مثل پر اکتفا کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

---

(۱) برہم گورکھپوری، حکیم (مالک و مدیر) ، (ہفت روزہ) " فتنہ و عطر فتنہ "، گورکھپور: ۲۱ دسمبر، ۱۹۱۰ء، ج ۲۵، ش ۵۱، ص ۹

رباعی

عالم کہتا ہے آپ کو ہرجاہل — کوشش ہے کہ سبھی ہو ہم کو حاصل

چھند میں اے ضیا ہماری وہ مثل — "لکھے وہ پڑھے نام محمد فاضل" (۱)

فارسی کی ایک عام مثل ہے "غم نداری بز بخر" مولانا قادری بھی اس مثل سے بہت متاثر ہوئے کسی دوسرے سے تو کچھ نہ کہا اپنے لیے ہی اس کی تاویلات لکھیں اور خود پر ہی اس کو یوں صادق ٹھہرایا :

اے ضیا کیا اور کچھ دھندا نہ تھا — کیوں بلائے عشق لے لی اپنے سر

کیا برا تھا بیٹھنا آرام سے — پھرتے ہو اب مارے مارے در بدر

رات اب کٹتی ہے مشکل‌ہا کبھی — شام سے سوتے تھے چادر تان کر

شغل تھا پہلے ہنسی اور دل لگی — کام ہے رونے سے اب شام و سحر

شغل ہے یہ نالۂ گرم و آہ سرد — حال ہے یہ خشک لب ہیں چشم تر

ہم کو وحشت ہوتی ہے سن سن کے حال — لطف آتا ہے تمہیں اس میں مگر

سچ تو یہ ہے کہ آج کل تو آپ کی

وہ مثل ہے "غم نداری بز بخر" (۲)

ایسے قطعات جواہر امثال مولانا قادری نے متعدد کہے ہیں یہ امثال ہندی کی بھی ہیں ، اردو کی بھی اور فارسی کچھ کی بھی - ذیل میں ہم ان کے طویل قطعات کو چھوڑ کر صرف وہی مصرعے درج کرتے ہیں جو بطور ضرب المثل کے مولانا نے تضمین کیے ہیں :

---

(۱) برہم گورکھپوری، حکیم، "فتنہ و عطر فتنہ"، گورکھپور: ۲۱ دسمبر، ۱۹۱۰ء، ج ۲۵، ش ۵۱، ص ۱۶

(۲) ایضاً، یکم فروری، ۱۹۱۱ء، ج ۲۶، ش ۵، ص ۹

۱- اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا ڈر نہیں

۲- صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

۳- چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

۴- گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

۵- ہرکجا چشمۂ بود شیرین مردم و مرغ و مور گرد آیند

۶- گھر کی مرغی دال برابر

۷- چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

۸- ان نینن کے یہی بسیکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

۹- در عمل کوش و ہرچہ خواہی پوش

۱۰- آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

۱۱- دوستی نادان کی ہے جی کا زیاں ہوجائے گا

۱۲- عید رمضان آمد و ماہ رمضان رفت

۱۳- ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

۱۴- غلطی کی ہے جو کافر کو مسلماں سمجھا

۱۵- بس ہوچکی نماز مصلا اٹھائیے

۱۶- درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

۱۷- دو مع الدھر کیف ما دارا

۱۸- تو پاک باش برادر مدار از کس باک

۱۹- جیسی کرنی ویسی بھرنی

۲۰- ہمت کا حامی خدا ہے

۲۱- روشن صورت ہیں ہمیں قید محرم کیا ہے

۲۲- غم نداری بز بخر

۲۳- ز خوردان خطا و ز بزرگان عطا

۲۴- لکھتے نہ پڑھے نام محمد فاضل

۲۵- ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

۲۶- بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

۲۷- پدرم سلطان بود

۲۸- الیاس احدی الراحمین

۲۹- اونٹ رے اونٹ تری کون سی کل سیدھی

مولانا نے ضرب الامثال ہی کو نظم کرنے کے لیے قطعات نہیں کہے انہیں کلام پاک سے بھی بے پناہ عشق تھا ان کی تاریخیں تو سراسر آیات قرآنی سے مزّین ہیں ہی مگر عام قطعات میں بھی ان کا یہ وصف نمایاں ہے ۔ قطعہ میں آیات قرآنی کی تضمین کر کے وہ اس میں اک عجیب سرور و کیف اور زور و اثر پیدا کردیا کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے قرآن کریم کی صدھا آیات کو قطعات میں تضمین کیا ہے ۔ یہاں چند قطعات درج کیے جاتے ہیں :

ہے یہ ارشاد خداوند ابد | اس میں کچھ شک ہے نہ کچھ بات کی
کہہ دو عالم سے بنام اسلام | " انما اللہ آلہ و احد "

===xxx====

حق پر باطل کو دو نہ ترجیح | رھبر کیا ہو جو خود ہے گم راہ (۱)
بننا چاہے جو کفر ہادی | کہدو " ان الھدی ھدی اللہ "

===xxx====

ہو نہ محنت سے آدمی مایوس | مل رہے گا کبھی تو کچھ ثمرا
صاف قرآن میں ہے " لعل اللہ " | " یُحدثُ بعد ذالک امرا "

===xxx====

قارون کا سا حشر ہو نہ تیرا مسک | لینا ہی نہیں تجھے ہے کچھ دینا بھی

---

(۱) ع " او خویشتن گم است کرا رھبری کند "

کرمال سے علمی کی طلب بھی نادان　　" لاتنس نصیبک من الدنیا " بھی

===xxx====

قادری رنگ ہے نیرنگ جہان کا بھی عجیب　　عقل انسان اس راہ میں گم ہوتی ہے

یاد دکھلا رہے عیش کے متوالوں کو　　عید کے روز محرمؔ کی دہم ہوتی ہے (۱)

====xxx===

سر مسلم ہے خم حکم خدا پر　　اسی کا اصل میں اسلام ہے نام

یہی دنیا، یہی عقبیٰ، یہی دین　　یہی منزل، یہی مقصد، یہی کام

نہو وہ جبر و طاغوت و طغیان　　کہ " ان الدین عند اللہ الاسلام "

===xxx===

دین اسلام خدا کے نزدیک　　ہے پسندیدہ مکمل اعلا

غلبہ میں نہیں شک مسلم　　" لا تخف انک انت الاعلیٰ "

==xxx====

منظومات و منثورات

تاریخ ادب کے مطالعہ سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ نظم کی ابتدا نثر سے پہلے ہوئی ۔ دوسروں کو اپنی زبان کی طرف راغب و متوجہ کرنے کا ایک آسان طریقہ نظم بھی ہے۔ مبلغین اسلام و بزرگان دین نے بھی ترویج و اشاعت دین کی خاطر نظم کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا۔ ایک طول طویل اور فصیح و بلیغ عبارت وہ کام نہیں کرسکتی جو نظم کا ایک سیدھا سادا اور عام فہم مصرعہ کرجاتا ہے ۔ نظم کو آج کل دو معنی میں استعمال کیا جاتا ہے

---

(۱)　" ایسا مشہور ہے کہ جس دن عید الفطر ہوتی ہے اسی دن محرم کی دس تاریخ پڑتی ہے ۔"

پہلا تو اس کا وہی قدیم مفہوم ہے یعنی اشعار کا ہر وہ مجموعہ خواہ وہ غزل و قصیدہ ہو یا مثنوی و قطعہ مگر ایک مرکزی خیال اور تسلسل رکھتا ہو۔ قصائد و مثنویات اسی ضمن میں آتے ہیں ۔ مگر دور جدید میں نظم ایک قسم کے موضوعی اشعار کو بھی کہا جانے لگا ہے اسی کو نظم جدید کا نام بھی دیا جاتا ہے ۔ ایسی نظموں کے عنوانات و موضوعات مقرر ہوتے ہیں ۔ اس میں شاعر خارجی حالات و واقعات کو بھی فطری و ذاتی انداز سے پیش کرتا ہے ۔ اردو نظم بھی اردو غزل کی طرح شاعری میں بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ جس طرح غزل میں میر و درد ، آتش و غالب ، مومن و فانی اور حسرت و جگر ممتاز شعرا ہوئے ہیں اسی طرح نظم میں نظیر اکبر آبادی ، حالی و آزاد ، شبلی و سرور ، چکبست و نادر ، اکبر و اقبال اور اسمعیل میرٹھی و شوق قدوائی کے نام بھی نمایاں ہیں۔ ان سب شعرا کی نظمیں حب الوطنی ، درس عزم و عمل اور مناظر فطرت سے بھر پور نظر آتی ہیں۔

مولانا قادری کا رجحان بھی نظم نگاری کی طرف زیادہ تھا ۔ لیکن علمی خدمات اور تعلیمی و تدریسی مشاغل و مصروفیات نے اس جذبے کو پنپنے نہ دیا۔ لیکن پھر بھی ہنگامی حالات میں کوئی ضرورت پیش آجاتی یا کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر ہوتا تو ان کی فطرت نظم نگاری رنگ لائے بغیر نہیں رہتی تھی اور ایسے موقعوں پر وہ جو کچھ بھی نظم کرتے وہ دوسروں کو متاثر کیے بغیر نہ رہتا۔

آپ کی ابتدائی دور کی نظموں کا انداز کچھ چھیڑ چھاڑ کا سا ہے ۔ مثلاً :

ملے کل حضرت واعظ عجب حالت تھی حضرت کی
نمایاں آپ کے آئینۂ رخ سے تھی حیرانی
شکستہ حال غم گیں مضطرب معلوم ہوتے تھے
نظر آتی تھی گرد آلود ساری ریش نورانی

جو میں نے حال پوچھا کچھ نہ بولے ہوگئے نادم

" چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی "

مگر جو تاڑنے والے ہیں فوراً تاڑجاتے ہیں

کہے دیتی تھی سارا حال ان کی چین پیشانی

یہ میں نے عرض کی بڑھ کر کہ مجھ پر ہوگیا روشن

چھپانا بھیٹ دائی سے نہیں ہے کیا یہ نادانی

کسی کو آپ نے بھی دے دیا ہے دل یہ ظاہر ہے

کسی کی یاد زلف عنبریں میں ہے پریشانی

کسی کے دام گیسو میں پھنسے ہیں آپ بھی بے شک

کسی کی یاد میں ہے خاک صحرا آپ نے چھانی

کہاں ہے آپ کی وہ پارسائی اور وہ تقوی   کیے احکام حق حضرت نے زیب طاق نسیانی

عبادت مٹ گئی سب نقش باطل کی طرح گویا

ریاضت آپ نے جو کی تھی سب پر پھر گیا پانی

خطا اس میں نہیں ہے آپ کی اے مہربان لیکن

کہا ہے سچ کہ ہوتی ہے جوانی سخت دیوانی

مجھی کو آپ کہتے تھے مگر اچھی تو آپ کہئیے

" چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی "

اسی طرح ایک رومانی نظم " آنکھیں" کے عنوان سے لکھی ہے جو مندرجہ ذیل ہے :

تیرھیں دل پر کی آنکھیں   خون کی ہیں پیاسی آنکھیں

کسی یہ آنکھیں بدخو ہیں   منتر افسوں جادو ہیں

جس سے یہ دو چار ہوئیں　　اس کے جگر کے پار ہوئیں

ہر عاشق بیمار ان کا　　سب کو ہے آزار ان کا

مست بھی ہیں ہشیار بھی ہیں　ساحر بھی ہے خوار بھی ہیں

مجھ پہ بھی ڈھائی ہے آفت　　ان سے ہی آئی ہے آفت

مجھ سے دغا کی مل مل کے　　کردیے سو ٹکڑے دل کے

آہ یہ جس دن مجھ سے لڑیں　　آفتیں کیا کیا مجھ پہ پڑیں

کردیے ہوش و خرد غارت　　اللہ ری ان کی جگر جراتؑ

پہلے دل ، پھر دین لیا

ہائے سبھی کچھ چھین لیا

===xxx====

۱۸ ستمبر، ۱۹۲۸ء کو سینٹ جانس کالج آگرہ کی انجمن ترقی اردو کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ طلبہ و اساتذہ نے مولانا سے بھی جلسے میں نظم پڑھنے کی فرمائش کی - مولانا نے " ترقی اردو" کے عنوان سے ایک طویل نظم جلسے میں پڑھی جو بہت پسند کی گئی - ملاحظہ ہو :

ترقی اردو

پھر جوش پہ ہے بہار اردو　　پھر نغمہ سرا ہزار اردو

پھر جان میں جان آ چلی ہے　　بے جان تھا جسم زار اردو

پھر زندہ ہوئی ہے انجمن آج　　پھر شاد ہوں غم گسار اردو

زیبا ہے کہیں جو انجمن کو　　ماشاءاللہ گل عذار اردو

پھر کیجیئے کوشش ترقی　　بنیے لگے جونہار اردو

ہوجائیے بس فنا فی الاردو　　کردیجئے جان نثار اردو

سینچو اسے اپنے خون دل سے ‏ پژمردہ ہے لالہ زار اردو

کولیتی ہے جذب ہر زبان کو ‏ ہے پھیلتی ہوئی کنار اردو

ہیں عربی و فارسی و بھاشا ‏ اجداد بزرگ وار اردو

رائج اسے کردو ہند بھر میں ‏ چلنے لگے کاروبار اردو

کیوں کر ہوں سب کے قلب و جان ایک

جب تک نہ ہو ملک کی زبان ایک

پھر ایسی دکھاؤ شان اردو ‏ اڑنے لگے پھر نشان اردو

ہو ہند کی لنگوا فرنکا ‏ ہے ایسی زبان اردو

تصنیف کرو کتابیں ایسی ‏ ہر شخص ہو مدح خوان اردو

سائنس و فلاسفی و لاجک ‏ ہیں عنصر جسم و جان اردو

تصنیف جو کچھ ہو نثر یا نظم ‏ ہو لائق عز و شان اردو

مضمون کا نمک شکر زبان کی ‏ معمور ہو ان سے خوان اردو

رکھتے ہیں یہ رائے حضرت داغ ‏ وہ نازش دودمان اردو

" جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

کہتے ہیں اسے زبان اردو " (۱)

بے شک ہے یہ اردوئے معلی ‏ بے شبہ یہی ہے جان اردو

لیکن مضمون بھی ہے اک چیز ‏ بڑھ جاتی ہے جس سے شان اردو

ہیں دونوں فصاحت و بلاغت ‏ مہر و مہہ و آسمان اردو

زندہ کرو نام میر و غالب ‏ وہ فخر پیمبران اردو

---

(۱) مولانا قادری نے بوجہ ضرورت شعری اور زبان کا قافیہ نظم کرنے کی غرض سے مرزا داغ کے مصرعوں کی ترتیب بدل دی ہے -

سید ، حالی ، نذیر ، آزاد — وہ سرور کاروان اردو

شبلی و شرر ، سرور و سرشار — وہ انجم آسمان اردو

اقبال و عزیز و اکبر و شاد — وہ فخر سخن وران اردو

سجاد و حسن ، پریم و راشد — وہ باعث زیب و شان اردو

دنیا پہ بٹھادو اس کا سکہ — ہر لب پہ ہو داستان اردو

اردو کو بنا دو اسپرنٹو — ہو سب کی نہان زبان اردو

اردو ہے خزینۂ ترقی

اردو ہی ہے زینۂ ترقی

ایک مرتبہ کالج کے تمام پروفیسروں نے فتح پور سیکری جاکر پکنک منانے کا پروگرام بنایا مولانا نے اس موقع پکنک سے متاثر ہوکر جو نظم کہی وہ مندرجہ ذیل ہے :

وہی لوگ دنیا میں دل شاد نکلے — جو دل کے طبیعت کے آزاد نکلے

پروفیسر ایسے ہی کالج کے ہیں سب — بڑی ولولوں سے دل آباد نکلے

اگر زندگی کو کہیں کوہ کندن — تو اس بستی کے یہ فرہاد نکلے

وہ رنگ مسرت بھرا زندگی میں — کہ گویا یہ مانی و بہزاد نکلے

ڈنر ، پارٹی ، کھیل ، تفریح ، پکنک — یہ سب ان کے گویا کہ ہم زاد نکلے

اسی شوق میں فتح پور آج آئے — یہاں آرزوئے دل شاد نکلے

اسی واسطے ہم بھی ہیں ساتھ سب کے — کہ کچھ حسرت جان برباد نکلے

نہ بس پر چلا بس تو بس ریل پکڑی — کہ یوں شکل تعمیل ارشاد نکلے

وہ لائے ہمیں وہ تو آہی گئے ہم — وہ استاد تو ہم بھی استاد نکلے

زمانے کی بیداد ہے عمر بھرکی — وہ ہیں کون جو غم سے آزاد نکلے

مگر مل کے جشن ہوں لیں ہم جو اک دن　　تو دل سے ذرا خار بیداد نکلے

مناؤ کچھ اس طرح جشن آج یارو　　کہیں سب کہ یہ بیکک ایجاد نکلے

بڑی لطف کی آج پکنک رہی ہے　　وہ کہیں دل سے بے ساختہ داد نکلے

وہ کہیں ہوتی اچھی سے اچھی ہر اک شے　　کہ کھوٹے کھری کے یہ نقاد نکلے

وہ جلسے وہ سیریں وہ کھانا وہ گانا　　کہ جن کی نہ دل سے کبھی یاد نکلے

توقع سے بڑھ کر نشاط و طرب میں
یہ انعام سارے خدا داد نکلے

مولانا ۱۹۵۵ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ سے ریٹائر ہوکر کراچی آئے - اس شہر سے بڑے ہی متاثر ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں ایک نظم " نظم مزاج رنگیں" ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء کے عنوان سے تحریر کی اس میں جا بجا ہجری و عیسوی مادہ ہائے تاریخ کا اہتمام بھی رکھا ہے نظم نہایت ہی پر لطف اور مزاحیہ ہے - ملاحظہ ہو :

جب سے آئے ہیں ہم کراچی میں　　جان کو ہے یہ غم کراچی میں

کہ یہاں گو ہیں بے شمار عزیز　　ان سے ملنا مگر ہے مشکل چیز

کتنے شاگرد ، کس قدر احباب　　جن کا ممکن نہیں شمار و حساب

لیکن اس کی بڑی ہے مجبوری　　کہ بہت ان میں ہم میں ہے دوری

ایک " جٹ لینڈ" میں فروکش ہے　　اس سے ملنے کو دل مشوش ہے

اک مقیم " بہار کالونی "　　اس سے ملنا ہے بات انہونی

فیڈرل ایریا ہے ایک یہاں　　مخلص بے ریا ہے ایک جہاں

اک سکونت پذیر " لالوکھیت "　　وان رہے جاکے نامہ بر بھی کھیت

ایک رہتا ہے " ڈان ہاؤس " میں　　ہے کہاں؟ پھریے اس تجسس میں

بُعد ہے ہم میں اور فضاسی میں ہیں بہت دور " رام سوامی" میں

اک نئی بات یہ سنی ہے یہاں اک " خدا داد کالونی" ہے یہاں

واں جو پہنچے خدا کے پہنچوائے جوتے بھی ٹوٹے ، کپڑے بھی پھٹوائے

اک ابی سینیا حبش نکلا بُعد سے دل کنارہ کش نکلا

اک محلہ یہاں ملا " رنچھوڑ " بھاگے تھے واں کے لوگ کیا رن چھوڑ

اک " صدر" ایک "بکرا پیڑی" ہے ایک سگرٹ ہے ، ایک بیڑی ہے

" قائد آباد" اک خراب آباد قہرآباد ہے ، عذاب آباد

سب عناصر کا نازل اس پہ عتاب سب عدو، خاک و باد و آتش و آب

یہ جلسے یا بہے ، اُڑے کہ مٹے سہل گردش سے یا فلک سے ہٹے

اس سے بیٹھے ہیں سب ہی منہ موڑے رحم ہو حادثات کے چھوڑے

واں امارت محل ، یہاں جگی حکم کا آٹا اینٹ کی دگی

الغرض بُعد بے تحاشا ہے یہ بھی تقدیر کا تماشا ہے

میل ان سب کے کم سے کم سات آٹھ

مجھ سے کم زور کو یہ آٹھ بھی ساٹھ

عزیزوں کے بعد کا ذکر کرنے کے بعد کراچی میں پائے جانے والے بزرگوں کے مزارات ان سے عقیدت رکھنے اور فیض یاب ہونے والوں کے اور اپنے تاثرات بھی پیش کرتے چلتے ہیں :

اک یہاں ہے مزار منگا پیر کہیں پنجابی ان کو " چنگا پیر"

گرم چشمہ وہاں ہے گندھک کا جس کو اجرا ملا ابد تک کا

سینکڑوں سال سے وہ جاری ہے اپنے بندوں پہ فضل باری ہے

چشمہ آب حیات کا کہیے فیض حضرت کی ذات کا کہیے

ہے یہ اعجاز حضرت منگا　　　جائے بیمار ہو بھلا چنگا

وہیں تالاب میں پڑے ہیں مگر　　　توبہ! کتنے بڑے بڑے ہیں مگر

جس نے منت جو کچھ بھی ہو مانی　　　کی بکری کی جاتی ہے قربانی

گوشت اس کا مگر جو کھاتے ہیں　　　لوگ اپنی مراد پاتے ہیں

گو زیارت کا شوق ہے دل میں　　　بُعدِ منزل سے ہم ہیں مشکل میں

ہم تو تیار تھے کمر کس کے　　　بس کے جھٹکے مگر نہ تھے بس کے

====XXX====

اک کلفٹن ہے اک منوڑا ہے　　　کیا مگر ان کا بعد تھوڑا ہے

ہیں مزارات اولیا بھی وہاں　　　کام آئے لیا دیا بھی وہاں

لطف نظارہ ، راحت دل بھی　　　فیض باطن بھی، سیر تک ساحل بھی

ہو سمندر میں سیر کشتی بھی　　　دھوئی جائے عمل کی زشتی بھی

شہر وان جانے کی نہ اب تک رائے　　　اب کوئی مثل موج سر ٹکرائے

===XXX====

کراچی میں حضرت عبداللہ غازی کا مزار کلفٹن پر سمندر کے کنارے نہایت اونچائی پر واقع ہے ۔ اس کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی بحرین کا ایک نہایت مشہور واقعہ بھی بیان کیا ہے جس میں ایک صاحبزادہ کا ذکر ہے جو کہ ایک ہندو راجہ کا سفیر بن کر حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور جب لوٹا تو دولت اسلام سے مالا مال تھا :

اک صحابی کا بھی یہاں ہے مزار　　　روح پر اُن کی ہوں سلام ہزار

ان کی قبر شریف کا ہے وہ طول　　　آج کل ہے جو زائد از معمول

ہوں گے حضرت ضرور قد آور　　　سبکو باور ہے قدرت داور
میں نے دیکھا کہیں ہے اور ایسا　　　پہلے تھا عمر و قد کا طور ایسا

میرا اصلی وطن جو ہے بچھراؤں ۔۔۔ سایہ طوبیٰ کا مجھ کو جس کی چھاؤں

واں بھی ایسا ہی ایک مرقد ہے ۔۔۔ ان کا بھی حد سے بیشتر قد ہے

وہ بھی اک مرقد صحابی ہے ۔۔۔ ثابت اس کی فلک جنابی ہے

ان کا شاید رتن حسین ہے نام ۔۔۔ پائی تھی صحبت رسول انام

گئے بن کر سفیر راجا کے ۔۔۔ کرلیا مس کو کیمیا جا کے

آئے خدمت میں جو رتن آئے ۔۔۔ واں سے آئے حسین بن آئے

ہے جہاں ان کی قبر جنگل ہے ۔۔۔ اسی جنگل میں ان سے منگل ہے

پہلے رہتے تھے شیر اک بن تھا ۔۔۔ ہم نے دیکھا تو بن کا گلشن تھا

وہ علاقہ ہے ایک ہندو کا ۔۔۔ اک شکم سیر، ریچ کا بھوکا

کیا کرامت ہے دین حق کا حریف ۔۔۔ کرتا ہے خدمت مزار شریف

طائر فکر کی تھی یہ بھی اڑان ۔۔۔ ہم کراچی سے پہنچے ہندوستان

اس کی تاریخ کہتی ہے کیا بات

" ہوتی ہے بات میں بھی پیدا بات "

۱۳۷۶ھ

باتوں باتوں میں مولانا کراچی سے ہندوستان بھی لے پہنچے اور فن تاریخ کی مہارت بھی دکھادی اور پھر اپنے مسکن پر ناظم آباد کراچی میں واپس لے آتے ہیں اور یوں سخن گستر ہیں :

ہو رہا تھا بیان کراچی کا ۔۔۔ ستم آسمان کراچی کا

کچھ بسوں اور بے بسوں کا بیاں ۔۔۔ بعد منزل کا بیکسوں کا بیاں

ناظم آباد کا بڑا میدان ۔۔۔ جو ہے گویا کہ حشر کا میدان

اپنی وسعت میں جو لق و دق ہے
اور وحشت میں دشت ہو حق ہے

دور افتادہ ہر مقام ہے ہے
اور الگ شاہ راہ عام سے ہے

یہی کہتے ہیں دیکھ چاروں کھونٹ
کون سی کل ہے سیدھی اونٹ پہ اونٹ

ایک تو فاصلہ ہے دور و دراز
پھر ہیں رستے میں سو نشیب و فراز

کبھی تالاب ہیں، کبھی خندق
کسی موسم میں چین کا نہیں حق

رات ہو تو ہے بس اندھیرا گھپ
کھاتے ہیں ٹھوکر اور رہتے ہیں چپ

پاؤں رکھیں کہیں، کہیں پڑ جائے
چھوڑ بکری ہی راہ میں اڑ جائے

سوچ کتنے یہ گر قدم پڑ جائے
اور وہ انتقام پر اڑ جائے

اک قیامت کی پھر تو الجھن ہے
جائے ماندن نہ پائے رفتن ہے

گندے نالے بھی یاں گذرتے ہیں
چین سے دن کہاں گذرتے ہیں

مکھیاں، مچھروں کی بھی بہتات
اور کھٹمل بھی ہیں بہت بد ذات

گھر ہے اپنا بھی گندے نالے پر
ہیں ہمیں مجبور بندے نالے پر

ہم جو یاں آن کر پھنسیں آخر
روئیں قسمت پہ یا ہنسیں آخر

کہ مسافت جب اس قدر ہو طویل
کیا ہو ملنے کی دوستی سے سبیل

رہ گیا گھٹ کے شوق سینوں میں
کیا ہوا گر ملے مہینوں میں

آ پڑے ایسے دور کونے میں
اچھا ہونا بھی ہے نہ ہونے میں

پھر ہے گھر کا اتا پتا مشکل
ہے عجب وا مصیبتا مشکل

مولانا قادری کی اس نظم سے لوگوں کی اقتصادی و معاشرتی حالت، رہن سہن، اور طور اطوار کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ کراچی کی معاشرتی حالت پر

مولانا نے کوی تقلید کی ہے - کہتے ہیں :

وقت لگتا ہے آنے جانے میں　　کس کو فرصت ہے اس زمانے میں

وقت سے وزم کرکے آئیں تو آئیں　　عزم بالجزم کرکرآئیں تو آئیں

ہم بھی ہیں اپنے غم سے کم خالی　　کیا ہو ملنا، نہ وہ نہ ہم خالی

ہیں سبھی اپنی اپنی دھن میں لگے　　زندگی کی ادھیڑ بن میں لگے

روزی ملتی نہیں بآسانی　　روز کھودے کنواں پیئے پانی

نہ ملے پھاوڑا تو کیا کھودے　　غم میں بس جان مبتلا کھودے

ساز و سامان کی وہ گرانی ہے　　کہ مصیبت میں زندگانی ہے

اک سخن تھی حماقت راجا　　تھے ٹکے سیر بھاجی اور کھاجا

وہ حماقت نہیں لیاقت ہے　　یاں لیاقت یہی حماقت ہے

کہ ہے کھاجے کے بھاؤ میں بھاجی　　اس پہ جینے کو چاہے کس کا جی

اس میں دھوکا نہیں ہے بھول نہیں　　یاں ٹکے سیر خاک دھول نہیں

مفت آنکھوں میں جھونکنے کو بہت　　دشنے پہلو میں بھونکنے کو بہت

آج کو غالب اے خدا نہ ہوا　　کہتا تھا :" خنجر آزما نہ ہوا"

جس قدر " خنجر آزما" لیتا　　تھے یہاں، آکر آزما لیتا

یاں بہت خنجر آزمائی ہے　　شوق سے آئے جس کی آئی ہے

بلکہ خنجر پہ بس نہیں کرتے　　جو ملے پیش و پس نہیں کرتے

کچھ ہو چاقو چھرا ، تیر یا تیغ　　آزمانے میں کچھ نہیں ہے دریغ

کس کی ہستی کی کوئی ہستی ہے　　یاں مہنگی ہے جان سستی ہے

ان کو کیا ڈر چھری سے کھانڈے سے　　جن کو کام اپنے حلوے مانڈے سے

مفلسی بڑھ رہی ہے ایک طرف — بے حسی بڑھ رہی ہے ایک طرف

سب پر افلاس ہے کہ طاری ہے — عالم یاس ہے کہ طاری ہے

کیا وضو کو ہی آب پاک نہیں — ہاں تیمّم کو گھر میں خاک نہیں

جن کے سب حل و عقد ہاتھ میں ہے — عیش انھیں مفت ، نقد ہاتھ میں ہے

کیا لکھوں ان کا کھول کر احوال — لکھ دوں بس یہی شعر میں اک سال

زیادتیٔ رُتبہ کی چڑھائی میں — پانچوں گھی میں ہیں سرکڑھائی میں

۱۰۳۸ — + ۹۱۸ = ۱۹۵۶ء

اس لیے سر میں پھر گیا خنّاس — ان سے مانگو پناہ ربّ الناس

====XXX====

یہ تمام باتیں بیان کرنے کے بعد مولانا کو احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے قضیے کو قالہ بنادیا ہے - دل چسپ باتیں لکھتے لکھتے دل خراش باتوں پر اتر آئے ہیں مگر منہہ پر آئی بات کہنی ہی پڑتی ہے - یہاں سے وہ اپنے اشہب قلم کو پھر موڑتے ہیں اور بیان کرتے ہیں :

پھر یہ خامہ مرا بہکنے لگا — یا کھلا مشک اور مہکنے لگا

یا جو دل گردشوں سے پسنے لگا — اندر اک زخم تھا وہ رسنے لگا

دل بھی آفت کا ایک ہے پرکالہ — اس نے قضیے کو کردیا نالہ

وہ تو پیرایۂ ظرافت تھا — ایک سرمایۂ لطافت تھا

بات تھی اپنے آنے جانے کی — جس کو گردش کہیں زمانے کی

کرنا پڑتا ہے جب سفر بس میں — نہیں ملتی جگہ بھی ہر بس میں

کبھی ایسا ہے رش خدا کی پناہ — کس قدر کشمکش خدا کی پناہ

گرچہ ملنے کی کھائی ہوں قسمیں — بس میں جانا مگر نہیں بس میں

پھر بھی رہتا ہے پاؤں میں چکر — بیٹھتے ہم نہیں کبھی تھک کر

گھر سے ہونا ہی پڑتا ہے بے گھر   آج اس کے گئے کل اس کے گھر

اس میں دل مبتلا ہی رہتا ہے   آنا جانا لگا ہی رہتا ہے

جب گئے صبح اور آئے شام   اک ملاقات ہی میں [illegible] دن ہے تمام

گر طنابیں زمیں کی کھنچ جائیں   آنے جانے کے سب یہ جھنجھٹ جائیں (Hitch)

ہوگئی یہ بھی ایک دل کی چیخ   قادری کہدو اس کی اب تاریخ

سحر و شام آنے جانے کے = ۷۷۰ }
} + ۱۹۵۶ء
اتفاقات ہیں زمانے کے = ۱۱۸۶ }

====xxx====

مثنوی نمونۂ عبرت

مولانا قادری کی شعری تصانیف میں " مثنوی نمونۂ عبرت" بڑی اہمیت رکھتی ہے - یہ مثنوی مولانا نے جنوری ۱۹۳۲ء کو اکبر آباد (آگرہ) دوران قیام میں لکھی تھی - اس مثنوی کی تصنیف کا سبب یہ تھا کہ مولانا حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری کے خلفاءِ مجاز میں سے تھے اور ہر سال پابندی سے عرس کے موقع پر علی پور شریف حاضر ہوا کرتے تھے - ایک روز ان کے پیر و مرشد نے دوران وعظ کلام پاک کی یہ حرمتی کرنے کے سلسلے میں ایک شخص کا نہایت ہی عبرت انگیز واقعہ بیان کیا - مولانا قادری بھی اس سے متاثر ہوئے اور خیال کیا کہ اس کو نظم کرنا چاہیے - اتفاق سے انہی دنوں " شاہنامہ اسلام" کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی- مولانا کے ایک پیر بھائی حفیظ ہی کے انداز میں یہ نظم دن رات جس وقت بھی موقع ملتا پیر و مرشد کو سناتے رہتے تھے- " شاہنامہ اسلام" کی طرز اور بحر مولانا کو بھی بہت پسند آئی اور اسی بحر میں وہیں چند اشعار لکھنے شروع کردیے- گھر آگئے اکر تقریباً دو ہفتے میں نظم مکمل کرلی- ۱۹۳۳ء میں جب دوبارہ

علی پور پہنچی تو ہزارہا سامعین کے مجمع میں اس کو سنایا جس سے عجیب سماں بندھ گیا
اور نظم بے حد مقبول ہوئی ۔

مولانا کا گھرانہ صوفیوں اور مولویوں کا گھرانا تھا۔ ان کو بچپن ہی سے مذہب و
طریقت کی طرف رغبت تھی اس لیے اولیائے کرام سے عقیدت ہونا تو لازمی تھا۔ اس مثنوی میں
بھی مذہب و طریقت سے محبت اور کلام الہی کی بے پناہ عظمت و تقدس اس طرح واضح ہے :

حضور قبلۂ کون و مکاں شاہ علی پوری　　میرے مرشد پناہ دوجہاں شاہ علی پوری
کریں ان کے فضائل پر جو کوشش غور سب کچھ ہیں　　خلاصہ یہ کہ پیمبر نہیں اور سب کچھ ہیں
بیاں کرتا ہوں اک ادنیٰ نمونہ ان کی سیرت کا　　نصیحت کا ، ہدایت کا ، ولایت کا ، کرامت کا
کسی کے میہماں اک شہر میں تھے حضرت والا　　زہے قسمت جسے حاصل ہو فیض خدمت والا
کہ حضرت لے گئے تشریف واں اک روز مسجد میں　　تو دیکھا اک عجب نظارۂ دل سوز مسجد میں

اس مسجد کے ملا کی بے دینی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

نظر آئی یہ بے دینی وہاں مسجد کی مُلّا کی
عیاں تھا جس سے اس کا خبث باطن اور ناپاکی
کہ جس منبر یہ اپنے پاؤں بے ایماں لٹکتا ہے
اسی منبر کے نیچے فرش پر قرآن رکھتا ہے

خدا کے زیر منبر واں کلام پاک رکھا ہے؟ بھلا ایسے کے دل میں نور ایماں خاک رکھا ہے
یہ حالت دیکھ کر حضرت کو غیظ آیا غضب آیا؟ بلایا اور پوچھا ، سامنے جب بے ادب آیا
کہ تو پیرو ہے کس مذہب کا کیا تیرا طریقہ ہے؟ وہ بولا جو امام بو حنیفہ کا طریقہ ہے

اس کے بعد وہ کلام پاک کی عظمت و تقدس یوں بیان کرتے ہیں :—

یہ وہ قرآن ہے جس کو بے طہارت مس نہیں کرتے
ادب کرتے ہیں کیسا کچھ اسی پر بس نہیں کرتے کہ

یہ وہ قرآن ہے جس کو دین والے دل میں رکھتے ہیں

جسے رحلوں پہ رکھتے ہیں اگر محفل میں رکھتے ہیں

یہ وہ قرآن ہے رکھتے ہیں مسلمان جس کو سینے میں

یہ وہ قرآن ہے جو منقوش ہے دل کے نگینے میں

ہدایت کا اسی سے ہے اجالا ہفت کشور میں

قیامت تک رہے اس کا بول بالا ہفت کشور میں

یہی وہ شرعِ کامل ہے یہی وہ دینِ راسخ ہے

جو ہر ملت کا مُکَمِّلُ ہے ، جو ہر مذہب کا ناسخ ہے

یہی ہے جانِ توحید اور یہی روحِ مذاہب ہے

غلط ہر قولِ کاہن ، فعلِ موبد ، زُہدِ راہب ہے

۱ اسی سے شرک بے حاصل کو باطل سب نے سمجھا ہے

اسی سے حق کو حق باطل کو باطل سب نے سمجھا ہے

یہی بندوں کو حق کا آخری پیغام رحمت ہے

اسی سے دین کی تکمیلؔ اتمام نعمت ہے

تصدّق اس کے اوپر مال کیسا جان و مومن ہے

یہی دولت ہے مومن کی یہی ایمان مومن ہے

سیاہی اس کے حرفوں کی سویدا قلب مومن کا

اسی سے نور ظلمت میں ہویدا قلب مومن کا

اسی کے حق میں " اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا " بھی فرمایا

حفاظت کا بڑی تاکید سے وعدا بھی فرمایا

کتاب اللہ ہے یہ شان لاریب فیہ اس کی ہے نہیں ممکن مثال اس کی ظہور امرکی شبیہ امرکی

بناکر حق نے بھیجا ہے هُدًى لِلْمُتَّقِين اس کو

بتایا ہے بلا شک مشعل راہ یقین اس کو

نہیں کرتا ہے جو اس کا ادب کافر ہے، بے دین ہے

خدا کا کہیں نہ ہو اس پر غضب کافر ہے ، بے دین ہے

حکایت طویل ہے غرض یہ کہ ملا ان نصائح سے سبق اندوز نہ ہوسکا اور قرآن کو جوں کا

توں رکھا رہنے دیا۔ حضّار مسجد بھی اس کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور لعنت ملامت

کی مگر وہ ملا بھی بڑا بد ذات تھا۔ " بے دین" کہنے پر اس نے آپ پر ہتک عزت کا دعوا

کیا ۔ اول تو کوئی وکیل اس کی ذلالت کے سبب اس کی طرف سے مقدمے کی پیروی کے لیے

تیار نہ تھا بلکہ سب الٹا اس کو ذلیل کرتے تھے آخر ایک الف دین نامی وکیل نے اس کی

وکالت کرنے کی حامی بھرلی مگر بعد میں کیا ہوا اس سلسلے میں مولانا بیان کرتے ہیں :

بالآخر اک وکیل بے حمیت ہی کیا حامی

کہ ہوسکتا ہے اک شیطان ہی شیطان کا حامی

نہ اس جاہل کو آتا تھا الف دین کا نہ بے دین کی

وہ بے دین تھا حمایت کس لیے کرتا نہ بے دین کی

کیا جب ذکر اس نے اپنے ہم پیشہ وکیلوں سے

کیا تائی سبھی نے حجتوں سے اور دلیلوں سے

مولانا نے ایک خاص بات اس میں بھی ملحوظ رکھی ہے کہ ایک سکھ وکیل کی زبان

کے ذریعہ مسلمانوں کو دین اسلام اور کلام الٰہی کی جس عظمت سے روشناس کرایا ہے یہ بھی

اس بے دین ملا کے واقعہ کی طرح نہایت سبق آموز ہے اور صرف زیب داستان کے لیے نہیں ہے

بلکہ مولانا نے مکمل تحقیق کرکے یہ سچا واقعہ نظم کیا ہے :

کہا اک سکھ نے مسلم ہوکے کرتے ہو غضب کیسا   تمہارے دل میں ہے قرآن کا آخر ادب کیسا

کلام اللہ کہتے ہو مگر عزت نہیں کرتے   حمایت کرتے ہو بے دین کی لعنت نہیں کرتے

ہدایت کرنے والوں کو تم الٹا تنگ کرتے ہو

خودی سے صلح کرتے ہو خدا سے جنگ کرتے ہو

ہمیں دیکھو ہماری جو کتاب دین و ایماں ہے

نہیں کہتے اسے وحی سماوی قول انساں ہے

مگر ایسا ادب کرتے ہیں اس کا اس صفت پر بھی

کہ وہ جس گھر میں ہو چڑھتے نہیں ہم اس کی چھت پر بھی

تمہیں تو چاہئے قرآں کا کیسا ادب کرنا

اٹھاؤ ہاتھ دینے سے ، نہ پھر ایسا غضب کرنا

وکیل بےخرد کو اس کے سمجھانے سے عقل آئی

وہ تھی مسلم کی نادانی ، یہ نا مسلم کی دانائی

نہ کہیں ہو یہ مقام افسوس کا ، عبرت نہ کہیں کر ہو

کہ مسلم کا عقیدہ ایک نا مسلم سے بدتر ہو

نہ کی پھر پیروی ملا کی مسلم نے نہ ہندو نے

رہا ناکام ، جتنی سعی کی دانش کی بد خو نے

اس کے بعد مولانا اس ملا کی چوری و سینہ زوری اور کور باطنی کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کو توبہ کی ترغیب دلاتے ہیں اور توبہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

خدا کرتا ہے توبہ کرنے والے پر کرم بے حد

" اجابت از در حق بہر استقبال می آید"

مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب توبہ صدق دل سے کی جائے ۔ آخر میں وہ ملا پر قہر الہی کے نزول اور اس کے عبرت ناک انجام کا ذکر کرتے ہوئے داستان کو یوں ختم کردیے ہیں :

رہا القصہ اس مسجد میں اور اس شہر میں ملا

رہا کچھ دن مگن عیش و خوشی کی لہر میں ملا

مگر تنگ آگئے اس کے دل کی تنگی اور پستی سے

کیا لوگوں نے خارج اس کو مسجد اور بستی سے

بچا کر جان لوگوں کے غضب سے شہر سے نکلا

خدا کے قہر میں آیا جو ان کے قہر سے نکلا

کیا اپنے وطن کو جب نہ واں رہنے دیا اس کو

مگر شامت نے راحت سے کہاں رہنے دیا اس کو

لڑائی اتفاقاً ہوگئی اک روز بھائی سے وہ بھائی کے لیے سفاک تر نکلا قصائی سے

اٹھا اور پیٹ میں بھائی کے ظالم نے چھرا مارا

برائی تھی طبیعت میں برا سوچا برا مارا

ادھر کی جان بحق تسلیم بھائی نے چھرا کھاکر

ادھر اس کو حراست میں پولس نے لے لیا آکر

عدالت کے لیے اس کو پولس اسی شہر میں لائی

جہاں پہلے ہی اس کو لگ چکا تھا داغ رسوائی

تماشا دیکھنے والوں کا اک مجمع سڑک پر تھا

یہ حیرت ناک حالت تھی یہ عبرت ناک منظر تھا

غرض الزام قتل اس پر ہوا ثابت عدالت میں

نہ چھوٹا ، گو بہت کچھ سب نے کوشش کی وکالت میں

کسی تدبیر سے اتنی رعایت کی گئی اس کی

کہ زندہ بچ گیا پھانسی سے جان بخشی ہوئی اس کی

ہوا یہ فیصلہ، زندان میں چودہ سال کاٹے گا

تعجب کیا جو بویا تھا وہی یہ حال کاٹے گا

مگر تجویز اس کی یہ سزا پھانسی سے بدتر کی

اذیت تھی وہ اک لمحے کی اور یہ زندگی بھر کی

نجات اس کو کہاں جس کو خدا کے قہر نے تاکا

نتیجہ تھا یہ فسق و ظلم کے صغرا و کبرا کا

تو زنہار از مکافات عمل غافل مشو حامد

ہمیشہ گندم از گندم بروید جو زجو حامد

یہ مثنوی تین جزو پر مشتمل ہے جزو اول میں پیر و مرشد کے ایمان و ایقان ، عقائد و سیرت اور کلام الٰہی کے فیوض و برکات اور عظمت و فضائل کا ذکر ہے - جزو دوم میں آپ کی اس کرامت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ پر دین ملا آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی کا طلبگار ہوا مگر آپ نے فرمایا کہ خدا سے معافی مانگ تو میرا نہیں خدا کا گناہ گار ہے مگر اس نے بجائے خدا سے توبہ کرنے کے خود شاہ صاحب پر ہتک عزت کا دعوا کرنے کی ٹھانی جزو سوم میں مخلوق اور خالق دونوں کی طرف سے اسے راندۂ درگاہ کئے جانے ، ارتکاب قتل کرنے اور اس جرم کے عوض چودہ سال تک قید سخت برداشت کرنے کا ذکر کرنے کے بعد اس کی حالت سے قارئین کو بھی اس ضرب المثل کے ذریعہ ؕ گڈ درس عبرت لینے کی تلقین کی ہے :

" از مکافات عمل غافل مشو

گندم از گندم بروید جوز جو "

بہر کیف مولانا کی یہ تمام مثنوی مذہب و تصوف کی ایمان افروز باتوں اور حکیمانہ و ناصحانہ خیالات سے لبریز ہے -

مولانا کو فن عروض و قواعد میں بھی کامل دستگاہ تھی چونکہ عربی و فارسی دونوں زبانوں پر عبور تھا اور اس میں اکثر شعر بھی کہا کرتے تھے- اس لیے اس فن کا حاصل کرنا ان کے لیے کوئی دشوار نہ تھا یہی سبب تھا کہ غزل ، قصیدہ ، رباعی ، قطعہ یا مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کرلینا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا- بڑے عالی ہمت اور زندہ دل تھے لہذا کسی کے مرنے کا کوئی خاص ~~کککو~~ غم نہ کیا سینکڑوں مرنے والوں کی تاریخیں پلک جھپکتے نکال کر دے دیا کرتے تھے مگر نہ کہا تو کسی کے غم میں کبھی مرثیہ نہ کہا البتہ کئی سلام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور واقعات کربلا کے سلسلے میں لکھے - مگر جب ان کے پیر و مرشد حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوریؒ کا وصال ہوا تو

ایسے ان کے پیر و مرشد کا تصرف کہیے یا مولانا کی بے پناہ عقیدت و محبت کہ وہ مرثیہ کہے بغیر نہ رہ سکے موصوف کے وصال کے پندرہ دن بعد آپ نے ترکیب بند کی شکل میں بارہ صفحات پر مشتمل ایک مرثیہ " شور محشر" کے عنوان سے لکھا ـ جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

جاء یوم القیامت آہ فآہ   غاب نور الکرامت آہ فآہ
خسفت بدر الارض یا اسفا   کسفت شمس الامت آہ فآہ
آہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا   آئی ناگاہ آفت آہ فآہ
ہائے اندھیر ہوگئی دنیا   چھاگئی کیسی ظلمت آہ فآہ
ہم ہیں اور عمر بھر کا رونا ہے   اب سکوں ہے نہ راحت آہ فآہ
نہ رہا قطب وقت و غوث زماں   تھا جو کان طریقت آہ فآہ
آہ منہ کو کلیجہ آتا ہے   ہوگیا کون رخصت آہ فآہ
قادری آہ یہ کہیں کہہ کر   فَاتَ شَاہِ جَماعت آہ فآہ
کرگئے پردہ دکاہ دنیا سے
جا ملے وہ رفیق اعلا سے

ایک اور بند میں آپ کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ایک صاحب کمال تھا نہ رہا   آپ اپنی مثال تھا نہ رہا
نہ رہا ایک تھا جو خلق میں فرد   برگزیدہ خصال تھا نہ رہا
جس کا دیدار نور دیدۂ دل   ایک یوسف جمال تھا نہ رہا
ہر قدم پر ہر اک عمل میں جسے   صدق و حق کا خیال تھا نہ رہا
کون اب دستگیر عالم کا   کون نعم النصیر عالم کا

آگے آپ کی چند اور روحانی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

روح کو جگ مگانے کا اب کون   رات کو دن بنانے کا اب کون
نور سے اپنے دل کی ظلمت میں   شمع وحدت جلانے کا اب کون
بھولے بھٹکے خدا کے بندوں کو   راہ حق پر لگانے کا اب کون

رات دن باتیں حق کے پیاروں کی　　پیار سے یوں سنائے گا اب کون
عمل تقوا و ریاضت میں　　جان ایسی کھپائے گا اب کون
ایسا عاشق نظر نہیں آتا
عشق صادق نظر نہیں آتا

اگلے بند میں اپنی عقیدت اور رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں :

وہ دل آرا نظر نہیں آتا　　حق کا پیارا نظر نہیں آتا
جس سے تقدیر اپنی چمکی تھی　　وہ ستارا نظر نہیں آتا
دین و دنیا کا جو سہارا تھا　　وہ سہارا نظر نہیں آتا
بحرِ غم میں پڑی ہے کشتی دل　　اور کنارا نظر نہیں آتا
دل ہے اور درد اب قیامت تک　　کوئی چارا نظر نہیں آتا
دل کوئی چیرتا ہے اندر سے　　گرچہ آرا نظر نہیں آتا
کیا عجب غم میں دم نکل جائے
نہیں ممکن کہ غم نکل جائے

اپنی اس اضطراری کیفیت اور بے قراری کے اظہار کے بعد امیر ملت شاہ جماعت کی خدمت خلق اور عبادت و ریاضت کو یاد کرکر کے یوں گریہ کناں ہیں :

فقر میں آن بان امارت کی　　شان تھی اک شہ جماعت کی
با ہمہ رہ کے بے ہمہ ہونا　　یہ تھی جلوت میں شان خلوت کی
طاعت رب کے ساتھ خدمت خلق　　دن ہدایت کا شب ریاضت کی
جس نے بن کر مجاہد اسلام　　اہل اسلام کی قیادت کی
جس نے سعی و عمل کے میدان میں　　دین سے حد ملی سیاست کی
دین و دنیا کے ہر تصادم میں　　لاج رکھی حق و صداقت کی
رعب مانا نہ کچھ حکومت کا　　دیکھی تو ہیں اگر شریعت کی
جس نے جاکر عرب، دکن، کابل　　بادشاہوں کو بھی ہدایت کی
تا حد ہند و شام و مصر و عرب　　وسعتیں جس کے خوان نعمت کی
جس کا عاشق عرب، عجم شیدا　　جس نے مخدوم ہوکے خدمت کی

ایک مخدوم تھا ، وہی نہ رہا
یہ بھی مقسوم تھا ، وہی نہ رہا

مرثیہ طویل ہے اور ہر بند میں کم از کم بارہ تیرہ اشعار ہیں۔ درمیان کے بندوں کو حذف کرکے آخری بند کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں آپ کے سفر آخرت کا ذکر یوں کیا گیا ہے :

وقت رخصت وہ نور کا عالم	بام حضرت پہ طور کا عالم
شب تاریک دفعتاً روشن	منظر آتا تھا دور کا عالم
قلب نورانی و منوّر پر	نور رب کے وفور کا عالم
جاں نثاروں کے دل پہ فرقت میں	جیسے یوم النشور کا عالم

یوں نظر سے چھپا وہ حق کا ولی
وہ جگر گوشۂ نبی و علی

===xxxx====

رباعیات

رباعی کا فن :

اردو کی دوسری اصناف سخن کی طرح رباعی بھی فارسی سے اردو میں آئی ہے شروع میں اس صنف سخن کی طرف شعرا نے کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن اردو نظم کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں بھی شعرا نے رباعیاں کہی تھیں - اردو کے پہلے شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں متعدد رباعیات ملتی ہیں۔ بلکہ محمد قلی قطب شاہ کے ایک اور ہم عصر ملا وجہی کے کلیات میں بھی کچھ رباعیاں ملتی ہیں -

رباعی کی تاریخ کے سلسلے میں مولانا حامد حسن قادری رقم طراز ہیں :

" رباعیاں بھی اور اصناف شاعری کی طرح شروع ہی سے پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ۱۷۰۰ع سے پہلے کے ایک شاعر میر عبدالقادر حیدرآبادی کی یہ رباعی اپنے رنگ میں خوب ہے ۔" (۱)

ہر چند ہمیں سب سے اٹھایا ہے ہات اس پر بھی نہ آزاد کہائے ہیہات!

عالم میں ہر ایک یہ کہتا ہوگا دکھن میں ہے قادر ابھی در قید حیات

رباعی عربی لفظ ربع سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ اس لیے رباعی چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں اس کو پہلے ترانہ یا دو بیتی بھی کہتے تھے۔ صاحب "بحرالفصاحت " لکھتے ہیں :

" بدائع الافکار فی صنائع الاشعار میں مولانا حسین کاشفی واعظ نے لکھا ہے کہ "رباعی" اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بحر ہزج سے مخصوص ہے اور بحر ہزج عرب کے شعروں میں چار اجزا پر ختم ہوتی تھی۔" (۲)

رباعی اپنی مستقل اور متعین ہیئت (Form) کے اعتبار سے جملہ اصناف سخن سے مختلف ہے ۔ یوں تو قصیدہ اور غزل کی طرح اس کے بھی پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں یعنی یہ کہ رباعی کا پہلا شعر مطلعہ ہوتا ہے ، لیکن رباعی دو بیتوں یا دو شعروں تک ہی محدود ہوتی ہے اور غزل کی طرح یہ بھی مردّف یا غیر مردّف ہوسکتی ہے یعنی اس میں صرف قافیہ ہی لانا چاہیں تو وہ بھی لاسکتے ہیں اور اگر قافیہ و ردیف دونوں کا اہتمام رکھیں تو یہ بھی ہوسکتا ہے ۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " تاریخ و تنقید" محولہ بالا، ص 115

(۲) بحر الفصاحت"، ص ۲۷۳، بحوالہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، " اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا"، (مضمون) ،ماہنامہ " نگار"، کراچی: ۱۹۶۷ع، (سال نامہ (اصناف ادب نمبر) ، ص ۲۲۰

رباعی کی ہیئت (Form) قوافی کی ترتیب کے لحاظ سے بھی مخصوص ہے۔ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ۔ ابتداً فارسی شعرائے متقدمین عام طور پر چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے ۔ چنانچہ عنصری و فرخی وغیرہ کے یہاں اس قسم کی دوبیتیاں ملتی ہیں جو بعد میں رباعیاں کہلائیں لیکن بعد میں تیسرے مصرعے سے قافیہ حذف کردیا گیا اور ایسی رباعی کو " خصّی رباعی " کہنے لگے ۔ اب خصّی رباعیوں کا رواج عام ہے یعنی رباعی کا تیسرا مصرع بے قافیہ ہوتا ہے ۔

میر تقی میر اور سودا کے یہاں بھی غزل کے علاوہ رباعیات کی بھی خاصی تعداد ہے ہر ایک نے تقریباً سو سو رباعیات کہی ہیں ۔ میر کی ایک رباعی ہے :—

ہر صبح غموں میں شام کی ہم نے   خونابہ کشی مدام کی ہم نے

یہ مہلت کم جس کو کہتے ہیں عمر   مر مر کے غرض تمام کی ہم نے

سودا کی رباعیات میں یہ رباعی بہت مشہور ہے :—

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک   آوارہ ازیں کوچہ بآں کوکب تک

حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے   بالفرض ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک

رباعی کے اوزان بھی مخصوص اور متعین ہیں۔ رباعی ہمیشہ بحر ہزج اخرب اور اخرم کے اوزان میں کہی جاتی ہے ۔ یہ اوزان تعداد میں چوبیس ہیں جن میں بارہ اخرب کے اور بارہ اخرم کے ۔ یہ خاصیت بھی صرف رباعی میں ہے کہ اس کا ہر مصرعہ ان چوبیس اوزان کے کسی وزن میں ہوسکتا ہے ۔

اخرب کے تمام اوزان " مفعول " سے شروع ہوتے ہیں جیسے مفعول ، مفاعیل ، مفاعیل ، مفعول ۔

اخرم کے تمام اوزان " مفعولن " سے شروع ہوتے ہیں جیسے مفعولن ، فاعلن ، مفاعیل ، فعول ۔

ان چوبیس اوزان کے باہم اشتراک سے بقول صاحب "بحرالفصاحت" کم از کم بیاسی ہزار دوسو چوالیس (۸۲۹۴۴) صورتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح اوزان و ترتیب کے رد و بدل سے متفرق مصاریع ترتیب دیے جاسکتے ہیں - رباعی کے اوزان و تقطیع کی سہولت کے لیے یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ رباعی کے مصرعے کا پہلا اور آخری رکن ذہن میں رہے اور بقیہ دو رکن اور لگاکر تقطیع کرلی جائے - مثلاً یہ کہ رباعی کے ہر مصرع کا پہلا رکن مفعول یا مفعولن اور آخری رکن فعل فاع یا فع ہوگا درمیان میں آنے والے ارکان مفاعلن، مفاعیل، مفاعیلن ، فعول یا فاعلن میں سے کوئی سے دو ہوں گے اور اس طرح چوبیس اوزان تشکیل دیئے جاسکیں گے -

رباعی ایک مختصر صنف سخن ہے جس کے ذریعہ ایک مخصوص وزن کے چار مصرعوں سے کوئی مستقل و مخصوص مضمون ادا کیا جاتا ہے - رباعی میں تسلسل بیان اور خیال کے تدریجی ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کے چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں الفاظ و تراکیب کا انتخاب موضوع و مضمون کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اس سے بہتر قیاس میں نہ آسکے - پہلے مصرعہ میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جائے ، دوسرے اور تیسرے مصرعہ میں اس کے خد و خال کچھ اور نمایاں کیے جائیں - چوتھے مصرعہ میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی ، شدت اور قوت کے ساتھ پیش کیا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہوجائے -

رباعی کے چوتھے مصرعے میں شاعر اپنے وجدان و تخیل کی مدد سے اظہار خیال کرتے ہوئے کوئی نکتہ یا فلسفہ کی بات کہتا ہے کبھی کبھی تلمیحات و استعارات اور شاعرانہ تعلیل یا فطرت کی ترجمانی کے ذریعہ بھی کلام کو دل کش بناتا ہے - اگر ایسا نہ ہو تو قوافی کی برجستگی اور بندش کی چستی سے بھی دل چسپی کو بڑھادیا کرتا ہے-

غرض یہ کہ شاعر کوئی نہ کوئی چونکا دینے والا طرز و اسلوب ضرور اختیار کرتا ہے۔ رباعی کے چوتھے مصرعے کی افادیت و اہمیت اور اس کی مجموعی کیفیات و تاثرات کے سلسلے میں مولانا وحیدالدین سلیم تحریر کرتے ہیں :

" چار مصرعوں میں کوئی مضمون اس انداز سے بیان کرنا کہ سامعین پر اس کا اثر ہو، ایک ہنر ہے ۔ اس میں کوئی مصرعہ بے کار اور برائے بیت نہ ہونا چاہیے اور چوتھا مصرعہ خاص کر پہلے والے مصرعوں سے زیادہ شان دار اور اہم ہو کیوں کہ اس مصرعے پر شاعر کے خیال کی تان ٹوٹتی ہے یہ مصرعہ ایسا ہونا چاہئے کہ سننے والے کے دماغ میں اس کی گونج دیر تک باقی رہے ۔" (۱)

مولانا حامد حسن قادری بھی رباعی میں چوتھے مصرعے کو بہت اہم بتاتے ہیں اور اپنی ایک نعتیہ رباعی میں اس کی اہمیت و عظمت اور برتری کا اعتراف اس طرح کیا ہے :

دنیا میں رسول اور بھی لاکھ سہی   زیبا ہے مگر حضور(صلعم) کو تاج شہی
ہے خاتمۂ حسن عناصر ان پر   ہیں مصرعہ آخر اس رباعی کا وہی

چوں کہ رباعی بہ لحاظ ہیئت (Form) ایک مختصر سی صنف سخن ہے اس لیے ایجاز و اختصار اور فصاحت و بلاغت اس کی شرط اول ہے اس لیے جب تک موضوع کی مناسبت سے فکر انگیز اسلوب اور الفاظ و تراکیب سے کام نہ لیا جائے کام یاب رباعی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ۔

حالی و اکبر دو ایسے عظیم ادبی و قومی قائد رہبر و مصلح تھے جنھوں نے رباعی کی صنف کو خصوصیت سے اصلاحی اور تعمیری کاموں کے لیے پسند کیا اکبر و حالی کی رباعیات کا مطالعہ ہمیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بہت قریب کردیتا ہے ۔ اگر کوئی مورخ برصغیر کے

---

(۱) وحیدالدین سلیم، " افادات سلیم"، ص ۹۲

ہندوستان کے اس دور پر آشوب کی خوں چکاں داستان کی سطحی و معاشرتی ، تہذیبی و تمدنی اور مذہبی تاریخ کو ترتیب دے تو اس کو حالی اور اکبر کی رباعیات سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ رباعیات اس دور کی پیداوار ہیں جب مغربی تہذیب و تمدن مشرقی روایات سے برسرپیکار تھا۔ انگریزی تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت نے مسلمانوں کو مذہب سے بے گانہ کردیا تھا۔ مذہب سے دوری ، قوم میں سستی و کاہلی ، آبا و اجداد کی روایات سے انحراف اور اسلاف کے کارناموں سے روگردانی یہ سب اس دور کے مضر اثرات تھے جو قوم کے اذہان پر بری طرح مسلط کردیے گئے تھے ۔ حالی واکبر دونوں نے شیخ سعدی کی طرح اخلاقیات اور پند و نصائح کو رباعی کا موضوع بنایا اور یہ ان دونوں حضرات کے خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے واعظانہ و ناصحانہ اور مصلحانہ لب و لہجہ کے باوجود بھی ان کی رباعیات لطف و اثر اور جذب و کشش کی حامل ہیں۔

ایک طرف اگر مولانا حالی نے ملت اسلامیہ کو اس کے عروج و زوال کی داستان سناکر حقائق زندگی کو سمجھنے کی طرف توجہ دلائی اور بہت سے اخلاقی پہلوؤں ، اصلاحی نکتوں اور تعمیری منصوبوں سے روشناس کرایا تو دوسری طرف اکبر نے بھی اپنے مخصوص طنزیہ نشتروں سے قوم کی رگوں سے خون فاسد نکال کر اسے صحت بخشنی چاہی ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے قہقہوں میں بھی اک گریان کناں قوم کی سسکیاں اور کراہیں موجود ہیں۔

پھر کہئے اس طرح حالی و اکبر نے اپنے مقصد میں کام یابی حاصل کرنے کے لیے اخلاقی و اصلاحی اور سیاسی و مذہبی روایات سے خوب کام لیا۔

مولانا قادری بھی ایک خدا ترس اور صاحب عرفان بزرگ تھے ۔ ان کے بہت سے اشعار اور خصوصیت سے مادہ ہائے تواریخ و مصرعے کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی(صلعم) سے رباعیات کو مزین کرتے ہیں۔

انھوں نے تقریباً چارسو رباعیاں ان سو (۱۰۰) رباعیات کے علاوہ کہی ہیں جو سلطان ابوسعید ابوالخیر کی فارسی رباعیات کا اردو ترجمہ ہیں۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ مولانا ایک رباعی نگار کی حیثیت سے وہ مقام حاصل نہ کرسکے جو خواجہ الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی یا سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کو حاصل ہوا۔ جس طرح اردو و فارسی کے شعرا عمر خیام، یا مولانا ، حضرت سرمد کی رباعیات کا ترجمہ کیا ہے ۔ اور ان کو "مے خانۂ خیام" یا "جام سرمد" کے نامی سے شائع کیا ہے اسی طرح مولانا قادری نے بھی "خزانۂ رباعیات" کے عنوان سے فارسی کے مشہور صوفی شاعر سلطان ابوسعید ابوالخیر کی سو (۱۰۰) صوفیانہ اور عارفانہ رباعیات کا منظوم ترجمہ کیا ہے ۔

حضرت سرمد اور عمر خیام کے سلسلے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں اتنی غنائیت و نغمگی اور فلسفہ و تصوف ہے کہ مترجم ماہر و فن کار ہو اور کوشش کرے تو ان کی دل کشی و دل آویزی کو برقرار رکھ سکتا ہے ۔ مگر سلطان ابوسعید ابوالخیر کی فارسی رباعیات میں خیام کی سی غنائیت اور سرمد کی سی سرشاری و سرمستی تو نہیں البتہ پند و نصائح اور عرفان و تصوف جا بجا ملتا ہے لہذا ان میں وہی حسن و دل کشی اور سلاست و روانی برقرار رکھنا بڑے کمال کی بات ہے ۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی غیر ملکی ادب کے احساسات و جذبات کو اس وقت تک کسی دوسری زبان میں نہیں ڈھالا جاسکتا جب تک مترجم و مصنف کی فنی صلاحیتوں میں مماثلت نہ پائی جاتی ہو ۔ شعر کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو خود بھی شاعر کے سے لطیف و نازک جذبات اور احساسات و تخیلات کا حامل ہونا ضروری ہے اس لیے منظوم ترجمہ نثر کے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ دشوار اور مشکل ہے ۔ مولانا قادری اگرچہ ادب میں بحیثیت ناقد و محقق اور مورخ ادب ایک اعلا حیثیت کے مالک ہیں اور شعر گوئی و زود گوئی میں بھی کمال رکھتے ہیں

مگر اپنی صوفی منشی، عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کے سبب نام و نمود اور سستی شہرت کے دور میں معروف نہ ہوسکے ورنہ ان کی ہستی شعر و ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ نثر و نظم اور تحقیق و تنقید کے میدان کے علاوہ فن تاریخ گوئی میں بھی ان کا کوئی حریف نہیں اور وہ اپنے اس دور کے مانے ہوئے تاریخ گو ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا جو کلام رسائل و جرائد کی زینت بنا وہ حسن و دل کشی نزاکت و لطافت کے پہلوؤں سے خالی ہے ۔ اسی لیے مولانا قادری شاعری کے میدان میں اپنا سکہ نہ منواسکے ۔ البتہ مولانا کی رباعیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ رباعیاں انسانی زندگی کے حقائق کی عکاس اور ہماری زندگی کے شب و روز کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتی ہیں۔ آج کل کی اس مادہ پرست دنیا میں جہاں مذہب و روحانیت صرف خیالی پیکر بن کر رہ گئے ہیں مولانا قادری نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ ان کی رباعیات حکیمانہ و فلسفیانہ نظریات اور متصوفانہ و عارفانہ خیالات سے مزّین ہیں۔ مولانا نے مختلف موضوعات پر سیکڑوں طبع زاد رباعیاں کہی ہیں لیکن ان کی وہ رباعیات خاص طور پر مشہور و مقبول ہیں جو انھوں نے سلطان ابوسعید ابوالخیر کی فارسی رباعیات سے ترجمہ کیں ان کی یہ رباعیاں ،عالمگیر، "رہبر" "زمانہ" "نقاد" "الناظر" اور دیگر کئی رسائل میں شائع ہوچکی ہیں۔

مولانا قادری نے ان سب کو یکجا کرکے " خزانۂ رباعیات" کے نام سے ترتیب دیا ہے - سلطان ابوسعید ابوالخیر صاحب عرفان اور صوفی منش بزرگ تھے ۔ فارسی میں سب سے پہلے آپ ہی نے حقیقت و معرفت اور عرفان و تصوف کو رباعیات میں پیش کرکے مادہ پرست لوگوں کی رہنمائی کی ۔

مولانا قادری نے اپنے ایک منظوم مضمون میں موصوف (سلطان ابوسعید ابوالخیر) کو ایک رباعی کے ذریعہ اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے :

شمع عرفاں کی ھیں لو مولانا　　　خورشید حقیقت کی ھیں ضو مولانا

لکھے ھیں شوق کے مضامیں کیا کیا　　　اس فن میں ھیں سب کے پیش رو مولانا

مولانا قادری نے سلطان ابوسعید ابوالخیر کی ان رباعیات کے ترجمے میں اکثر جگہ حسن و دل کشی ، لطافت و نزاکت ، سلاست و روانی کو حتی الامکان برقرار رکھا ھے اور اپنی ان خوبیوں کی بدولت مولانا قادری کو ایک اچھا رباعی گو شاعر تسلیم کیا جاسکتا ھے کیوں کہ ان رباعیات میں وہ پھیکا پن نہیں جو اکثر ترجمے میں ھوتا ھے - مولانا قادری فن شعر سے بخوبی طرح باخبر ھونے کے علاوہ فن عروض اور علم بیان پر بڑی بڑا عبور رکھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں فنی اغلاط نہ ھونے کے برابر ھیں - ذیل میں سلطان ابوسعید ابوالخیر کی فارسی رباعیات اور مولانا قادری کی ترجمہ کی ھوئی چند اردو رباعیات پیش کی جاتی ھیں - ملاحظہ ھوں :

فارسی (سلطان ابوسعید ابوالخیر)	اردو (مولانا حامد حسن قادری)
باز آ ، باز آ ، هر آن چه هستی باز آ	باز آ ، باز آ ، جو کچھ ھے ، باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ	کافر ھے کہ بت پرست وترسا باز آ
این درگہ مادر کہ نومید نیست	نومید نہ ھو ھماری درگاہ سے تو
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ	سوبار بھی توڑ دی جو توبا باز آ

====xx====

آن را کہ فنا شیوہ و فقر آئین است	کرلیتا ھے سالک جو رہ فقر کو طے
نہ کشف و یقین نہ معرفت نہ دین است	پھر کشف و یقین و دین نہیں کوئی شے
رفت او ز میان همین خدا ماند خدا	مٹ جائے خودی ، خدا رھے صرف خدا
الفقر اذا تم هواللہ این است	الفقر اذا تم هواللہ یہ ھے

====xx====

زان می خوردم که روح پیمانهٔ اوست　　روح اس کی شراب غم کا پیمانہ ہے

زان مست شدم که عقل دیوانهٔ اوست　　عقل اس کے جنون میں مست و دیوانہ ہے

دودی بمن آمد و آتشی بامن زد　　اس شمع کی لو سے دل میں ہے آگ لگی

زان شمع که آفتاب پروانهٔ اوست　　جس شمع کا آفتاب پروانہ ہے

====XXX====

منصور حلاج آن نهنگ دریا　　منصور سا ہیں راہ رو راہ خدا

کز پنبهٔ تن دانهٔ جان کرد جدا　　کر پنبۂ تن سے دانۂ جان کو جدا

روزی که اناالحق بزبان می آورد　　نکلا تھا زبان سے اناالحق جس دم

منصور کجا بود؟ خدا بود خدا　　منصور نہ تھا، خدا تھا واللہ خدا

====XXX====

ای درد دل من اصل تمنا همه تو　　دل میں مری اے جان تمنا تو ہے

وی در سر من مایهٔ سودا همه تو　　سر میں مرے سرمایۂ سودا تو ہے

هرچند بروز کار درمی نگرم　　کرتا ہوں جو غور سے زمانے پہ نظر

امروز همه توئی و فردا همه تو　　دی تو، امروز تو ہے، فردا تو ہے

===XXX====

دردی دارم و سینه بریانی　　اک درد ہے اور سینۂ بریان ہے

عشقی دارم و دیدهٔ گریانی　　اک عشق ہے، اور دیدۂ گریان ہے

عشقی، چه عشق؟ عشق عالم سوزی　　کیا عشق ہے، واہ عشق ہے، عالم سوز

دردی، چه درد؟ درد بی درمانی　　کیا درد ہے؟ آہ درد بے درمان ہے

====XXX====

ای آن که به کنهت نرسد ادراکی　　عاجز تری ادراک سے ہر دانش ہے

کونین به پیش رحمت خاشاکی　　کونین کو رحمت پہ تری نازش ہے

از روئے کہ کرم اگر بخشی مارا
بخشیدہ از لطف تو مشتے خاکے

از راہ کرم ہماری بخشش یارب
کیا اک مشت خاک کی بخشش ہے

===XXX====

از ہستیٔ خویش تا پشیمان نشوی
سر حلقۂ عارفان و مستان نشوی
تا در نظر حق تو نگردی کافر
در مذہبِ عاشقان مسلمان نشوی

لازم ہستی سے ہے پشیمان ہونا
ہے تجھ کوجو سر حلقۂ مستاں ہونا
ثابت ہونانگاہ حق میں کافر
ہے مذہب عشق میں مسلمان ہونا

====XXX====

گرمیگردم بر آتش ہجر کباب
گہ سرگردانِ بحر غم ہم چو حباب
القصہ چو خار و خس درین دیر خراب
گہ بر آتشم گہے بُرسرِ آب

ہوں آتش ہجر میں کبھی جل کے کباب
سرگشتۂ بحر غم کبھی مثل حباب
القصہ مثال خار و خس دنیا میں
یا برسر آتش ہوں میں یا برسر آب

===XXX====

عشقم دادی، ز اہل درد کردی
از دانش و عقل و ہوش فردم کردی
سجادہ نشینِ باوقارے بودم
مے خوارہ رند و کوچہ گردم کردی

عاشق ہوں سراپا غم و درد آج ہوں میں
بے ہوشی و بے خودی میں فرد آج ہوں میں
تھا زاہد پاک میں، مگر تیری طفیل
مے خوار ہوں، رند و کوچہ گرد آج ہوں میں

====XXXX=====

وصل تو کجا و من مہجور کجا
دُرِ دانہ کجا حوصلۂ مور کجا
ہر چند ز سوختن ندارم باکے
پروانہ کجا و آتشِ طور کجا

وصل اس کا کہاں اور یہ مہجور کہاں
یہ خاک کہاں، وہ منبع نور کہاں
ہر چند کہ جلنے سے مجھے باک نہیں
پروانہ کہاں اور آتش طور کہاں

===XXX====

مولانا قادری کی ان رباعیات میں سلاست و روانی اور کیف و اثر کی خصوصیات نمایاں ہیں ۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت ان تمام شرائط کو ملحوظ خاطر رکھا ۔ جو ایک مترجم کے لیے ضروری ہیں ۔ سلطان ابوسعید ابوالخیر کی رباعیات میں جو شاعرانہ حسن و لطافت

باقی جاتی ہے مولانا قادری نے بھی اسے برقرار رکھا ہے -

مولانا کی ان ترجمہ شدہ رباعیات میں جو حسن و دل کشی ہے - اس کا پرتو ان کی اپنی طبع زاد رباعیات میں بھی موجود ہے - اگرچہ انھوں نے کسی خاص موضوع کو مد نظر رکھ کر رباعیات نہیں کہیں ، تاہم ان کی بیشتر رباعیات میں متصوفانہ و عارفانہ رنگ اور درس اخلاق و انسانیت نمایاں ہے - دوسرے عام شاعروں کی طرح انھوں نے صرف قافیہ پیمائی نہیں کی - بلکہ ان کا مقصد لوگوں کو پیغام خُلق و محبت اور دعوت فکر و عمل دینا ہے اور جو کچھ خود دیکھا و سمجھا ہے اس کو دوسروں کو دکھانا اور سمجھانا ہے جس سے ان کی بے غرضی و بے لوثی اور انسان دوستی و ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے -

غزل گوئی میں اگرچہ ان کا کوئی خاص مقام نہیں ہے مگر رباعیات کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں وہ تمام محاسن شعری اور لطف زبان و بیان موجود ہے جس کی توقع ایک اچھے رباعی گو شاعر سے کی جاسکتی ہے -

مذہبی رباعیات :

مولانا حامد حسن قادری کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور کلام پاک سے جو دلی محبت اور والہانہ عشق تھا اس کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے - اس سلسلے میں پروفیسر محمد حبیب صاحب رقم طراز ہیں :

" اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ با عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے - قادری صاحب قبلہ کی زندگی ایک بے بہا ہیرا تھی ، وہ شاعر بھی تھے ، ادیب بھی ، عالم باعمل بھی مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ متقی ، دین دار اور سچے عاشق رسول تھے- ایمان کی پختگی اور عشق رسول کا پرتو ان کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے -" (۱)

---

(۱) حبیب، پروفیسر محمد " ایک مرد مومن"، (ماہنامہ) " شفق"، جون، ۱۹۶۳ء، ص ۵۲

شہنشاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دربار والا سے مولانا کو تمام زندگی محبت وابستگی رہی وہ اٹھتے بیٹھتے نہ صرف زبان سے بلکہ قلب سے بھی ذکر حبیب کرتے رہتے تھے یہی ان کا مسلک تھا اور یہی ان کا مشغلہ ۔ دنیا کی نظروں سے پردہ کرنے کے بعد بھی عشق حبیب سے سرشار ہوکر وہ کہتے ہیں :

جو ذات ہوئی فخر رسولان سلف   حاصل ہے مجھے اس کی غلامی کا شرف

مرقد میں فرشتوں سے کہوں گا حامد   کھڑکی کوئی کھول دو مدینے کی طرف

مولانا ایک خدا ترس اور صاحب عرفان صوفی تھے انھوں نے قرآنی احکامات کو اپنی شاعری میں جا بجا پیش کیا ہے ۔ ان کی بیشتر رباعیاں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ خداوند وحدہ لا شریک کی قربت و محبت حاصل کرنے کے لیے حضور ﷺ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی تضمین و تفسیر بیان کی ہے:

تم کو اگر ہے اللہ کی چاہ   قرآن میں اس کی ہے ایک ہی راہ

سن لو حبیب حق کی زبانی   " فا تبعونی یحببکم اللہ"

متصوفانہ اور عارفانہ رباعیات :

مذہبی رباعیات کے علاوہ مولانا نے عارفانہ و متصوفانہ رباعیات بھی کہی ہیں ۔ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہونے اور سلسلۂ سلوک سے وابستہ ہونے کے بعد وہ عرفان و معرفت کے چمن زار کے نظاروں میں محو ہوگئے ۔ انھوں نے عام شعراء کی طرح صرف قافیہ پیمائی یا نام و نمود کے لیے شاعری نہیں کی بلکہ ان کے یہاں دعوت فکر و عمل ہے ۔ انھوں نے حیات ناپائیدار اور جہان بے ثبات کے متعلق اپنی رباعیوں کے ذریعہ بہت سے حقائق و مسائل کی نشان دہی کی ہے ۔ جن سے ان کی انفرادیت و پختگی کا بخوبی اندازہ

لگایا جاسکتا ہے ۔ ان کی مندرجہ ذیل رباعیات جدّت بیان اور ندرت فکر ادا کے کامیاب

ہوتے ہیں :—

مدہوش ہمیشہ مے پرستی میں رہے   ویوان ہی رہے اگرچہ بستی میں رہے
آنا جانا ہوا نہ معلوم اپنا   ہم مثل حباب بحر ہستی میں رہے

====XXX===

اس عہد شباب پر جو مغرور ہے تو   یہ سوچ کہ حق سے کس قدر دور ہے تو
بہتر ہے خوشی سے کرلے سجدہ بھی کبھی   پیری میں تو رکوع پر مجبور ہے تو

===XXX====

اٹھ صبح ہوئی ، خبر ہے غافل کچھ کو   فیضان سحر نہیں ہے حاصل تجھ کو
مشکیں کس لی ہیں کروٹوں نے تری   تسکین بستر کی ہیں سلاسل تجھ کو

===XXX===

انسان اس سرائے فانی میں آکر اس کو اپنا مستقل و جاودانی مسکن سمجھ لیتا ہے۔ اگرچہ اسے یہ معلوم ہے کہ یہ اک سراب و دھوکا ہے مگر حقیقت سے روگردانی کرتا ہے اور دنیا کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس پر ریجھ جاتا ہے ۔ وجود و عدم وجود ، ہستی و نیستی کسی بات کو کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا ، بے ثباتی کائنات اور ناپائیداری حیات کے مضامین اکثر شعرا کے یہاں ملتے ہیں ۔ غالب نے کہا ہے :

ہاں کھائیو مت فریب ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب   آخر تو کیا ہے ؟ اے نہیں ہے

====XXX====

مولانا قادری نے بھی اس سلسلے میں اپنی حکیمانہ رائے اور استدلال پیش کئے ہیں :

گردش میں ہوس سے مثل گرداب ہیں ہم   فانی ہیں مگر خیال ہیں خواب ہیں ہم
باقی پر ہے جہان فانی قائم   پھر کچھ نہیں کیا ہیں ؟ نقش برآب ہیں ہم

===XXX===

ہے اصل میں نیست ہست سمجھے ہو جسے — ہے شان بلند پست سمجھے ہو جسے
توڑو اصنام نفس و پندار کو تم — ہے فتح وہی شکست سمجھے ہو جسے

====XXX====

قادری وہ رنگ ہے نیرنگ جہاں کا بھی عجیب — عقل انساں اس راہ میں گم ہوتی ہے
یاد نکتہ یہ رہے عیش کے متوالوں کو — عید کے روز محرم کی دھوم ہوتی ہے

===XXX====

اخلاقی رباعیات :

مولانا نے درس ایثار و قربانی ، اخوت و مساوات اور اخلاق و مروت دینے کے لیے بھی بہت سے اشعار کہے ہیں ۔ اسی طرح آدمی کو احترام آدمیت سکھانے کے لیے بھی انھوں نے بہت سی رباعیاں کہی ہیں جو دوامی اقدار کی حامل ہیں۔ اس طرح ان کے جلائے ہوئے چراغوں سے بہت سے چراغ جلائے جاسکتے ہیں ۔ کہتے ہیں :——

اصلاح کا کام رہنماؤں نے کیا — اخلاق کو پاک پیشواؤں نے کیا
لیکن وہ ہوا بڑے بڑے رہنماؤں سے — دنیا میں جو کام نیک ماؤں نے کیا

===XXX===

اوروں کو بھی دو جو تم کو حاصل ہے فراغ — ملتا ہے یہیں سے اس عالم کا سراغ
پہنچا ہے جہان میں ایک سے ایک کو فیض — جلتا ہے چراغ سے اسی طرح چراغ

===XXX===

مومن ہو تو بندۂ رضا کار بنو — حریت و صدق کے علم بردار بنو
سرگشتہ و گم رہان دریائے ضلال — تم دہر میں روشنی کے مینار بنو

===XXX====

بحیثیت ایک شاعر اور خصوصیت سے ایک رباعی گو شاعر مولانا کا مرتبہ اردو شاعری میں بلند رہے گا ۔ انھوں نے اس میدان میں اپنے جوہر دکھاکر حقائق زندگی کے

عمدہ مرقعے پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک خصوصیت تخئیل کی گہرائی اور بیان کی ندرت ہے ۔ وہ اگر اس میدان میں تگ و دو جاری رکھتے اور اسے چھوڑ کر نثر کی طرف خصوصی توجہ نہ دیتے تو ان کا کلام اردو کے کسی بلند پایہ شاعر سے کم نہ ہوتا ۔ اسے اردو نثر کی خوش قسمتی کہیے کہ وہ اتنا کچھ نثر کے میدان میں کرگئے اگر وہ نظم کی طرف بھی اسی طرح ملتفت رہتے تو یقیناً اردو نظم کی ایسی خدمت نہ کرپاتے جیسے کچھ کہ اب کرگئے ۔ باین ہمہ انھوں نے فارسی کے دو عظیم شعرا سلطان ابوسعید ابوالخیر اور عمر خیامؔ کی رباعیات کا سلیس و سادہ زبان میں منظوم ترجمہ کرکے " اردو رباعی " کو بڑا فروغ دیا ہے۔

***

ساتواں باب

فن تاریخ گوئی

مولانا قادری کی تاریخ گوئی

ساتواں - باب

مولانا قادری کی تاریخ گوئی

فن تاریخ گوئی :

فن تاریخ گوئی اہل علم و ادب میں بڑا معروف و مقبول اور نادر فن ہے - مسلمانوں سے قبل اہل یونان میں بھی یہ فن پایا جاتا تھا مگر اس کی صورت دوسری تھی- جس طرح ہمارے یہاں " ابجد" کے لحاظ سے حروف کے لیے اعداد مقرر ہیں اسی طرح اہل یونان میں بھی حروف کے لیے اعداد مقرر تھے مگر وہ اس سے عموماً خفیہ لغت (Abbreviations) یا مخفف حروف (Code Words) کا کام لیا کرتے تھے- مگر ہمارے یہاں اس سے بڑے بڑے اہم کارناموں کے رونما ہونے، واقعات کے واقع ہونے اور ولادت و وفات کے ایام و تواریخ کو یاد رکھنے کا کام لیا جاتا ہے -

تاریخ ہمیں زندگی کے آغاز و ارتقا ، اس کے شعور و وجدان کی منازل ، اس کی تہذیب و تمدن کی رفعتوں ، اس کے احساسات و رجحانات کی بدلتی ہوئی کیفیتوں اور اس کی علمی و ادبی وسعتوں سے آگاہ کرتی ہے - یہ تمام چیزیں اپنی اپنی تاریخ رکھتی ہیں - تاریخ نے ہی ان کو جنم دیا ہے اور تاریخ نے ہی ان کو سنوارا و اُبھارا ہے -

فن تاریخ گوئی ایک دقّت طلب کام ہے اس کے لیے نہ صرف زبان و ادب اور شعر و سخن میں مہارت رکھنا ضروری ہے بلکہ ایک تاریخ گو کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک ماہر ریاضی داں بھی ہو اور آسانی سے جمع و تفریق اور تخرجہ و تعمیہ سے کام لے سکے- مزید برآں ماہرین فن نے اس میں بھی بڑی بڑی جدتوں اور ندرتوں سے کام لے کر بڑے بڑے دشوار التزامات قائم کیے ہیں -

اکثر ہر حرف کے ملفوظی نام کے عدد شمار کرکے مادۂ تاریخ مکمل کرتے ہیں - مثلاً لفظ

" عادل" کے اعداد بحساب ابجد (بہ قاعدۂ جمل یا زبر) یہ ہیں :

ع=۷۰، الف =۱، د= ۴، ل = ۳۰ + ۱۰۵

لیکن حروف " عادل" کے اسمائے ملفوظی یا باطنی کے اعداد اس طرح شمار ہوں گے :

عین = ۱۳۰، الف = ۸۱، دال = ۳۵، لام = ۷۱ + ۳۱۷

یہ قاعدۂ استخراج نہایت مشکل ہے اور محنت شاقہ و وقت کثیر کا طالب ہے یہی سبب ہے

کہ آج کل کے اس مشینی دور میں اس طرف توجہ نہیں دی جاتی مگر اب بھی چند

شائقین اس طرف مائل ہیں۔ زمانۂ قدیم سے اب تک مسلمانوں نے اس فن کو بڑی کوششوں اور

محنت سے قائم رکھا ہے -

اسی طرح حضرت امیر خسرو نے اپنے نام کے سلسلے میں کہا ہے :

مرا نام باید ست خواجہ علیم دوشین و دو لام و دو قاف و دو جیم

برآری اگر حرف زین حرف ها بدانم کہ هستی تو مرد فہیم

اس میں حرف شین کے عدد بحساب ابجد ۳۰۰ ہیں - اس طرح دو حرف

شین کے اعداد کا مجموعہ ۶۰۰ - دو لام کے عدد کا مجموعہ ۶۰ - دو قاف کے اعداد کا

مجموعہ ۲۰۰ اور دو جیم کے اعداد کا مجموعہ ۶ ہوگا - یعنی حروف و اعداد کی ترتیب و

مجموعہ یوں ہوگا :

" ش ش = ۳۰۰ + ۳۰۰، ل ل = ۳۰ + ۳۰، ق ق = ۱۰۰ + ۱۰۰ ،
ج ج = ۳ + ۳ = ۸۲۶

مندرجہ بالا اعداد کا مجموعہ ۸۲۶ ہے اور ابجد کے حساب سے یہی اعداد " خسرو"

کے ہیں :-

" غ = ۶۰۰ ، س = ۶۰ ، ز = ۲۰۰ ، و = ۶ + ۸۷۶"

لہذا " خسرو" ، " بادشاہ" اور "خواجۂ عظیم" یہ تینوں الفاظ ہم معنی ہیں۔

تاریخ کیا ہے ؟ :

زندگی کے وہ تمام واقعات و حادثات جو زمان و مکان کی آغوش میں جنم لیتے ہیں ان واقعات کو اور ان کے اوقات کو یاد رکھنا تاریخ کہلاتا ہے ۔ تاریخ ہمارے ماضی کی عکاسی کرتی ہے ہم ماضی سے روشنی لے کر اپنے حال کو سنوارتے اور مستقبل کے لیے اسی روشنی کی مدد سے کوئی واضح لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔ تاریخ ہمارا قومی ورثہ ، ہماری اقدار حیات کا خزانہ، ہماری خوشیوں کا نغمہ اور ہمارے غم کا مرثیہ ہے ۔ تاریخ ایک ایسا دریچہ ہے جس میں سے ہم اپنے ماضی کی جھلک بخوبی دیکھ سکتے ہیں ۔ تاریخ کے آئینے میں ہمیں اپنے اسلاف اور آبا و اجداد کے خد و خال بخوبی نظر آسکتے ہیں۔ تاریخ ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرت و ثقافت کی آئینہ دار ہے ۔ اسی سے قوموں کے عروج و زوال اور انحطاط و کمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

تاریخ کے لغوی معنی واقعات اور حادثات کا علم ہے ۔ یہی واقعات و حادثات زمانہ ، عرصہ اور وقت ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ساحر سہسوانی لکھتے ہیں:

" تاریخ کے لغوی معنی کسی چیز کا وقت پیدا کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں تعین کرنا ہے ۔ ابتداء سے کسی امر عظیم کا ازل سے ابد تک فن تاریخ گوئی کی اصطلاح میں تاریخ اس فن کو کہتے ہیں کہ کوئی لفظ یا جملہ پراگندہ خواہ پیوستہ ہو یا کوئی مصرعہ مناسب و بامعنی جس کو مادۂ کہتے ہیں۔" (۱)

---

(۱) ساحر سہسوانی، " ملہم تاریخ "، ص ۷ بحوالہ " دفتر تواریخ "، از مولانا حامد حسن قادری، (مخطوطہ) ، مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری، (پروفیسر اردو لندن یونی ورسٹی، برطانیہ)

صاحب "غیاث اللغات" لکھتے ہیں :

"تاریخ در اصطلاح عبارت است از تعیّن کردن مدّتے از ابتدائے امر عظیم و قدیم و مشہور تا ظہور امر ثانی کہ عقب اوست ۔ تاکہ دریافتہ شود بزمانہ آیندہ و دیگر ظہور این امر ثانی بلحاظ نسبت بعد مدّت امر قدیم مشہور اول -" (۱)

یعنی ابتدا سے کسی دوسری بات کے ظاہر ہونے تک کی مدت کو معیّن کرنے کا نام تاریخ ہے تاکہ آئندہ زمانے میں سابقہ مدّت اور نئے زمانے کی نسبت معلوم ہوسکے۔

"منتخب اللغات" میں تاریخ کے معنی اس طرح درج ہیں :—

"وقت چیزے پدید آمدن" یعنی کسی چیز کے ظاہر ہونے کا وقت ۔"

اسی لیے صاحب "غرائب الجمل" لکھتے ہیں :

"کسی چیز کے وقت پیدا کرنے کو اصل لغت تاریخ کہتے ہیں -" (۲)

صاحب "معدن الجواہر" فن تاریخ گوئی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :—

"تاریخ نام صنعتے است از صنائع علم بدیع و این عبارت است ازان کہ متکلم بیان کند ۔ سال ہجری یا سال دیگر را برائے وقوع امرے بلفظے یا فقرہ یا مصرعے یا زیادہ ازان کہ اعدادش بحسب حساب جمل موافق سال مذکور باشد -" (۳)

صاحب "سبحۃ المرجان" نے اس فن کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"اَلتَّارِیخُ ھُوَ عِبَارَۃٌ عن ۔ یُعَیِّنَ المُتَکَلِّم عَامًا ہجریا لوقوع حادثۃٍ بقاعدۃِ الجملِ و ھُوَ عُروۃٌ لا یدری الادباء و لُحمۃٌ فی محافل الظُرفاء والعَجَبُ انّہُم قصروا عن اداء حقّہٖ حیث ما ادخلوہ فی سلک انواع البدیع و لم یَنظِمُہٗ اِحدٍیٍن

---

(۱) سہامتھراوی، "ترویج فن تاریخ"، کراچی : مکتبہ اردو، ۱۹۶۰ء، ص ۸
(۲) ایضاً، ص ۸
(۳) ایضاً، ص ۱۲

اصحاب البدیعات التی طالعتہا و ھو جری بذالک اما ادبا الفرس فقد قضوا حقہ و ذکروہ فی انواع البدیع الفارسی"۔(۱)

یعنی " تاریخ عبارت ہے اس سے کہ متکلم سال ہجری کسی حادثے کے وقوع کا فن جمل کے قاعدے سے بیان کرے اور یہ صنعت ایک دستاویز ہے ادیبوں کے ہاتھ میں اور ایک کھلونا ہے ظریفوں کی محفل میں۔ اور تعجب اس کا ہے کہ ادبائے عرب نے اس صنعت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے - یہی سبب ہے کہ اس کا اقسام فن بدیع میں ذکر نہیں کیا۔ اور وہ اصحاب بدیعیات میں سے جو میری نظر سے گذرے ہیں، کسی نے اس کو نظم کیا حالانکہ یہ صنعت قابل ذکر ہے - لیکن فارس کے ادیبوں نے اس کا حق ادا کیا ہے اور فارسی کے فن بدیع کے اقسام میں اس کو جگہ دی ہے -"

اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے :

(الف) فن جُمل کے قاعدہ کے مطابق کسی حادثے کے وقوع کو بیان کرنے کا نام " تاریخ" ہے -

(ب) اہل عرب نے تاریخ گوئی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کی اور فن بدیع کے اقسام میں اس کا ذکر نہیں کیا۔

(ج) اہل فارس نے تاریخ گوئی کا حق ادا کرتے ہوئے اس فن کا ذکر فن بدیع کی صنائع میں کیا۔

مندرجہ بالا اقتباس سے تاریخ گوئی کی تعریف کے ساتھ ساتھ فن تاریخ گوئی کی تاریخ پر بھی روشنی پڑجاتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ گوئی اہل عجم کی ایجاد ہے۔

---

(۱) صبا متھراوی، " ترویج فن تاریخ"، محولہ بالا، ص ۱۳

انھوں نے اس فن کو ایک فن کا درجہ دیا اور اسے فن بدیع کی صنعتوں میں شمار کرکے اس میں اپنی طبائع کے جوہر دکھائے ، برخلاف اس کے اہل عرب نے اسے قابل اعتنا نہ سمجھا اور نہ ہی اسے کوئی صنعت خیال کیا۔

اس سلسلے میں مہر نقوی لکھتے ہیں :

" زمانۂ جاہلیت یا ظہور اسلام کے بعد عربی زبان کا کوئی مادۂ تاریخ یا شعر معرض وجود میں لائے جانے کا حوالہ موجودہ کتب میں نہیں ملتا اور جو ملتا ہے وہ بہت بعد کا معلوم ہوتا ہے ۔ تاریخ گوئی کی موجودہ کتابیں عجمی یا ہندوستانی مولفین کی ہیں۔ اس لیے ان میں جن شعرائے تاریخ گو کا ذکر ہے وہ سب یا تو عجمی ہیں یا ہندوستانی ، عربی کوئی نہیں۔" (۱)

اس سلسلے میں ساحر سہسوانی نے کسی قدر تحقیق و تفحص سے کام لیا ہے مگر یہ بھی تحقیق نہیں بلکہ تفحص ہی ہے ، کیوں کہ اس میں ان کے قیاس و اندازے کو زیادہ دخل ہے مگر پھر بھی ان کے قول سے تاریخ گوئی کے آغاز کا کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" مغل فرمانروا اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں محمد جعفر رومی نے بمطابق سن ہجری و فصلی تاریخ کہی۔ وہ ہجری تاریخ " ظہور" اور فصلی تاریخ " ظہور" ہے ۔ پس فصلی کا موجد " رومی" ہے ۔ کچھ عرصے بعد دانشوروں نے اس میں دل چسپی لینا شروع کردی اور مختلف اقسام پر تاریخیں کہنا شروع کردیں۔ صنائع اور بدائع اسی دور کی پیداوار ہیں۔" (۲)

---

(۱) مہر نقوی ، " انیس تاریخ گوئی"، بحوالہ " ترویج فن تاریخ " از صبا متھراوی ، ص ۱۷

(۲) ساحر سہسوانی ، " ملہم تاریخ "، بحوالہ " دفتر تواریخ " محولہ بالا ، (دیباچہ) ، ص

قواعد تاریخ گوئی :

مورخین ادب کے نزدیک تاریخ ایسی لفظی صنعت ہے جس میں کوئی حدیث، آیت، مصرعہ یا شعر کسی بات و واقعہ کے حدوث پر بحساب جمل قرار پائی جائے - یعنی اس کے الفاظ کے اعداد کے مجموعے سے بحساب " ابجد " اس واقعے یا حادثے کا سن معلوم ہوسکے۔ عام طور سے ماہرین فن تاریخ گوئی نے بحساب جمل یا زبر تواریخ کہی ہیں مگر بعض ماہرین نے دشوار التزامات کرکے بھی تاریخیں کہی ہیں۔

۱۔ قاعدۂ زُبُر :

اس کو حساب جمل یا قاعدہ زبر بھی کہتے ہیں۔ اس میں تاریخ بحساب حروف ابجد نکالی جاتی ہے - حروف ابجد کتابہ ہیں۔ ابجد کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ : " آبا جلوٗ" ایک بادشاہ کا نام تھا جس کا مخفف " ابجد " ہے اور باقی ساتوں کلمے اس کے بیٹوں کے نام ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ مرامر نامی ایک شخص تھا جس نے خط لکھنا ایجاد کیا اور یہ آٹھوں کلمے اس کے بیٹوں کے نام ہیں۔ بعض کے نزدیک " ابجد " ادریس علیہ السلام کی ایجاد ہے -"

حروف " ابجد " اور ان کے اعداد

	ابجد				ھوز			حطی			کلمن				سعفص			
حروف	ا	ب	ج	د	ھ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص
اعداد	۱	۲	۳	۳	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۳۰	۵۰	۶۰	۷	۸۰	۹۰

	قرشت				ثخذ			ضظغ		
حروف	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
اعداد	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

ابجد کی اقسام :

(۱) ابجد آدم، (۲) ابجد قمری، (۳) ابجد ترقع و تنزل ، (۴) ابجد سبعہ،
(۵) ابجد عناصر، (۶) ابجد طبیعی، (۷) ابجد ابدان۔

۱۔ ابجد آدم :

یہ سب سے قدیم اور پرانی ابجد کے سات الفاظ ہیں جن کو بعض محققین نے

ابجد آدم کہا ہے ۔ الفاظ یہ ہیں :

" ابتث ، جخحد ، ذرزس ، شصضط ، ظعغف ، قکلم ، نوہی " جمل مروجہ میں

ان الفاظ کو کوئی دخل نہیں ہے عام طور پر تاریخیں ان سے نہیں نکالی جاتیں۔

۲۔ ابجد قمری :

یہ موجودہ ابجد ہے ۔ اس کے اول چھ الفاظ سریانی زبان کے اور آخری دو

الفاظ عربی زبان کے ہیں ۔

کلمات ابجد

کلمات	ابجد	ہوز	حطی	کلمن	سعفص	قرشت	ثخذ	ضظغ
معنی	شروع کیا	بھلا دیا	واقف ہوا	سخن گو ہوا	جلد لکھ لیا	ترتیب دی	دل میں لے لیا	تمام کیا

ابجد کی باقی قسمیں ابجد قمری سے ہی نکلی ہیں جو حسب ذیل ہیں :

۳- ابجد ترفع و تنزل :—

• ابجد ترفع :- الفغ ، بکر، جلش ، دمت ، ہدث ، وسخ ، زعد، حفض ، طصظ -

• ابجد تنزل :- غقیا، رکب ، شلج ، تمد، ثخدہ ، خسو، ذعز، ضفح ، ظصط

۴- ابجد سبعہ :

ابجد ، ہوزح ، طیکل، منسع ، فصقر، شتثخ ، ذضظغ -

۵- ابجد عناصر :—

ابجد ، ہوزح ، طیکل، منسع ، فصقر ، شتثخ ، ذضظغ -

۶- ابجد طبیعی :—

اہطم، فشذ ، جزکس ، قثظ ، دحلع ، رخغ ، بوین، صتض -

۷- ابجد ایراں :—

ابجد ، ہوزح ، طیکل، منسع ، فصقر، شتثخ ، ذضظغ

قاعدۂ زُبر و بیّنات :—

ابجد کا دوسرا قاعدہ، قاعدۂ زبر و بینات کہلاتا ہے - یہ قاعدہ نہایت دشوار و دقت طلب ہے - اس حساب سے تاریخیں صرف ماہرین و اساتذۂ فن ہی نکالا کرتے ہیں- عزیز لکھنوی وغیرہ بعض شعراء نے اس قاعدہ سے تاریخیں نکالی ہیں- اس میں حروف کے اسمائے ملفوظی کے اعداد شمار کیے جاتے ہیں - مثال کے طور پر اس میں لفظ " علم " کے اعداد اس طرح شمار ہوں گے :

ع - ی - ن + عین   ل - ا - م + لام   م - ی - م + میم } علم

۷۰ - ۱۰ - ۵۰ + ۱۳۰   ۳۰ - ۱ - ۴۰ + ۷۱   ۴۰ - ۱۰ - ۴۰ + ۹۰ } ۲۹۱

دشوار ودقت طلب ہونے کی وجہ سے یہ قاعدہ مروج نہیں ہے - یہی سبب ہے کہ اس قاعدہ سے صرف چند اساتذہ نے تاریخیں نکالی ہیں۔

اقسام تاریخ :—

(۱) تاریخ صوری، (۲) تاریخ معنوی، (۳) صوری و معنوی یا تاریخ جامع

۱- تاریخ صوری :—

صوری عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی منسوب بصورت یعنی ظاہر کے ہیں ایسی تاریخ میں اعداد کا شمار کیے بغیر کسی حادثے یا واقعہ کی تاریخ صاف صاف الفاظ میں بیان کردی جاتی ہے - مثلاً :—

تیرہ سو اسی (۱۳۸۰) تھا سن ہجری صبا	جب ہوئے انور علی ہم سے جدا
عیسوی تاریخ صوری اس کی کہہ	ساٹھ (۶۰) کو انیس سو (۱۹۰۰) پر تو بڑھا

۱۳۸۰ھ = ۱۹۶۰ع

اس صوری تاریخ میں الفاظ کے ذریعہ ۱۳۸۰ھ اور ۱۹۶۰ع مادہ‌ہائے تواریخ برآمد ہوتے ہیں۔

۲- تاریخ معنوی :—

اصطلاح اہل فن میں تاریخ معنوی وہ ہے جس کے مادہ تاریخ کے اعداد و جمل کے مجموعے سے سنہ مطلوبہ حاصل ہو - تاریخ کی یہ شکل عام طور پر مروج ہے اور اکثر تاریخیں اسی قسم میں کہی جاتی ہیں - مثلاً : شکیل بدایونی نے جب مولانا قادری کو اپنا مجموعۂ کلام پیش کیا تو مولانا نے یہ تاریخ معنوی نکالی :

ان کے مجموعے میں جو کچھ ہے وہی تاریخ ہے

" فکر کی آرایشیں کل ، شعر کی گہرائیاں "

۱۹۳۳ع

تاریخ صوری و معنوی :—

تاریخ کی تیسری قسم صوری و معنوی دونوں سے مل کر بنتی ہے - اس کو " تاریخ جامع " بھی کہتے ہیں۔ اس میں الفاظ سے تو سنہ و سال ظاہر ہوتا ہی ہے لیکن حروف کے اعداد کے مجموعے سے بھی وہی سنہ نکلتا ہے جو شاعر الفاظ سے ظاہر کرتا ہے - مثلاً مولانا محمد حسن علی شاہ کی تاریخ وفات ظاہر نا بطی نے یوں نکالی ہے :

چوں عاشق ذات قل ہواللہ احد — شُد واصلِ رَبِّ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُولَدْ

این صوری و معنویست تاریخ وصال — " ہشتاد و چہار و یک ہزار و دو صد

۸۰ — ۴ — ۱۰۰۰ — ۲۰۰

۱۲۸۴ھ

اقسام تاریخ با عتبار لفظ :—

(۱) تاریخ مفرد ، (۲) تاریخ مُرکب

۱- تاریخ مفرد :—

وہ ہے جو کسی ایک حرف کے عدد جمل سے حاصل ہو - جیسا کہ ناسخ لکھنوی نے ایک حکیم صاحب پر تین مرتبہ شاہی عتاب نازل ہونے اور تینوں مرتبہ نصف نصف تنخواہ کم ہوجانے کی تاریخ یوں کہی ہے :

از حائے حکیم ہشت بر گیر
سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

" ح " کے اعداد بحساب جمل ۸ ہیں اس کے نصف ۴ ہوئے پھر اس کا نصف کھینچئے تو ۲ ہوئے اور اس کا بھی نصف کھینچئے تو ایک باقی رہا ان چاروں کو ایک ہی سطر میں یکجا لکھئے تو مادۂ تاریخ یہ نکلے گا :

۸ + ۴ + ۲ + ۱ = ۱۲۴۸ھ

۲- تاریخ مرکب :

ایسی تاریخ جو ایک یا کئی لفظوں سے مرکب ہو - مثلاً علامہ اقبال کی تاریخ وفات جو تین الفاظ سے مرکب ہے - سیماب اکبر آبادی نے یہ نکالی ہے :

" شاعر مشرق گذشت "

۱۹۳۸ء

اقسام تاریخ بہ لحاظ اظہار کلام :

(۱) تاریخ منثور (۲) تاریخ منظوم

۱- تاریخ منثور :

وہ تاریخ جو ایک یا اس سے زیادہ جملوں یا فقروں کی عبارت سے حاصل کی گئی ہو-

جیسے : " تواریخ طباعت دیوان کلام بدیع "

۱۹۳۷ء

۲- تاریخ منظوم :

وہ تاریخ جو ایک مصرعہ یا جزو مصرع یا شعر سالم سے اخذ کی گئی ہو -

سالم مصرع کی مثال :(تاریخ وفات سیماب اکبرآبادی از مولانا حامد حسن قادری)

قادری لکھدو یہ تاریخ وفات

" مرگیا شاعر اعظم سیماب "

۱۹۵۱ء

جزو مصرع کی مثال : (تاریخ وفات شہنشاہ جہانگیر از کشفی)

چو تاریخ وفاتش جست کشفی

خرد گفتا" جہاں گیر از جہاں رفت "

۱۰۳۶ھ

===xxx====

فن تاریخ کے اس مختصر سے جائزے کے بعد اگر ہم اردو شاعری میں اس کی ابتدا و ارتقا کا اندازہ لگانا چاہیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بہت کم اساتذہ اس طرف متوجہ ہوئے - اردو کے صرف چند شعرا کے یہاں یہ رجحان ملتا ہے - جن میں حکیم مومن خاں مومن، مرزا داغ، نواب مصطفی خاں شیفتہ، ناسخ لکھنوی، احسن مارہروی اور سیماب اکبرآبادی وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ چند مثالیں مرزا غالب کے یہاں بھی ملتی ہیں اور آج بھی بعض شعرا کے یہاں دو ایک اس قسم کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ لیکن مولانا قادری کو اس فن سے بڑا شغف تھا۔ اور اس پر انہیں بڑا عبور بھی حاصل تھا۔ تقریباً چار ہزار تاریخیں ان کی یادگار ہیں اور اس میں سب سے زیادہ کمال کی جو بات ہے وہ یہ کہ انھوں نے قرآن مجید سے اس قدر تاریخیں نکالی ہیں کہ اتنی تاریخیں کسی دوسرے تاریخ گو سے منقول نہیں -

ان کی تاریخ گوئی میں دو خاص باتیں ہیں جو دوسروں کے ہاں کم دیکھی گئی ہیں اول تو یہ کہ انھوں نے آیات قرآن مجید سے دو سو سے زیادہ تاریخیں نکالی ہیں۔ ان تاریخوں میں اکثر تاریخیں وفات کی ہیں لیکن دوسرے واقعات کی تاریخیں بھی ہیں مثلاً جنگ و فساد، صحت و مرض، تقرری و تنزل، عقد رفیقہ، شادی و مرگ، تقسیم و تنظیم، مسجد و مقبرہ جن میں سن عیسوی یا سن ہجری نکلتے ہیں -

تاریخ گوئی میں مولانا کی ایک اور خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ انھوں نے صرف مشہور و معروف ہستیوں یا اعزّہ و اقارب کے انتقال ہی کی تاریخیں نہیں کہیں بلکہ ملکی و غیرملکی احوال و کوائف اور عام دل چسپ باتوں کو بھی مد نظر رکھا - مثلاً :

" شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کا عشق" شادی کے لیے کوشش" ترک شاہی، آغاز جنگ، اختتام جنگ، مصر کا انقلاب، آگرہ کا سیلاب، ایران کا تیل، افریقہ کے مظاہرے،

یوم کا اجراء ، خاندانوں کی تاریخ ، کانفرنسوں کے معاہدے، صلح و جنگ اور
بہت سی عام روزمرہ کی معمولی معمولی باتوں کی بھی انھوں نے نہایت دل چسپ
و نادر تاریخیں نکالی ہیں۔"

اپنی تاریخ گوئی کے سلسلے میں وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں :

" معمولی روزمرہ کے حالات کی تاریخیں کہی ہیں۔ اپنی، اپنے گھر کی ،
عزیزوں کی، دوستوں کی، کوئی نئی اور دل چسپ بات دیکھی - اور ان کی تاریخ
گوئی کی رگ پھڑکی - مثلاً کوئی امتحان میں پاس ہوا، کوئی فیل ہوا۔ کسی کی
خلاف امید تھرڈ ڈویژن آئی - کسی نے بے طلب چائے پلائی ، اپنا علاج شروع
کیا، پرہیز توڑا، گھر میں سانپ نکلا" کسی کے بچھو یا بھڑ نے کاٹا، بندر روٹی
لے گیا، کسی نے ڈاڑھی رکھ کر منڈا دی، کسی نے منڈا کر رکھ لی۔ کسی نے
بڑھاپے میں پتلون پہننے کا شوق کیا، کسی مہمان کو ماش کی دال ناپسند ہوئی،
کالج میں بارش ہوئی، کالج اسٹاف کی پکنک منائی گئی، انھوں نے جہاز کا
سفر کیا، گھر کے بچوں نے نمائش منعقد کی - کالج کے لڑکوں نے امتحان سے
اسٹرائک کی، کسی نے بڑھاپے میں اپنا عقیقہ کیا، کسی کا تیسرا نکاح ہوا، کسی کا
چوتھا نکاح ہوا، کسی کی بیوی نے زد و کوب کیا، اسی طرح کی بے شمار تاریخیں
مع چھوٹے بڑے قطعات کے لکھی ہیں - ایک خاتون کے متعلق سنا کہ وہ جمعہ کو
پیدا ہوئیں ، جمعہ کو نکاح ہوا، جمعہ کو بیوہ ہوئیں ، جمعہ کو انتقال کیا،
اس عجیب اتفاق کی تاریخ کہہ دی۔" (۱)

فن تاریخ گوئی کی مختلف صنعتوں میں قادری صاحب کی تاریخیں دیکھ کر اور
خصوصیت سے قرآن مجید کی آیات سے ان کی نکالی ہوئی تاریخیں دیکھ کر اس فن پر ان
کے عبور و مہارت اور قدرت و کمال کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے -

مولانا کی تاریخ گوئی کے سلسلے میں ان کے ایک قریبی دوست مولوی عبداللطیف خان

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا" خود نوشت "، " اردو نامہ " کراچی: جنوری تا مارچ ،
۱۹۶۵ء ، شمارہ ۱۹ ، ص ۱۷

صاحب کشتہ لکھتے ہیں :

" تاریخ گوئی ان کا محبوب مشغلہ تھا، چلتے پھرتے ، اٹھتے بیٹھتے تاریخی مادّے نکالتے اور قطعات یا اشعار تصنیف کرتے رہتے اور عجیب عجیب جدّتیں برتتے تھے اور تاریخ نہایت رواں، برجستہ اور معانی خیز ہوتی تھی-" (۱)

قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے تاریخیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کام کو وہی شخص سر انجام دے سکتا ہے جس کو قرآن کریم سے ایک طرح کا قلبی و روحانی تعلق ہونے کے علاوہ اس پر گہرا عبور بھی حاصل ہو - قادری صاحب چوں کہ ایک عالم باعمل ، صوفی صافی اور عشق رسول سے سرشار تھے قرآن پاک کی تلاوت ان کا معمول تھا لہذا تلاوت کرتے وقت سہل و رواں آیات کو تاریخی مادوں کے لیے منتخب کرلیا کرتے تھے- آیات قرآنی سے ان کی نکالی ہوئی بیشتر تاریخیں ان آیات پر مشتمل ہیں جو نہایت ہی سہل الادا اور عوام و خواص کو یکساں طور پر از بر ہوتی ہیں ، مثلاً جرمنی کی مسجد کی تاریخ اذان ہی کے الفاظ سے بھی نکالی ہے :

"حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ   حَیَّ عَلَی الفَلَاح ، حَیَّ عَلَی الفَلَاح "

۱۹   ع   ۲۶

اور اسی طرح کی متعدد مثالیں ہیں-

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ مولانا نے اپنی تاریخ گوئی کے لیے خود کیا کہا ہے -

اپنے تیسرے مجموعے تواریخ " جامع التواریخ " (۱۳۶۲ھ) میں وہ یوں رقم طراز ہیں :

" تاریخ گوئی علم و ادب کا ایک عجیب لطیفہ ہے - مسلمانوں کی ایجاد اور عربی و فارسی اردو کے ساتھ مخصوص - اگرچہ حروف تہجی کے اعداد مسلمانوں کیا، عیسائیوں سے بھی پہلے کے ہیں، لیکن ان اعداد سے یہ کام لینا جس کو

---

(۱) کشتہ، مولوی عبداللطیف خان، " حامد حسن قادری"، " اردو نامہ "، کراچی : ترقی اردو بورڈ ، جنوری تا مارچ ، ۱۹۶۵ء، ش ۱۹ ، ص ۱۷

تاریخ گوئی کہتے ہیں اور اس کو ایک مستقل و با اصول فن بنادینا مسلمانوں کے شوق بلاغت طرازی اور شغف انشاپردازی کی اختراع بدیع کے علاوہ ان کی فرصت بے نہایت کی بھی یادگار ہے - آدمی مجھ جیسا بے کار ہو تو تاریخیں کہا کرے - تاریخ گوئی سے زیادہ محنت اور کم نفع کا مشکل سے کوئی دوسرا مشغلہ طبع نکل سکے گا -" (۱)

اپنی تاریخ گوئی کے سلسلے میں بھی ان کا بیان ہے :

" مجھے لڑکپن سے تاریخ گوئی کا شوق ہے اور اب اس شغل کو چالیس برس سے زیادہ ہوگئے کئی ہزار تاریخی مادے نکالے ہوں گے جن میں سے ڈیڑھ ہزار کے قریب دو مجلد قلمی بیاضوں میں ترتیب سنین کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں -" (۲)

بیاض اول :- " دفتر تواریخ " (۱۹۰۱ع) ، از ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ع تا ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۷ع میں ۹۰۰ تاریخیں -

بیاض ثانی :- " میزان التواریخ " (۱۳۵۶ھ) ، از ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ع تا ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ع میں ۵۳۵ تاریخیں -

کل : ۹۰۰ + ۵۳۵ = ۱۳۳۵

ان میں صدہا تاریخیں قطعات میں منظوم و مرتب ہیں اس کی تفصیل یہ ہے :-

بیاض اول میں ۲۵۳ قطعے }
۴۲۸ قطعے
بیاض ثانی میں ۱۷۵ قطعے }

قطعات میں کم سے کم دو شعر تو ہوتے ہی ہیں لہذا ان کے بعض قطعات دو شعروں پر ، بعض دس شعروں پر اور بعض پچیس (۲۵) پچیس (۲۵) شعروں پر مشتمل ہیں - چند نظمیں تیس (۳۰) یا زیادہ اشعار پر بھی مشتمل ہیں مثلاً اقبال کی چند

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " جامع التواریخ " محولہ بالا ، (دیباچہ) ، ص ۲
(۲) ایضاً ، (دیباچہ) ، ص ۱ -

تاریخیں ایک طویل مثنوی میں نظم کی ہیں جس کے اشعار تقریباً ستر (۷۰) ہیں اسی طرح پروفیسر ولی محمد خاں حضور کی تاریخ وفات بھی نہایت طویل نظم لکھی ہے - (یہ آئندہ صفحات میں شامل ہیں)

ان کی تاریخوں میں بعض تاریخ گوئی کے لطائف و صنائع ہیں، بعض عجیب و غریب واقعات کی تاریخیں ہیں، بعض تاریخیں ایسی بھی ہیں جو کسی کی فرمائش پر فی البدیہہ بھی کہی گئی ہیں اور ساتھ ہی فرمائش کرنے والے کا نام بھی تحریر کردیا ہے -

ان کو قرآن مجید سے تاریخی مادے اخذ کرنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اس سے جہاں ان کی قرآن سے عقیدت و محبت اور اس کی عظمت و حرمت کا علم ہوتا ہے وہاں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا انھوں نے کس قدر عقیدت و محبت اور کیسے غور و انہماک سے مطالعہ کیا تھا کہ ایک ایک حرف اور ایک ایک آیت دل پر نقش رہتی تھی۔ قرآن مجید سے تاریخی مادے اخذ کرنے کے سلسلے میں انھوں نے " جامع التواریخ " کے مقدمے میں خود لکھا ہے :

" میں نے قرآن مجید کی آیات کریمہ سے اتنی تاریخیں نکالی ہیں کہ میرے علم میں کسی دوسرے تاریخ گو سے اس قدر تعداد منقول نہیں ہے -" (۱)

لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ پہلے لوگوں نے بھی قرآن کریم سے ایسی دل کش و دلآویز تاریخیں نکالی ہیں کہ ان کے ذہن کی رسائی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - قادری صاحب بھی اس سے متاثر تھے لہذا اس سلسلے میں انھوں نے خود بھی " جامع التواریخ " میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ " قدیم زمانے کا تذکرہ رہا ہے کہ کوئی شخص جن کا نام آدم تھا ، حج کو گئے ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں ، خوش نصیبی

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " جامع التواریخ "، محولہ بالا ، (دیباچہ) ، ص ۲

سے دونوں میاں بیوی مدینہ منورہ میں انتقال کرگئے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے ۔ کسی نے تاریخ کہی :

" یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ "

۱۱۶۳ھ

سبحان اللہ کیا تاریخ ہوئی ہے! ایسے مقام پر تو مرنے کی آرزو کیا کرتے ہیں ۔ ایسی تاریخ کے لیے بھی مرجانا چاہئیے ۔" (۱)

قرآن مجید سے تاریخ نکالنے میں بعض خاص صورتیں پیش آتی ہیں جو بظاہر اصول کے خلاف ہیں لیکن اگلے بزرگوں نے ان کو جائز رکھا ہے اس لیے مولانا نے بھی حسب ضرورت ان کا اتباع کیا ہے ۔ مثلاً :

۱۔ کسی آیت سے پہلے واو عطف سلسلۂ کلام کے سبب آتا ہے اگر وہ آیت مع واو کے تاریخ کے لیے لی جائے تو عطف بے محل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ واو کے ساتھ بھی ہوتی ہے اس لیے واو کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے مثلاً کسی نے زیب النسا بیگم (بنت اورنگ زیب عالم گیر) کی تاریخ وفات کہی تھی " " وادخلی جنتی " (۱۱۱۳ھ)

۲۔ عربی میں تائے تانیث (ۃ) لکھی جاتی ہے اور اس پر وقف ہو تو (ہ) بھی پڑھی جاتی ہے ۔ اس لیے تاریخ گوئی کے اساتذہ نے اس کو ہائے ہوز مان کر پانچ عدد لیے ہیں مثلاً امیر مینائی نے اپنے دیوان کے نام " مراۃ الغیب " میں پانچ عدد لے کر ۱۲۸۹ھ نکالے ہیں۔ لیکن بعض تاریخ گو حضرات نے اس (ۃ) کے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا : جامع التواریخ"، محولہ بالا ، (دیباچہ) ، ص۳

چارسو عدد لیے ہیں اسی طرح کسی نے سرسید مرحوم کی تاریخ وفات قرآن مجید سے بھی نکالی ہے : " ان العاقبۃ للمتقین" (۱۳۱۵ھ)

خود قرآن کریم میں بھی کہیں کہیں تائے تانیث (ۃ) کو بڑی " ت " کی صورت میں لکھا گیا ہے مثلاً سورۂ روم ، رکوع ۳، پارۂ ۲۱ میں " فطرت اللہ التی فطرالناس علیہا" صحیح " فطرۃ " تھا ، لیکن مضاف ہونے کے سبب سے " ت " لکھی گئی - اسی طرح رحمت اللہ میں بھی " ت " لکھی گئی - لیکن یہ بھی املائے قرآنی کا قاعدۂ کلیہ نہیں ہے " کلمۃ اللہ"، " حجۃ اللہ" میں چھوٹی " ۃ " بھی لکھی ہوئی موجود ہے -

۳- جن اسما کی جمع "ات" کے ساتھ آتی ہے ان میں بھی " ت " لکھی جاتی ہے - جیسے " جنّات" یا املائے قرآنی میں " جَنّٰت " - لیکن انھوں نے بضرورت تاریخ اس کے پانچ عدد لینے کے لیے جَنّٰۃ " لکھدیا ہے -

۴- قرآن شریف میں ہمزہ کے لیے کہیں شوشہ لکھا ہے کہیں نہیں لکھا " اُولٰٓئِکَ " میں ہرجگہ شوشہ ہے لیکن سورۂ یوسف میں " اٰلْئٰنَ حصحص الحقّ " میں ہمزہ کے لیے شوشہ نہیں ہے - شوشے کی حالت میں اس کو " ی" کی علامت سمجھ کر دس (۱۰) عدد لیے جاتے ہیں اور بغیر شوشے کے کچھ نہیں - " اُولٰٓئِکَ " کے عدد ۶۷ ہیں اور " اٰلْئٰنَ" کے ۸۱ اگر اٰلْئٰن لکھ دیں تو ۹۱ عدد ہوجائیں گے اور اٰلْاٰن لکھا جائے تو ۸۲ ہوں گے -

۵- اسی طرح درمیانی الف کے لکھنے کی مختلف صورتیں ہیں - مثلاً "مولنا" "مولٰنا" اور مولانا، تینوں صورتوں سے لکھ سکتے ہیں - قرآن مجید میں "مولٰنا" کی صورت اختیار کی گئی ہے لیکن خود مولانا نے تینوں طرح لکھ کر مختلف عدد لیے ہیں - یا مثلاً " صٰلِحٰت " اور "صَالِحَاتٌ" ، " خٰلِدِیْنَ " اور " خَالِدِیْنَ" دونوں

املا درست ہیں۔ یا مثلاً سورۂ حجر رکوع ۳ پارہ ۱۴ میں " اِنَّ عِبَادِیْ" لکھا ہے

اور سورہ فجر ، پارہ ۳ میں " فِی عِبٰدِیْ" ہے - اس لیے انھوں نے بھی " فادخلی

فی عبدی" اور " فَادخُلِیْ فِی عِبَادِیْ" دونوں سے تاریخیں نکالی ہیں۔ اور اس طرح

کی (ت) اور (و) کو کہیں رہنے دیا ہے اور کہیں حذف کردیا ہے -

(۲ - بعض آیات میں جن سے تاریخ نکالی گئی ہے کسی عامل کے سبب سے لفظ کی

ایک خاص صورت ہے لیکن وہ حرف عامل مادۂ تاریخ میں شامل نہیں کیا گیا پھر

بھی اسی لفظ کو بجنسہٖ رہنے دیا ہے ورنہ وہ آیت کا حصہ نہ رہتا۔ مثلاً

" اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِی ظِلٰلٍ وَّ عُیُوْنٍ وَّ فَوَاکِہَ " ہے بغیر " اِنَّ " کے تاریخ نکالی ہے -

قاعدۂ نحو کے مطابق " اِنَّ" کے نکلنے کی حالت میں " المتقون" ہونا چاہئے - لیکن

الفاظ قرآنی کے سبب سے یہ تصرف جائز نہیں رکھا گیا اور اگر کسی جگہ تذیر کرکے

سن بھی کئے ہیں تو مولینا اس کو قرآن کی آیت نہیں کہتے عربی کا فقرہ کہتے

ہیں - یہی صورت کبھی اعراب میں بھی پیش آئی ہے - مثلاً انھوں نے ایک

تاریخ نکالی ہے " فضلہ کان علیک کبیراً " = ۱۳۲۹ (بنی اسرائیل رکوع ۱۰ ، پارہ ۱۵)

یہاں بظاہر" فضل" کا لام منصوب (زبر کے ساتھ) ہونے کا کوئی سبب نہیں

لیکن آیت میں" اِنَّ فَضْلَہٗ " ہے - مولانا نے " اِنَّ" نہیں لیا لیکن حرکت وہی قائم

رکھی ہے -

غرض کہ انھوں نے ضرورت شعری کے لیے یا مادۂ تاریخ کے اعداد پورے کرنے کی غرض سے

آیات کریمہ کو بجنسہٖ رکھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی - حالاں کہ اس

سلسلے میں ان کو بہت دقتیں اور کوہ کندن و کاہ برآوردن والا معاملہ در پیش رہا مگر

انھوں نے اپنے شوق کی خاطر یہ سب کڑی منزلیں بآسانی طے کرلیں۔ آج ہم دیکھتے ہیں

کہ ان کے چھ مجموعہ ہائے تواریخ تقریباً چار ہزار تاریخوں پر مشتمل موجود ہیں۔

مولانا کو تاریخ گوئی کا شوق کیسے؟ اور کیوں کر پیدا ہوا اس کا حال آپ مولانا سے

ہی سنیں تو بہتر ہوگا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ایک مجموعۂ تاریخ " دفتر تواریخ "

(۱۹۰۱ع) میں یوں رقم طراز ہیں :

" تاریخ گوئی کا شوق کیوں کر پیدا ہوا یہ اب مجھے بھی یاد نہیں آتا ۔

میرے شوق تاریخ گوئی کا طبعی و فطری سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں طبعاً عجائب پسند

اور نوادر پرست ہوں۔ دنیا کی ہر عجیب چیز دل چسپ معلوم ہوتی ہے بشرطے کہ بدصورت

اور کریہ المنظر نہ ہو ۔ فقدان حسن اور عدم موزونیت کو میری طبیعت برداشت نہیں

کرسکتی میں کسی اندھے ، کانے کی آنکھوں کو نہیں دیکھ سکتا ۔ کسی بد ہیئت کی طرف

میری نظر نہیں اٹھتی ۔ بعض عجیب الخلقت انسان اور حیوان تماشے کے لیے لائے جاتے ہیں

کسی کا سر ضرورت سے زیادہ بڑا ہوتا ہے کسی کے اور اعضا تعداد و ساخت میں غیر معمولی

ہوتے ہیں ۔ میں ان کو دیکھنے تو کیا جاتا خود بخود بھی سامنے آجاتے ہیں تو دیکھنے

کو جی نہیں چاہتا غرض میری طبیعت عجیب پسند ، جدید پسند اور مشکل پسند ہے ۔

چوں کہ ہمیشہ سے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا اس لیے علم و فن اور شعر و ادب کے ہی

نوادر کا شوق رہا ۔ منطق کے مغالطے ، علم ہیئت کے عجائبات ، فن بلاغت کے صنائع و

بدائع ، علم قیافہ ، فال ، قیافۂ ید ، قیافۂ تحریر ، معمّے ، پہیلیاں وغیرہ عجائبات سے ہمیشہ

دل چسپی رہی ۔ انہی میں ایک عجیب و نادر فن تاریخ گوئی ہے اس سے دل چسپی پیدا

ہوجانا ظاہر ہے ۔

تاریخ گوئی کی تحریک اس طرح ہوئی ہوگی کہ والد مرحوم کو تاریخ گوئی کا شوق تھا

تھا۔ ممکن ہے ان کی تاریخیں سنی ہوں اس کے علاوہ چھوٹے چچا میاں مولوی محمد محسن

صاحب فاروقی مرحوم کے پاس " پیسہ اخبار" آتا تھا۔ اس میں لوگوں کی تاریخیں بھی کبھی کبھی چھپتی تھیں اور ہر سال دو کے آغاز میں تاریخی ناموں کی طویل فہرست شائع ہوا کرتی تھی ۔ بہرحال تیرہ چودہ برس کی عمر سے مجھے تاریخ گوئی کا شوق پیدا ہوا۔

بیسویں صدی تمام عالم کے لیے دور انقلاب لے کر آئی تھی۔ تمام نظام درہم و برہم ہونے والا تھا۔ چناں چہ ایک چوتھائی حصہ گزرتے گزرتے ساری دنیا کی کایا پلٹ ہوگئی ۔ اس تہلکے کا نمونہ صدی کے شروع ہوتے ہی یہ نظر آیا کہ کلک ۱۹۰۱ع میں بہت سے بڑے اور مشہور آدمیوں کا انتقال ہوا۔ مثلاً ملکۂ وکٹوریہ، امیر کابل ، حکیم عبدالمجید خاں دہلوی، امیر مینائی ، رستم ہند غلام پہلوان، ان کے علاوہ رام پور میں ایک ہر دل عزیز شخص فیروز شاہ خاں کا انتقال ہوا۔ اور ہمارے گھر کی ہر دل عزیز ماما اشرف کا یکایک انتقال ہوگیا۔ میں ان سب کی وفات سے متاثر ہوا۔ اور سب کی تاریخیں لکھیں۔ یہ میری سب سے قدیم تاریخیں ہیں۔

اس وقت تک نہ شاعری کی مشق تھی نہ شہرت کا سلیقہ ۔ اس لیے ان تاریخوں پر نہ مصرعے لگائے نہ اشاعت دی ۔ سب سے پہلی تاریخ جس سے میری تاریخ گوئی کی خاندان میں شہرت ہوئی یہ تھی :

" انتقالِ نُجّو خالہ ہوگیا" (۱۳۱۹ھ)

یہ مرحومہ ایک غریب بی بی تھیں جو عمر بھر سے صدیق چچا کے گھر بچھرائوں میں رہتی تھیں اور ان کی والدہ ان بے چاری کی خدمت کرتی تھیں سب بڑے ان کو نُجّو بھابی کہا کرتے تھے ، چھوٹے نُجّو خالہ کہتے تھے ۔ ان کا انتقال کسی خاص صدمے کا باعث نہ تھا ۔ میں نے ان کو دیکھا بھی مشکل سے ہوگا، کوئی وجہ ان کی تاریخ کہنے کی نہ تھی ، لیکن تاریخ گوئی کا شوق تھا ۔ میں اس وقت تک اسکول میں بھی داخل نہ ہوا تھا

شام کو ایک ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھنے جایا کرتا تھا ۔ خوب یاد ہے کہ ماسٹر صاحب کے پاس سوال نکالنے میں وہ مصرع ذہن میں آیا۔ سلیٹ پر لکھ کر عدد نکالے تو یہی ۱۳۱۹ھ نکلے۔ بڑی حیرت اور خوشی ہوئی ۔ گھر آکر چھوٹے چچا میاں کو سنایا ان کو بے حد پسند آیا۔

سب سے پہلی تاریخ جو اخبار میں شائع ہوئی ایڈورڈ ہفتم کے جشن تخت نشینی کی تھی ۔ ۱۹۰۲ع میں رسالہ " انتخاب لاجواب" لاہور نے جشن کےمتعلق خاص پرچہ شائع کیا تھا اس میں یہ تاریخ چھپی ہے وہ پرچہ میرے پاس محفوظ ہے اس کے بعد " کیپٹن علی خاں رام پوری" (سپاہی و کتب فروش) کی تصنیفات کی تاریخیں ان کتابوں پر چھپیں ۔ یہ صاحب سپاہیوں میں نوکر تھے اور کتابوں کی دوکان بھی رکھتے تھے۔ وقت پر نوکری بجاتے تھے اور خالی وقت میں رام پوریوں کی طرح ڈنڈے بجانے کی جگہ کتابیں بیچتے تھے۔ ناول لکھتے تھے ، شاعری کرتے تھے۔ میری ان سے ملاقات ناول بینی کی مد میں ہوئی تھی۔ کرایہ پر ناول پڑھنے کے لیے دیتے تھے ۔" (۱)

شاعری میں بعض اوقات شعرا کسی دوسرے شاعر کا مصرع یا قرآن پاک کی کوئی آیت بھی نظم کردیا کرتے ہیں ۔ تاریخ گوئی میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کا مشہور مصرع ذہن میں آجاتا ہے اور اتفاق کی بات کہ اس سے پورا پورا مادۂ تاریخ بھی نکل آتا ہے مگر یہ بات شاذ و نادر اور حسن اتفاق ہی سے پیش آتی ہے ۔ قادری صاحب نے اکثر تاریخیں اس طرح سے نکالی ہیں ۔ ننگو خالہ والی تاریخ کا تو ذکر اوپر کیا گیا ۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " دفتر تواریخ" (مخطوطہ) ، مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری، (پروفیسر لندن یونی ورسٹی) ، ص ۳

اس کے علاوہ منشی امیر مینائی کی تاریخ بھی فارسی کے ایک مشہور قدیم مصرع :

" آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" (۱۳۱۸ھ)

سے نکالی ھے - اسی طرح جب مولانا میٹو چھاؤنی سے ترک ملازمت کرکے چلے تو رخصت کے وقت احباب سے کہا :

" رخصت اے اھل مہو جاتے ھیں ھم " (۱۹۱۲ء)

اسی طرح جب ۱۹۰۹ء کو امتحان میں پاس ھوئے تو تاریخی شکریہ اس طرح ادا کیا :

" شکر خدا کہ ھوگئے پاس امتحان میں ھم " (۱۹۰۹ء)

تاریخ گوئی کے لیے بڑے کمال اور محنت و ریاضت کی ضرورت ھے - اس میں جب تک قدرت و مہارت نہ ھو تو بڑے سے بڑا صاحب علم بھی گھبراجاتا ھے - قادری صاحب نے اس فن کو کمال شوق و رغبت سے سیکھا تھا اور چلتے پھرتے اس ذھنی کشمکش میں لگے رہتے تھے- جس سے انھیں فی البدیہہ تاریخ گوئی کی مشق ھوگئی تھی- جس کا ذکر اکثر حضرات نے اپنے مضامین میں کیا ھے - ولی محمد خاں ، حضور پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے مولانا کی فی البدیہہ یہ تاریخ گوئی کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ھے :

" ایک مرتبہ میں اور مولانا قادری سینٹ جانس کالج کے قریب ھی ایک ~~قریب ھی ایک~~ مسجد میں ظہر کی نماز پڑھنے گئے وھیں کسی صاحب نے بتایا کہ مولانا راشدالخیری کا انتقال ھوگیا - قادری صاحب نے جب یہ خبر سنی تو اظہار افسوس کیا اور پھر وہ وضو وغیرہ میں مشغول ھوگئے - شاید انھوں نے دوران وضو تاریخ کہہ لی تھی کیوں کہ انھوں نے نماز سے چند لمحے پہلے ھی مجھے یہ تاریخ سنائی -" (۱)

---

(۱) طاھر فاروقی ، ڈاکٹر مولوی محمد ، " بالمشافہ "

" اگر وہ اور بھی دو سال جی گئے ہوتے
۲

تو ہوتی نام سے تاریخ راشدالخیری"

۲ - ۱۲۳۵٦ = ۱۳۵۴ھ

اس تاریخ میں مولانا قادری نے دو کا تخرجہ کیا ہے - یعنی راشدالخیری کے کل اعداد ۱۳۵٦ ہوتے ہیں مگر ان کا انتقال ۱۳۵۴ھ میں ہوا اگر وہ دو سال اور زندہ رہتے تو ان کے نام راشدالخیری سے بڑی اچھی تاریخ نکلتی- مولانا کی قدرت کلام یہی ہے کہ انہوں نے یہ بات نظم بھی کردی اور تاریخ بھی نکال دی - اسی موقع پر علامہ راشدالخیری کی ایک اور عیسوی تاریخ بھی یوں نکالی ہے :

" منزل جنت میں داخل راشدالخیری ہوئے "

۵۸۰ + ۱۳۵٦ = ۱۹۳٦ء

اسی طرح کی تاریخیں اور بھی لوگوں نے کہی ہیں مگر لوگوں نے ان کے نام میں دو عدد زیادہ دیکھ کر تاریخ کہنے کی کوشش نہ کی ہوگی - اور اگر کی بھی ہوگی تو اس انداز کی نہیں جس طرح مولانا نے کی - اسی قسم کی دو تاریخیں ماہنامہ " عصمت " دہلی کے راشدالخیری نمبروں میں بھی شایع ہوئیں جو مندرجہ ذیل ہیں :

۱- راشدالخیری سے نکال الف اور پھر لکھدے راشدالخیری (محمود اسرائیلی)

۲- سرنگوں بام فلک نے دی ندا راشدالخیری ہے تاریخ وفات (سید راحت حسین)
۲ ۱۳۵۴ھ

یعنی پہلی تاریخ میں راشدالخیری کے دونوں الف نکالے ہیں تو دوسری میں بام فلک کے سر یعنی (ب) کو نگوں کیا ہے مگر ان دونوں تاریخوں کے مقابلے میں قادری صاحب کی فی البدیہہ تاریخ میں جو برجستگی و روانی اور شرط ہے وہ لائق ستائش ہے -

قادری صاحب کی فی البدیہہ تاریخ گوئی کے سلسلے میں مولوی سید حامد علی صاحب

بیان کرتے ہیں کہ ایک روز شام کے وقت میں مولانا قادری کے مکان پر ان سے ملاقات کے لیے پہنچا ۔ اور اطلاع کرائی تو وہ فوراً ہاتھ میں کاغذ قلم دان لیے باہر آگئے میں نے کہا کہ اگر آپ کچھ لکھنے میں مصروف تھے تو کہلوادیا ہوتا میں پھر آجاتا ۔ قادری صاحب نے کہا کہ " آپ کے دوست پروفیسر مفتی حبیب صاحب (۱) کو پشاور خط لکھ رہا تھا سوچا کہ آپ کا بھی کوئی پیام ہو تو لکھدوں ، اس لیے یونہی اٹھا چلا آیا ابھی ابھی کالج سے آنے پر ان کا خط ملا کہ ایک جوان مرگ شخص سید غلام الحسنین ابن مومن کی تاریخ مطلوب ہے ۔ میں نے عدد جوڑے تو نام کے عددوں سے پورا سال وفات نکلتا ہے نام خود ہی تاریخ ہے میں ابھی اچکی بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ معاً دوسرا شعر موزوں ہوگیا اور پھر جو لکھنے بیٹھا تو پہلا بھی موزوں تھا ۔ لیجئے آپ بھی سماعت فرمالیجئے ۔" تاریخ یہ تھی :

مومن کا وہ نورچشم تھا دل کا چین   حاصل ہوگئی اسے قرب رسول الثقلین

مرنے کی خبر یہ نام خود دیتا تھا   تاریخ ہے "سید غلام الحسنین"
۱۳۵۴ھ

اس سلسلے کے دو اور واقعے تحریر کرتے ہوئے مولوی سید حامد علی صاحب لکھتے ہیں :-

" تاریخ گوئی میں ایسا زود گو ، پسحار گو اور نغز گو شعر و ادب کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گا وہ معمولی سے غور و فکر میں عجیب و غریب مادے نکال لیتے اور سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے ۔ زود گوئی اور بدیہہ گوئی کی بہت سی مثالیں ان کے یہاں موجود ہیں ۔ ایک دن کالج سے واپس تشریف لائے ۔ نشست گاہ میں باہر سے آئے ہوئے خطوط رکھے ہوئے تھے ہم کئی آدمی خوش گپیوں میں مصروف تھے ۔ مولانا تشریف لائے خطوط اٹھاکر پہلا ہی خط

---

(۱)   مفتی ، پروفیسر محمد حبیب ، صدر شعبۂ فارسی پشاور یونی ورسٹی

(۲)   حامد ، مولوی سید حامد علی ، سابق لیکچرار وکٹوریہ کالج ، آگرہ

پڑھا - پھر میز پر رکھ دیا۔ اندر گئے کارڈ لائے اور جواب لکھنا شروع کردیا۔ پنجاب کے کسی مقام سے کسی صاحب نے کسی عبدالعزیز صاحب کے ملتی کی تعمیر کی تاریخ چاہی تھی اور لکھا تھا کہ میں نے بہت سے تاریخ گو حضرات سے تاریخیں کہلوائیں لیکن ان میں ایک بھی معقول نہ تھی۔ قادری صاحب نے لمحہ بھر میں تاریخ نکالی، مصرعے لگائے اور روانہ کردی اس تاریخ کا مصرعہ مجھے آج بھی یاد ہے :

" ایوان استراحت عبدالعزیز ہے "
۱۳۵۴ھ

چند روز کے بعد ان صاحب کا شکریے کا خط آیا جس میں تاریخ کی اور مولانا قادری کی بڑی تعریف و توصیف کے بعد لکھا تھا کہ میں ایسی ہی تاریخ چاہتا تھا۔ " (۱)

اسی طرح ایک اور واقعہ کا ذکر مولوی سید حامد علی صاحب یوں کرتے ہیں :

" ہمارے اسکول کے ایک ٹیچر پنڈت گوپی پرشاد ہمدم کا انتقال ہوا تو میں نے تاریخ نکالی مگر پانچ عدد کی کمی رہ گئی میں نے کافی زور لگایا مگر ناکامی ہوئی آخر صبح کو قادری صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا - قادری صاحب کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے اطلاع ہونے پر شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے باہر تشریف لائے - میں نے جلدی جلدی اپنا مقصد بیان کیا۔ میرا مصرعہ تھا :

" خزان گلشن کشمیریان اکبر آبادی "
۱۹۳۰ع

ادھر میری زبان سے مصرعہ نکلا اور ادھر قادری صاحب نے فرمایا :

" لب حاتف سے اے حامد ہوئی تاریخ رحلت کی
خزان گلشن کشمیریان اکبر آبادی
۱۹۳۵ع

" حاتف " کی " ہ " نے عدد بھی کردیے - میں خوش خوش

---

(۱) " شفق " ، کراچی : باب الاسلام پریس ، جون ، ۱۹۷۳ع ، (قادری نمبر) ، ص ۲۰

واپس لوٹا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ آواز دے کر بلایا اور فرمایا ایک تاریخ اور لیتے جاؤ۔ میں نے کہا ارشاد ، فرمایا:

" ہندم داخل دوزخ ہوا" (۱۳۳۵ھ)

اس طرح کے لطیفے رات دن ہوتے آتے اور ہم سب لوگ لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ یہی حال ان کی بدیہہ گوئی کا تھا۔" (۱)

آیات قرآنی سے تاریخیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جسے قرآن و حدیث اور عربی میں مہارت تامہ حاصل ہو ۔ سرسید احمد خاں کی یہ دونوں تاریخیں نہایت عمدہ و خوب ہیں :

۱- " ان العاقبة للمتقين " (۱۳۱۵ھ)

۲- " انی متوفیک و رافعک الی و مطہرک " (۱۳۱۵ھ)

اس میں پہلی تاریخ پر اہل فن کو یہ اعتراض ہے کہ " عاقبة " کی " ۃ " " ت " نہیں بلکہ " ہ " ہے اس لیے اس کے عدد ۴۰۰ کی بجائے ۵ لیے جانے چاہئیں جب کہ یہاں ۴۰۰ ہی شمار کئے گئے ہیں اور پھر " ۃ " کو " ت " لکھنا بھی املائے قرآن کے خلاف ہے ۔

اس سے مراد یہی تھی کہ بہت سے حضرات نے قرآن کریم سے تاریخیں نکالی ہیں مگر قادری صاحب کا یہ کمال ہے کہ قرآن پاک کی جو آیت تلاوت کے وقت ایسی نظر آئی جس سے مستقبل قریب کاکوئی سن نکلتا ہو بس اس کو لکھ کر رکھ لیا اور جب کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا اس پر چسپاں کردی ہیں اس سلسلے میں وہ خود بھی دفتر تواریخ میں تحریر کرتے ہیں :

---

(۱) " شفق "، کراچی، جون، ۱۹۷۳ء ، ص ۶۰

" ایک بار ایک آیتہ کریمہ میں ۱۲۹۶ھ نکلیہ سن میری ولادت سے آٹھ سال پہلے کا ہے ۔ لیکن تاریخ نہایت نفیس و اعلا تھی چھوڑنے کو جی نہ چاہا ۔ اموات خاندان کا رجسٹر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ اس سال میں حضرت مولانا فضل عالم صاحب کا وصال ہوا ہے ۔ یہ میرے پر دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے کامل درویش اور خاندان عازیہ نظامیہ بریلی کے خلیفہ تھے۔ میری والدہ خالہ وغیرہ بہت سے افراد خاندان کے پیر و مرشد تھے۔ تاریخ کے لیے بھی ایسا ہی با صفات آدمی درکار تھا ۔ چنان چہ ان کی روح پاک کو اس کا ثواب پہنچادیا۔ چوں کہ اس" دفتر تواریخ "کے " دفتری " کے وجود پر وجود سے بھی پہلے کی بات تھی ، اس لیے اس میں درج کرنے کی گنجائش کہاں تھی اسی رجسٹر پر لکھدی اور اب یہاں حاضر ہے :

" عَسیٰ اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَاماً مَّحْمُوداً " (۱)

۱۲۹۶ھ

قادری صاحب کے " دفتر تواریخ " میں ایسی بھی بہت سی تواریخ ہیں جو واقعہ کے مدتوں بعد نکالی گئی ہیں اور اس کا حوالہ انھوں نے اس تاریخ میں بھی دیا ہے مثلاً " منشی فضل حسن صابری مالک اخبار سکندری سکندری کی فرمائش سے لکھی گئی ۔" اور اس طرح کی دیگر حضرات کے نام بھی اس فرمائشی تاریخ کے ساتھ درج ہیں۔

قرآن کریم سے نکالی گئی سب ہی تاریخیں نہایت خوب ہیں ۔ مثلاً " اپنے خالہ زاد بھائی محمد عظیم الحق جھدی کی ولادت کی تاریخ یہ نکالی ہے :

" وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا " ۱۳۲۸ھ

یہ وہ دعا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے بارگاہ خداوندی میں کی تھی ۔ اسی طرح انھوں نے مولانا الطاف حسین حالی کے لیے بھی سورۂ یٰسین شریف کی ایک آیت سے ایک نہایت ہی خوب صورت مختصر اور موزوں تاریخ یہ نکالی ہے ۔ " فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ " اس تاریخ میں انھوں نے اساتذہ فن کے اصولوں پر

---

(۱) حامد حسن قادری مولانا " دفتر تواریخ " محولہ بالا ص ۱۲

حل ہورا رہتے ہوئے دونوں لفظوں میں " ہ " اور " ۃ " کے عدد یکساں یعنی ۵ لیے ہیں۔
لیکن کہیں کہیں سرسید احمد خان وغیرہ کے اتباع میں " ۃ " کے عدد ۴۰۰ بھی لے لیے ہیں کوئی پس و پیش نہیں کیا ہے مثلاً اخلاق علی صاحب میرٹھی کی تاریخ وفات جب وہ آیت کریمہ " وجوہ یومئذ ناعمۃ " سے نکالتے ہیں تو یہاں " ۃ " کے عدد بجائے ۵ کے
۱۳۳۷ھ
سرسید کے اتباع میں وہی ۴۰۰ لیتے ہیں ۔(۱)

" دفتر تواریخ " کے دیباچے میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں :" ایک مرتبہ ۱۹۱۶ء میں تلاوت کرنے میں اس آیت کریمہ پر نظر پڑی " ھذا من فضل ربی " عدد نکالے تو بجے ۱۹۱۸ء تھے اس وقت میرا پہلا بچہ کوئی سال بھر کا ہوگا لیکن خیال آیا کہ انشاءاللہ میرا ہی کوئی بچہ اس وقت تک اور ہوجائے گا اور اس کے لیے یہ تاریخ موزوں ہوگی لکھ کر رکھ لی اتفاق سے ۱۹۱۸ء میں لڑکی پیدا ہوئی لیکن " ھذا " اسم اشارہ مذکر کے لیے تھا برادر عزیز مولوی محمد طاہر فاروقی نے کہا یعنی " ھذاالانعام " اس سے چار سال بعد تیسرا بچہ لڑکا ہوا تو اسی تاریخ کو پھر کرلیا " ھذہ من فضل ربی " یہاں پھر الٹی بات
۱۹۲۲ء
ہوگئی یعنی مذکر کے لیے اشارہ مونث تو اس کی تاویل کی گئی " ھذہ النعمۃ "

بعض اوقات مولانا نے ایک ہی مادۂ تاریخ میں کمی بیشی کرکے اس کو کئی کئی موقعوں پر استعمال کیا ہے مگر یہ ان کی فنی مہارت اور علم و فضیلت کی بات ہے کہ ہر تاریخ اپنی جگہ نہایت بہتر اور موزوں ہے ۔ مثال کے طور پر انھوں نے مولانا راشدالخیری کی تاریخ وفات آیۂ کریمہ سے یوں نکالی ہے :

" لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون " (۱۹۳۶ء)

---

(۱) حامد حسن قادری ، " دفتر تواریخ "، محولہ بالا ، ص ۹۸

بعد میں یہ مادۂ تاریخ اور بھی کئی ضرورت مندوں کے کام آیا اور کئی تاریخیں اور بھی نکالی گئیں۔

یہ آیۂ کریمہ قرآن مجید میں ضمیر غائب کے ساتھ بھی ہے اور بہت مشہور ہے قادری صاحب سےپہلے بھی بہت سے بزرگوں نے اسی آیۂ کریمہ سے مختلف حصّوں سے مادۂ ہائے تواریخ نکالے ہیں۔

قادری صاحب نے بھی کوشش کی اور اس آیت کیے مندرجہ ذیل تواریخ نکالیں۔ مندرجہ ذیل تاریخ مولانا کے سلسلے کے کسی قدیم بزرگ کی یہ ہے :

" لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" (۱۸۰۵ع)

اسی آیت کے توسل سے قادری صاحب نے مولانا فخرالدین کی یہ تاریخ نکالی :

" اولیا اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" (۱۱۹۹ھ)

حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی مشہور بزرگ ہیں ان کے لیے اس آیت سے یہ تاریخ اخذ کی :

" ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" (۱۲۵۰ھ)

اور اسی سے مولانا شاہ نظام الدین حسین بریلوی کی بھی یہ تاریخ نکالی :

" واللہ ان اولیا اللہ لا خوف علیھم ولا یحزنون" (۱۳۲۲ھ

اسی طرح مولانا کی اور بھی قرآنی تاریخیں نہایت دل کش و دل چسپ ہیں۔ جنگ ترکی و اٹلی جو ۱۹۱۱ع مطابق ۱۳۲۹ ھ میں واقع ہوئی اس کے لیے کس قدر موزوں اور خوب صورت تاریخ نکالی ہے :-

" ان الا برار لفی نعیم و ان الفجار لفی جحیم " (۱۳۲۹ھ)

اسی طرح ہندو مسلم فساد کے موقع پر ہندوؤں کی شکست کے متعلق کیا برجستہ

داشتہ آید بکار" (۱)

فن تاریخ گوئی کے اساتذہ و ماہرین نے معمولی قاعدے کے علاوہ بعض دشوار التزامات قائم کرکے بھی تاریخیں کہی ہیں ان میں سے ایک نہایت مشکل قاعدہ یہ ہے کہ ہر حرف کے نام ملفوظی کے عدد لیے جائیں ۔ مثلاً لفظ علم کے عدد معمولی قاعدے سے اس طرح شمار کئے جاتے ہیں :" ع – ل – م" = ۱۴۰ " اور اس کو حساب جمل یا قاعدۂ زبر کہتے ہیں اور یہی عام طور پر مروج ہے لیکن حروف علم کے اسماء ملفوظی یا حروف باطنی کے عدد اس طرح شمار کئے جائیں گے :" عین – لام – میم " اس قاعدے کو زبر و
۲۹۱ = ۹۰ +۷۱ +۱۳۰
بیّنات کہتے ہیں ۔ قادری صاحب بحساب جمل اور بحساب زبر بینات بخوبی تارخیں نکالنے پر قدرت رکھتے تھے مگر قاعدۂ زبر بینات چوں کہ بہت ہی مشکل و صبر آزما قاعدہ ہے اس لیے اس میدان میں وہ زیادہ دور چل سکے اس میں ان کی صرف چند تاریخیں ملتی ہیں ۔ اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں :

" ایک مرتبہ رسالہ جامعہ دہلی میں نکیدہ کے کسی صاحب کمال کی ایک تاریخ صنعت زبر و بینات میں دیکھی۔ اس میں ایک یہ کمال اور بھی تھا کہ مصرع تاریخ اور قطعہ کے مصرع سب غیر منقوطہ تھے تاریخ اچھی تھی مجھے بھی اس صنعت میں کوشش کرنے کا خیال آگیا ۔چوں کہ اس کو جامعہ ہی میں شائع کرانے کا قصد تھا اس لیے تاریخ کے لیے کوئی ایسا واقعہ تلاش کیا جو دل چسپی کا باعث ہو اس زمانے میں لوزان کانفرنس ہوئی تھی اور اس میں ترکوں کے قائداعظم مصطفی کمال پاشا کی صلح و کام یابی کی دھوم تھی اسی کو مدد تاریخ بنایا ۔ تاریخ یہ ہے :

صلح کردہ کمال کامل — عادل محمود مصر و ہمدرد
حامد را کرد ملہم الہام — صلح حاصل مراد دل کرد ۔ (۲)
۱۳۴۱ھ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا :" دفتر تواریخ " محولہ بالا ، ص ۷

(۲) حامد حسن قادری، مولانا :" تواریخ صلح لوزان کانفرنس"، رسالہ " جامعہ دہلی : دسمبر، ۱۹۲۳ع ، بحوالہ دفتر تواریخ ص ۶۵

مندرجہ بالا تاریخ میں مصرعۂ تاریخی کے اعداد اس طرح لیے گئے ہیں:

"صاد(۹۵) ، لام (۵۱) ، حا(۹) ، حا(۹) ، الف (۱۱۱) ،
صاد(۹۵) ، لام (۷۱) ، میم (۹۰) ، را(۲۰۱) ، الف (۱۱۱) ، دال(۳۵) ،
دال(۳۵) ، لام (۷۱) ، کاف (۱۰۱) ، را(۲۰۱) ، دال(۳۵) = ۱۳۳۱ھ"

اس کے علاوہ مولانا نے اسی واقعے کی ایک تاریخ غیر منقوطہ کی قید اٹھاکر زبر و بینات میں کہی اور ایک زبر بینات کی شرط چھوڑ کر غیر منقوطہ میں کہی، اسی زمانے میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نظر بندی سے آزاد ہوئے تھے ایک تاریخ اس کی بھی زبر بینات میں بغیر شرط منقوط کہی ہے - یہ سب تواریخ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

در صنعت زبر بینی قاعدہ معمولی غیر منقوط :

"مالک دو عالم کرد مسلم را عطا | صلح کامل دارو دردِ دل و آرام دل
مصرع سال حصول صلح آمد در دلم | "سرور و سالار صالح کرد حاصل کام دل" (۱)

۱۳۳۱ھ

در صنعت زبر و بینات بغیر صنعت غیر منقوط :

"اے کمال اکمل مصری لاریب | عادل و شیر دل و دریا دل
ناخن زیرکی و همت تو | حل کند عقدۂ کار مشکل
صلح در مجلس لوزان کردی | بحقیقت شدہ فتح کامل
حامد از زبر و بینہ گفت | کردۂ فتح مبینی حاصل" (۲)

۱۳۳۱ھ

تاریخ رہائی مولینا محمد علی جوہر در صنعت زبر و بینات :

آں محمد علی رہبر شد | عزت قوم را علم بردار

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "دفتر تواریخ"، محولہ بالا، ص ۶۷-۲۲

(۲) ایضاً، ص ۶۷-۲۲

که بر اسلام و مسلمان کرده　　　وقف مال و متاع و جاه و وقار

هم پسر خویشتن یک دارد　　　که کند بهر دین خویش نثار

چون ز قید فرنگ شد آزاد　　　گشت مسرور قلب حامد زار

گفت تاریخ بحیات و زبر

با شد آزاد سرور سالار" (۱)
۱۹۲۳ع

تاریخ گوئی کی ایک صنعت یہ بھی ہے کہ مادۂ تاریخ کے الفاظ کے صرف ابتدائی حروف یا درمیانی حروف یا آخری حروف کے اعداد لیتے ہیں اور اس کی طرف کسی خوب صورت پیرائے میں اشارہ کردیتے ہیں لیکن یہ صنعت برقرار رکھنا بھی صنعت زبر بحیات کی طرح گوئی آسان کام نہیں ہے اس صنعت کی سب سے عمدہ اور شائد اردو میں سب سے پہلی تاریخ حکیم مومن خان مومن دہلوی کی ملتی ہے جو انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے موقع پر نکالی تھی - وہ تاریخ یہ ہے :

انتخاب نسخۂ دین مولوی عبدالعزیز　　　بے نظیر و بے عدیل و بے مثال و بے مثل

جانب ملک عدم تشریف فرما کیں ہوئے　　　آگیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایمان میں خلل

مجلس درد آفریں تعزیت میں ، میں بھی تھا　　　جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر بے بدل

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے　　　فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

۱۲۳۹ھ

مصرعۂ تاریخ خط کشیدہ کی تفصیل یہ ہے :

" فقر کا " ق" (۱۰۰) ، دین کا " ی" (۱۰) ، فضل کا "ض" (۸۰۰) ، ہنر کا "ن" (۵۰) ، لطف کا "ط" (۹) ، کرم کا "ر" (۲۰۰) ، علم کا "ل" (۳۰) اور عمل کا " م " (۴۰) ، کل ۱۲۳۹ ھجری "

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا " تاریخ رہائی مولانا محمد علی جوہر" ، رسالہ " جامعہ" دہلی : دسمبر ، ۱۹۲۳ع

قادری صاحب نے بھی حکیم مومن خان مومن کی اس تقلید میں طبع آزمائی کی ہے اور نہایت عمدہ تاریخیں نکالی ہیں۔ مگر اپنی طبیعت کی جدت پسندی و پابندی اصول کا ثبوت دیتے ہوئے بجائے درمیان کے شروع کے حروف سے ابتدا کرتے ہیں ۔

۱۹۳۱ع / ۱۳۳۹ھ کو کان پور (بھنڈی) میں بلوہ ہوا قادری صاحب نے صرف ابتدائی حروف سے اس کی تاریخ یوں نکالی ہے :

یہ تاریخ سمجھیے کہ کہتے ہیں کیا؟ لب شورش و غدر و طغیان و مرگ

۱۳۳۹ھ

مصرعۂ تاریخ خط کشیدہ کی تفصیل یہ ہے :

" لفظ شورش کا حرف " ش "(۳۰۰) ، غدر کا " غ "(۱۰۰۰) ، طغیان کا " ط " (۹) ، مرگ کا " م "(۴۰) ، کل ۱۳۴۹ ھجری "

اس کے بعد درمیانی حروف سے حضرت شاہ دل کبیر اکبر آبادی کی تاریخ وفات یوں لکھی ہے :

سب پہ سویا ہوئے دل کبیر کے جانے سے اب

لطف و کرم شعر و سخن عشق و وفا وصل و ادا

۱۳۵۳ھ

تفصیل حسب ذیل ہے :

" لطف کا (۹۰۰)، کرم کا " ر "(۲۰۰) ، شعر کا " ع "(۷۰) ، سخن کا " خ " (۶۰۰) ، عشق کا " ش "(۳۰۰) ، وفا کا " ف "(۸۰) ، وصل کا " ص "(۹۰) ، ادا کا " د "(۴) ، کل ۱۲۵۴ ھجری "

اس کے بعد آخری حروف سے ایک صاحب کی مہمان نوازی کی تاریخ یوں نکالی ہے :

جو چاہو دیکھنا تاریخ اس مہمان نوازی کی

تواضع فیض و لطف و مکرمت کی انتہا دیکھو

۱۳۵۰ھ

مصرعۂ تاریخ خط کشیدہ مندرجۂ بالا کی تفصیل یہ ہے :

" تواضع کا " ع" (۷۰) ، فیض کا " ض" (۸۰۰) ، لطف کا ف (۸۰) ،
مکرمت کا " ت " (۴۰۰) ، کل ۱۳۵۰ھجری "

قادری صاحب کے یہاں اس قسم کی تاریخوں کی بہت سی مثالیں ہیں ۔ اسی قسم کی اور بھی تاریخیں ہیں جن میں دو تاریخیں تو شاہ دل گیر کی ، ایک محسن کاکوروی کی اور ایک حضرت شاہ معصوم کے پوتے کی ہے جو مندرجۂ ذیل ہیں :

تاریخ وفات محسن کاکوروی

رحلتم نمود " اندوہ و غم درد و الم رنج و ستم"

ا (۱) ، غ (۱۰۰۰) ، د (۴) ، ا (۱) ، ر (۲۰۰) ، س (۶۰) = ۱۲۶۶ھ

اسی طرح درمیانی حروف چھوڑ کر شاہ دل گیر کی تاریخ وفات یوں نکالی ہے :

دلم بگفت کہ بی دل زمرگ او گشتند

وفا و ناز و کرم ذوق و شوق و شعر و سخن

۱۳۵۳ھ

و - ا (۶+ ۱) ، ن - ز (۵۰ +۷) ، گ - م (۲۰ +۴۰) ، ذ - ق (۷۰۰ +۱۰۰) ،
ش - ق (۳۰۰ +۱۰۰) ، ش - ر (۳۰۰ +۲۰۰) ، س - ن (۶۰ + ۵۰) =۱۳۵۳ھ

سال مرگش گفتہ ام مآمد کہ اندر ہجر ے

آہ و افسوس و ملال و صدمہ و غم بے حد است

۱۳۵۳ھ

آہ (۱) + افسوس (۱۴۷) + ملال (۷۱) + صدمہ (۱۳۴) + غم (۱۰۰۰) = ۱۳۵۳ھ

اسی طرح اک اور تاریخ وفات مولوی عبدالعزیز پسر زادہ حضرت شاہ محمد معصوم مہاجر مدنی کے صاحب زادے کی ہے ۔ (مرحوم کا انتقال عین عالم شباب میں شادی سے چند

روز پہلے ہوا) کہتے ہیں :

ہوئے عزیز کے جانے سے آہ بے سروپا

شاب و حسن و وفا فقر و دین و رشد و رضا

۸۰۰ ۲۰۰ ۱۰ ۱۰۰ ۸۰ ۶۰ ۳

۱۳۵۳ھ

تاریخ گوئی کے سلسلے میں اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض شعرا مادۂ تاریخ کے لیے واقعہ کی مناسبت سے کوئی ایسا لفظ تلاش کرلیا کرتے ہیں جس کے حروف کے اعداد برابر برابر لکھنے سے وہ سن پیدا ہوجائے جس کی انھیں تلاش و ضرورت ہے اس کو آپ قدامت پرستی اور جدّت پسندی جو بھی چاہیں کہہ لیں مگر یہ بات ہے خوب ۔ کسی صاحب نے کسی باغ کا نام تجویز کرکے اس کی تاریخ لفظ " طوبیٰ " سے نکالی مگر جدّت یہ دکھائی کہ اس کا املا " طُوبَا " کیا اور " ط ۔ و ۔ ب ۔ ا " یعنی علی الترتیب ۹، ۶، ۲، ۱(۱۲۶۹ھ) کے اعداد حاصل کرلیے۔ قادری صاحب بھی بھلا ایسے موقع کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتے انھوں نے بھی ایک سیلاب کی تاریخ اس طرح نکالی ہے ۔ ملاحظہ ہو :

بپا کانپ کا کانپ طوفاں میں ایسا ۔۔۔ کہ ممکن نہیں جس کی ہرگز تلافی

بچائیں تو اللہ والے بچائیں ۔۔۔ وہ شیخ مجدد ہیں یا بُشرِ حافیؒ

مثال اس کی ممکن نہیں پیش کردیں ۔۔۔ بدایونی، قاسم، ابوالفضل، خافی

یہ وہ دردہے جس کا درماں ہے مشکل ۔۔۔ ہواللہ کافی، ہواللہ شافی

مجھے اس سے عبرت دلانا ہے مقصد ۔۔۔ نہ اظہارِ خوبیِ نظم و قوافی

زمیں جیسے ہستی سے خالی ہوئی ہے ۔۔۔ یونہی غیر حق سے رہے سینہ صافی

مجھے اک نئی بات سوجھی ہے لیکن ۔۔۔ خدا جانے اس میں نکل آئے کیا نفی؟

غرض میں نے تاریخ کہہ دی کہ بہ جا ۔۔۔ جو دیکھا کہ طوفاں نہ دے کا معافی

ب ۔ ہ ۔ ج ۔ ا ۔۔۔ ۲ ۔ ۵ ۔ ۳ ۔ ۱ = ۱۳۵۲ھ

۱۳۵۲ھ

عدد جمع کرنے کی حاجت نہیں ہے

برابر برابر ہی لکھنا ہے کافی " (۱)

یعنی تاریخ بھی دل چسپ ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال ہے کہ

قاری کے ذہن کو کاوش نہ کرنی پڑے -

تاریخ گوئی میں ناسخ لکھنوی نے بھی ایک جدت کی انھوں نے کہا :

از حائے حکیم ہشت برگیر | سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

ح - ۸، ۸ کا نصف ۴، ۴ کا نصف ۲، ۲ کا نصف ۱ = ۱۲۴۸ ھ

یعنی ۱۲۴۸ حالاں کہ یہ ایک نئی ایجاد ہے لیکن یہ صرف اسی سن کے ساتھ مخصوص ہے -

وہ پہلے پائی گئی اور نہ شاید بعد میں ممکن ہوسکے کیوں کہ تمام اکائیوں میں صرف (۸)

آٹھ ہی کے عدد سے یہ بات پیدا ہوسکتی ہے -

قادری صاحب اس موقع سے بھی فائدہ اٹھایا اور اس میں ترمیم کرکے ۱۳۵۷ھ کے

لیے یوں کہا :

قطعہ

از زائے زمانہ ہفت گیرند | سہ مرتبہ کم کنید دو دو

ز - ۷، ۷ - ۲ = ۵، ۵ - ۲ = ۳، ۳ - ۲ = ۱ = ۱۳۵۷ ھ

یعنی اس طرح ۱۳۵۷ ہوئے اور یہ بھی صرف اسی سال میں ممکن ہے -

اسی قسم کی مولینا محسن کاکوروی کی بھی ایک تاریخ ہے جو انھوں نے منشی

جمال الدین حسن ڈپٹی کلکٹر مین پوری کے اضافہ دوم تنخواہ کے موقع پر نکالی تھی -

فرماتے ہیں :

از جسم جمال دین سہ برگیر | دوبار اضعاف بے رقم کن (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "دفتر تواریخ"، محولہ بالا، ص ۱۰

(۲) ایضاً، ص ۱۱

تاریخ گو شعرا ایک اور بھی جدت تاریخ گوئی میں اختیار کرتے ھیں وہ یہ کہ مادۂ تاریخ میں سنہ واقعہ لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے اور اس کے اعداد سے بھی وھی سنہ حاصل ھوتا ہے حالاں کہ یادگار و یادداشت کے لیے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ جب لفظوں سے سنہ ظاھر ھو رھا ہے تو اعداد سے نکلے یا نہ نکلے یاد دھانی کا مقصد تو پورا ھو ھی گیا لیکن چوں کہ لفظوں میں بیان کرنے سے کوئی فن کاری و مشاقی ظاھر نہیں ھوتی اس لیے یہ روایت لازمی ٹھہری کہ لفظوں کے ساتھ ساتھ اعداد سے بھی وھی سنہ نکلنا چاھیے ھو ۔ قادری صاحب نے بھی اس میں کاوش کی ہے جس کی مثالیں مندرجہ ذیل ھیں :

۱- " یکو جامد" ہزار و نہ صد و دو سال بگذشتہ" ۱۹۰۲ع
۱۹۰۲ع

۲- ھے تاریخ الفاظ و اعداد میں کہ " سن آج تیرہ سو بتیس ھیں ۱۳۳۲ھ
۱۳۳۲ھ

۳- " تیرہ سو اٹھارہ ھوئے آج " ۱۳۱۸ھ
۱۳۱۸ھ

لیکن اس کے ساتھ ساتھ قادری صاحب نے ایک اور جدت بھی کی ہے وہ یہ کہ مادۂ تاریخ کے الفاظ میں اگر سنہ ھجری بتایا ہے تو اس کے اعداد سے سنہ عیسوی نکالا ہے ۔ تاکہ واقعہ کے دونوں سنین ایک ساتھ پیش نظر رھیں۔ اور واقعی یہ قادری صاحب کی قادرالکلامی اور جدت پسندی کا بہترین ثبوت ہے ۔ مندرجہ ذیل قطعہ اس کی بہترین مثال ہے :

قطعہ

صدی بیسویں تھی کہ قہر الہی | جو آتے ھی کی اس نے برپا قیامت
ابھی سال پہلا ھی تھا اس صدی کا | مشاھیر عالم ھوئے کتنے رخصت
وہ وکٹوریہ ملکہ برطانیہ کی | وہ کابل (۱) کا والی وہ فخر امارت

---

(۱) امیر عبدالرحمن خان والی کابل ۔

وہ رستم (۱) کہ جن کی رستم غلامی　　　وہ عبدالمجید (۲) آفتاب حذاقت

جو پوچھے کوئی سال ان دو حادثوں کا　　　تو کہہ دو کہ "تیرہ سو اٹھارہ ہجرت" ۱۳۱۸ھ
۱۹۰۱ء　۱۹۰۱ء

ہے لفظوں میں ہجری عدد عیسوی کے　　　نئی ہے یہ تاریخ گوئی کی صنعت (۳)

تاریخ گوئی میں تعمیہ و تخرجہ کے بغیر بھی کام نہیں چلتا - تعمیہ و تخرجہ ایسے وقت میں کیا جاتا ہے جب کہ مادے میں کمی بیشی رہ جائے تو بہت کام دیتا ہے - مادہ اگر بہتر ہو تو اس کو چھوڑنے کو بھی طبیعت نہیں چاہتی اس لیے اس میں الگ سے کچھ گھٹا بڑھاکر پورا کردیتے ہیں اور اس جمع و فرق کی طرف اشارہ کردیتے ہیں۔ اصل میں تو یہ ایک طرح کا عیب ہے مگر بعض تاریخوں میں یہ عیب بھی بہتر معلوم ہوتا ہے - مثلاً مرزا غالب نے غدر ۱۸۵۷ء کی تاریخ "رستخیز بے جا" سے نکالی ہے - "رستخیز" کے ۱۲۷۷ عدد ہوتے ان میں سے "جا" کے ۴ عدد کم کردیے جائیں تو ۱۲۷۳ھ بن جاتا ہے - اس کی طرف انھوں نے لفظ "بے جا" سے اشارہ کردیا ہے لیکن یہ مادۂ تاریخ "رستخیز بے جا" یعنی "بے موقع قیامت" غدر کے ہنگاموں کے لیے اس قدر موزوں و مناسب ہے کہ غالب کی دوسری تاریخ جو بھی نکلی ہے یعنی "غدر ہندی" ۱۲۷۳ھ وہ اس کے آگے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی -

اسی طرح ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں کسی نے تعمیر حوض کی تاریخ کہی تھی کہ:

از حوض لطیف "آبِ بردار" ۳ = ۹۳۳
-۳
۹۳۰ھ

یہاں "آب بردار" کہہ کر کس قدر موزوں و مناسب تخرجہ کیا گیا ہے -

---

(۱) رستم عرف غلام پہلوان -
(۲) حاذق الملک حکیم عبدالمجید خان دہلوی۔
(۳) حامد حسن قادری، مولانا "دفتر تاریخ"، محولہ بالا، ص ۷۵

اکبر بادشاہ کی تاریخ وفات بھی کسی نے یہ نکالی تھی :

" الفؔ کشیدہ ملائک زفوت اکبر شاہ " ۱۰۱۵ − ۱ = ۱۰۱۴ھ

" الف کشیدن" یعنی افسوس کرنا فارسی کا مشہور محاورہ ہے جو موقع سے کس قدر مناسبت رکھتا ہے -

اساتذہ قدیم کا عموماً یہ دستور رہا ہے کہ ایک یا دو سے زیادہ عدد گھٹائے بڑھائے نہیں جاتے لیکن لوگوں نے زیادہ اعداد کے تعمیہ و تخرجہ میں بھی جدت پیدا کرکے حسن و لطافت کو بڑھادیا ہے - مثال کے طور پر حکیم مومن خان مومن دہلوی نے اس قسم کا زور طبیعت اکثر دکھایا ہے - کسی کی شادی کی تاریخ یوں نکالی ہے :

" سہا" بر بہم " زہرہ" و " مشتری"

۱۰۱   ۹۵۰ + ۲۱۷ = ۱۲۶۸ھ (۱)

اسی طرح انھوں نے اپنی لڑکی کی تاریخ ولادت بھی یوں کہی ہے :

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے (۸۱)   کہی تاریخ دختر مومن (۱۳۴۰ھ)

۱۳۴۰ − ۸۱ = ۱۲۵۹ھ (۲)

مومن دہلوی کا ایک اور تخرجہ بھی بہت دل چسپ ہے کہتے ہیں :

شحنۂ دہلی خلق آزار   بچۂ افغاں رشوت خوار

نام بتاؤں کیا اے یار   ناموزوں ہیں کے اشعار

ہاں تو پوچھے گر تاریخ   اس سے کیا بہتر تاریخ

سب نے کہا جب چھوٹا کام (−۶۱)   اترا شحنہ مردک نام (۱۳۲۰ھ) = ۱۲۵۹ھ (۳)

---

(۱) حامد حسن قادری، ولادتِ " دفتر التواریخ"، محولہ بالا، ص ۱۵

(۲) ایضاً، ص ۱۵

(۳) ایضاً، ص ۱۵

مولینا محسن کاکوری نے بھی کیا خوب تخرجہ کیا ہے:

لاجواب (۱۲) است مصرع تاریخ — چشمۂ فیض از دم طالب

ھ۱۳۲۰ =۱۲-۱۳۳۲

مولینا قادری نے بھی تعمیہ و تخرجہ سے بہت کام لیا ہے ۔ عام طور پر لوگ "از لب ہاتف" "از دل شاد" اور "از روح الہام" کی تراکیب تو استعمال کرتے ہی ہیں لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کے لیے دوسری صورتیں استعمال کی ہیں۔ اور عجیب انداز سے کمی بیشی کی ہے ۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اس قول کی تصدیق بخوبی ہوسکتی ہے:

اٹھ کر کہیں ایک (ـہ) نے یہ تاریخ — کیا چاند غروب ہوگیا ہے ؟

ھ۱۳۵۳=۱۰۰

میاں سر فضل حسین کی تاریخ وفات نکالنے میں ایک تعمیہ یوں کیا ہے:

ذکر تھا تاریخ کا یہ ایک (+۱) نے بڑھ کر کہا — "آہ اک ماتم ہے ملک و قوم کا ان کی وفات"

ھ۱۳۵۵=== +۱

ایک جلسے کے سلسلے میں یوں تاریخ نکالی ہے:

کمی ہے ایک کی اور وہ سکریٹری کی کمی — بڑی کمی ہے تو کیا یہ سبب یہ ہے افسوس

کمی سے ایک کی تاریخ ہوگئی یعنی — وہ آئے ناظم بزم ادب بھی افسوس

ھ۱۳۳۹ =۱-

اسی طرح ایک اور تخرجہ کیا ہے:

کشیدم آہ (۶) و گفتم سال رحلت — نسیم خلد جان افزائے تو باد

تاریخ مرگ سے بھی نکلتی ہے آہ آہ (۱۲=۶+۶) — شاہد کے جسم پر یہ کفن وا مصیبتا

ھ۱۳۴۸=۱۲-

لیکن کہیں کہیں قادری صاحب نے اس سے بھی زیادہ کمی بیشی سے کام لیا ہے مگر یہ زیادہ کمی بیشی کا معاملہ اس وقت در پیش آیا ہے جب کسی مشہور مصرع یا مثل

سے تاریخ نکالنا ضروری خیال کیا ہے لیکن ایسا بھی موزونی و برجستگی کے پیش نظر کیا کیا ہے -

۱- بے مثل (۵۷۰) برآمد سنہ ازیں مصرع مشہور — "این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد" - ۵۷۰ = ۱۹۱۲ء

۲- دل پکار اٹھا جو ٹوٹا اس طرح جور فلک (۳۳۹) — "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے" - ۳۳۹ = ۱۹۲۶ء

۳- فیض سے حافظ شیراز کے نکلی تاریخ — گرچہ حاصل مجھے حافظ کا ہے کیا خاک انداز

این صدا ہست کہ "از حسن عروس" آمد (۲۶۳) — "خیز در کاسۂ زر آب طرب ناک انداز" + ۲۶۳ = ۱۹۳۳ء

۴- "جان مجروح" سے نکلی تاریخ (+۳۱۱) — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی + ۳۱۱ = ۱۹۳۶ء

اس کے علاوہ قادری صاحب نے یہ کام بھی کیا ہے کہ لفظوں کے باہم جمع و تفریق کرنے سے بھی بہت عمدہ تاریخی مادے نکالے ہیں - مثلاً :

۱- شد در جوار رحمت (۸۵۸) + داخل ضمیر عالی (۴۹۱) = ۱۳۴۹ھ

۲- شاہ مجنوں (۴۵۵) - ز تاج و تخت جدا (۱۸۱۰) = ۱۳۵۵

۳- منزل جنت (۵۸۰) میں داخل + راشد الخیری ہوئے (۱۳۵۶) = ۱۹۳۶ء

۴- رقم سال وفاتش کرد حامد — کہ نیر (۲۶۰) + داخل فردوس ہشتم (۱۰۹۵) = ۱۳۵۵ھ

بعض تاریخوں میں مادۂ تاریخ میں سنہ ہجری و عیسوی دونوں ہی نکالے ہیں، مثلاً :

۱- حامد لکھو سال عیسوی و ہجری — بے مثل (۵۸۲) + خزانہ کلام شعرا (۱۳۲۵ھ) = ۱۹۰۷ء

۲- "سال و دعا بگو، کند حشر (۵۸۲) خلیل (مرحوم) با خلیل" (۱۳۵۳ھ) ۱۹۳۵ء

اسی طرح بہت سی تاریخیں پورے شعر سے بھی نکالی ہیں اتنا ضرور ہے کہ ان میں کسی مشہور مصرع سے تاریخ نکالنے کے لیے اپنا مصرع بڑھادیا ہے اور اس طرح

دونوں مصرعے مل کر تاریخ بھی ہوسکتی ہے ۔ مندرجہ ذیل تاریخیں اس کی مثال ہیں۔

۱- نہ کافی ہودہ آیا ایں کہ ناگاہ
+۳۵۸
"زفتنہ و فتنۂ دیگر برآمد"
۱۵۵۸ = ۱۹۱۶ع

۲- حامد ہے ہیں اب بھی شاکر
+۶۷۵
"مرتضیٰ مولی از ہمہ اولی"
۱۲۴۱ = ۱۹۱۶ع

۳- ترک حفظ کا سوچ کیا فی الحال
+۱۰۱۴
"کچھ نئی ایسی کائنات نہیں"
۹۱۸ = ۱۹۳۲ع

فن تاریخ گوئی کے ماہرین نے اس فن میں بڑی بڑی ندرتیں ، صناعیاں ، اور کمالات دکھائے ہیں یعنی بڑے طول طویل قصیدے نظم کئے ہیں اور ان کے ہر مصرعے میں تاریخ نکالی ہے ۔ مرزا داغ اور وصل بلگرامی کے نام اس سلسلے میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مثلاً جارج پنجم کے جشن جوبلی کے موقع پر وصل بلگرامی کا ایک قصیدہ بہت پسند کیا گیا اس کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر مصرع اول سے تاریخ ہجری اور ہر مصرع ثانی سے عیسوی تاریخ نکلتی تھی ۔ نظم کا عنوان بھی تاریخی تھا اور اشعار نہایت برجستہ و دل کش۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں :

جشنہ بہاراں
۱۳۵۴ھ

تاریخ دل فریب جشن جبلی
۱۹۳۵ع

ایسا ہے جشن اس کا رفعت پناہ جو ہے
۱۳۵۴ھ
خورشید حلم جو ہے ، شاہوں کا شاہ جو ہے
۱۹۳۵ع

وہ شاہ جارج پنجم رشک جہان و سلطان
۱۳۵۴ھ
وہ تاجدار اعلیٰ ، ماہ کمال و ذی شان
۱۹۳۵ع

وہ شاہد عنایت جس کا زمانہ شیدا
۱۳۵۴ھ
وہ مقصد شجاعت ، جود و سخا کا دریا
۱۹۳۵ع

کیا رعب، کیا ہے سطوت کیا جود کیا ہے دولت ۱۳۵۴ھ — کس میں یہ شان و شوکت اللہ ایسی طاقت! ۱۹۳۵ع

صدقے شکوہ جس پر، اجلال ہو تو ایسا ۱۳۵۴ھ — عالم کو فخر جس پر اقبال ہو تو ایسا ۱۹۳۵ع

کس طور، کس روش سے پچیس سال گزرے ۱۳۵۴ھ — دور حکومت ایسا، ہو خلق شاد جس سے ۱۹۳۵ع

افزوں رہے برابر اقبال، اوج و دولت ۱۳۵۴ھ — ہو شاہ کو مبارک یہ خاص روز بہجت ۱۹۳۵ع

اے وصل کہہ دو پوچھ دل خوب جانتا ہے ۱۳۵۴ھ — تاریخ کا یہ قطعہ جس فکر سے لکھا ہے ۱۹۳۵ع

نقاد حال دیکھیں، صنعت کا ہے یہ گلشن ۱۳۵۴ھ — ہے شعر شعر یکسر، ہجری و عیسوی سن ۱۹۳۵ع

مولانا قادری نے اس قصیدے کا ذکر "دفتر تواریخ" میں بہت ہی ستائش کے ساتھ کیا ہے۔ قادری صاحب کے والد مولوی احمد حسن صاحب کو بھی اس میں کمال حاصل تھا ان کی بیاض میں بھی چند اسی قسم کی تاریخیں پائی جاتی ہیں۔ مگر قادری صاحب نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی البتہ انھوں نے راز رام بھی کے مجموعۂ نظم کی تاریخ کہی تھی اس کے ایک ہی شعر میں دو مادۂ ہائے تاریخ ایک ہی سنہ کے ضرور رکھتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے :—

ترتیب کلام کے ہیں دو سال — مصرعے ہیں یہ دونوں زیور نظم

جو نظم ہے مہر نامہ شعر ۱۹۲۵ع — جو شعر ہے سلک گوہر نظم ۱۹۲۵ع

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کتاب یا شاعر و مصنف کا نام و تعریف تو تاریخی ہوتے ہی ہیں مگر قادری صاحب نے یہ جدت بھی کی ہے کہ شخصی پتا اور عہدہ و مرتبہ وغیرہ کو بھی نہایت بے تکلفی سے مادۂ تاریخ بنادیا ہے مثلاً : وہ اپنی ہی ایک کتاب کی اشاعت کے موقع

پر اپنا عہدہ و پتا اس طرح تحریر کرتے ہیں :

" لکچرار، فارسی و اردو سینٹ جانس کالج آگرہ "
۱۹۳۶ع

اسی طرح ۳۱ مارچ ، ۱۹۳۷ع کو ایک صاحب محمد مرتضیٰ صدیقی نے انہیں دیوان آسی پیش کیا جس کا تاریخی ذکر وہ یوں کرتے ہیں :

" ہدیۂ جناب محمد مرتضیٰ صاحب صدیقی، انکم ٹیکس آفیسر بہ مقام آگرہ " (۱)
۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ع

انہوں نے تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں تاریخ ہند سے متعلقہ واقعات " خلاصہ تاریخ " (۱۹۳۷ء) کے نام سے مرتب کئے ہیں۔ یہ بھی اک تاریخی نام ہے ۔

اسی طرح " تاریخ ادبیات" فارسی" کو مرتب کرنے کے بعد اس کا تاریخی نام " تاریخ العجم" (۱۳۵۵ھ) رکھا ہے ۔ (۲)

غالباً ۱۹۳۵ع سے انہوں نے ادبیات اردو کی تاریخ لکھنی شروع کی جس میں آغاز اردو سے پہلے کے زمانے کی مختصر تاریخ اردو کا آغازہ تدریجی رفتار" ترقی، تغیر بیان اور ہر قسم کا اردو ادب اور نظم و نثر کے مشاہیر کی جامع و مختصر تاریخ لکھنی تھی اس کے لیے بہت سے موضوعات و عنوانات بھی تجویز کیے اور ان کے لیے مختلف سنین کے مادے بھی نکالے جو کچھ اس قسم کے تھے :

" ذکر زبان اردوئے قدیم - ذکر اکابر اردو - مثنویات قدیمہ -
۱۳۵۵ھ ۱۳۵۵ ۱۳۵۶

انتخاب کلام اردو - تاریخ و تبصرۂ جدید - بے مثل ترقیات اردوئے جدید
۱۳۵۶ھ ۱۹۳۵ع ۱۹۳۵ع

تاریخ باستان اردو - داستان مختصر احیائے زبان - تذکرۃ الہند ستانی
۱۹۳۶ع ۱۹۳۶ع ۱۹۳۶ع

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا" دفتر تواریخ"، محولہ بالا، ص ۱۸
(۲) ایضاً، ص

<u>التذکرہ</u> ۔ <u>صاحبِ مشاہیرِ نثر</u> ۔ <u>حصّۂ نثر ختم ہوگیا۔</u>
۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ء ۱۹۳۶ء

<u>شاعرانِ ہند کی تاریخ ہے</u> " (۱)
۱۹۳۷ء

قادری صاحب نے بعض ایسی دل چسپ باتیں اور لطیفے جو واقعی تاریخی کہے جاسکتے ہیں ان کی بھی تاریخیں نکالی ہیں مثلاً پنجاب یونی ورسٹی کے امتحان منشی کی کامیابی کی تاریخ اور لطیفہ انھوں نے " دفتر تواریخ " کے دیباچے میں خود یوں تحریر کیا ہے :

" ۱۹۱۰ء میں مدرسۂ عالیہ ریاست رام پور سے میں نے پنجاب کے درجۂ منشی کا امتحان دیا۔ اتفاق سے اپنی اور اپنے استادوں کی امید کے خلاف میں تمام یونی ورسٹی میں اول نمبر پر پاس ہوگیا۔ اس کے بعد مدرسۂ عالیہ میں تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا اور مجھے بھی انعام میں ایک مخملی ٹوپی (حامد کیپ) عنایت ہوئی ۔ میں نے از راہ ظرافت اس ٹوپی کی تاریخ کہی کہ —

" <u>از تاج دواب بر تر کلاہ</u> "
۱۳۲۹ھ

سال آئندہ میں منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہوا۔ میرے ساتھ دو اور طالب علم ایسے تھے کہ ہم تینوں نے اسی سال فارسی اور اردو دونوں کے اعلا امتحانات دئیے۔ اس کا نتیجہ بڑا دل چسپ رہا ۔ یعنی ایک طالب علم منشی فاضل میں یونی ورسٹی میں اول نمبر پر کامیاب ہوا ، لیکن اردو کے امتحان میں ناکام رہا۔ دوسرا اردو میں اول اور فارسی میں فیل ۔ اور میں اول کسی میں نہیں اور پاس دونوں میں ۔ میں نے فارسی والے کے لیے تاریخ کہی :

" ان کارہا فاضلوں میں اول نمبر
تاریخ ہوئی ہے " <u>منشی فاضل تر</u> "
۱۹۱۱ء

اور اپنے لیے کہا :—

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا " دفتر تواریخ " ، محولہ بالا ، ص

"آیا ہے یہ دونوں طرف حرف مشدّد کی طرح" (۱)
۱۳۳۰ھ

مولینا قادری کی تاریخ گوئی کا آغاز کب سے ہوتا ہے ، اس کے متعلق وہ خود "دفتر تواریخ" میں لکھتے ہیں :

"غالباً ۱۹۰۳ء کے آخر یا ۱۹۰۴ء کے شروع میں جب کہ میں اسکول میں بھی داخل نہ ہوا تھا۔ گھر پر والد صاحب قبلہ رحمتہ اللہ علیہ سے درس نظامیہ کی عربی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور ماسٹر سے انگریزی اس زمانے میں میں نے ایک ناول تصنیف کیا تھا۔ بادامی کاغذ کی چھوٹی تقطیع کی کاپی اور پنسل ساتھ رکھتا تھا۔ جہاں موقع ملتا تھا سب سے چھپاکر اس کو لکھتا تھا کبھی کبھی ایک عجیب و دل چسپ جگہ یہ کتاب تصنیف ہوتی تھی۔ یعنی جاڑوں کے زمانے میں رضائی اوڑھ کر عربی کتاب کا سبق پڑھنے کے لیے والد کے پاس باہر مردانہ مکان میں تخت پر جا بیٹھتا تھا کبھی ایسا ہوتا کہ سبق کے بعد والد اپنی وکالت کے کام میں مصروف ہوجاتے اور میں سبق یاد کرتا رہتا اس میں کبھی بڑی دیر ہوجاتی - میں سبق یادکر چکتا ، لیکن والد موکلوں سے گفتگو میں مشغول ہوتے اور مجھے اٹھنے کی اجازت نہ مل سکتی - اس وقت میں اپنی کاپی اور پنسل نکال لیتا اور رضائی کے اندر اپنا ناول لکھنا شروع کردیتا - لیکن یہ اتفاق بہت کم پیش آتا تھا۔ اکثر دوسرے اوقات ہی میں لکھتا تھا۔ بہرحال وہ ناول مکمل کرلیا اور کافی ضخیم ہوگیا یعنی اس کاپی سائز کے ۱۵۰ صفحہ سے کم نہ ہوگی - اس میں حسن و عشق اور جاسوسی دونوں مضامین شامل تھے - ناول جیسا کچھ ہوگا ظاہر ہی ہے - میں نے بڑے ہوکر کبھی اس کو دوبارہ پڑھ کر بھی نہیں دیکھا لیکن ہمیشہ احتیاط کے سے رکھا کہ یادگار رہ جائے - اس زمانے میں تاریخ گوئی کا شوق پیدا ہوچکا تھا جہاں کسی کے مرنے کو سنا تاریخ کہہ دی - والدہ کہا کرتی تھیں " اس کی تو وہ کہاوت ہے ، مری مچھا بھروں لوٹا" یہ جملہ معترضہ ہے کہ اک دن خیال آگیا تو اس زمانے میں

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ،" دفتر تواریخ" ، محولہ بالا ، ص

اس مثل سے میں نے یہ تاریخ نکالی :

کبھی ہو جس کسی نے جس کسی پر ۔۔۔ مگر میری یہ حالت آج کل ہے

مری تاریخ گوئی کی ہے تاریخ ۔۔۔ مری لکھ موٹا بھی لوٹا مثل ہے " (۱)

۱۹۳۶ع

اگرچہ یہ ناول قادری صاحب کی حیات میں ہی ادھر ادھر ہوگیا اور اب مفقود ہے۔ اس کی ایک آخری کاپی وہ بھی درمیان سے ناتمام و بوشیدہ پرانے کاغذات میں مل گئی جس میں ایک ناتمام نوحۂ منظوم، ایک مضمون اور چند قطعات تاریخ درج ہیں۔ ناول چوں کہ پنسل سے لکھا گیا تھا اس لیے صفحات کی تحریر بھی نہایت گھسی پٹی اور پڑھے جانے کے قابل نہیں رہی ۔ مندرجہ ذیل فقرے جو اس میں سے اخذ کیے جاسکے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مقفی و مسجع عبارت میں لکھا گیا تھا۔

قادری صاحب کو تاریخ گوئی میں جو کمال ہے وہ تو ظاہر ہی ہے مگر کبھی کبھی وہ کوشش کے باوجود بھی کوئی خاص تاریخ نکالنے میں بہت دن تک سرگردان رہے اور اس پر بھی مادۂ تاریخ برآمد نہ ہوسکتا تو ان کا عالم کیا ہوتا تھا اس کا ذکر وہ خود یوں کرتے ہیں :

" میں اکثر و بیشتر تاریخ کہنے میں کام یاب ہوجاتا ہوں ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص تاریخ کی فرمائش کرے یا میں خود کہنے بیٹھوں اور کوئی مادہ اعلا نہ سہی اوسط درجے کا نہ نکل آئے ۔ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں قطعاً ناکام رہا ہوں ۔ میں نے دوسروں کے بچوں کی ولادت پر بہت سی تاریخیں کہی ہیں اور بعض مرتبہ بہت جلد اور بہت اچھے مادے نکال لیے ہیں ۔ لیکن جب میرا پہلا بچہ پیدا ہوا اور اس کی تاریخ کہنی چاہی تو ہر چند کوشش کی لیکن کوئی ڈھنگ کا مادہ نہ نکلا جو قابل نظم اور لائق [illegible]

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " دفتر تواریخ "، محولہ بالا، ص ۲۰

اندراج ہوتا آخر میں نے کوشش چھوڑ دی ۔ حالاں کہ اس بچّے کی ولادت سے چند گھنٹے بعد بھمراؤں کے ایک بزرگ مولوی شرف الدین صاحب مرحوم نے قطعہ تاریخ لکھ کر مجھے ارسال فرمادیا تھا۔ اور اس کے بعد رام پور سے میں قدیم دوست مولوی حاجی محمد فیاض الدین صاحب نے بڑی برجستہ اور خوب صورت تاریخ کہہ کر بھیجی تھی۔" لخت دل مبارک باد" (۱۳۳۲ھ) مگر مجھے یہ سادہ سے الفاظ بھی نہ سوجھے ۔" (۱)

اسی طرح تاریخ گوئی کے امتحان کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں :

" کبھی کبھی تاریخ گوئی میں میرا امتحان بھی لیا گیا ہے یعنی ۱۹۳۶ء میں میں نے فن تاریخ گوئی کے نام سے ایک مضمون رسالہ ، "زمانہ" کان پور میں چھپوایا تھا اس میں اس فن کے متعلق کچھ تاریخی معلومات لکھی تھیں اور بعض اساتذہ قدیم کی تاریخیں درج کرکے اپنے صورت کلاؤ مادے پیش کئے تھے جو بعض مصرعوں میں نکلے ہیں۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی کا الہ آباد سے خط آیا جس میں اس مضمون کا حوالہ تھا اور کسی شخص کے لوح مزار کے لیے تاریخ کی فرمائش تھی میری ان سے کبھی شناسائی بھی نہ تھی سمجھا کہ میرا امتحان مقصود ہے ۔ اتفاق سے فوراً تاریخ نکل آئی اور یہ قطعہ افسر صاحب کو بھیج دیا:

کیا سکھ کی نیند سوتے ہیں زیر زمیں عزیز ملتی ہے جان دے کے یہ راحت وہ چیز ہے

لوح مزار کے لیے تاریخ برمحل ایوان استراحت عبدالعزیز ہے

۱۳۵۴ھ

اس کے جواب میں افسر صاحب نے بڑی تعریف لکھی اور اتنی جلدی ایسی اچھی تاریخ کہنے پر بڑی حیرت ظاہر کی ۔" (۲)

قادری صاحب کو تاریخ گوئی ورثے میں ملی تھی لکھتے ہیں :

" والد صاحب مغفور کو بھی بات بات پر تاریخ کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " دفتر تواریخ"، محولہ بالا ، ص ۲۵

(۲) ایضاً ، ص ۲۶

مجھے یہ شوق انھیں سے پہونچا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ بڑے جیّد عالم اور
با کمال شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں اساتذہ و مشاہیر کا سا پایہ رکھتے تھے
بعض تاریخیں ایسی نادر و نایاب ، بے ساختہ و برجستہ کہی ہیں کہ میرا سارا
دفتر ان کے مقابلے میں ہیچ ہے پھر عربی و فارسی دونوں زبانوں کے نہایت ارفع
و اعلا شاعر تھے ۔ فارسی میں تو ہزار ہا شعر ان کی یادگار ہیں۔ عربی میں
بھی صدہا شعر کہے ہیں اور عربی کی تاریخوں پر قصیدے کے قصیدے لکھے ہیں۔
مثلاً اپنے پیر و مرشد کی ایک تاریخ وصال آیۂ کریمہ سے نکالی ہے جس کا نمونہ
یہ ہے :

مات نظام الدین حسین	قدسہ اللہ العالی
فاز مفازاً محسترما	فی فردوس الاجلال
واللہ ان اهلکنی	هذا الحزن فاویٰ لی
أرخ قلبی تاریخاً	یخبر عن حسن الحال
عنہم و عن هم عنه	قد رضی اللہ العالی
	۱۳۲۲ھ

اسی طرح مولوی نورالرحمن صاحب کے فرزند (مقبول الرحمن) کی تاریخ ولادت
ایک شعر سے یوں نکالی ہے :

مبارک باد از پیر تو یار نور   "گل نو زادۂ نور علی نور"
۱۹۱۲ع

دوسری ہجری تاریخ اس سے بھی بہتر اور نادرو بے نظیر ہے ۔ کہتے ہیں :

"آب روئے نور ، نورچشم نور"
۱۳۲۰ھ

اسی طرح منشی علی اکبر صاحب مرادآباد میں امین عدالت تھے ان کی تاریخ
وفات کیا کہی : "علی اکبر امین خلد برین" ۔ (۱)
۱۳ ھ ۳۰

قادری صاحب کو شعر گوئی کا شوق تو پہلے ہی تھا اور شروع شروع میں [illegible]

زار تخلص کرتے تھے ابتدائی تاریخوں میں ہر جگہ زار ہی تخلص نظم کیا ہے لہذا کہ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " دفتر تواریخ" ، محولہ بالا ، ص، ۲۸-۲۷

" دفتر التواریخ " کے صفحہ ۲ پر خود رقم طراز ہیں :

" خاکسار مصنف اول زار تخلص کرتا تھا اس کے بعد حسب ارشاد استاد مکرم حضرت راز رام پوری اپنے نام کے جزو اول (حامد) کو تخلص قرار دیا۔" (۱)

چناں چہ منشی گوہر علی خان گوہر رام پوری کی مثنوی " ستم عشق" اور دوسری تاریخوں میں زار ہی تخلص استعمال کیا ہے ۔ مثلاً قطعات تاریخ طبع مثنوی " ستم عشق" مصنفہ منشی گوہر علی خان گوہر رام پوری ۔

ستم عشق مثنوی عجیب — چاپ گردید خوشخط و اعلا

از دل زار ہاتف تاریختش — آمدم " نظم شاہد زیبا "
۱۳۲۱ھ

===XXX===

قصۂ دل فریب نظم نمود — منشی گوہر علی بلند خیال

ہاتف آمد بگوش من اے زار — از فلک " در نظم اہل کمال" (۲)
۱۳۲۱ھ

" قطعات تاریخ طبع کتاب " عجائبات مقناطیس" مولفہ سید عبدالرحمن صاحب مقیم کلکتہ ۔"

(۱)

بہت ہی با سلیقہ اور بہ خوبی — عجائب عبدرحمن نے لکھے ہیں

لکھے ہیں میر صاحب نے عجائب — کہ چشمے فیض کے جاری کئے ہیں

ہیں اس میں لفظ یا بکھرے ہوئے پھول — لکھے ہیں نقطے یا موتی جڑے ہیں

صدا آئی لب ہاتف سے اے زار
عجائب قوت تحریک کے ہیں (۳)
۱۳۲۱ھ

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " دفتر تواریخ "، محولہ بالا ، ص ۲

(۲) ایضاً ، ص ۲

(۳) اخبار " ~~xxxxxxxxxx~~ دبدبۂ سکندری "، رام پور ، ۱۹۰۳ء ، بحوالہ " دفتر التواریخ "

(۲)

عبدرحمان نے خوب لکھی ہے   واقعی اک عجیب کتاب ہے یہ

فکر تاریخ جب ہوئی تو کہا   "چشمۂ فیض بے حساب" ہے یہ
۱۳۲۱ھ

میٹرک امتحان میں کامیاب ہونے پر خود اپنی کامیابی کی تاریخ نکالی اس کا ایک شعر یہ ہے :

جب پاس ہوگئے تو یہ تاریخ کی رقم   شکر خدا کہ ہوگئے پاس امتحان میں ہم
۱۹۰۹ع

۱۹۱۱ع میں لالہ سری رام ایم اے دہلوی نے شعرا کا تذکرۂ "خم خانۂ جاوید" کے نام سے شائع کیا اس موقع پر مولانا نے تقریباً چند تاریخیں نہایت برجستہ ، خوب صورت تاریخی قطعات کی شکل میں کہیں جو سات سات اور دو دو اشعار پر مشتمل ہیں ان میں سے یہاں صرف ایک بطور نمونہ پیش ہے :

تذکرہ لکھا ہے بے مثل و بے نظیر   سب میں مشہور یہ افسانہ ہوا

اک نظر جس نے اسے دیکھ لیا   عاشق و والہ و دیوانہ ہوا

فکر کی طبع ہوئی بہتیری   سچ تو یہ ہے کوئی ایسا کہ ہوا

تذکرہ کیا ہوا یہ اے حامد

بادۂ شعر کا خم خانہ ہوا
۱۹۱۱ع

۱۹۱۱ع میں وہ سنٹرل انڈیا مہو کی چھاؤنی میں تھے ۔ ماہ اکتوبر میں وہاں طاعون کی وبا پھیلی لوگوں کو میدانوں میں خیمے نصب کرکے رہنا پڑا ۔ قادری صاحب بھی چند احباب کے ساتھ خیمہ زن تھے کہ وہاں ایک زہریلے سانپ نے حملہ کیا۔ مگر مارا گیا۔ اس کی تاریخ قادری صاحب نے نہایت سلیس و برجستہ کہی ہے :

" اتفاقاً آج ایک مار سیاہ   آگیا خیمہ میں لہراتا ہوا

تھا وہ پردار اور زہریلا بھی تھا   مار ڈالا اس کو یہ اچھا ہوا

دیکھنے کے واسطے ہر سمت سے   گرد اس کے جمع اک میلا ہوا

فکر ہے حامد اگر تاریخ کی   کہدو اچھا قتل موذی کا ہوا" (۱)
۱۳۲۹ھ

مولانا قادری فانی بدایونی کی بحیثیت شاعر بڑی قدر کرتے تھے - ایک اور تعلق فانی کے لیے ان کو یہ پیدا ہوا کہ ان کے دادا استاد حضرت امیر احمد مینائی نے دکن میں رحلت کی اور فانی بھی وہیں کے ہورہے اس لیے فانی کی تاریخ وفات نکالتے وقت مولانا نے لکھا :

(۱)

" حضرت امیر مینائی بھی دکن میں سپرد خاک ہوئے تھے - ان کی تاریخ وفات تھی : " غریب الوطنی " (۱۳۱۸ھ)

فانی بھی وہیں رہ گئے اس تاریخ سے ان کی بھی تاریخ ہوئی :

" در لحد " ۴۲ + رفت " غریب الوطنی " ۱۳۱۸ = ۱۳۶۰ھ

(۲)

ماتم مرگ سخن دانی ہے   ہے وہ فانی نہ غزل خوانی ہے
۱۹۴۱ع

(۳)

مومن کے مصرع پر مصرع لگاکر بھی شعر سے یہی تاریخ نکالی ہے :

یاد ایام عشرت فانی   اب فصاحت نہ وہ ہمہ دانی
۱۹۴۱ع

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " دفتر التواریخ "، محولہ بالا، ص ۲۵

(۳)

سوز برفت و ساز فنا شد   مرگ است نہ مرگ تنہا

زندہ بودند و ہم مردند   با فانی دو شاعر یکتا

صادق شد تاریخ وفاتش

"میر و غالب یکجا گیا" (۱)

۱۳۶۰ھ

مولانا نے کان پور سے بچوں کا ایک رسالہ جاری کیا تھا جس کا تاریخی نام "اخبار سعید" رکھا تھا۔ اس کا پہلا پرچہ ۱۵ مارچ ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۶ھ کو شائع ہوا اور آخری پرچہ ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کو نکلا، حالاں کہ یہ بچوں کا ماہنامہ تھا مگر مولانا شوق تاریخ گوئی میں اس کو بھی اخبار کہا کرتے تھے اور اس کی تاریخ یہ نکالی تھی:

"بچوں کا اچھا دل چسپ اور مفید اخبار"

۱۳۳۶ھ

"سعید" کی اشاعت بند ہونے پر مولانا نے رنج و قلق کے ساتھ حسب ذیل تاریخ کہی:

بند شد بعد ہفت سال "سعید"   زین غم و رنج سینہ چاک شدہ

پسر محبوبش می خواندم   آن قدر بانی انہماک شدہ

زہی اطفال تیز گشت ازان   خلق اطفال نیز پاک شدہ

قدرش اہل وطن ندانستند   صلح بود کو ہلاک شدہ

مصرعے خواند دل ز روئے قلق

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

۱۴۴۳ - ۱۰۰ = ۱۳۴۳ھ

---

(۱) احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد: "فانی اور ان کی شاعری"، کراچی: جاوید پریس، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۲-۲۳

گھر میں بچے کا کلام پاک ختم ہوا تو مولانا نے فی البدیہہ کہا :

" حافظہ خوان کلام پاک " (۱۹۲۷ء)

پھر دوسرے بچے نے کلام پاک ختم کیا تو تاریخ نکالی : " ختم صحفہ المجید" (۱۳۵۱ھ)

کسی صاحب کی شادی کے ذکر و فکر کی تاریخ دو لفظوں میں یوں نکالی ہے :

" غم شادی" (۱۳۵۵ھ) اور پھر جب اسی سال یہ سلسلہ درہم و برہم ہوا اور شادی کی بات ختم ہوگئی تو پھر دو لفظوں میں یہ برجستہ تاریخ نکالی : " شادی ختم" (۱۳۵۵ھ) -

" دفتر تاریخ " کے مقدمے کے آخر میں ان الفاظ میں تاریخ نکالی :

" اب مقدمہ کا ختم ہونا بہتر ہے "
۱۹۳۷ء

مولانا علامہ اقبال سے بے حد متاثر تھے - ان کی وفات پر انھوں نے جو تاریخیں کہی ہیں ان کے مادوں کی موزونیت کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ ہر مصرع سے ہجری و عیسوی مادۂ تاریخ مستخرج ہو -

" رفعت درجت " (۱۳۵۷ھ) - " ترجمان حقیقت فیلسوف عصر" (۱۹۳۸ء) -

" سحر بیان آگاہ دل ڈاکٹر سرمحمد اقبال رحمت اللہ علیہ "
۱۹۳۸ء

" در دفتر عقیدت "
۱۹۳۸ء

" کم ترین احقر حامد حسن قادری عفی اللہ عنہ "
۱۹۳۸ء

رفت اقبال آفتاب جہاں
۱۳۵۷ھ

رفت اقبال وقت بدر آیات
۱۹۳۸ء

رفت اقبال و هم گل افشانی
۱۳۵۷ھ

رفت اقبال و رفت زیب حیات
۱۹۳۸ء

فخر اسلام و ناز عالم علم
۱۳۵۷ھ

ناز مشرق بہ بہترین صفات
۱۹۳۸ء

ترجمان حقیقت بے پاک
۱۳۵۷ھ

حق پژوہ و فقیر خوش اوقات
۱۹۳۸ء

آن قلندر صفت سخن پیرائے
۱۹۳۸ء

آن مثال کلیم وقف نکات
۱۳۵۷ھ

نام اقبال روشن و شیرین
۱۳۵۷ھ

ذات اقبال مجمع الحسنات
۱۹۳۸ء

ذات اقبال بے تعلق نام
۱۹۳۸ء

نام اقبال با جدائی ذات
۱۳۵۷ھ

تربت پاک محفل قدسی
۱۳۵۷ھ

روح پر نور و مہبط برکات
۱۳۵۷ھ

قطعۂ گفتہ ام کہ ہر مصرع

شعرے می شود بسال وفات

علامہ اقبال کی ایک اور تاریخ وفات انھوں نے علامہ ہی کے مشہور مصرعہ " دگر دانائے راز آید کہ ناید" پر مصرعہ لگاکر یہی شعر سے نکالی ہے ۔ ان کی اس نظم میں تئیس (۲۳) اشعار ہیں آخری دو شعر ملاحظہ ہوں :

ز شعرش ساخت حامد سال رحلت

بشان اعجاز آید کہ ناید

" برفت اقبال آن عرفان نوائے

دگر دانائے راز آید کہ ناید"
۱۹۳۸ء = ۲۰۳ + ۱۷۳۵

شکیل بدایونی کے مجموعہ کلام کے سلسلے میں جو تاریخ انھوں نے لکھی ہے وہ ایک طرف ان کی نظم پر تنقید ہے تو دوسری طرف ایک تاریخ بھی ۔ ملاحظہ ہو :

"تاریخ مجموعۂ نظم شکیل بدایونی"

چھپ گیا مجموعۂ نظم شکیل خوش نوا　　　شاعری کی اس میں ہیں کیا کیا چمن آرائیاں

اہل دل ہر نظم میں دیکھیں گے دل کی دھڑکنیں

پائیں گے اہل نظر تخئیل کی گہرائیاں

ہیں نشاط افزائیاں کیا کیا ہر اک اسلوب میں

ہر زمین و وزن میں کیا کیا ترنم زائیاں

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

دیکھتا ہر شعر کی لذت کی یہ گہرائیاں

مجھ سے بھی اے قادری فرمایش تاریخ ہے

ہیں یہ میرے حال پر ان کی کرم فرمائیاں

ان کے مجموعے میں جو کچھ ہے وہی تاریخ ہے

فکر کی آرایشیں گل، شعر کی رعنائیاں
۱۹۴۴ع

آپ کے برادر خورد جناب الحاج عابد حسن فریدی نے (پروفیسر شعبۂ فارسی، سینٹ جانس کالج آگرہ) ۱۹۳۵ع میں رحلت فرمائی اس موقع پر آپ نے مندرجہ ذیل تاریخیں نکالیں ۔ ملاحظہ ہوں :

"تربت منور" ۔ ۱۳۶۴ھ　"مولانا حاجی عابد حسن صاحب فریدی جماعتی نوراللہ مرقدہ" ۱۳۶۴ھ

"خلیفہ مجاز کعبۂ دو جہاں قبلۂ عالم علی بخش ارواحنا فداہم"
۱۹۳۵ع

"فی الجنت خلدین فیہا"
۱۳۶۴ھ

عابد و شہر ہادی عارف　　　زاہد صادق تقامرات
۱۳۶۴ھ　　　۱۳۶۴ھ

سالک کامل فنا فی الشیخ
۱۳۶۴ھ

قطب ربانی ارفع الدرجات
۱۳۶۴ھ

عاشق مصطفیٰ و رمز شناس
۱۳۶۴ھ

روح عشاق محیط برکات
۱۳۶۴ھ

آمدہ ہم ز عشق پیر شرف
۱۳۶۴ھ

اشرف الناس کامل الحسنات
۱۳۶۴ھ

کرم و فضل صاحب لولاک
۱۳۶۴

یار باجاہ شاہ جنات
۱۳۶۴ھ

از اقل العباد حامد حسن قادری نقشبندی جماعتی کان اللہ لہ
۱۹۳۵ء

۱۴ جون، ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے، جب مولانا آگرے میں محلہ "گلی حکیمان" میں مقیم تھے ان کے برابر کے مکان میں اک روز شادی تھی - یہ اتفاق کہ اسی روز اس سے اگلے مکان میں کسی بی بی کا انتقال ہوگیا۔ دوپہر کو متوفیہ کا جنازہ اٹھا۔ اور سہ پہر کو دو گھنٹے بعد شادی والے گھر سے لڑکی کا جہیز نکلا اور اتفاق کی بات یہ کہ دو گھنٹے قبل جہاں ایک بی بی کے جنازہ کی چارپائی رکھی گئی تھی اب اسی جگہ دوسری بی بی کے جہیز کی مسہری رکھی تھی - مولانا اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور اسی شب یہ تاریخ کہی :

نغمۂ شادی و شغل غم
۱۹۳۸ء

اک گلی ہے اک محلہ دو گھروں کا بیچ ہے
ایک گھر میں نغمۂ عیش، ایک میں شور و فغاں
واہ! کیا نیرنگ ہے یہ آہ کیا منظر ہے یہ
دو گھروں سے آج رخصت ہو رہی ہیں بیٹیاں
ساتھ رخصت ہوکے دونوں اپنے اپنے گھر چلیں
لیکن اک تابوت میں اک پالکی میں ہے رواں

ایک کو آغوش شوہر ، ایک کو آغوش گور   سمجھے اپنی مصلحت کو توہی اے اللہ میاں

نکلی ہے تاریخ اک مصرعہ مشہور سے

"ہوتے ہیں ماتم وہیں بجتے ہیں نقارے جہاں"

۱۹   ۶   ۳۸

منشی سعید احمد صاحب مارہروی ، منیجر شعیب محمدیہ کالج آگرہ نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اکبر آباد میں مدرسہ، اسکول اور کالج قائم کیا آپ بڑے دین دار ، خداترس اور بڑی صفات کے حامل بزرگ تھے۔ موصوف کی وفات سے مولانا قادری کو بڑا صدمہ ہوا کیوں کہ مولانا سے بھی ان کے بڑے گہرے مراسم تھے ۔ مولانا نے ان کی تواریخ وفات بڑی محنت و جاں فشانی سے یہ نکالی ہیں :

تحریر غم فزا

۱۹۳۶ء

" مزار پاک طیع منشی سعید احمد صاحب مارہروی رحمت اللہ علیہ "

۱۹۳۶ء

پاک سیر منیجر شعیب محمدیہ کالج آگرہ

۱۳۶۵ھ

" تاریخ از کلام پاک ایزدی"

۱۳۶۵ھ

"رحمت اللہ قریب من المحسنین "

۱۳۶۵ھ

" تاریخ دیگر مطول از قرآن مجید"

۱۹۳۶ء

من خاف مقام ربہ و نہی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی

۱۹۳۶ء

بقیۃ التواریخ

مات سعید احمد مارہروی   کان سعید الدہر حقّا

کان کریم الخصلۃ طیبا　　　　عَاشَ تقیاً مَاتَ نقیاً

جادہ حداد فی تاریخ
"عَاشَ رَشِیداً مَاتَ زکیاً" (۱)
۱۳۶۵ھ

غالب کے مصرعوں کا تصرف کرتے ہوئے اک اور تاریخی قطعہ میں کہا ہے :

(۲)

دل ہی کیا ساتھ گیا تیرے سعید احمد آہ
　　دوستوں کے نہ رہے ہوش بجا تیرے بعد

خاک اب آگرہ میں اڑتی نظر آتی ہے　　گئے فضل و کرم و مجد و علا تیرے بعد

سوگوار انجمن و مدرسہ و کالج ہیں　　علم و تعلیم ہے اور شغل بکا تیرے بعد

عشق دین ، عشق ادب ، عشق خدا ، عشق رسول
　　یادگار اب یہ ترا عشق رہا تیرے بعد

"درد آہ" آئے دل میں جو یہ تاریخ کہی
۲۰

"شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد"
۱۹۶۶ - ۲۰ = ۱۹۴۶ء

===XXX===

"منصب صبر و رضا کے کوئی قابل نہ رہا"　　یہ بھی اک مصرع تاریخ سنا تیرے بعد
۱۹۴۶ء

قادری نے بھی یہ تاریخ کہی "دو" کے ساتھ　　آج ہے تعزیت مہر و وفا تیرے بعد
۲

۱۹۴۴ء
+۲
۱۹۴۶ء

(۳)

آج آگرہ پہ جو ابر غم چھایا ہے　　اک صاحب دل نے پردہ فرمایا ہے

مرقد پہ منشی سعید احمد کے　　لکھ دو کہ "وصال ذات حق پایا ہے"
۱۳۶۵ھ

---

(۱)　حامد حسن قادری ، مولانا ، "جامع التواریخ" ، (مخطوطہ) ، مملوکہ خالد حسن قادری ، پسر حامد حسن قادری ، پروفیسر شعبہ اردو ، لندن یونی ورسٹی ،
صص: ۲۷-۲۵

(۴)

سعید احمد نیک دل پاک سیرت　　　سپہر کرامت کے تھے نجم ثاقب

یہ ہیں ہجری و عیسوی سال رحلت　　　کرم شیوہ، ذی شان عالی مناقب

۱۳۶۵ھ + ۵۸۱

۱۹۴۶ء

(۵)

منشی سعید احمد مارہروی گئے　　　لے کر چراغ ڈھونڈئیے ایسا باصفت

خلق خدا کے دل میں گھر ان کا تھا قادری　　　پھر کیوں خدا کے پاس نہ ہو قدر و منزلت

فصلی و ہجری، عیسوی و بکرمی ہیں سال

جان شیوہ کرم ہوا ، سامان آخرت

فصلی	۱۳۵۴ھ	+	۱۲
ہجری	۱۳۶۵	+	۵۸۱
عیسوی	۱۹۴۶ء	+	۵۶
بکرمی	۲۰۰۲		

۱۹۳۷ء میں مولانا سیماب اکبر آبادی نے کلام پاک کا منظوم ترجمہ کیا تو فکر تاریخ ہوئی - محبوں اور دوستوں کو خطوط لکھے تقریباً سو تاریخیں ان کے پاس جمع ہوگئیں ، مگر ان میں سے انھیں صرف مولانا قادری کی مندرجہ ذیل تاریخ پسند آئی -

خود مولانا قادری نے بھی لکھا ہے کہ :" سیماب صاحب مرحوم مصرع تاریخ کی بے حد تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے پاس تقریباً سو تاریخیں آئی ہوں گی لیکن کوئی ایک بھی ایسی خوبی کی نہیں -"(۱)

مطلع تواریخ

[illegible]

" مقدس وحی منظوم مترجم "

۱۹۳۷ء

---

(۱)　　حامد حسن قادری، مولانا ،" جامع التواریخ "، محولہ بالا ، ص ۳۶

" از کلام بدیع حضرت سیماب اکبر آبادی"
۱۹۳۷ع

" فی صحف مطہرۃ فیھا کتب قیمۃ "
۱۳۶۶ھ

شعر کیا کیا ہیں اس صحیفے کے | ہند میں ہیں مچی ہوئی دھومیں
ترجمہ ہے کلام باری کا | رکھیں سب اس کو سر پہ اور چومیں
فکر سیماب کی کرامت سے | معجزہ ہے بیان کے جادو میں
دل کشی، دل بری، دل آویزی | ہے عروس سخن کے گیسو میں
آئیں ارباب فکر و اہل نظر | پڑھیں اس ترجمے کو اور جھومیں

قادری نے بھی یہ لکھی تاریخ

آ گئی وحیٔ منظم اردو میں
۱۳۶۶ھ

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے مجموعۂ کلام " نشاط رفتہ " کی اشاعت کے موقع پر مولانا قادری سے تاریخ کی فرمائش کی - مولانا نے اس موقع پر بھی مندرجہ ذیل تاریخیں نکالیں :

" تواریخ طباعت دیوان کلام بدیع "
۱۹۳۷ع

محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے ، پی ایچ ڈی
۱۹۳۷ع

(از آثار قلم حامد حسن قادری)
۱۳۶۶ھ

۹۱ ۱

جس سے ہے خانۂ سخن کے صلائے عام آرہی ہے پیہم
گل سخن، ساغر صبوحی ہے آج ، اور عندلیب ساقی

سرور اس مے کا کم نہ ہوگا ، خزاں نہ آئے گی اس چمن میں

ہے اس کی تاریخ کیا شگفتہ " نشاط رفتہ بہار باقی"
۱۳۶۶ھ

[۱۲]

ہوگیا شائع کلام عندلیب — آشکارا ہوگیا درد نہاں

اس میں احساسات ہیں اور واردات — حکمت شعری ہے اور سحر بیان

قادری صادق ہے یہ تاریخ بھی — " ماہ بے داغ و بہار بے خزاں"
۱۹۴۷ع

تاریخ قیام پاکستان

(قرآن مجید سے)

" کنتم خیر امۃ " (آل عمران ، رکوع ۱۲)
۱۳۶۶ھ

ہوا قائم جو پاکستان آخر — پہلے ہی دن تھے ہندوستان کے واللہ

سمجھتے ہیں اسے وہ مژدہ اس — جو اسلام اور مسلم سے ہیں آگہہ

یہ دنیا کو ہے آزادی کا پیغام — شب تاریک میں ہے مشعل رہ

مساوات و اخوت کا علم دار — سکون و عافیت کا پیش خیمہ

ریاست کی مثال کیا بے مثال — سیاست کا زمانے کو نمونہ

سناؤں قادری قرآں سے تاریخ ؟ — بتاؤں اس کی اک وجہ موجہ ؟

مسلماں کا پاکستان حق تھا

کہ تھا ارشاد " کنتم خیر امۃ "
۱۳۶۶ھ

اس طرح سن عیسوی میں بھی قیام پاکستان کے لیے مندرجہ ذیل تواریخ نکالیں

ملاحظہ ہوں :

﴿ ۲ ﴾

" احلنا دار المقامة من فضله لا یمسنا فیھا نصب " (۱) (سورۂ فاطر ، رکوع ۴ ، پارہ ۲۲)
۱۹۴۷ء

(ترجمہ :- ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے گھر میں اتارا جہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی)

﴿ ۳ ﴾

" فلا تھنوا وتدعوا الی السلم و انتم الاعلون " (سورۂ محمد ، رکوع ۴ ، پارہ ۲۶)
۱۹۴۷ء

(ترجمہ :- پس بھی نہ بنو اور صلح کی طرف بلاؤ - اور تم ہی سربلند ہونے والے ہو -)

﴿ ۴ ﴾

" فانجینٰہ والذین معہ برحمۃ "
۱۳۶۶ھ

(ترجمہ :- پس ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے نجات بخشی یعنی قائد اعظم محمد علی جناح اور مسلمانوں کو)

" تاریخ تقسیم ہند و قیام پاکستان "

۱۴ اگست ، ۱۹۴۷ء مطابق ۲۷ رمضان المبارک ، ۱۳۶۶ھ ، بروز جمعہ ، تقسیم ہند ہوئی اور مملکت پاکستان وجود میں آئی - اس موقع پر جن جذبات سے آپ نے تاریخ نکالی ہے وہ ملاحظہ ہو :

نئی نقل پر باغ بانوں کی پتھر کیا آپ اپنا چمن نکلی نکلی
جو بیٹے ہی ظالم رہے ماں کے حق میں ہے تاریخ " ام وطن نکلی نکلی "
۱۳۶۶ھ

" حادثۂ حسرت ناک و اندوہ فزا "
۱۳۶۷ھ

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا " جامع التواریخ " ، محولہ بالا ، ص ۳۰

اس تاریخ کے کہنے کا سبب قادری صاحب نے تفصیل سے "جامع التواریخ" میں لکھا ہے:

" ۱۶ نومبر، ۱۹۴۷ء / ۲ محرم، ۱۳۶۷ھ کو ہماری محلے " قاضی گلی"
میں یہ عجیب و غریب حادثہ پیش آیا کہ رات میں بارہ بجے کے بعد آغا شمس
الحسن کے بھائی آغا شجاعت کا جوان لڑکا آغا فرحت مکان کے چھجے پر سے
نیچے گلی میں گر پڑا - اقبال (فرزند ڈاکٹر ماشاء اللہ خان) کے مکان میں سوتا
تھا۔ کئی روز سے وہیں سوتا تھا۔ مکان کے چھجے پر بہت اونچا کٹھرا لگا ہوا
ہے اور چھجا مُسَقَّفُ ہے - کوئی شخص بے خیالی میں غلطی سے نہیں گرسکتا۔
جب تک کٹھرے کے اوپر سے نہ کودے یا کوئی اٹھاکر نہ پھینکے - ان دونوں کا کوئی
قرینہ نہ تھا۔ خود کشی کا کوئی سبب نہیں اور ۲۲سال کے بھاری لڑکے کو اٹھا
کر پھینکنا آسان نہیں - پھینکنے کی کشمکش سے گھر کے آدمیوں کا بیدار ہونا
ضروری تھا۔ اور پھینکنے والا کون ہوسکتاہے - محلے والے سب سوتے تھے لیکن
گرنے کی سخت آواز سے سب جاگ گئے اور دوڑ پڑے - لڑکا بے ہوش تھا۔ اندرونی
چوٹ تھی کہیں ضرب کا نشان نہ تھا۔ صرف ناک سے بے حد خون نکلا تھا اس
کے باپ بھائی تو خوف و دہشت اور صدمے کے مارے پاس تک نہ آئے - ماجد (۱)
اسی وقت زین خانے سے حاجی حیدر بخش کی کار لائے اس میں اہل محلہ
فرحت کو شفاخانے لے گئے مگر کوئی علاج کار گر نہ ہوا۔ دوسرے روز ۱۷ نومبر،
مطابق ۳ محرم، یک شنبے کو شام کے وقت رخصت ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!
اللہ تعالی مغفرت فرمائے!

اس واقعہ کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صبح کو جب لڑکے
کو شفاخانے میں ہوش آیا تو اس نے بعض اعزہ سے کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا
کہ کسی نے مجھے اٹھاکر نیچے دے مارا۔ اس سے لوگوں کا یہ قیاس ہے کہ اقبال کے
مکان میں جو ہمیشہ سے جن رہتے ہیں ان کے رہنے کی جگہ پر فرحت نے رات
میں اٹھ کر پیشاب کردیا تھا۔ اس کا نشان صبح کو دیکھا گیا تھا۔ جنوں نے
اٹھاکر پھینک دیا۔ اس مکان میں جنوں کی روایت بہت مشہور ہے - مکان والے
کہتے ہیں کہ جنوں نے اکثر اپنے وجود کا ثبوت دیا ہے اور لوگوں کو گستاخی پر

---

(۱) قادری صاحب کے منجھلے صاحب زادے ماجد حسن فریدی، بانی و پرنسپل نیو میتھڈ
اسکول ، ناظم آباد ، کراچی-۱۸

معمولی سزائیں دی ہیں۔ اسی مکان کے پڑوس میں ایک بزرگ عالم و عامل واجد حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ رہتے تھے - وہ جنوں کے عامل تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے اس مکان کے جن سے ملاقات کی اس نے اپنا نام فضل الرحمن بتایا اور اکبر بادشاہ کے زمانے سے اس مکان میں اپنا قیام بتایا۔

اب یہ لطیفہ قابل غور ہے کہ ۱۹۴۸ء سے اس اقبال والے مکان میں ہندو آباد ہیں۔ وہ جنوں کا ادب کیا ملحوظ رکھتے ہوں گے - لیکن جن ان سے کچھ نہیں کہتے ممکن ہے مکان چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔"

=====

ایک مرتبہ عید کے موقع پر ۲۹ رمضان کو چاند ہونے کا قوی امکان تھا مگر چاند نظر نہ آیا تو قادری صاحب نے یہ تاریخ کہی :

آج کے چاند کی خوشی تھی ہمیں ہوگیا خواب سب خیال عید

میں نے تاریخ بھی یہ خوب کہی " کہ نہ آیا نظر ہلال عید"

۱۳۶۷ھ

تھوڑی دیر کے بعد مائکروفون پر اعلان کیا گیا کہ کل عید ہے - لہذا قادری صاحب نے فوراً ہی دوسری تاریخ اس عید بے ہلال کی یوں کہی :-

تاریخ بھی جو ہو تو عجیب و جدید ہو

لکھ " اب کے بے ہلال نظر آئے عید ہو"

۱۳۶۷ھ

۱۹۴۸ء میں قادری صاحب مسلسل ڈھائی مہینے بیمار رہے - بیماری کا آغاز نزلہ و زکام سے ہوا ، پھر بخار آیا اس کے بعد حرارت رہنے لگی - حرارت کبھی رہتی کبھی نہ رہتی - کبھی بخار ہوتا ، کبھی نہ ہوتا۔ ان تمام کیفیات کی تاریخیں موصوف نے علالت کے دوران ہی لکھیں، کئی انگریزی ناولیں بھی پڑھیں۔ دوست احباب کو خطوط بھی لکھے اور مدیران اخبارات کی فرمائشوں پر مضمون بھی بھیجے۔ ملاحظہ کیجئے :

" کیفیات مرض و شفا"

۱۹۴۸ء

کہا یہ میں نے جو دیکھا پڑا ہوا ہے بخار

"آج کل میں بیچھے پڑا ہوا ہے بخار"
۱۳۶۷ھ

تاریخ عیسوی بھی یہ نکلی ہے بے بدل "بیچھے میں بخار پڑا خوب آج کل"
۱۹۴۸ء

سوجھی تاریخ اب کی بار ہمیں تین ہفتے سے ہے بخار ہمیں
۱۹۴۸ء

قاضی جب بنے تاریخ بار بار ہوئے کہا "بخار تو ہے، ہفتے آج چار ہوئے"
۱۹۴۸ء

ماہ تاریخ و دعا می رخشد کہ "رہائی ز حرارت بخشد"
۱۹۴۸ء

===XXX====

تخصیص نہیں کچھ اس میں تعمیم ہی ہے ہرحکم خدا واجب تعظیم ہی ہے
وہ دے گے مرض شفا بھی پھر دے کا وہ دے ہرحال میں شکر اس کی تعلیم ہی ہے
تاریخیں ہیں عیسوی و ہجری دونوں
منظور جو کچھ حق کو، وہ تسلیم ہی ہے
۵۸۱ + ۱۳۶۷ھ
۱۹۴۸ء

دبایا مرض نے ہمیں ایسا ایسا (۱۳۶۷ھ) پڑا ضعف نے بدلا نقشا ہمارا (۱۹۴۸ء)
چلایا ہے کیا تیر تاریخ کا یہ (۱۹۴۸ء) حرارت نے چھوڑا ہے پیچھا ہمارا (۱۳۶۷ھ)

===XXX====

یہ از روئے بے چارگی کہہ ہی ڈالا "مرض نے ہمارا پلیتھن نکالا"
+۲ ۱۹۴۶ء
+۲
۱۹۴۸ء

===XXXX====

صحت حاصل ہوئی جب حسب احکام خداوندی کہی تاریخ "صحت بھی ہے انعام خداوندی"
۱۳۶۷ھ

===XXXX====

تاریخ کا یہ سجا ہے کھلے "پھر آج ہوا مرض کا حملہ"
۱۳۶۷ھ

پاکستان وجود میں آنے اور قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے وقت قادری

صاحب ہندوستان میں ہی سینٹ جانس کالج آگرہ میں پروفیسر تھے مگر انھوں نے قیام پاکستان اور قائداعظم کی رحلت کی تاریخیں کہیں اور اقبال کے اس قول کے مصداق کہ :

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

بڑی بے نیازی سے یہ تاریخیں ہندوستان کے کچھ رسائل و جرائد میں ذرا بھی نتائج کی پروا کیے بغیر چھپوادیں - قیام پاکستان کی تواریخ پہلے گذرچکی ہیں۔ قائداعظم کی وفات کی تواریخ یہ ہیں - ملاحظہ کیجئے :

ممدوح جہاں و بانئ پاکستان قائد اعظم جناح
۱۹۴۸ء

ہم میں نہیں وہ آج مشیت خدا کی ہے تاریخ ہے "جناح پہ رحمت خدا کی ہے"
۱۳۶۷ھ

| ۲ |

فرشتے کہنے لگے عرش پہ یہ "آہ" کے ساتھ (+۶) "جہاں میں دین کی خدمت تری حوالے کی"
۱۹۴۸ء

تو جبرئیل (+۳) سر اپنا اٹھاکے بول اٹھے "جناح، خلد کی نعمت تری حوالے کی"
۱۹۴۸ء

| ۳ |

اے قائد اعظم و زعیم اکمل ہو روح پہ تیری رحمت عزو جل
تاریخ وفات قادری نے یہ لکھی "ہے گوشۂ قبر ترا ایاشیش محل"
۱۹۴۸ء

۱۹۴۸ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ان کے مقالے "اردو تنقید کا ارتقا" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی - اس موقع پر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے فرمائش کرکے قادری صاحب سے تاریخ نکلوائی جو حسب ذیل ہے :

تاریخ ڈاکٹری عبادت بریلوی
(بفرمائش خواجہ احمد فاروقی)

(۱)

کیوں عبادت نہ ہوتے پی ایچ ڈی — تھا جو تنقید میں ید طولیٰ

تم بھی خوش ہوکے سال ڈاکٹری — لکھدو خواجہ "فضیلت اولیٰ"
۱۳۶۷ھ

(۲)

شکر ہے بھائی عبادت ہوگئے پی ایچ ڈی — مل گیا ہمت کا ثمرہ ، قابلیت کی سند

پیش کردو تہنیت کے ساتھ یہ تاریخ بھی — "واہ اچھی ہاتھ آئی اک فضیلت کی سند"
۱۹۴۸ع

(۳)

عبادت کی تنقید ہے بے مثال — بنایا ہے بدر اس کو جو تھا ہلال

یہ تاریخ اعزاز پی ایچ ڈی — لکھو طرۂ علم و فضل و کمال
۱۳۶۷ھ

===xxx====

۱۹۴۸ع میں صدر الافاضل مولانا حکیم نعیم الدین صاحب نے رحلت فرمائی قادری صاحب کو موصوف سے دلی مناسبت تھی ان کی وفات کے بعد قادری صاحب نے تقریباً دو درجن تاریخیں کہیں ۔ ہر مصرع میں ایک تاریخ نظم کی اور بعض مقامات پر ایک مصرع میں بھی دو تاریخوں کا اہتمام رکھا۔ ملاحظہ ہو :

"تلاش تواریخ"
۱۹۴۸ع

"بسم اللہ المعز المعظم"
۱۳۶۷ھ

"تواریخ وفات مجمع کمال"
۱۹۴۸ع

صدرالافاضل والاجاه مولانا مولوی حکیم نعیم الدین صاحب

۱۹۳۸ء

رضی گذشته واللهه الملک الوهاب

۱۳۶۷ھ

وہ مولانا نعیم الدین صاحب — حق آگاہ و حق اندیش و حق آئین

وہ تھے بھی، ہوگئے بھی واصل حق — طفیل حضرت طہٰ و یٰسین

گئے ان کے فضائل ساتھ ان کے — کہاں ہیں اب جو ان میں خوبیاں تھیں

حکیم و فاضل و حاجی و زائر — فقیہ و مفتی و علّامۂ دین

وہ جن کی پاک سیرت نیک طینت — وہ جن کی رائے صائب قول شیریں

خطیب خوش بیاں و نکتہ پرور — جو کہتے دل میں وہ باتیں اترتیں

لکھوں اب قادری تاریخ رحلت — جو پوچھے کوئی سال حسرت آگئیں

کہ "وہ اہل حق و صدر افاضل (۱۳۶۷ھ) — وہ شمع روزگار علم پیشین" (۱۳۶۷ھ)

کہوں :" وہ خضر راہ کعبۂ دل" (۱۳۶۷ھ) — " وہ نجم علم با توصیف و تحسین"

کہوں :" درویش کامل رحمت حق" (۱۳۶۷ھ) — کہوں :" صدر افاضل کعبۂ دین " (۱۳۶۷ھ)

کہوں :" وہ گلستاں جلد میں ہیں" (۱۳۶۷ھ) — " وہ نیک آہنگ و باخوئی شیریں" (۱۳۶۷ھ)

" وہ کنز علم جو مخدوم گیتی " (۱۳۶۷ھ) — " وحید خلق ، جو با عز و تمکین" (۱۳۶۷ھ)

دو سال عیسوی و ہجری آمد

عظیم القدر بود (۱۳۶۷ھ) - آن سرور دین (۵۸۱)

۵۸۱ + ۱۳۶۷ھ = ۱۹۳۸ء

| ۲ |

آمدہ ہم بہ دو مصراع دو سال — کرد چوں صدر افاضل رحلت

فخر اطبا — حکیم حاذق   یافت آرام مقام جنت"
١٩٤٨ع   ١٣٦٧ھ

(٣)

صدر افاضل زمان خلد میں جاتے ہیں سکوں

سال وفات بھی لکھیں "فی الشرفت آ مدیں"
١٩٤٨ع

(٣)

جانے سے مولانا کے ہیں سب یہ سراپا محو غم

فضل و صفا – رشد و ہدی – حلم و حیا – عدل و کرم

ض خ ش د ل ی د ر

١٩٤٨ع = ٢٠٠ ٤ ١٠ ٣٠ ٤ ٣٠٠ ٦٠٠ ٨٠٠

(٥)

اے قادری خستہ دل ، تاریخ رحلت کر رقم

ہیں رونما اب :- درد و غم – قہر و جفا – رنج و ستم

د غ ق ج ر س

١٣٦٧ھ = ٦٠ ٢٠٠ ٣ ١٠٠ ١٠٠٠ ٤

١٩٤٨ع کو قادری صاحب کے برادر عم زاد ، ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں اور ان کے بھتیجے و داماد مولوی زاہد حسن فریدی سندھ کالج کراچی میں پروفیسر مقرر ہوئے – اس موقع پر دونوں کے لیے ایک ہی تاریخ کہی :

پروفیسر ہوئے ہیں کالجوں میں طاہر و زاہد

ملی یہ نوکری اچھی ، خوشی گو دیر تو ہے حد

کہی تاریخ جب خط آئے لاہور و کراچی سے

کہ :" ہے اچھا ثبوت اس کا کہ دیر آید درست آید"
١٩٤٨ع

سینٹ جانس کالج آگرہ ہر سال " شفق" کے نام سے میگزین شائع کیا کرتا تھا۔ اردو کے ایک پروفیسر مولانا ولی محمد خاں صاحب نے ۲۲ جون، ۱۹۳۹ء کو وفات پائی - اس موقع پر قادری صاحب نے خصوصیت سے " شفق" کا خصوصی نمبر" حضور نمبر" کے نام سے نکالا - جس میں " رشحات غم" کے عنوان سے مولوی صاحب کے حالات و کمالات بیان کیے ہیں - (۱)

الغفور الودود
۱۳۶۸ھ

رشحات غم
۱۹۳۹ء

حادثۂ انتقال یگانۂ آفاق
۱۳۶۸ھ

کامل و فاضل عصر، جناب مولانا ولی محمد خاں صاحب مرحوم
۱۳۶۸ھ — ۱۳۶۸ھ

نور اللہ رب العالمین مرقدہ بخیرہ
۱۳۶۸ھ

عالی منقبت پروفیسر سینٹ جانس کالج
۱۹۳۹ء

(یکالے ملقب باسم پاک حضور)
۱۳۶۸ھ

۱ ۱ ۱

عازم بہشت شد ولی محمد خاں — شذر محفل مانا بود شمع اہل فضل

سال فصلی و ہجری عیسوی و سمبت شد — پاک دل، کرم فرما بود شمع اہل فضل

۵۷ ۵۸۱ ۱۲
۱۳۵۶ فصلی
۱۳۶۸ ہجری
۱۹۳۹ عیسوی
۲۰۰۶ بکرمی

---

(۱) ماہنامہ" شفق"، آگرہ : آگرہ اخبار پریس، ۱۹۳۹ء ، ج ۲۳ ، ش ۱۱ ، ص ۲

وہ ہردل کو عزیز اور ان کو ہردل — کچھ ان میں اس قدر محبوبیاں تھیں

یہ ہے تاریخ صادق ان ولی پر — کہاں ہیں اب جو ان کی خوبیاں تھیں

۱۳۶۸ھ

(۳)

در فضائل کہ آں ولی می داشت — ثانی و مثل غیر ممکن بود

قادری سال رحلتش بنویس — فاضل صبر پاک باطن بود

۱۳۶۸ھ

(۴)

یہ واقعہ ہے ، نہ تھے صرف نام ہی کے ولی — ولا میں فرد کرم میں یگانہ تھے بے شک

جو واقعہ ہے وہی ان کا سال رحلت بھی — کہ "وہ ولی تھے ولئ زمانہ تھے بے شک"

۱۳۶۸ھ

(۵)

ولی خدا تھے ولی محمد — ولی محمد سے سیکھو ولا کو

ولی باحمد تھے ولی بے ہمہ تھے — نہ دنیا کو چھوڑا نہ بھولے خدا کو

ضیا مہر و الطاف کو ان کے دل سے — جلا ان کے سینے سے صدق و صفا کو

ہر استاد و شاگرد کالج کے مخلص — خلوص ان سے ہر دوست ہر آشنا کو

ہوئے بولتے چالتے دم میں راہی — کہا ہنس کے لبیک بیک قضا کو

وہ بے شبہ مصداق لا یحزنون تھے — بقائے ابد جانتے تھے فنا کو

یہ ہے برمحل قادری سال رحلت — "ولی تھے ، کہاں حزن و خوف اولیا کو"

۱۳۶۸ھ

حالات با کمالات "حضور"

ہوئے رخصت ولی محمد خان — آہ وہ دوستوں کے دل کا سرور

زندہ دل پاک نفس نیک خصال — صدق و مہر و وفا سے دل معمور

فاضل عصر و خوش بیان واعظ　　نشۂ حبِّ دیں میں بالکل چور

سن کے تقریر ان کی گرما گرم　　سب برودت دلوں سے ہو کافور

وہ بیان جس سے اک سماں بندھ جائے　　وہ اثر جس سے سامعین مسحور

پاک باطن مگر نہ زاہد خشک　　شوخ طبیعت مگر بہت ہی غیور

زینت و زیب محفل احباب　　ہو لطیفوں سے ان کے سب غم دور

===XXXX====

ان کے حالات داستان عجیب　　سبق آموز، لطف سے معمور

عربی فارسی کی، کی تحصیل　　بمقام ریاست جے پور

جملہ اسناد فاضل و کامل　　کرکے حاصل مطابق دستور

پھر دیا امتحان انگریزی　　نوکری میں رہے نہ پھر معذور

اس صدی کا وہ سال تھا دسواں　　نوکری کا ملا تھا جب منشور

خدمت اسکول کی سپرد ہوئی　　لوح تقدیر میں جو تھی مسطور

گذرے پھر سال ایک کم چالیس　　کہ مسلسل رہے ہیں وہ مامور

سترہ سال راج پوت اسکول　　ان کے فیضان سے رہا بھرپور

اور بائیس سال کالج میں　　سعی تعلیم ان کی ہے مشکور

خوبیٔ بخت تھی کہ یوں گذرے　　خدمت علم میں سنین و شہور

====XXX===

اہل کالج کے دل میں گھر ایسا　　ان کو کہتے تھے سب "حضور حضور"

ان کی باتیں تھیں دل کش و دل چسپ　　خوش مزاجی کا تھا وہ جوش و وفور

بعض شاگرد تھے جو شوخ و شریر　　حاضری کا یہ ان کی تھا دستور

نام کے آگے اک الف لکھتے　　ان کا ڈنڈا یہ تھا بہت مشہور

بی پریزنٹ کی یہ بن جاتا ان کو ہوتی جو حاضری منظور

یا یہ بنتا تھا "ایبسنٹ کا " اے" ہوتا ثابت اگر کسی کا قصور

لڑکے ڈرتے تھے ان کے ڈنڈے سے کہ نہ آجائے حاضری میں فتور

" جور استاد بہ ز مہر پدر " تھا یہ احساس سب کو اور یہ شعور

مہربان بھی تھے ایسے لڑکوں پر کہ نہ کرتے کسی کا دل رنجور

گھر پہنچتے اگر کبھی شاگرد پہنچتے کچھ کھلا پلا کے ضرور

کھاتے خود جاکے ہوسٹل میں کبھی چائے اور توس کیلے اور انگور

===XXXX====

ممبر اسٹاف کے کلب میں رہے بیڈ منٹن بھی کھیلتے تھے ضرور

ہوتیں جب پارٹی میں تقریریں کھلتے ان کے بھی جوہر مستور

جب وہ کرتے نسیم صبح کا ذکر ان کی تقریر سے برستا نور

پھدی کہتی تھی مارننگ بریز جو کچھ ان کے بیان میں تھا مذکور

===XXX====

جاتی پکنک کبھی جو کالج کی اس میں رہتے تھے پیش پیش " حضور "

سیکری ہو، سکندرہ ہو کہ ڈیگ مستعد تھے سفر پہ دور سے دور

کھیلتے کھاتے دل لگی کرتے رہتے ہر طرح شامل جمہور

کھیل ان کو پسند تھا شطرنج مات کھائیں کہ دیں بہت مسرور

تھے شکاری بھی رکھتے تھے بندوق کھیلتے تھے کبھی شکار طیور

==XXX====

ماتھر، اشتھی ، فڈن و شرما (۱) خاطر ان سب کو ان کی تھی منظور

---

(۱) "ماتھر، اشتھی، فڈن اور شرما" صاحبان پروفیسران سینٹ جانس کالج، آگرہ

کس محبت سے ~~کٹھک~~ ، امبیکا (۱) شیودت آتے رس گلے لے کے پیش حضور

اور مشیت (۲) اک صائے بھی تھے ساتھ ساتھ ان کے چلنے پر مامور

رہتی تھی چھیڑ چھاڑ کٹھک (۳) سے کہ ظرافت میں وہ بھی تھیں مشہور

خود تھے مسٹر مہاجن (۴) ادیبِ شفیق ہیں جو کالج کے آج صدر صدور

رہے معذور ہوکے بھی دیگر تھا کرم کا پرنسپل کے ظہور

وہ بھی تھے سب کی مہربانی کے دل سے ممنون و حق شناس و شکور

===xxx====

آگرے میں تھی ایک " بزم ادب " جس کی پوچھ ہوتی تھی شہرت دور

ہوتی جب ڈائرکٹری شائع ہوتی بزم ادب بھی واں مذکور

صدر اس کے فریدی (۵) مرحوم اس کے ناظم منظّر منصور

خازن بزم سعؔد محمود صدر و خازن ہیں آج زیب قبور

مولوی ولی محمد خان اس کی " پبلسٹی " پہ تھے مامور

قاصد بزم تھے بڑے پر جوش اڑ کے ہر وقت جاتے مثل طیور

ان کو تبلیغ دین بھی تھی تفویض اس میں کرتے تھے کوشش موفور

کرتے احکام شرع کی تعلیم کرتے اصلاح حالت جمہور

---

(۱) و (۳) " شیودت " " امبیکا جین " اور " کٹھک " صاحبان پروفیسران سینٹ جانس کالج ، آگرہ

(۲) ڈاکٹر مشیت الدین فریدی صاحب ، حضور اور قادری صاحب کے زمانے میں اس کالج کے طالب علم تھے۔ قادری صاحب کے سبکدوش ہونے پر صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ جس زمانے میں راقم انٹر اور بی اے کا طالب علم تھا مشیت الدین فریدی صاحب اردو پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کے پڑھانے کا انداز بڑا دل نشین و دل کش تھا۔ راقم میں اردو کا صحیح ذوق قادری صاحب اور ڈاکٹر مشیت فریدی صاحب ہی نے پیدا کرایا ۔ آج کل آپ دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہیں۔

(۴) مہاجن صاحب، قاضی صاحب اور حضور صاحب کے زمانے میں سینٹ جانس کالج کے پرنسپل تھے۔ بعد میں آگرہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوگئے ۔

(۵) مولوی عابد حسن صاحب فریدی ، صدر شعبہ فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ

دیتے دعوت کرتے دعوت بھی　　ہیں کلام و طعام جب منظور

دوست کہتے تھے پھر بھی ان کو　　گو نہ تھے بھی نیاز و نذور

شغل بزم اک مقالہ خوانی تھا　　رکھتے اس میں بھی تھے وہ درک و شعور

ہوگئی آہ ختم " بزم ادب "　　آئینہ ہوا وہ چکنا چور

===XXX====

تھے وہ مہمان و میزبان اچھے　　کھاکے بھی خوش کھلاکے بھی مسرور

کرتے رہتے تھے اپنے گھر دعوت　　خاص کر سردیوں میں تھا دستور

نان منگواتے پائے پکواتے　　خود بھی تھا فن پخت و پز پہ عبور

کس محبت کے ساتھ ہوتا تھا　　ان کی مہمان نوازیوں کا ظہور

=XXXX====

شادیاں کی تھیں سات پے در پے　　کہ تجرّد سے تھے وہ سخت نفور

کبھی مانگی انھوں نے جوڑی بھی　　تھے وہ جب نشۂ شباب میں چور

گھر کہاں ، ہواگر نہ گھر والی　　اس لیے تھے نکاح پر مجبور

نہ ہو بیوی تو تھے تن تنہا　　روٹیوں سے بھی رہتے پھر معذور

یہی مقصد تھا گھر بسانے کا　　ہیں " چہ می کوشیاں " سمجھ کا فتور

بیویوں سے سلوک تھا ایسا　　کہ کسی حق میں کچھ کمی نہ قصور

ان کے آرام کا خیال ایسا　　کہ خوشی ان کی ہر طرح منظور

گھر لٹا دیں خوشی پہ بیوی کی　　یہی سعی و عمل تھا مقدور

کبھی اس کے خلاف کچھ نہ کیا　　تھا جو شرع شریعت کا دستور

۱۰۰ ۱۰۰
یہ دعا ہے کہ یارب ان کو وہاں　　ملے اک اک کے بدلے سو سو حور

===XXX====

آہ ایسے عزیز دوست گئے　　ہم سے وہ دور ان سے ہم مہجور

ان کے اوصاف پاک نا محدود | ان کے اخلاق نیک نا محصور
وصف کو ان کے ذکر ناکافی | جیسے جلنے کو تنگ دامن طور
یا الٰہی رہیں خوش و خرم | ان کے پس ماندگان اناث و ذکور
رحم فرما بروح مولانا | یاس از رحمت است عین قصور
فاغفر الذنب و اقبل التوبۃ | یا الٰہ العباد انت غفور
ان کے مرقد کو کردے شیش محل | لطف سے تیرے، تیرا لمعۂ نور
تیرے دربار سے ملے ان کو | مژدۂ آن سعیکم مشکور
ان پہ سایہ لوائے حمد کا ہو | حق تری اولیا میں وہ محشور

===xxxx====

قادری نے یہ ان کا سال وفات | لکھدیا "تھے ولی رب غفور"
١٩٣٩ء

دل ہے غم ناک آنکھ ہے نم ناک

حال اور سال ہے ، " یہ غم کاوفور" (١)
١٣٦٨ھ

خاک سار حامدحسن قادری
١٣٦٨ھ

یہ نظم جہاں حضور کے فضائل کی آئینہ دار ہے وہاں آگرہ (اکبر آباد) اور سینٹ جانس کالج آگرہ کے لائق و فائق اساتذہ اور وہاں کے علمی و ادبی ماحول کی بھی آئینہ دار ہے ۔ راقم کو بھی انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں یہیں تعلیم حاصل کرنے کا شرف ملا۔

" مجمع الکرامات " ایک نادر و نایاب قلمی کتاب تھی۔ جس میں امام الدین خاں صاحب رام پوری خلیفہ حضرت شاہ درگاہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیر و مرشد کے اور دادا پیر حضرت

---

(١) " شفق " ، آگرہ : آگرہ اخبار پریس ، دسمبر، ١٩٣٩ء، ج ٢٣، ش ، صص ٨-٢

حافظ شاہ جمال اللہ قدس سرہ العزیز کے حالات و کرامات فارسی زبان میں لکھے تھے۔ مولانا حامد حسن قادری نے حضرت شہزادہ میاں صاحب سجادہ نشین درگاہ شاہ درگاہی کے فرمانے پر اس کا ترجمہ اردو میں کیا اور بہت سی عجیب و غریب تاریخیں نکالیں چند درج ذیل ہیں۔ اس کا تفصیلی ذکر مولانا کے تراجم کے سلسلے میں آئے گا۔ اس کتاب کا سرورق ملاحظہ ہو :

تواریخ کتاب مجمع الکرامات

دیباچہ

بسم اللہم المحسن الذی انعم علی

١٣٦٩ھ

تذکرۂ بابرکت

١٩٥٠ع

نسخۃ البرکات

١٣٦٩ھ

فیض جاری

١١٠٣

مجمع الکرامات

٨٤٦

١١٠٣ + ٨٤٦ = ١٩٥٠ع

دیباچہ ختم شد

تواریخ درمیان و بہ اختتام کتاب :- ١٣٦٩ھ

اللھم ربنا اَوزِعنا اَن نُتِمّہ صادقاً ، آمین

١٣٦٩ھ

" حال کرامات اولیا عام گشت

١٩٥٠ع

با لطف ھادیؐ کامل باختتام رسید

١٩٥٠ع

بر درود و سلام ختم کتاب رسید

١٩٥٠ع

دوسرا سرورق اس سے زیادہ عجیب ترکیب کے ساتھ ہے یہ بھی ملاحظہ ہو :

فصلی	ہجری		عیسوی	بکرمی
۸۳۶	۸۳۶	مجمع الکرامات	۸۳۶	۸۳۶
-	-	نایاب	۶۴	۶۴
-	-	از	۸	۸
-	-	حق پناہ یزدان آگاہ	۲۶۵	۲۶۵
۱۷	۱۷	زاہد	۱۷	۱۷
-	-	پاک دل	-	۵۷
-	۶	و	۶	۶
۱۶	۱۶	باوجود	۱۶	۱۶
-	۶	و	۶	۶
۶۷	۶۷	ادیب ادب مآب	۶۷	۶۷
۸۲	۸۲	امام	۸۲	۸۲
۶	۶	و	۶	۶
-	-	اردو	۲۱۳	۲۱۳
-	-	ہدیۂ ادب	۳۱	۳۱
-	-	از	۸	۸
۳۱۵	۳۱۵	قادری	۳۱۵	۳۱۵
۱۳۵۷ فصلی	۱۳۶۹ ہجری		۱۹۵۰ء عیسوی	۲۰۰۷ بکرمی

سرورق کے بعد بھی مولانا نے متعدد تاریخیں فصلی، ہجری، عیسوی اور سمبت بکرمی میں بڑی محنت و جاں فشانی سے نکالی ہیں جن کی امثال حسب ذیل ہیں:

" تالیف گنجینۂ کرامات اولیا " و " تذکرۂ اولیائے حق رام بھی "
۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء

یعنی

کتاب بے بہائے اہل دل
۵۳۳
مجمع الکرامات
۸۳۶

۱۳۶۹ھ

یا احوال اقطاب حق حافظ جمال اللہ و شاہ درگاہی

۱۹۵۰ع

رحمھم اللہ البصیر و قدس اسرار ھم

۱۳۶۹ھ

(۱)

رنگ بے عرفان حقیقت یہ ہے ۱۳۶۹ھ — مقصود کل نخل شریعت یہ ہے ۱۹۵۰ع

نایاب در نظم طریقت یہ ہے ۲۰۰۷ بکرمی — اک بحر ہدایت ہے کرامت یہ ہے ۱۳۵۷ فصلی

(۲)

ہجری میں ہے " بستان حقیقت کی بہار" ۱۳۶۹ھ فصلی بھی ہے "گلشن طریقت کی بہار" ۱۳۵۷ف

ہے عیسوی "اک صفات کثرت کی بہار" سمبت " فیضان شمع وحدت کی بہار" ۲۰۰۷ بکرمی

(۳)

یہ خوب ہے اثر خامۂ امام الدین — بیان حال کرامات بھی کرامت ہے

یہ سال ہجری و فصلی ہیں قادری یکجا — کہ " واہ یہ سرچشمۂ طریقت ہے" ۱۲+ = ۱۳۵۷ف ۱۳۶۹ھ

(۴)

در جلوه چو مجمع الکرامات آمد — آئینۂ فقر و کشف را آئینے

از خامۂ قادری بر آمد تاریخ — " این ست کرامت امام الدینے "

۱۳۶۹ھ

(۵)

فقر درگاهی و عرفان جمال اللهی — شان سنت ہے وہ شایان شریعت ہے یہ

قادری ہے یہی تعریف یہی ہے تاریخ — " گل سرسبز گلستان شریعت ہے یہ "

۱۹۵۰ع

(۶)

روشن ہے اس سے کیا نور عرفان — ظاهر ہے اس سے کیا شان توحید

مدغم هیں هجری اور عیسوی سال — شمع معادی ، فیضان توحید

۱۳۶۹ھ + ۵۸۱

۱۹۵۰ع

(۷)

اهل عرفان اور نور ذات کی باتیں هیں یہ — جس نے پایا اهل عرفان هی سے پایا نور ذات

بکرمی و عیسوی ، هجری و فصلی چار سال — یوں لکھو: " بهم توسل هی سے آیا نور ذات

فصلی ۱۳۵۷ + ۱۲

هجری ۱۳۶۹ + ۵۸۱

عیسوی ۱۹۵۰ع + ۵۷

بکرمی ۲۰۰۷

(۸)

نیز قدرت شہ درگاهی و جمال اللہہ — امام صاحب دل زد رقم کمالے چند

سنین شمس و قمر چار گفته ام یک جا — ز فیض هادیٔ گیتی بود مثالے چند

فصلی ۱۳۵۷ف + ۱۲ + ۵۸۱ + ۵۷

هجری ۱۳۶۹ھ + ۵۸۱

عیسوی ۱۹۵۰ع + ۵۷

بکرمی ۲۰۰۷

﴿ ۹ ﴾

یہ طالب حق کو نعمت ہے   یہ دل والوں کی ہدایت ہے

یہ قادری اس کا سال لکھو   " یہ فیض رسان طریقت ہے "

۱۹۵۰ء

﴿ ۱۰ ﴾

مرتب چوگشتہ بہ نثر و بہ نظم   کتابے ز ذکر امام جہاں

ہم از قول مشہور تاریخ آں   بگو " حکمت شعر سحربیاں "

۱۳۶۹ھ

﴿ ۱۱ ﴾

مترجم چو گشتہ کتاب امام   شد آئینہ فیض درگاہ قطب

ز تاریخ تالیف تاریخ شد   کہ : گنجینۂ فیض درگاہ قطب

۱۲۳۱ + ۱۳۸

۱۳۶۹ھ

ابھی اسی کتاب اور اس سے متعلق صوفیائے کرام اور محسنین و مخلصین کی کم از کم اتنی ہی تاریخیں اور ہیں ، بخوف طوالت ان کو حذف کیا جاتا ہے - اور اب ذیل میں حضرت شاہ حافظ جمال اللہ اور حضرت شاہ درگاہی محبوب الہی کی تواریخ درج کی جاتی ہیں :

تواریخ وصال حضرت حافظ جمال اللہ شاہ صاحب

﴿ ۱ ﴾

و ھوالعلی العظیم

۱۲۰۹ھ

﴿ ۲ ﴾

مات ھیہات جمال اللہ   غاب فی القبر جمال الرحمان

کُتبَ فی الخوض التاریخ الفوت   قال قلبی " طلبہ الرضوان "

۱۲۰۹ھ

۱ ۳ ۱

بود مرگ و ز لیتش آیات حق "ذات حق" سال فنا در ذات حق
۱۲۰۹ھ

تواریخ وصال حضرت شاہ درگاہی محبوب الٰہی

" لعلی اللہ محبوب الٰہی شاہ درگاہی" "معدن فیض گنج جود و عطا"
۱۲۲۶ھ ۱۳۲۶م

==xxxx====

مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر دین محمد تاثیر سے مولانا کے دوستانہ مراسم تھے
ان کی وفات پر سے متاثر ہوکر مولانا نے مندرجہ ذیل تاریخ کہی تھی :

بگڑ جاتی ہے بن بن کر الٰہی یہ کس سانچے میں ڈھالی بزم عالم

اجڑتا ہے بہر صورت مقدر اگر کچھ دن جمالی بزم عالم

حقیقت رفت با تاثیر و ماندہ است مجازی و خیالی بزم عالم

تہی بزم سخن ز افکار نادر ہم از اخلاق عالی بزم عالم

حسن تاریخ مرگش قادری گفت

کہ : " از تاثیر خالی بزم عالم " (۱)
۱۹۵۰ع

اکبر الہ آبادی کی وفات کے تقریباً تیس سال کے بعد " لسان العصر اکبر الہ آبادی
کی یاد میں ایک کتاب " لسان العصر " ہی کے نام سے شائع کرائی اس میں شعرائے
کرام کے منظوم خراج عقیدت کے علاوہ اکبر کے فکر و فن پر روشنی بھی ڈالی گئی تھی -
قادری صاحب سے بھی تاریخ کی فرمائش کی گئی۔ آپ نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ وفات
لکھ دیا جس کو لسان العصر میں سب سے پہلے درج کیا گیا ہے - (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " آثارالتواریخ " ، (مخطوطہ) ، مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری پسر مولانا قادری ، (لندن) ص ۳۵

(۲) حامد حسن قادری ، مولانا ، " جامع التواریخ " ، (مخطوطہ) ، مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری ، پسر مولانا قادری (لندن) ۔

تاریخ اکبر

یادگار حضرت اکبر الہ آبادی
۱۹۲۱ء

اب آہ کہاں وہ شوخیاں اکبر کی ۔۔۔ وہ طبع بہار جاودان اکبر کی

تاریخ از روئے بذلہ سنجی یہ ہوئی ۔۔۔ "جنت میں ہیں شوخ طبعیاں اکبر کی"

۱۹۱۹
۲ الف
۱۹۲۱ء

علامہ سیماب اکبر آبادی سے مولانا قادری کی ادبی چشمکیں اکثر رہتی تھیں مگر یہ دونوں حضرات اس قدر وسیع القلب اور وسیع النظر تھے کہ ایک دوسرے کا نہایت ادب و احترام کرتے تھے ۔ علامہ سیماب کے کلام پر مولانا نے بڑی بے لاگ تنقیدیں کیں اور جملہ معائب و محاسن دل کھول کر بیان کئے مگر کیا مجال کہ کبھی علامہ ان کے شاکی ہوئے ہوں یا ان کے خلوص و محبت میں کچھ کمی آئی ہو ۔ وہ اختلاف صرف شعر و سخن کی ہی حد تک تھا ، مشربات بھی ایک دوسرے کے بہت کچھ ملتے جلتے تھے اور نہایت ہی مخلصانہ مراسم تھے۔ علامہ سیماب کے انتقال پر ان کے صاحب زادے مظہر صدیقی نے مولینا سے تاریخ اور خصوصیت سے لوح مزار کی تاریخ کی فرمائش کی اس موقع پر مولانا کی کوشش و کاوش واقعی قابل دید و لائق ستائش ہے اس طرح کسی ادیب و شاعر کو خراج عقیدت وہی پیش کرسکتا ہے جو واقعی اس کی دل و جان سے قدر کرتا ہو ۔ تاریخیں مندرجہ ذیل ہیں :

ابر فراق و اشک غم
۱۹۵۱ء

" مرقد منور منزل راحت جاودانی علامہ سیماب اکبر آبادی
۱۹۵۱ء

۱ ۱ ۱

گئے جہاں سے کرکے جہاں کو بے تاب ۔۔۔ وہ کنز خوبی اخلاق حضرت سیماب

یہ قادری نے لکھا سال ارتحال ان کا کہ: " برگزیدۂ آفاق حضرت سیماب "
۱۹۵۱ء

۵ ۲ ۰

سیماب سے تھی محفل علم و ادب کی شان
ویران سی بزم شعر و سخن آج کل ہے کچھ

سیماب سا ملیح کا کہاں صاحب کمال ہم ان کا غم کریں تو یہ کیا بےمحل ہے کچھ

ہے قادری یہ سال وفات ان کا حسب حال

" اب آہ لطف شعر نہ حسن غزل ہے کچھ "
۱۹۵۱ء

۵ ۳ ۱

دے گیا داغ جدائی آخر	وہ معظم وہ مکرم سیماب
فخر علم و ادب استاد زبان	فن کے اسرار کا محرم سیماب
وہ مصنف، وہ سخنور، وہ مدیر	بانیٔ " شاعر " و " پرچم " سیماب
صاحب وحی کے اب قرب میں ہے	چھوڑ کر وحی مترجم سیماب
قادری لکھدو یہ تاریخ وفات	" شاعر اعظم سیماب " (۱) ۱۹۵۱ء

مولانا فضل الحسن، حسرت موہانی نے ۱۳ مئی، ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں وفات پائی - مولانا قادری نے ۱۴ مئی کو تاریخیں کہہ لیں اور ماہنامہ " آج کل " دہلی کو ارسال کردیں جس نے دو مہینے کے وقفے کے بعد جولائی، ۱۹۵۱ء میں اُن کو شائع کیا - تواریخ یہ تھیں :

---

(۱) یہ تیسرا قطعہ علامہ سیماب کے فرزند منظور صدیقی نے لوح مزار پر لکھوانے کے لیے منتخب کیا تھا اور یہی مزار پر کندہ بھی کیا گیا۔

تواریخ وفات مولانا حسرت موہانی

(۱)

حسرت شیدائے ملک ، ہر دل کو حبیب ـــــ ۱۳۷۰ھ
اک شاعر نکتہ سنج و نقاد و ادیب ـــــ ۱۳۷۰ھ

یارب گل زار خلد حسرت کو نصیب ـــــ ۱۹۵۱ء
ہو اپنے شوق شفیع محشر کے قریب ـــــ ۱۹۵۱ء

(۲)

اللہ باقی ، باقی فانی　　موت حقیقت زیست کہانی

جیسی دولت ویسی ہستی　　دھوپ اور چھاؤں آنی جانی

نقش برآب اس کو بھی سمجھو　　آخر زیر زمین ہے پانی

لیکن جس کی یاد ہے باقی　　اس کی ہستی جاویدانی

ایسے ہی تھے مولانا حسرت　　فخر بنی نوع انسانی

عزم میں پتھر، عجز میں مٹی　　جوش میں آگ، اخلاق میں پانی

شاعر ایسے ، نقاد ایسے　　بس ختم ان پر سحر بیانی

اس کے آگے نام اللہ کا　　ان کا تغزّل وہ لا ثانی

لطف، مزہ ، تاثیر اور جادو　　نشّہ فزائی بادہ چکانی

لوچ لچک نرمی شیرینی　　شبنم ریزی گل افشانی

بات یہی ہے سب نے سن لی　　اپنی کہانی ان کی زبانی

بات میں وہ لذّت تھی کہ سب نے　　اپنے دل کی بات ہی جانی

ملک کے شیدا قوم کے خادم　　ان کا بڑھاپا رشک جوانی

بے لوث ایسے، بے باک ایسے　　کر گزرے جو دل میں ٹھانی

باطل کے آگے نہ جھکا سر　　رعب نہ مانا بات نہ مانی

ایسے صفا آئین روشن دل — دن سے بڑھ کر شب نورانی

قادری ان کی مدح ہے مشکل — ان پر ہو فضل یزدانی

یوں شعر میں نکلے تاریخ — رہ جائے تیری یہ نشانی

سچے لیڈر ۔ ناقد شاعر = ۱۰۳۳

۹ +۱۰۳۳

مولانا حسرت موہانی = ۹۰۸ (۱)

+ ۹۰۸ = ۱۹۵۱ء

بہار خراسانی ایران کا ایک مشہور و معروف شاعر اور ملک الشعرا تھا۔ اس نے ۲۱ اپریل، ۱۹۵۱ء کو انتقال کیا۔ مولانا کو ویسے تو اس سے کوئی خاص انسیت نہیں تھی صرف بحیثیت ایک فارسی شاعر کے اس کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہی سبب تھا کہ انھوں نے کوشش کرکے بہار خراسانی کے حالات زندگی اور نمونہ کلام جمع کیا اور پھر ماہنامہ "آج کل" دھلی میں انھیں شائع بھی کرادیا ۔ مولانا کو چونکہ اقبال سے بڑی عقیدت تھی اگرہ میں بھی مولانا قادری ھی کی تحریک پر ڈاکٹر مولوی محمد طاھر فاروقی کی کوشش سے علامہ اقبال کی یادگار قائم کرنے کے لیے ۲ مئی ، ۱۹۳۸ء کو "بزم اقبال" کی بنیاد ڈالی گئی ۔ ھرسال یوم اقبال بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ "بزم اقبال" ھی کے زیر اھتمام اول ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر مولوی محمد طاھر فاروقی نے جامعہ اردو کا خاکہ تیار کیا اور ۱۹۳۹ء کو اس کی تشکیل عمل میں آئی ۔ اور اس طرح ھرسال ماہ نومبر میں ادیب ، ادیب ماھر اور ادیب کامل کے امتحانات مختلف شہروں اور ریاستوں میں منعقد ھوئے اور پھر ڈاکٹر مولوی محمد طاھر فاروقی نے یہ ادارہ جامعہ اردو ، علی گڑھ یونی ورسٹی میں ضم کردیا تاکہ لوگ مزید فیض اٹھا سکیں ۔ آج بھی یہ ادارہ علی گڑھ

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا "تواریخ وفات مولانا حسرت موہانی" ، "آج کل" (ماہنامہ) ، دھلی : جولائی ، ۱۹۵۱ء ، ص

میں جامعہ اردو کے نام سے ہرسال لاکھوں طالب علموں کو علوم سے بہرہور کر رہا ہے۔
اس ادارے نے اس زمانے میں کئی کتب بھی مثلاً حسرت موہانی(عبدالشکور) ایرانی افسانے، مولانا حامد حسن قادری، بزم اقبال (ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی) ، نئے پرانے چراغ، (آل احمد سرور) ، چند تنقیدیں (ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) وغیرہ بھی شائع کی تھیں۔

بہر کیف مولانا قادری " بزم اقبال" کے روح رواں تھے اور" بزم اقبال" کے سالانہ جلسوں یا اس موقع پر شائع کردہ کتب و رسائل سب میں ان کا مقالہ ضرور ہی شامل ہوتا جس سے ان کی اقبال دوستی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے -(۱)

بہار خراسانی کی بھی انھیں یہی اقبال دوستی پسند آئی اور اس عقیدت کی بنا پر انھوں نے اس کی تواریخ وفات کہہ کر اس کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس سلسلے میں مولانا خود لکھتے ہیں :

" مجھے بہار خراسانی سے کیا لینا دینا تھا۔ مگر کچھ تاریخ گوئی کا شوق اور خاص طور پر ایک واقعہ محرک ہوا۔ ۱۳ مئی، ۱۹۵۱ع کو اخبار میں بہار خراسانی کے انتقال کی خبر پڑھی ۔ اس میں لکھا تھا کہ " ملک الشعرا " کو اقبال سے بڑی محبت تھی ۔ ملک الشعرا کے انتقال سے پانچ روز پہلے ایک پاکستانی خواجہ عبدالحمید عرفانی ان کی عیادت کے لیے گئے اور کہا کہ ۲۱ اپریل کو ایران میں بھی اقبال کی برسی منائی جائے گی اس کے لیے آپ کچھ پیام دیجئے۔ ملک الشعرا نے مسکراکر کہا " اب کیا پیام؟ میں خود عنقریب اقبال کے پاس جاتا ہوں۔" چناں چہ ٹھیک اقبال کے انتقال کے دن ۲۱ اپریل کو ملک الشعرا نے بھی انتقال کیا۔ ملک الشعرا کے قول کا صادق آنا اور تاریخ وفات کا توارد مجھے بہت عجیب و دل چسپ معلوم ہوا۔" (۲)

---

(۱) طاہر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد " بزم اقبال" ، آگرہ : آگرہ اخبار پریس ۱۹۳۳ع ص ۷

(۲) حامد حسن قادری، مولانا " آثارالتواریخ"، محولہ بالا ، ص ۵۲

طلبہ کو تو اپنی کام یابی کی جیسی خوشی ہوتی ہے وہ ظاہر ہی ہے لیکن اساتذہ کو بھی ان کی کام یابی پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی اپنی ہی کام یابی ہے ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ایک مخلص و ہمدرد استاد طلبہ کے نتائج کے لیے بھی بڑا فکر مند رہتا ہے ۔ قادری صاحب بھی طلبہ کا نتیجہ نکلنے کا بڑی شدت سے انتظار کرتے تھے۔ آگرہ یونی ورسٹی نے ۱۹۵۰ء سے طلبہ کی سہولت کے پیش نظر یہ کام کیا کہ نتیجہ کا اعلان کرتے ہی اخبارات وغیرہ کو ان کی کاپیاں بھیجنے سے پہلے ایک ایک کاپی یونی ورسٹی کے نوٹس بورڈ پر بھی چسپاں کرنی شروع کردی ۔ قادری صاحب روز صبح ٹہلنے جاتے تھے اور عموماً یونی ورسٹی کے سامنے ہی پارک میں ٹہلا کرتے تھے ۔ ۱۹۵۰ء میں بھی انھیں نتیجہ ایک روز بعد اخبار سے معلوم ہوا لیکن ۱۹۵۱ء میں شام کو پتا چل گیا تو وہ صبح فجر کے بعد یونی ورسٹی پہنچ گئے ۔ لیکن سویرا تھا اس لیے یونی ورسٹی کا پھاٹک بند ملا۔ قادری صاحب اس سے بہت جز بز ہوئے اور فوراً آکر تاریخ کہہ ڈالی:

تاریخ نتیجہ

ہم پہنچیں ، یونی ورسٹی بھی پہنچیں	ہر نتیجہ نکل کے یاں سے چلے
ہم کو ہوگئی ہوئی نہ اب کے خبر	اپنی چندیں غفلتے سخت پہ بدلے
صبح کو ہوگیا رزلٹ آؤٹ	ظلم ہم کو ہوا چراغ جلے
صبح پہنچیں تو بند تھا پھاٹک	کہیں نہ کٹے ہوں جب نہ دال گلے
ہم چنیں پارسال واقعہ بود	سال ہم گفتہ بودم از مثلے

وہی غفلت ہے پھر وہی تاریخ

ہے اندھیرا وہی چراغ تلے

۱۹۵۱ء

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ؛ "آثارالتواریخ" ، محولہ بالا ، ص ۵۵

اتفاق سے ایک مرتبہ قادری صاحب کے ایک عزیز کے صاحب زادے نے امتحان میں ڈویژن حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کرکے بڑی محنت اور شوق و لگن سے پڑھا وہ فرسٹ ڈویژن کی امید لگائے بیٹھے تھے مگر فرسٹ کیا سیکنڈ بھی نہ آئی اور یہ چاری تھرڈ ہی رہ گئے ۔ بہت افسردہ ہوئے ۔ قادری صاحب نے ان کی اشک شوئی اور ہمت افزائی کے لیے بھی مندرجہ ذیل تاریخ کہی اور تاریخ کا عنوان بھی تھرڈ ڈویژن ہی رکھا ۔

تاریخ تھرڈ ڈویژن

کیا فکر ہے جو تھرڈ ہے ڈویژن	بے کار بیٹھیں نہ تائیے آپ
اتنا ہی تو کرا ملے گا	جتنا محنت سے چھانیے آپ
جا پڑھیں وہ اور آپ مجبور	وہ ممتحن امتحانیے آپ
ہے جور یہ ان کے صبر بہتر	کچھ اور نہ جی میں ٹھانیے آپ
کہئے " ثــالثہ ثلاثہ	والو تر کا فیض مانیے آپ
والتین[1] کہ خوب ہے یہ تاریخ	" ثالث بالخیر جانیے آپ"
	۱۹۵۱ء

==xxx===

مولانا چلتے پھرتے اور بات بات میں تاریخ کہنے کے عادی ہوگئے تھے ۔ ایک مرتبہ شام کے وقت کالج کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے گئے ابھی آدھے راستے میں تھے کہ چاروں طرف ابر چھاگیا ۔ قادری صاحب بہت گھبرائے کہ اگر بارش ہونے لگی تو کیا ہوگا؟ اتفاق کی بات کہ بارش شروع ہوگئی ۔ قادری صاحب بھیگتے ہوئے کالج پہنچے مگر ایک تاریخ بھی ساتھ تھی :

---

(۱) " والتین" سے تین کی قسم سے مراد لی ہے ۔

برس جائے تو کیا ہو ابر تو ہے   شوخی ہے وہی بارش میں چھتری

خوشی اس بھول کی رستے میں تاریخ   نہیں ہے آج ہی بارش میں چھتری

۱۳۷۰ھ

سینٹ جانس کالج آگرہ اپنے حسن کارکردگی کے سبب ہند کے بہترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے - اس کالج کا پراسپکٹس (Prospectus) ہے جس کی قیمت بیس برس پہلے ایک روپیہ ہوتی تھی ہر سال کم از کم دس پندرہ ہزار کی تعداد میں فروخت ہوجاتا تھا جب کہ داخلہ صرف ۲ ہزار طلبہ کو ملتا تھا۔ آگرہ اور بیرون آگرہ طالب علموں کی دلی خواہش ہوتی کہ کسی طرح اس کالج میں داخلہ مل جائے۔ اس کالج کے ایک سابق طالب علم نے کراچی سے ۱۹۵۱ء میں قادری صاحب سے کالج کا حال پوچھا - قادری صاحب نے کالج کا تاریخی حال یوں نظم بند کرکے ارسال کیا:

اور کالج نہیں کیا لڑکیوں لڑکوں کے لیے   ایک پر ایک جوان آکے گرا پڑتا ہے

اتنی سینٹ جانس میں کثرت ہے کہ تاریخ ہے یہ   "آج جوتوں کی طرح یہ بھی بکتا پڑتا ہے"

۱۳۷۰ھ

===XXX===

۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر شفا گوالیاری تلمیذ سیماب اکبر آبادی نے اپنا مجموعۂ کلام "آیات شفا" کے نام سے شائع کرایا اور قادری صاحب سے تاریخ کی فرمائش کی - اور مولانا نے مندرجہ ذیل تاریخ نکالی :

ہر غزل ہر شعر "آیات شفا"   آئینہ دار کمالات شفا

ہیں جو افکار شفا گنج گہر   مخزن اخلاق ہے ذات شفا

محفل شعر و سخن میں کیوں نہ ہو   ضو فگن مصباح مشکات شفا

درد دل بھی ہے دوائے درد بھی   کہئے اس کو بھی کرامات شفا

کہئے اک تاریخ اس کی قادری   حرزِ جان اوراقِ آیاتِ شفا (۱)
۱۳۷۰ھ

===xxx====

قادری صاحب آگرہ یونی ورسٹی کے فارسی بورڈ کے چیرمین تھے لیکن ہمیشہ خود کو ممبر ہی ظاہر کرتے تھے اس بورڈ میں سات ممبران اور تھے۔ فارسی و اردو بورڈ کے جلسے اکثر آگرہ یونی ورسٹی میں ہی ہوا کرتے تھے یہ سب " یاران مے کدہ " کی اصطلاح سے یاد کئے جاتے تھے۔ ۳ مارچ ، ۱۹۵۲ء کو آگرہ میں یہ جلسہ پھر ہوا اس سلسلے میں قادری صاحب لکھتے ہیں :

" آگرہ یونی ورسٹی کے فارسی و اردو بورڈ کے سالانہ جلسے تھے - فارسی بورڈ کے سات ممبر تھے جن میں ایک میں تھا۔ باقی چھ ممبر میرے مہمان تھے۔ ان میں اقبال احمد سہیل (اعظم گڑھ) ، شوکت سلطان (اعظم گڑھ) ، خواجہ عبدالواجد (کان پور) ، عبدالرحمن (گورکھپور) ، خلیق احمد (دہلی) ، معین الدین حسن (اجمیر) اور ان کے علاوہ اردو بورڈ کے ممبر آل احمد سرور ریڈر لکھنؤ یونی ورسٹی بھی شامل تھے۔

دو روز ان احباب سے بڑی پر لطف صحبت رہی۔ جس میں یہ بات قابل تذکرہ ہے کہ اقبال احمد خاں صاحب سہیل کو اپنا کلام سنانے کا اس قدر بے پناہ شوق ہے کہ یونی ورسٹی میں پہلی ملاقات اچھی طرح ہونے بھی نہ پائی تھی کہ انھوں نے تانگے کے پاس کھڑے ہوکر اپنا فارسی قصیدہ سنانا شروع کردیا اور پھر جلسے سے مکان پر آکر جو اپنا کلام سنانا شروع کیا تو شام کے ۳ بجادیے اور پھر رات میں ۱۱ بجے تک سناتے رہے - دل چسپ بات یہ ہے کہ اپنا سارا دیوان و کلیات نوک زبان پر رکھتے ہیں بے تکان حفظ پڑھتے چلے جاتے ہیں نہ خود دم لیتے ہیں اور نہ دوسروں کو سانس لینے دیتے ہیں۔پروفیسر خلیق احمد صاحب نے دہلی واپس جاکر مجھ سے قطعۂ تاریخ کی فرمائش کی تھی"۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ؛ " آثار التواریخ "، محولہ بالا ، ص ۹۲

قطعہ حسب ذیل ہے :

تواریخ
قطعۂ مستان
۱۹۵۲ع

شعر و سخن کو ہے کدہ سمجھو جو قادری
ہم بار ہے جماعت یارا ن ہے کدہ

سب سے زیادہ ہے کدہ آشام ہیں سہیل سوجھو انھیں امامت یاران ہے کدہ
ڈوبا ہوا سرور ادب میں جو ایک ہے تو ایک سے ہے شوکت یاران ہے کدہ
یار خلیق ایک تو اک ہے معین بزم اک خواجۂ کرامت یاران ہے کدہ
رندی میں آملا ہے جو اک بندۂ خدا (۱) " فل بینچ " ہے عدالت یاران ہے کدہ
اس بزم کی جو چاہئے تاریخ قادری تو : " بوستان الفت یاران ہے کدہ "
۱۳۷۱ھ

یاروں کا وصف اک اور بھی تاریخ میں سنو
" معنی شعلس "، " خلّت یاران ہے کدہ " (۲)
۱۳۷۱ھ + ۵۸۱
۱۹۵۲ع

اس تاریخ کے ساتھ ہی قادری صاحب نے ایک اور شعر بھی مع عنوان تاریخ کے پروفیسر خلیق احمد صاحب کی خدمت میں ارسال کیا جو یہ تھا :

تاریخ خبط مکمل
۱۹۵۲ع

تاریخ یہ ان کی شعر خوانی پہ سجی " دیکھا وہ تھا اس کمال کا خبط اچھی "
۱۳۷۱ھ

اس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے کہ جامعۂ اردو کی بنیاد آگرہ میں " بزم اقبال " کے تحت اس کے معتمد اعزازی پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی نے ڈالی اور اس کے بعد یہ ادارہ پروفیسر ظہیرالدین علوی صاحب کے سپرد کردیا گیا جو علی گڑھ منتقل ہوگیا اور آج

---

(۱) " اک بندۂ خدا " سے " پروفیسر عبدالرحمن " مراد ہیں۔
(۲) حامد حسن قادری، مولانا " آثارالتواریخ "، محولہ بالا، ص: ۹۷

بڑی شان و شوکت سے چل رہا ہے ۔ ۱۹۵۲ء میں اس امتحان میں ہزار طالب علم شریک ہوئے اور اس کے بعد سے روز بروز طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ۱۹۵۲ء میں جب اس میں ایک ہزار طلبہ شریک ہوئے تو پروفیسر خواجہ ظہیرالدین علوی صاحب نے یہ خوش خبری قادری صاحب کو بھی سنائی ۔ اس موقع پر قادری صاحب نے جو تاریخیں نظم کیں یہ ہیں: (۱)

مآثر تاریخ

۱۹۵۲ء

ترقی آفاق گیر امتحان جامعہ اردو

۱۹۵۲ء

بعون اللہ جل شانہ ، و بدلیل سعی شکور

۱۳۷۱ھ

جلیل القدر جناب ظہیرالدین صاحب علوی ایم اے ۔ ایل ایل بی

۱۹۵۲ء

پروفیسر رجسٹرار جامعہ اردو

۱۹۵۲ء

۱۱۱

مردان چو عزم کار بفکر ازین کنند امداد غیب آید و فتح مبین کنند

علوی ظہیر جامعہ اردو آمدہ خلقش ہمہ ستائش عزم متین کنند

از سعی علوی اردو ما گشت سربلند ہم اہل عرش فخر بر اہل زمین کنند

درامتحان جامعہ پرسعیش اہل علم تحسین کنند ، مدح کنند ، آفرین کنند

امسال اگر ہزار نمودند شرکتش سال دگر بعون خدا بیش ازین کند

شاید بر او کنند گل تہنیت نثار باید ہمہ پر از گہرش آستین کنند

با "عز و جاہ" قادری این سال و فال زد

+۹۲

"این کار از تو آید و مردان چنین کنند"

۱۳۷۱ھ = ۹۲ + ۱۲۷۹

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا "آثارالتواریخ" ، محولہ بالا ، ص ۹۸

۱۲۱

کیے جا خدمت اردو کیے جا — سمند غم کو طوفی نہ ٹھہرا

رہا محروم ساحل پر رہا جو — وہ اترا پار جو دریا میں تیرا

گل و سنبل ہیں باغ جامعہ کے — تری ایک ایک سطر ایک ایک بیرا

جہاں میں امتحان اردو کے پھیلا — بگردش آر این مجاد و بے را

یہ تاریخ و دعا "الہام" سے ہے
۷۷

"جزاک اللہ فی الدارین خیرا"
۱۲۹۳ + ۷۷ = ۱۳۷۱ھ

مولانا قادری نے اس بات کا ذکر خود بھی کیا ہے اکثر باتیں خواہ وہ ان سے متعلق ہوں یا نہ ہوں اور خواہ وہ ہندوستان کی ہوں یا پاکستان کی یا کسی اور ملک کی ان سے متاثر ہوکر بھی وہ تاریخیں کہہ دیا کرتے تھے۔ -

۱۴ جولائی، ۱۹۵۱ع کے انگریزی اخبار "اسٹیٹسمین" میں ایک عجیب حادثے کی خبر شائع ہوئی - خبر یہ تھی کہ گذشتہ روز آسٹریلیا میں ایک لاری جارہی تھی - پیچھے سے ایک موٹر سائیکل لاری کے برابر سے گذری تو اتفاق سے اسی وقت لاری پر سے ایک لوہے کی چادر اڑی اور اس نے موٹر سائیکل سوار کی گردن اڑادی - سائیکل بغیر سر کے سوار کو لے کر بڑھی تو ایک عورت اور بچے سے ٹکرائی۔ لاری کے ڈرائیور کی نظر جب بے سر کے سوار پر پڑی تو دہشت کے مارے فوراً ہی اس کا بھی دم نکل گیا اور بے ڈرائیور کی لاری بھی ایک مکان سے جا ٹکرائی -

اس موقع کی مناسبت سے مولانا قادری نے جو تاریخیں نکالیں یہ ہیں :

یہی ہے سلسلۂ حادثات عالم عبرت
۱۹۵۲ع

عبرت خانہ ہے دنیا بھی
۱۳۷۱ھ

۱۹۵۲ء کو موسم گرما کی تعطیلات میں مولانا قادری حضرت شیخ سلیم چشتی کے مزار شریف پر فتح پور سیکری گئے وہاں حوض میں نہاتے وقت کمر میں جھٹکا آگیا اس واقعہ کو خود " آثارالتواریخ" میں اپنی تاریخ کے عنوان سے یوں درج کیا ہے :

" ۲۸ جون، ۱۹۵۲ء کو فتح پور میں نہاتے میں میری کمر میں ایسا سخت جھٹکا آیا کہ تقریباً بیس دن میں کمر ٹھیک ہوئی دو آدمی میرا پلنگ صبح و شام اٹھاتے رہے -

واہ ری اتفاق واہ ری بخت	پڑ گئے ہم پلنگ پر یک لخت
بیس دن تک رہے" پلنگ سوار"	تھی کمر تختہ یہ تھا اپنا تخت

اس کی تاریخ قادری لکھ دو

" جھٹکا آیا کمر میں کیسا سخت" (۱)

۱۹۵۲ء

۱۹۵۳ء میں پروفیسر ظہیرالدین علوی صاحب رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ نے طلبہ کے افادے کے لیے ماھنامہ " درس" کا اجراء کیا اور اس موقع پر قادری صاحب سے بھی تاریخ کی فرمائش کی - مولانا نے مندرجہ ذیل دو تاریخیں نکال کر ارسال کیں :

(۱)

ظہیر الدین علوی ھنر ور	پئے تعلیم جاری " درس" کردہ
بتاریخ اشاعت قادری گفت	نہال علم در دل غرس کردہ

۱۹۵۳ء

(۲)

جاری شدہ ماھنامہ " درس "	این راہ نمائے علم و فضل است
تاریخ اشاعت و بنایش	" درس طلبائے علم و فضل" است

۱۳۷۲ھ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " آثار التواریخ "، محولہ بالا ، ص ۱۰۳

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (سابق صدر جمہوریۂ ہند) جس زمانے میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے عربی سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب شعبۂ نباتات کی ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے ان سے عرض کیا گیا تو کہاگیا تو انھوں نے مولانا قادری کو آگرہ لکھا "کہ آپ عربی میں کوئی ایسی تاریخ نکالیں جس میں نباتات کا کچھ حوالہ ہو یا ان کا نام ہو"۔ قادری صاحب نے اس موقع پر دو تاریخیں نکالیں جس میں آسان عربی والی منتخب کرلی گئی ۔ تاریخیں یہ تھیں :(۱)

۱ ۱ ۱

هوالخالق الباری فالق الحب و النوی
۱۳۷۲ھ

اسس بید السامی داکتر ذاکر حسین
۱۹۵۳ع

۱۹۵۳ء میں ہی خواجہ احمد فاروقی صاحب کو دو فضلیتیں ملیں ایک تو یہ کہ پی ایچ ڈی ہوئے ۔ دوسری یہ کہ دہلی یونی ورسٹی میں ریڈر کے منصب پر فائز ہوئے قادری صاحب نے دونوں کی تاریخیں " آثارالتواریخ " میں بھی تحریر کی ہیں :

تاریخ ڈاکٹری

۱ ۱ ۱

ہزار شکر کہ پی ایچ ڈی ہوئے خواجہ بڑا صلہ ہے بڑی نعمت خدائے احد
یہ فی‌البدیہہ کہی قادری نے بھی تاریخ کہ :" ڈاکٹر ہوئے کیا خوب خواجہ احمد"
۱۹۵۳ع

۱ ۲ ۱

تاریخ ریڈری

نکلا نام اور کام نکلا آئی کیا خوب ریڈری ہاتھ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " آثارالتواریخ "، محولہ بالا ، ص: ۱۳۶

تاریخ بھی لو یہ خواجۂ احمد "خرما و ثواب دونوں ہیں ساتھ"
۱۹۵۴ء

==xxx===

تاریخ گوئی کی ایک صنعت جو بہت مشکل اور دقت طلب ہے "صنعت دائرہ" کہلاتی ہے - یہ ایک ایسی عجیب صنعت ہے جس سے بے شمار تاریخیں نکلتی ہیں۔ عام طور پر دائرہ آٹھ خانوں کا ہوتا ہے لیکن خلّاق تاریخ نگاروں نے زیادہ خانوں کے دائرے بھی بنائے ہیں۔ مولانا قادری نے علامہ سیماب اکبر آبادی کی وفات پر سن عیسوی اور سن ہجری کے لحاظ سے صنعت دائرہ میں چودہ چودہ خانوں کے دائروں میں تاریخیں کہی ہیں جو ان کی جودت و جدّت طبع کا مظہر ہیں۔ ان دونوں دائروں سے متعدد تاریخیں پیدا ہوتی ہیں ملاحظہ ہو:

(سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹۰)

مجمع تواریخ

۱۳ ھ ۷۰

انتقالِ پُرملال یگانۂ آفاق علامہ سیماب اکبرآبادی

۱۹ ۶ ۵۱
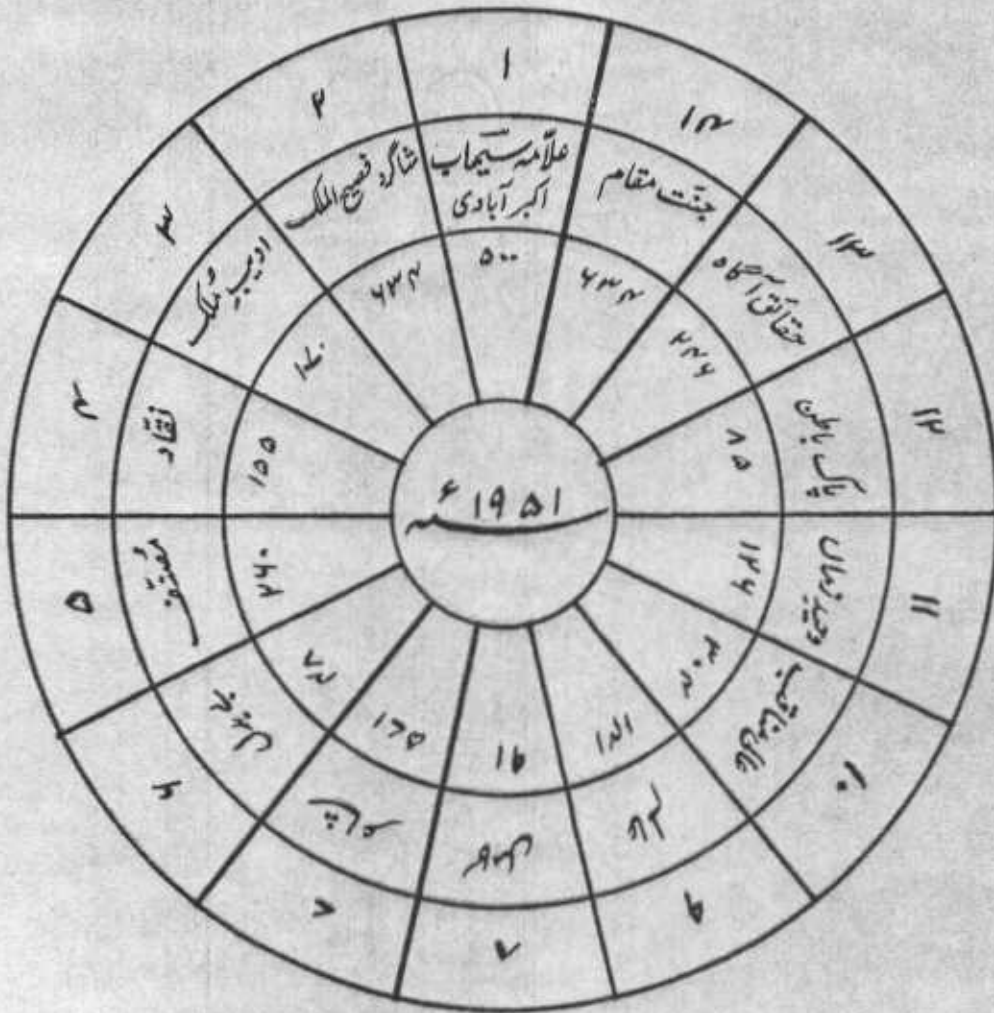
قاعدۂ استخراجِ تواریخ :-

دائرہ کے ۱۴ خانوں میں سے جس خانے سے چاہیں شروع کریں اور جس قدر چاہیں شمار کریں (بجز ۱ ، ۲ ، ۳ کے اور بجز ۱۴ اور اس کے اضعاف کے اور بجز ۱۵ کے) یعنی ۴ سے ۱۳ تک اور سولہ سے سینکڑوں ہزاروں تک شمار کرسکتے ہیں صرف ان اعداد کو چھوڑنا ہوگا جو ۱۴ پر پورے تقسیم ہوجائیں اور صرف ۱۵ کو چھوڑا جائے گا - اس کے اضعاف کو نہیں چھوڑا جائے گا - جس خانے پر شمار تمام ہو اس خانے کا لفظ و اعداد

لکھ لیں اب جو عدد شمار کے لیے مقرر کیا ہے وہ اگر طاق ہو تو خانۂ انتہا کو خانۂ ابتدا قرار دے کر اسی طرح شمار کرتے رہیں یہاں تک کہ سب سے پہلے خانۂ ابتدا پر انتہا ہوجائے ۔ اس کے بعد شمار ختم کریں ۔ اب ان سب اعداد کو جمع کرلیں ہمیشہ ان کا مجموعہ ۱۹۵۱ء ہوگا اور اگر وہ عدد جو شمار کے لیے مقرر کیا ہے جفت ہو تو شمار اول جس خانے پر ختم ہو اس کے بعد کے خانے سے دوسرا شمار شروع کریں اور اسی طرح شمار کرتے رہیں ۔ یہاں تک کہ ابتدائے اصلی کے خانے سے ایک خانہ قبل پر انتہا ہوجائے۔ اس کے بعد شمار ختم کریں ان سب اعداد کا مجموعہ بھی وہی ۱۹۵۱ء ہوگا۔ البتہ ہر تعداد کے شمار میں صرف سات مرتبہ شمار کرنا پڑے گا۔(۱)

ا۔ مثال :

۵ تک شمار کریں اور خانہ نمبر ۱۱ سے شروع کریں تو آگے کی طرف گننے سے :

۱۔ ۵ کا شمار خانہ نمبر ۱ پر ختم ہوگا اس کے الفاظ و اعداد یہیں — علامہ سہاب اکبر آبادی ۵۰۰

۲۔ دوبارہ خانہ نمبر۱ سے ۵ تک شمار کرکے لکھیں مصنف ۲۶۰

۳۔ تیسری بار مصنف والے خانے سے ۵ تک گن کر لکھیں — عالم ۱۳۱

۴۔ چوتھی بار عالم والے خانے سے شمار کرکے لکھیں — حقائق آگاہ ۲۳۶

۵۔ پانچویں بار اسی طرح شمار کرکے لکھیں — ادیب ملک ۱۰۷

۶۔ چھٹی بار اسی طرح ادیب ملک والے خانے سے گن کر لکھیں — شاعر ۵۷۱

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " آثارالتواریخ "، محولہ بالا، ص: ۳۳

۷- ساتویں بار ۵ کا شمار خانہ نمبر ۱۱
پر ختم ہوگا جس سے شروع کیا تھا وحید زمان ۱۲۲

۱۹۵۱ء

===xxx====

۲- مثال :

جفت عدد ۱۲ تک اور پہلے نمبر کے خانے سے شروع کریں تو پہلا شمار ۱۲ تک خانہ نمبر ۱۲ پر تمام ہوگا :

۱- پہلے شمار کے الفاظ و اعداد	پاک باطن	۸۵
۲- دوسرا شمار خانہ ۱۲ کو چھوڑ کر ۱۳ سے شروع کریں -	عالی مناقب	۳۰۲
۳- تیسرا شمار عالی مناقب والے خانے کے بعد کے خانے سے شروع ہوگا	کامل	۹۱
۴- چوتھا شمار اسی طرح کامل کے بعد سے ۱۲ تک -	بے بدل	۳۸
۵- پانچواں شمار بے بدل کے بعد سے	نقاد	۱۵۵
۶- چھٹا شمار اسی طرح	شاگرد فصیح الملک	۲۳۳
۷- ساتواں شمار ۱۲ تک پہلے خانۂ آغاز سے ایک خانہ قبل پر ختم ہوگا-"(۱)	جنّت مقام	۲۳۲

۱۹۵۱ء

فن تاریخ گوئی کی مختلف صنعتوں میں مولانا قادری کی تاریخیں دیکھ کر اس فن میں ان کی مہارت تامہ اور قدرت و کمال فن کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے - ذیل میں ہم علامہ سیماب ہی کے لیے نکالی گئی ان کی ایک اور تاریخ جو انھوں نے صنعت دائرہ ہی میں سن ہجری کے اعتبار سے نکالی ہے اور اس سے بھی بہت سی تاریخیں نکلتی ہیں پیش کرتے ہیں :

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " آثارالتاریخ "، محولہ بالا، ص ۳۳

شیلی، گرے، بائرن اور لارڈ چیسٹر، فیلڈ اور چارلس لیمب ہیں۔ ان لوگوں کے خطوط میں انسان دوستی کے جذبات بڑی حد تک نمایاں ہیں۔

ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگاری کا باقاعدہ آغاز روم میں سسرو نے کیا۔ پھر انگلستان نے اس طرف توجہ دی - یہاں خطوط نگاری کا آغاز اطالوی زبان کے خطوط کے ترجموں سے ہوا۔ ان حضرات کے علاوہ ایک خاتون" میری ارٹلے مانٹیگ " نے بھی اپنی بیٹی کے نام نہایت دل چسپ و نصیحت آمیز خطوط لکھے ہیں۔ فرانسیسی میں والٹیر وغیرہ کے خطوط بھی نثر کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان خطوط نگاروں میں ان کے خطوط زیادہ دل کش و موثر ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا ہی علم و ادب تھا یا جو عملی زندگی سے کسی حد تک آشنا و باخبر تھے۔

چوں کہ مکتوب نگاری ایک آسان صنف ادب ہے اس لیے ہر زبان میں یہ ادب ملتا ہے ہمارا مقالہ اس مقالے میں صرف اردو خطوط نویسی کے آغاز و ارتقا پر بحث کرتا ہے مگر اردو و فارسی سے متاثر ہے اور فارسی پر عربی کا اثر ہے اس لیے عربی و فارسی میں فن مکتوب نگاری کے ابتدائی وارتقائی مدارج کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے -

اسلام کے عروج کے زمانے میں اس فن نے بہت ترقی کی - حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کے زمانۂ نبوت ہی میں خطوط کی ترتیب کا کام شروع ہوگیا تھا - غیر مسلم ممالک کے فرمانرواؤں کو دعوت اسلام کے سلسلے میں جو خطوط بھیجے جاتے انہیں انشاء پردازی میں مہارت رکھنے والے صحابۂ کرام ترتیب دیتے اور وہی ان کی حفاظت بھی کرتے - حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کی اہمیت اور بڑھتی ہوئی ضرورت کو محسوس فرماتے ہوئے ایک مستقل محکمۂ انشا قائم کیا۔ خلافت امیّہ اور خلافت عبّاسیہ دونوں نے اس محکمے میں توسیع کی اور ساتھ ساتھ فن خطوط نویسی کو وہ ترقی دی جو اس سے

پہلے اسے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ حکومت کی طرف سے خط لکھنا ایک مستقل اور اہم فن کی شکل اختیار کرگیا جسے حاصل کرنے کے لیے لوگ برسوں مشق کرتے اور مہارت بہم پہنچاتے تھے۔ مکتوب نگاری کے فن کو عام کرنے کے لیے بلند پایہ انشا پردازوں کے خطوط کے مجموعے شائع کیے گئے - مکتوب نگاری کے فن پر مستقل تصانیف مہیا کی گئیں ، علمی طور پر خطوط کی تعریف کی جانے لگی ان کی قسمیں مقرر ہوئیں مثلاً تہنیتی خطوط، تعزیتی خطوط ، تنبیہی خطوط ، فاصحانہ خطوط ، وغیرہ اور ہرقسم کے خطوط کے لیے ایک خاص طرز و اسلوب مقرر کیا گیا۔ اس طرح بہت سے بلند پایہ عربی انشا پردازوں و مکتوب نگاروں کے مکاتیب آج بھی عربی ادب کے خزانہ میں محفوظ ہیں۔

جب بغداد پر زوال آیا۔ خلافت عباسیہ کا دور دورہ ختم ہوا۔ تاتاریوں کی حکومت ہوئی اور پھر الہند میں مغلوں کا پھریرا لہرانے لگا تو اس زمانے میں عربی بجائے فارسی سرکاری و دفتری زبان بن گئی - یہ عجیب بات ہے کہ فارسی خطوط نگاری کو ایران و فارس سے کہیں زیادہ ہندوستان میں عروج ہوا۔ مکاتیب کے وہ مجموعے جو فارسی ادب میں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں وہ ایران کے بجائے ہندوستان میں تخلیق کیے گئے ان میں حکومت کے رقعات کے علاوہ صوفیاء ، علماء اور دوسرے دانشوروں کے بہت سے نجی خطوط بھی شامل ہیں۔ دوسرے لوگوں کے رقعات میں بھی حکومت کے رقعات کی چھاپ ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مکتبوں اور مدرسوں میں حکومت کے ہی رقعات پڑھائے جاتے تھے اس وجہ سے ذہن میں وہی طرز و اسلوب رچ بس گیا۔

فارسی زبان سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تہذیب و ثقافت پر چھائی رہی - عام طور پر خط و کتابت فارسی ہی میں ہوا کرتی تھی - یہی وجہ ہے کہ فارسی میں خطوط و رقعات کے بہت سے مجموعے موجود ہیں۔ اردو خطوط نگاری میں بھی ابتدا اسی فارسی طرز پر

اسلوب کی تقلید و پیروی کی گئی -

فارسی خطوط کے سلسلے میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ان کی نشو و نما حکومت کی آغوش میں ہوئی تھی - حکومت کی طرف سے جو خطوط لکھے جاتے تھے ان میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ سب سے پہلی بات جس کا شاہی انشاپردازوں کو خصوصیت سے خیال رکھنا پڑتا تھا۔ یہ تھی کہ خط میں اول تا آخر رکھ رکھاؤ باقی رہے کوئی حرف ایسا نہ ہو جس سے حکومت کی آن بان اور شان و شوکت پر کوئی حرف آئے - حکومت کی کوئی بھی کمزوری خاص مکتوب الیہ پر ظاہر نہ ہونے پائے جس سے اس کو یہ احساس نہ ہوپائے کہ حکومت کی نظر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے - مزید برآں انشا پردازی نے بھی اپنے علمی و ادبی جوہر ظاہر کرنے اور اشہب قلم کی جولانیاں دکھانے کے لیے مکتوب نگاری ہی کو جولان گاہ بنایا - مقفا و مسجع عبارت و فقروں اور تشبیہوں و استعاروں کی بھرمار کے سبب مکتوب نگاری میں ژولیدگی و پیچیدگی اور تکلف و تصنع در آیا۔ اور وہ سادگی و برجستگی نہ رہی جو اس صنف کے لیے لازمی ہے -

شاہی مکتوبات میں القاظ و آداب کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی اور وہ بھی بہت طول طویل لکھے جاتے تھے - نجی خطوط میں بھی ہر رشتہ دار اور ہر حیثیت کے ملنے والے کے لیے جدا جدا القاب مقرر تھے۔ انشا پرداز ان میں بھی اپنی جدت طبع کے جوہر دکھائے بغیر نہ رہتے تھے۔ مکتوبات کے ان مجموعوں میں "مکتوبات امام ربانی" غیر معمولی علمی و ادبی اور دینی و معاشرتی اہمیت کے آئینہ دار ہیں۔ "رقعات عالم گیری" سے بھی بہت سی سیاسی و معاشرتی باتوں کا علم ہوتا ہے - دیگر مکتوبات میں " پنج رقعہ"، رقعات ابوالفضل"، " انشا مادھورام" اور " بہار عجم" وغیرہ سر فہرست ہیں۔ رقعات و مکتوبات کے یہ مجموعے عرصے تک مکتبوں اور مدرسوں میں طلبہ کے نصاب میں شامل رہے

اور جب تک خط و کتابت فارسی میں جاری رہی اس میں ان کا رنگ صاف جھلکتا رہا اور جب اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز ہوا۔ تب بھی ان کا اثر ان میں نمایاں رہا۔

اردو میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے ۔ انھوں نے ہی اردو خطوط نویسی کی دنیا کو بدلا ۔ غالب کے زمانے میں خط و کتابت عموماً فارسی میں ہوتی تھی۔ اردو میں اس فن کا فارسی کی بیروی کے بغیر پروان چڑھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اردو کے شعراء و ادبا نے جس طرح دوسری اصناف سخن اور اصناف ادب سے استفادہ کیا تھا خطوط نگاری میں بھی اس سے فیض حاصل کیا۔ مگر فارسی کی تقلید کا اثر اردو خطوط نگاری پر یہ ہوا کہ اس میں بھی وہی مشکل پسندی اور عبارت آرائی در آئی ۔ جو فارسی کا طرۂ امتیاز تھی۔ اردو خطوط نویسی کے ابتدائی دور میں وہی صنائع بدائع کی کثرت، مقفا و مسجع عبارت کی بہتات اور تشبیہات کی بھرمار نظر آتی ہے ۔ جس کے بیشتر نمونے " انشائے خرد افروز" ،"رقعات عنایت علی" اور " انشائے سرور" میں نظر آتے ہیں۔

غالب اگرچہ اردو خطوط نویسی کی نئی طرز کے موجد و بانی ہیں لیکن ان کے دوست اور ہم عصر بھی اکثر اسی قسم کے خطوط لکھا کرتے تھے جن کے القاب و آداب نہایت پر تکلف و پر تصنع ہوتے تھے۔ مولوی غلام امام شہید اور خواجہ غلام غوث بیخبر ، وغیرہ کے خطوط میں یہی طرز و اسلوب نظر آتا ہے ۔ اس دور میں اگرچہ یہ طرز پسندیدہ و مستحسن تھا۔ مگر وہ لوگ زندگی کو بہت دور سے دیکھتے تھے اور اس کے عملی پہلوؤں کو نظر انداز کرجاتے تھے ۔ غالب کے دوستوں اور احباب میں بھی یہ روش عام تھی۔

چناں چہ غلام امام شہید اور خواجہ غلام غوث بے خبر جو غالب کے قریبی دوستوں میں تھے ان کے خطوط میں یہی طرز اسلوب نظر آتا ہے ۔ نمونے کے طور پر ہم ذیل میں مولوی غلام امام شہید اور خواجہ غلام غوث بے خبر کے خطوط پیش کرتے ہیں تاکہ غالب سے پہلے اردو

خطوط نویسی کا جو طرز و اسلوب تھا وہ بخوبی نمایاں ہوسکے۔

مولوی غلام امام شہید اپنے ایک دوست کے والد کی وفات اور اس کی شادی کے موقع پر لکھتے ہیں :

" مجموعہ انشا شہیں زبانی دیباچہ کتاب سخن معانی زاد حشمتہ ،

غم التشریح مراتب اشتیاق و آرزو مندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے اور کچھ خوشی میں آکر مبارک باد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔

زمانہ میں خوشی و غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ساتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے ۔ تقدیر نے صبح کو اگر لباس سفید خوشی کا پہنایا تو شام کے واسطے جامہ سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اسی گردش لیل و نہار نے خزاں و بہار کا تماشہ دکھایا۔ اور اس غم نے جتنا رلایا تھا۔ آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا۔ اس افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے نظر آیا تو شفق کی سرخی نے وہیں خوشی کلرنگ بھی دکھایا۔ رنج میں دو ہتتڑ جو پہلے منھ پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اٹھاکر یہ دعا مانگی کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مبارک ہو ۔ بندہ بھی ادائے رسم فاتحہ خوانی و شرکت محفل شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہوگا۔"

والسلام " (۱)

مولوی صاحب نے اس خط میں تعزیت و تہنیت کا مضمون لکھا ہے اس مضمون کو انسانی جذبات سے قریب رہ کر بات چیت کے طرز میں بھی لکھا جاسکتا تھا لیکن وہ اپنے زمانے کے خاص انداز میں لکھنے کے پابند تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ عبارت کی رنگینی و قافیہ پیمائی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اس طرح انسانی جذبات پر تکلفات کے پردے پڑے رہے ۔ ایک

---

(۱) شمس الرحمن(مرتب) ، " اردو خطوط نویسی"، دہلی: آزاد پریس ۱۹۴۷ء ، ص: ۲۵-۲۳

خاص بات یہ کہ خوشی و غم کے ساتھ ساتھ پائے جانے کا ذکر کرکے مضمون تعزیت کی اہمیت کو گھٹادیا۔ اور شادی مرگ کو برابر کا حصہ دیا۔ حالاں کہ خط لکھنے کا خاص سبب صرف تعزیت پدر تھی نہ کہ شادی پسر -

اب خواجہ غلام غوث بے خبر کا خط ملاحظہ ہو جو انھوں نے مرثی غلام امام شہید کے دیوان کا دیباچہ لکھنے کے بعد ان کو لکھا ہے :

" قبلہ میری شوخی دیکھیے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گل زار میں پھول لے جاتا ہوں، خُتن میں مشک تحفہ پہنچتا ہوں یعنی حضرت کا دیوان مرتب کرکے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں ..... میں نے اس کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کیا ایسی بات تھی جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں ہو ..... مگر چوں کہ غلبۂ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال نہیں ہوتاکہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ دیباچہ لکھ ڈالا - وہ اس کے قابل کا ہے کو ہے - آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزے کا آویزہ لگا ہو، زربفت کی قبا میں چھینٹ کا حاشیہ لگا ہو ..... مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے - بد صورت کے مقابلے میں حسین کے حسن کو اور رونق ہوتی ہے ..... خاطر مشکل پسند کرے تو ہوسکتا ہے - بے شک دیکھنے والوں کو اس کی برائی سے اس کی خوبی زیادہ نظر آئے گی - میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو - اس کے لیے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت حاصل ہو -" (۱)

بے خبر کے اس خط کا انداز بھی گذشتہ خط کی مانند ہے - اس خط میں القاب و آداب کا نہ ہونا غالب کا اثر معلوم ہوتا ہے - بے خبر غالب کے ہم عصر تھے مگر

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "داستان تاریخ اردو"، کراچی : ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۶ء، ص ۳۷۵

ان سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن غالب ان کا بیحد احترام کرتے تھے اور خطوط میں ہر خط کو " قبلہ" و " مولانا" لکھا کرتے تھے۔ ان کی سخن گوئی کے بھی ایسے مداح و معترف تھے کہ ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" رام پور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے ! ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرز اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ دوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا، وہ تم بروئے کار لائے، خدا تم کو سلامت رکھے۔" (۱)

غالب سے پہلے خطوط میں ایک عام بات یہ بھی تھی کہ بہت سی ادھر ادھر کی باتوں کو ملا جلا کر بیان کردیا جاتا تھا۔ جس میں کوئی ترتیب نہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات نصف خط القاب و آداب خیر گوئی اور خیر طلبی کی باتوں میں ہی ختم ہوجاتا تھا اس کے بعد " دیگر احوال یہ ہے " کے بعد خط میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی تھیں۔ جو آج کے اس دور میں ذوق سلیم پر گران گذرتی ہیں۔ اس میں سے بعض باتیں غالب کے بعد بھی زندہ رہیں البتہ مشکل پسندی سے اجتناب کیا جانے لگا۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی اپنے ایک پرانے طرز کے خط میں رقم طراز ہیں :

" بخدمت برادر مکرم و معظم حضرت سید حسن علی شاہ
زید مجدکم
بعد ادائے آداب گذارش ہے کہ یہاں پر خیرت ہے اور خیر و عافیت آں جناب کی درگاہ الٰہی سے نیک مطلوب ہیں ۔ غرض یہ ہے کہ آپ کا خط نہیں آیا ۔ نہایت فکر ہے ....

المرقوم ۸ ربیع الاول ، ۱۳۱۲ھ" (۲)

---

(۱) " عود ہندی"، بحوالہ حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۲۷۳

(۲) شمس الرحمن، " اردو خطوط"، محولہ بالا، ص ۲۷

ملا رموزی نے اپنے مخصوص انداز میں قدیم طرز خطوط نگاری کا مضحکہ یوں اڑایا ہے :

" امید کہ آں محترم مع الخیر ہوں گے - اور اس طرف بھی سردی کم ہوگئی - میں نے تو معصوم بچوں سے دعا کرائی تب جاکر کہیں اس طرف سردی قدرے کم ہوئی ہے - اور بھئی کتنے دنوں سے لکھ رہا ہوں کہ اگر اس طرف خالص گھی کی فصل شروع ہوگئی ہو تو چند سیر گھی اپنے بھتیجے کے عقیقے کے لیے بھیج دیجئے ، کیوں کہ یہ تقریب محض خالص گھی نہ ملنے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے - خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا - اور ہاں بھئی خوب یاد آئی یعنی برادر محترم محمد عالم صاحب سے بعد سلام و اشتیاق ملاقات کہہ دیجئے کہ آپ کو بھی بہت یاد کرتے ہیں- آخر اس خاموشی کا کیا مطلب ؟"

مندرجہ بالا امثال سے قدیم خطوط نویسی کی تمام خصوصیات بخوبی واضح ہوجاتی ہیں -

غالب ایک نئے ذہن اور نئی فکر کے مبلغ تھے انھوں نے " ادب برائے ادب " کے بجائے" ادب برائے زندگی" والے مقولے کو اپنایا- یہی سبب تھا کہ انھوں نے بے جا لفاظی اور تصنع و تکلف کو خیر باد کہا - مکتوب نگاری کی قدیم روش سے وہ پہلے ہی دل برداشتہ تھے- پہلےجب وہ فارسی میں خطوط لکھا کرتے تھے تب بھی اپنی جدت و جودت طبع کے جوہر دکھائے بغیر نہ رہ سکے اور ان میں بھی ایک منفرد و نیا رنگ و انداز اپنانے کی کوشش کی - اردو خطوط کی طرز قدیم سے وہ خوش نہ تھے جس کا ذکر انھوں نے میر مہدی مجروح وغیرہ کے خطوط میں جا بجا کیا ہے - لکھتے ہیں :

" میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو ، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو-" (۱)

---

(۱) " خطوط غالب"، بحوالہ شمس الرحمن " اردو خطوط"، محولہ بالا ، ص ۳۳

ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کیوں کہ ان کے خطوط بالکل اس انداز کے ہیں جیسے دو آدمی بالمشافہ بیٹھے ہوئے مصروف گفتگو ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے خطوط نے دنیائے ادب اور خصوصیت سے دنیائے مکاتیب میں جو انقلاب پیدا کیا اس کے باعث قافیہ پیمائی اور پر تصنع نامہ نگاری کی روش بڑی حد تک موقوف ہوگئی اور اس طرح اردو زبان و ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور ان کے بعد بہت سے نامور و مقتدر ادیبوں کے خطوط کی اشاعت نے اس صنف ادب کو اور بھی عروج بخشا۔

غرض یہ کہ غالب کے خطوط سے ان کی شخصیت اور زندگی کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے اور اس زمانے کی تاریخ مرتب کرنے میں بھی مدد ملتی ہے ۔ ان میں ان کی خود داری بھی ہے اور خوشامد بھی، رندی و مستی بھی ہے اور فلسفہ و تصوف بھی، شوخی و ظرافت بھی ہے اور سنجیدگی و سادگی بھی ۔ ان خطوط نے مرزا غالب کی شخصیت کی اصلی تصویر پیش کرکے ان کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح واضح کردیا ہے کہ اب ہمارے اور مرزا غالب کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔

اب یہ حقیقت بخوبی واضح ہوگئی ہوگی کہ خطوط انسانی کردار کے واضح خد و خال کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کو سامنے رکھ کر لکھنے والے کے اصل جذبات و تاثرات ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کے تمام نشیب و فراز اور مد و جزر سے بخوبی آگاہی ہوسکتی ہے۔ جس کی عکاسی نہ اس کی تصنیفات کرسکتی ہیں ۔ اور نہ تالیفات ، ڈاکٹر مولوی عبدالحق خطوط کی افادیت و اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" خط دلی خیالات و جذبات کا روز نامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا ۔ خطوط سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔" (۱)

---

(۱) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی، " خطوط شبلی" (مقدمہ) ، بحوالہ شمس الرحمن" اردو خطوط"، محولہ بالا ، ص ۸

مولانا قادری کی مکتوب نگاری :-

جہاں تک مولانا حامد حسن قادری کی خطوط نگاری کا تعلق ہے ان کے وہ تمام خطوط جو انھوں نے اپنے احباب و اعزہ اور معاصرین و تلامذہ وغیرہ کو لکھے ہیں مکتوب نگاری کی ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں۔ مولانا کی زندگی ہمارے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند ہے جس میں نہ تکلف و تصنع ہے ، نہ لاگ لپیٹ اور نہ نمائش ریاکاری - ان کے خطوط بھی دل چسپی و دل کشی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

مولانا قادری اگرچہ مرزا غالب کی طرح مراسلت کو مکالمت نہ بناسکے اور نہ ہی مولانا شبلی و مہدی افادی کی طرح طرز و اسلوب کی شوخیاں و رعنائیاں دکھاسکے اور نہ ہی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح منطق و فلسفہ کے نکات کی وضاحت پر مائل ہوئے مگر ان کے خطوط بہت سی ادبی موشگافیوں سے پر ہیں۔ اور بہت سے ادبی مسائل کے حل ان میں موجود ہیں۔ ساتھ ہی یہ خطوط ان کے خلوص و محبت ، انداز فکر و نظر اور متانت و سنجیدگی کے بھی آئینہ دار ہیں۔

مولانا نے چوں کہ خالص مشرقی تہذیب و تمدن میں پرورش پائی ہے اس لیے ان کے خطوط میں حفظ مراتب جا بجا نظر آتا ہے - خوردوں کے ساتھ بھی ان کی روش نہایت مشفقانہ و ہمدردانہ ہے - وہ ان پر طعن و تشنیع کے تیر نہیں برساتے بلکہ نہایت متانت و سنجیدگی اور دل سوزی و ہمدردی سے ہر بات دل نشین کراتے ہیں - ان کے جو خطوط معاصرین کے نام ہیں ان میں ان کی اپنی دل چسپیوں اور مشاغل زندگی کا ذکر ، مسائل ادب پر اظہار خیال ، علمی و ادبی مباحث پر گفتگو ، دوسروں کی عظمت کا اعتراف اور اپنی عاجزی و انکساری کا اقرار ہے -

بہر کیف ان خطوط سے ان کی وسیع النظری ، علمی و ادبی تحقیق و تدقیق

فنی شعور اور تنقیدی صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے - اور ان کی ہمہ گیر شخصیت و طبیعت کے نقوش اور بھی گہرے ہوجاتے ہیں۔

مولانا فطرتاً درویش صفت ، صوفی مش اور قناعت پسند تھے۔ ان کا دسترخوان بھی وسیع تھا۔ حاجت مندوں کی حاجت براری اور غربا کی اعانت کرتے رہتے تھے۔ گھر بھی مہمانوں سے عموماً بھرا رہتا تھا - لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں اپنی معاشی دشواریوں کا کبھی بھول کر بھی تذکرہ نہیں کیا۔

مولانا قادری نے غیر تو غیر اپنی اولاد تک پر اپنی تنگ دستی کو ظاہر نہ ہونے دیا جس کی ایک مثال یہ ہے :"

ایک دفعہ ان کے منجھلے صاحب زادے ماجد حسن فریدی نے جو علی گڑھ یونی ورسٹی میں زیر تعلیم تھے مولانا کو نئی شیروانی بنوانے کے لیے خط لکھا - ان دنوں مولانا کا گھر کنگال میں کسی مذہبی تقریب کے سلسلے میں مہمان خانہ عام بنا ہوا تھا - اخراجات کثیر تھے مگر مولانا نے صاحب زادے صاحب کو فوراً جواب میں لکھا :

" تمہاری فرمائش موصول ہوئی ، اس ماہ تو نہیں ان شاء اللہ آئندہ ماہ حافظ علاء الدین کے یہاں سے شیروانی سلواکر بھجوادی جائے گی۔"(١)

مولانا قادری کی مکتوب نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی رقم طراز ہیں :-

" قادری صاحب کی طرح ان کی مکتوب نگاری بھی ان کی شخصیت کا آئینہ ہے - عصر حاضر کے بہت کم لوگ ہیں جن کے خطوں میں معمولی لمحوں کو جاودان بنادینے کا سلیقہ ، باتوں کا لطف اور روز مرہ کی چاشنی ہو۔ جس شخص نے ان کو نہیں دیکھا وہ ان کے خطوں کو دیکھ لے۔ ان کی زندہ شخصیت یا فردیت اگر کسی جگہ صاف نظر آتی ہے تو خطوں میں - ان کے بے تکلف رقعوں

---

(١) " خطوط قادری" غیر مطبوعہ ، مملوکہ ماجد حسن فریدی پسر مولانا قادری

میں حسن کا وہ ناز و انداز نہیں ہے کہ وہ خلوت میں بھی نقاب ڈال کر آئے اور نہ عشق کی وہ احتیاط ہے کہ بازار میں کبھی رسوا نہ ہو۔

ان کا انداز تحریر ایک عمدہ قسم کا شیشہ ہے جس کے ذریعہ ہر چیز اپنے اصلی روپ میں نظر آسکتی ہے ۔ تصنع اور آب و رنگ مطلق نہیں ہے وہ جو کچھ اثر مرتب کرتے ہیں وہ موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی ہے ۔

ایک مرتبہ فلا بوٹ نے موپاسان سے کہا تھا :

" بات کہنے کے لیے دراصل ایک ہی لفظ ہوتا ہے ۔ صفت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک ہی اسم صفت اور فعل کو ظاہر کرنے کے لیے بس ایک ہی فعل۔" (۱)

مولانا قادری کے یہاں بھی یہی بات ہے ۔ وہ ایک ماہر طبیب اور نباض حکیم کی طرح ایک ایک لفظ کی نبض کو جانچتے ہیں اور اس کو ایسے مناسب موقع و محل سے استعمال کرتے ہیں کہ اس کی معنویت و اہمیت اور بڑھ جاتی ہے ۔ ۲۰ اپریل، ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں کاہلی کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو لکھتے ہیں :

" میں آج کل کثرت کار سرکار سے بہت پریشان ہوں اور سرکار ایک دو نہیں ۔ چھ سات ہیں۔ سب کی بندگی کے لیے وقت کی پابندی ہے ۔" (۲)

ایک اور موقع پر ڈاکٹر فاروقی صاحب نے لکھا کہ ایک صاحب کے پوتا ہوا ہے آپ تاریخ کہہ دیجئے ۔ اس موقع پر اپنی تاریخ گوئی کے متعلق مولانا نے جیسا دل چسپ خط لکھا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

" انھوں نے تو کہا تاریخ کو کہا ہوگا ۔ آپ ہی کو یہ لپکا پڑگیا ہے ۔

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ : " مولانا حامد حسن قادری"، (مقالہ) ، " نقوش"، لاہور : جنوری، ۱۹۵۵ء ، ش ۳۸-۳۷ ، (شخصیات نمبر) ، ص ۲۸۷

(۲) ایضاً، ش ۳۸-۳۷، (شخصیات نمبر) ، ص ۲۸۳

مگر وہ تو کہئے مجھے خود اس کا خبط ہے - اکثر میری لوی محنت محبت

(Labour of love) ہوتی ہے - محض تاریخ کہنے میں مزا آتا ہے -

کتنی تاریخیں کہتا ہوں مگر کبھی کسی کو نہیں سناتا - لکھیں اور رکھ لیں-

ٹہلتا جارہا ہوں اور تاریخ کہہ رہا ہوں- امتحان کی نگرانی کر رہا ہوں

اور تاریخ کہہ رہا ہوں- بات یہ ہے - سبب یہ سبب کہتا ہوں تو اب بات

اور سبب پر کبھی نہ کہتا، مگر آج کل اصل میں فرصت بالکل نہ تھی - کالج

کے آخری دن میں کاپیاں بڑی ہوتی ہیں اور لطیفہ یہ کہ امتحان ابھی ختم

بھی نہیں ہوئے کہ آئندہ سال کے پرچے بنانے کو آگئے - اس لیے میں نے سوچا

کہ فوراً آپ کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو پھر نہ ہوسکے گی - چناں چہ

عجلت میں یہ چند تاریخیں آج ہی لکھ کر ختم کردیں- اتوار کے سبب آج خط

نہ جاسکا ، کل جائے گا - ان کے اچھے بری ہونے کی ذمہ داری نہیں ماحضر

سمجھئے -" (۱)

مولانا قادری کی جن لوگوں سے خط و کتابت تھی وہ زیادہ تر اہل قلم اور

شاعر و ادیب تھے - جن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی آل احمد سرور، عندلیب شادانی، سیماب اکبر آبادی ، پروفیسر نظیر صدیقی، حیرت شملوی ، منظور جلیل شوق ، ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، عبدالماجد دریا بادی، وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں- (افسوس کہ علاوہ چند کے سب حضرات کے خطوط دستیاب نہ ہوسکے) - مولانا ان احباب کی تخلیقات و تحریرات پر کبھی داد دیتے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی یہ لاگ تنقید کرتے نظر آتے ہیں- اس طرح ان کے خطوط سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کے عروج و ارتقا اور اس کے سنوارنے و بنانے میں بڑی محنت و لگن اور مستعدی وجانفشانی سے کام لیا ہے-

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ ، " مولانا حامد حسن قادری"، محولہ بالا ، ص ۲۸۲

ان کو ادبی تلاش و تفحص اور تحقیق و تدقیق سے جو کچھ حاصل ہوتا اس کو اپنے ، دوستوں ، عزیزوں اور شاگردوں تک پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے -

تقسیم سے قبل علی گڑھ کے محلے چاہ گرما یہ میں کچھ معزز انگریز آباد تھے جن میں جان پش (John Pesh) صاحب کی حویلی اب تک معروف ہے - ان کا انگریزوں نے اس وقت کے ہندوستان کو اپنا وطن مالوف بنالیا تھا۔ ہندوستان کی تہذیب اپنانے میں فخر و مسرت محسوس کرتے تھے اردو کو زبان کی حیثیت سے اس قدر اپنایا کہ اچھے خاصے ادیب اور شاعر ہوگئے - مولانا قادری کا ذوق تجسس دیکھئے کہ انھوں نے ایک انگریز " جان بیلی" کے خاندان کے توسل سے اس وقت کے چند انگریز شعرا کا کلام حاصل کرلیا۔ اپنی اس تحقیق کے سلسلے میں اپنے برادر عم زاد مولوی مظہر جلیل شوق کو ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" کرم نامہ موصول ہوا تھا۔ تاخیر جواب کی ندامت ہے - میں اس عرصے میں کچھ مصروف ، کچھ علیل اور کچھ غیر حاضر رہا - تاریخیں دونوں بہت عمدہ ہیں۔ لیکن" کعبہ وفا" یہاں بعض حضرات کو پسند نہیں اس کا ہم عدد" یگانہ زماں" اور ہے - جو یہاں موزوں ہوسکتا ہے - آپکے جیسی رائے ہو -

بعد کو خیال آیا کہ آپ کی دل چسپی کے لیے عیسائی شاعروں کے کچھ شعر بھی لکھدوں -

۱- کرنل جان بیلی : - وہی انشا اللہ خان کا " اللہ بیلی" والا ، اس نے ایک شعر بہت دل چسپ کہا ہے :

" مار ڈالے گی محبت مجھے مس طیبا کی
جان نکلے گی چلاتے ہوئے بحر عیسا کی

ایک عیسائی کی زبان سے حضرتؑ عیسی کو یہ طعنہ بہت پر لطف ہے -

۲- مس صوفیہ بلیک : - خفی تخلص - مرزا داغ دہلوی کی سوتیلی بہن " اخیانی" یعنی ماں میں اشتراک تھا۔ اس کا باپ مسٹر بلیک (بولی شکل ایجنٹ جے پور)

تھا۔ جس کا قتل ہونے کے بعد خفی کی ماں نے نواب شمس الدین خان والی فیروز پور جھرکہ سے نکاح کیا تھا اور نواب صاحب کے قتل ہونے کے بعد مرزا فخرو (ولی عہد بہادر شاہ) کے نکاح میں آئی تھی۔ مس بلیک خفی کا یہ شعر جو اب نہیں رکھتا :

" خود شوق اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ تیرے ایک بھی دانے کے نہیں ہم

۳۔ آئیرن جیک (Iren Jack) :۔ آرمینی نسل کا تھا ایرن اور فرحت تخلص کرتا تھا ۔ ایک غزل کے یہ شعر دیکھئیے :

یہ کیا چپکے چپکے تو کہتا ہے اے دل
یہ در پردہ کس کا گلہ ہو رہا ہے
لگی چوٹ ایرن کے دل پر کہ جس
کہ ہر وقت ذکر خدا ہو رہا ہے

۴۔ ٹامس بیلمنٹ : ۔ نفیس تخلص ۔ مسلمان ہوگیا تھا۔ محمد سلیمان خان نام رکھا۔ شہور تلمیذ مرزا غالب کا شاگرد تھا۔ نعت شریف میں بھی یہ تضمین دیکھئیے :

یکمال شرف و رفعت و شان عربی پہنچے افلاک پہ جس دم شب معراج نبی
ہر نبی نے یہ کہا ہو کے باشی و ابی مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

چوں براقت ز فلک چابک چالاک گذشت نظرے بود کہ از آئینۂ بے باک گذشت
اوج جاہت ز قیاس اے شہ لولاک گذشت شب معراج عروج تو ز افلاک گذشت
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

منہ لگائے جو سگ در ترا اے شاہ امم ناز سے جامے میں پھولا نہ سمائے اک دم
دل سے طالب ہوں معافی کا بچشم پرنم دست خود بہ سگ کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

خواب ہی میں رخ انور نظر آجائے اگر پھر نہ مرنے کی تمنا ہو نہ جینا دوبھر
امتی ہوں میں ترا کچھ تو توجہ ہو ادھر چشم رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی و لقبی ، ہاشمی و مطلبی

مرزا داغ کی ایک غزل کا مخمسہ کہا ہے - ایک شعر پر کیا خوب مصرعے لگائے ہیں:

تم نے پوچھا تھا نہ میں نے کیا گلا   قاصد نے اپنے دل سے جو چاہا وہ کہہ دیا

دشمن تمہارے روٹھیں خفا ہو مری بلا   پیغامبر کی بات کا آپس میں رنج کیا

میری زبان کی ہے نہ تمہاری زبان کی ہے

<u>۵- جارج فیتھم</u> :- فرانسیسی تھا- جرجیس اور صاحب تخلص تھے-

امیر مینائی نے اپنے تذکرہ شعرا "انتخاب یادگار" میں بھی اس کا حال اور کلام لکھا ہے - اردو میں پورا مکمل دیوان کہا ہے - فارسی بھی کہتا تھا- یہ رباعی اور قطعہ دیکھئے :

رباعی

گر دوست مرا دوست ندارد چہ کنم   بر حال من او رحم نیارد چہ کنم

راضی بوفائے دوست باش اے جرجیس   تحریر ازل نمی شود رد چہ کنم

قطعہ

بسا جواہر خوش آب در تہ دریا   نہفتہ است کہ کس ہیچ ازاں ندارد یاد

بسا گلے کہ دمیدہ است و کس ندیدہ آں را   کہ بوئے خویش بہ ویرانہ می دہد برباد

<u>۶- جان بیش شور</u> :- یہ بھی فرانسیسی تھا- میرٹھ میں رہتا تھا- چھ مکمل دیوان چھوڑے ہیں - کہتا ہے :

"آپ کا شور جہاں میں نہ ہو کیوں کر اے شور

کہ فرنگی بھی ہو، شاعر بھی ہو، مشہور بھی ہو"

<u>۷- الگزینڈر ہیڈلے آزاد</u> :- یہ بھی صاحب دیوان تھا- نواب زین العابدین خاں عارف (غالب کے بھانجے) کا شاگرد تھا- صرف ۳۲ برس کی عمر پائی ، ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا- غزلیات ، قصائد ، خمسے، تاریخیں ، مثنوی سب کچھ کہہ گیا - غالب کی غزلوں پر غزلیں لکھیں - غالب کا اتباع بھی کیا :

وہ گرم رو راہ معاصی ہیں جہاں میں

گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا

===XXX====

آج دشمن اگر خراب نہیں   کیا زمانے میں انقلاب نہیں

مجھ سے کیسا حساب ہے یارب   تیری بخشش کا کچھ حساب نہیں

===XXX====

کافر نہیں تو عشق میں تنہا بنے نہیں
دنیا میں اور کوئی مسلمان نکالیے

===xx===

آج ہلتا نہیں سر ضعف سے اللہ اللہ!
اسی سر سے کبھی دیوار گرائی ہوگی

===xxx====

سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی دیکھئے :

سب میں بے پردہ رہی پردۂ فانوس میں شمع
لگ گئی آگ تری خانۂ فانوس میں شمع
پاس آئے تو جلے دور ہو بے تاب رہے
سر دھنا کرتی ہے پروانے کے افسوس میں شمع

===xxx====

یہی ہے خرچ اگر اس کا دل فگاروں میں
تنک بکے گا کوئی دن میں مشک ناب کے مول
خراب ہو ہی گا آخر جو میرا گھر ہوگا
مکان لیا نہ کوئی مارے اس عذاب کے مول "

==xxx====

مولانا قادری کے بعض خطوں میں بڑی دل چسپ ادبی بحثیں اور موشگافیاں ملتی ہیں ۔ جن سے ان کے علمی تبحر اور نقطۂ نظر کا اندازہ بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ تقریباً ۱۹۳۵ءکی بات ہے جب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے دہلی کالج میگزین کا حسرت موہانی نمبر نکالنا چاہا اور ایک خط میں مولانا کو لکھا :

" حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کے لیے مندرجہ ذیل عنوانات انتخاب کئے گئے ہیں۔" (۱)

مولانا قادری نے اس جگہ" بے نقاب " کے استعمال کو پسند نہ کیا اور ۱۱ مارچ ۱۹۳۷ء

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ؛ حامد حسن قادری (مقالہ) ، محولہ بالا ، ص ۲۸۹

کو اس کے جواب میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو لکھا :

محاورں کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے - ان کی صحت ، رواج عام اور قبول خاطر پر منحصر ہوتی ہے - اور محاورے کے مختلف پہلو اور مختلف استعمال معنی میں فرق پیدا کردیتے ہیں-..... آپ نے "بے نقاب" کے حقیقی اور مجازی معنی پر غور نہیں کیا اور چار شاعروں کی مثالیں لکھ دیں جن میں سے ایک بھی آپ کے لیے مفید نہیں ، اس لیے کہ ان سب میں حقیقی معنی مراد ہیں - یعنی چہرے سے نقاب اٹھانا ، طالب ، انوری ، جوش کے اشعار میں تو حقیقی معنی ظاہر ہیں- اقبال کے شعر میں " از رخ معنی" کے الفاظ نے مجاز کو حقیقت سے مشابہ کردیا ہے - یعنی نقاب بہرحال رخ سے اٹھایا ہے - اگرچہ معنی کا رخ ہے - چہرے کا بے نقاب ہونا اور سیرت کا بے نقاب ہونا ، زندگی کا بے نقاب ہونا ، قابلیت کا بے نقاب ہونا ، ذہن کا بے نقاب ہونا اور بات ہے - ان میں لامحالہ معائب کا بھی بے نقاب ہونا مفہوم ہوتا ہے - بلکہ ذہن سب سے پہلے معائب ہی کی بے نقابی کی طرف منتقل ہوتا ہے - اس لیے اس محاورے کو کسی ایسے شخص کے متعلق استعمال کرنا مناسب نہیں جس کا احترام مدنظر ہو - مثلاً اگر زہد نے غالب کے متعلق لکھا ہے تو میرے نزدیک درست ہے - اس لیے کہ اس کا کوئی خاص احترام مجھے مد نظر نہیں مجھے اس کی زندگی اور شاعری دونوں میں معیوب پہلو نظر آتے ہیں اور بعض پہلو اب تک واقعی پوشیدہ ہی ہیں جا تاہے - لیکن مثلاً اگر یہ فقرہ حسرت موہانی کے لیے لکھا جائے تو میں پسند نہ کروں گا - " حسرت موہانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنا -" اس کو بار بار پڑھ کر دیکھئے اور سوچئے - صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مذموم پہلو بیان کرتے ہیں-"

ایک عرصہ ہوا " نگار" اور " نیرنگ خیال" میں مضمون بازی ہوئی تھی - آرگس نے ایک مضمون لکھا تھا " غالب بے نقاب " - اس کا جواب دیا گیا- " آرگس بے حجاب " -" غالب بے نقاب " کے الفاظ ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غالب کے معائب کا بیان ہے - یہ ہماری زبان ، محاورے اور رواج کی بات ہے ، ورنہ ممکن ہے ایران میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہ لیا جائے -" (۱)

---

(۱) احمد فاروقی ، ڈاکٹر خواجہ، " حامد حسن قادری"، (مقالہ) ، محولہ بالا ، ص ۲۸۲

مولانا کا یہ جواب پاکر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے پھر لکھا کہ کیا حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ ہم ان میں سے کسی رائے سے متفق ہوں اور کسی رائے سے نہ ہوں۔ کم از کم ان کی شاعری پر تو منحرفانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے اور ابھی حال ہی میں ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بعض اعتراضات ایسے کئے ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتے۔ اس خط کے جواب میں مولانا ۲۱اپریل ۱۹۳۴ء کو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو لکھتے ہیں :

" میرا اب بھی وہی خیال ہے .... زندگی کو " بے نقاب" کرنے اور شاعری کو " بے نقاب " کرنے میں فرق ہے ۔ حسرت کی شاعری کو جتنا چاہئے بے نقاب کیجئے لیکن جب کہیے گا کہ حسرت کی زندگی کو بے نقاب کرتا ہے تو فوراً ذہن ان کے عیوب اخلاقی کی طرف جائے گا۔

ڈاکٹر شادانی نے حسرت پر جو اعتراضات کئے ہیں، وہ میں نے حرف بحرف کئی بار پڑھے ہیں اور ان کا جواب ڈاکٹر صاحب کو لکھدیا ہے ۔ آپ کہتے ہیں اٹھائے نہیں اٹھتے ۔ میں نے سب اعتدادیے کوشی پڑا نہ رہا ۔ ڈاکٹر صاحب سے میری پرانی شناسائی ہے ۔ ۲۶ سال کی ۔ وہ مجھ سے بڑا خلوص رکھتے ہیں۔ ان کے اعتراضات ایک خاص نظریے کی بنا پر ہیں۔ اور صرف حسرت کی ذات پر نہیں ، بلکہ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر جگر و حسرت تک ہزاروں شاعروں پر ہیں۔ بلکہ ایران، عرب ، مصر وغیرہ سب ان کی زد میں ہیں۔" (۱)

مولانا قادری نے یوں تو ۱۸۹۹ء سے مضامین لکھنے شروع کردیے تھے لیکن سب سے پہلا تنقیدی مضمون ۱۹۱۵ء میں لکھا اس کے متعلق ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو یکم دسمبر ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ ، " حامد حسن قادری" (مقالہ) ، محولہ بالا ، ص ۲۸۲

" آپ نے مضمون کے اصرا میں کمال کردیا .... اس زمانے میں کتابیں چھپ رہی تھیں اور وہ تا ایں دم جاری ہیں اور کیا عجب کہ تا آں دم (دم واپسیں یا ہنگام قیامت) جاری رہیں۔ اس لیے کہ ایک اپریل سے چھپ رہی ہے۔ ۸ مہینے ہوگئے نہ لکھنا پورا ہوا نہ چھپا۔ آپ نے ان کتابوں ہی کا ایک صفحہ مانگا تھا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا، اس لیے کہ ایک بی - اے - فارسی کورش میں ہے۔ اس میں سے کیا بھیج دیتا۔ دوسرا میرے افسانوں کا مجموعہ ہے - وہ پندرہ بیس سال سے کبھیں نہ کبھیں چھپتے ہی رہے ہیں۔ بعض نئے ہیں تو طویل ہیں، اور میں ان کو نیا ہی رکھنا چاہتا ہوں - پھر ان کو دوبارہ آپ کے لیے نقل کرنا ناممکن تھا۔

بہرحال اب ایک مضمون تقریباً تیار ہے اور بھیج سکتا ہوں - تنقیدی ہے اور بہت عجیب و دل چسپ لیکن یہ دونوں صفتیں کچھ اور معنی رکھتی ہیں جو پڑھنے کے بعد آپ سمجھیں گے - مجھے اس کی تکمیل اور نقل سے پہلے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کے کالج میگزین میں کتنے صفحوں کی گنجائش ہے - معمولی میگزین سائز مثلاً " نگار" کے پانچ چھ صفحوں میں آئے گا۔ دوسرے یہ کہ میگزین کب تک شائع ہوگا - ہوگا یا نہ ہوگا ...؟ جب واقعی سب مضامین مرتب ہوجائیں اور کاتب کو دیئے لگیں اس وقت مجھ سے منگالیجئے گا اور میرا مسودہ واپس کرنا ہوگا۔ یہ مضمون شوق صاحب بچھرایونی (۱) کی ایک غزل پر تنقید ہے اور اس کا مضطر خیرآبادی کی غزل سے مقابلہ - ۲۸ برس ہوئے ۱۹۱۵ء میں یہ تنقید نورالحسن (۲) کی فرمائش سے لکھی تھی - ان کی فرمائش مجھے حامد علی کی معرفت بڑودہ میں ملی تھی۔ میں نے تنقید خط میں لکھ کر حامد علی کو بھیجی تھی - اس سال گزشتہ جنوری میں جب میں حامد علی کی عیادت کے لیے بچھرایوں گیا تھا(اور آپ بھی شاید آئے تھے) تو حامد علی نے وہ خط مجھے دیا تھا۔ یہ طویل خط اور طویل تنقید ہے - کہئے تو بھیج دوں۔" (۳)

---

(۱) شوق مرحوم کا ترجمہ" خم خانۂ جاوید" میں موجود ہے۔
(۲) مصنف " حیات سرسید"
(۳) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ،" حامد حسن قادری" (مقالہ) ، محولہ بالا ، ص ۲۸۵

گنجینۂ تواریخ

۱۳ ھ ۵۵
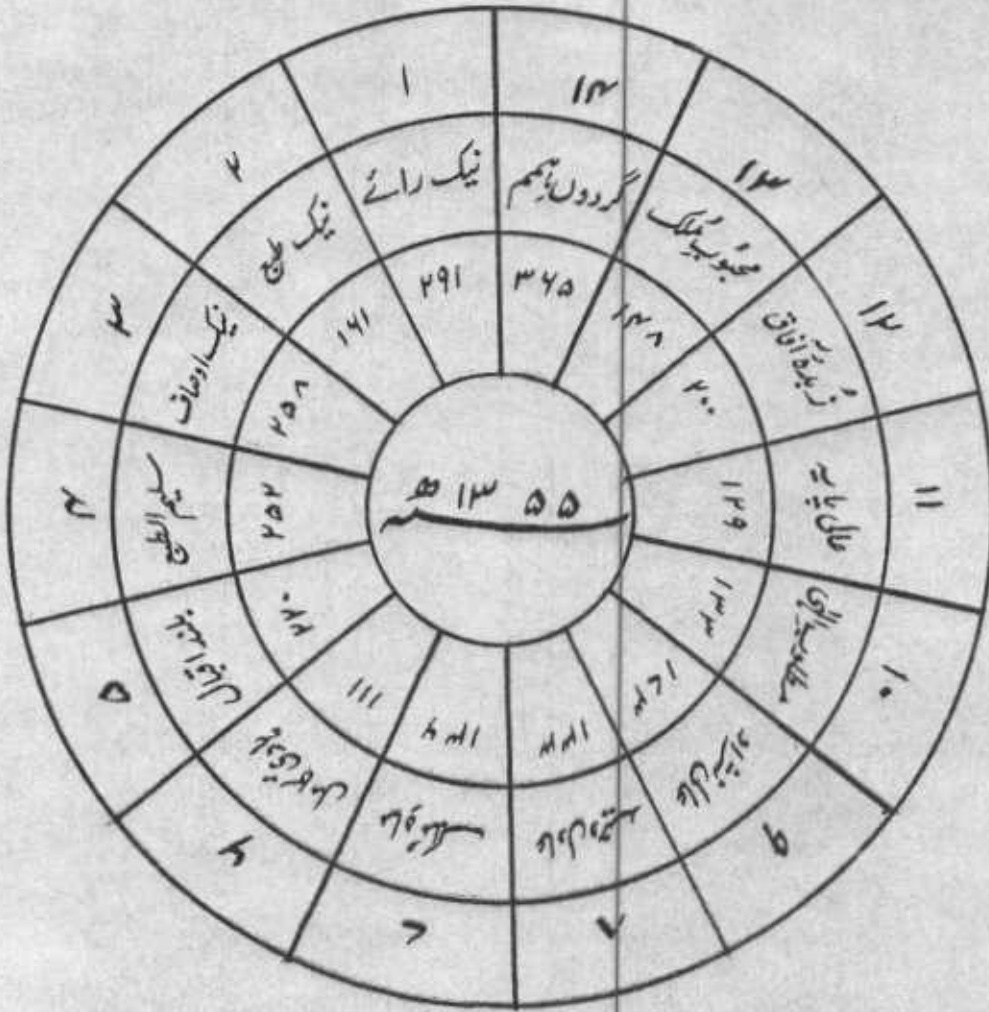
قاعدۂ استخراجِ تواریخ :-

یہ ہے کہ نیچے کے تختے پر جو چودہ خانے بنے ہیں ان میں سے جس خانے سے چاہیں شروع کردیں اور جس عدد تک چاہیں شمار کریں (بجز ایک دو تین چودہ اور اس کے اضعاف کے) اور جس خانے پر شمار تمام ہو اس کے عدد لے لیں ۔ (بالائی تختے کو گھماکر اور اس خانے پر لاکر لفظ کے عدد دریافت ہوسکتے ہیں) اب جو عدد شمار کے لیے مقرر کیا ہے وہ اگر طاق ہو تو خانۂ انتہا کو خانۂ ابتدا قرار دے کر

ہر بار اسی طرح شمار کرتے رہیں یہاں تک کہ سب سے پہلے خانۂ ابتدا پر انتہا ہوجائے۔ اب ان سب اعداد کو جمع کرلیں ، ہمیشہ ان کا مجموعہ ۱۳۵۵ھ ہوگا اور اگر وہ عدد جو شمار کے لیے مقرر کیا گیا ہے ، جفت ہو تو شمار اول کے خانۂ انتہا کے بعد کے خانے سے شمار کریں اور ہر مرتبہ اسی طرح شمار کرتے رہیں یہاں تک کہ ابتدائے اصلی کے خانے سے ایک خانہ قبل پر انتہائے شمار ہوجائے ۔ ان سب اعداد کے جمع کرنے سے بھی وہی سنہ حاصل ہوگا ۔ واضح رہے کہ ہر حالت میں صرف سات مرتبہ شمار کرنا پڑے گا ۔ چودہ کے پہاڑے کو چھوڑ کر ۲ عدد سے سینکڑوں ہزاروں تک جتنے چاہیں شمار کریں۔

مولانا قادری نے اپنے اسلاف و اساتذۂ کرام کے نقش قدم پر گامزن رہتے ہوئے دنیائے علم و ادب میں فن تاریخ گوئی کو جاری رکھا ۔ ان کے فرصت کے بیشتر اوقات تاریخ گوئی میں صرف ہوتے تھے۔ اپنی کوشش و کاوش سے انھوں نے اس فن میں نئی نئی جدتیں بھی پیدا کیں اور اس قدر مہارت پیدا کی کہ نظم و نثر دونوں پر حاوی ہوگئے ۔ اکثر غزلیں قصیدوں، رباعیوں اور قطعوں وغیرہ میں بھی کوئی نہ کوئی مصرعہ ایسا رکھ دیا کرتے تھے جو مادۂ تاریخ سے پر ہوتا تھا۔ اکثر احباب کو خطوط لکھتے وقت ایسے برجستہ قطعے اور رباعیاں بھی لکھتے جاتے تھے جن سے مادہ ہائے تاریخ نکلتے ہوتے تھے ۔ اسی طرح ملاقات میں گفتگو کے دوران بہت سے فقرے اور مصرعے مادۂ ہائے تاریخ سے مزّین ہوتے تھے۔ جس کی امثال مندرجہ بالا صفحات میں پیش کی جاچکی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ متکلم مع التواریخ تھے ۔

دور حاضر میں بہت کم شعراء ادھر توجہ دے رہے ہیں اور اسلاف کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ رفتہ رفتہ یہ فن اٹھتا جارہا ہے ۔ تازہ واردان بساط سخن نہایت سہل پسند و سہل انگار ہیں جب کہ یہاں خون جگر سے نمو پاتا ہے ۔

تاریخ گوئی ادبی روایت کی ایک مستقل کڑی ہے - اگر اسے ناقدوں کے گھٹنی ماتمون نے توڑ دیا تو جہاں ہم اپنے تاب ناک ماضی، اسلاف کے ورثے اور قومی و ادبی سرمایے سے محروم ہوجائیں گے وہاں ہم حال کی مثبت اقدار اور مستقبل کی تاب ناکیوں کو بھی نہ اپنا سکیں گے -

تاریخ گوئی ایک ادبی امانت ہی نہیں بلکہ یہ ہماری انفرادی و اجتماعی اور سیاسی و معاشرتی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کا آئینہ بھی ہے جس میں ہم اپنے متصلقین و محبّین، محسنین و مخلصین، قائدین و مفکرین اور اکابرین و صالحین کے اقوال و افعال اور یادوں و کارگزاریوں کی دل کش مناظر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے اس فن کا قائم رہنا ضروری ہے -

○○○○

آٹھواں ـ باب

مکتوب نگاری

مولانا قادری کی مکتوب نگاری، مباحث، مکاتیب، علمی حیثیت

آٹھواں - باب

مکتوب نگاری

مولانا قادری کی مکتوب نگاری ، مباحث ، مکاتیب ، علمی حیثیت

جن اصناف ادب نے گذشتہ چالیس ، پچاس سال کے عرصے میں خاصی مقبولیت حاصل کی ہے ان میں ایک صنف " مکاتیبی ادب" بھی ہے - یہ ایک ایسی صنف اور ایک ایسا فن ہے جس سے ہر مکتبۂ فکر کا آدمی اپنی فہم و فراست کے مطابق حظ اٹھاتا اور لطف اندوز ہوتا ہے -

خطوط میں انسانی زندگی کے ہر پہلو پر تنقید ، دنیا کے ہر ادب پر تبصرہ اور تمام عالم موجودات پر آزادی سے بحث کی جاسکتی ہے - اس طرح ایک اچھے مکتوب نگار کے خطوط میں ہر شخص کو اپنی دل چسپی کا سامان مل جاتا ہے - وہ اپنے زور قلم کے ذریعہ اپنی خاص اور نجی باتوں میں بھی معنویت و تنوع اور رنگارنگی و دل چسپی پیدا کردیتا ہے- اس کی بہی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں مکتوب الیہ یا قاری کے لیے بڑی اہم اور لطف و تسکین کا باعث ہوتی ہیں -

انسان میں نمود و نمائش اور ستائش و دیائش کا جذبہ عموماً ملتا ہے مگر انسان کی ایک اور خصوصی خواہش یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کم زوریوں اور خامیوں کو پردۂ خفا میں رکھنا چاہتا ہے - اس طرح یہ خود پوشیدگی بھی ایک فن اور آرٹ ہے جس پر فن کار کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے - لیکن جو شخص اس فن میں مہارت رکھتا ہے وہ بات کو ایسی سادگی و برجستگی سے کہدیتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی سادگی و برجستگی پر غور کرتا رہ جاتا ہے لیکن اس کے لیے جذبات و واردات پر قابو پانا ضروری ہے - یہی سبب ہے کہ اس میدان میں صرف وہی لوگ کام یاب ہوسکے جو اپنی قلبی کیفیات و ذہنی تاثرات پر قدرت و قابو رکھتے

ہوئے ان کو الفاظ کا جامہ پہناسکے -

مکتوب سے کاتب کی سیرت اور اس کے رجحانات و خیالات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور اس دور کی ، ادبی، تاریخی ، سیاسی و سماجی زندگی کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے - کہ مکاتیب کےذریعہ کاتب کے صحیح جذبات و تاثرات ہی نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان سے زندگی کے اس مد و جزر سے بھی آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے جس کی عکاسی کوئی تصنیف و تالیف نہیں کرسکتی -

مولانا حالی اگر " حیات جاوید" اور " یادگار غالب " نہ بھی لکھتے تو بھی سرسید اور غالب کے افکارو خیالات اور کہ مزاج و افتاد طبع کا اندازہ ان کے ان خطوط سے بہ آسانی لگایا جاسکتا تھا جو انھوں نے قلم برداشتہ اور اضطراری طور پر لکھے -

مکتوبات کے ذریعہ ہم مکتوب نگار کو اس کی زندگی کے اصلی روپ میں دیکھتے ہوئے-

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس بات کو مقدمہ " خطوط شبلی" میں یوں واضح کیا ہے :

> " خانگی خطوط میں اور خاص کر ان خطوط میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ، ایک خاص قسم دل چسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی - ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے - تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی در اندازی کا کھٹکا نہیں رہتا- گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے - جہاں اندیشہ لاحق نہیں ہوتا - یہ دلی جذبات اور خیالات کا روز نامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے یہ بھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا- یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روز نامچوں ، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑی ذوق اور شوق سے پڑھتے ہیں-" (۱)

---

(۱) عبدالحق ، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی، " خطوط شبلی"(مقدمہ) ، بحوالہ شمس الرحمن (مرتبہ) ، " اردو خطوط"، دھلی :آزاد پریس، ۱۹۳۷ع ، ص ۸

خطوط کی مقبولیت کا ایک خاص سبب ان کی سادگی و برجستگی ہی ہے - جس کے آگے ہزار تکلفات و تصنعات ہیچ ہیں۔ اس قول کی تصدیق ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے الفاظ سے بھی یوں ہوتی ہے :

" ان میں انسان بچوں کی سی سادگی سے ، بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں جنھیں وہ انشا کی صنعت مسخ کرسکتی ہے اور وہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل و دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت ، ہر خیال اور ہر ادا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔" (۱)

کسی ادیب یا شاعر کے خطوط اس لیے بھی اہم ہوتے ہیں کہ ان کی مدد سے اس کی ذات کا صحیح عکس نظر آجاتا ہے ، ساتھ ہی اپنے کلام اور تصانیف کے متعلق بھی اس کا اپنا خیال واضح ہوجاتا ہے - ان سے اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے - ولا بہت سی باتیں بہت سے لوگوں سے چھپاکر صرف چند مخصوص احباب پر ظاہر کرتا ہے مگر مکاتیب کی اشاعت پر یہ تمام راز ہائے پنہانی اظہر من الشمس ہوجاتے ہیں - خط لکھتے وقت اس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ خطوط کبھی چھپیں گے اور احباب سے اس کی یہ بے تکلفی عام ہوکر ایک روز اس کے خلاف ایک بڑا اشتہار بن جائے گی -

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ خطوط کے ذریعہ سیرت کی اہم خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔ کسی مکتوب نگار کے قول و فعل ، کردار و عمل ، ذہنی ارتقا اور زندگی و ماحول کا صحیح علم خطوط ہی کے ذریعہ ہوتا ہے -

---

(۱) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی،" خطوط شبلی" (مقدمہ) ، بحوالہ شمس الرحمن(مرتبہ) ، " اردو خطوط ، محولہ بالا ، ص ۹

جدید دور کے جدید نقادوں نے نقد و نظر کے بھی نئے اصول وضع کیے ہیں۔ اب مصنف کی زندگی اور ماحول کا صحیح جائزہ لیے بغیر اس کی تصانیف پر تنقید و تبصرہ کرنا کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا۔ اور یہ تنقید کے بجائے تقریظ شمار کیا جاتا ہے - یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تنقید کی ابتدا خطوط کے ذریعہ بھی ہوئی ہے - انگریزی کے تنقیدی ادب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہترین تنقیدی ادب خطوط ہی کی شکل میں نظر آتا ہے - چالس لیمپ ، کیٹس ، شیلی، بائرن اور ولیم سرھیبرلٹ کی شہرت ان کے مضامین ہی کے سبب نہیں بلکہ ان کے خطوط بھی انگریزی ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں۔

اردو ادب کی اس صنف میں اپنی ذہانت و فطانت کے سبب غالب ایک خصوصی امتیاز رکھتے ہیں۔ خطوط میں اگر فطری طنز و مزاح ، خوش طبعی و خوش مزاجی ، بذلہ سنجی و بدیہہ گوئی، بے ساختگی و برجستگی نہ ہو تو وہ خطوط بے جان ہوتے ہیں اور اس میں لوگوں کے لیے کوئی لطف نہیں ہوتا - یہ تمام باتیں غالب کے خطوط میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ غالب کے خطوط میں شگفتہ مزاجی بھی ہے اور بذلہ سنجی بھی ، لفظی طنز و مزاح بھی ہے اور بے ساختگی و برجستگی بھی۔ الفاظ کی تراش و خراش بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ وہ غم و آلام کے عالم میں بھی زندگی کو زندہ دلی سے بسر کرنے کے قائل تھے اور ہر مشکل کو آسان بنانے کی فکر میں رہتے تھے۔ اپنی زندی و سرمستی اور اسراف بے جا اور غیر معمولی اخراجات کے سبب وہ بعض اوقات خود سے بھی بے زار رہتے مگر احباب کو ان کے رنج و الم میں جو خطوط بھیجتے ان میں بھی بڑے مخلصانہ و ہمدردانہ مشورے ہوتے اور ان کے ایک ایک لفظ سے شوخی و بذلہ سنجی ٹپکتی ہوتی۔ شراب و شاعری کے بعد غالب کو اگر کسی شغل سے دل چسپی تھی تو وہ صرف خطوط نویسی تھی۔ وہ احباب کے ایک ایک خط کو بار بار

پڑھتے اور خود بھی بڑے ذوق و شوق سے ان کو خطوط لکھا کرتے تھے۔

مکتوب نگاری کا آغاز و ارتقا :

جب سے انسان نے اپنی ضرورت کے اظہار کا طریقہ اختیار کیا اور لکھنا پڑھنا سیکھا اسی وقت سے خط کے ذریعہ پیغام رسانی شروع ہوئی ۔ ابتدا میں خط بھی صرف ضرورت کے اظہار کے لیے لکھے جاتے تھے جب سے انسان تہذیب و تمدن کی طرف راغب ہوا مکتوب نگاری کا آغاز بھی وہیں سے ہوتا ہے ۔ انسانی تہذیب کے عروج و ارتقا میں مذہب اور حکومت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ خطوط نویسی کی ابتدا بھی حکومت اور مذہب کے پیشواؤں کی رہین منت ہے ۔ اب تک کی تحقیق بتاتی ہے کہ اب تک خطوط کے جو مجموعے ملے ہیں وہ مذہب اور حکومت کے ہی رہین منت ہیں۔ ان میں یا تو وہ خطوط ہیں جو بادشاہوں نے اپنے ماتحتوں اور حکام کو لکھے یا پھر وہ خطوط ہیں جو مذہبی پیشواؤں نے اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت وغیرہ کے سلسلے میں اپنے ارادت مندوں کو لکھے ۔ ان میں مکتوبات امام ربانی اور رقعات عالم گیری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

جیسے جیسے زمانہ زیادہ ترقی کرتا گیا فن خطوط نویسی کو بھی فروغ ملا ۔ لوگوں کو خط جمع کرنے کا خیال ہوا تو ذاتی و خانگی خطوط بھی شائع ہونے لگے ۔ آج دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں میں خطوط کے ایسے مجموعے ملتے ہیں جو نہ صرف مصنف کی انشاء پردازی اور اعلا قابلیت کا مظہر ہیں بلکہ ان سے ان کے اخلاق و کردار اور ماحول کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔

مکتوب نگاری کی ابتدا کے سلسلے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام رقم طراز ہیں :

" مکتوب نگاری کی ابتدا سلطنت روما کے سائے میں ہوئی ۔ ممکن ہے قدیم تہذیب کے دوسرے مرکزوں میں بھی اس نے کچھ فروغ پایا ہو لیکن یہ بات

ثابت نہیں - یہ عجیب بات ہے کہ یونان میں یہ شغل نہ عوام میں محبوب ہوا اور نہ خواص میں - شاید اس لیے کہ ان کی شہری ریاستیں سیاسی اور جغرافیائی ، حالات کی بنا پر سکڑوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ ہر ریاست ایک دنیا تھی۔ شہروں میں ، تلاش کے میدانوں میں ، دوستوں کی محفلوں میں لوگ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔ دل کے غبار اور سر کے خمار کے لیے وا تھیں راہیں تھیں۔ اپنے سہارے کے علاوہ دوسرے کا وجود ان کے لیے برابر تھا وہاں کے بسنے والوں سے ادھیں اتنی ہی دل چسپی تھی یا ہوسکتی تھی جتنی ہمیں فرشتوں سے ہے یا ہوسکتی ہے - فرشتوں سے دوستی کے امکانات کم ہیں اور بفرض محال یہ تعلق پیدا ہو بھی جائے تو کیا معلوم وہ ہماری بات سمجھنے کی زحمت گوارا بھی کریں گے یا نہیں۔" (١)

یونان چوں کہ اس زمانے میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی اور خود کفیل تھی ، زندگی کی تمام آسائشیں وہاں موجود تھیں اس لیے وہاں یہ صنف فروغ نہ پاسکی - البتہ روم کا معاشرہ وسیع تھا۔ حکومت کا باقاعدہ نظام تھا - لاطینی زبان بولی جاتی تھی - اس زبان میں ہوریس اور سسرو کے مکاتیب میں روم کی علمی زندگی اور معاشرے کی جھلک خاصی نمایاں ہے - انگریزی میں خطوط نگاری کا آغاز پندرھویں صدی سے ہوا - اس دور کے تمام مکاتیب واقعات کی کھتونی ہیں۔ سولھویں صدی میں انگریزی خطوط پند و نصائح اور وعظ و موعظت کے دفتر نظر آتے ہیں اور خطوط کی سی کوئی بات ان میں نہیں ملتی۔

سترھویں صدی میں کچھ اطالوی خطوط کے ترجمے ہوئے - انگلستان میں جیمز ہاول نے بھی خطوط لکھے مگر ان کا انداز بیان ادیبانہ اور عالمانہ ہے - البتہ اس دور میں ایک شخص جان ہیورنگ میں ہے اس کے بعد ملٹن ، بیکن ، ولیم کیوپر ، گلا گولڈ اسمتھ ، گیٹس ،

---

(١) خورشید الاسلام ، ڈاکٹر ، " خطوط نگاری" (مقالہ) ، " نگار " ، کراچی (پاکستان) : ١٩٦٦ء (سالنامہ ـــ اصناف ادب نمبر) ، ص ٣٣٦

مولانا قادری "نقد و نظر" کے سلسلے میں لگی لپٹی نہیں رکھتے - رائے دینے

میں بڑے نڈر اور بے باک ہیں- لیکن ان کی ادبی بحث کبھی ذاتیات تک نہیں پہنچتی-

سیماب اکبر آبادی سے ان کے بڑے بڑے علمی مجادلے و مباحثے ہوئے - لیکن جلسے، مشاعرے اور

محفل میں ان سے نہایت خندہ پیشانی اور خلوص دل سے ملے ان کی وفات کے بعد بھی ان

کی لوح مزار کے لیے بڑی محنت و جانفشانی سے ایک تاریخ بے نظیر کہی- اسی طرح ڈاکٹر

خواجہ احمد فاروقی کو مومن کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

" میں نے مومن کی غزلیات کا تو انتخاب مع شرح و تنقید لکھ لیا ہے،
ان کی مثنویوں کا بھی انتخاب و تبصرہ لکھنا چاہتا ہوں، مگر قصہ یہ ہے کہ
میں اپنی عادت کے مطابق کسی کو بخشنے والا نہیں- ایسے مضامین بھی نہ
چھوڑوں گا :

کچھ تجھ کو نہ غم سے کام ہو ہے
ہر چند غم امام ہو ہے

ان ہی باتوں نے مومن خاں کو مقبول نہ ہونے دیا- میری تحریر سے لوگ
اور بدکیں گے - غنیمت ہے کہ ان کی غزلیں ان جذبات سے خالی ہیں-" (۱)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے خط کے جواب میں ۳۰ اکتوبر، ۱۹۳۸ء کے خط میں

اپنا حال لکھا ہے - مختصر سے الفاظ میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ حالات کی بھی تصویر

پیش کردی ہے :

" میں اچھا ہوں ..... (عید کے روز) بعض احباب نے ڈیڑھ سو (۱۵۰)
دوسو (۲۰۰) کو ایک ایک بکرا خریدا اور ڈھیر گوشت ہمارے گھر بھیج دیا-
پھر کیا تھا- کیسا بخار اور کہاں کا پرہیز- گوشت کیا تھا موٹی موٹی چکنائی سے
محاط و محصور - میں نے بھی خوب اڑایا---- صدہ گوشت کو میں بشیر روٹی کی
لاگ کے کھایا کرتا ہوں- خلاصۂ نتیجہ یہ کہ عید کے تیسرے دن سے پھر حرارت

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ، "حامد حسن قادری"، (مقالہ) ، محولہ بالا ،
ص ۲۸۵

محسوس ہونے لگی مگر اب اچھا ہوں ۔ ... ضعف بھی کچھ کم ہے ۔" (۱)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی مولانا کی شخصیت پر مضمون لکھنے کے لئے سلسلے میں بیان کرتے ہیں :" نفی ذات کا معاملہ بھی عجیب ہے اس لیے کہ خود " حل نفی" دوسروں کو نفی کرنے والے کی طرف متوجہ کردیتا ہے ۔ میں عرصے سے قادری صاحب پر مضمون لکھنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے کبھی ہمت افزائی نہیں کی ۔ ۱۲ ستمبر، ۱۹۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں" : (۲)

" آپ کا خط بڑا دل چسپ ہے ۔ ہمیشہ دل چسپ لکھتے ہیں۔ بہت لطف آیا۔ .... میں اس قابل یقیناً نہیں ہوں کہ میرے " اوپر" مضمون لکھئے ۔ میرا تو یہ حال ہے کہ " زاد و مُرد و ہیچ نکرد" ۔ آپ لکھیں گے کیا؟ " سعید" (۳) کوئی بڑی کار گزاری نہ تھی۔ کتابیں بڑا کارنامہ نہیں۔ پھر مضمون آپ کی "کارستانی " رہے گی ۔ میں تو ملاقاتوں اور باتوں کا بھی آدمی نہیں کہ آپ لطف صحبت کے واقعات لکھ سکیں ۔ خواہ مخواہ آپ کو خیال پیدا ہوگیا ہے ۔ چھوڑیے اس خیال کو ۔" (۴)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کو ۲۸ دسمبر، ۱۹۳۹ء کے خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کی خود پوشی کی انتہا ہے ۔ لکھتے ہیں :

" میری کچھ حالات ایسے بھی نہیں جو لکھے جائیں ۔ بہت خاموش اور پرسکون زندگی ہے ۔" (۵)

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ ، " حامد حسن قادری"، (مقالہ) ، محولہ بالا ، ص ۲۸۰
(۲) ایضاً، ص ۲۹۷
(۳) حامد حسن قادری ، مولانا (مدیر و مالک) ، " سعید" (بچوں کا رسالہ) ، کان پور سے جاری کیا تھا۔
(۴) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ، " حامد حسن قادری" (مقالہ) ، محولہ بالا ، ص ۲۹۲
(۵) ایضاً، ص ۲۹۲

اس پر بھی ڈاکٹر صاحب نے اصرار کیا تو ۲۵ نومبر، ۱۹۵۲ع کے خط میں تحریر فرماتے ہیں :

" میرے متعلق مضمون کو میں بعد رکھئے - اب تو ایسا معلوم ہوگا کہ میں نے خود فرمائش کرکے چھپوادیا - میں نے تو کبھی تصویر بھی نہ چھپوائی-" (۱)

مولانا کے ایک عزیز مولوی حفیظ الرحمن صاحب نے تحفتاً اپنے باغوں سے آم بھیجے مولانا ۳۰ جون ، ۱۹۵۳ء کو شکریے کا خط لکھتے ہیں کیا عمدہ روزمرہ اور رسیلی زبان ہے :

" آج ملفوف ملی اور پارسل آگیا- محفوظ پہنچا مگر اسٹیشن سے گھر تک قلی پر ٹپکتا رس ٹپکتا آیا- چھوٹے آم جیسے تھے بالکل دب کر بہہ گئے - بڑے آم بھی دب کر نرم ہوگئے - بہرحال خوب آئے - کھائے ہی جائیں گے - بہت بہت شکریہ -" (۲)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو ۷ اکتوبر، ۱۹۵۲ع کے ایک اور خط میں ایک پرچہ نکالنے کی داستان کیسے دل چسپ و رنگین انداز میں بیان کرتے ہیں :

" عصمت" کی جگہ " عفت " نکالنے کی آپ نے خوب سوچی - بھلا کہیں مجھ سے اب یہ درد سر مول لیا جائے گا- " جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا-" آپ کو مزا آئے گا یہ سن کر کہ آگرے سے گذشتہ مئی ، جون میں ایک پرچہ بالکل بطن پریس سے نکلنے ہی والا تھا - درد زہ شروع ہوگیا تھا - اشتہار چھپ گیا ، ڈا تھتی ہلاک بن گیا ، چندے آنے لگے، آگرے سے باہر بھی یارو آشنا منتظر رہنے لگے- ڈیکلریشن منظور ہوگیا ، میں اور دوسروں کے سو ڈیڑھ سو روپے لگ گئے لیکن میں نے غور کرتے کرتے آخری وقت میں یہی مناسب سمجھا کہ اس قدر نقصان گوارا کرنا بہتر ہے - آئندہ کے درد سر سے پرچہ بالکل بے ضرر و بے خطر تھا- یعنی بچوں کا ، جیسا " کھلونا" وغیرہ ہے - غرض قصہ ختم کیا- تمام شرکاء ، میں سب سے زیادہ بار مجھ پر تھا ، میں نے ہمت ہار دی-" (۳)

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ، " حامد حسن قادری"، محولہ بالا (مقالہ) ، ص ۲۹۲
(۲) ایضاً ، ص ۲۸۸
(۳) ایضاً ، ص ۲۸۷

ایک اور موقع پر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے اپنی ترتیب کردہ کتاب

" مثنوی مرزا شوق لکھنوی" پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی اس کے جواب میں یکم فروری ۱۹۵۰ع

کو لکھتے ہیں :

" کل کارڈ ملا۔ بالکل شاعری کا مزا آگیا۔ میں تو نثر میں بھی شاعری کا قائل ہوں.... معلوم ہوتا ہے رسیدی خطوط پر کوئی خاص زوال اور آفت ہے .... مجھے شکایت کرنی ہی تھی ۔ جب کبھی آپ کا خط آتا ضرور لکھتا اب معلوم ہوا کہ آپ نے دونوں مرتبہ رسید لکھی مگر نہ پہنچی۔ چلیئے بات ختم ہوئی ۔

باقی، مقدمہ میں واقعی نہیں لکھ سکتا۔ آج کل تصنیف و تالیف ، لکھنے پڑھنے سے بالکل دست کش ہوں ۔ طبیعت بالکل متوجہ نہیں ہوتی اور یہ مبالغہ آپ کا فضول ہے کہ چند سطریں ــــ ایک سطر ــــ ایک لفظ ، بھلا اس کی کیا تک ہے ..... اگر میری جمود کی یہی حالت رہی تو آئندہ شاید یہ سلسلہ بالکل ہی ختم ہوجائے ۔ مگر میری دل و دماغ کی یہ کیفیت ابھی لوگوں کی عقل میں نہیں آسکتی ۔ خدا کرے آپ کی عقل میں آسکے اور یقین کرسکیں۔" (۱)

تاریخ گوئی کے سلسلے میں حفیظ ہوشیار پوری کے نام ایک خط میں ان کی تاریخ گوئی کی تعریف اور اپنے شوق تاریخ گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" کرم نامے کا بہت بہت شکریہ ۔ آپ کا تذکرہ عزیزی خالد حسن قادری نے اکثر لکھا۔ مگر تعارف کی کوئی تقریب نہ نکلی مدت کے بعد یہ بہانہ خوب نکل آیا۔ آپ کی تاریخ اخبار" الجمعیۃ " میں بھی چھپی تھی ۔ یہاں بھی لوگوں نے بہت پسند کی ۔ میں نے طاہر فاروقی صاحب کو تعریف

---

(۱) احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ " حامد حسن قادری"، (مقالہ) ، محولہ بالا ، " نقوش ــــ شخصیات نمبر" ، ص ۲۸۶

لکھی کہ اس مصرع پر خوب نظر پہنچی - بہترین تاریخ نکلی ہے - اس کے بعد رسالہ " نقش" کراچی میں بھی آپ کی تاریخیں دیکھیں یہ بھی خوب ہیں - تاریخ کا ایک تاریخی عنوان بھی نکلتا تھا ــــ " شہادت کی تاریخ " ـ ـ ــ ۱۹۵۱ء

میری تاریخ گوئی کا عجیب عالم ہے - علم و ادب کے مشاغل میں شاید تاریخ گوئی سے زیادہ فضول و غیر نافع کوئی شغل نہ ہوگا - مگر میں نے اس میں بڑا وقت ضائع کیا ہے - پچاس سال سے زیادہ اس خبط میں مبتلا ہوں - کئی ہزار مادے نکالے ہیں- آپ نے میری جو تاریخیں ملاحظہ فرمائیں وہ مشہور لوگوں کی وفات کی ہوں گی لیکن میں نے ان کے علاوہ بے شمار تاریخیں دوسرے حالات و واقعات کی لکھی ہیں ......

ان باتوں میں آپ کے خط کا جواب رہ گیا- آگرے میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا اب صفر ہے - انتہا یہ کہ کچھ شعرا اچھے تھے وہ بھی ہجرت کر گئے - یہ عجیب بات ہے کہ آگرے میں اردو فارسی کی کتابوں کی کوئی بڑی دکان کبھی ہوئی ہی نہیں- چالیس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں - پہلے بھی نہ تھی - اس زمانے میں ایک دکان درسیات کے سلسلے کی تھی اس کے ذریعے سے ہم کالج کے لیے دوسری علمی کتابیں بھی دہلی، لکھنو ، حیدرآباد وغیرہ سے منگالیتے تھے - اب وہ دکان بھی ختم ہوگئی - اس کے مالک حال ہی میں ہجرت کرگئے -

لیکن آپ کو جن کتابوں کی ضرورت ہو وہ میں مہیا کرسکتا ہوں- یعنی کتابوں کے نام آپ لکھیے میں نول کشور لکھنو اور دہلی وغیرہ سے منگاکر آپ کو بھیج دوں گا - جامعہ ملیہ دہلی کی فہرست اس خط کے ساتھ بھیجتا ہوں ..... تصوف کے تذکرے ، مکتوبات ملفوظات نئے مکتبوں میں تو کہیں نظر نہیں آتے- ہیں تو نول کشور کے ہاں ہیں- اس کی فہرست منگاکر بھیجوں گا- " (۱)

مولانا بڑے مصروف اور مستعد آدمی تھے ہر کام کو نہایت ذمہ داری سے انجام دیتے تھے - ڈھاکہ سے منظور صدیقی کے ایک خط کے جواب میں ۵ دسمبر، ۱۹۵۱ء کو اپنی مصروفیتوں

---

(۱) " خطوط قادری، بنام حفیظ ہوشیار پوری"، " نقوش : لاہور، جنوری، ۱۹۷۶ء، (سال نامہ) ، ص ۳۹۲

کے ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ استفسارات کے جوابات دیتے اور تنقیدی پہلو نمایاں کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :

" آپ کا کرم نامہ اور اس کے بعد کتابوں کا پارسل ملا - دونوں کا شکریہ - آپ کے خط کے تینوں سوال دل چسپ ہیں مگر جواب میں طول چاہتے ہیں - اس زمانے میں یہ خط ذرا بے موقع آیا - آج کل بڑا کام ہے - بی - اے - ایم - اے کے امتحان ۲۲ مارچ سے شروع ہونے والے ہیں - سال کے آخری کام بھی کالج میں نمٹانے ہیں ...

یہ دل چسپ بات ہے کہ ڈاکٹر شادانی صاحب کو شاعری پر امرد پرستی کا اثر ثابت کرنے کا بڑا شوق ہے - ڈاکٹر صاحب سامنے ہوتے تو میں اس پر کچھ فقرے چست کرتا مگر آپ ان کے شاگرد ہیں - آپ کو ناگفتنی بات کیا لکھوں - میں ذرا ملا نہیں ہوں - ڈاکٹر صاحب کی شوخ طبعی میں بھی شک نہیں - مجھے بھی مولوی عبدالحق صاحب نے " اردو " میں لکھا تھا کہ : " قادری صاحب کی طبیعت میں شوخی ہے -"

بہرحال میں اس قدر تو مانتا ہوں کہ اردو شاعری میں محبوب کی تذکیر اور اس کے لوازم فارسی شاعری کی امرد پرستی سے آئے - اور یہ " فن شریف " کسی حد تک مقبول بھی تھا - لیکن یہ نہیں مانتا کہ ننانوے فی صدی شاعر واقعۃً امرد پرست تھے - اور بجز اس کے کوئی سبب نہیں ہے بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ یہ صورت حال روایت پرستی کے سبب سے بھی ہے ، عشق حقیقی کے خیال سے بھی اور شرم و حیا کی وجہ سے بھی -

ڈاکٹر صاحب پوچھتے ہیں کہ " کہساری دنیا کی غیرت و حمیت صرف ہندی مسلمانوں کے حصے میں آگئی ہے ؟ " اس کا ترکی بہ ترکی جواب تو یہ ہے کہ بلا شبہ و لاریب ساری دنیا سے زیادہ ہم غیرت و حمیت کے ٹھیکیدار ہیں - لیکن ایمان و انصاف کی بات بھی یہی

ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں پردے کے سبب سے جو عفت و غیرت کی حفاظت رہی ہے وہ نہ ایران میں رہی نہ عرب میں ، یورپ کا تو ذکر ہی کیا ہے -----

اب دوسرے سوال کو لیجئے یعنی اس شعر کا مطلب :

" وہ اور سے مخاطب ، میں اور سے مخاطب
پابندیوں نے کھولی یہ راہ ہم کلامی

میں ڈاکٹر صاحب کا مطلب سمجھ گیا ، بلا شبہ خوب بات کہی ، بالکل نئی جو کسی نے نہ کہی تھی اور بالکل واقعہ جو بار بار پیش آیا ہے - عاشق و معشوق میں اس واقعہ کا دیکھنا مجھے یاد نہیں مگر دو سرے لوگوں میں بہت دیکھا ہے - دو طالب علموں یا دو دوستوں میں کسی وجہ سے بد مزگی پیدا ہوگئی ہے - بول چال بند ہے - دونوں موجود ہیں اور آپس میں گفتگو کرنے کے بجائے دوسرے لوگوں سے مخاطب ہیں لیکن روئے سخن ایک کا دوسرے ہی کی طرف ہے - کہہ رہے ہیں کسی اور سے ، لیکن مقصود سنانا ہے اسی کو جس سے کلام و سلام بند ہے - وہ بھی اسی طرح اس کا جواب دیتا ہے - یہ کیفیت معشوقہ و عاشق میں بہت دل چسپ ہوگی ، اور پابندی کے سبب سے بے شک ہوسکتی ہے -

جو حضرات شعر کو سمجھنے سے قاصر رہے انھوں نے غور کرنے کی زحمت نہ کی ورنہ " یہ راہ ہم کلامی" بالکل صاف ہے - " پابندیوں" میں ذرا گنجلک ہے - مگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ نہیں رکھا جاسکتا - میں نے غور کرلیا - سارے شعر ہی کو کسی اور طرح کہا جائے تو الگ بات ہے -

میں مومن خان کے سے شیوہ کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ کہ حد اعتدال سے نہ نکل جائے - یہ شعر ذرا اعتدال سے بڑھ گیا - مگر میں اس کو جائز رکھتا ہوں -

تیسرے سوال کا ایسی آسانی سے جواب دینے سے میں بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح معذور ہوں کہ خالص تغزل میں کسی ایک شاعر کو بہترین بتادوں ۔ شاعری میں میرے نزدیک یہ دیکھنا کافی نہیں کہ کیا کہا اور کتنا کہا بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح کہا۔ مجازی عشق و محبت کی شاعری میں جذبات ، معاملات ، ادائیں، شانیں سبھی نے لکھیں مگر کثرت و وسعت سے قطع نظر کرکے کہنے کی تازگی اور خوبی میں میر کے بعد مصحفی ، غالب ، مومن ، داغ اور ریاض کے نام لیے جاسکتے ہیں ۔ اس خمسہ کے ارکان اپنی انفرادی خوبیوں میں ایک دوسرے سے اس قدر الگ اور ممتاز ہیں کہ ایک کا انتخاب کرنے سے دوسروں کی خوبیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً مومن کو لے لیجئے تومصحفی کا سوز ، غالب کی فکر، داغ و ریاض کی زبان اور شوخی رہی جاتی ہے ۔ لیکن اگر کسی ایک ہی کو لینا ہو تو ریاض بہتر رہیں گے ۔ میں اپنی پسند سے تو عشقیہ شاعری ہو یا فکریہ ، غالب ہی کو بہترین سمجھتا ہوں۔

=======

یہ مصرعہ اصل میں یوں ہے :" آپ جانیں یہ بھرا گھر ہے سبھی کچھ ہوگا" میں نے (یہ) کو (کہ) کردیا تھا ۔ دوسرا مصرع لکھدوں تو پورا شعر غیر مربوط ہوجائے گا ۔ اس لیے کہ یہ مضطر خیرآبادی کے ایک طویل قطعہ کا مصرع ہے ۔ دوسرا مصرعہ گفتگو کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق قطعے کے مضمون سے ہے ۔ پہلے مصرعے میں ضرب المثل کی سی شان تھی اس لیے یاد تھا دوسرا مصرع قطعہ دیکھنے سے معلوم ہوا۔ مضطر نے اس قطعے میں ایک خیالی عاشقانہ و شاعرانہ واقعہ تمثیلی رنگ میں لکھا ہے ۔ مضطر کے ہم عصر داغ کے شاگرد مولوی عبدالحق بے خود بدایونی نے اس کو خمسہ کیا ہے۔ اب سے ۶۳ سال پہلے ۱۳۰۷ھ میں کسی صاحب نے اس پر دیباچہ لکھ کر کتابی صورت میں

چھپوایا تھا۔ وہ کتاب میری پاس تھی۔ میں نے اس پر اپنا مختصر سا نوٹ لکھ کر جون ، ۱۹۳۰ء کے " زمانہ" کان پور میں پوری کتاب چھپوادی تھی۔ اس کتاب کانام " صبر و شکیب کی لوٹ " ہے -

اس طرح کا ایک دل چسپ قطعہ مولوی کفایت علی ھاپوڑی کا ہے - جس کو بے خود بدایونی نے تضمین کیا ہے - اس کو بھی انہی حضرت مرتب نے اپنے مقدمے کے ساتھ اسی زمانے میں چھپوایا تھا۔ میں نے اس کتاب کو بھی"زمانہ" میں ۱۹۳۹ء میں چھپوادیا تھا۔ اس کا نام ہے " جوش و خرد کی دکان" -

مضطر کی ایک اور طویل نظم " دکھی کی پکار" چھوٹی سی کتاب کی شکل میں میری پاس تھی - یہ نظم مضطر نے مولانا حالی کی " مناجات بیوہ" کی بحر و طرز میں لکھی ہے - بلکہ زبان اور مصرعوں کی ساخت میں کچھ لے حد سے بڑھادی ہے - یہ اکتوبر، ۱۹۲۱ء میں تیسری بار چھپی ہے - اس کو بھی میں نے اپنے تعارف کے ساتھ " زمانہ" ستمبر، ۱۹۳۱ء میں شائع کرادیا تھا۔

میں نے مضطر کو دیکھا بھی ہے اور سنا بھی - رام پور کے سرکاری مشاعروں میں آتے تھے۔ انیسویں صدی کے بالکل لکھنوی و امیری طرز کے شاعرہیں - ان کے کلام کا انتخاب تو ضرور دل چسپ ہوگا۔ ویسے کچھ مزیدار شاعر نہیں ہیں امیر مینائی کے شاگردوں میں جلیل و حفیظ جون پوری ان سے بہتر ہیں۔

سنا تھا کہ مضطر کا ایک پورا دیوان " حمد خدا" کے نام سے اور ایک" نعت مصطفی " کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مگرمیں نے نہیں دیکھے - عشقیہ دیوان بھی غالباً شائع نہیں ہوا۔ جاں نثار اختر ان کے لڑکے ہیں۔ مگروہ جدید اور کمیونسٹ شاعر ہوگئے اس لیے شاید باپ کا کلام شائع کرنے کی کوشش نہیں کی -

اب آپ کے سب سوالات کے جواب ہوگئے - کچھ ضرورت سے کم ، کچھ ضرورت سے کچھ زیادہ - ڈاکٹر صاحب سے سلام کہئے - میرا خط ان کو دکھادیا کیجئے -

۲۰ فروری کو یونی ورسٹی کے جلسے تھے- مجنوں صاحب بھی آئے تھے- میں فارسی بورڈ میں ہوں وہ اردو بورڈ میں - ان سے ڈھاکے کے سفر اور آپ کے خط کے متعلق بھی گفتگو رہی - بڑے دل چسپ آدمی ہیں" (۱)

۶ اپریل ، ۱۹۵۱ء کو ظہیر صدیقی صاحب نے ڈھاکہ سے مولانا کو اگلی خط لکھا اور اس میں دیگر کئی باتیں دریافت کرنے کے علاوہ یہ بھی پوچھا کہ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے شادانی صاحب کے متعلق کیا رائے دی- مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ ان کی اعلا ظرفی اور بلند کرداری کا ایک اعلا ثبوت ہے - لکھتے ہیں :

" بہترین غزل گو کے مسئلےمیں آپ نے جذبات و محسوسات کے گہرے اعلے" ہونے کی شرط نہیں لگائی تھی- اعلا عشقیہ شاعری کی اصل روح کا سوال ہو تو میر و غالب کو چھوڑ کر التہبہ کا نام ہے - میں نے ریاض کو اور دوسروں نے آتش مومن اور داغ کو صرف حسن و عشق کے جذبات و معاملات کی کثرت و وسعت رنگینی و رنگارنگی کے سبب سے تجویز کیا ہے - اس سے بحث نہیں کہ ان میں گہرائی یا آفاقیت ہے یا نہیں- یہ اوصاف اگر ملیں گے تو چوٹ کھائے ہوئے دلوں میں یا فطرت انسان اور فطرت عالم سے ہمدردی رکھنے والے ذہنوں میں ہی ملیں گے - آتش کے لکھنوی رنگ میں صفائی اور تصنع بے حد ہے - مومن اور داغ شاہد باز ہیں ، ریاض سستے جذبات سے کھیلنے والے ہیں- ان میں اعلا عشقیہ شاعری کو ڈھونڈنا عبث ہے - یوں دس دس بیس بیس شعر مل جائیںگے- یہ بات مصحفی کے دور تک ملتی ہے ، خود مصحفی میں ملتی ہے - پھر داغ کے دور میں حالی جیسوں میں ملتی ہے - حالی کی غزلوں کا بالا ستیعاب مطالعہ کیجئے بہت ہی خوب غزل گو

---

(۱) " خطوط قادری ، بنام پروفیسر ظہیر صدیقی" ، (غیر مطبوعہ) مملوکہ ماجدحسن فریدی ، پسر مولانا قادری ۔

ہے - پھر بیسویں صدی میں ہمارے زمانے میں ملتی ہے -

میں نے آپ کو دیکھا نہیں، مگر آپ بڑے خوش اعتقاد سچے، بھولے آدمی معلوم ہوتے ہیں- آپ لکھتے ہیں :

" قیاس کہتا ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے (مجنوں نے) شادانی صاحب کے متعلق کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا ہوگا- کاش آپ لوگوں کی گفتگو کا یہ حصّہ معلوم ہوسکتا-"

اللہ تعالی فرماتا ہے : یا یھاالذین آمنوالا تسئلو عن اشیاء ان تبد لکم تسو کم (مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمھیں بری لگیں-)"

میں آج کل امتحانوں کی کاپیوں میں مصروف ہوں، سارا اپریل یوں ہی گذرے گا-" (۱)

مولانا کو فارسی سے بڑی رغبت تھی بیدل، غالب، اور اقبال کا فارسی کلام نہایت ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے - انھوں نے بیدل کے کلام کا انتخاب بھی کیا تھا مگر شائع ہونے کی نوبت نہ آئی - ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کو ایک خط میں بیدل کے متعلق لکھتے ہیں :

آگرہ
۱۵ اگست ، ۱۹۴۰ء

دوشہ میاں (۲)

السلام علیکم

" کل لفافہ ملا - اس کے چلنے کے بعد میرا لفافہ بھی مل گیا ہوگا- راشد (۳) کے نام خط بہت دل چسپ ہے - اس مزے کا خط ہر شخص نہیں لکھ سکتا - رکھنے کے قابل ہے- محفوظ رکھوں گا - سب نے پڑھا اور مزے لیے -

---

(۱) " خطوط قادری، بنام پروفیسر نظیر صدیقی"، (غیر مطبوعہ ، سلوکہ ماجد حسن حسن قادری، پسر مولانا قادری-

(۲) پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی کی عرفیت " دوشہ کڈ میاں" ہے - قادری صاحب بھی موصوف کو اسی طرح مخاطب کیا کرتے تھے-

(۳) راشد حسن قادری مولانا کے سب سے چھوٹے صاحب زادے ہیں اور حبیب بینک ، کراچی میں سینئر ڈپٹی کنٹرولر آف پرائجیز ہیں-

مولوی سید حامد علی صاحب (۱) نے خالد کو شاہد کے ساتھ والدہ وغیرہ کے قافلے میں بھیج دیا۔ خود کو فقط جلدی ملنے کی امید نہیں۔ استعفے کے بعد تین چار مہینے رکنا پڑیگا۔ اور کہیں سے دام سفر خرچ کے لیے نہیں مل سکتے۔ اس لیے بے چارے حیران پریشان پڑے ہیں ۔ استادوں کی نیش زنیاں سہہ رہے ہیں ۔ کیا کریں۔"

حضرت قبلۂ عالم روحی فداہم (۲) کے حج کا تذکرہ کراچی ہی میں سن لیا تھا ۔ پھر علی پور شریف میں دن رات یہی ذکر و فکر تھا۔ جہاز والوں کی اطلاع و ہدایات و پروگرام میں سامنے ہی آئے تھے۔ اللہم تعالی مبارک فرمائے۔ بخیریت واپس لائے ۔ اور پھر قدم بوسی و زیارت نصیب فرمائے ۔ پہلے کسی ایسے ہی موقع پر کسی نے کہا تھا کہ حضور تو بے شمار حج کر آئے ہیں پھر کیا ضرورت ہے تو جواب میں حافظ کا یہ شعر پڑھ دیا تھا :

محرم مکن ز عشق ولے اے مفتی زمان
معذور دار مت کہ تو او را ندیدہ ای

بیدل کا شعر نول کشور کے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۷۷ع / ۱۲۸۷ھ میں صفحہ ۲۳ پر ہے ردیف الف کی آخری غزل ہے ۔ میں نے تو سارے دیوان کا انتخاب الگ لکھ لیا ہے۔ مجھے یہ شعر اور اس کا یہ مقطع یاد تھا :

علاج زخم دل از گریہ کے ممکن بود بیدل
بشبنم بخیہ نتوان کرد چاک دامن گل را

---

(۱) مولوی حافظ سید حامد علی صاحب اس وقت وکٹوریہ انٹر کالج میں ہیڈ مولوی تھے آج کل کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

(۲) حضرت الحاج پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ قادری صاحب ، فاروقی صاحب اور ان کے سارے خاندان کے شیخ طریقت اور مقتدا تھے ۔ آپ نے ۳۰ اگست، ۱۹۵۱ع کو علی پور سیداں ، ضلع سیال کوٹ میں وصال فرمایا۔"

میں نے اس شعر کو جب پڑھا تھا مطلب سمجھ لیا تھا اور شعر کے الفاظ کو درست سمجھا تھا۔ اب آپ نے شبہے میں ڈال دیا۔ مگر کابلی شعر اور آپ کا سنا ہوا دونوں صحیح نہیں ۔ درست وہی نول کشور والا معلوم ہوتا ہے : یعنی

فنا مشکل کند منع تپش از طینت عاشق
بساحل می برد ہر موج این دریا تسلسل را

" ہر موج دریا این تسلسل را" نہیں بلکہ " ہر موج این دریا تسلسل را" ۔ " این" کا لفظ بہرحال بے وجہ رکھا ہے ۔ " این دریا" اور " این تسلسل" دونوں فضول ہیں۔ مگر اس طرح کے اضافے یا حشو بیدل کے ہاں بہت ہیں۔

(ایسا ہی " این " اس شعر میں بھی ہے اور ایسا ہی بے وجہ ہے :

درین دریا ز بس فرش است اجزائے شکست من
بہر جا می روم چون موج بر خود می دہم پا را)

" فنا" فاعل ہے ۔ " منع تپش" مفعول اول ۔ " مشکل" مفعول ثانی یا متمم فعل ناقص متعدی (کند) " از طینت عاشق" ۔ متعلق منع تپش ۔ طینت عاشق سے تپش روکنا۔ تڑپنے سے باز رکھنا ۔ فنا طینت عاشق سے منع تپش کو مشکل کردیتی ہے ۔ عاشق کی قسمت میں فنا ہونا ہے تو تڑپنے سے کیوں باز رہے ۔ تڑپتا تڑپتا ہی مرے ۔ مرتے مرتے تڑپے جائے۔ دیکھو موج کی تقدیر میں ساحل پر پہنچ کر فنا ہونا ہے ۔ مگر ساحل تک تڑپتی ہوئی جاتی ہے ۔ ہر موج دریا ساحل تک تسلسل کو قائم رکھتی ہے ۔ میرے خیال میں مطلب صاف ہوگیا۔

میرا کوئی مضمون بیدل پر کہیں نہیں چھپا۔ ۱۹۳۲ع میں نے دیوان بیدل کا انتخاب کیا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا تھا۔ سوچا تھا کہ پہلے نثر بیدل کا مختصر تعارف کرادوں ۔ چناں چہ نکات بیدل اور چہار عنصر بیدل کا تعارف ، نمونے ، ان کی تشریح و

تنقید شروع کی تھی۔ لکھتے لکھتے گاڑی رک گئی - تو پارسال پھر خیال آیا اور نثر کو ختم کردیا۔ یہ کوئی بیس صفحے ہوئے - اس کے بعد نظم بیدل کو لیا تو چند سطریں ہی لکھ سکا۔ خیال آیا کہ پہلے بیدل کے زمانے کا طرز اور معاصرین کی خصوصیات اور سوچے لکھنے چاہیئں۔ تمام معاصرین کی فہرست بنائی - تذکروں میں نشانات رکھے مگر لکھنے کی نوبت نہ آئی - اب آپ کا خط شاید محرک ہوجائے۔ اس حساب سے میری قلم کے پچاس صفحے ہوجائیں گے - اور سو صفحوں کا انتخاب - یہ کتاب چھپوا دو تو لکھ دوں - فارسی یہاں تو ختم ہے - وہاں ایم اے میں رکھا جاسکتا ہے - مگر اب ایک الجھن اور پیدا ہوگئی۔

مجھے بیدل کا ایک قلمی مکمل دیوان حال میں ملا ہے - بالکل اتفاق سے - آپ کے شاگرد بدرالدین (۱) جو یہاں آئے تھے تو انھوں نے اپنی روایات نکالیں - اتفاق سے مشیت (۲) ان کے گھر گئے - یہ دیوان بھی تھا - وہاں سے لے آئے - مجھ سے ذکر آیا تو میں نے لے لیا - اب مشکل یہ ہے کہ یہ دیوان بالکل الگ ہے - نول کشور والے کی کوئی کوئی غزل اس میں بھی ہے - باقی ہزار ہا غزلیں نئی ہیں۔ چار سو صفحے کا دیوان ہے - اب اس کے انتخاب کا سوال سر پڑ گیا۔ وہی مہینوں برسوں میں پورا کیا تھا۔ اور اس پر طرہ یہ بھی ہے کہ پارسال جون میں رام پور اسٹیٹ لائبریری کی سیر عرشی صاحب (۳) کے ذریعہ سے کی تھی - وہاں دیوان بیدل کے کئی قلمی نسخے دیکھے - ایک بڑا طویل و

---

(۱) بدرالدین صاحب الخطری پنجاب کے ایک گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادب کے پروفیسر ہیں

(۲) ڈاکٹر مشیت الدین صاحب فریدی پیرزادگان فتح پور سیکری میں سے ہیں - آپ اس زمانے میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو کے پروفیسر تھے۔ اب عرصے سے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہیں۔

(۳) مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری مشہور عالم ، محقق ، نقاد ، مصنف اور محسن علم و ادب کی حیثیت سے ہمیشہ امتیاز کے حامل رہیں گے -

عرش نقرئی و طلائی تھا۔ شیشے کے اندر رکھا رکھا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو جو غزل کھلی ہوئی تھی وہ کلیات نول کشور والے سے الگ تھی۔ ممکن ہے تمہارا کابلی مطبوعہ اس کی نقل ہو بہو ہو - یعنی طول و عرض میں بھی۔ یا یہی اس نئے قلمی کے مطابق ہو -

بہرحال اب بیدل پر ریسرچ کے لیے، بلکہ مین متن و انتخاب کے لیے بھی سب نسخوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے - کابل و پشاور دور سہی رام پور تو پاس ہے - اگرچہ ممکن ہے اب اسٹیٹ لائبریری معناً دور ہوگئی ہو - نئے انتظام کا حال معلوم نہیں -

نول کشور والے میں " تسلسل را" کی ایک غزل ہے - میرے قلمی میں دوسری غزل ہے - کابلی میں یہی دونوں ہوں گی - قلمی غزل مگر مطبوعہ سے بہتر نہیں ہے - یہ شعر اور مقطع ٹھیک ہیں :

به بی رفع کجی مشکل بود از طبع کج طینت
بزور سهل نتوان راست کردن قامت پل را

به پستی نیز معراجیت گر آزادهٔ بیدل
صدائے آب شو ، ساز ترقی کن تنزل را

بیدل کی طویل ترکیبوں کے بعض دل چسپ نمونے دیکھئے :

بهشت عافیت رنگ جهان آرزو یابی
در آغوش نفس گر بشکنی عرض تمنا را

===xxx===

دو جهان ساغر تکلیف ز خود رفتن ماست
دل هرکس بطپد قافیه تنگ است این جا

(جہاں ساغر کی کیا تک تھی !!)

صبح نفس متاع جہان هداہتم ناچیدہ رفتہ است بشارت دکان ما

===xxxx====

بہار اندیشۂ صد رنگ عشرت کرد بسمل را
کف خونی کہ برگ گل کند دامان قاتل را

===xxx===

حیرت نگاہ شوکت نو میدی خودیم کاین هفت عرصہ یک کف بے دستگاہ اوست

===xxx====

عجیب بڑھے آدمی تھے۔ یہی کجی غالب میں آگئی تھی ۔ مگر نازک خیالیاں بھی خوب خوب کی ھیں۔ دیکھئے :

درین گلشن چو گل یک پر زدن رخصت نمی باشد
مگر از رنگ باہی نسخہ بال افشانی ما را

گویا رنگ اڑنا بھی بال افشانی ہی کا ایک نسخہ ھے ۔ ایک دوسری صورت :

نزاکت هاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

غبار احتیاج آن جا کہ دامان طلب گیرد
دران سمت آبروء هرکہ برفتار آمدی پا را

بجوش بے خودی ما گرم کن هنگامۂ عشرت
کہ می نامد اندر این جا شکست رنگ مینا را

مینا کا نام شکست رنگ رکھا ھے۔ شکست رنگ کو مینا سمجھو ۔ بے خودی میں شکست رنگ هو تو سمجھو هنگامۂ عشرت گرم ھے ۔ شراب کے دور چل رہے ھیں۔

نمی سازد متاع هوش باپوست خریداران بود نقد ز خود رفتن، نگاہ جلوہ سودا را
دل آسودۂ ما شورا مکان در نفس دارد گہر دز دیدہ است این جا نفس موج دریا را

گویا کوزہ میں بھی وہی موج دریا موجود ہے - مگر اس نے موج کی باگ کو روک لیا ہے -

دمیِ دامن وصل ست بخود پیچیدن   غنچہ گر واشد از خویش گلشن درچنگ است

===xxx=====

وسعت جاوید در شہطِ عالیِ آرزوست   بال و پر گر جمع گردد آشیانے می شود

====xxx====

خاکے ، موج بحر ، ندارد جبیں شان   قومے کہ از گداز دل خود وضو کنند

===xxx===

گر بسوزد آہ مجنوں بر رخ لیلی نقاب   شمع می بالا بخود چندان کہ محمل می شود

===xxx====

نالہ ھا در شکی وام خموشی داریم   شعلہ پرواز در آغوش شکست پرما

بس کہ جاں سختیٔ ما آئینہ خجلت ماست   ھرکہ شد آب ز درد تو گزشت از سرما

بیدل از ھمت مشہور بے عشق مپرس   بے گداز دو جہان پر نشود ساغر ما

===xxx====

غرض بیدل پڑھنے لکھنے دونوں کے قابل ہے - کچھ پڑھ تو لیا مگر لکھنا مشکل ہے -

میں نے اب آکر اپنے مضامین پھر یکجا کئے - ضخامت تو کافی ہوجائے گی - مگر مضامین سب اچھے نہیں ہیں متفرقات سے ہیں - تین چار ریڈیو کی تقریریں ہیں - فانی کے نقاد والا مضمون " شفق " اور " سب رس " کے لیے الگ الگ لکھا تھا - اس کو ایک مضمون کرنا ہے - غرض ان میں الجھن کافی ہے - اس لیے بجائے نقل کرانے کے بجنسہ بھیج دوں - آپ جو چاہیں کریں -

مٹی کا " شاعر " آگرہ آپ کو ملا یا نہیں - جولائی میں لاہور بھیجا ہوگا - میں

---

(۱) " شفق " مولانا کا آگرے سے جاری کردہ ماہنامہ ہے جو سینٹ جانس کالج آگرہ کی میگزین کی شکل میں شائع ہوتا تھا - کراچی آکر ان کے منجھلے صاحب زادے ماجد حسن فریدی نے مولانا کی اس روایت کو برقرار رکھا - اب بھی گاہ گاہ شائع ہوتا ہے -

پاس چلنے سے پہلے کراچی میں آیا تھا۔ آپ کا پتا اعجاز (۱) کو بھیج مل میں دے دیا تھا۔ اس میں میرا مضمون اقبال پر ہے - چھ سات صفحے کا راجندر ناتھ شیدا کے اعتراضات کا جواب ہے - اور بہت تیز ہے - اعجاز ملے تھے کہتے تھے کہ وہ بہت چراغ پا ہو رہے ہیں۔ باقی خیریت - سب کو سلام بچوں کو بھی سب کو - والسلام

احقر

حامد حسن قادری"

ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب کو ایک خط میں داغ کی شخصیت ، شاعری اور بہت سی ان باتوں کے متعلق لکھتے ہیں جو اس کے متعلق ہنوز صیغہ راز میں ہیں -

۱۲ فروری کے ایک اور خط میں ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی کے خط کے جواب میں تحریر کرتے ہیں :

" ادب غیر فانی " کے متعلق میں نے آپ کے خط کی نشان دہی کے لیے لکھ دیا تھا لیکن سوچتا ہوں تو یہ کچکچاہٹ آپ کی موجودہ زندگی کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس فضا کو بدلنے کی کوشش کیجئے - اور وہ اس طرح کہ اپنے اہل و عیال کو بلائیے - بڑا مشکل مسئلہ ہے - اور نہایت دشوار مرحلہ - لیکن کوئی تدبیر نکالئے - ایک مرتبہ جاکر سب کو لے آئیے -(۲) ایک دفعہ سب آجائیں تو بالکل مقیم ہوجائیے - یہ نوکری بہت اچھی

---

(۱) جناب اعجاز صدیقی ، بلند مرتبہ شاعر ، ماہنامہ " شاعر" کے مدیر اور علامہ سیماب اکبر آبادی کے صاحب زادے۔

(۲) پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب جنوری، ۱۹۵۰ع سے ستمبر، ۱۹۵۳ع تک ڈھاکہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی کے ریڈر کے عہدے پر فائز رہے - وہاں کی آب و ہوا سخت ناسازگار ثابت ہوئی - اس لیے اہل و عیال بدستور پشاور میں رہے - اور وہ بھی موقع پاتے ہی استعفادے کر کمتر معاوضے کی استادی پر اسلامیہ کالج پشاور واپس چلے آئے -

ہے - اس سے بہتر ملنی مشکل ہے - آپ کی قدر وہاں والے ضرور کرتے ہوں گے - آپ کا جانا کوئی نہ چاہتا ہوگا- وہاں کے ماحول سے تنگ دل ہونا اصل میں ابھی پریشانیوں کے سبب سے ہے - سکون و اطمینان ہوجائے گا تو یہ بات جاتی رہے گی - پھر آگے انشا اللہ ترقی اور اعزاز ہی ہے - آپ کے اس خط سے میرے دل پر بڑا اثر ہوا-

شوکت صاحب (۱) کے مضامین میں نے ابھی پڑھے ہی نہیں - رسالوں اور تحریروں کے بڑے حوالے ہیں- جوڑ ملانا اور یاد رکھنا بڑا مشکل ہے - محاکمہ میں بھی بڑا قال اقول کرنا پڑتا ہے - اس سے دل گھبراتا ہے - کوئی سیدھی سی بات ہو تو لکھدی جائے - نظیر صدیقی (۲) نے ہر چند اصرار کیا کہ " نشاط رفتہ " (۳) کے لیے تبصرہ اثر پر محاکمہ کردوں - مگر میں نے انکار کردیا-

" نگار" کے " داغ نمبر" میں شوکت صاحب کا مضمون بہت دل چسپ ہے - شاید دیر سے پہنچنے کے سبب آخر میں ہے - وقار عظیم صاحب نے بھی بڑی محنت سے لکھا ہے باقی خیر صلا ہے - خود نیاز صاحب بھی کچھ بہتر نہ فرماسکے - فراق تو صرف کچکچائے ہی ہیں - ڈاکٹر اعجاز حسین کے مضمون کی ذوجیت لوح پیشانی پر لکھی ہوئی ہے :

" داغ ـــــ ترجمان و رہنمائے دور

---

(۱) ڈاکٹر سید شوکت سبزواری جو اس زمانے میں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں سینئر لیکچرر تھے - بعد میں ترقی اردو بورڈ کراچی آگئے اورآخر تک لغات کبیر کے مدیر اول رہے -

(۲) پروفیسر نظیر صدیقی صاحب بھی اس زمانے میں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے- بڑے مشہور ادیب و شاعر اور نقاد ہیں - آج کل اسلام آباد کالج میں ہیں-

(۳) " نشاط رفتہ " جناب ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی مرحوم کا مجموعۂ کلام -

الفاظ کے انتخاب و ترکیب کے لیے بھی موزونیت اور لطافت درکار ہے ۔ "داغ نمبر" میں حالات زیادہ ہیں تنقید کم ۔ آٹھ تنقیدی مقالوں میں سے پانچ میں لب و لہجہ اور شاہد پرستی پر نقادوں نے توجہ صرف فرمائی ہے ۔ داغ میں ان کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ داغ اپنی طبیعت و عادت سے مفکر و فلسفی نہ تھے۔ سوز و گداز ، عجز و نیاز، لوچ اور لچک کے آدمی تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی ان کی نظر نفسیاتی پہلوؤں پر بھی پڑتی ہے ۔ کہیں حوادث عالم کی تہہ تک بھی پہنچے ہیں۔ کہیں جذبات میں خلوص اور صداقت بھی رکھتے ہیں۔ کبھی "آفاقی" بھی نظر آتے ہیں ۔ اگرچہ ان اوصاف کا کبھی کبھی پایا جانا شاعر کے انفرادی کمال کی دلیل نہیں ہے ۔ لیکن یہی چیز داغ کا کمال بن جاتی ہے ۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہر بات کو اپنے ہی رنگ میں کہہ سکتے ہیں ۔ محبت کے تجربے ہیں تو اپنے رنگ میں ۔ جذبات کا خلوص ہے تو اپنے اسلوب میں۔ آفاقیت ہے تو اپنے انداز میں ۔ تشبیہات ہیں تو اپنی زبان میں۔

آپ کہیں گے یہ تو خالی باتیں ہی باتیں ہوئیں ۔ تو کچھ کراماتیں بھی دیکھ لیجئے ۔ میری نہیں، داغ کی ۔ (ان اشعار میں کوئی ترتیب نہیں سب ملے جلے ہیں) ۔

ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی   فریاد سے ملتی نہیں فریاد کسی کی

===XXX====

آرام طلب ہم ہوں کرم عام کے طالب   یوں مفت میں لگتی نہیں بیداد کسی کی

===XXX====

ہوگیا پر تو رخسار کچھ سے کچھ اور ہی رنگ   میں نے منہ چوم لیا اس کے تماشائی کا

===XXX====

سامنے میرے جو چراتے ہو آنکھ   آئینہ کیا آج دیا ہو گیا ہے!

===XXX===

اے عشق سن نہ لے کہیں فریاد یہ صدا   تیشہ پکارتا ہے کہ میں کوہکن ہوا

==XXX===

قابل آشیاں کوئی نہ ملا   تنکا تنکا اٹھا کے دیکھ لیا

===XXX====

لوگ کہتے تھے چپ لگی ہے تجھے   حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا

===XXX====

ممکن ہے کہ تجھ سا دیکھ لے چشم غلط نگر
اس کا کہاں جواب جسے آئے تو پھر

===XXXX====

حسرت سے تک رہا ہوں جو تجھ کو سبب یہ ہے
خاک اڑتی دیکھتا ہوں میں اپنی وفا کے بعد

====XXX

رشک دشمن بھی گوارا کیوں   تجھ کو منظور نہیں دیکھا جاتا
بارہا دیکھ لیا ہے اس کو   اور اکثر نہیں دیکھا جاتا
خط مرا پھینک دیا یہ کہہ کر   ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا
تو بہ کے بعد بھی خالی خالی   کوئی ساغر کبھی دیکھا جاتا
ہوش جاتے رہے رقیبوں کے   داغ کو بے کار وفا کہتے

===XXX===

مل گئے راہ میں مجھ کو یہ بڑی خیر ہوئی
لوگ جو دیکھ کے شب کو تری محفل آئے

====XXX===

بے پردہ اگر جلوہ نما وہ نہیں گھر میں   بجلی سی چمک جاتی ہے کیوں روزن در میں

===XXX====

کیا قسم کھا کر ہوا ہے منفعل پیغام بر
تاڑلی اس نکتہ چیں نے بات سمجھائی ہوئی

===XXX====

نکالے اپنی ہی تلووں سے خار گلشن میں
ابھی تو پاؤں دبائے ہیں رہنما کے مجھے

===XXX====

اس آخری شعر ہی کو دیکھ لیجئے کیا سچا واقعہ ہے - کیا واقعی تجربہ ہے۔ مگر کہنے کا انداز داغ کا اپنا ہے - اور کہاں تک لکھوں - بس کرتا ہوں۔ مگر ایک لطیفہ سن لیجئے -

جلال اکثر داغ سے بہتر سوچتے تھے۔ ہم طرح غزلوں میں بے شمار اشعار جلال کے داغ سے بہتر ہیں - لیکن داغ سے بہت جلتے تھے۔ اس جلن میں کبھی ان پر " سخن فہمی عالم بالا " (۱) کا مضمون صادق آجاتا تھا۔ " داغ نمبر" میں صفحہ ۱۰۰ پر ایک لطیفہ درج ہے کہ ایک مشاعرے میں داغ نے ایک مطلع پڑھا - اور جلال سے داد طلب ہوئے - مطلع یہ تھا:

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

جلال نے مسکرا کر کہا مصرع نہیں لگا - جب جلال کی باری آئی تو فوراً دوسرا مصرع لگاکر پڑھا :

دل مرا ، آنکھ تری ، دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال برا ، ایک کا حال اچھا ہے

یہ دونوں شعر کچھ نہیں لیکن مقابلے کی ٹھہری تو جلال کی فکر داغ کے مقابلے میں نہایت مبتذل ہے - جیسے بالکل سامنے پڑی ہوئی چیز اٹھالی ہے - اور ان کا یہ کہنا کہ " مصرع نہیں لگا۔" ان کی سخن فہمی یا بغض و حسد کی غمازی کر رہا ہے - یا لکھنو کے فکر و خیال کا اثر ہے کہ جلال نے بری اور اچھے حال والی دو چیزوں کا تذکرہ پہلے

---

(۱) " سخن فہمی عالم بالا" کی تلمیح سے لطف اندوز ہونے کے لیے فیضی کا مشہور لطیفہ یاد کیجئے -

مصرع میں ضروری سمجھا۔ داغ کی تخیئل اس سے زیادہ نازک و لطیف ہے کہ ایک شخص کا حال برا ہے، ایک شخص کا حال اچھا ہے ، یہ تیری چشم فسوں گر ہی کا کمال ہے ۔

" داغ ضمیر" میں داغ کے خاندانی حالات کے سلسلے میں ان کی والدہ کی کافی رسوائی ہوئی ہے ۔ پھر بھی محققین کی رسائی وہاں تک نہیں ہوئی جہاں تک میرے علم میں ہے۔ داغ کی والدہ کلو پیٹرا (Cleopatra) قسم کی بیگم تھیں۔ مگر اس سے زیادہ بدقسمت اور بہت زیادہ منحوس ۔ جس سے ملی کوئی قتل ہوا، کوئی دار پر چڑھا، کوئی جوان مرا، کوئی برباد ہوا۔ لیکن بڑی شاعر زا، اُمّ الشعرا۔ جب پیدا کیا شاعر پیدا کیا۔ داغ کی ایک ہمشیرہ " مس بلیک بادشاہ بیگم خفی" کا شعر سنئے :

خود شوق اسیری سے پھنسے دام میں صیّاد
شرمندہ تری ایک بھی دانے کو نہیں ہم

نواب شمس الدین خاں تک پہنچنے سے پہلے کس حال میں رہیں، یہ معلوم ہوتا ابھی سینگہ راز میں ہے ۔ ورنہ لکھنے والے چھوڑتے نہیں۔ اس زمانے کے تعلق سے ان کی نسل الگ چل رہی ہے ۔ اور ابھی دور حیات میں ہے ۔ میری تحقیق کے دوران میں خالد (۱) کو علم ہوگیا تھا۔ انھوں نے بہت اصرار کیا کہ میں وہ کاغذات ان کو دے دوں اور وہ مضمون لکھ دیں مگر میں نے گوارا نہ کیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم !

ہاں ! شاید آپ کو میں نے یہ نہیں لکھا کہ اب کے نعیمہ (۲) نے ادیب کا اور آصفہ (۳) نے ادیب ماہر کا امتحان دیا تھا۔ دونوں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگئیں ۔ نعیمہ ایک ایک سے انعام وصول کر رہی ہیں۔ پڑھا دونوں نے کچھ نہ تھا۔ قیام فتح پور کے آخری

---

(۱) ڈاکٹر خالد حسن قادری، پروفیسر اردو لندن یونی ورسٹی، مولانا قادری کے منجھلے صاحب زادے ۔
(۲) نعیمہ ، مولانا قادری کی چھوٹی صاحب زادی کا نام ہے ۔
(۳) آصفہ بنت مولوی فرید عالم صاحب چشتی، مولانا قادری کی بھتیجی ۔

دنوں میں امتحان سے دو مہینے پہلے ارادہ کیا تھا ۔ آپ کی جامعہ اردو (۱) نے اب بڑی ترقی کرلی ہے ۔ اسی جنوری سے ایک ماہنامہ " درس " جاری کیا ہے ۔ آپ کے پاس آیا یا نہیں؟

مارچ کے پہلے ہفتے میں بورڈ (۲) کے جلسے ہوں گے ۔ میں اب ممبر نہیں ہوں۔ بیرونی ممبر دو عدد پہلے سے موجود تھے ۔ خواجہ عبدالواجد اور اقبال احمد سہیل تیسرا مناسب نہ تھا۔ بھوپال کالج کے پروفیسر ہوں گے۔ میں ان سے واقف نہیں۔ آپ کے احباب میں خواجہ صاحب (۳) ، خلیق صاحب بریلوی (۴) اور عبدالرحمن (۵) صاحب ہیں۔ اردو میں سرور صاحب (۶)، نقوی (۷) و نواب (۸) ہیں۔ پرنسپل عبدالشکور صاحب رام پور سے ریٹائرڈ ہوگئے۔"

---

(۱) ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی صاحب نے ۱۹۳۹ء میں آگرے میں ایک باقاعدہ آئین کے تحت " جامعہ اردو" (اردو یونی ورسٹی) قائم کی تھی۔ اس کے موسوس رجسٹرار خود فاروقی صاحب تھے۔ دس سال کی محنت شاقہ سے اس کو پختہ بنیادوں پر استوار کیا۔ پاکستان تشریف لاتے وقت آپ نے پروفیسر سید ظہیرالدین صاحب علوی (پروفیسر شعبۂ اردو ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) کو اس کا اعزازی رجسٹرار مقرر کرکے دفتر علی گڑھ منتقل کرادیا ۔ علوی صاحب مرحوم نے اپنی چودہ پندرہ سال کی ان تھک محنت و کاوش سے " جامعہ اردو" کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ بیس سال کے عرصے میں جامعہ کے پاس اپنی وسیع عمارت، باقاعدہ تنخواہ دار رجسٹرار اور لمبا چوڑا عملہ ہوگیا۔ اور اس طرح اس ادارے نے ایک" اردو یونی ورسٹی " کی شکل اختیار کرلی ۔ مختلف یونی ورسٹیوں، بورڈوں اور محکمہ ہائے تعلیم نے بیس پچیس سال سے جامعہ اردو کے امتحانات کو باقاعدہ تسلیم کر رکھا ہے ۔

(۲) بورڈ سے مراد آگرہ یونی ورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز ہیں۔ فارسی نیز اردو کے ۔

(۳) خواجہ عبدالواجد صاحب ، ایم اے ، سابق پروفیسر صدر شعبۂ فارسی ، کرائسٹ چرچ کالج کان پور۔

(۴) پروفیسر خلیق احمد صاحب، ایم اے، سابق پروفیسر فارسی و اردو، بریلی کالج بریلی، پاکستان آگئے راولپنڈی میں کنٹونمنٹ بورڈ میں سپرنٹنڈنٹ تعلیمات کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

(۵) پروفیسر عبدالرحمن صاحب، ایم اے ، سابق پروفیسر اردو سینٹ اینڈ ریوز کالج ۔

(۶) پروفیسر آل احمد صاحب سرور، ایم اے، سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی ، علی گڑھ۔

(۷) جناب نجم الدین نقوی ، ایم اے ، اول آگرہ کالج آگرہ میں شعبۂ اردو میں لیکچرار تھے۔ پھر رضا کالج رام پور کے پرنسپل ہوگئے ۔

(۸) جناب سید نواب حسین صاحب ، ایم اے ، صدر شعبۂ اردو کرائسٹ چرچ کالج ، کان پور

مولانا کے اس خط سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ شعر و ادب کے سلسلے میں کیسی کیسی موشگافیاں کرتے تھے۔ اور تنقید کے معاملے میں کسی کے منصب و مرتبے کا خیال کئے بغیر وہ ہی بات کہتے جو حق ہوتی ۔ آئندہ صفحات میں ہم مولانا کے چند اور ایسے ہی خطوط پیش کریں گے جن سے اس امر کی مزید تصدیق ہوسکےگی ۔

پروفیسر نظیر صدیقی صاحب نے ۲۵ دسمبر، ۱۹۵۱ء کو ڈھاکہ سے مولانا کو آکے خط لکھا : " شادانی صاحب کی ایک تازہ نظم ارسال خدمت ہے ۔ جو آپ میں اس کے متعلق اپنی رائے ضرور تحریر کیجئے ۔"

نظم یہ تھی :

پھر قلب سے اٹھتا ہے دھواں خیر ہو یارب
دشوار ہے پھر ضبط فغاں خیر ہو یارب
پھر ایک تمنا ہے جواں خیر ہو یارب
شعلے کی طرح دل ہے تپاں خیر ہو یارب

اک تیر نظر قلب میں پیوست ہوا ہے
اب دیکھئے کیا اپنے مقدر میں لکھا ہے

دیکھو مری آنکھوں میں ذرا غور سے دیکھو
ان آئینوں میں جلوہ فگن کون ہے بولو
محجوب نہو، شرم سے آنکھیں نہ جھکاؤ
پہچان لیا تم نے تو مجھ کو بھی بتاؤ

سچ کہدو یہ کس شوخ کی تصویر ہے دوشیں
اس خواب کی آخر کوئی تعبیر ہے دوشیں

مولانا قادری اس نظم کے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

" نظم خوب ہے ۔ پہلے بند میں کوئی خاص بات نہیں۔ کسی بات کی

تمہید ہے ۔ اور ٹھیک ہے ۔ دوسرے بند میں ایک بات ہے اور بہت خوب صورت ہے ۔ لیکن میں اس کو شاہزادہ تخئیل سمجھ کر تعریف کر رہا ہوں۔ اگر آپ کہیں کہ یہ بات مجملہؑ واقعات و واردات ہے تو مجھے اس سے اختلاف ہوگا۔ یہ واقعہ نہیں ہوسکتا۔ جذبہ عمدہ ہے ۔ شاعری خوب ہے ۔" (۱)

===xxx===

مظہر صدیقی صاحب نے اس رائے کو پڑھ کر ۲۳ دسمبر، ۱۹۵۱ء کو لکھا :

" یہ واقعہ کیوں نہیں ہوسکتا ؟ مجھے تو اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو تخئیل ہی میں ممکن ہو تو ہو، واقعات کی دنیا میں اس کا ہونا ممکن نہیں۔"

اس کے جواب میں مولانا قادری ۲۸ دسمبر، ۱۹۵۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" میں نے شادانی صاحب کے اس بند کو جو خلاف واقعہ کہا تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ عاشق و معشوق آمنے سامنے بیٹھے ہوں تو عاشق اس طرح نہیں کہہ سکتا، اور اگر کہے تو فضول سی بات ہے ۔ ایک وجہ تو یہ کہ آنکھوں میں کسی کا عکس فاصلے سے نظر نہیں آتا۔ بالکل آنکھوں کے پاس آنکھیں کی جائیں تو نظر آتا ہے ، اور منہ سے منہ ملاکر یہ کہنا کچھ بھدا سا معلوم ہوتا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آنکھوں میں شخص مقابل کا عکس ہونا قدرتی بات ہے ۔ اس کو محبت سے کچھ واسطہ نہیں۔ محبوبہ کہہ سکتی ہے ۔ کہ یہ کیا بات کہتے ہو۔ کوئی دوسری یا دوسرا ہوتا تو اس کا عکس بھی تمہاری آنکھوں میں ہوتا ۔ ہاں دل کے آئینے میں میری سوا کوئی اور نہ ہو تو بات ماننے کے قابل ہے ۔" (۲)

اس خط کا جواب پاکر مظہر صدیقی صاحب نے تسلیم کرلیا کہ یہ مکالمہ تخئیل میں سر انجام ہو رہا ہے ۔

---

(۱) خطوط قادری بنام پروفیسر مظہر صدیقی صاحب ، مملوکہ ماجد حسن فریدی (غیر مطبوعہ)
(۲) ایضاً

۲۵ فروری، ۱۹۵۲ع کے ایک خط میں مظہر صاحب نے ڈاکٹر شادانی کے ایک شعر کا مطلب دریافت کیا۔ اور لکھا کہ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے شعر کا جو مطلب بیان کیا ہے اس سے انھیں کلی اطمینان نہیں ہوا۔ ڈھاکہ کے دوسرے ادیب اور نقاد بھی وہ طلب نہ بتاسکے جو شاعر کا مقصود تھا۔ مظہر صاحب نے لکھا کہ :

" اب میں آپ سے اس شعر کا مفہوم دریافت کرنا چاہتا ہوں ۔ اگر آپ نے وہی مفہوم بیان کیا جو ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر ہے تو ان کا دعوا صحیح اور میرا غلط ۔ ورنہ میں صحیح اور وہ غلط ۔" شعر یہ تھا :

میں اور سے مخاطب وہ اور سے مخاطب
پابندیوں نے کھولی یہ راہِ ہم کلامی "

اس خط کے جواب میں مولانا قادری لکھتے ہیں :

" میں ڈاکٹر صاحب کا مطلب سمجھ گیا۔ بلا شبہ خوب کہی ، بالکل نئی ، جو کسی نے نہ کہی تھی، اور بالکل واقعہ جو بارہا پیش آیاہے۔ عاشق و معشوق میں اس واقعہ کا دیکھنا مجھے یاد نہیں مگر دوسرے لوگوں میں بہت دیکھا ہے ۔ دو طالب علموں یا دو دوستوں میں کسی وجہ سے بدمزگی پیدا ہوگئی ہے بول چال بند ہے ۔ دونوں موجود ہیں اور آپس میں گفتگو کرنےکے بجائے دوسرے لوگوں سے مخاطب ہیں۔ لیکن روئے سخن ایک کا دوسرے ہی کی طرف ہے ۔ کہہ رہے ہیں کسی اور سے ، لیکن مقصود سنانا ہے اسی کو جس سے کلام و سلام بند ہے ۔ وہ بھی اسی طرح اس کا جواب دیتا ہے ۔ یہ کیفیت معشوقہ و عاشق میں بہت دل چسپ ہوگی اور پابندیوں کے سبب سے بے شک ہوسکتی ہے ۔ جو حضرات شعر کو سمجھنے سے قاصر رہے، انھوں نے غور کرنے کی زحمت نہ کی ورنہ " یہ راہ ہم کلامی، بالکل صاف ہے ۔ " پابندیوں" میں ذرا گنجلک ہے، مگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ نہیں رکھا جاسکتا ۔ میں نے غور کرلیا۔ سارے شعر ہی کو کسی اور طرح کہا جائے تو الگ بات ہے ۔" (۱)

---

(۱) خطوط قادری، بنام پروفیسر مظہر صدیقی، (غیرمطبوعہ) ، مملوکہ ماجدحسن فریدی

ایک اور خط میں مظہر صاحب کے اظہار پر مومن کی نازک خیالی کے متعلق لکھتے ہیں :"

" مومن جیسا نازک خیال اور کوئی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ دشوار ہے - اور بڑی طویل بحث چاہتا ہے - آپ دیکھتے ہیں کہ " مجھے لن ترانیوں" کا بہت شوق ہے! بہرحال اب آئیے اپنی نازک خیالی کی طرف - آپ نے بہت سی اصطلاحیں جو یاد آئیں لکھ دیں - نازک خیالی اور نزاکت خیال تو ایک ہی بات ہے - رفعت تخیل اور طرفگی خیال بھی ایک ہی سمجھیے - بلند پروازی بھی ان کے ساتھ ہی رکھئے - اب چار باتیں رہیں :" لطافت ، نزاکت ، رفعت ، دقت "- ان میں بھی لطافت اور نزاکت اور باریکی ایک ہی چیز ہے - میں تھوڑے تھوڑے امتیاز و فرق سے قطع نظر کر رہا ہوں- دقت کے دو معنی ہیں : دشواری اور باریکی - باریکی تو آچکی گئی - اب دقت[1] (دشواری) اور رفعت[2] اور لطافت[3] و نزاکت تین صفتیں ہیں - دشواری تو ظاہر ہی ہے کہ کوئی مضمون یا اسلوب عام فہم نہ ہو- یہ صفت ہر اچھے برے اور چھوٹے بڑے شاعر میں ہوسکتی ہے - ناسخ ، غالب ، مومن ، کک سب شریک ہیں- اور یہ فی نفسہٖ کوئی بڑا کمال نہیں - خصوصاً جب نفس مضمون مشکل ہو - مثلاً تاریخ ، روایت ، علم و فنون کے مفروضات یا مسلمات سے مضمون پیدا کیا جائے تو ظاہر ہے کہ عوام کی دسترس سے باہر ہوگا- اس میں شاعر کی فضیلت علم اور رسائی ذہن کی خوبی نکلتی ہے - لیکن اگر دشواری، دقت اسلوب بیان کے سبب سے ہو تو البتہ لطف سے خالی نہیں- بشرطیکہ دشواری حد سے زیادہ نہ ہو - ایک قرینے سے ہو - اس دشواری کے ساتھ اگر نفس مضمون نادر و لطیف ہو تو شعر نہایت دل چسپ اور حیرت انگیز

ہوجاتا ہے ۔ مومن کا یہی رنگ خاص ہے ۔ کہ وہ بات کو سیدھی طرح نہیں کہتے، الجھا کر اور پیچ دے کر کہتے ہیں۔ یعنی بیچ کی کڑیاں چھوڑ دیتے ہیں ۔ لیکن خلا کو پرکرنے کے لیے کوئی موزوں لفظ مناسب موقع پر رکھ دیتے ہیں۔ ذرا سوچنے سے کڑیاں مسلسل ہوجاتی ہیں۔

نازک خیالی ایک تو یہی ہوئی ۔ اس طرح بات کو پیدا تخئیل کی نزاکت اور باریکی ہے ۔ مومن اسی لیے نازک خیال کہے جاتے ہیں ۔ انھوں نے اسلوب بیان کی باریکیاں اور نزاکتیں اتنی کثرت سے پیدا کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ۔ اس رنگ خاص میں کوئی ان کے برابر نہیں، غالب بھی نہیں۔

لیکن میرے نزدیک نفس تخئیل کی ندرت و نزاکت زیادہ مستحسن ہے ۔ یہ صفت غالب میں ایسا ہے جس کا جواب اردو میں اب تک نہیں ہوا۔ مثالیں دیکھئے مومن کہتے ہیں :

رحم فلک اور مرے حال پر   تونے کرم اے ستم آرا کیا

پہلی نظر دونوں مصرعوں کا ربط واضح نہیں ہوتا۔ اس ستم آرا نے کیا کرم کیا کہ فلک کا رحم ان کے حال پر ہوگیا۔ یہاں "ستم آرا" کا لفظ نہایت معنی خیز اور طنز مومن کی بنیاد ہے ۔ مومن اس کو " ستم آرا" کہتے ہیں۔ یعنی ستم آرائی کو کرم بتاتے ہیں۔ " تونے اتنے ستم ڈھائے کہ حد کردی۔ مگر تیرے یہی ستم ہمارے حق میں کرم بن گئے کہ آخر فلک کو بھی ہمارے اس حال پر ترس آگیا اور اس نے ظلم کرنا چھوڑ دیا۔" مضمون کی نزہت کو نہ دیکھیے کہ واقعہ ہے یا مفروضہ ۔ مومن کا رنگ دیکھئے اور بات کو کہنے کا ڈھنگ دیکھئے اور دیکھئے :

ہجراں میں بھی زیست کہیں نہ چاہوں   جان دادۂ شوخ بے وفا ہوں

شوخ بے وفا پر عاشق ہیں تو ہجراں میں زیست چاہنے کی کیا وجہ؟
بات بتائی نہیں مگر "بے وفا" کا لفظ رکھ کر اشارہ کردیا ہے - یعنی
"بے وفا" پر عاشق ہوں، بے وفا سمجھ کر ہی عاشق ہوا ہوں- بے وفا ہے تو
وہ کبھی کہیں ملے گا- ہجر ہی رہے گا - لہذا ہجر میں ہی میں مجھے
زندگی گذارنی ہے - اسی میں میری وفاداری ہے -" (۱)

مومن کی اس نازک خیالی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا کے پیش نظر یہ بات بھی ہے
کہ ایسی نازک خیالیاں اور طرز و اسلوب کہیں کہیں غالب، داغ اور حسرت کے یہاں بھی
ملتا ہے - فارسی میں بیدل کے یہاں بھی یہ طرز بیان جا بجا نمایاں ہے - دراصل
اس طرح بات کہنے میں نزاکت و لطافت دونوں ہی در آتی ہیں- اسی سلسلے میں مولانا
قادری، مرزا غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نظاہی نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ تری رخ پر بکھر گئی

"شعر کا نقاب بنا کوئی نئی اور عجیب بات نہ تھی لیکن یہاں
نقاب بنانے میں بڑی نازک خیالی ہے - گویا نقاب بُنا اور بُنا ہوا موجود ہے -
یعنی جو نگاہ رخ پر پڑی مست ہوکر وہیں بکھر گئی - ایک، دو، دس، بیس
نگاہوں نے بکھر کر نقاب کی جالی بنادی- اس سے نازک تر دیکھئے:

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

محبوب کی شرم اک ادائے ناز ہے - تو پھر ہر حالت میں ہے، دوسرے
سے ہو یا اپنے سے - ادائے ناز محو ادائے ناز ہی رہے گی - لہذا جو شرم
کی وجہ سے حجاب میں ہیں تو گویا اپنے کو ادائے ناز دکھا رہے ہیں- اور
ادائے ناز دکھانا بے حجابی کی بات ہے - اس لیے وہ حجاب میں بھی بے حجاب
ہیں" (۲)

---

(۱) "خطوط قادری، بنام پروفیسر نظیر صدیقی"، (غیر مطبوعہ) مملوکہ ماجد حسن فریدی-
(۲) ایضاً،

غالب کی اس نازک خیالی اور اپچ تک ذہن کی رسائی مولانا کی ہی فکر رسا کا کام ہے - ایسے مضمون ذرا مشکل ہی سے ذہن میں آتے ہیں واقعی بڑی نازک اور بالکل خیالی بات ہے - بیدل کی نازک خیالی کے نمونے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

درین گلشن چوگل یک پر زدن رخصت نمی باشد

مگر از رنگ یابی نسخۂ بال افشانی مارا (بیدل)

" (اس گلشن (باغ عالم) میں گل کی طرح ایک بار پر مارنے کی بھی فرصت نہیں ہے - بس رنگ اڑنے کو ہماری بال افشانی کا ایک نسخہ سمجھ لو) یہاں ہمارا رنگ اڑتا ہے ، بس اسی کو ہماری پر افشانی کہہ لو- جس طرح کسی عبارت میں ایک لفظ دوسرے لفظ کا نسخہ کہلاتا ہے - یعنی اس کا قائم مقام ہوتا ہے - اسی طرح رنگ اڑنا ، گویا" پرمارنے" کا ایک نسخہ ہے - رنگ اڑنے کو بال افشانی قرار دینا کس قدر نازک ہے - دونوں کیفیتوں کا تصور کیجئے - محسوس چیز کو غیر محسوس سے تشبیہ دی ہے - اور پہلے مصرع کی خوب صورتی کو بھی دیکھئے - گل کی شگفتگی ، پتیوں کے کھلنے کو " پر زدن" کہا ہے - گل کھلتے ہی مرجھانے لگتا ہے - کہتے ہیں کہ گل کو تو یک پر زدن کی رخصت بھی ہے - ہم کو اتنی بھی نہیں بیدل کی اسی غزل کا دوسرا شعر ہے :

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت

مژہ برہم مزن تانشکنی رنگ تماشارا

(حیرت کے شیش محل میں بڑی نزاکتیں ہیں- نہایت نازک واقع ہوا ہے - پلک نہ جھپکنا کہیں رنگ تماشا ختم نہ ہوجائے -)

آسان شعر ہے - آنکھ کھولنے سے حیرت ختم ہوجاتی ہے - گویا پلک مارنے سے ہی شیش محل ٹوٹ جاتا ہے - اسی غزل کا اور شعر لیجئے :

نمی سازد متاع حوش بایوسف خریداران

بود نقد ز خود رفتن نگاه جلوہ سودارا

(یوسف کے خریداروں کو متاع حوش کام نہیں دیتی - ان عشاق کی نگاہ جلوہ طلب

کے پاس نقد بے خودی ہونا چاہئے -)

یوسف کی مشتاق دیدار زنان مصر ہوش کھو بیٹھی تھیں- کہتے ہیں کہ یہاں

متاع حوش کا کام نہیں - نگاہ جلوہ سودا (مشتاق جلوہ، خریدار جلوہ) کو نقد ز خود کوٹ

رفتن (نقد بے خودی) پیش کرنا چاہئے -

اسی غزل میں اور دیکھئے :

دل آسودۂ ما شور امکان در نفس دارد

گہر دزدیدہ است این جا عنان موج دریا را

(ہمارا دل آسودہ ، (مطمئن دل) شور کائنات کو اپنے اندر لیے اور چھپائے

ہوئے ہے - جیسے گہر موج دریا کی عنان کھینچے ہوئے ہے)

گوھر کی حالت و کیفیت کو کس نزاکت کے ساتھ بیان کرتے ھیں- گوھر کو یوں

سمجھو کہ اس کے اندر موج دریا کی عنان کھینچی ہوئی ہے - روک لی گئی ہے - رفتار

و روانی بند ہوگئی اور گوھر بن گیا- گویا گوھر گوھر کے اندر موج و طوفان سب ہے مگر

ٹھہاؤ و سکون میں ہے - یہی کیفیت ہماری دل آسودہ کی ہے کہ اس کے اندر بھی شور

امکان ہے مگر بند ہے -

آپ کی یہ شرط مشکل ہے کہ بیدل کی شرح بھی کرتا جاؤں - ہر شعر کی شرح

کرنے میں آپ کا طول امل ہے اور میرا طول عمل -

اب آپ اور شادانی صاحب یہ بحثیں کرتے رہئے کہ ان نازک خیالیوں کا نتیجہ کیا ہے؟

فرضی باتیں ہیں، " ہوائی محل " ہیں۔ میں تمام شاعری اسی کو نہیں سمجھتا۔ لیکن اعلا نازک ، لطیف شاعری ضرور سمجھتا ہوں۔

بہرحال نازک خیالی اسی طرز میں منحصر نہیں ہے ۔ بالکل سادہ و جذباتی اشعار میں بھی نزاکت اور لطافت ہوتی ہے اور ان خیال آرائیوں سے زیادہ پر لطف اور پر اثر ہوتی ہے ۔ لیکن نازک خیالی کی تعریف متعین کرنا مشکل ہے ۔ جیسے خود شعر و شاعری کی تعریف آج تک نہ ہوسکی۔" (۱)

مولانا نقد و نظر کے سلسلے میں بڑے بے لوث و بے باک اور صاف گو آدمی تھے۔ اپنے خاص عزیز دوستوں کو بھی نہ بخشتے تھے۔ اس سلسلے میں غالب کے طرف دار بھی ان سے بہت شاکی ہیں۔ نظیر صدیقی صاحب کو ایک خط میں شادانی صاحب کی تحریروں کے جوابات کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

" شادانی صاحب نے اپنے نظریات اور اپنی تجویزات کو جس اہتمام ، جس مبالغے اور جس مضحکانہ انداز سے پیش کیا ہے اس کا جواب اس انداز کے سوا نہیں ہوسکتا جو میں نے اختیار کیا ۔ انھوں نے سختی کے ساتھ تمام استعارات کو نام بنام گن گن کر فرسودہ بتایا۔ میں نے ان کو بیکار ثابت کیا۔ انھوں نے فانی و حسرت کی غزل کی پھبتی اڑا دی۔ میں نے خود ان کی کامیڈی کا مذاق اڑادیا۔ سنجیدہ بات کو جب غیر سنجیدہ طریقے سے کہنے کا اس کا یہی جواب ہوگا۔ شادانی صاحب سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے طعنے دیئے ، مذاق اڑایا ، صحیح تنقید نہیں کی ۔ انھوں نے جفائے محبوب ، مرگ و مزار ، دام و قفس وغیرہ عنوان قائم کرکے اور اشعار لکھ کر سب کو یک لخت مردود قرار دیا۔ اس کا میں نے

---

(۱) " خطوط قادری بنام پروفیسر نظیر صدیقی"، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ ماجد حسن فریدی

یہ جواب دیا کہ سب ٹھیک ، سب درست ، سب بے عیب اور اب بھی یہی کہتا ہوں ۔ بات یہ ہے کہ غزل کے رمز و ایما میں سب کی جگہ اور سب کا درجہ ہے ۔ استعارے کی فرسودگی کوئی چیز نہیں۔ شعر و مضمون کی بے مزگی اور بد مزگی ایک چیز ہے ۔ استعارے کا مقصود بالذات ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ استعارہ کبھی مقصود بالذات ہواہی نہیں کرتا ۔ ہر محاورے کی بنیاد استعارے پر ہے ۔ اور محاورہ کہتے ہی ہیں غیر حقیقی معنی مراد لینے کو ۔ تیغ و خنجر، قتل و غارت وغیرہ کبھی غزل میں مقصود بالذات نہیں ہوتے ۔ مگر کہنے کہنے میں فرق ہے ۔ بات لطیف نازک اور نادر ہوجائے جور و جفا کی ہو کیا کل و قلقل کی ۔ میں بے لطف شعروں کو لطیف نہیں کہتا۔ آپ نے بے مزہ اشعار پیش کرکے لکھ دیا کہ یہ اس وجہ سے قابل قبول نہیں کہ ان میں استعارہ مقصود بالذات ہے ۔ حالاں کہ یہ بات نہیں ہے ۔ وہ اشعار استعارے کے مقصود بالذات ہونے کی بنا پر ناپسند نہیں ہیں بلکہ اس لیے کہ ان میں خیال نازک و لطیف نہیں۔

شادانی صاحب نے یہ عجیب بات لکھی کہ ان فرسودہ استعاروں کا استعمال کچھ مدت کے لیے بالکل ترک کردیا جائے ۔ یہ بھی کھانا نہ دیکھا کہ بدہضمی ہوگئی ہے ۔ ۲۴ گھنٹوں کے لیے کھانا ترک کردیا جائے ۔ پھر تھوڑا تھوڑا کھایا جائے ۔ استعاروں کا ترک کرنا کیا معنی ؟ ایک دن ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں ندرت کو تازگی پیدا کرنے کو کہیے ۔ سو میرے نزدیک تو ندرت و تازگی کے بغیر شعر ہی نہیں ہوتا ۔ زبان کی ، بیان کی، خیال کی ، جذبے کی، کچھ نہ کچھ ندرت و تازگی ضرور ہونی چاہئے ۔ چناں چہ سب نہیں تو اکثر شاعروں میں ہوتی ہے ، کم ہو یا زیادہ ۔ شادانی صاحب کے زیر بحث شعرا میں بھی ہے اور بہت ہے ۔ لیکن بہت سے اشعار میں نہیں ہے نہ سہی ۔ کانٹوں کو ہٹاکر پھول چن لیجئے ۔ کانٹے ہی کیوں چن چن کر بچھاتے جائیے۔

لیکن ان استعاروں کو آپ ترک کرانا چاہیں گے تو پھر غزل کی وسعت غائب اور آفاقیت اتنی بار ہوجائے گی ۔ ان استعاروں اور تشبیہوں کی کارفرمائیاں چند اشعار میں دیکھئے :

بہار آخر ہوئی ہے اب توسینے دے گریباں کو
یقیں کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن، بس کر — یقین

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا ہوش کر کیا ہے ظالم دوانہ پن میں — یقین

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے
یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریباں گیا تھا — مصحفی

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا — مصحفی

پھٹ چکا جب سے گریباں اپنا — ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں — مصحفی

دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے مدت دست
پرزے ہو ہو کے گریباں اڑا جاتا ہے — مصحفی

اے دست جنوں تیری مدد ہوئے تو اب بھی
اک جھٹکے میں لگتا ہے گریباں ٹھکانے

یہاں تک بھی بات غنیمت تھی مگر اس سے نیز تر سنیے :

کر سلوک اب تو گریباں سے اے دست جنوں
چاک اک جھٹکے میں تا دامن محشر پہنچے

کیا محشر کا بھی دامن ہے ، اور کیا وہ عاشق کے گریباں سے جڑا ہوا ہے ؟

نہیں مگر دیوانے کا کیا جوش ہے!

پرواز اولیں میں اسیری ہوئی نصیب — کیا قفس میں تھے جو اڑے آشیاں سے ہم (تسلیم)

عدم میں ترسوگے درد جگر کو اے تسلیم — جو ہوسکے کوئی ستمیہ یہ تیر کھائے چلو (تسلیم)

زلف پر پیچ کو کھولا ہے کسی نے یارب   کہ مری پاؤں کی زنجیر کسے دیتے ہیں (تسکین)

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں   ابر سیاہ جانب گلزار دیکھ کر (ثاقب لکھنوی)

یہ میں نے وہی شادانی صاحب والی " الٹے بانس کی تھامان" کچھ تھوڑی سی جمع کردی ہیں۔ مگر دیکھیے کہ یہ استعارے کچھ لطف پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ان کے مقابلے میں ان ہی شاعروں کے ان ہی استعاروں کے بے مزہ اشعار بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ میں ان کو نہیں سراہتا۔ اور برتن کے وجود سے ان اچھوں میں کوئی برائی نہیں آتی۔ اب یہ بات الگ رہی کہ ان بزرگوں نے غزل کے بیس ایک ایک دو دو شعر کہیں نہ کہیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ " فالتو" بھی کہدیے۔ یہ غزل کی روایت تھی جب تک غزل ہے رہے گی۔ شادانی صاحب کو چاہیئے تھا کہ ڈرامائی، افسانوی اور مضحکانہ طرز اختیار نہ کرتے - جن شاعروں پر اعتراض کرنا تھا ان کے دس دس ، بیس بیس اشعار نکال کر دکھاتے کہ شعر اس کو کہتے ہیں۔ ایسا کہنا چاہیئے - اس کے بعد قابل اعتراض اشعار پیش کرکے ان کی خامی و خرابی بیان کرتے - شادانی صاحب نے یہ تو نہ کیا اور یہ کیا کہ " رئیس المتغزلین " کے طعنے دینے شروع کردیے - اس سے بات غیر سنجیدگی ہوگئی - غزل کا جو معیار اب تک تھا اور ابھی ہے ، اس کے اعتبار سے حسرت موہانی کے رئیس المتغزلین ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ بجز شادانی صاحب اینڈ کمپنی کے - لیکن ریاست تغزل کی شان یہ ہے کہ مثلاً حسرت موہانی نے پانچ ہزار شعر کہے ہیں تو ان میں نصف سے کم ہیں جن کی بنا پر ان کو رئیس المتغزلین کہہ سکتے ہیں۔ باقی ردی کھاتا ہے سلوکی اس سے حسرت پر ، ان کے تغزل پر ، ان کی " رئیسی " پر کوئی حرف نہیں آتا۔ سارے بڑے بڑوں کا یہی حال ہے - میر، مصحفی، مومن ، غالب، سب رطب و یابس رکھتے ہیں - اکثر یابس زیادہ اور رطب کم غزل کی یہی افتاد طبع ہے -" (۱)

---

(۱) " مخطوط قادری بنام پروفیسر نذیر صدیقی کو(غیر مطبوعہ) مملوکہ ماجد حسن فریدی

مولانا اپنے ہم عصروں میں " غالب شکن" کے نام سے موسوم تھے اور انھوں نے
اپنے تنقیدی مضامین میں غالب پر بڑی سخت تنقید کی ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ غالب
کے یہاں وہ تمام غلطیاں اور عیوب پائے جاتے ہیں جو کسی عام شاعر کے یہاں مل سکتے ہیں۔
مگر جہاں تک غالب کی تخئیل اور بلند پروازی و معنی آفرینی کا تعلق ہے مولانا اس کے
دل و جان سے معترف ہیں۔ وہ اقبال کے شیدائی تھے اور ان سے بڑی عقیدت و محبت
رکھتے تھے مگر جہاں جہاں اقبال کے یہاں عروض و قواعد یا اور فنی خامیاں نظر آئیں ہیں
مولانا نے ان کی نشان دہی کی ہے ۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے شادانی صاحب سے
رشتۂ دوستی ہوتے ہوئے بھی ان پر کڑی تنقید کی ۔ عندلیب شادانی کے ایک دوست کو خط
لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :

" میں نے شادانی صاحب کے متعلق جو فقرے لکھے تھے ان پر آپ بہت
جز بز ہوئے ۔ مگر برا ماننے کی بات نہیں ۔ غالب اور حسرت اور فانی سے
شادانی صاحب کو بڑھانے میں نہ ان کی عزت نہ آپ کا فخر ـــــ نہ یہ واقعہ
ہے نہ ہوسکتا ہے ۔ ولی گجراتی سے لے کر شادانی تک غالب سے بڑا شاعر
(غزل گو) عالم وجود میں آیا ہی نہیں ۔ حسرت و فانی کی شیرینی و
دل گدازی اس بیسویں صدی میں منفرد ، یکتا و تنہا ہے ۔ غزل کا فکر و تفکر
اور شاعروں میں بھی ملتا ہے ۔ مگر حسرت و فانی کی سی کشش کسی میں
نہیں۔ بس ہم آپ میں زاویۂ نگاہ کا فرق ہے ۔ آپ فانی کے معائب دیکھتے ہیں،
میں محاسن دیکھتا ہوں۔ آپ عیبوں کو اچھالتے ہیں۔ میں ان سے قطع نظر
کرتا ہوں ۔ جو غلطیاں ہیں، اس سے مجھے یا کسی کو انکار نہیں۔ لیکن ان
کو ہی کیوں سامنے رکھا جائے۔ " عیب ما جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" ....

اثر صاحب کی تنقید " نشاط رفتہ " پر میں نے بڑے غور سے پڑھی۔
ان کے صفحہ بہ صفحہ اعتراضات پر رائے لکھنا فضول ہے ۔ ان کی تنقیدیں
صحیح بھی ہیں، غلط بھی مگر اصلاحیں اکثر مکروہ ہیں۔ آپ سب سے پہلے
اثر صاحب کے لب و لہجے کو دیکھیں اور عبرت حاصل کیجئے ۔ نہ شادانی صاحب

کا یہ انداز ہوتا نہ اثر صاحب اس طرح الزامی جواب دیتے ....---
میں نے اثر صاحب کی تنقید کے بارے میں جو فقرے لکھے تھے ان کو آپ نے
عجیب مقام پر چسپاں کیا۔ جس سے مجھے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک اثر صاحب
نے سارے مضمون میں بہترین تنقید یہی کی ہے جس کو آپ نے غلط قرار دیا۔
ادھر ان کی نظر ایسی پہنچی ہے کہ ہر شخص کی نہ پہنچتی ۔ یہ ان
کے بڑاپے پن کی بات ہے ۔ دیکھئے یہ ہماری آپ کی نظر اور نظریے کا
اختلاف ہے ۔ بلا شبہ اثر صاحب کا اعتراض سر تا سر روایت پرستی کا
نتیجہ ہے ۔" (۱)

ایک اور خط میں پروفیسر نظیر صدیقی کے اس سوال کے جواب میں کہ " عظیم
شاعری " سے کیا مراد ہے ؟ اور خصوصیت سے " مشقیہ عظیم شاعری" کے متعلق آپ کا کیا
خیال ہے ؟ اس سوال کے جواب کی عظمت و ضخامت اور طوالت کو مد نظر رکھتے ہوئے
مولانا جواب میں لکھتے ہیں :

" اس کا مختصر جواب نہیں ، ایک مقالہ ایک کتاب ہے ۔ بہرحال اس وقت
آپ کی خاطر سے اشارات لکھے دیتا ہوں ۔

پہلے عظیم شاعری کی تعریف متعین کیجئے ۔ عظیم شاعریاں بتائیے، ان کی
عظمتیں گنائیے ۔ مثلاً ملٹن نے عظیم شاعری کی ہے، فردوسی نے عظیم شاعری کی ہے،
رومی نے عظیم شاعری کی ہے ، ادھس نے عظیم شاعری کی ہے ۔ اقبال نے عظیم شاعری
کی ہے ۔ یہ سب الگ الگ نوعیت کی مگر سب عظمت کی شاعریاں ہیں۔ ایسی
عظیم شاعری کسی ایک غزل گو شاعر نے نہیں کی ۔ اس کا سبب غزل کی محدودیت
ہے ۔ غزل انتہائی وسعتیں حاصل کرکے بھی محدود رہنے پر مجبور ہے ۔
سعدی میں تو ان کی " پیشمیں" کے سوا کچھ تھا ہی نہیں ۔ حافظ شیریں ترین
ہونے پر بھی محدود سے محدود ہیں۔ نظیری نے حدود کچھ بڑھائے مگر کتنے !
اسی طرح میر و مصحفی شوریں بہت ہیں مگر گوگے رسیلے ہیں۔ مغز نہیں ۔
مومن و غالب نے پر مغزی کا ثبوت دیا مگر مومن داؤ پیچ میں پڑ گئے ۔ غالب البتہ

---

(۱) " مخطوط قادری بنام پروفیسر نظیر صدیقی"، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ ماجد
حسن فریدی ۔

اور سب سے اونچے اڑے - لکھی گئے - غالب کی اردو غزل اور بیدل کی فارسی غزل تمام فارسی ؤالحق سے بھی بلند ، وسیع اور عظیم ہے - تفکر و تخئیل ایسا کہیں نہیں ہے -

ان اہل غزل کے مقابلے میں ان عظیم شاعروں کو دیکھئے - ملٹن نے صرف آدم و ابلیس کا قصہ نہیں لکھا ، تمام کائنات و فطرت کو گھیرلیا ہے - فردوسی نے صرف داستان عجم نہیں لکھی- جذبات و معاملات ، واقعات و حادثات کا انسائی کلو پیڈیا لکھدیا ہے - رومی نے صرف اسلام و تصوف کو بیان نہیں کیا- عقل و دل اور نفس و روح کے تمام جھگڑے چکادیے ہیں- تصوف کے پیرایے میں فلسفیات کی کتاب لکھدی ہے - انیس نے صرف مرثیہ نہیں لکھا فطرت انسانی کی نقاب کشائی کی ہے - اقبال نے عملی زندگی کے لیے ان سب سے بڑھ کر کام کیا ہے- اور سب کی شاعری نظریاتی ہے ، اقبال کی عملی اور پیامی ، حیات کا نظریہ بدل دیا ہے - زندگی کا رخ ، پھیردیا ہے ، عمل کو راہ پر لگادیا ہے -

ان عظیم شاعروں کو دیکھیے تو کسی تنہا غزل گو نے عظیم شاعری نہیں کی - لیکن خود غزل عظیم شاعری ہے - نفس غزل میں عظیم شاعری ہوتی ہے- یعنی تمام اعلا فارسی و اردو متغزلین کا انتخاب یکجا کیجیے تو وہ عظیم شاعری ہوگا - لیکن مقابلے سے قطع نظر کرکے صرف غزل کو دیکھئے تو وہ بلا شبہ شاعری کی نہایت عظیم قسم ہے - لیکن کسی ایک کو شاعر اعظم ماننے پر سب کا اتفاق نہیں ہوسکتا- اپنی اپنی پسند ہمیشہ الگ رہے گی - میں غالب اور بیدل کو شعرائے اعظم مانتا ہوں- " (۱)

قادری صاحب مرنجان و مرنج قسم کے انسان تھے ان کے مسلک میں کسی کا دل دکھانا اور رنج پہنچانا قطعی روا نہ تھا- لیکن بحیثیت ایک ناقد کے بے لوثی و بے باکی اور محاسن و معائب کی نقاب کشائی بھی ان پر واجب تھی- تنقید کے معاملے میں وہ اس قدر سخت تھے کہ اپنے خاص دوستوں کے ساتھ بھی کوئی رو رعایت نہ کرتے اور وہی بات کہتے

---

(۱) " خطوط قادری بنام پروفیسر نظیر صدیقی" ، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ ماجد حسن فریدی -

جو جائز و حق ہوتی۔ بعض موقعوں پر وہ اپنے عمدہ تنقیدی مضامین کی اشاعت بھی اسی سبب سے روک دیتے کہ شاعر یا ادیب کو بار کلفت خاطر نہ ہو۔ ۸ مارچ ، ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں حیرت شملوی کو لکھتے ہیں :

" تاریخ و تنقید" پر آپ نے خوب ریمارکس لکھے ہیں۔ آپ کو اس میں جلیل قدوائی کا نام دیکھ کر یہ کیا خیال آیا۔ میں کسی سے جزو اختلاف کی بنا پر اس کی تمام خوبیوں پر پانی نہیں پھیردیا کرتا۔ بلکہ ہمیشہ کھلے دل سے اعتراف کیا کرتا ہوں۔ دیکھئے میں نے " تاریخ و تنقید" کے اس دوسرے ایڈیشن سے وہ (شاعری میں چوری) والا مضمون نکال دیا جس میں جلیل صاحب کا تذکرہ تھا۔ اس لیے کہ اس میں ذاتیات سے بحث آگئی تھی۔ اور وہ وقتی بات تھی۔ میں نے اس مضمون کی دل چسپ باتیں سرقہ و توارد والے مضمون میں لکھدیں۔ اسی طرح " تاریخ و تنقید" کے پہلے ایڈیشن میں بہت بڑا مضمون سیماب صاحب کے متعلق تھا۔ اس میں ان پر بڑی کڑی تنقید تھی۔ مگر وہ مضمون ان کی فرمائش سے لکھا گیا تھا اور سیماب صاحب نے اس کو " شاعر" میں چھاپا بھی تھا۔ مگر اس پر نہایت جز بز تھے۔ بہرحال میں نے وہ مضمون بھی خارج کردیا۔" (۱)

ایک اور خط دیکھئے اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری ، اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تنقید پر تنقید کرتے ہوئے حیرت شملوی کو لکھتے ہیں:

" صدق جدید" جولائی سے باقاعدہ آرہا ہے۔ میں نے ذکی صاحب کا شعر اور اس کی داد دیکھی تھی۔ اور دونوں پر رائے قائم کرلی تھی۔ میں آپ کے " حضرت" دریابادی کی سخن فہمی اور نقادی کا کچھ بہت قائل نہیں ہوں ، اگرچہ وہ میری تحریروں کے بہت کچھ مداح رہے ہیں۔ میری کتاب (نقد و نظر) پر اور میرے دوسرے مضامین پر ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں اپنی رائے بھی لکھ چکے ہیں اور چھاپ بھی چکے ہیں۔ دریابادی صاحب بہتر

---

(۱) " خطوط قادری بنام حیرت شملوی"، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ راشد حسن قادری۔

فلسفی تھے۔ بہتر ادیب تھیں۔ لیکن بہتر نقاد نہیں ہیں۔ تاہم ذکی لکھنوی کے شعر کو سراہنے میں مفتی عبدالماجد صاحب دریابادی نے کچھ بہت غلطی نہیں کی ۔ داد میں مبالغہ ضرور ہے ۔ لیکن پسند کے قابل ہے ۔

نیاز فتح پوری کا شعر کو مہمل کہنا ان کی عادت میں داخل ہے ۔ جب کبھی وہ سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ غور نہیں کیا کرتے مہمل کہدیا کرتے ہیں اور غلطیاں نکال دیتے ہیں جو سراسر غلط ہوتی ہیں۔ جگر ، اصغر، سیماب وغیرہ پر تبصرہ کرنے میں نیاز صاحب نے درجنوں بار ٹھوکر کھائی ہے۔

رشید احمد صدیقی سے البتہ تعجب ہے کہ انھوں نے عجلت میں رائے قائم کرلی۔ خدا جانے آپ نے کیا لکھا کہ انھوں نے کہا کہ " مجھ پر بھی وہی تاثر ہے جو آپ پر"، کیا آپ نے مہمل بتایا تھا؟ یا اعتراض کیا تھا۔؟ (۱)

مولانا کو ادیبوں اور شاعروں سے فنی و نظریاتی اختلاف ضرور تھا۔ مگر وہ دل و جان سے ہر ایک کی قدر کرتے تھے یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ جن شعرا و ادبا سے ان کو اختلاف تھا ان کے شائع شدہ مضامین و غزلیات پر مشتمل کتب و رسائل ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور فرمائش کرکے منگاتے ، ان کی اعلا تنقید و تبصرہ کو سراہتے ، عمدہ شعروں کو بار بار لوگوں کو سناتے اور خود بھی خوب خوب داد دیتے ۔ اس کا اعتراف خود سیماب صاحب نے بھی کیا ہے ۔ اور مولانا قادری نے بھی اس کا ثبوت مولانا کی تاریخ وفات نکال کردیا ہے۔ مولانا سیماب کے مرقد کی زینت مولانا قادری کی ہی لکھی ہوئی تاریخ ہے ۔ صنعت دائرہ میں باعتبار سن عیسوی و ہجری علامہ سیماب اکبر آبادی کی تواریخ وفات جیسی مولانا نے نکالی ہیں اور ان میں جیسی صنعت کی ہے ایسی مولانا نے زندگی بھر کسی کی تاریخ وفات نکالنے میں نہیں کی اس کی امثال ان کی تاریخ گوئی میں شامل ہیں۔ اور یہ دونوں حضرات کے دلی و روحانی تعلق کا ثبوت ہے ۔

---

(۱) " خطوط قادری بنام حیرت شملوی"، (غیرمطبوعہ) ، مملوکہ راشد حسن قادری

خلیفہ عبدالحکیم اور الیاس برنی کی وفات سے وہ بڑے متاثر ہوئے اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

" خلیفہ عبدالحکیم اور الیاس برنی دونوں کی وفات حسرت ناک ہے ۔ الیاس برنی مرحوم سے میرا کچھ سسرالی رشتہ بھی تھا ۔ یعنی میری بیوی کی ایک خالہ زاد بہن ان سے منسوب تھیں ۔ میں خود بھی ان سے تعلقات تھے ۔ برنی صاحب کی بیوی کے حقیقی بھائی اور دوسرے سب ہی رشتہ دار کراچی اور پاکستان میں ہیں ۔ بعض مجھ سے قریب ہی رہتے ہیں ۔ انہی لوگوں سے ان کا حال معلوم ہوا تھا ۔ یہ ایک حیرت ناک بات ہوئی ۔ قرآن مجید میں ہے کہ کسی نفس کو خبر نہیں کہ " بای ارض تموت " ۔ کس سر زمین پر موت آئے گی ۔ برنی مرحوم کی عمر حیدرآباد دکن میں گذری ۔ انھوں نے وہاں اپنے پیر و مرشد کے قریب اپنی جگہ متعین کر رکھی تھی ۔ بلند شہر میں اپنی ہمشیرہ کی عیادت کے لیے آئے تھے ۔ کہ یکایک ایک وقت آگیا ۔ ان کے کوئی لڑکا نہیں ہے ۔ ایک لڑکی ہے ۔ وہ ساتھ تھی ۔ لڑکی جنازہ لے کر حیدرآباد چلی مگر دہلی پہنچنے پر حکومت نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی ۔ ناچار جنازہ واپس لاکر وطن ہی میں دفن کیا گیا ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون " اللہ تعالی مغفرت فرمائے ۔ مراتب اخروی بلند فرمائے ۔ " (۱)

مولانا شعر و سخن کے کس قدر دل دادہ اور فن و کمال کے اس قدر قدردان تھے کہ اگر فن و کمال کسی ادنا سے ادنا اور چھوٹے سے چھوٹے شخص میں بھی نظر آتا تھا تو اپنی وسیع القلبی اور وسیع النظری کے سبب داد دئیے بغیر نہ رہتے تھے ۔ وہ کراچی کے ایک نو عمر و نو فکر شاعر عارف سنبھلی کے اشعار سے بہت متاثر تھے اور اکثر احبا[۲] کو اس کے کلام شعر سناتے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ اس کو نظر بد سے بچائے کہ اس کم عمری میں ایسے اعلا شعر کہتا ہے اور ان کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا ۔ عین عالم شبا[۲] میں بڑی بیدردی سے قتل کردیا گیا ۔ اس کی کی شعری صلاحیتوں کے سلسلے میں پروفیسر مشیت الدین فریدی

---

(۱) " خطوط قادری بنام حیرت شملوی " ، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ راشد حسن قادری

کو یکم اپریل، ۱۹۵۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" اس عرصے میں ایک نئے نوجوان شاعر کا پتا ملا - کسی نے اس کے چند شعر سنائے بہت پسند آئے - بالکل لڑکا ہے ، نو عمر، نومشق ، مگر خوب کہتا ہے - لوگوں کو فکر ہے کہ اچھی ترکیبیں اور شعروں کو یہ خود بھی سمجھتا ہے یا نہیں اس لیے کبھی کبھی فی البدیہہ کہا واکر امتحان بھی لیا گیا اور وہ کام یاب ہوا- مشاعروں کے بعض بوڑھے و پرانے شاعر اس سے جلنے لگے ہیں- اس کو شروع میں پڑھوا دینا چاہتے ہیں - مگر اب استادوں کے شروع میں اس کا نمبر آنے لگا ہے - اس کے مندرج ذیل شعروں کو دیکھئے اور داد دیجئے - محمد علی شاہ صاحب نے کن کو بھی سنائیے - بعض شعر ٹی پختہ کہے ہیں حالاں کہ تعلیم کچھ نہیں ، نہ پڑھا ہے نہ پڑھتا ہے -

جگر صاحب کی مشہور غزل ہے - وفا یاد ، ادا یاد ، اس پر اس نے غزل لکھی اور جگر کو سنائی کہتا ہے :

بھلا نہ سکے ہم کو بہاروں کے مناظر
آنکھوں کو رہی جرم نظارہ کی سزا یاد

حیرت ہے کہ اتنا سا بچہ یہ مضمون کیوں کر پیدا کرسکا - دوسرا شعر دوسری غزل کا دوسرے رنگ کا ہے مگر کس قدر دل چسپ ہے :

یہ پردہ‌شوں حجاب محبت کی تاب‌کے
اچھا بھی کیجئے کبھی نیچی نگاہ کو

ایسے اشعار کوئی بچہ کہہ سکتا ہے ؟ مگر بچے ہی نے کہا ہے اور اس مطلع کو دیکھنا :

آخر ہنسنا کس کا حق ہے
لالہ و گل کا سینہ شق ہے

مجھے بھی حیرت ہے کہ پہلا مصرعہ اس نے کیسے کہہ دیا-" (۱)

مولانا اگرچہ بڑے متین و سنجیدہ اور روایت پرست شخص ہیں مگر جہاں کوئی نئی و

---

(۱) " مکتوب قادری بنام پروفیسر مغیث الدین فریدی"، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ مجید حسن فریدی -

اچھی بات نظر آتی ہے اس کو سراہنے ~~بخط~~ نہیں مانتے۔

وہ ہماری قدیم تہذیب کا اک نمونہ ہیں اور اپنے نظام فکر میں معاشرتی و اخلاقی اقدار کا ایک خاص نظریہ و معیار رکھتے ہیں ۔ ۱۵ اگست ، ۱۹۵۳ء کے ایک خط میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو لکھتے ہیں :

" مدراس والے ڈاکٹر عبدالحق کا خطاب شاید افضل العلماء بھی ہے۔ مجھے بھی ایک مرتبہ ان کی زیارت کا موقع ملا ہے ۔ جب وہ جامعہ اردو کے جلسے میں آگرے تشریف لائے تھے ۔ مجھے ایک ادا ان کی بہت پسند آئی ۔ ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ مولانا احمد حسن صاحب محدث کانپوری رحمتہ اللہ علیہ ڈاکٹر صاحب کے والد مرحوم محدث کانپوری کے شاگرد تھے۔ صرف اس تعلق سے ڈاکٹر صاحب آگرے سے کانپور گئے ۔ مولانائے مغفور کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور ان کے خاندان سے ملے یہ سن کر آپ کو لطف آئے گا کہ حضرت محدث کانپوری مفتی الدین فریدی کے حقیقی دادا تھے اور لطف مزید کا باعث یہ لطیفہ ہوگا کہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب میرے پیر و مرشد حضرت قبلۂ عالم محدث علی پوری روحی فداہ کے بھی استاد تھے۔ حضرت صاحب نے کانپور آکر اور مولانا صاحب کی خدمت میں رہ کر حدیث شریف پڑھی تھی۔ لطیفہ یہ ہے کہ جب حضرت مفتی اور ان کے بھائی کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت صاحب اپنے استاد کے نواسوں کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے ۔ حالانکہ انتہائے ضعف کے سبب سے ایک آدمی کی مدد سے اٹھتے اور کھڑے ہوتے تھے۔ اور پہلے لڑکوں کو بٹھالیا جب تک خود بیٹھے ۔" (۱)

جیسا کہ مولانا کے مندرجہ بالا مکتوب سے ظاہر ہے وہ حضرت قبلۂ عالم الحاج حافظ پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث ~~ــــــ~~ علی پوری رحمتہ اللہ علیہ سے نہ صرف بیعت تھے بلکہ ان کے محبوب و مقرب خلفاء میں سے تھا راقم کے والد (حکیم سید قمر احمد) کو بھی اسی دربار سے خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا۔ یہ مولانا قادری کی اپنی بزرگی اور

---

(۱) احمد فاروقی ، ڈاکٹر خواجہ ، " حامد حسن قادری " ، (مقالہ) ، " نقوش شخصیات نمبر " ، محولہ بالا ، ص ۲۸۸

حسن اخلاق تھا۔ اہل سلسلہ و یار طریقت ہونے کے سبب بڑے لطف و کرم اور خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ شاید اسی خلوص و محبت اور تعلق روحانی کا سبب تھا کہ دونوں بزرگوں نے ایک ہی سال یعنی کہ ۱۹۶۳ء میں صرف چارماہ کے تفاوت سے جان جان آفرین کے سپرد کی یعنی والد نے یکم فروری ۱۹۶۳ء کو رحلت کی تو مولانا کا وصال ۲ جون ۱۹۶۳ء کو ہوا۔

عمر کے آخری ایام میں بھی جب عناصر میں اعتدال نہیں رہتا اور قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوجاتا ہے ۔ مولانا نے قلم کو ہاتھ سے نہ چھوڑا ۔ اخلاق و اخلاص اور تعلقات و وضعداری میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیا ۔ عرصے سے خود صاحب فراش ہونے اور مسلسل علیل رہنے کے باوجود اس احقر کے والد کی وفات پر تعزیتی خط میں تحریر فرماتے ہیں :

" حکیم صاحب قبلہ کی وفات حسرت آیات بڑا سخت المیہ ہے ۔ یہ قندیل ہستی تھی۔ ہمارے سلسلے میں آگرے کے قطب تھے ۔ اللہ تعالی مغفرت کرے، جوار رحمت میں جگہ دے اور مراتب آخرت بلند فرمائے۔

آپ کو جیسا صدمہ ہوگا اس کا میرے دل پر بڑا اثر ہے ۔ میں کئی ہفتے سے سخت علیل اور صاحب فراش ہوں جس کا اثر اس تحریر سے ظاہر ہے ۔ قلم اور ہاتھ قابو میں نہیں۔" (۱)

پھر کہتے مولانا قادری کی شخصیت اور صالحیت کی طرح ان کے خطوط بھی اردو ادب میں ایک خاص اہمیت و افادیت کے حامل ہیں۔ جن سے ان کی اعلا ظرفی و بلند کرداری اور خلوص و محبت کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے ان خطوں میں مولانا کی متانت و سنجیدگی بھی ہے ، شفقت و محبت بھی، برجستگی و بے تکلفی بھی اور تحقیق و تنقید بھی۔

---

(۱) * مکتوب قادری بنام سرور اکبرآبادی، غیر مطبوعہ ، مکتوب الیہ ... قادری

ان کی شفقت و محبت کا عالم یہ تھا کہ اپنے احباب و اعزہ کے علاوہ دوسروں کے کام کو بھی اپنا ذاتی و ضروری کام سمجھ کر انجام دیتے ۔ اس سلسلے میں مولوی عبداللطیف خاں صاحب کشتہ رقم طراز ہیں :

" میں گورنمنٹ کالج اٹاوہ میں تعینات تھا میری کالج کی بزم ادب کا سکریٹری انٹرمیڈیٹ پاس کرکے سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخلے لینے کے لیے جانے لگا ۔ ایک غریب گھرانے کا بچّہ تھا ، لیکن ہونہار ۔ مجھ سے طالب اعانت ہوا۔ میں نے قادری صاحب کو سفارشی خط لکھ کر اسے دے دیا انھوں نے مجھے تحریر فرمایا:

" کرم نامے کا شکریہ ، رادھا رمن ماشاء اللہ بہت ذہین ہے اور متین بھی ۔ میں ہر طرح کی امداد و اعانت کے لیے تیار رہوں گا ۔ آپ مطمئن رہیں۔ ماسٹر الطاف حسین صاحب کی علالت کو سن کر بہت تردد ہوگیا۔ اللہ تعالی صحت دے اور سلامت رکھے۔ ان کی خیریت پھر لکھئے گا۔ فریدی صاحب سلام لکھواتے ہیں۔" (۱)

اس طرح ان کے ہر خط سے شفقت و محبت اور خلوص و ایثار ٹپکتا ہے ۔ اگرچہ انھوں نے دوسروں کی طرح غالب کے خطوط کی تقلید و پیروی نہ کی مگر خطوط کے ذریعہ ملاقاتوں کے وہ ضرور قائل تھے اور خطوط آتے ہی جواب لکھنے بیٹھ جاتے گویا ان خطوط ہی کے منتظر تھے۔ لیکن لگ ان کے لکھنے میں وہ کسی کوشش و کاوش سے کام نہ لیتے بلکہ قلم برداشتہ جو کچھ ذہن میں وارد ہوتا لکھتے چلے جاتے بعض تحقیق طلب باتوں کے متعلق بھی جو کچھ اس وقت ذہن میں آتا فوراً لکھ دیتے ۔ حیرت شملوی کے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں :

" یہ میں بلا تحقیق اپنی رائے لکھ رہا ہوں ۔ چھان بین کرنے سے

---

(۱) کشتہ، عبداللطیف خاں ، مکاتیب، " حامد حسن قادری" (مقالہ) ، " اردو نامہ" کراچی : ۱۹٦۵ع ، شمارہ ۱۹، ص ۲۳

ممکن ہے اس کے خلاف کسی استاد کی سند نکل آئے ۔ آپ تحقیق جاری رکھئے ۔"(۱)

ان کے خطوط سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے کہ وہ بے تکلفی و سادگی اور برجستگی و بے ساختگی کا ایک اعلا نمونہ ہیں۔ بعض جملے تو ایسے لکھ جاتے ہیں کہ بار بار پڑھنے کو اور بخوبی ذہن نشین کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ جگہ جگہ اردو و فارسی کے عمدہ جملوں کے علاوہ کلام پاک کی آیات کے بھی حوالے دیتے چلتے ہیں اور ان کا ترجمہ بھی لکھتے جاتے ہیں تاکہ مکتوب الیہ پر بات بخوبی واضح ہوجائے ۔ گاہ گاہ واقعات کو بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں داستان کا سا لطف پیدا ہوجاتا ہے ۔

وہ ایک بے ریا ، بے تعصب اور بے باک انسان تھے۔ علمی و ادبی دنیا میں انھوں نے خطوط کے ذریعہ بہت سے لوگوں کی ہمت افزائی کی ۔

خطوط کے ذریعہ بھی وہ اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرلیا کرتے تھے۔ اور اس شغل کو بھی وہ اپنے شغل تاریخ گوئی کی طرح محنت ، محبت یا (Labour of love) ہی سے تعبیر کرتے تھے۔ اپنے مختصر سے خطوط میں بھی بڑے بڑے ادبی مضامین سمودیا کرتے تھے ۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ان سے تنقیدی و تحقیقی باتیں دریافت کرتے تھے بہت خوش ہوتے ایسے خطوط کے جوابات کو اور عام خطوط پر فوقیت دیتے ۔ اس طرح انھوں نے اپنے بہت سے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے ذوق کو جلا بخشی ۔ انھیں ان کی لغزشوں سے آگاہ کرکے ان کے محاسن کو اجاگر کیا۔ اگر کسی ذریعہ سے کوئی ادبی یا تحقیقی بات ان تک پہنچی یا کسی اچھے شاعر کے شعر ان کو سنائے گئے تو یہ نا ممکن تھا کہ وہ اپنے احباب اور با ذوق تلامذہ سے دور رہتے ہوئے بھی یہ باتیں اور یہ اشعار خطوط کے ذریعہ اپنی اولین

---

(۱) "خطوط قادری بنام حیرت شملوی"، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ راشد حسن قادری۔

فرصت میں ان تک نہ پہنچادیں ایسا کرنے کے بعد انہیں جو طمانیت ملتی اس کا اندازہ صاحب ذوق حضرات ہی کرسکتے ہیں۔

بہر کیف مولانا قادری کا فن کارانہ خلوص ان کے خطوط کا دل کش و دل چسپ انداز تحریر ، ان کی خوش طبعی و بذلہ سنجی ، بے تکلفی و برجستگی اور ان کی ادبی اہمیت و افادیت ان کو دنیائے مکاتیب میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رکھے گی اور وہ ہر دور میں دل چسپی سے پڑھے جائیں گے ۔

٭٭٭٭

نواں ۔ باب

بچوں کا ادب

مولانا قادری اور بچوں کی دلچسپیات ،

بچوں کے لیے مولانا کی صحافت ،

مولانا کا پیغام اور بچوں پر اس کے اثرات

دسواں - باب

بچوں کا ادب

مولانا قادری اور بچوں کی نفسیات ،

بچوں کے لیے مولانا کی تصانیف ،

مولانا کا پیغام اور بچوں پر اس کے اثرات

دنیا کی تمام متمدن اور ترقی یافتہ قومیں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما کی طرف خصوصی توجہ دیا کرتی ہیں ، کیوں کہ ان کے پیش نظر یہ مقولہ رہتا ہے کہ " آج کے بچے کل کے باپ ہیں"۔ یہی سبب ہے کہ جن اقوام میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف مناسب طور پر توجہ نہیں دی جاتی تو اس کا خمیازہ اس قوم و نسل کو صدیوں تک بھگتنا پڑتا ہے ۔ لائق و فائق والدین اپنے بچوں کے لیے علم و عمل کی دولت ہی بطور سرمایہ و ورثہ چھوڑ جاتے ہیں۔ جس کے سہارے پس ماندگان زندگی کے ہر خلا کو پر کرلیتے اور ہر مسئلے کا حل تلاش کرلیا کرتے ہیں ۔ لیکن اس کے برعکس وہ لوگ جو اپنے پیچھے اولاد کے لیے کثیر مال و دولت تو چھوڑ جاتے ہیں مگر ان کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حالات کا مقابلہ نہیں کرپاتے ، زمانے کی چالوں کو نہیں سمجھتے ، وہ اخلاق و کردار اور تمدن و معاشرت کے اصولوں سے بے بہرہ رہتے ہیں اور معاشرہ کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔

آج کا دور ترقی یافتہ دور ہے ۔ امریکہ و برطانیہ ، روس و جرمنی اور چین و جاپان وغیرہ میں بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہانت و لیاقت کے اعتبار سے بہت سی کتابیں ملتی ہیں۔ اور آئے دن نئی نئی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے ان کے علم و ادب اور تہذیب و شائستگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور وہ بتدریج ترقی کی طرف گام زن ہیں۔ اس لیے ہم کو بھی بچوں کے ادب پر خصوصی طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔

بچوں کے ادب کی اقسام

بچوں کے ادب کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

۱- بچوں کے متعلق ادب ،
۲- بچوں کے مطالعہ کا ادب ، اور
۳- بچوں کے لئے لکھا ہوا ادب -

اس وقت موخر الذکر یعنی " بچوں کے لیے لکھے جانے والے ادب " کے متعلق کچھ لکھنا مقصود ہے - یہاں بچوں کے ادب سے مراد وہ کتب بھی نہیں ہیں جو بطور نصاب ان کے کورس میں شامل ہوتی ہیں بلکہ یہاں بچوں کے ادب سے صرف وہ ادب مراد ہے جو بچوں کے ذہنوں کو جلا بخشے اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارے ، ان کو اعلا اخلاقی اور انسانی درس دے اور زندگی کی اعلا اقدار سے روشناس کرائے - اگر کسی ادب میں کوئی واضح نصب العین اور اخلاقی بات نہیں ہے تو ایسا ادب بے روح اور بے فیض ہے -

بچوں کے ادب کی تخلیق کرتے وقت کسی ادیب اور مصنف کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان کی نفسیات اور ان کے گرد و پیش سے بخوبی واقف ہو - ساتھ ہی اسے بچے کی عقل و شعور ، ذہن و ادراک ، قوت حافظہ ، پرواز خیال اور دل چسپی و معلومات کی حدود کا بھی اندازہ ہو - اگر ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی ادب تخلیق کیا جائے تو ایسا ادب بچوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہونے کے علاوہ ان کو ذہنی بیماریوں اور کمزوریوں سے بھی نجات دلائے گا۔

بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لیے انھیں بہت سی باتیں سکھائی و سمجھائی جاتی ہیں اور عملاً کرکے دکھائی جاتی ہیں ، جب کہ بعض باتوں سے باز رہنے اور بچنے کی تلقین کی جاتی ہے - ان کے بعض جذبوں کو ابھارا جاتا ہے بعض کو دبانے کی طرف توجہ دی جاتی ہے - لہٰذا بچوں کے ادب میں یہ خصوصیت لازمی ہونی چاہئے کہ وہ ان کی

معلومات عامہ میں اضافہ کرکے ذہنی نشو و نما کرے اور اخلاقی درس دے -

اردو ادب دنیا کے دوسرے ادبوں کے مقابلے میں ابھی کم سن ہے لیکن اس نے جلد ہی جوانی کی منزلوں کو چھولیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا واسطہ جن شعرا و ادبا سے پڑا وہ دوسری زبانوں میں بھی ماہر تھے - یعنی عربی و فارسی میں بھی دست گاہ رکھتے تھے- جب ہمارے شاعر و ادیب اس زبان کی طرف متوجہ ہوئے تو انھوں نے بھی چند خیالی کہانیاں لکھیں مگر وہ بھی زیادہ تر دوسری زبانوں سے ماخوذ تھیں- بچوں کے ادب کی طرف بہت بھی توجہ نہ دی گئی کہ بلند پایہ ادیب چھوٹوں کے لیے چند نظمیں اور کہانیوں کی سوغات چھوڑ کر بڑوں کے ادب کی طرف متوجہ ہوگئے -

اردو میں بچوں کے ادب کی کمی کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ اس کے لیے بڑے غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کی ضرورت ہے جس کی پابندی ہمارے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کے بس کی بات تو تھی مگر انھوں نے اس طرف کوئی خاص توجہ اس لیے نہ دی کہ " بچوں کے لیے لکھنا بھی کوئی کام ہے " اس خیال سے ہمارے شاعر اور ادیب بچوں کے ادب کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے - اور اس سے اکثر پہلو تہی کرتے رہتے ہیں - ایک اور خیال جو ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ بچوں کے لیے تو بچے ہی لکھیں بڑوں سے اس کا کیا واسطہ - کتنا مضحکہ خیز خیال ہے ؟ کیا بچوں کا ادب ، ادب ہی نہ ہوا کوئی ادنا درجے کا کام ہوا-

بچوں کے ادب کی تخلیق بڑا مقدس فریضہ ہے اور یہ کام بڑے ادیب و شاعر ہی انجام دیا کرتے ہیں - کیوں کہ بچوں کے لیے کتابیں لکھنے والے کو بلندئ فکر و نظر اور بلندئ اخلاق و کردار کا حامل ہونا ضروری ہے - اخلاق و کردار اور فکر و فن کی آمیزش ہی سے بچوں کے لیے اچھا ادب تخلیق کیا جاسکتا ہے - بچوں کے ادب کے اپنے تقاضے و مقاصد

ہوتی ہیں۔ اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت ان تمام خصوصیات کو بروئے کار لانا نہایت ضروری اور اہم ہے ۔ ان کے بغیر نتیجہ خیز اور سبق آموز ادب تیار ہی نہیں ہوسکتا۔

بچوں کے ادب پر مزید کچھ لکھنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس امر کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیں کہ عام طور پر اردو میں بچوں کا ادب کس معیار اور کس قسم کا ہے۔ جہاں تک بچوں کے ادب کی ابتدا کا تعلق ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے نظر" خالق باری" اور مرزا غالب کے " قادر نامہ " کی طرف جاتی ہے ۔ اگرچہ غالب سے قبل ان کے استاد نظیر اکبر آبادی نے بھی " ریچھ کا بچہ " اور " ھنس" وغیرہ نظمیں خصوصیت سے بچوں کے لیے لکھی تھیں۔ اور ان سے اس زمانے کے بچے محظوظ بھی ہوتے تھے لیکن یہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس کی طرف خصوصیت سے جن لوگوں نے توجہ دی ان میں مولانا محمد حسین آزاد ، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکا اللہ دھلوی کے نام سر فہرست ہیں۔ اگر ان بزرگوں نے ادب کے قواعد و ضوابط کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی کتابیں نہیں لکھیں مگر پھر بھی تاریخی کہانیوں پر مشتمل مولانا محمد حسین کی " قصص الہند" اور اخلاقی و اصلاحی باتوں پر مشتمل " نصیحت کا کرن پھول" اپنی دل چسپی و دل کشی اور زبان و بیان کے اعتبار سے بڑی اہمیت و افادیت کی حامل ہیں۔ ان دونوں کا انداز بیان خصوصیت سے بچوں کی پسند و رغبت سے گہرا تعلق رکھتا ہے ۔

اس ضمن میں خود مولانا آزاد کا قول ہے :

" جب تک انسان بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ انھیں بار بار کاٹتا اور بناتا ، لکھتا اور مٹاتا ، بوڑھا ہوکر بچہ بنتا ، چلتے پھرتے سوتے جاگتے بچوں ہی کی خیالات میں رہا کرتا مہینوں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب بچوں کے کھلونے تیار ہوئے ۔" (۱)

---

(۱) محمود الرحمن ، " بچوں کا ادب"، کراچی : نیشنل بک فاؤنڈیشن ، ص ۸۱

آزاد کے اس قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بچوں کا ادب بچوں کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا اور یہی بات ان کی کتب کی شہرت و مقبولیت کا سبب بنی ۔ آزاد کی تصنیفات کے متعلق مولانا حامد حسن قادری " داستان تاریخ اردو " میں رقم طراز ہیں :

" سررشتہ تعلیم پنجاب کی ملازمت کے زمانے میں کرنل ہالرائڈ کی فرمائش سے آزاد نے اردو ریڈریں، قواعد اردو اور قصص ہند مرتب کیں۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوع کی بہترین کتابیں ہیں۔ بچوں کی درسیات میں ان سے بہتر کتابیں موجود نہ تھیں۔ اور ان کے بعد بھی مولوی اسمعیل میرٹھی کے سوا کسی سے ان سے بہتر نہ بن سکیں خصوصاً قصص ہند کی فصاحت و دل کشی اور لطف و تاثیر کا آج تک جواب نہ ہوسکا۔" (۱)

ڈپٹی نذیر احمد کی بعض کتابوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انھیں بھی بچوں کی لیاقت و صلاحیت اور جبلت و فطرت کا اندازہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی ہوگی وہ بھی اپنی تصانیف کے سلسلے میں خود لکھتے ہیں :

" میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ۔ ڈھونڈا، تلاش کیا، کہیں پتا نہ لگا۔ ناچار میں نے ہرایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے " مرآۃ العروس " ، چھوٹی کے لیے " منتخب الحکایات " ۔ بشیر کے لیے " چند پند" ۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں ، تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کردیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لیے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی، وہ دو کے لیے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے ۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا کھاں تیار ہوا۔" (۲)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، کراچی: ایجوکیشنل پریس ، ۱۹۶۶ء ، (تیسرا ایڈیشن) " صص ۵۳-۳۵۴

(۲) ایضاً، صص ۳۸-۵۴۷

آزاد کے اس قول کی تصدیق آج بھی اس امر سے ہوسکتی ہے کہ " مراۃ العروس" کو آج بھی لڑکے اور لڑکیاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ آج سوسال سے زیادہ کا عرصہ گذرنے کے بعد بھی اس کی دل کشی برقرار ہے کیوں کہ خاندانی زندگی کے جھگڑوں کو مٹانے کے لیے ڈپٹی نذیر احمد نے جو کوشش کی تھی وہ آج بھی کسی نہ کسی رنگ میں ہر درجے کے معاشرے میں روبنما ہوتی رہتی ہے ۔ ہم لوگ کیوں کہ اوسط درجے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اوسط کے متعلق ہی جانتے ہیں ۔

آزاد اور نذیر احمد کی طرح مولوی ذکا اللہ دہلوی کی نصابی کتب بھی عرصے تک بچوں کے لیے بڑا مفید ادب پیش کرتی رہیں مگر جب انگریزوں کا غلبہ ہوا تو تمام اسکولوں کی تعلیم اور امتحانات انگریزی میں ہونے لگے تو ان کو خیرباد کہہ دیا گیا ۔ مولوی ذکا اللہ کی نصابیت کے لیے مولانا حامد حسن قادری رقم طراز ہیں :

" مولوی ذکا اللہ صاحب کے ہم عصروں میں کسی ایک مصنف نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں نہیں لکھیں ۔ لیکن یہ بخت و تقدیر کی عجب ستم ظریفی ہے کہ اب ان کی نصابیت کی طباعت و اشاعت ، قدردانی و فیض رسانی کم سے کم ہے ۔ مولوی ذکا اللہ صاحب کی اکثر کتابیں ، خصوصاً تاریخ نہایت معمولی کاغذ و کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئیں ۔ اور حسن ظاہری میں دل کشی و جاذبیت نہیں رہیں۔ اب صرف ان کے مضامین کہیں کہیں درسی کتابوں میں داخل نظر آتے ہیں اور بس ۔" (۱)

بچوں کے ادب کے سلسلے میں خصوصیت سے مولانا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں ۔ ان کے علاوہ خواجہ الطاف حسین حالی، اور علامہ اقبال ۔ نے بھی اپنے پہلے مجموعۂ کلام " بانگ درا" میں بچوں کے لیے بہت سی

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "تاریخ داستان اردو"، محولہ بالا، ص ۵۲۳

نظمیں لکھیں جو آج بھی بے حد مقبول ہیں ۔ مثلاً :

"ایک پہاڑ اور گلہری"

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے تجھے ہو شرم تو پانی میں جاکے ڈوب مرے

ذراسی چیز ہے اس پر غرور کیا کہنا یہ عقل اور یہ سمجھ یہ شعور کیا کہنا !

خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں

بھلا پہاڑ کہاں جانور غریب کہاں

کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجھ کو بنادیا اس نے مجھے درخت پہ چڑھنا سکھادیا اس نے

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ کو نری بڑائی ہے ! خوبی ہے اور کیا تجھ میں

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اسی طرح ان کی دوسری نظمیں "ایک گائے اور بکری" ، " بچے کی دعا "، " ہمدردی"، " ماں کا خواب "، " پرندے کی فریاد"، " جگنو" ، " ہندوستانی بچوں کا قومی گیت "، " ایک پرندہ اور جگنو" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اقبال نے خصوصیت سے بچوں کے لیے لکھیں۔ اقبال کی ان نظموں کے اکثر اشعار میں بعض الفاظ مشکل بھی ہیں اور انداز بیان بھی

آسان نہیں ہے مگر بچے ان کو شوق سے رٹتے ، گاتے اور لکھتے و پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ انداز بیان سادہ نہ ہونے اور مشکل الفاظ رکھنے کے باوجود بھی یہ الفاظ بچوں کی افتاد طبع اور مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کا ترنم و موسیقی ، روانی و برجستگی الفاظ کے در و بست سے پیدا ہونے والا تجسس و تحیر بچوں کے لیے ایک بڑی کشش رکھتا ہے اور وہ ان کی طرف خود بخود ملتفت ہوجاتے ہیں۔

بچوں کے ادب کی تخلیق میں سب سے نمایاں کام مولوی محمد اسمعیل میرٹھی کا ہے ۔ انھوں نے یونان کے مشہور مصنف ایسوپ کی طرز پر (جو اخلاقی و اصلاحی کہانیاں لکھنے میں ماہر تسلیم کیا جاتا ہے) بچوں کے لیے اخلاقی نظمیں اور کہانیاں لکھیں ۔ مولوی محمد اسمعیل میرٹھی کی وہ نظمیں جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھیں ہماری اردو شاعری میں ایک نیا و خوش گوار تجربہ و اضافہ ہیں۔ انھوں نے وہی زبان بولی اور وہی زبان لکھی جو بچے بولتے اور لکھتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کو اچھی اچھی باتیں اور اچھے اچھے کاموں کے لیے ایسے دل نشیں و دل پذیر انداز میں نصیحتیں کی ہیں کہ ان کی نظمیں سرسید احمد خاں کے اس قول کا مصداق بن گئی ہیں کہ " بات دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔" انھوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیوں، واقعات ، امثال اور مکالمات کے ذریعہ بڑے نرم و دل نشیں لہجے اور بڑی سادہ و آسان زبان میں اس انداز سے نصیحتیں کیں کہ وہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ مولوی محمد اسمعیل میرٹھی ایک معلم ہونے کے ساتھ بچوں کی نفسیات کے بھی ماہر تھے ۔ اسی مناسبت سے انھوں نے بچوں کے لیے درسی کتابوں کا ایک سلسلہ ترتیب دیا جو عرصے تک اسکولوں کے نصاب میں شامل رہا۔

مولوی اسمعیل میرٹھی بچوں کی دل چسپی سے پہلے ہی آگاہ تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے نظم کی سادگی و برجستگی اور اس کی نتیجہ خیزی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔

ملاحظہ ہو کہ وہ کس سیدھے سادے انداز میں بچوں کے اندر کام کرنے کی لگن پیدا کرنا چاہتے ہیں :

دیکھو چل رہی ہے پن چکی — دُھن کی پکی ہے کام کی سچی
بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر — تیرے پہیے کو ہے سدا چکّر
علم سیکھو سبق پڑھو بچّو — اور آگے بڑھے چلو بچّو
کھیلنے کودنے کا مت لو نام — کام جب تک کہ ہو نہ جائے تمام
جب ہو جائے کام تب ہے مزا — کھیلنے کھانے اور سونے کا
دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ — نہ کہ اکتا کے خامشی کے ساتھ

دیکھ لو چل رہی ہے پن چکّی
دھن کی پکی ہے کام کی سچی

اس نظم میں انھوں نے بچوں کو نتیجہ اخذ کرنے کے ساتھ ساتھ دعوت مشاہدہ بھی دی ہے تاکہ اس نظم کے ذریعہ جو سبق وہ بچوں کو دینا چاہتے ہیں وہ بخوبی ان کے دل نشین ہوجائے - جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے وہ بھی بچوں کے مزاج سے بخوبی ہم آہنگ ہے - یہی وجہ ہے کہ بچے اس میں دل چسپی لیتے ہیں اور ان میں علم سے فرار کا مادّہ نہیں رہتا بلکہ اس نظم کو پڑھ کر حاصل ہونے والی مسرت سے وہ اور آگے بڑھنے کی سعی کرتے ہیں- بچے جانوروں میں بڑی دل چسپی لیتے ہیں مولوی صاحب نے ان کی اخلاقی تربیت کے لیے " کتّا و بلّی" یا " ایک حریص بلّی" کے عنوان سے نظمیں لکھی ہیں- اسی طرح ان کی ایک اور نظم "ہماری گائے " ہے- جس کے ذریعہ بچے کی توجہ اس کے ذاتی مشاہدے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت کی طرف بھی مبذول کرائی ہے - مثلاً :

اس مالک کو کیوں نہ پکاریں — جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا — سبزے کو پھر گائے نے کھایا

کل جو گھاس چری تھی بن میں　　　دودھ بھی وہ گائے کے تھن میں

سبحان اللہ دودھ ہے کیسا

تازہ گرم سفید اور میٹھا

اسمعیل میرٹھی صحیح معنی میں بچوں کے شاعر ہیں ان کی شاعری میں بلندی نہیں ہے - فلسفہ نہیں ہے - اونچی چاشنی بھی نہیں ہے مگر ان کی نظموں میں بچوں کے لیے ایک خصوصی کشش ضرور ہے اور وہ کشش ہے " بچپن" - ان کی نظمیں پڑھ کر بوڑھوں کو بھی بچپن کا گذرا زمانہ یاد آجاتا ہے - ان کی نظموں میں سدا بہاری اور ہردم تازگی کی سی کیفیت ملتی ہے - یہی سبب ہے کہ آج بھی عمر کی ہر منزل میں ان کے اشعار یاد آجاتے ہیں۔

یہ اشعار نہ جذبات کی شدت رکھتے ہیں اور نہ ہی اردو ادب کی کسی قدیم یا جدید روایت کے علم بردار ہیں اور نہ ہی کوئی خاص شاعرانہ فن کاری ہے ان کو دیکھ کر ہر کوئی کہہ سکتا ہے کہ نہایت سیدھی سادی سی عام فہم بچوں کی سی باتیں ہیں۔ ان میں بچپن و لڑکپن موجود ہے - یہ اشعار ہماری زبان پر خود بخود آجاتے ہیں۔ جب کبھی ہم ان کو تفریحاً بھی ذہن میں لاتے یا دھراتے ہیں تو ہمیں بچپن کا دل کش زمانہ ، مکتب کی بہاریں اور استادوں کا پڑھانا یاد آجاتا ہے -

بچپن کے دن بیت جانے کے بعد بھی یہ اشعار اس لیے یاد آتے رہتے ہیں کہ ان میں ایک یاد رہ جانے والی کیفیت اور سادگی و روانی چھپی ہوئی ہے - یہی ان کی سب سے بڑی خوبی و افادیت ہے یہ اپنے آپ کو منوالیتے ہیں اور برابر یاد آتے رہتے ہیں۔ ان اشعار میں جو مخصوص کیفیت ہے وہی بچوں کے سارے ادب میں ملتی ہے - جب کبھی بچوں کے ادب کے سلسلے میں غور کیا جاتا ہے تو یہی یاددھانی اور یاد کرانے والی بات فوراً

سامنے آجاتی ہے - اور یہی " پادشاہی" والا حصہ بچوں کے لیے نفس مضمون اور ہیئت کو متعین کرتا ہے کیوں کہ بچوں کے ادب میں نفس مضمون اور ہیئت بہت اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی محمد اسمعیل میرٹھی کے بعد بچوں کے لیے لکھنے والوں میں ایک اور نمایاں نام حامد اللہ افسر میرٹھی کا ہے انھوں نے بھی بچوں کے لیے آسان و سادہ زبان میں نظمیں اور بہت سے علمی و معلوماتی مضامین لکھے ہیں۔ درسی کتب بھی ترتیب دی ہیں - نظموں و مضامین کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی کتب بھی تصنیف کیں جن میں " مکانوں کی کہانی" ، " آسمان کا ہم سایہ "، " جانوروں کی عقل مندی"، " چار چاند"، " لوہے کی چیل" وغیرہ ایسی کتب ہیں جو بچوں کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہیں۔

افسر صاحب نے بچوں کے لیے جو گیت لکھے وہ اپنی سادگی و سلاست کی وجہ سے کافی مقبول ہوئے ان کے مندرجہ ذیل شعروں کی سادگی ملاحظہ ہو :

اچھی بی بی آئی آنا   لیتا پردہ تھامنا

لاتی ہو کیا کیا   ہوگیا میرا سامنا

====XXX====

باغوں سے بہنا   پھولوں کا گہنا

نہروں کا بہنا   وارفتہ رہنا

دنیا میں جنت میرا وطن ہے

بھوری کمائیں   لائیں ہوائیں

باغوں میں جائیں   کلیاں کھلائیں

دنیا میں جنت میرا وطن ہے

افسر صاحب علامہ اقبال سے کافی متاثر تھے۔ علامہ اقبال کی طرح انھوں نے

بھی حسب وطن کے سلسلے میں جو نظمیں لکھیں ان میں اقبال کا اثر اور لب و لہجہ نمایاں ہے - یہ نظم ملاحظہ ہو :

پھولوں سے بھی سوا ہے کانٹا مرے وطن کا ــــ ہے آفتاب مجھ کو ذرّہ مرے وطن کا

دل میں جما ہوا ہے نقشہ مرے وطن کا

ہیں سب عزیز مجھ کو اس کی بیابان بھی ــــ بہتر بہار سے ہے اس کی مجھے خزاں بھی

دنیا میں ہو رہا ہے چرچا مرے وطن کا

گودی میں اس کی کیا کیا دریا مچل رہے ہیں ــــ ہر سمت کیسے کیسے چشمے ابل رہے ہیں

گویا بہشت ہے اک نقشہ مرے وطن کا

میں نے جہان بھر کی کیا کیا خاک اڑائی ــــ ایسی جہان بھر میں بستی کہیں نہ پائی

ہے میرے سر میں افسر سودا مرے وطن کا

مندرجہ بالا اشعار سے افسر صاحب کی وطن دوستی اور مناظر قدرت سے دل چسپی کا ہی ثبوت نہیں ملتا بلکہ انھوں نے اس کے ذریعہ بچوں کو جو درس حب الوطنی دیا ہے وہ بھی طرح کارگر نظر آتا ہے - ان اشعار میں صرف سادگی و برجستگی ہی نہیں ترنم و موسیقی بھی بھی طرح جلوہ گر ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے ترانے گیت اور نظمیں بچوں میں بہت مقبول ہیں۔

===XXXX====

موضوع و مضمون کی اہمیت یوں تو ہر قسم کے ادب میں بہت اہم و ضروری ہے مگر بچوں کے ادب میں اس پر خصوصی توجہ دینا لازمی ہے - ورنہ پھر یہ انتہائی نازک مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے - بچوں کے ادب میں موضوع کی گیرائی و گہرائی اور جذبات کی لطافت و نزاکت پر زور صرف نہیں کیا جاتا بلکہ موضوع کے ایسے پہلوؤں اور ایسی باتوں کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے جو آسانی سے بچوں کے ذہنوں پر مرتسم ہوجائیں - یہ

کام بڑا دقت طلب ہے ۔ اس میں بھی ایسی ہی کوشش و کاوش درکار ہوتی ہے جیسی
کسی اعلا علمی و ادبی تخلیق کے لیے ہوا کرتی ہے ۔ بچوں کے ادیب کو ایسے موقع پر
دوہری ذمہ داریوں کا سامنا ہوتا ہے ۔ اول تو یہ کہ وہ ایسے مضامین کا انتخاب کرے جو
بچوں کے سن و سال سے ہم آہنگ ہوں۔ دوم یہ کہ وہ کسی موضوع کے صرف چند ہی پہلوؤں
کو اسی طرح پیش کرے جو بچے کے سمجھ اور ذہن سے بڑی حد تک مطابقت رکھتے ہوں۔
بچے ان کو بآسانی سمجھ لے اور وہ اس کے ذہن میں کسی حد تک محفوظ رہ سکیں۔

اس لیے اچھے ادیب و شاعر بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت مواد کے انتخاب کو
ضرور پیش نظر رکھتے ہیں ۔ کیوں کہ اگر مفید سے مفید اور اچھے سے اچھا موضوع بے
احتیاطی سے منتخب کیا جائے تو وہ بچے کے لیے بے معنی ہوکر رہ جائے گا۔ لہذا موضوع کے
لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ بچوں کے لیے پسندیدہ ہو ۔ بچوں کی پسند و ناپسند کا
معاملہ اس ادیب و شاعر کے لیے نہایت سہل ہے جو بچوں کی نفسیات سے واقف ہو اور
نہ صرف یہ کہ وہ بچوں کی نفسیات کا ماہر ہو بلکہ اس دور اور اس زمانے کی نفسیات سے
بھی بخوبی آگاہ ہو ۔ ہر دور اور ہر زمانے میں اقدار حیات بدلتی رہتی ہیں ۔ اگر ادیب
یا شاعر نے اس طرف توجہ نہیں دی تو بھی وہ اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہوسکے گا۔ اس
لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد کے تقاضوں اور نفسیاتی اندازوں سے بھی بخوبی باخبر ہو۔
باغ و بہار، طلسم ہوش ربا، یا الف لیلی قسم کی کہانیاں بچوں کو آج بھی پسند ہیں
مگر ان کا انداز بدلا ہوا ہونا لازمی ہے ۔ اگر یہ آج بھی اسی انداز میں لکھی گئیں
تو مقبول نہ ہوں گی ۔

آج کے بچے جنوں اور پریوں کی کہانیوں کی بجائے سراغ رسانوں اور مہم جوؤں کی
کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں کیوں کہ انھوں نے سائنس کے دور میں آنکھ کھولی ہے اس لیے
وہ جنوں اور پریوں کی کہانیوں کو پسند نہ کریں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ادیب کو

روایتی ماحول ، فرسودہ خیالات اور بے سوچا افسانوی طرز سے گریز کرنا پڑتا ہے ۔ لہذا بچوں کے ادب میں ان کے مزاج و نفسیات سے ہم آہنگی لازمی ہے ۔

مولانا قادری نے جس زمانے میں آنکھ کھولی اس زمانے میں عربی و فارسی کا رواج عام تھا۔ لوگ انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے۔ انگریزی تعلیم کو اخلاق و معاشرے کے لیے مضر تصور کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دی اور اس کے سبب عہدے مناصب حاصل کرنا شروع کردیے ۔ جب کہ مسلمان اس طرف توجہ نہ دینے کے سبب معاشی پریشانیوں میں گھرے رہے ۔ آخر انھیں ان معاشی پریشانیوں کو دور کرنے کا طریقہ یہی نظر آیا کہ جدید تعلیم کی طرف توجہ دی جائے ۔ سرسید بھی اس راز سے بخوبی واقف تھے یہی سبب تھا کہ انھوں نے بھی اپنی تحریک کے ذریعہ مسلمانوں کو جدید علوم سے آگاہ ہونے اور جدید تعلیم کی حاصل کرکے آگے بڑھنے کی طرف توجہ دلائی ۔

مولانا قادری نے جب تعلیمی و تدریسی کاموں کی طرف توجہ دی تو انھوں نے دیکھا کہ انگریزی میں بچوں کا ادب بڑا وسیع اور وقیع ہے اور ایک خاص بات انگریزی ادب میں انھیں یہ بھی نظر آئی کہ انگریزی کے ہر اچھے شاعر و ادیب نے بچوں کے ادب کی طرف خصوصیت سے توجہ دی ہے ۔ علاوہ ازیں مغربی ممالک میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہاں کے اخبارات و رسائل بھی بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں مسلسل سرگرم عمل رہتے ہیں۔

مولانا قادری اور بچوں کی نفسیات :

مولانا قادری ایک معلم ہونے کے سبب بچوں کی نفسیات اور عادات و خصائل سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں وہ آزاد و نذیر ، حالی و اقبال اور مولوی محمد اسمعیل میرٹھی کی کوششوں کو بھی بڑی وقعت کی نگاہ

سے دیکھتے تھے - یہی سبب تھا کہ اول اول انھوں نے انگریزی کہانیوں اور نظموں کے ترجمے کی طرف توجہ کی ان کی ان نظموں میں تصنع و تکلف کی بجائے سادگی و صفائی اور حقیقت‌نگاری نمایاں ہے -

مولانا قادری نے اوائل عمر سے ہی بچوں کے لیے لکھنا شروع کردیا تھا- ان کے والد مولوی احمد حسن صاحب وکیل ان کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کو اکثر اپنے دفتر میں بلالیا کرتے تھے جہاں مولوی صاحب تو اکثر اپنے موکلوں کی طرف متوجہ ہوجاتے اور مولانا قادری بچوں کے لیے قصے کہانیاں لکھنا شروع کردیتے - اس طرح انھوں نے اس قدر مشق بہم پہنچائی کہ بچوں کے لیے اچھے خاصے مضامین اور قصے کہانیاں لکھنے لگے-

شروع شروع میں انھوں نے جو کتابیں لکھیں وہ اگرچہ مختصر تھیں مگر بچوں کے لیے بڑی دل چسپ اور سبق آموز تھیں- بچوں کے ادب کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کے لیے بھی انھوں نے کئی درسی کتب ترتیب دیں جن کا ذکر آگے آئے گا -

بچوں کے لیے مولانا کی تصانیف :

۱- پھولوں کی ڈالی

۲- گدڑی کا لال

۳- ہمت کا پھل

۴- ترانۂ حمد

۵- گم شدہ طالب علم

۶- گلدستۂ اخلاق

۷- ابراھام لنکن

۸- رفیق کقّا تنہائی

۹- حسنون

۱۰- سوچا کا حوالہ

۱۱- جادوگری

۱۲- حسن بچیسی

۱۳- کاغذ کے کھلونے

بچوں کی مندرجہ بالا کتب میں سے صرف پھلولوں کی ڈالی - گدڑی کا لال

اور ابراہام لنکن ہمارے پیش نظر ہیں ۔ مولانا کی دوسری کتب تلاش بسیار کے باوجود حاصل نہ ہوسکیں جس کا بڑا قلق ہے ۔

پھولوں کی ڈالی :

پھولوں کی ڈالی مولانا کی اخلاقی نظموں کا مجموعہ ہے ۔ اس کی ترتیب میں مولانا کے پیش نظر یہ بات بھی رہی ہے کہ زبان کی چاشنی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ بچے اخلاقی تربیت بھی حاصل کرسکیں ۔ اور یہی ایک معلم و استاد کا اولین فرض ہے ۔ اس کتاب کی پہلی نظم خدا کی تعریف ہے ۔ اس نظم کا عنوان بھی بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے ۔ وہ قدماء کی طرح صرف حمد پر ہی اکتفا کرتے۔ وہ بچوں کے ذہن پر ایک دم اصطلاحات مسلط کردینے کے قائل نہیں بلکہ وہ ایسا طریقہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں جس سے بچوں کی دل چسپی برقرار رہے ۔ پیش نظر نظم میں خدا کی تعریف بچوں کے مشاہدے کے عین مطابق ہے ۔ مخمس کی شکل میں ان کی یہ نظم ملاحظہ ہو :

خدا کا نام لو ہر آن بچو　　　اسی نے دی ہے تم کو جان بچو
بنایا ہے تمہیں انسان بچو　　　اسی کے ہیں یہ سب احسان بچو
خدا کا نام لو ہر آن بچو

اگر بیٹھے ہو کوئی کام لے کر　　　کرو پورا خدا کا نام لے کر
اسی کا نام صبح شام لے کر　　　کرو مشکل کو تم آسان بچو
خدا کا نام لو ہر آن بچو

وہی سب کی عبادت کے ہے لائق　　　وہی ہے سب کا مالک سب کا خالق
وہی ہے سب کا آقا سب کا رازق　　　بڑی ہے سب سے اس کی شان بچو
خدا کا نام لو ہر آن بچو

اسی کے سامنے سر کو جھکاؤ　　　اسی کے سامنے تم لو لگاؤ
اسی کو حال تم اپنا سناؤ　　　بر آئیں گے سبھی ارمان بچو
خدا کا نام لو ہر آن بچو

نظر تم پر خدا کی ہر گھڑی ہے　　　عنایت اس کی بندوں پر بڑی ہے
نہ گھبراؤ جو مشکل آ پڑی ہے　　　کہ سب ہوجائے گی آسان بچو
خدا کا نام لو ہر آن بچو

اسی مجموعے کی دوسری نظم " علم " ہے جس میں بچوں کو تحصیل علم کی رغبت اس طرح دلائی گئی ہے :

چھائی ہوئی جہان میں برکت ہے علم کی　　　سچ ہے کہ علم ہی کا زمانہ میں راج ہے
حاصل ہے آدمی کو شرف علم کے سبب　　　باقی جہان میں علم سے انسان کی لاج ہے
ہے مال دار علم کی دولت اگر ہے پاس　　　ہے بادشاہ علم کا گر سر پہ تاج ہے
ہے علم روح کے لیے ایک طرح کی غذا　　　جس طرح جسم کے لیے پھل اور اناج ہے
امراض جسم کی بھی دوائیں ہیں سینکڑوں　　　جو روح کے مرض ہیں یہ اُن کا علاج ہے
بچو ہمیشہ علم کی دھن میں لگے رہو
ہر کام میں اسی کی بڑی احتیاج ہے

اس نظم میں مولانا نے کس خوش اسلوبی سے علم کی خوبیاں و خصوصیات بیان کی ہیں۔ آدمی کو علم ہی کے سبب شرف و بزرگی ہے جس کے سر پر علم کا تاج ہو وہی بادشاہ ہے - یہ روح کی غذا بھی ہے اور امراض روح کا علاج بھی اور خلاصہ یہ کہ ہر کام میں علم کی ضرورت ہے -

ایک اور نظم " امتحان پاس کرو محنت سے " ہے - یہ بھی مخمس کی شکل میں ہے اس طرح انھوں نے بچوں کو مختلف امتحان سشن، اوزان اور اشکال سے بھی بچوں کو روشناس کرایا ہے - اس نظم میں ٹیپ کا مصرع ہے " امتحان پاس کرو محنت سے " اس پر چار چار

مصرعے اور لگائے ہیں جو اپنی سلاست و سادگی ، متانت و سنجیدگی اور حسن بیان کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس میں تحصیل علم کا شوق ، اخلاقی تربیت اور بچوں کے مشاہدے کا خیال مسلسل کارفرما ہے ۔ ملاحظہ ہو :

ہے یہ پڑھنے کا زمانہ بچو　　　نہ کرو حیلہ بہانہ بچو

جی نہ محنت سے چرانا بچو　　　علم کا لو تو خزانہ بچو

امتحاں پاس کرو محنت سے

علم سے بڑھ کے نہیں دولت بھی　　　اس سے عزت بھی ہے اور راحت بھی

اس قدر ٹھیک نہیں غفلت بھی　　　اٹھو کر ڈالو بس اب ہمت بھی

امتحاں پاس کرو محنت سے

عاقل انجام پہ رکھتا ہے نظر　　　دن یہ محنت کے بھی جائیں گے گذر

آج تکلیف اٹھاؤ گے اگر　　　عمر آرام سے بہتر ہوگی بسر

امتحاں پاس کرو محنت سے

" عاقل انجام پہ رکھتا ہے نظر" کے لیے مولانا نے کیسے کیسے خوب صورت مصرعے لگائے ہیں۔ اس قدر سادگی اور سلاست سے ایسی اہم بات کہنا مولانا ہی کا حق ہے ۔ اس سے ان کے گہرے مشاہدے اور وسیع تجربہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔

اس کے بعد " چھٹی کا دن " اور " علم کی دولت " وغیرہ نظمیں ہیں ۔

انسان کو اپنے ملک و وطن سے بے انتہا محبت ہوتی ہے ۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جہاں پیدا ہو ، پلے بڑھے اس سرزمین سے اس کو قلبی و روحانی تعلق ہونا لازمی ہے ۔ وہ اس کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کو بھی تیار ہوجاتا ہے ۔ مولانا بھی بچوں کو وطن کی محبت کا سبق دیتے ہوئے نظم " پیارا دیس " میں بتاتے ہیں :

دیس اپنا ہم کو پیارا کیوں نہ ہو　　دل فدا اس پر ہمارا کیوں نہ ہو

" پاک " سے بڑھ کر نہیں کوئی زمیں　　گو جہاں جنت ہی سارا کیوں نہ ہو

کہتے ہیں جس چیز کو آب حیات　　بحر وہ شے راوی کا دھارا کیوں نہ ہو

کب مٹا سکتا ہے ہم کو آسماں　　گو وہ دشمن ہی ہمارا کیوں نہ ہو

دیس والوں میں نہ ہو کیوں اتفاق　　ہر کہیں ہو، بھائی چارا کیوں نہ ہو

ہم ہیں پاکستان کے سچے سپوت　　دیس کی خدمت گوارا کیوں نہ ہو

اس نظم میں نفاق و دشمنی کی برائیوں اور اتفاق و اتحاد کی برکتوں کو بڑی خوب صورتی سے ذہن نشین کرایا ہے اور دلیری و بہادری کا سبق دیتے ہوئے وطن کی خدمت کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اس مجموعہ کی ایک اور نظم " وقت " ہے جس کی اہمیت کو انھوں نے بڑی خوبی سے تشبیہات و تمثیلات کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ وقت ایک ایسی دولت ہے کہ جو کوئی اس کو بے اندازہ و بے حساب خرچ کرتا ہے وہ دن بدن مفلس و بے نوا ہوتا جاتا ہے اور زندگی بھر رنجیدگی و پریشانی میں بسر کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

سمجھتے ہو تم وقت کیا شے ہے بچو　　یہ دولت سے بڑھ کر ہے پوچھو اگر حق

سفید اور سیہ داغ ہیں رات اور دن　　یہ سمجھو کہ وقت ایک گھوڑا ہے ابلق

ٹھہرتا نہیں تیز رو اس قدر ہے　　پہاڑ آگے آجائے اس کے کہ خندق

ہے دن آگ اور رات اس کا دھواں ہے　　یہ انجن ہے دنیا کا قل اس کی بھق بھق

یوں اس کو کہیے تو بالکل بجا ہے　　چمکتے ہوئے پر ہیں دنیا کی رونق

یہ چڑیا ہے اڑ جائے گی پھر سے دیکھو　　اگر اس کی پروا نہ کی تم نے مطلق

اسے پا لیا جس نے وہ سب سے دانا　　اسے جس نے کھویا وہ ہے سب سے احمق

اس نظم میں مولانا نے بڑی سادگی سے، وقت کے تیزی کے ساتھ گذرنے اور مسلسل رواں دواں رہنے کی خاصیت بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جس نے وقت سے فائدہ اٹھایا وہی دانا ہے اور جس نے وقت کو کھودیا وہ سب سے بڑا احمق ہے -

اسی مجموعہ کی ایک اور نظم کا عنوان" میٹھی باتیں" ہے - کسی نے سچ کہا ہے کہ " میٹھے بول میں جادو ہے " مولانا بھی بچوں کو بڑی محبت و شفقت سے یہ راز کی بات بتاتے ہیں اور کہتے ہیں :

کبھی کہنا نہ کڑوی اور کڑی بات	کہ ہے نرم اور میٹھی ہی بڑی بات
بڑائی اپنی اور اپنے ہی منہہ سے	اسے کہتے ہیں چھوٹا منہہ اور بڑی بات
نہ جانے گا کوئی پھر تم کو سچا	اگر دل سے کبھی تم نے گھڑی بات
اگر انسان اس کو دل پہ رکھ لے	تو سچ کہنا ہے ایسی کیا بڑی بات
اگر بولو تو پس اس طرح بولو	کہ ہو معلوم سب کو سلجھی بات
الگ ہوجاؤ تم اس وقت واں سے	کرے کوئی کسی سے جس گھڑی بات
چغل خوروں میں ہوتی ہے یہ عادت	کہ اس سے سن کے اس سے جاجڑی بات
جو کچھ تم جانتے ہو کہدو سچ سچ	اگر دیکھو کہ تم پر آ پڑی بات

یہ باتیں موتیوں سے بھی ہیں بڑھ کر
رہے یہ کان میں سب کے پڑی بات

مولانا کی یہ نظم زبان و بیان، روزمرہ اور محاورے کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے - سلاست و سادگی ، متانت و سنجیدگی اور حسن بیان کا ایک اعلا نمونہ ہے اور بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے بھی نہایت مناسب و موزوں ہے -

مشہور شاعر غلام ہمدانی مصحفی کا ایک مشہور شعر ہے :

کہنا وہ کسی سے اپنے جی کی

ہے بات یہ لاکھ اشرفی کی

مصحفی کے اسی شعر سے متاثر ہوکر مولانا نے بھی اسی زمین میں بچوں کے لیے چند نصیحت آمیز باتیں لکھی ہیں ۔ نظم کی ابتدا مولانا نے مصحفی کے اسی شعر سے اسی طرح کی ہے :

" کہنا وہ کسی سے اپنے جی کی ہے بات یہ لاکھ اشرفی کی "

جو بات کہو ، کہو سمجھ کر پہچان یہی ہے آدمی کی

سن لو جو کرے کوئی نصیحت کڑوی معلوم ہو کہ پھیکی

فوراً ہی مانگ لو معافی بھولے سے خطا اگر کبھی کی

کھاؤ ترس ان پہ جو ہیں بیکس تکلیف سے خوش نہ ہو کسی کی

آئینہ کو دل کے صاف رکھو جمنے نہ دو گرد دشمنی کی

مولانا نے اگرچہ اپنی نظموں کے ذریعہ بچوں کو درس اخلاق دیا ہے مگر ان کی یہ نظمیں بھی شاعرانہ تخیلات کی پختگی لیے ہوئے ہیں۔ مولانا چوں کہ خود ایک بلند اخلاق و بلند کردار انسان تھے لہذا اسی اخلاقی افہام و تفہیم کی غرض سے انھوں نے بچوں کی شاعری پر خصوصی توجہ دی اور ہر ہر موقع پر ان کی فطرت و جبلت کا خیال مد نظر رکھا۔ اردو میں بچوں کے شاعروں میں مولوی محمد اسمعیل میرٹھی کے بعد افسر میرٹھی اور مولانا قادری ہی دو ایسے شاعر ہیں جن کی نظمیں پڑھ کر بچے اپنے دل کی بھولی بھالی باتیں ان میں پاتے اور ان سے دل بہلاتے ہیں۔ بچوں کو پھولوں کو ڈالی کے ذریعہ مولانا پیاری پیاری باتیں یوں بتاتے ہیں :

تمہاری عمر یہ بچو بڑی بہار آئے خدا کرے کہ ہزا سال لاکھ بار آئے

تمہیں وہ علم و ہنر میں کمال حاصل ہو کہ یہ زمانہ کہ یکتائے روزگار آئے

تمہاری ہمت و محنت سے پھول بن جائے تمہاری راہ عمل میں جو کوئی خار آئے

تمہاری عادتیں کچھ ایسی پیاری ہیں کہ تم پہ اپنے پرائے سبھی کو پیار آئے

بھلائیوں کا ہمیشہ رہے خیال تمہیں برائیوں کے تصور سے تم کو عار آئے

نہ بل پڑے کبھی بچو تمہاری ابرو پر تمہارے دل میں نہ بچو کبھی غبار آئے

نہ ڈگمگائیں قدم راستی کے رستے سے دروغ گوئی کا لالچ تمہیں ہزار آئے

کرو وہ کام کہ سب واہ واہ کہہ اٹھیں کرو وہ بات کہ سنتے ہی اعتبار آئے

کرو کسی پہ جو احسان تو صدق دل سے کرو نہ اس طرح کوئی جیسے بوجھ اتار آئے

ادب تمیز، ہنر آدمی کے زیور ہیں کچھ ان کی قدر نہیں جو انہیں اتار آئے

یہ نظم پھولوں کی ڈالی سے کم نہیں بچو

ہے کوئی ایسا بھی؟ جھکنے تو بے شمار آئے

مندرجہ بالا نظم میں بچوں کو کیسی سیدھی سادی اور آسان زبان میں کیسے عمدہ اخلاقی اصول ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے - وہ معصوم بچوں کی معصومیت کو سمجھتے تھے لہذا شروع سے ہی ان کو ہمت و حوصلے ، محنت و مشقت اور سچائی کے راستے کی طرف گامزن کرنا چاہتے تھے۔

مولانا قادری کی ایک اور نظم " چند مفید قاعدے" ملاحظہ ہو اس میں بچوں کو بری عادتوں اور بد اخلاقی سے بچنے کی کیسے دل نشین انداز میں تلقین کی ہے :

(۱)

پیارے بچو ہمیشہ سچ بولو سچ شجاعت ہے جھوٹ نامردی

اپنی باتوں میں شک نہ آنے دو بات شک کی کبھی نہیں اچھی

جھوٹ اک مرتبہ جو بولا پھر کون سمجھا ہے سچی بات اس کی

(۲)

تم نہ جھوٹے سے بھی قسم کھاؤ — اور نہ بیٹھو خراب صحبت میں

بری الفاظ گھر سے باہر سے — دور کر دو اگر ہو طاقت میں

نہ کرو کام تم کبھی ایسا — فرق آتا ہو جس سے عزت میں

(۳)

نہ کرو بات بد تمیزی سے — نہ کرو تم کلام چلّا کر

بد مزاجی ، غرور، خوب نہیں — نہ چلو راستے میں بل کھاکر

نیک برتاؤ نیک ہے سب میں — جس جگہ چاہو دیکھ لو جاکر

(۴)

ہو ملاقات اجنبی سے اگر — اس سے باصد ادب کلام کرو

اپنے استاد اور بزرگوں کو — جھک کے تعظیم سے سلام کرو

رہو سنجیدہ اور شائستہ — اپنے اسلاف کے سے کام کرو

(۵)

چھوٹے بچوں سے اور ضعیفوں سے — گفتگو تم کرو عنایت کی

راستہ چھوڑ دو بڑوں کے لیے — یہی پہچان ہے شرافت کی

گو بڑے کام کر نہیں سکتے — ڈالو عادت مگر سخاوت کی

(٦)

گر کسی کام کو کہے کوئی — کرو تم جلد حکم کی تعمیل

دو نہ تکلیف اسے تقاضے کی — کرو تعمیل حکم میں تعجیل

جو نہیں مانتا بڑوں کا کہا — ہے وہ ہر شخص کی نظر میں ذلیل

(۷)

نہ دکھاؤ کسی کا ہرگز دل   تم سے رنجیدہ ہو کبھی (کوئی) نہ ضعیف

دوسروں کی خوشی کے کام کرو   خواہ ہو تم کو اس میں کچھ تکلیف

نہ کرو تم کسی سے خود غرضی   نہیں انسان اس طرح کا شریف

(۸)

کرو سب سے سلوک ویسا ہی   چاہو تم اپنے واسطے جیسا

تم کو برتاؤ جو پسند نہ ہو   نہ کرو دوسروں سے بھی ویسا

یہ طریقہ ہے زندگی کا خوب   کام بے اس کے چل نہیں سکتا

(۹)

نرم الفاظ میں کرو انکار   گر سکو کر نہ کوئی کار ثواب

نہیں کوئی مزاج ایسا سخت   نرم کر دے نہ جس کو نرم جواب

غصہ کتنا ہی سخت ہو اس کو   نرم الفاظ روک دیں گے شتاب

(۱۰)

گفتگو میں کسی کی دخل نہ دو   یہ بہت ہی خراب عادت ہے

بات تہذیب کے خلاف ہے یہ   اور انجام کار خفت ہے

تم کو کچھ فائدہ نہیں اس سے   غیر کو باعث حقارت ہے

(۱۱)

جب کوئی شخص لکھ رہا ہو کچھ   یا ہو پڑھنے میں آدمی مشغول

آگے پیچھے سے تم نہ دیکھو اسے   کہ تمہارا یہ دیکھنا ہے فضول

بے خیالی میں بھی اگر ہو بات   لوگ تم کو کہیں گے نامعقول

(۱۲)

کرو ہر کام کو سلیقے سے — جس سے ہر شخص کا ہو دل خورسند

رہو پا بند وقت اے بچو — تم کو دنیا کہے گی دانش مند

ضائع کرتا ہے اپنا وقت عزیز — نہیں جو شخص وقت کا پابند

مولانا قادری کی سب سے بڑی شاعرانہ خصوصیت یہی ہے کہ وہ روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور روزانہ پیش آنے والے معمولی معمولی واقعات کو بھی سبق آموز نظم کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی بچوں کی زندگی میں روزانہ پیش آنے والے واقعات کی طرف اشارے ہیں مگر کہیں کہیں ڈپٹی نذیر احمد کی طرح الفاظ ثقیل آگئے ہیں جس سے نظم کی روانی و موسیقی میں کچھ فرق واقع ہوا ہے مگر ہمارے پیش نظر مولانا کا جذبۂ خلوص اور بچوں کے لیے ان کی شفقت و محبت ہے -

رفیق تنہائی :

یہ کتاب بھی پھولوں کی ڈالی کی طرح اخلاقی نظموں کا مجموعہ ہے مگر اب نایاب ہے -

گل دستۂ اخلاق :

اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے اخلاقی قصے درج ہیں جن سے بچوں کے کردار کو سنوار نے و اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

حسنین رضی اللہ عنہم :

اس میں بچوں کے لیے آسان اور سادہ زبان میں جگر گوشۂ بتول حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم کی سوانح عمریاں ہیں۔

سونے کا ڈھیلا :

اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ سونے کے بڑے ڈھیر سے روٹی کا ایک چھوٹا سا لقمہ

کہیں بہتر ہے -

گدڑی کا لال :

یہ کتاب بھی مولانا نے بچوں کے کردار کی تعمیر کے لیے لکھی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ شرافت رنگ و نسل اور نام و نسب میں نہیں بلکہ انسان کے اعمال و کردار اور عمدہ اخلاق و ذاتی اوصاف میں ہوا کرتی ہے -

جادو گردنی :

یہ انگریزی افسانوں کا آسان و سہل ترجمہ ہے - اس میں بھی بچوں کی دل چسپی اور ان کے کردار کی تشکیل کو خصوصیت سے مد نظر رکھا ہے -

ابراھام لنکن :

یہ امریکہ کے سولھویں صدر ابراھام لنکن کی سوانح حیات ہے - جس کو مولانا نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تاکہ بچے اس کی زندگی کے حالات کو پڑھ کر درس عزم و عمل حاصل کریں -

اسی طرح " ستارۂ ھند" ، " حسن پرچھائی" اور " کاغذ کے کھلونے" وغیرہ ان کی وہ کتب ہیں جو بچوں کے لیے بہت مفید ہیں بعض قدیم کتب فروشوں اور کتب خانوں کی فہرستوں میں ان کتب کا نام تو ملتا ہے لیکن کتابیں نایاب ہیں-

مولانا قادری نہ صرف یہ کہ خود لکھنے لکھانے اور پڑھنے پڑھانے کے آدمی تھے بلکہ وہ شاعر گر و ادیب گر قسم کے انسان بھی تھے- انھوں نے اپنے بیشتر تلامذہ میں شعر و سخن اور علم و ادب کا ایسا اعلا ذوق پیدا کردیا کہ وہ آج ملک کے نامور شعراء و مصنفین میں شمار کیے جاتے ہیں - مولانا نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے خواتین کی توجہ بھی اس طرف دلائی کہ وہ بچوں کے لیے اخلاقی و اصلاحی کہانیاں لکھیں - انھوں نے اپنی چار

بچوں سے " سچی کہانیاں" نام کی ایک کتاب مرتب کرائی جو پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء کو آگرہ اخبار پریس آگرہ سے شائع ہوئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ فوراً ہی اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں یہ کتاب قادری اکادمی کے زیر اہتمام کراچی میں شائع ہوئی - یہ چاروں بہنیں ہند و پاک کی بزرگ و نامور ہستیوں کی بیویاں اور مائیں ہیں۔

۱- ط - خاتون :- مولانا محمد محسن فاروقی پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور کی زوجہ محترمہ اور ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی کی والدۂ معظمہ ہیں۔

۲- خاتون : اور ۳- ک - خاتون :- پروفیسر عابد حسن صاحب فریدی کی ازواج ہیں جن میں سے " خاتون " صاحبہ جنت مکانی ہوگئیں۔ وہ پروفیسر زاہد حسن فریدی پرنسپل گورنمنٹ کالج چکوال کی والدۂ محترمہ ہیں۔

۴- صاحبہ :- مولانا حامد حسن صاحب قادری کی اہلیہ محترمہ اور جناب ساجد حسن صاحب قادری ، ڈپٹی ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کوئٹہ ، جناب ڈاکٹر خالد حسن قادری ، پروفیسر علوم شرقیہ لندن یونی ورسٹی لندن ، جناب ماجد حسن فریدی بانی و پرنسپل نیو ماڈل اسکول ناظم آباد اور جناب راشد حسن قادری کنٹرولر آف پراجیکٹ ، انچارج ٹریننگ سینٹر حبیب بینک ، کراچی کی والدہ محترمہ ہیں۔

اس کتاب میں چھوٹے بچوں ، لڑکوں ، لڑکیوں اور عورتوں کے وہ قصے جمع کیے گیے ہیں جن سے ان کی ہمت و بہادری اور ہمدردی و جاں نثاری ظاہر ہوتی ہے -

بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں بچوں کے اخبارات و رسائل کا کردار بھی نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں پھول کا نام سر فہرست ہے - مولانا کی بھی اکثر نظمیں اور کہانیاں " پھول" " گل دستہ "، " پیام تعلیم"، " غنچہ " اور " سعید" وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ ان سب

کا مقصد بچوں کے دلوں میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرکے اخلاقی اقدار کو فروغ دینا تھا۔

" پھول" ۱۳ اکتوبر، ۱۹۰۹ء کو لاہور سے نذر الباقر کی ادارت میں جاری ہوا اور ۱۹۵۷ء تک باقاعدگی سے ہر ہفتے شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد بچوں کے کئی اور اخبار و رسائل مثلاً اخبار سعید، غنچہ اور پیام تعلیم وغیرہ شایع ہونا شروع ہوئے - لیکن زبان و بیان اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے جو معیار" پھول" نے قائم کرلیا تھا دوسرے رسائل اس تک نہ پہنچ سکے اس سلسلے میں خواجہ غلام عباس لکھتے ہیں :

" پھول ایک اخبار یا رسالہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسا ادارہ تھا جو نونہالوں کے دلوں میں علمی لگن لگاتا، اخلاق کو سنوار تا، اور ان میں ادب کا ذوق پیدا کرتا تھا۔ ان کے ذہنوں کی تربیت کرتا اور انھیں آسان و سلیس زبان میں لکھنا سکھاتا - اس رسالے سے ایڈیٹروں کو بھی تربیت ملتی تھی۔" (۱)

نذرالباقر کے بعد مولوی سید ممتاز علی اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور اپنی کوشش و کاوش سے اس کو خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو میں رہے۔ ان کے اس مضمون سے جو انھوں نے پھول کے مضمون نگار حضرات کی توجہ کے لیے لکھا تھا اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بچوں کے لیے کس قسم کا ادب چاہتے تھے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں :

" پھول میں وہ مضمون نہیں چھاپے جاتے جن میں مشکل الفاظ یا مشکل خیالات ہوں یا بے جا مبالغہ ہو - بہت سے مضمون نویس آسان لفظ تو لکھ دیتے ہیں مگر یہ خیال ذرا نہیں کرتے کہ جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں یا جو خیالات انھوں نے ظاہر کیے ہیں ویسے خیالات بچوں کے دماغ میں بھی کبھی آتے اور ویسے لفظ ان کی زبان سے کبھی بولے بھی جاتے ہیں، یا کوئی

---

(۱) غلام عباس، خواجہ ، " انتخاب پھول"، (دیباچہ) ، ص ۱۱

بچہ اپنی بول چال میں اتنا مبالغہ کبھی کرتا ہے!

آج کل بہت سے لوگ لکھے پڑھے عالم فاضل ہوکر جاہل بن جاتے ہیں - کسی کو اپنی زبان میں بے ضرورت عربی فارسی کے مشکل لفظ بولنے کا شوق ہے- کسی کو اس میں خواہ مخواہ ہندی اور سنسکرت گھسانے کی دھت ہے- دونوں فریق غلطی پر ہیں اور ملک کو گمراہ کرتے ہیں- زبان دریا کے بہاؤ کی طرح ہے - یہ کسی کے قابو کا نہ وہ کسی کے بس کی - دریا بھی اپنا راستہ آپ نکال لیتا ہے - زبان بھی اپنے قاعدے آپ بنالیتی ہے - ہم خود ان قاعدوں کو نہیں گھڑ سکتے بلکہ ہمیں وہ قاعدے جو زبان نے خود بنالیے ہیں زبردستی ماننے پڑتے ہیں-

بس اے مصنفو! اور زبان کی درستی چاہنے والو! نہ فارسی عربی بولنے کا شوق کرو- نہ ہندی کی چندی نکالنے کی عادت ڈالو- تم ہمیشہ وہ زبان بولو اور لکھو جو سب سے آسان ہو جسے بچہ بچہ سیکھ سکتا ہے-" (۱)

مولوی ممتاز علی نے نصف صدی تک " پھول " کو ترو تازہ رکھا اور اس کو ملک کے مشہور و معروف اہل قلم حضرات کے مضامین و منظومات سے نکھار بخشتے رہے - ۱۹۳۵ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے اور اردو کے مشہور ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج نے بھی اس کو جاری رکھا اور نہ صرف یہ بلکہ " بہنسہ لائبریری" کے نام سے بچوں کے لیے معیاری کتابیں شائع کرنے کا بھی سلسلہ شروع کیا- یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں کی مطبوعہ بیشتر کتب طبع زاد ہونے کی بجائے دوسری زبانوں کے تراجم پر مشتمل ہوتی تھیں مگر وہ بڑی معیاری ہوتی تھیں ، کیوں کہ دوسری قوموں کے ادیب دیگر باتوں میں تجارتی ہوں تو وہ الگ بات ہے مگر بچوں کے ادب کی تخلیق کے سلسلہ میں وہ تجارتی اغراض کو مد نظر نہیں رکھتے- اور نہ ہی اس کی تخلیق میں روا روی و سہل انگاری سے کام لیتے ہیں - بچوں کا ادب کیوں کہ کوئی منفعت بخش کام نہیں ہے اس لیے ہمارے ناشرین و مصنفین اس

---

(۱) احمد عباس، خواجہ ، " انتخاب پھول"، (دیباچہ) ، ص ۱۳

طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں -

بچوں کے ادب کی تخلیق کے سلسلے میں مولانا کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ " اخبار سعید" ہے اس پرچے سے متاثر ہوکر دوسرے اہل علم و اہل قلم حضرات نے بھی اس طرف توجہ دی اس سلسلے میں مولانا رقم طراز ہیں :

" ۲۸ برس سے زیادہ ہوئے میں نے کان پور سے بچوں کا ایک پندرہ روزہ پرچہ " اخبار سعید" کے نام سے جاری کیا تھا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۱۸ء کو پہلا پرچہ نکلا اور تقریباً سات برس جاری رہ کر ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کے پرچے کے بعد بند ہوگیا۔" (۱)

<u>مولانا کا پیغام اور بچوں پر اس کے اثرات :</u>

مولانا نے جس زمانے میں سعید جاری کیا اس وقت تمام ہندوستان میں بچوں کے لیے صرف ایک رسالہ " پھول" لاہور سے نکلتا تھا۔ اگرچہ پھول سے قبل بھی کئی اور پرچے نکلے تھے مگر وہ جاری نہ رہ سکے اور جلد ہی بند ہوگئے - ان میں" بچوں کا اخبار" لاہور اور عزیزی پریس آگرہ سے شائع ہونے والے بچوں کے ایک ماہنامہ " عزیز" کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ رسائل بھی تھوڑے عرصے زندہ رہنے کے بعد دم توڑ گئے - لیکن یہ مولانا کے " سعید" کی برکت تھی کہ " سعید" کا اجرا ہوتے ہی دو تین سال کے اندر کئی پرچے شائع ہونا شروع ہوگئے -

اخبار" سعید" میں مولانا نے رسائل کی عام ڈگر سے ہٹ کر پہلے اداریہ لکھنے کے بجائے حمد باری تعالیٰ سے رسالہ کا آغاز کیا ہے - حمد کے فوراً ہی بعد اسی نظم کے آخر میں اخبار " سعید" کے اجراء کا مقصد بیان کیا ہے اور بعد میں اداریہ لکھا

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ، " بچوں کی ڈالی"، کراچی: سپر آرٹ پریس، ۱۹۴۸ء، (دیباچہ) ، ص ۱

ہے - ملاحظہ ہو :

خدا کی تعریف اور ہماری دعا

خدا سب کا خالق ہے اور ایک ہے — اسی کا ہے جو بد ہے یا نیک ہے

یہ دنیا اسی کی بنائی ہوئی — یہ بستی اسی کی بسائی ہوئی

اسی نے بنایا ہے یہ آسماں — اسی نے لگایا ہے یہ سائباں

یہ جنگل اسی کے لگائے ہوئے — سمندر اسی کے بہائے ہوئے

یہ کھیتی اسی کی اگائی ہوئی — ہوائیں اسی کی چلائی ہوئی

یہ سب پھول اسی کے کھلائے ہوئے — یہ میوے اسی کے لگائے ہوئے

یہ انساں اس کے بنائے ہوئے — یہ حیواں اسی کے بنائے ہوئے

چرندے پرندے اسی کے ہیں سب — وہ مالک ہے بندے اسی کے ہیں سب

اسی نے ہمیں اور تمہیں جاں دی — بری اور اچھے کی پہچان دی

اسی نے زباں ایک دی کان دو — کہے ایک جب سن لے انسان دو

اس نے دیے پاؤں دو ہاتھ دو — کہ ان سے ضعیفوں کا تم ساتھ دو

=====XXXX=====

کرو یاد وہ وقت ہر آن تم — کہ چھوٹے سے تھے اور ناداں تم

بڑے پیار سے ماں نے پالا تمہیں — سمجھتی تھی گھر کا اجالا تمہیں

وہ کہتی تھی آنکھوں کا تارا تمہیں — سمجھتی تھی دنیا سے پیارا تمہیں

ہو گرمی کہ سردی کہ برسات ہو — کوئی وقت ہو دن ہو یا رات ہو

وہ رکھتی تھی ہر دم اسی کا خیال — کہ آئے نہ دل میں تمہارے ملال

یہ احساس ہے اس کا کتنا بڑا — کیا پال کر تم کو اتنا بڑا

مگر دل میں اپنے کرو غور اب — کہ ماں کی محبت کا ادا کیا سبب

سبب یہ کہ خدا تم پہ رب مہربان | جو وہ مہربان ہو تو سب مہربان
اسی نے عطا کی یہ طاقت تمہیں | کہ مصروف ہو کھیل اور کود میں
اسی کی عنایت سے بڑھنے لگے | ترقی کے زینوں پہ چڑھنے لگے

=====XXX=====

اسی کا کرم ہے اسی کا کرم | کہ جاری یہ اخبار کرتے ہیں ہم
اسی کا کرم ہے یہ پیارا "سعید" | ہمارا "سعید" اور تمہارا "سعید"
دعا ہے مدد وہ ہماری کرے | کہ یہ بوجھ خدمت تمہاری کرے
اسی کے کرم سے ہمیں ہے امید | کہ تم میں سے ہر ایک ہوگا سعید
کوئی تم میں مشہور تاجر بنے | کوئی سارے علموں کا ماہر بنے
بنے تم میں ہر ایک ایسا دلیر | برابر نہ ہو جس کے طاقت میں شیر
چلن تم سے بہتر کسی کا نہ ہو | خدا کے سوا ڈر کسی کا نہ ہو
جو کچھ دل میں ہو وہ زباں سے کہو | مگر جو کہو اس پہ قائم رہو
خدا کی ہمیشہ عبادت کرو | بڑوں کی ہمیشہ اطاعت کرو

غرض ہر طرح سے بنو نیک تم
ہزاروں میں لاکھوں میں ہو ایک تم" (۱)

نظم میں رسالہ کے اجرا کا مقصد بیان کرنے اور پند نصائح کے بعد بچوں سے انہیں کی زبان میں ان کی جھجک و فطرت اور نفسیات کے عین مطابق یوں آغاز گفتگو کرتے ہیں :

" بھائی بچو! یہ اخبار سعید جس کا پہلا پرچہ آج تمہارے ہاتھ میں ہے صرف تمہاری تفریح اور دل بہلانے کے لیے نکالا گیا ہے ۔ تم اسکولوں اور مدرسوں

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا؛ خدا کی تعریف اور ہماری دعا"، " اخبار سعید"، کان پور : ۱۵ مارچ، ۱۹۱۸ع ، ص ۲-۳

میں پڑھتے ہو ۔ جب مدرسے سے آتے ہو تو کچھ کھا پی کر کھیل کود میں مصروف
ہوجاتے ہو ۔ کھیلنے کے بعد مدرسے کا سبق یاد کرتے ہو ۔ اس کے بعد جو وقت
بچتا ہے اس میں تم چاہتے ہو کہ ایسا کام کرو کہ جس میں دل لگے اور تفریح
ہو ۔ اس وقت تم ڈھونڈتے ہو کہ کوئی قصہ کہانی کی کتاب یا دل چسپ اخبار
ملے تو اسے پڑھو ...... ہم نے یہی دیکھ کر کہ بچوں کو دل چسپ اخبار اور
اچھی کتابوں کی بڑی ضرورت ہے ۔ یہ اخبار جاری کیا ہے جو مہینے میں دوبار
پہلی اور پندرھویں تاریخ کو چھپا کرے گا۔ اس میں مزے دار کہانیاں ، عمدہ
لطیفے ، دل چسپ باتیں، اچھی نظمیں اور نئی نئی خبریں چھپیں گی ۔" (۱)

سعید کے اجرا سے مولانا کا اصل مقصد یہی تھا کہ بچوں کی علمی و ادبی
اور ذہنی و فکری اصلاح ہو ۔ وہ اس کے مضامین و منظومات سے اخلاقی سبق حاصل کریں۔
لہذا اس میں اسی قسم کی کہانیاں اور نظمیں شامل کی جاتی تھیں۔ اس کے لیے مولانا
نے بڑے بڑے مشہور ادیبوں اور شاعروں سے بھی مضامین و نظمیں لکھوائیں اس کا اندازہ
ذیل میں دی ہوئی کہانی سے ہوسکتا ہے جو پروفیسر مولانا حامد حسن قادری کی تحریر
کردہ ہے ۔ عنوان ہے " غرور کا سر نیچا" :

" جنوبی سمندر میں بہت سے جزیرے ہیں جو سلیمانی جزیروں کے نام
سے مشہور ہیں۔ ان جزیروں کے بیچ میں لیکن سب سے علاحدہ اور دور ایک
بڑا جزیرہ ہے ۔ اس جزیرے میں ایک امیر رہتا تھا جو اپنی دولت اور طاقت
کی وجہ سے اتنا مغرور ہوگیا تھا کہ غریب آدمیوں کو ذلیل سمجھتا اور
ان سے نفرت کرتا تھا۔

اس کو شکار کا بہت شوق تھا اس کے مکان سے تھوڑے فاصلے پر سمندر تھا۔
جہاں وہ مچھلیوں اور جانوروں کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ لیکن مکان سے سمندر
کو جاتے ہوئے اس کے راستے میں ایک کھیت پڑتا تھا۔ جس میں بہت اونچے
اونچے جھاڑیوں مرکل اگے ہوئے تھے۔ اس لیے شکار کے پیچھے دوڑنے میں بہت تکلیف

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "اخبار سعید"، کان پور: ۱۵ مارچ ۱۹۱۸ء،
اداریہ ، ص

ہوتی تھی۔ وہ کھیت ایک غریب آدمی کا تھا۔ جو ان درختوں سے لکڑیاں
بیچ کر پیٹ پالتا تھا ۔ وہ نہایت نیک مزاج اور ایمان دار تھا۔

امیر نے کئی مرتبہ اس سے کہا کہ اس زمین کو اسے دے دے چونکہ
پیٹ پالنے کا اس کے پاس وہی ذریعہ تھا اس نے انکار کیا ۔ اب اس مغرور
آدمی کو بہت غصہ آیا کہ ایک ذلیل اور غریب آدمی نے اس کا کہنا نہیں
مانا اس لیے اس نے ایک دن جب ہوا بہت تیز چل رہی تھی ان درختوں میں
آگ لگوادی جس سے تمام درخت جل گئے ۔ اس غریب کو نہایت صدمہ ہوا۔
اور اس نے بہت کچھ برا بھلا کہا ۔ اس سے اس امیر کو اور بھی طیش
آیا کہ اتنا غریب اور ذلیل ہوکر زبان درازی کرتا ہے ۔ اور اس بے چارے
کو اتنا پٹوایا کہ آدھ مرا ہوگیا۔ جگہ جگہ سے خون نکلنے لگا۔

آخر مجبور ہوکر وہ اسی حالت میں اس جزیرے کے بادشاہ کے دربار
میں پہنچا ۔ اور قدموں پر گر کر اول سے آخر تک سارا دکھڑا سنایا
اور انصاف چاہا۔

بادشاہ نے فوراً اس مغرور امیر کو دربار میں طلب کیا۔ وہ آیا اور
اس نے اقرار کیا کہ "حضور بے شک میں نے ایسا کیا ہے ۔ لیکن بات یہ ہے
کہ کمینے اور ذلیل لوگوں کو جو عزت اور فرماں برداری ہم امیروں کی کرنی
چاہیے وہ اس نے نہیں کی یہی اس کا قصور ہے ۔"

بادشاہ نے کہا "تمہارے پر دادا کی جو میرے پر دادا کے یہاں
جنگل صاف کرنے پر نوکر تھا کیا عزت تھی؟ وہ ایسے ہی کمینے اور ذلیل لوگوں
میں سے تھا ایک موقع پر اپنے آقا کی جان بچانے میں بہادری اور وفاداری
دکھانے کی وجہ سے اس کو عزت اور ترقی دی گئی ۔ اس پر بھی اس کی
عزت تمہاری عزت سے بہت بہتر تھی۔ اس نے جو عزت پائی وہ اپنی لیاقت کے
سبب پائی اور تمہاری عزت دولت سے ہے ۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میری سلطنت
میں ایک ایسا شخص رہتا ہے جو اپنے آپ کو شریف بتاتا اور سمجھتا ہے
لیکن ایسا کمینہ اور ذلیل ہے کہ اس نے یہ بات بھلا دی ہے کہ جو آرام اور
اطمینان اور دولت اس کو دی گئی وہ اس غرض سے کہ اپنی ضرورتوں کی طرف
سے بے فکر ہوکر اپنے دل و دماغ اور ہاتھوں سے خدا کی مخلوق کو فائدہ
پہنچائے ۔"

ان امیر صاحب کو بادشاہ کا اس طرح بھری دربار میں ڈانٹنا بہت

ناگوار ہوا۔ ان کو تو یہ گمان تھا کہ میرے مقابلے میں اس غریب اور ذلیل آدمی
کی کچھ نہ سنی جائے گی ۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہ امیر کو اس کی گفتگو
بری معلوم ہوئی حکم دیا کہ ان دونوں یعنی امیر اور ٹوکریاں بننے والے کو
ننگا کرکے ایک جزیرے میں رات کے وقت چھوڑ آؤ۔ چنانچہ فوراً ایک افسر ان
دونوں کو کشتی میں بٹھا کر لے گیا اور ننگا کرکے ایک سنسان اور جنگلی آدمیوں
کے جزیرے میں چھوڑ آیا۔ اس غریب آدمی کو تو کوئی پروا نہ تھی لیکن ان
امیر صاحب کو اس سے اور بھی نفرت بڑھ گئی اور ایسی تنہائی میں بھی اپنے
پاس تک نہ آنے دیا۔

صبح ہوتے ہی وہاں کے جنگلی باشندے لاٹھیاں لے کر آ پہنچے اور
مارنا چاہتے تھے کہ اس غریب نے اشاروں سے انہیں سمجھایا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔
میں تمہیں ایک عجیب چیز دکھاتا ہوں ۔ جب ان سب نے اپنے ہاتھ روک لیے تو
کاغ وہ غریب اٹھا اور نرکل لاکر جلدی جلدی کچھ بننا شروع کیا سب جنگلی یہ
تماشا دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں اس نے ایک نہایت خوب صورت تاج تیار کیا
اور ان میں سے جو سب کا سردار معلوم ہوتا تھا اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس
سے وہ سردار بہت بھلا اور شان دار معلوم ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر سب بہت
خوش ہوئے اور اس غریب کے چاروں طرف پھر پھر کر ناچنے لگے ۔ اب تو ہر ایک
یہی چاہتا تھا کہ اس کے سر پر بھی ایک تاج ہو ۔ چنانچہ اس نے نرکل
منگوائے اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ بناتا جاتا تھا اور ان لوگوں کو دیتا
جاتا تھے ، جو پہن کر خوب ناچتے اور تالیاں بجاتے۔

اس کے بعد وہ لوگ اس کے واسطے جو کھانا وہ کھایا کرتے تھے لائے اب
کے ان کی نظر اس امیر پر پڑی جو ڈر کے مارے درخت کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔
اس کو دیکھنا تھا کہ سب کے سب ڈنڈے لے کر اس کی طرف دوڑے اور خوب
مارا۔ جب اس کو مار چکے تو پھر اس غریب کے پاس آئے اور ٹوکریاں بنانے کا
تماشا دیکھنے لگے۔ جو کھانا لائے تھے اپنے سامنے اس کو کھلایا اور جو بچ رہا
اس کو خود کھایا۔ اور امیر کو کھانا دینے کی جگہ پھر ڈنڈوں سے اس کی
خاطر کی ۔ آخر اس غریب سے نہ رہا گیا اور اگرچہ اس امیر نے اس کو بہت
بڑا نقصان پہنچایا تھا اور اس سے نفرت کرتا تھا پھر بھی اس کو ترس آیا اور

ان لوگوں سے کہا کہ اس کو نہ مارو یہ مشکل توڑ کر لایا کرے گا - یہ کام ان لوگوں کو خود کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ راضی ہوگئے اسے مارنا چھوڑ دیا اور اسے بھی بچا ہوا کھانا دینے لگے - پھر سب نے مل کر ان دونوں کے لیے ایک جھونپڑی بنادی -

اس طرح بہت دن گزر گئے اور اس امیر کو عقل آگئی کہ جس دولت اور طاقت پر اس کو اتنا غرور تھا وہ سب بے کار ثابت ہوئی اور جس چیز سے اس کو نفرت تھی یعنی ہنر وہ کتنا مفید ثابت ہوا۔ اگر وہ غریب وہاں نہ ہوتا یا اس کو بھی کوئی ہنر نہ آتا ہوتا تو ان لوگوں کے ہاتھوں ان کو کبھی کا خاتمہ ہوگیا ہوتا۔

امیر اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوا اور اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا اورایک رات اس نے اس غریب سے کہا کہ بھائی مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اتنا ستایا اور تکلیف پہنچائی میری دولت اور امیری ہنر کے سامنے سب بے کار ہیں میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں اور تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب میں یہاں سے واپس جاؤں گا تو اپنی دولت میں سے آدھی تم کو دے دوں گا۔

چنانچہ جب بادشاہ نے پھر افسر کو بھیجکر ان دونوں کو بلا بھیجا تو امیر نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس کو اپنی آدھی دولت دے دی۔ اس واقعہ کے بعد سے اب تک وہاں یہ دستور ہے کہ جب کوئی امیر آدمی غریبوں پر ظلم کرتا ہے تو اس کا مرتبہ گھٹا دیا جاتا ہے اور اسے ذلیل کیا جاتا ہے -

پیارے سعید بچو! تم نے دیکھا کہ جو غریبوں کو برا سمجھتا ہے ان سے نفرت کرتا ہے ان پر سختی کرتا ہے اور خدا کی دی ہوئی دولت و نعمت پر شکر نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے اس کا کیا انجام ہوتا ہے - " یعنی جو غرور کرے گا وہ ہمیشہ ذلیل ہوگا۔"

" سعید " میں مولانا نے اسی قسم کی بہت سی سبق آموز اور اصلاحی کہانیاں شائع کیں۔ مزیدار اور شائستہ لطیفے لکھے - اصلاحی مضمون لکھیں - انھوں نے " بچوں کا کتب خانہ" نامی ایک ادبی حلقہ بھی قائم کیا اس کے ذریعہ سے انھوں نے نوجوانوں سے بھی کتابیں لکھوائیں - یہاں تک کہ انھوں نے اپنے آٹھ سالہ بھانجے شاہد علی سے

مزے دار لطیفوں کی ایک کتاب مرتب کروائی - اپنے صاحب زادے ڈاکٹر خالد حسن قادری سے کم سنی میں ہی کہانیوں کی ایک کتاب " طلسمی برج " کے نام سے لکھوائی - ڈاکٹر مولوی محمد طاہر فاروقی سے جب وہ ابتدائی جماعتوں کے طالب علم تھے نہایت دل چسپ کہانیاں اور مزے دار لطیفے لکھوائے - اسی طرح چار بہنوں سے کہہ کر ایک کتاب " سچی کہانیاں" مرتب کرائی جس میں لڑکیوں، لڑکوں اور عورتوں کی بہادری کے قصے جمع کیے گئے تھے۔ اپنے ایک اور عزیز و شاگرد مولانا شمس الحق نظامی سے بھی ہائی اسکول ہی کے زمانے میں ایک کتاب " سفید کبوتر" کے نام سے لکھوائی - سچ تو یہ ہے کہ وہ خود ہی ادیب و شاعر نہ تھے بلکہ جو بھی ان کے قریب رہا اس میں انھوں نے علم و ادب، تحقیق و تجسس اور شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق پیدا کر دیا۔

ایک اور نظم کا عنوان " کام کی باتیں " ہے اس نظم میں بچوں کو نہایت آسان و سیدھی سادی زبان میں اچھے اخلاق اور اعلا کردار پیدا کرنے کی طرف اس طرح توجہ دلائی ہے :

کرو تم بزرگوں کی خدمت زیادہ — کرے گا خدا تم پہ رحمت زیادہ

ادب تم کرو خوب اپنے بڑوں کا — کرو اپنے چھوٹوں پہ شفقت زیادہ

جو تم ان کو چاہو وہ چاہیں گے تم کو — محبت سے ہوگی محبت زیادہ

جو بوجھ اٹھ سکے شوق سے تم اٹھاؤ — کرو پر نہ طاقت سے محنت زیادہ

جو پڑھنے کا ہو وقت اس میں پڑھو تم — کہ پڑھنے سے ہوگی لیاقت زیادہ

جو ہو کھیل کا وقت خوب اس میں کھیلو — کہ آتی ہے کھیلوں سے طاقت زیادہ

نہ مغرور ہو مال پر اپنے ہرگز — کہ ہے پاس اوروں کے دولت زیادہ

نہ بولو کبھی جھوٹ چغلی نہ کھاؤ — خدا کو ہے جھوٹوں سے نفرت زیادہ

بڑا مال سمجھو تم علم و ہنر کو نہیں ہے کوئی اس سے دولت زیادہ

کرو کام وہ جس میں سب کا بھلا ہو کریں کیا ہم اس سے نصیحت زیادہ

غرض یہ کہ اس مجموعے کی تمام نظمیں صرف بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں جس میں ان کی نفسیات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے - بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ وہ ان کی نفسیات اور خصوصیات سے بخوبی ہم آہنگ ہو ، مضامین بچوں کے لیے قابل فہم ہوں اور زبان سلیس و سادہ ہو اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہو ان تمام باتوں کے علاوہ وہ ادب ان کے لیے مفید و کار آمد اور سبق آموز ہو - مولانا نے بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت ان تمام باتوں کو مد نظر رکھا ہے - اسی لیے انھوں نے "اخبار سعید" کا اجرا کیا - اخبار سعید نام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اخبار ہے اور عوام و خواص سب کے لیے ہوگا مگر اس کے ساتھ بھی وہی داستان تاریخ اردو والا معاملہ ہوا - بعض جیسے لوگوں نے اس کے لیے کہا تھا کہ یہ داستان ہے یا تاریخ - یا داستان و تاریخ دونوں ہیں - داستان تاریخ اردو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں مرتب کی تھی اس رعایت اور شوق تاریخ گوئی کے سبب اس کا یہ نام رکھا - (داستان تاریخ اردو کے اعداد ۱۹۳۸ء ہوتے ہیں) " سعید کا پہلا شمارہ ۱۵ مارچ ، ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۶ھ کو شائع ہوا - سن ہجری کے اعتبار سے مولانا نے اس کا تاریخی نام بھی رکھا :

بچوں کا اچھا دل چسپ اور مفید اخبار
۱۳۳۶ھ
سعید
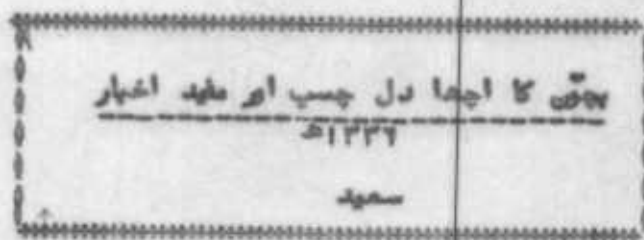
اور اس کے بعد سے یہ " اخبار سعید" ہی کہلانے لگا - خود بھی مولانا نے جہاں جہاں اس کا ذکر کیا اس کو " اخبار سعید" ہی کہا - دراصل وہ اس کو بچوں کا

ہفتے وار اخبار ہی بنانا چاہتے تھے۔

سعید کی پسندیدگی اور مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ علامہ اقبال جیسا مفکر و دانشور بھی اس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ علامہ اقبال بچوں کی تعلیم و تربیت کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے حامی تھے انہوں نے خود بھی بہت سی نظمیں بچوں کے لیے تحریر کیں لہذا مولانا کے " سعید" کو دیکھ کر ان کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

علامہ نے اس پرچے کو دیکھ کر مولانا کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھا :

" اخبار سعید میں نے دیکھا ، بچوں کے لیے نہایت مفید ہے - زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے اور مطالب بھی بچوں کی سمجھ سے بالاتر نہیں ہیں" (۱)

اسی طرح سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی نے بھی اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

" پرچہ سعید بے شک بچوں کے لیے بہت اچھا ہے - بڑی خوبی یہ ہے کہ خط جلی میں نہایت روشن اور صاف چھپا ہے -" (۲)

"سعید" کی اشاعت سے قبل جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا لاہور سے بچوں کا صرف ایک ماہنامہ " پھول " نکلا کرتا تھا ۔ مولانا کا پرچہ شائع ہونے پر ملک کے اخبارات و رسائل نے اس پر اپنی آراء کا اظہار کیا چنانچہ روز نامہ " جمہور" کلکتہ کے مدیر ۲۸ اپریل، ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں :

" ابھی تک چھوٹے بچوں کے قابل صرف لاہور کا اخبار " پھول" تھا۔ کوئی اس قسم کا اخبار اور موجود نہ تھا۔ اب کان پور سے حامد حسن صاحب قادری نے " اخبار سعید" جاری کیا ہے - جو مہینے میں دو دفعہ شائع ہوتا ہے - حامد حسن صاحب موصوف ادبی دنیا میں ایک مشہور اہل قلم ہیں۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مدیر) " اخبار سعید"، کان پور : یکم جولائی، ۱۹۱۸ء، (مکتوب علامہ اقبال بنام مولانا قادری) ، ص ۱۲

(۲) ایضاً، (مکتوب اکبر الہ آبادی، بنام مولانا قادری) ، ص ۱۲

ہمارے سامنے" سعید" کے دو نمبر ہیں ۔ اور ہم ان کو بچوں کے لیے ہر طرح مفید اور دل چسپ پاتے ہیں ۔ چھوٹی چھوٹی نتیجہ خیز کہانیاں ، دل چسپ باتیں ، سادہ اور سلیس زبان ، اسی کے ساتھ سادہ تر اور سلیس تر معانی ، غرض کہ " سعید" ہمہ وجوہ ایک اچھا پرچہ ہے ۔ خدا کام یاب کرے اور اس کے قابل ایڈیٹر اپنے قلم سے قوم کی آیندہ نسلوں کو فائدہ پہنچا سکیں ۔ ہم اپنے اس ہم عصر کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔" (۱)

ماہنامہ " معارف " اعظم گڑھ اپریل ، ۱۹۱۸ع کی اشاعت میں " سعید" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی نے چھوٹے طالب علموں کے لیے ایک ہفتہ روزہ اخبار نکالنا شروع کیا ہے ، مضامین ابتدائی طالب علموں کے حسب حال اور بعض خود طلبہ کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ عبارت اور طرز ادا نہایت سادہ اور سہل ، تقطیع چھوٹی اور خط صاف پاکیزہ ہوتا ہے ۔ مولوی صاحب اردو کے ادیب ہیں ۔ اس لیے " سعید" کی ترقی کی امید بے جا نہیں۔" (۲)

ایک اور اخبار" دبدبۂ اعظم " مرادآباد اپنی ۵ مئی، ۱۹۱۸ع کی اشاعت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" ہمارے ہم وطن حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی نے کان پور سے محض بچوں کے واسطے ایک دل چسپ و مفید اخبار مہینے میں دو بار جاری کیا ہے ۔ اس صوبے میں بڑی کمی اس بات کی تھی کہ بچوں کے پڑھنے کا کوئی ایک اخبار بھی نہ تھا۔ چھوٹے بچوں کے لیے یہ اخبار ہر اعتبار سے مفید اور دل چسپ ہے ۔ مولوی محمد محسن صاحب فاروقی بچھرایونی جو لٹریری دنیا میں مشہور ہیں۔ ان کے مشورے سے اس کا اجرا ہوا ہے ۔ تقطیع و ضخامت ، لکھائی ،

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا (مدیر) : اخبار سعید ، کان پور : یکم جولائی ، ۱۹۱۸ع،

(۲) ایضاً ، (بحوالہ " معارف "، اعظم گڑھ ، بحیں)

چھپائی، کاغذ سب موزوں ہے - مضامین خود اپنی داد دلوادیں گے۔" (۱)

مندرجہ بالا اخبارات و رسائل کے علاوہ اور بھی بہت سے دیگر اخبارات و رسائل کے مدیران مثلاً " مشرق" گورکھپور، " رہنما" مرادآباد، " صحت" دھلی، " القریش " امرتسر، اور " خطیب " دھلی وغیرہ نے " سعید" پر اپنی اشاعتوں میں تبصرے کیے - جو سعید میں وقتاً فوقتاً شایع ہوئے - ہم بخوف طوالت ان کو حذف کرتے ھیں- علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی کی آراء پہلے پیش کی جاچکی ھیں- اب ذیل میں چند اور ماہرین تعلیم کی آراء پیش کی جاتی ھیں جس سے اس کی علمی و ادبی اور تعلیمی و تدریسی اہمیت کااندازہ لگایا جاسکتا ہے - اس سلسلے میں جناب مولوی ابوالحسن صاحب اسپشل انسپکٹر محمڈن اسکولز الہ آباد تحریر کرتے ھیں :

" اخبار بینی کے فوائد محتاج بیان نہیں رہے - اب ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہے کہ انسانی علم معلومات میں اخبار کے ذریعہ سے جس قدر جلد اور معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہے اور کسی صورت سے ممکن نہیں- لیکن اخبار بینی کی عادت کم عمری سے نہ پڑے تو سوائے تارکی خبروں اور اشتہارات کے حصے کے علمی، اخلاقی اور مذہبی مضامین کے پڑھنے میں مشکل سے جی لگتا ہے - اس لیے بچوں کے اخباروں کو رواج دینے کی بہت ضرورت ہے تاکہ یہ مفید عادت بچپن سے پڑے - آیندہ زمانے میں اخبار بینی ضروریات زندگی سے ہوجائے گی - اس وجہ سے میری رائے میں " اخبار سعید" کا خیر مقدم نہایت جوش و خوشی کے ساتھ کرنا چاہئے غالباً اس صوبے میں بچوں کا یہ ہفتہ روزہ اخبار اپنی نوعیت کا ایک ہی پرچہ ہے - اور یہی خواہاں ملک و ملت کا یہ فرض ہے کہ اس کی اشاعت اور قلمی امداد میں بھی کوشش فرمائیں جس سے حامد حسن قادری کی ہمت افزائی ہو اور وہ اسی پرچے کو ہفتہ وار کرسکیں۔

" اخبار سعید" کے جو پرچے میری نظر سے گذرے ھیں ان میں بچوں

---

(۱) " اخبار سعید"، محولہ بالا، (بحوالہ " دبیر اعظم"، مرادآباد، ماہ مئی، ۱۹۱۸ع)

کے لیے نہ صرف دل چسپ کہانیاں ہوتی ہیں ، بلکہ کار آمد معلومات اور اخلاقی
صائح کا اچھا ذخیرہ ہے ۔ لیکن اس سے چھوٹے بچے اسی صورت میں مستفید
ہوں گے جب کہ ان کے والدین یا استاد تھوڑا سا اپنا وقت بھی بچوں کے ساتھ
صرف فرمائیں۔ یعنی بچوں سے اخبار پڑھواکر سنیں اور سوال و جواب کے ذریعہ
سے نتیجہ خیز مسائل ان کے ذہن نشین کریں۔ امید ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص
یہ کم خرچ بالا نشین تحفہ اپنی اولاد اور خردسال عزیزوں کو دے کر ان کی
تربیت اور مسرت دونوں کا سامان پیدا کرے گا۔" (۱)

اسی طرح اور بہت سے ماہرین تعلیم مثلاً شیخ تیمور صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج
پشاور ، مولوی عبدالہادی صاحب اتالیق صاحب زادگان نواب بھوپال ، جناب پروفیسر مولوی
محمد محسن صاحب فاروقی، پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور، و جناب مولوی بشیرالدین احمد صاحب
کلکٹر دہلی وغیرہ نے " سعید" کے اجرا پر مولانا کی خدمات کو سراہتے ہوئے تعریفی و
تہنیتی خطوط ارسال کیے۔ جو اخبار سعید" کی زینت ہیں۔

مولانا قادری دراصل بچوں کی نفسیات کے ماہر ہونے کے علاوہ قومی ضروریات سے بھی
آشنا تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مختلف معلومات باتوں کو دل چسپ انداز میں طرح پیش کرنا
کہ وہ ان کے ذہن پر بار نہ ہوں اصل تعلیم ہے ۔ قصوں اور کہانیوں کے توسل سے
بہت سی اچھی اچھی اور اخلاقی باتیں بخوبی بچوں کے ذہن نشین ہوسکتی ہیں ۔
دوسرا اور کوئی طریقہ اس سے زیادہ موثر و کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔ یہی سبب تھا کہ
انھوں نے بچوں کو مہذب و شائستہ بنانے، ان کو تعلیم و تربیت کی طرف مائل کرنے اور ان
کے نرم دلوں، نازک طبیعتوں کو صحیح سمت پر لے جانے اور ذہنوں کی تربیت کے لیے " سعید"

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " اخبار سعید"، کان پور: ۱۵ اکتوبر، ۱۹۱۸ء ،
(مکتوب بنام مولوی ابوالحسن بنام ایڈیٹر) ، ص ١٢

کے اجرا کا بیڑا اٹھایا۔ بچوں میں ادب اور تمیز کی کمی ایک بڑی کمی ہے اور یہ جب ہی پوری ہوسکتی ہے جب کہ ان کے ذہنوں کی صحیح خطوط پر تربیت کی جائے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب وہ بغیر کسی کی تاکید و تنبیہہ کے از خود اخلاقی و معاشرتی باتوں کو سیکھیں ۔ سعید کے ذریعہ مولانا نے بچوں کی صحیح خطوط پر رہنمائی کرکے ان کو علم و ادب اور اخلاق و معاشرت کی تعلیم دی ۔

مولانا اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ بچوں کو لطیفے پڑھنے کا شوق دلانے یا شوقین بچوں کے شوق میں اضافہ کرنے اور علمی ذوق پیدا کرنے کے لیے قصّے کہانیاں خاصی موثر ثابت ہوتی ہیں۔ بچوں کو کہانی سننے یا کہانی پڑھنے سے فطری لگاؤ ہوتا ہے ۔ کہانیوں کے افراد اور ان کے کارنامے نہ صرف بچوں کی دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں بلکہ کردار کی تعمیر میں بڑی حد تک معاون ہوتے ہیں۔ کہانیوں کے علاوہ مولانا نے بچوں کی عام طبائع اور ان کی مخصوص کیفیات کو مدنظر رکھ کر نہایت مناسب و موزوں منظومات سے بھی اس کو مزین کیا تھا۔ مثلاً "سعید" کی یہ اخلاقی غزل ملا حظہ ہو :

" کہنا نہ کسی سے اپنے جی کی	ہے بات یہ لاکھ اشرفی کی "(۱)
جو بات کہی کہی سمجھ کر	پہچان یہی ہے آدمی کی
سن لو جو کہے کوئی نصیحت	کڑوی معلوم ہو کہ پھیکی
فوراً ہی مانگ لی معافی	بھولے سے خطا اگر کبھی کی
کھاؤ ترس ان پہ جو ہیں بیکس	تکلیف سے خوش نہ ہو کسی کی
آئینہ کو دل کے صاف رکھو	جمنے نہ دو گرد دشمنی کی (۲)

---

(۱) یہ شعر غلام ہمدانی مصحفی کا ہے -(حامد حسن قادری)

(۲) " اخبار سعید"، کان پور، یکم جون ۱۹۱۸ء ، ص ۲

* سعید * میں جتنی نظمیں، کہانیاں اور مضامین شایع ہوئے وہ سب ہی نتیجہ خیز اور اخلاقی ہوتے تھے۔ بعض کہانیاں بھی منظوم ہوا کرتی تھیں۔ بچوں کو غرور و تکبر سے بچنے کی فہمائش کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

آدمی تھا اک نہایت مال دار   عیش میں کٹتے تھے اس کے ماہ و سال

اپنی دولت پر مگر مغرور تھا   بے کسوں کا کچھ نہ کرتا تھا خیال

تھی فقط دل میں سخاوت کی کمی   گرچہ دولت کا نہ تھا کچھ گھر میں کال

ایکدن کوئی فقیر آیا ادھر   اور روکر کچھ کیا اس سے سوال

دیکھنے سے اس پہ آتا تھا ترس   ہورہا تھا ضعف سے اتنا نڈھال

لیکن ایسا سنگ دل تھا وہ امیر   خوب بگڑا دیکھ کر مفلس کا حال

بے سبب ہی غصہ ہوتے دیکھ کر   سخت مفلس کو ہوا رنج و ملال

بولا اس سے ڈر خدا سے اے امیر   لے بھی سکتا ہے دیا ہے جس نے مال

سن کے یہ طیش اس کو آیا اور بھی   ہوگیا غصہ سے چہرہ اس کا لال

پاس ہی اس کے کھڑا تھا اک غلام   بولا " دھکّے دے کے جلد اس کو نکال"

پھر نہ آنے پائے یہ ہرگز ادھر   ہوشیاری سے رکھ اس کی دیکھ بھال"

دیکھو اب اللہ کی قدرت کا کھیل   وہ امیر اتنا تھا جس کے پاس مال

کچھ دنوں میں ہوگیا بالکل تباہ   مارے فاقوں کے ہوا جینا محال

بک گیا جو کچھ اثاثہ گھر میں تھا   اب نہ کمبل پاس باقی تھا نہ شال

بھیک کے ٹکڑوں پہ دن کٹنے لگے   در بدر پھر پھر کے کرتا تھا سوال

لے لیا اس کا غلام اک شخص نے   دے کے قیمت میں اسے تھوڑا سا مال

ہوگیا خوش آکے اس آقا کے پاس   واں مصیبت میں کٹے تھے چند سال

تھا وہ آقا نہایت نیک دل — تھا سخاوت میں اسے حاصل کمال

ایک دن کوئی گدا آیا وہاں — بھوک سے چلنا بھی تھا جس کو محال

رحم کھاکر بولا آقا "اے غلام — اس قدر دے اس کو ہوجائے نہال"

چیخ اٹھا دیکھ کر اس کو غلام — جب گیا وہ لے کے کھانا اور مال

لوٹ کر آیا تو آقا نے کہا — "بات کیا ہے کچھ بیان کر مجھ سے حال

دیکھ کر مفلس کو کیوں کی تھی آہ — اس گدا سے تجھ کو پہنچا کیا ملال

عرض کی اس نے ادب سے "اے امیر — تھا کبھی آقا مرا یہ خستہ حال

اس کے در پر سائل آتے تھے کبھی — آج خود کرتا ہے اوروں سے سوال

بولا آقا "کچھ تعجب تو نہ کر — ہے یہ خود اپنے کیے کا سب وبال

میں وہی محتاج ہوں اس نے جسے — دھکّے دے دے کر دیا اس دن نکال

کی خدا نے میری حالت پر نظر — دے دیا قدرت سے اپنی مجھ کو مال

ہے غرور اور حرص اس کو ناپسند — اس کی دولت کو ہوا آخر زوال

یاد رکھ سو ہاتھ ہیں اللہ کے — جس کو چاہے کردے دم بھر میں نہال

چھین لے دے کر کوئی تو کیا کرے

دخل دے کچھ بھی کسی کی کیا مجال" (۱)

ایک اور نظم جس کا عنوان "سچی دوستی" ہے اس میں ایک مخلص دوست کی دوستی اور جان نثاری کا حال یوں بیان کیا ہے :

ایک مشہور شخص بیرم خاں — تھا ہمایوں کی فوج کا افسر

---

(۱) "اخبار سعید"، کان پور، یکم جون، ۱۹۱۸ع، ص ۳

دی ہمایوں کو شیر شہ نے شکست
ہوگیا سب تتر بتر لشکر

بھاگ نکلا وہاں سے بیرم بھی
سینگ اس کے جدھر سمائے ادھر

اک سپاہی بھی ساتھ تھا اس کے
تھا جو بیرم کا ہمدم و یاور

تھا سپاہی کا نام ابوالقاسم
دوستی کا تھا خاتمہ اس پر

چھپتے پھرتے تھے دونوں بے چارے
جنگلوں جنگلوں ادھر سے ادھر

ڈھونڈتا پھر رہا تھا بیرم کو
ہرطرف شیر شاہ کا لشکر

ایک دن بیرم اور ابوالقاسم
دونوں بیٹھے تھے اک جگہ تھک کر

اتنے میں ایک فوج کا دستہ
آیا آتا ہوا ادھر کو نظر

آئے اور آکے ان کو گھیر لیا
بھاگتے وہ تو بھاگتے کیوں کر

شکل دونوں کی ملتی جلتی تھی
ایسا ہوتا ہے اتفاق اکثر

سمجھا دشمن کہ یہ ہے بیرم خان
پڑی قاسم کے چہرے پر جو نظر

اسی دھوکے میں آکے حکم دیا
* ہے یہ بیرم اڑادو اس کا سر *

سن کے بیرم سے ضبط ہو نہ سکا
اور کہا اس نے سامنے آکر

* یہ نہیں بلکہ میں ہوں بیرم خان
مارنا مجھ کو چاہتے ہو اگر *

اس پہ قاسم نے اپنے دل میں کہا
اب وفا کے دکھائیے جوہر

اور پھر وہ یہ سوچ کر بولا
* میں ہوں بیرم یہ ہے مرا نوکر *

ہے وفادار یہ بہت میرا
جان میری بچاتی ہے اکثر *

اتنا سنتے ہی اک سپاہی نے
کیا اک وار بڑھ کے قاسم پر

واہ شاباش اے ابوالقاسم
یہی مردانگی کے ہیں جوہر

جان دی اپنی دوستی کے لیے

دوستی کا ہے خاتمہ تجھ پر (١)

مندرجہ بالا نظم ایک اخلاقی نظم ہے ۔ سادگی و صفائی اور دل کشی و دلآویزی کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ اس کے ہر شعر سے سادگی و پرکاری عیاں ہے ۔ ان کی بیشتر اخلاقی نظمیں حالی و انیس کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ سعید کے ذریعہ انھوں نے نظم و نثر کے توسل سے بچوں کی علمی و ادبی اور ذہنی و جسمانی ہر طرح کی اصلاح کرنا چاہی۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے اصلاحی و اخلاقی نظمیں بھی لکھیں ان کو اٹھنے بیٹھنے کھانے ، پینے اور تندرست رہنے کے طریقے بھی سکھائے ۔ سعید میں " تندرستی کی باتیں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہوئے بچوں کو کھانے کی اہمیت یوں بتاتے ہیں :

" بعض بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ کھانا جلدی جلدی کھاتے ہیں اور جو چیز جس وقت مل جاتی ہے کھالیتے ہیں۔ یہ دونوں عادتیں بری ہیں۔ کھانے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے ۔ اس لیے کہ سو (١٠٠) میں سے نناوے (٩٩) مرض صرف کھانے کی بے احتیاطی اور معدے کی کمزوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ کھانا خوب چبا چبا کر کھانا چاہیے ۔ منھ میں جو لعاب ہوتا ہے وہ کھانے کے هضم کرنے میں بہت مدد دیتا ہے ۔ اس لیے کہ جتنا دیر تک چباؤ گے اتنا ہی زیادہ لعاب کھانے میں ملے گا اور کھانا جلد هضم ہوگا۔

دوسرے ہر وقت کھاتے رہنا بھی بہت مضر ہے ۔ کھانے کے وقت مقرر کرنے چاہئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تم ایک چیز کھاتے ہو تو معدہ فوراً هضم کرنے کا کام کرنے لگتا ہے ۔ اب تم اس کے هضم ہونے سے پہلے دوسری چیز کھالو گے تو معدے کو ان دونوں چیزوں کے هضم کرنے میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔ تیسرے دو وقت خوب پیٹ بھرکر کھانے سے بہتر یہ ہے کہ دن میں تین چار مرتبہ

---

(١) حامد حسن قادری، مولانا (مدیر) ، " اخبار سعید"، کان پور : انتظامی پریس، یکم جون، ١٩١٩ء ، ص ٣-٣

تھوڑا تھوڑا کھاؤ۔ اس سے تندرستی اچھی رہتی ہے ۔ لیکن یاد رکھو کہ جب تک ایک غذا ہضم نہ ہوجائے ۔ دوسری غذا نہ کھاؤ ۔ کھانا وہی فائدہ دیتا ہے جو خوب بھوک لگنے پر کھایا جائے ۔

کھانا کھاتے میں پانی نہ پینا چاہیے ۔ یا اگر پیو تو بہت تھوڑا ۔ بہتر یہ ہے کہ کھانے کے بعد پانی پیو ۔ ڈاکٹروں کی نصیحت ہے کہ " کھانا کھاؤ تو پانی نہ پیو اور پانی پیو تو کھانا نہ کھاؤ ۔" کھانے کے بعد پھل کھانا بھی مفید ہے ... دودھ سب سے اچھی غذا ہے ۔ یہ سب کا سب خون بن جاتا ہے اور بہت طاقت دیتا ہے ۔ ہلکا گرم پینا چاہیے۔ بہت دیر تک ابالنا اچھا نہیں اس سے اس کے فائدے کم ہوجاتے ہیں۔ ترکاری بھی ضرور کھانی چاہیے ۔ اس سے بھی خون صاف ہوتا ہے ۔ گوشت بھی فائدہ مند ہے لیکن خوب پکاہوا کھانا چاہیے ۔ جو لوگ گوشت نہیں کھاتے وہ دودھ سے اس کا بدل کرسکتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد فوراً لکھنا پڑھنا یا کوئی محنت کا کام نہیں کرنا چاہئے ۔ اس سے معدہ بھی کم زور ہوجاتا ہے اور آنکھوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے ۔" (١)

بچوں کے لیے مولانا نے صرف ادبی و اخلاقی مضامین ہی نہیں لکھے بلکہ سب سے سائنسی و معلوماتی مضامین بھی تحریر کیے ۔ مثلاً ان کو سائنس کے آلات اور ان کے استعمال سے روشناس کرایا۔ تاکہ جب وہ ابتدائی جماعتوں کے بعد ثانوی اور اعلا ثانوی جماعتوں میں پہنچیں تو ان کے لیے یہ آلات نئے نہ ہوں۔

ایک اور مضمون میں بچوں کو صحت و صفائی اور ورزش و کسرت کے فوائد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

" تندرستی قایم رکھنے کے لیے ورزش کرنا ضروری ہے ۔ لوگ عام طور سے اس لیے ورزش کیا کرتے ہیں کہ جسم کے رگ پٹھے مضبوط ہوں ۔ لیکن ورزش اس

---

(١) حامد حسن قادری، مولانا (مدیر) " اخبار سعید"، محولہ بالا ، ص ٨-٧

بھی زیادہ کام دیتی ہے - یہ صرف رگ پٹھوں کو ہی مضبوط نہیں کرتی بلکہ جسم کے تمام اعضاء کو صحیح، طاقتور اور چست کردیتی ہے - ورزش کرنے سے خون پھیپھڑوں میں تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے اور صاف ہوا زیادہ مقدار میں اندر پہنچتی ہے - اس لیے ورزش کرتے وقت اس بات کا خیال رہے کہ پھیپھڑے اور سینہ آزادی کے ساتھ کام کرسکیں - ورزش کرنے سے پسینہ بہت نکلتا ہے اور پسینے کے ساتھ خراب مادہ جسم میں سے نکل جاتا ہے - دل زیادہ تیزی سے کام کرتا ہے اور زیادہ مضبوط و موٹا ہوجاتا ہے - خون صاف ہوتا ہے، بھوک خوب لگتی ہے- اور کھانا اچھی طرح ہضم ہوتا ہے - جسم کی گرمی قائم رہتی ہے -

ورزش صرف جسم ہی کے لیے مفید نہیں بلکہ دماغ کو بھی اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے - جس کا جسم تندرست ہوتا ہے اس کا دماغ بھی قوی اور درست رہتا ہے اور دماغ ہی سے انسان، انسان کہلاتا ہے - جن لوگوں کو دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کو ورزش کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے -" (۱)

مولانا اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ شعر کے قالب میں ڈھال کر خلوص ومحبت سے جو بات سمجھائی جاتی ہے وہ پر اثر ہوتی ہے اگر وہی بات سیدھے سادے طریقے سے نثر میں کہی جائے تو شاید اتنی کارگر نہ ہو - بچوں میں تحصیل علم کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے وہ مصر کے دو امیر زادوں کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں :

تھے مصر میں دو امیر زادے	ہر اک کے الگ الگ ارادے
کی ایک نے جمع اتنی دولت	ہاتھ آگئی مصر کی حکومت
حاصل کیا علم دوسرے نے	کرنے پڑتے تھے اس کو فاقے
دولت کا بھرا تھا سر میں سودا	وہ اس کو ذلیل جانتا تھا
کہنے لگا مالدار اک دن	تجھ کو نہیں ایسے عیش ممکن
پائی دولت سے میں نے شاہی	تجھ کو ملی علم سے تباہی
عالم نے دیا جواب اس کو	اور کردیا لاجواب اس کو

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مدیر) "اخبار سعید"، کان پور: انتظامی پریس یکم دسمبر ۱۹۱۹ع، ص ۳

یہ ملک جو تیرے ہاتھ آیا | فردوس کا تو نے ترکہ پایا
نعمت اللہ نے بڑی دی | توفیق جو مجھ کو علم کی دی

رحمت مجھ پر ہے یہ خدا کی
میراث ہے علم انبیاء کی (۱)

مولانا کے رسالہ " سعید " سے قبل " پھول " ہی بچوں کا ایک واحد پرچہ تھا۔ اس میں بھی مولانا کی نظمیں اور مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۲ء کو آپ کی ایک نظم " پھول اور کانٹا " کے عنوان سے شائع ہوئی اس کو مولانا نے دسمبر، ۱۹۲۱ء کے " اخبار سعید " میں بھی شائع کیا ۔ نظم یہ تھی :

ایک دن پھول نے کانٹے سے کہا جھنجھلا کر
کس لیے رہتا ہے تو میرے برابر اکثر
میں ہوں جس شاخ پہ رہتا اسی جا تو بھی
رنگ اور بو میں برابر ہے مری کیا تو بھی
مجھ میں ہے رنگ نہیں اس کا پتا بھی تجھ میں
مجھ میں خوش بو ہے نہیں اس کی ہوا بھی تجھ میں
میری رنگت سے زمانے کی ہیں آنکھیں روشن
میری خوش بو سے بسا رہتا ہے سارا گلشن
مجھ کو سب سر پہ چڑھاتے ہیں ، لگاتے ہیں گلے
تجھ کو تو پھول کے بھی پاؤں سے کوئی نہ ملے
گود میں لیتے ہیں شیریں میں لگاتے ہیں مجھے
قدر کرتے ہیں مری سر پہ چڑھاتے ہیں مجھے
تو ستاتا ہے تری نوک سے سب ڈرتے ہیں
پاس جاتا نہیں کوئی تری سب ڈرتے ہیں
قدر داں ایسے بھی دنیا میں ہیں اکثر میرے
سج پر رکھتے ہیں ، گل دستے بناکر میرے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا (مدیر) ، " اخبار سعید "، کان پور، انتظامی پریس ، ۱۵ اگست، ۱۹۲۱ء ، ص ۲

تجھ کو در پر بھی تو رہنے نہیں دیتا کوئی
پھینکنے کو بھی نہیں ہاتھ میں لیتا کوئی

دیکھ لوگوں نے بڑھایا ہے یہ رتبا میرا   سر پہ دولھا کے بندھا کرتا ہے سہرا میرا

کبھی سیجوں پہ لگا لیتے ہیں چادر میری
کبھی قبروں پہ چڑھا دیتے ہیں چادر میری
مانگ ہوتی ہے مری شادی و غم دونوں میں
دیکھ تو کتنا بڑا فرق ہے ہم دونوں میں

خوبیاں کون سی تجھ میں ہیں بتا اے کانٹے
دیکھ دنیا میں تری قدر ہے کیا اے کانٹے
نوک چبھ جاتی ہے بن کر تری نشتر اے خار
خار کھائے ہوئے سب بیٹھے ہیں تجھ پر اے خار
کس لیے ہاتھ میں گل چیں کے چبھا جاتا ہے
لینے آتا ہے وہ مجھ کو ترا کیا جاتا ہے
جیسی ہے شکل ، ہے ایسا ہی برا نام ترا
چل پرے ہٹ مرے پہلو میں ہے کیا کام ترا

سن کے سب پھول کی تقریر یہ بولا کانٹا   ٹھہریے پھول خفا ہونے سے حاصل ہے کیا
کام کا تو ہے اگر میں بھی تو بیکار نہیں   بات یہ اور ہے تو اس سے خبردار نہیں
نہیں معلوم مری وصف جو متعلق تجھ کو   پھر برا کہنے کا اے پھول ہے کیا حق تجھ کو
تونے جو کچھ کہا وہ سب ہے درست اور بجا   لیکن اے پھول تو اس حسن و نزاکت پہ نہ جا
خوش نما رنگ ترا دیکھنے ہی کا ہے فقط   بیہ اترانا ہے یہ دھوکا ہی دھوکا ہے فقط
نہ یہ بو ہی ہے تجھ میں نہ یہ رنگت قایم   چار دن بھی نہیں رہتی تری صورت قایم
صبح ہے شام سے اے پھول سحر تک تیری   نہیں لیتا کوئی پھر اس کی خبر تک تیری
گر پڑے سوکھ کے یا توڑ لے کوئی تجھ کو   زندگی ہے یہی اللہ نے بخشی تجھ کو
تیری خوش بو کس طرح ہے ترا آنا جانا   تونے اک رات میں جینے کا مزا کیا جانا

سر میں تیرے بھری اے پھول ہے شیخی کیا کیا
اتنی ہو عمر تو اس عمر پہ اترانا کیا ؟
جس کا یہ حال ہو اس حسن سے حاصل کیا
اس کے ہونے سے نہ ہونا ہی بہت اچھا ہے

کیا کسی لیے کے وہ دولت جو ہمیشہ نہ رہے

بھاڑ میں جائے وہ صورت جو ہمیشہ نہ رہے

نکلا سورج تو کیا رنگ بھی تیرا ہو بھی

دن کا جانا تھا کہ رخصت ہوا اے گل تو بھی

تو خفا ہوتا ہے کیوں دیکھ کے صورت میری ؟

اے نادان میں کرتا ہوں حفاظت تیری

نوک چبھ جاتی ہے جو توڑنے آتا ہے تجھے

میرا نشتر ہی ہے ، اے گل جو بچاتا ہے تجھے

میں ہوتے ہی سے بچ جاتے ہیں دو چار کبھی

میں نہ ہوتا تو کوئی پھول نہ رہتا باقی

باغ کے چار طرف ہوتے ہیں مجھ کو مالی

تاکہ پھل پھول کی چوروں سے کریں رکھوالی

پاس تیرے نہیں ہتھیار حفاظت کے لیے   اور مری نوک ہے تیار حفاظت کے لیے

بے خطا کوئی ستاتا ہے کسی کو اے پھول   کہ تو دیتا ہے یہ الزام مجھی کو اے پھول

جو نہ چھیڑے مجھے تکلیف اسے کیا دیتا ہوں

ہاں مزہ توڑنے والے کو چکھا دیتا ہوں

نوک جھونک ان کی کہیں مالی نے بھی سن پائی

سنتے ہی دونوں کو سمجھانے کو دوڑی آئی

کہا دونوں سے کہ احمق نہ بنو ہوش میں آؤ

ابھی تعریف نہ ہرگز کرو باتیں نہ بناؤ

خود جو اچھے ہیں برا سب کے بھلا کہتے ہیں

جو برے ہیں وہی اوروں کو برا کہتے ہیں

ہاتھ سے اپنے بنایا ہے خدا نے تم کو   خاص مخلوق اسی ایک کی تم دونو ہو

کام اس کا کوئی حکمت سے نہیں ہے خالی   تم ہو جس باغ میں اس کا ہے وہی تو مالی

اس نے بیکار کیا دونوں کو ہے کیا پیدا   فائدہ کچھ بھی نہ ہوتا تو نہ کرتا پیدا

یاد رکھو کہ ہے دنیا میں خوشی بھی غم بھی

جس جگہ ہوتی ہے شادی ہے وہیں ماتم بھی

رنج کے بعد مزہ ملتا ہے راحت میں سوا　　　اس لیے پھول کے رہتا ہے برابر کانٹا

فائدہ کچھ ہے اگر گل میں تو کچھ خار میں ہے

نفع دونوں میں ہے کیا فائدہ تکرار میں ہے (۱)

ایک اور نظم میں " فاتح اندلس (اسپین) طارق" کا حال سناتے ہوئے بچوں

کو ہمت و جرات کا درس یوں دیتے ہیں :

لے کے جب طارق گیا اسپین کو فوج جہاز

اور لشکر جاکے اترا ساحل اسپین پر

سب جہازوں میں لگادی سب سے پہلے اس نے آگ

لگ رہی ہے آگ پانی میں یہ آتا تھا نظر

جل گئے سارے جہاز اور راکھ ہوکر بہہ گئے

لشکر گھبرا کے یوں کہنے لگے یہ دیکھ کر

آپ نے یہ کیا کیا انجام ہوگا اس کا کیا

کس طرح اس ملک سے پہنچیں گے آخر اپنے گھر

آپ کا یہ کام تو ہے عقل مندی کے خلاف

ہم کدھر جائیں ، ادھر دشمن سمندر ہے ادھر

ہاتھ میں تلوار لے کر ہنس کے طارق نے کہا

" تم کو اندیشہ ہے کیا ؟ ڈرتے ہو تم کیوں اس قدر

جو خدا کا ملک ہے بے شک ہمارا ہے

ہم میں ہمت ہے تو پھر ساری تک زمین اپنا ہے گھر "

تھی بھی ہمت کہ دی برکت خدائے پاک نے

ہوگئی حاصل اسے اسپین پر آخر ظفر

سہل ہوجاتا ہے گو کیسا ہی مشکل کام ہو

دل میں ہمت اور بھروسہ ہو اگر اللہ پر

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا (مدیر) " اخبار سعید" ، کان پور : انتظامی پریس ، یکم دسمبر ، ۱۹۲۱ء ، ص ۳

کام ہمّت اور محنت سے کریں جو آدمی　　　　کام پاہیں اور ہمّت کا ہے سہرا اس کے سر

پست ہمت ہو اگر انسان تو ہوتا ہے ذلیل

نام پاتا ہے وہ آتا ہے اسے کوئی ہنر　　　　(۱)

ایک اور مضمون میں بچوں کو اطاعت و فرماں برداری کا سبق دیتے ہیں - اچھے کاموں کو انجام دینے اور بری کاموں سے بچنے کی فہمائش اس انداز سے کرتے ہیں :

" ایک بچہ کسی اسٹیشن پر ریل گاڑی کی پٹری پر کھیل رہا تھا۔ اس کا باپ کہیں دور تھا - تھوڑی دیر میں بچے کو دور سے باپ کی آواز آئی " بیٹے! لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ" - باپ کی آواز سنتے ہی بچہ فوراً پٹری کے بیچ میں لیٹ گیا۔ ابھی وہ لیٹا ہی تھا کہ ریل گاڑی آگئی اور بچے کے اوپر سے گذر گئی - اس کا باپ دوڑتا ہوا آیا - دیکھا تو بچہ بالکل صحیح سلامت تھا۔ اس نے جلدی سے گود میں اٹھالیا۔ پیار کیا اور خوشی کے مارے باپ کے آنسو بھر آئے - اللہ نے اس کے بچے کو بچالیا۔

بتاؤ وہ بچہ باپ کے کہنے سے کیوں فوراً لیٹ گیا۔ اس نے ریل گاڑی کو آتے ہوئے نہ دیکھا تھا - نہ اس کو خبر تھی کہ گاڑی آنے والی ہے - پھر وہ کیوں چپ چاپ لیٹ گیا۔ وہ صرف اس لیے لیٹ گیا تھا کہ اس کے باپ نے حکم دیا تھا اس نے فوراً باپ کا کہنا مان لیا۔ اسی کو اطاعت اور فرماں برداری کہتے ہیں -

ایک بچہ بازار میں چلا جارہا تھا - ایک آدمی اس کے قریب آیا اور چپکے سے اس سے کہا کہ " تم ہمارا کام کردو گے ؟" بچے نے پوچھا کیا کام ہے ؟" اس شخص نے ایک دوکان کی طرف اشارہ کرکے کہا " تم اس دوکان پر جاکر کھڑے ہوجاؤ - دوکان دار سے کچھ چیزوں کی قیمت پوچھنا۔ جب دوکان دار کسی اور طرف دیکھتا ہو تو وہ چاقو جو سامنے رکھا ہوا ہے چپکے سے اٹھاکر جیب میں ڈال لینا۔ چاقو لے آؤ گے تو میں تم کو آٹھ آنے انعام دوں گا۔" لڑکا اس آدمی

---

(۱)　حامد حسن قادری، مولانا: " ہمت کی برکت "، " تاج اردو"، آگرہ : آگرہ اخبار پریس، ۱۹۳۳ع، ص ۷۲

کے کہنے سے دوکیا ہو گیا اور دوکان دار کی نظر بچاکر چاقو جیب میں ڈال لیا۔
ابھی دوکان سے ہٹا ہی تھا کہ دوکان دار کو خیال آیا کہ ابھی جو چاقو یہاں رکھا تھا۔
وہ غائب ہے فوراً اس کا شبہ لڑکے پر ہوا۔ اس نے لپک کر لڑکے کی گردن پکڑ لی۔
اور جھٹ اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔ پھر بھری بازار میں
بہت برا بھلا کہا اور تھانے کی طرف لے چلا۔ خیر لوگوں نے کہہ سن کر چھڑا
دیا اور لڑکے سے توبہ کرائی کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ لڑکے نے کہا
" مجھ سے ایک آدمی نے چوری کرنے کو کہا تھا اور سڑک کی طرف اشارہ کر کے
بتایا کہ وہاں وہ آدمی کھڑا تھا" لیکن اب اس کا پتا کہاں تھا وہ تو یہ واقعہ
دیکھتے ہی غائب ہوگیا تھا۔

دیکھو! اس لڑکے نے جو اس آدمی کا کہنا مانا۔ یہ بھی اطاعت اور فرماں برداری
ہی کہلاتا ہے - لیکن صاف ظاہر ہے کہ کون سی اطاعت اچھی تھی اور کون سی
بری ~~اسے~~ کس کا کہنا ماننا چاہیے تھا اور کس کا نہیں -

یاد رکھو کہ ہر آدمی کا کہنا ماننا مناسب نہیں ہوتا۔ ہم کو اپنے ماں
باپ کا ، اپنے استادوں کا ، حکیموں اور ڈاکٹروں کا ، غرض ان لوگوںکا کہنا ماننا
چاہئے جن کو ہم جانتے ہیں - اچھا سمجھتے ہیں - ایسے لوگوں کا کہنا
ماننا واجب ہے - چاہے ہم اس بات کو سمجھیں یا نہ سمجھیں - غیر آدمی کا
کہنا ماننے میں بھی مضائقہ نہیں لیکن صرف ان باتوں میں جو اچھی ہیں اور
جن کے کرنے میں کچھ نقصان نہیں -

ماں باپ اور استاد ہرگز کسی بری بات کا حکم نہیں دیتے ہم کو ان
کی اطاعت ہر حال میں کرنی چاہئے - اور خوشی سے ان کے ہر حکم کی تعمیل
کرنی چاہئے - جو بچے سزا کے ڈر یا انعام کے لالچ سے اطاعت کرتے ہیں وہ
سچے اطاعت مند اور فرماں بردار نہیں ہوتے - زندگی کے ہر کام میں اطاعت اور
فرماں برداری کی ضرورت ہے - گھر میں ماں باپ اور سب بزرگوں کا کہنا ماننا
چاہئے - اس سے سارے گھر میں خوشی اور امن رہتا ہے - نافرماں بچوں سے
والدین ناراض رہتے ہیں - ایسے بچے جن کو گھرکی چھوٹی چھوٹی باتوں میں
نافرمانی کی جرات ہوتی ہے - بڑی عمر میں بہت برے آدمی بن جاتے ہیں۔

اسکول میں استادوں کی فرماں برداری کی ضرورت ہے - ایک بچہ نافرمانی کرتا ہے تو اوروں کو بھی ہمت ہوتی ہے - اگر سب لڑکے نافرمانی کرنے لگیں تو اسکول کا انتظام کس طرح درست رہ سکتا ہے - جو لڑکے استادوں کا کہنا نہیں مانتے اور اپنا کام اچھی طرح نہیں کرتے ان کو اسکول کی تعلیم سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا-" (۱)

مولانا کے وہ مضامین اور نظمیں جو انھوں نے بچوں کے لیے خاص طور پر لکھیں ان کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی وضاحت کے لیے اساتذہ اور والدین کو بھی کوئی خاص زحمت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بلکہ بچے ان کو خود پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں- اور خود ہی اس سے نتائج بھی اخذ کرسکتے ہیں- اس کے علاوہ مولانا اکثر مضامین میں اچھی باتوں کے فوائد اور بری باتوں کے نقصانات بھی بچوں کو عمدہ دلائل سے سمجھاتے چلتے ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے - بچوں کے ادب میں ان کی کتابوں کی نمایاں خصوصیت ان کا رچا ہوا اسلوب ، سلیس و سادہ انداز اور وضاحت و صراحت ہے - وہ ہر بات کو سادگی سے بیان کرتے اور اس کی تحلیل کرتے چلتے ہیں-

مولانا جب بچوں کو ذہنی کو ایسے شعور تک لے آئے کہ اب ان کو اپنے نصاب سے دلچسپی پیدا ہو تو انھوں نے نصاب کی کتابیں بھی لکھیں اور اسی معیار کو برقرار رکھنا چاہیے جس کی بنیاد انھوں نے بچوں کے ادب کے سلسلے میں رکھی تھی- اور اسی بنیاد پر اسی مناسبت سے عمارت کھڑی کی - جو بچہ ان کی تحریریں پڑھ کر بی اے تک پہنچا ہو اس کو ان کی مرتب کردہ درسی کتب میں بیگانگی محسوس نہیں ہوتی اور وہ انھیں (درسی کتابوں کو) ویسی ہی دلچسپی سے پڑھتا اور معلومات کے خزانے کو لے کر آگے بڑھتا

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا" ، " اطاعت و خدمت " ، " تاریخ اردو" ، محولہ بالا ، ص ۲۶

اور اسی طرح مولانا قادری بچوں کی ذہنی نشو و نما کرکے ان کو شعور کی منزلوں تک پہنچانے میں کام یاب ہوجاتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرلیتے ہیں۔ یعنی معاشرے کی ایک خاص نہج پر تعلیم و تربیت -

تعلیمی صاحیت :

مولانا چوں کہ اول و آخر معلم تھے - ان کی زندگی کا بہترین مشغلہ ہی لکھنا اور پڑھنا تھا اس لیے بچوں کے ادب اور دیگر ادبی صلاحیت کے علاوہ انھوں نے بہت سی درسی و تعلیمی کتب بھی ترتیب دیں جو عرصۂ دراز تک ہندوستان کے اسکولوں و کالجوں میں پڑھا جاتی رہیں - ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

۱-	ہلال اردو،	۱۰-	تذکرے و تبصرے ،
۲-	جمال اردو،	۱۱-	نقش تازہ ،
۳-	نہال اردو،	۱۲-	حرف دو ،
۴-	منظر اردو،	۱۳-	ادبی مقالے ،
۵-	چمنستان اردو،	۱۴-	ابراہام لنکن،
۶-	دامن گلچیں،	۱۵-	بہار نظم ،
۷-	داستان رستم و سہراب ،	۱۶-	بی - اے - پوشین کورس ،
۸-	Selected English Pieces for Urdu translation	۱۷-	تاریخ و تنقید ادبیات اردو،
		۱۸-	تاریخ مرثیہ گوئی ، اور
۹-	انتخاب مراثی انیس و دبیر،	۱۹-	مطالب سیرت و تبصرہ مصنفان عجم و ہند ، ۱۹۳۴ء

" ہلال اردو"، " جمال اردو"، " نہال اردو" اور " منظر اردو" ابتدائی درجات کے نصاب کی کتب ہیں - ان میں مختلف اقسام اور مختلف موضوعات پر مضامین درج ہیں۔، جن میں سوانحی ، اخلاقی، تاریخی و قومی مضامین اور اخلاقی و اصلاحی نظمیں شامل ہیں۔

"چمنستانِ اردو" :

یہ ثانوی جماعتوں یعنی نہم اور دہم کے نصاب کی کتاب ہے - جس میں غزلیات، مراثی، اور مثنویات کا انتخاب شامل ہے - اس میں مولانا نے قدیم و جدید دونوں قسم کی شاعری کے بہترین نمونے انتخاب کرکے شامل کیے ہیں-

اصنافِ نظم میں غزل سب سے قدیم ، سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف رہی ہے اس لیے مولانا نے غزل گوئی کے ہر دور سے چند شعرا کا انتخاب کرکے قدیم و جدید طرزِ غزل کی نمائندگی کا حق ادا کردیا ہے -

مثنوی و مرثیہ بہ اعتبار مضامین سب سے وسیع اور دل چسپ و مفید اصناف سخن ہیں اس لیے مولانا نے اس انتخاب میں مثنوی کی تعریف ، اس کی مستعمل و مروج بحور، مثنوی کی خوبیاں اور اس کی تاریخ اختصار سے بیان کی ہے جو پانچ ادوار پر مشتمل ہے -

مرثیے کے ضمن میں ، مرثیے کی تعریف ، مرثیے کی ہیئت و صورت ، مرثیے کے اجزاء، مرثیے کی خوبیاں اور مرثیے کی تاریخ بھی مع پانچ ادوار کے بیان کی ہے -

"چمنستانِ اردو" کے انتخاب کے موقع پر مولانا نے ایک جدت یہ بھی کالا کی کہ شعرا کے سوانح حیات اور تبصرۂ کلام کے علاوہ ہرصنف سخن کی مختصر تاریخ بھی اس کے شروع میں درج کردی ہے جس سے طلبہ کو یہ آسانی ہوگئی ہے کہ وہ اردو شاعری کی رفتار و ترقی کا اندازہ بآسانی لگا سکتے ہیں -

SELECTED ENGLISH PIECES FOR URDU TRANSLATION:

اس کتاب میں مولانا نے انگریزی کے مشہور و معروف ادیبوں مثلاً ڈرائیڈن ، چیسٹر فیلڈ ، جان رسکن، کولرج ، چارلس اسٹیونسن ، کارلائل اور گولڈ اسمتھ وغیرہ کے مضامین سے اقتباسات

دیے ہیں تاکہ طلبہ کو ترجمہ کرنے کے لیے بھی انگریزی کے اعلا ادیبوں کے ادب سے واسطہ رہے اور طلبہ کی علمی و ادبی استعداد بھی بڑھے ۔ اس زمانے میں بی ۔ اے کے اردو پرچے میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں ترجمے کا ایک ایک سوال بھی لازمی ہوتا تھا۔

" تذکرہ و تبصرہ " :

اس کتاب میں مولانا نے اردو کے مشہور و معروف مصنفین و شعرا کے حالات ، ان کے طرز تحریر اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ شامل کیے ہیں۔

" ابراہام لنکن ، جھونپڑی سے ایوان صدارت تک" :

یہ رینڈم ہاؤس نیویارک کی شایع کردہ اسٹرلنگ نارتھ کی انگریزی کتاب " ABE LINCOLN (Log Cabin to white House): کا اردو ترجمہ ہے ۔ امریکہ کا سولھواں صدر ابراہام لنکن مشاہیر عالم میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔ وہ ایک جھونپڑی میں پیدا ہوا مگر اپنی ذاتی صلاحیت اور محنت و مشقت کے ذریعہ امریکہ کے ایوان صدارت تک پہنچ گیا۔ اور عوام میں بے انتہا مقبول رہا۔ یہ کتاب اسٹرلنگ نارتھ نے امریکی بچوں کو لنکن کے اعمال و کردار سے سبق حاصل کرنے کے لیے لکھی تھی۔ حالاں کہ یہ کہانی ایک مزدور انسان کی ہے اور یہ اتفاق ہے کہ وہ امریکہ کا صدر تھا۔

عقل و دانش اور خوبیاں اچھائیاں کسی بھی قوم کے کسی بھی آدمی میں ہوں ہم کو اپنا لینی چاہئیں ۔ اس کتاب کا ترجمہ کرنے کا مقصد ہی پاکستانی بچوں کو لنکن کی زندگی، اس کے کردار اور اس کے اعمال و افکار سے روشناس کرانا تھا۔

* انتخاب مراثی انیس و دبیر:

یہ کتاب مولانا نے بی اے کے طلبہ کے لیے ترتیب دی ہے - اس میں مرثیہ کی ابتدا اور ارتقا ، اس کی مجموعی حیثیت ، دوسری اقوام والسنہ میں مرثیے کی حیثیت ، اردو میں مرثیے آمد اور اس کی فضیلت ، میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری اور پھر انیس و دبیر کے بعد مرثیے کی کیفیت اور صحیح بیان کی ہیں - اردو مرثیے کی فضیلت کے متعلق مولانا رقم طراز ہیں :

" تمام زمانوں اور زبانوں کے مرثیے اپنی اپنی جگہ قابل قدر و لائق ستائش ہیں ، لیکن اردو والوں نے مرثیے کو جیسا عظیم الشان فن بنادیا ہے اس کا جواب تمام عالم کی شاعری میں نہیں ہے - جس طرح فارسی و اردو دونوں نے غزل ایک ایسی چیز دنیائے شعر و ادب کو دی ہے جو اپنی ساخت ، نوعیت ، آفاقیت ، لطف و تاثیر میں بے نظیر ہے - اور ہزاروبارہ سو سال سے فارسی اور چھ سات سو سال سے اردو میں مقبول خاطر و لطف سخن کا خدا داد امتیاز رکھتی ہے - اسی طرح تنہا اردو نے مرثیہ ایک ایسی مکمل شان دار و حسین چیز پیدا کردی ہے جس کا پلہ عالم کی شاعری میں نہایت گراں ہے -" (۱)

اس انتخاب میں مولانا نے " موازنہ انیس و دبیر" کی طرح نہ انیس کی مدلل مداحی کی ہے اور نہ دبیر کے ہی مرثیے کو بالکل گرادیا ہے بلکہ ہر ایک کے کمال کو بخوبی واضح کرنے کی کوشش کی ہے - وہ مولانا شبلی کی اس رائے کے خلاف ہیں کہ " فصاحت دبیر کے کلام کو چھو نہیں گئی-" اس کے جواز میں مولانا قادری کا قول یہ ہے کہ " اس میں شک نہیں دبیر کے کلام میں دشواری اور تخیل کی بے اعتدالی بہت ہے مگر جو کلام اچھا ہے وہ بہت اچھا ہے - دبیر کے یہاں ایسی فصاحت بھی موجود ہے کہ اگر ان کے

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ؛ انتخاب مراثی انیس و دبیر" ، پشاور : شاہین برقی برقی پریس ، س ن ، ص ۲۷

بعض بعدین کو انیس کے کلام میں شامل کردیا جائے تو پہچان مشکل ہے - مولانا نے اس کی متعدد مثالیں بھی دی ہیں مگر آخر میں اس حقیقت سے انحراف بھی نہیں کیا ہے کہ " میر انیس کو بلا شبہ دبیر پر فضیلت حاصل ہے - لیکن مرزا دبیر کے کمال اور استادی میں بھی کوئی شک نہیں ہے -"

بی - اے - پرشین کورس :

یہ کتاب مولانا نے اس زمانے میں جب وہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں صدر شعبۂ فارسی تھے - بی - اے فارسی کے نصاب کے لیے لکھی تھی- عرصے تک شامل نصاب رہی- نثر و نظم فارسی کا بہترین انتخاب ہے - نثر میں علاالدین بن عطاملک جوینی کی " تاریخ جہان کشا" " انشا ابوالفضل" ، " آئین اکبر (مصنفہ ابوالفضل)"، " سہ نثر ظہوری" اور " چہار مقالہ " کا انتخاب شامل ہے جب کہ نظم میں انوری، فیضی، عرفی اور قاآنی کے قصائد کا انتخاب اور غزلیات میں عرفی، سعدی، حافظ ، نظیری، صائب ، ابوطالب کلیم ، مرزا غالب اور اقبال کی غزلیں شامل ہیں-

" مطالب سیرت و تبصرہ مصنفان عجم و ہند " :

اس کتاب میں فارسی شعرا و مصنفین کے حالات،طرز تحریر اور طرزکلام پر تبصرہ کے علاوہ اصناف شعر، صنایع بدائع اور بحور و اوزان کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے - کتاب کے آخر میں خلاصۂ تاریخ بھی دیا گیا ہے جس میں فارسی نظم و نثر کے ادوار کی خصوصیات کو اور اس دور میں ہونے والے واقعات کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے - مثلاً دور اول ۲۰۵ ہجری تا ۳۸۹ہجری کے مختصر واقعات یوں بیان کیے گئے ہیں:

" پہلوی و عربی عناصر سے فارسی زبان پیدا ہوئی - نثر و نظم فارسی کی تصانیف کا آغاز ہوا- بلعمی نے تاریخ طبری کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا-

ابو شکور بلخی نے سب سے پہلی مثنوی لکھی - ابوالمؤید بلخی نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ شہید بلخی نے سب سے پہلے ردیف وار دیوان مرتب کیا۔ رودکی نے مکمل قصیدے لکھے - نثر و نظم دونوں میں سادگی ہے - زبان میں پختگی نہیں۔ نثر فارسی کی فصاحت نظم سے کم ہے - عورتوں میں بھی مذاق شاعری ہے - رابعہ قزداری خوش گو شاعرہ ہے -"

غرض یہ کہ بچوں کے ادب کی تخلیق کے علاوہ مولانا نے درسی کتب کی ترتیب کا کام پر بھی خصوصیت سے توجہ دی اور اس میں بھی یہ بات مد نظر رکھی کہ طلبہ کی دل چسپی بر قرار رہے اور تخیل بیدار ہوتا رہے - مولانا کی درسی کتب کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ عرصۂ دراز تک یہ کتابیں ہند و پاک کے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل رہیں اور کئی آج بھی ہند و پاک کی بعض یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل ہیں۔

دسواں ۔ باب

مولانا قادری کی نثر نگاری

دسواں ـ باب

مولانا قادری کی نثر نگاری

مولانا قادری کی اوّلیات :

مولانا قادری نے اپنی مبسوط کتاب " داستان تاریخ اردو" میں میر نذر علی درد کاکوروی کے حوالے سے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ دکن کی ان تصانیف سے بہت پہلے شمالی ہند میں سیّد اشرف جہانگیر سمنانی نے (جن کا مزار کچھو چھہ شریف ، ضلع فیض آباد ، لکھنؤ میں ہے) اردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۱۳۰۸ء/ ۷۰۸ ھ میں تصنیف کیا تھا۔

اس سلسلے میں میر نذر علی درد کاکوروی رسالہ " نگار" بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں :

" سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں زبان ہندی کہا کرتے تھے۔ خود جمع کیا ہے ۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے ۔ اس کے صفحہ ۱۱۸ کی ایک عبارت کا نمونہ یہ ہے :

اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے ۔ ہوا سب خدا میں ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرّہ ہے تو صفات کے باہر بہتر سب ذات ہی ذات ۔" (۱)

اول اول اس انکشاف اور اس دعوے پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا ۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب نے بھی جب ان سے ذاتی طور پر اس کے متعلق استفسار کیا تو وہ

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " داستان تاریخ اردو" ، کراچی : ایجوکیشنل پریس ، اردو اکیڈمی (سندھ) ، ۱۹۶۶ء ، ص ۲۳

کوشی خاطر خواہ جواب نہ دے سکے ۔ لیکن اب مورخین ادب نے تسلیم کرلیا ہے کہ سب سے پہلا نثری رسالہ جس کا اب تک علم ہوسکا ہے وہ یہی ہے ۔ چنانچہ اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی پہلی نثری کتاب سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ " دبارۂ اخلاق و تصوف " ہے اور پہلی مطبوعہ کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب "معراج العاشقین" ہے ۔ اردو کی ابتدائی نثری کتابوں میں " شرح مرغوب القلوب " مصنفہ حضرت شاہ میراں جی (۹۰۳ھ/۱۴۹۶ع) ، " کلمۃ الحق" مصنفہ شاہ برھان الدین جانم (۹۹۰ھ/۱۵۸۲ع) ، " گنج مخفی" مصنفہ حضرت شاہ امین الدین اعلا یے جابجی(۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ع) ، " شرح تمہید ہمدانی" مصنفہ حضرت میراں صاحب خدا نما(۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ع) ، " احکام الصلوۃ " مولانا عبداللہ معاصر قطب شاہ (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ع) ، " سب رس " ملا وجہی (۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ع) ہیں ۔

ابتدائی نثری کتابوں پر عمومی تبصرہ :

ابتدائی نثری کتابوں کا موضوع اخلاق ، تصوف اور مذھب ہے ۔ اس لیے یہ عام دلچسپی سے خالی ہیں لیکن علم اللسان کے طالب علم کے لیے اردو کی عہد بہ عہد ترقی اور لسانی تبدیلیوں کی ان سے واضح نشاندہی ہوجاتی ہے ۔ مولانا احسن مارہروی ان کتابوں اور اس عہدکی اردو کی لسانی خصوصیات کے متعلق لکھتے ہیں :

" مرقومۂ بالا ادوار میں جتنے نمونے پیش کیے گیے وہ سب دکنی اردو کے نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے زبانی تغیرات کا انتخاب اورزبانی تبدیلیوں کا شمار نہ صرف شمالی ہند کے لیے بلکہ خود جنوبی ہند کے واسطے مفید وقت نہیں کیوں کہ مدت دراز سے یہ انداز بیان دکن میں بھی مفقود و متروک ہے ۔ تاہم ان نمونوں سے چند الفاظ التقاط کرکے یکجالکھے گئے ہیں جن سے ہر دور اور عہد کے خصائص امتیازی معلوم ہوسکیں گے۔

یہ معلومات وقتی لحاظ سے شاید کارآمد نہ ہو لیکن تاریخی نقطۂ نگاہ سے یقیناً بصیرت افروز ہے -

مقررہ شمار کے لحاظ سے یہ دور تین صدیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان زمانوں کی زبانوں میں کوئی بیّن اور مابہ الامتیاز فرق نظر نہیں آتا ہے - بجز اس کے کہ ایک دور کے مقابل میں دوسرے دور میں بعض الفاظ کی کمی بیشی ہوگئی ہے جیسا کہ مندرجہ نقشوں اور جدولوں سے معلوم ہوگا۔ تیسرے دور کی کتاب " سب رس " کا انداز بیان اپنے متقدم نمونوں سے ضرور جدا نظر آتا ہے - اور اس کی مقفی و مسجع عبارت پڑھ کر کہا جاسکتا ہے کہ شمالی ہند میں جب اردو نثر نویسی کی ابتدا ہوئی ہوگی تو غالباً اسی قسم کا تقلیدی نمونہ سامنے رکھا گیا ہوگا۔ با ایں ہمہ اس کی زبان بھی بہت قدیم ہے ، سیکڑوں الفاظ اور بہت سے محاورے ایسے پائے جاتے ہیں جو اس وقت سمجھ میں نہیں آتے - محاورات وغیرہ کی اجنبیت کے علاوہ زبان کی صرف و نحو میں بھی اس وقت کی زبان سے بہت فرق ہے۔ جس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں :

۱- اکثر عربی الفاظ کے املا کو سادہ کردیا ہے ، یعنی جس طرح سے بولے جاتے تھے تو ویسے ہی لکھ دیے ہیں۔ جیسے دفع کو (دفا) وضع کو (وضا) یا (ورا) واقعہ کو (واقا) جمع کو (جما) وغیرہ -

۲- مونث میں فعل کی جمع جیسے اصیل عورتاں مانتیاں ہیں، دین و ایمان پہچانتیاں ہیں۔

۳- اضافت کی جمع ، کی کے عوض (کیاں) اس کی ، کو (اسکیاں) وغیرہ۔

۴- جیتی - ایسی - جیسی کی جمع (جیتیاں، ایسیاں، جیسیاں) وغیرہ -

۵- " کر " کا استعمال ، جیسے دانا ہمنا رہنا کر جائے گا۔ اگر بولوں کا دشمن کرجائے گا۔

۶- " سی" مستقبل کے لیے جیسے خداکو اس نظر سے دیکھیانا جاسی (دیکھنا چاہیے)

۷- اردو الفاظ کی تکرار سے جو معنی تمام و کمال کے پیدا ہوتے ہیں ، جیسے گھر گھر ، در در ، وغیرہ - قدیم دکنی اردو میں ان دو لفظوں کے درمیان حرف (ے) کا اضافہ کیا جاتا ہے مثلاً گھرے گھر - درے در ، جدائے جدا، رگے رگ وغیرہ -

۸- مانگنا یا منگنا بمعنی چاہنا، جیسے اگر منگتا ہے دل میں محبت بھری تو شراب پی -

۹- الفاظ کی تذکیر و تانیث کا امتیاز اور لحاظ اکثر نہیں کیا جاتا تھا۔ شراب، شہر، صورت، دنیا، جان وغیرہ کو جو بالاتفاق مؤنث ہیں، مذکر لکھا ہے -

۱۰- اکثر نظموں میں بحریں ہندی (بھاشا) ہوا کرتی تھیں۔

۱۱- عروض و نظم کے اصول و قواعد کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی۔ اکثر مصرع کو کھینچ تان کر سکتہ پورا کرلیا جاتا تھا اور ضرورت شعری کے لیے لفظوں کی ہیأت بدل دی جاتی تھی۔ ساکن کو متحرک، متحرک کو ساکن کردینا اور امالہ و اشباع کا بے تکلف استعمال معمولی بات تھی۔ اسی قسم کی اور بھی خصوصیات ان عہدوں کی طرز بیان میں پائی جاتی ہیں جو غور کرنے سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ ان شاء کے علاوہ املا میں بھی اس زمانے کی تحریروں کے خلاف بعض صورتیں نظر آتی ہیں۔ کرتا کی جگہ کہتا، مانگتا کے عوض سنگتا۔ کبھی بھائی کی - انکھیں مترادف آگے - کوایا بمقابلہ کہا یا کہا کیا وغیرہ -" (۱)

دوسرا دور:

شمالی ہند میں جو کتاب عام طور پر اب تک افضلیت و اولیت کا حق رکھتی ہے وہ فضل علی فضلی کی "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" ہے - جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس کے بعد اگر کوئی قدیم نثری نمونہ ملتا ہے تو وہ سودا کا دیباچہ ہے جو اس نے آغاز کلیات میں لکھا ہے - اسی ذیل میں خاندان شاہ ولی اللہ کے ترجمہ قرآن پاک آتے ہیں۔ آپ کے صاحب زادے شاہ رفیع الدین (۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ع) نے کلام پاک کا اردو میں ترجمہ کیا - ان کے بھائی شاہ عبدالقادر نے بھی (۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ع)

---

(۱) احسن مارہروی، مولانا، "تاریخ نثر اردو"، ص ۵۵-۵۳

میں ترجمہ کیا جو شاہ رفیع الدین کے ترجمہ سے زیادہ سلیس اور بہتر ہے ۔

ترجمہ ہائے قرآن کے علاوہ کچھ داستانی ادب بھی پایا جاتا ہے لیکن قابل ذکر کتاب میر عطا حسین تحسین کی " نو طرز مرصّع " ہے ۔

فورٹ ولیم کالج :

اردو کے نثری دور کا روشن زمانہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا زمانہ ہے ۔

فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرائسٹ اردو کے بڑے حامی و ماہر تھے وہ اس عہدے پر فائز ہونے سے کئی سال قبل سے اردو کی خدمات انجام دے رہے تھے ۔ انھوں نے کالج میں تصنیف و تالیف کا محکمہ قائم کیا اور اردو کے تمام اچھے نثر نگاروں کو جمع کردیا ۔ انھوں نے خود بھی کتابیں لکھیں اور دوسرے اہل قلم حضرات سے بھی کتابیں لکھوائیں ۔ انھوں نے اردو کو عام فہم بنانے کے لیے سلیس اردو میں کتابیں لکھوائیں ۔ اس طرح ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی سرپرستی و کوشش سے اس زمانے میں ایسا اردو ادب پیدا ہوگیا جو آج تک اردو میں اپنی نوعیت کا بے نظیر و یادگار تسلیم کیا جاتا ہے ۔ چناں چہ میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس ، میر بہادر علی حسینی، سید حیدر بخش حیدری، خلیل علی خان اشک، مرزا علی لطف ، شیخ حفیظ الدین ، نہال چند لاہوری، مظہر علی ولا ، مرزا کاظم علی جوان، بینی نرائن جہاں، وغیرہ نے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی زیر ہدایت مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں مثلاً " باغ و بہار" (میر امن) ، " آرائش محفل"، " طوطا کہانی" (حیدر بخش حیدری) ، " باغ اردو" (میر شیر علی افسوس) ، " گلشن ہند" (مرزا علی لطف) ، نثر بے نظیر، اخلاق ہندی" (میر بہادر علی حسینی) ، " ہفت گلشن" (مظہر علی ولا) ، " داستان امیر حمزہ" (خلیل علی خاں اشک) ، " چار گلشن" (بینی نرائن جہاں) ،

" خرد افروز" (شیخ حفیظ الدین) ، " اخوان الصفاء " (اکرام علی) -

فورٹ ولیم کالج کی خدمات :

جس زمانے میں فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا اسی زمانے میں کالج کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اہل زبان اور اصحاب علم و فن ذاتی طور پر اردو نثر کی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے- جن میں دہلی ، آگرہ اور لکھنؤ کے اصحاب علم و ادب پیش پیش تھے- جو اردو کے فروغ و ارتقا کے لیے مسلسل کوششیں کر رہے تھے - لیکن وہ مصنفین جو کالج سے منسلک تھے ان کو طباعت و اشاعت کی سہولتیں میسر نہیں تھیں کہ کالج میں دارالترجمہ کے ساتھ مطبع بھی قائم ہوگیا تھا اور ۱۸۰۲ء سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا- لیکن فورٹ ولیم کالج سے باہر طباعت و اشاعت کا سلسلہ دہلی میں ۱۸۳۷ء سے ہوا- اس سبب سے دہلی، آگرہ و لکھنؤ وغیرہ میں قیام کالج سے پہلے یا زمانۂ کالج میں یا اس سے کچھ عرصے بعد تک جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں وہ مشہور عام نہ ہوسکیں - مولانا قادری نے تحقیق کے بعد ایسے بیشتر مصنفین کی تصانیف کا ذکر " داستان تاریخ اردو" میں کیا ہے -

اس طرح کالج کے قیام سے قبل کلکتے اور دوسرے شہروں میں اردو تصانیف نثر کا سلسلہ تو جاری تھا مگر کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہ تھی- باقاعدہ اور منظم طور پر اردو نثر نگاری کا آغاز فورٹ ولیم کالج ہی نے کیا-

فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حامد حسین قادری " داستان تاریخ اردو میں رقم طراز ہیں :

"۱- کالج کے منتظمین نے سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کرکے کام شروع کیا- یہ گویا پہلا علمی اور ادبی ادارہ یا ندوہ تھا-

۲- اردو ٹائپ کا پہلا مطبع اسی کالج کی طرف سے قائم کیا گیا - اور بعض کتابیں خاص حسن و خوبی کے ساتھ شائع کی گئیں -

۳- کالج کی یہ خدمات کم و بیش بیس برس جاری رہیں۔ اس عرصے میں اٹھارہ مصنفوں نے پچاس کتابیں اردو میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کیں۔ اس زمانے میں (۱۸۰۱ع سے ۱۸۲۰ع تک) فورٹ ولیم کالج سے باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اردو کی مشکل سے لکھی گئی ہوں گی - اور جتنی لکھی گئیں ان میں سے اکثر کو آج تک چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

۴- بیرون کالج کی کوئی تصنیف زبان و محاورے کی سلاست اور اسلوب بیان کی دل کشی میں میر امن ، حیدری ، اکرام علی وغیرہ کی کتابوں سے بہتر اور داستان امیر حمزہ و اخوان الصفا سے زیادہ ضخیم نہیں ہے -

۵- کالج کی تالیفات میں مختلف ضروری ، مفید اور دل چسپ موضوع کی کتابیں شامل ہیں۔ یعنی فسانہ ، تذکرہ ، صرف و نحو ، تاریخ ، اخلاق ، فقہ اسلام ، ترجمہ قرآن مجید ، ترجمہ انجیل مقدس -

۶- سب سے بڑی خدمت اس کالج کی یہ ہے کہ سلیس نثر نگاری کی شاہ راہ قائم کردی۔ اگر یہ محکمہ جاری نہ ہوتا تو بھی ارباب علم و ادب اس رستے پر آتے ، لیکن دیر لگتی ۔ ان کتابوں کا نمونہ موجود ہونے پر بھی لوگوں نے اس طرف کم توجہ کی اور بہت آہستہ آہستہ اس راہ پر آئے -"(۱)

نثر اردو کا متوسط دور :

فورٹ ولیم کالج نے سلیس اردو میں نثری ادب کی بنیاد ڈال دی تھی۔ لیکن نثری ادب کی ترویج و ترقی میں اہل کلکتہ کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے - فقیر محمد خان گویا (متوفی ، ۱۸۵۰-۱۲۲۶ھ) نے "انوار سہیلی" کا ترجمہ " بستان حکمت " کے نام سے ۱۲۵۱ھ میں کیا جو نول کشور پریس سے شائع ہوا- (۲) مرزا رجب علی بیگ سرور کی " فسانہ عجائب " مقفی اور مسجع نثر کا اچھا نمونہ ہے - مفتی صدرالدین آزردہ ، امام بخش صہبائی ، ماسٹر رام چندر ، آغا امانت لکھنوی وغیرہ نے مختلف موضوعات پر مختلف کتابیں

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " داستان تاریخ اردو" ، محولہ بالا ، ص: ۱۲۱-۱۲۲

(۲) عسکری ، مرزا محمد (مترجم) " تاریخ ادب اردو" ، از رام بابو سکسینہ ، لاہور : منظور پرنٹنگ پریس ، س ن ، ص: ۲۶۳

تحریر کیں لیکن اس دور کی عہد آفریں شخصیت مرزا غالب ہیں - نثر میں ان کے خطوط سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں غالب کے رشتے کے بھتیجے خواجہ امان دہلوی نے " بوستان خیال" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا۔ پہلی جلد کا نام " حدائق الانظار" اور دوسری کا " ریاض الابصار" رکھا اس کی پہلی جلد کا دیباچہ مرزا غالب ہی نے لکھا تھا۔ (۱) خواجہ امان نے اگرچہ تمہید میں مقفی عبارت لکھی ہے اور عربی و فارسی سے بھی کام لیا ہے لیکن اصل داستان بہت سادہ و سلیس ہے - اس کے علاوہ مولوی غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث بے خبر اور بعض دکنی مصنفین نے بھی نثر ادب میں اضافہ کیا۔

عہد سرسید :

جدید اردو نثر کا اصل دور سرسید سے شروع ہوتا ہے - سرسید ایک ہمہ گیر تحریک لے کر اٹھے - وہ ادب و معاشرت اور تعلیم و تمدن کے ہر شعبے پر چھاگئے - بعض شعبوں کو انھوں نے براہ راست متاثر کیا۔ اور بعض پر اپنے رفقائے کار کے ذریعہ بڑے پائے دار اثرات مرتب کئے - سرسید کی خدمات اور طرز تحریر پر بہترین تبصرہ " داستان تاریخ اردو" میں مولانا قادری نے یوں کیا ہے :

" سرسید کی تحریر میں زبان و محاورے کی لطافت ، بیان کی سادگی و صفائی ، استعارے و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال و بے ساختگی ، بیان کا جوش طرز اداکی روانی ، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت و ظرافت اس قدر کثرت ، صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان سے پہلے کہیں نہ تھی ان کے ساتھیوں نے ان سے بہتر نہ تھی، اور ان کے ہم زمانہ لوگوں میں اکثر انہیں کے اتباع کی بدولت تھی۔ سرسید پیچیدہ سیاسی مسائل، باریک مذہبی نکات اور دشوار اصلاحی مباحث کو نہایت صفائی ، سادگی، بے تکلفی اور زور و قوت کے ساتھ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا؛ داستان تاریخ اردو"، محولۂ بالا، ص ۲۶۶

بیان کرسکتے تھے ان کی برجستہ تقریروں اور قلم برداشتہ تحریروں میں بھی وہی انداز پیدا ہے - جو غور و فکر سے لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین میں ہے - حسب موقع اسلوب بیان اختیار کرنا، شوخی و سنجیدگی سے برمحل کام لینا، جذب و اثر پیدا کرنا ان کے لیے بالکل فطری وطبعی بات تھی کسی خاص کوشش و ارادے کو دخل نہ تھا۔ گویا ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اور صحیح انداز خود بخود پیدا ہو جاتا تھا۔ جن الفاظ و محاورات کے بولنے کی ان کو عادت تھی بے تکلف ان کو استعمال کردیتے تھے، یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اہل زبان یا اہل دہلی کیا اور کس طرح بولتے ہیں۔ دقیق علمی، فلسفیانہ، سائنٹفک، تنقیدی مضامین اس قدر سلجھاکر بیان کرتے تھے کہ اس فن میں گویا ان کا اولیت حاصل تھی۔ بعض مضامین میں علمائے یورپ کے فکر و رائے پر تنقید و تبصرہ کیا ہے - فضلائے عرب و عجم کی تحقیق پر نقد و نظر کی ہے، اپنے زمانے کے اہل قلم اور اپنے مخالفوں کے مباحث کی تنقیح کی ہے - خود سرسید کی تصانیف میں تاریخ و سیرت، مذہب و اخلاق، سیاست و حکمت وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔ ہرجگہ سرسید کا جوش بیان اور زور قلم نمایاں ہیں۔ اور انھوں نے اردو زبان میں ہرقسم کے مضامین ادا کرنے کی قابلیت ثابت کردی ہے - جہاں ان کو اصابت رائے حاصل نہیں ہے وہاں بھی ان کا خلوص و دل سوزی ناقابل انکار ہے -

مزاح و ظرافت سرسید کا فطری رنگ تھا لیکن یہ موقع و محل پر صرف ہوتا تھا۔ خصوصاً پرائیویٹ خطوط میں یا مخالفوں کے مباحثے میں اس رنگ کی شوخی نہایت دل چسپ اور کارگر ہے - جذب و اثر پیدا کرنے کے موقع پر کوشش وجانفشانی قوت ان کے اندر کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔"(۱)

یہ دور اردو نثر کی ترقی اور ترویج کا دور ہے - اس عہد میں زبان کی ترقی و ترویج نہ صرف لسانی اعتبار سے ہوئی بلکہ موضوعات کے اعتبار سے بھی بیش بہا خزینوں کا

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا؛ "داستان تاریخ اردو" محولہ بالا، صص ۲۱-۳۳۹

اضافہ ہوا ۔ وہ زبان جو اب تک بیشتر اخلاق ، مذہب ، تصوف اور قصص و حکایات کا ذریعہ اظہار رہی تھی اب فلسفہ و منطق ، طب و حکمت ، علم الاعضا و علم الابدان، مدنیت و شہریت ، طبیعیات و ارضیات اور دوسرے بیشتر جدید علوم و فنون کے اظہار کا ذریعہ بن گئی اور اس طرح اس کے انداز بیان میں لچک لغات میں وسعت اور طرز ادا میں واقعیت کا انداز پیدا ہوا۔

غالب کے خطوط اور سرسید کی نثری کاوشوں نے آنے والے ادیبوں کی راہ ہموار کردی تھی۔ اس دور کے مشاہیر ادب میں نواب محسن الملک ، نواب وقارالملک اور مولوی چراغ علی وغیرہ ہیں ۔ یہ اصحاب سرسید ہی کے حلقۂ اثر سے متعلق ہیں۔

نثر کا چھٹا دور:

نثر کا چھٹا دور جنگ آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اصل میں سرسید اور ان کے رفقاء بھی اسی چھٹے دور کے صف اول میں سمجھے جانے چاہئیں لیکن چوں کہ ان اصحاب کا طرز تحریر مقصدی اور افادی نوعیت کا تھا اور بقول مولانا قادری کے :" زبان و بیان کے لحاظ سے اور ایجاد و اسالیب کے اعتبار سے ان تمام مصنفوں میں بجز سرسید کے ، کسی کا کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے ۔ طرز قدیم کا اثر سب میں ہے ، کہیں قافیہ بندی کی حد تک ، کہیں الفاظ کی بے ترتیبی اور زبان و محاورے کی بے پروائی کی صورت میں ۔ ان میں سے کوئی مصنف صاحب طرز نہیں کہا جاسکتا ۔" (۱)

اس سبب سے چھٹے دور کو محمد حسین آزاد سے شروع کرنا مناسب ہے ۔ آزاد ، ذکا اللہ ، نذیر احمد ، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور ان کے بعد آنے والے ادیبوں نے اردو نثر کی عمارت کو اوج ثریا تک پہنچادیا۔ علم کلام، تاریخ ، نقد شعر و ادب ،

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا ؛ داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۷-۳۲۶

ناول ، انشائیہ ، غرض کوئی باب ایسا باقی نہ رہا جس میں یہ بزرگ اپنا نقش دوام ثبت نہ کرگئے ہوں۔

غرض یہ کہ اس طرح اردو نثر اپنے موضوع کے اعتبار سا پنی تخلیقی قوت کے لحاظ سے اور اظہار مدعا کی گہرائی کے اعتبار سے دنیا کی بہترین زبانوں کے ہم پلّہ ہوگئی ۔ اسی دور کے پس منظر میں ہمیں مولانا قادری کے نثری کارناموں اور ادبی مرتبے کا جائزہ لینا ہے۔ اسی لیے ہمارے اس باب کے پس منظر کے طور پر اردو کی ترقی و اشاعت کا یہ دور کافی ہے۔

مولانا قادری کی کاوشوں کا سب سے بڑا کارنامہ اور ثبت دوام پانے والا نقش " داستان تاریخ اردو" ہے ۔ داستان پہلی بار ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی آج اسے شایع ہوئے کم و بیش سینتیس (۳۷) برس ہوچکے ہیں۔ اگرچہ اس عرصے میں ہندوستان و پاکستان میں اردو ادب کی متعدد " تاریخیں شائع ہوچکی ہیں لیکن مولانا کی" داستان تاریخ اردو" اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اب بھی منفرد ہے ۔

" داستان تاریخ اردو" پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی جو اور تواریخ ادب مرتّب ہوئیں و مقبول تھیں ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور ان کا مقابلہ بھی کیا جائے ۔ یہ کام بہتر سے بہتر سید محمود رضوی اکبر آبادی نے اپنی کتاب " صحیفہ اردو" کے دیباچے میں کردیا ہے ۔ چوں کہ ان کتابوں کا اس تفصیل سے جائزہ اب تک کہیں اور پیش نہیں کیا گیا اور مخمور اکبر آبادی صاحب کی یہ کتاب سہل الحصول بھی نہیں اس لیے افادہ کی خاطر اس کے تقابلی مطالعے کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں ۔ مخمور اکبر آبادی لکھتے ہیں :

" اب میں اردو زبان اور ادب کی ان چند تاریخوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو بیسویں صدی میں مرتب ہوئی ہیں اور جن کی زبان بھی اردو

ہے - یہ دو قسم کی ہیں :

۱- وہ جو ادب کا پرانا ذوق رکھنے والوں نے ،" آب حیات" کی طرح انیسویں صدی کے پس منظر میں لکھی ہیں۔

۲- وہ جو جدید مغربی تنقید کے نظریوں سے روشناس نئی حضرات نے مغربی انداز پر مرتب کی ہیں۔

ان دونوں قسموں کے زاویۂ نظر اور لب و لہجے میں بڑا فرق ہے - پہلی قسم میں " گل رعنا" (۱۹۲۰ء) مصنفہ مولوی عبدالحی اور شعر الہند (۱۹۳۹ء) مصنفہ مولوی عبدالسلام اور دوسری میں ،" تاریخ نظم و نثر اردو" (۱۹۳۳ء) مرتبہ آغا محمد باقر صاحب اور " مختصر تاریخ ادب" (۱۹۳۰ء) مرتبہ سید اعجاز حسین صاحب ، میرے پیش نظر ہیں - پہلے میں پہلی قسم سے بحث کروں گا اور بعد کو دوسری قسم کا جائزہ لوں گا -

" گل رعنا" اور " شعر الہند" دونوں ضخیم کتابیں ہیں - ان میں تاریخی مواد معتد بہ مقدار میں میسر آتا ہے مگر تنقیدی مواد بہت کم ہے - لیکن تاریخی مواد کی ترتیب و تدوین میں کوئی بنیادی اصول مد نظر نہیں رکھا گیا۔ موضوعات اور ادوار کی تقسیم بے ربط اور بے محل ہے - شعرا کے ذہنی اور طبعی امتیازات نمایاں کرنے اور ایک استاد کے خصوصیات کو دوسرے سے ممیز کرنے کی کوشش نہیں کی گئی - فطرت کے اجزاء کے تجزیے اور انفرادیت کے لوازم کی تحلیل کی طرف قدم نہیں بڑھایا گیا - ساری بیانات ہم رنگ اور ساری تنقیدیں ہم آہنگ ہیں۔ دونوں مصنفوں کی ضخامت ، کلام کے نمونوں کی مرہون منت ہے - ان کتابوں کو تاریخ و تنقید کی بجائے کلام کے نمونوں کے گلدستے کہنا زیادہ مناسب ہے - ان دونوں تصانیف کے سطحی و سرسری مطالعے سے حسب ذیل باتیں جلب توجہ کرتی ہیں :

۱- دونوں ادیبوں کا انداز بیان ، لب و لہجہ اور نقطۂ نظر یکساں ہے -

۲- دونوں کو صداقت اور فن کاری کے مقابلے میں وجاہت اور تصرف سے زیادہ شغف ہے -

۳- دونوں نے شعرا کے کلام کو داخلی محاسن کی بنا پر نہیں بلکہ خارجی معیارات کی مدد سے پرکھا ہے -

۴- " گل رعنا" میں ، " آبِ حیات" کے اسلوب بیان کی نقالی کی کوشش کی گئی ہے مگر کہیں کام یابی نہیں ہوئی - نقل ہرجگہ بھونڈی نقالی

ہوکر رہ گئی ہے اور بس -

۵- " گل رعنا" کے مصنف کو مرزا جان جاناں مظہر اور اس کے شاگردوں سے خاص عقیدت ہے - اس نے اس گروہ کی صوفیانہ عظمت اور وجاہت کی تبلیغ کی بڑی کوشش کی ہے - شعر کے کیف و اثر کی جگہ ، شاعر کی روحانی بزرگی اور کلام پر نقد کی جگہ ، مریدوں کی بیعت کا ذکر کیا ہے -

۶- تصوف کے اور بیعت کے افسانوں کے علاوہ " گل رعنا" کے مصنف کا ذہن " برابر" اور " بہتر" کے مذموم دائرے سے باہر نہیں نکلتا - وہ متقدم کو معیار قرار دے کر چلتا ہے اور متاخر کو اس کے برابر یا اس سے بہتر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے - اس کے علاوہ ، تصوف کے جس سلسلے سے اس کو محبت اور عقیدت ہے ، اس کو اور اس کے مریدوں کو بڑھاتا کا چڑھاتا اور دوسروں کو گرانے کی کوشش کرتا ہے - وہ فطرت ، انفرادیت ، نفس کے محرکات اور ذہن کے تدریجی ارتقا پر نظر ڈالنے کی سعی نہیں کرتا - اس کے بیان کی یک لہجگی وبال جان ہوکر رہ جاتی ہے -

۷- " شعرالہند" کی تمام تنقیدیں روایتی ، سطحی اور نامکمل ہیں - ان کو تنقید کی جگہ تحسین کہنا زیادہ مناسب ہے - مغز اور انداز بیان کی فرسودگی و یک لہجگی میں ، وہ ان تذکروں سے ہرگز جدا نہیں جو انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں نول کشور پریس کی ہر مطبوعہ کتاب کا جزو لاینفک سمجھی جاتی تھیں -

۸- دونوں تصانیف کے بیان میں وہ چستی ، گٹھاوٗ اور دلائل میں وہ دل نشینی ، قوت اور استحکام نہیں جو ایک پر مغز ادبی تصنیف اور تنقیدی صحیفے کے شایان شان ہو - جگہ جگہ عبارت ڈھیلی ڈھالی اور سست ، بوجھل اور ثقیل ، بے ربط اور ناہموار ہے - " گل رعنا" میں خصوصیت کے ساتھ روابط اور ضمائر کی بڑی کمی ہے - بار بار فاعل کو بے ضرورت فقرے سے حذف کردیا گیا ہے جو بے حد گراں گزرتا ہے - ان خامیوں کے علاوہ " گل رعنا" میں عبارت کے ایسے نمونے بہ کثرت نظر آتے ہیں جو ایک ادبی تصنیف میں معیوب سمجھے جانے چاہئیں - بعض مقامات نمونے کے طور پر

پیش ہیں :

" رفتہ رفتہ ملکی زبان میں جو نہ خالص ہندی بلکہ عربی اور فارسی الفاظ کے امتزاج سے ایک نئی زبان ہوگئی تھی طبع آزمائی کرنے کا شوق عام ہوگیا اور بڑھتا گیا ، یہاں تک کہ فارسی بحروں میں کہنے لگے۔"

(ص ۲۳)

اس عبارت میں " طبع آزمائی " کے بعد " کرنے" حشو ہے - دوسرے یہ پتا نہیں چلتا کہ " کہنے لگے" کا فاعل کون ہے -

" قزلباش خان امید اسی زمانے کے بڑے نامور شاعر ہیں اور اہل ہند کے کے ساتھ ان کے جلسوں کی گرم جوشیاں مشہور ہیں"۔(صفحہ ۲۹)

اس عبارت میں " جلسوں کی گرم جوشیاں" اس کتاب کی اختراع فاقہ ہے -" گرم جوشی" افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے - جلسے اور " جلسوں " کے لیے اس کا استعمال محاورے کے خلاف ہے -

" اور بجائے اس کے کہ پہلے سے زبان میں زیادہ شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوتی زیادہ ثقیل ہوگئی۔" (ص ۲۳)

یہاں صاف نظر آتا ہے کہ " پہلے سے " کو " زبان میں" کے بعد لایا جاتا تو ایسی بد نما تعقید نہ پیدا ہوتی ، جو اب پیدا ہوگئی ہے - اس کے علاوہ" ثقیل ہوگئی۔" کا فاعل بھی بے جا طور پر حذف کردیا گیا ہے - یہ عبارت اس طرح ہوتی تو اتنی بدنما نہ رہتی اور کدبی تصنیف کے شایاں شان بھی ہوتی -

" مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق اختر نے بھی لکھنو میں مستقل سکونت اختیار کرلی غرض کہ لکھنو میں دلی کی سبھا بھی کی بھی اٹھ کر آگئی -"(ص ۳۲۸-۲۹)

اس عبارت کا بھونڈا پن قسم کھانے کے قابل ہے - فقرے میں" دلی کی سبھا" کا ذکر ہے اس لیے یہی فاعل ہے اور قاعدے کی رو سے فقرے میں فاعل ہی پہلے آنا چاہئے اس لیے یہ عبارت اگر یوں ہوتی تو صحیح ہوتی :

" غرض کہ دلی کی سبھا بھی کی بھی کچھ اٹھ کر لکھنو میں آگئی -"

" لکھنو کا پرستان اٹھ کر مٹیا برج آ پہونچا۔ بادشاہ نے دل بہلانے کو زندہ جانوروں کا خصوصاً سانپوں کا ایسا ایک چڑیا خانہ بنایا کہ شاید دنیا میں اس کا کہیں جواب نہ ہوگا۔" (ص ۳۸۱)

اس عبارت میں "سادگی کا جڑوا خادہ " ایسا ادبی نادرہ ہے جو مولانا کے حصے کی جدت اور داد سے مستثنیٰ ہے - یہ ترکیب بیسویں صدی کی غالباً بہترین اختراع ہے -" " شب لیلۃ القدر" اور " لب دریا کے کنارے" اردو کے مشہور مگر پرانے جملے ہیں۔ پنجاب میں " لوہے کا آہنی سبت" گوالیار میں" محشیوں کی مردم شماری" اور بمبئی میں" کشتیوں کی کشتی دنو " اس زمانے میں وضع ہوئے - مولانا کا کرم ہے کہ انھوں نے اس فہرست میں ایک اور لسانی اعجوبے کا اضافہ کیا۔

عبارت کی خامیوں سے قطع نظر " گل رعنا" میں بہت سی داخلی خوبیاں بھی موجود ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ضروری ہے - سب سے نمایاں یہ ہے کہ اپنی مقدم تاریخوں کے مقابلے میں ، یہ کتاب، معتدبہ تاریخی مواد کی حامل ہے - اور یہ مواد نہ صرف مقدار میں مقابلتاً کثیر ہے بلکہ صحت و سند میں بھی بہ مراتب بلند ہے - اس تصنیف کی مدد سے بہت سی غلط روایتیں ، جنھوں نے بے حد شہرت و مقبولیت حاصل کرلی تھی ، باطل ہوکر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے میر کو اس کے صحیح حالات و واقعات کی روشنی میں پیش کیا ہے - اس کے دامن سے وہ سارے دھبے دھودیے ہیں جو " آب حیات" کے مصنف نے خواہ مخواہ اس کے سر تھوپ دیئے تھے۔ اس کتاب کے بعض تبصرے بھی بصیرت افروز ہیں۔ مثلاً مرثیے پر اس کا تبصرہ مغز و معنی کے اعتبار سے اہم اور صداقت و اصابت کے لحاظ سے پر وزن ہے - صفحہ ۵۲۱ پر درج ہے :

" مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اتنی بات صاف کہنی چاہئے کہ حضرات اہل بیت اطہار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی اصلی شان دکھانے میں مرثیہ گویوں نے بڑی کمی کی ہے ، اکثر رفقار و ثبات کی جزع و فزع و اضطراب تک پہنچا دیا ہے - پس بعض کی شان اس پیرایے میں لکھی ہے ، جس سے معلوم ہو کہ یہ نہایت بزدل اور خوف زدہ دکھ کی ماری ہستی محو نوحہ و بکا ہے ، حالاں کہ وہ پاک بزرگ ، ان کم زوریوں سے بہرحال دور تھے، مدعا عوام کو رلانا ، تڑپانا تھا ، اس نے مراثی کا پایۂ بیت پست کردیا ہے، شاعری میں جان پڑی ہو مگر اخلاقی ومذہبی پہلو مفلوج ہوکر رہ گیا ، شہادت نامہ خواہ کتنا ہی موثر ہوگیا مگر وقائع نگاری کا خون ہوگیا۔"

ان الفاظ میں مرثیے کی اخلاقی و نفسیاتی قدر کا جائزہ لیا گیا ہے - مذہب کو

تنگ نظر سے دیکھنے والے افراد ، کہتے ہی کہیں مگر حقیقت و واقعیت کو دیانت کے کانٹے میں تولنے والے، تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اعتراض اپنی جگہ اٹل ہے - ان خارجی اسباب و ذرائع سے ، جو محض رونے رلانے کے لیے مرثیہ میں بہم کیے گئے ہیں نہ صرف کربلا کے حادثے کے بعض پہلوؤں کا تناظر غلط ہوجاتا ہے ، بلکہ خود حادثے کی اہمیت میں بھی فرق پڑتا ہے - بعض کردار اس جذب و اثر سے معری ہوجاتے ہیں جو ان کا فطری لازمہ ہے - یہ زاویۂ نظر حقیقت اور تاریخ دونوں کے منافی ہے اور ذہن میں غلط کیفیت پیدا کرتا ہے - جناب سرور کائنات کے گھرانے کی بہو ، بیٹیاں جو فی نفسہ صبر و استقلال ، جرات و استقامت کا نمونہ ہیں ، گریہ و بکا کی شدت اور نالہ و شیون کی کثرت کے باعث وقار سے محروم نظر آنے لگتی ہیں- ان کی ذات ، اس ضبط و جلال سے خالی ہوکر رہ جاتی ہے جس کا اعلا ترین مظاہرہ کربلا کے مصائب و نوائب کے دوران میں ہوا- یہ مفروضات نہ صرف اس بے پایان ایثار کی اہمیت میں کمی کردیتے ہیں جو ان ہستیوں نے کربلا کی امتحان گاہ میں بہ خندہ پیشانی کیا بلکہ ان کا اعادہ ، اس عظمت و شان سے بے آہنگ بھی ہوکر رہ جاتا ہے جو خود مرثیے میں ، ان ذاتوں سے منسوب کی گئی ہے - واقعیت کے بطلان کے علاوہ یہ آرٹ کی بھی کھلی غلطی ہے - ان حالات میں مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کربلا کی مرقع کشی کے وقت لکھنؤ کے دور انحطاط کی خاتون ہر وقت مرثیہ گویوں کے پیش نظر رہی -

" شعر الہند "کی عبارت اور انداز بیان کڑ کل رہتا" پر بہ درجہا فوقیت ہے - اس میں بہرحال عبارت کے ایسے ناقص نمونے نظر نہیں آتے، جنھیں مثال کے طور پر مجبوراً پیش کرنا پڑے - "

" تاریخ نظم و نثر اردو" اور " مختصر تاریخ ادب " دونوں مقابلتاً مختصر ہیں-

یہ دونوں کتابیں سکسینہ صاحب کی فاضلانہ تصنیف سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہیں- " تاریخ نظم و نثر " کے مطالعے سے حسب ذیل باتیں مترشح ہوتی ہیں :

۱- اس کا دیباچہ پڑھ کر پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ مصنف نے تاریخ ادب اردو کو موضوع کی حیثیت سے خلاصہ کرکے" تاریخ نظم و نثر اردو" کے اوراق پر پیش کیا ہے - اس اثر کے وجوہ حسب ذیل ہیں :

(الف) دیباچے کی ابتدا میں ذو معنی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو خود موضوع اور سکسینہ صاحب کی تصنیف دونوں پر بہ یک وقت صادق آتے ہیں۔

(ب) سکسینہ صاحب کی کتاب کا نام " تاریخ ادب اردو" ہے اور آغا صاحب نے بدل کر ، اپنی کتاب کا نام " تاریخ نظم و نثر اردو" رکھا ہے - ناموں کے اختلاف سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مختلف ہیں۔ ایک کتاب کو دوسری سے کوئی علاقہ نہیں ہے -

(ج) کتاب کے سر ورق یا دیباچے میں کھل کر کہیں یہ اعتراف نہیں کیا گیا کہ " تاریخ نظم و نثر اردو" ، " تاریخ ادب اردو" مصنفہ سکسینہ کا ترجمہ ہے -

(د) " تاریخ نظم و نثر اردو" کے دیباچے کے دوسرے صفحے پر " ہسٹری آف لٹریچر" کے عنوان سے ایک پارہ لکھا گیا ہے ، جس میں سکسینہ صاحب اور ان کی تصنیف کی داد دی گئی ہے مگر یہاں بھی یہ اعتراف نہیں کیا گیا کہ" تاریخ نظم و نثر اردو" اسی تصنیف کا خلاصہ یا ترجمہ ہے -

۲- یہاں اس کتاب کے مؤلف یا مترجم کو کسی بات کے چھپانے کا الزام دینا مقصود نہیں ، صرف یہ بتانا ہے کہ یہ کتاب سکسینہ صاحب کی تصنیف کی آواز باز گشت ہے اور بس -

۳- یہ کتاب خلاصہ کہہ کر پیش کی گئی ہے مگر ترجمہ معلوم ہوتی ہے - خلاصے اور ترجمے میں بہرحال بڑا فرق ہے - خلاصہ اپنی زبان میں ہوتا ہے اور ترجمہ اصل کی ہوبہو تصویر - مصدر کے الفاظ ترجمے کی زبان میں دہرادیے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں اصل کا بجنسہٖ پورا التزام باقی ہے اور ترجمے کےسارے لوازم موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں :

(الف) سکسینہ صاحب کی کتاب میں انیس باب ہیں اور آغا صاحب نے بھی
اپنے ابواب کی تعداد اسی عدد پر ختم کی ہے -

(ب) سکسینہ صاحب نے اپنے ابواب کے جو نام رکھے ہیں ، بغیر کسی اختلاف کے
اسی ترتیب کے ساتھ آغا صاحب نے بھی وہی قائم رکھے ہیں مثال کے طور پر—

(اول) سکسینہ صاحب کے دسویں باب کا نام " ایلجی اور ایلجی رائٹرز"
ہے ، آغا صاحب کے دسویں باب کا نام مرثیہ اور مرثیہ گو ہے -"

(دوم) گیارھویں کا نام سکسینہ صاحب نے " اسٹریگلرس — نظیر اکبر آبادی
اور نصیر دہلوی" رکھا ہے - آغا صاحب " اسٹریگلرس (بے راہ رو)
کا ترجمہ بہم نہ کرسکے - ان کے اس باب کا نام " نظیر اکبرآبادی
اور نصیر دہلوی" ہے -

(سوم) سکسینہ صاحب نے انیس میں سے چودہ باب نظم کے لیے مخصوص
کیے ہیں اور اتنے ہی آغا صاحب نے ، اس صنف ادب کے لیے وقف
فرمائے ہیں - بقیہ پانچ میں سکسینہ صاحب نے نثر کی ترقی کا ذکر
کیا ہے اور بجنسبہ یہی آغا صاحب نے بھی پسند فرمایا ہے -

(چہارم) سکسینہ صاحب کا اٹھارواں باب اردو ڈرامے سے بحث کرتا ہے
اور آغا صاحب کا بھی یہ باب اسی نام سے ، اسی موضوع سے
متعلق ہے -

(پنجم) ابواب کی تقسیم اور وجہ تسمیہ کے علاوہ ، ابواب کے داخلی پاروںکے
نام بھی سکسینہ اور آغا صاحب کے یہاں یکساں ہیں-

۳- خلاصہ کرنے والوں کے لیے مصنف کی خامیوں کا اتباع لازمی نہیں مگر مترجم کے لیے

از بس لازمی ہے - مثلاً یہ کہ اگر صحت سے کوئی شخصیت سہواً نظر انداز ہوجائے تو خلاصہ کرنے والے کے لیے اس کا اضافہ حرام نہیں ہے - اس کو محذوفات کے اضافے کا ہر وقت حق حاصل ہے - لیکن جو مشاہیر مثلاً نواب مرزا شوق ، بیان و یزدانی ، مضطر خیرآبادی، اور شوق قدوائی سکسینہ صاحب سے سہواً نظر انداز ہوئے ہیں وہ آغا صاحب کو بھی یاد نہیں آئے اس طرح انھوں نے خلاصہ کرنے والے کی جگہ مترجم کا اسوۂ حسنہ اختیار کیا ہے -

۵- اس کتاب میں جو واقعات ، رائیں اور تنقیدیں ہیں وہ سب کی سب ، سکسینہ صاحب کی رائے سے تمام و کمال مطابقت رکھتی ہیں-

ڈاکٹر اعجاز حسین کی مشہور تصنیف "مختصر تاریخ ادب اردو" کے متعلق مخمورؔاکبرآبادی لکھتے ہیں :

"مختصر تاریخ ادب اردو" کے مطالعے سے حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

۱- مختصر تاریخوں کے باب میں اعجاز صاحب نے سکسینہ صاحب کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ہے اور ترتیب و التزام میں اس حد تک استفادہ کیا ہے جس کا جواز بہ مشکل میسر آسکتا ہے - مثال کے طور پر ـــــ

(الف) جہاں سکسینہ صاحب کو ولادت یا وفات کی تاریخ میسر نہیں آئی وہاں اعجاز صاحب کے یہاں بھی ناپید ہے -

(ب) جہاں سکسینہ صاحب نے ایک ہی بیان میں کبھی ہجری اور کبھی عیسوی تاریخ درج کی ہے وہاں اعجاز صاحب نے بھی یہی التزام قائم رکھا ہے -

(ج) جہاں سکسینہ صاحب نے محض ہجری تاریخ پر اکتفا کی ہے وہاں اعجاز صاحب نے بھی صرف اسی پر قناعت فرمائی ہے -

(د) اس قسم کی خامیاں فروگذاشتیں اور ناهمواریاں کہ ساڈل کی ولادت کی تاریخ ندارد اور یاس و یگانہ کی ولادت کی تاریخ ھجری اور کلکتے جانے کی عیسوی بہ کثرت موجود ھیں۔ ولادت کی تاریخ جو کلکتے کے سفر کی تاریخ سے اھم تر ھے ، اگر عیسوی سے مطابق کرکے پیش کی جاتی تو مفید ھوتی۔ ان معائب اور سہل انگاریوں کو دیکھ کر حیرت ھوتی ھے -

(ھ) جن شاعروں یا ادیبوں کا ذکر سکینہ صاحب کے یہاں ممکن نہ تھا ، یعنی جو " تاریخ ادب اردو" کی اشاعت کے بعد معروف ھوئے ، ان کی کوئی تاریخ اعجاز صاحب نے درج نہیں کی -

۲- مورخ کو وسعت نظر اور بے تعصبی کے علاوہ شدہ حافظہ بھی درکار ھے - حافظے کی کمزوری اکثر بدنما نقائص پیدا کردیتی ھے - چناں چہ اس کتاب میں سعادت یارخان رنگیں جیسے جلیل القدر شاعر کا کوئی ذکر نہیں ھے - لیکن اس کو ترک عمد نہیں کہا جاسکتا - ایک سہو ھے جو بہ سہل اتفاق آسانی سے ممکن ھے -

۳- بہت سے نادر شعرا جو سکسینہ صاحب سے نظر انداز ھوئے ھیں مثلاً نواب مرزا شوق ، بیان ، بیدار ، مضطر خیرآبادی ، شوق قدوائی ، ان پر اعجاز صاحب نے بھی کوئی التفات نہیں کیا۔

۴- بیسویں صدی کی بھی بہت سی نامور شخصیتیں کو اعجاز صاحب نے فراموش کردیا ھے - چناں چہ شعرا میں نادر کاکوروی ، شفق عماد پوری ، آزاد انصاری ، وحشت کلکتوی ، مانی جائسی کے اسماء و تخلص اپنے عدم اندراج سے ممتاز نظر آتے ھیں۔

۵- مختصر افسانہ لکھنے والوں میں لطیف الدین احمد اکبر آبادی کا شمار ملک کے

ان چند پیش رو صنفین میں ہے ، جنھوں نے اس نوع کے ذوق نگارش کی نہ صرف بنیاد ڈالی بلکہ تربیت بھی کی ۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے افسانہ نگاروں کا ذکر موجود ہے جنھوں نے اس وقت جنم بھی نہ لیا تھا۔ جب ل ۔ احمد کا نام ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر آچکا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے واقعی قاصر ہوں کہ لطیف الدین احمد اکبر آبادی کا نام کیوں کر اعجاز صاحب کے ذہن سے محو ہوسکا۔ یہ نام اگر عمداً ترک کیا گیا ہے تو کمال بالائے کمال ہے ۔

۶۔ بیان کا لب و لہجہ عامیانہ اور عبارت کا انداز غیر ادبی اور نہایت غیر دل کش ہے ۔ بندش کا ڈھیلا پن ، الفاظ کی بے ترتیبی ، انتخاب کا فقدان ، تصورات کی غربت ، تحقیق کی کمی ، نظر کا عدم بلوغ جگہ جگہ نمایاں ہے ۔ الفاظ کی نشست میں مشرقی دیہات کی بولی ، محاورے اور روزمرہ کا دخل جگہ جگہ اپنی غمازی کرتا ہے ۔ جگہ جگہ شتر گربہ کا عیب موجود ہے ۔

۷۔ مجموعی طور پر کتاب میں علمیت کا عنصر کم ہے اور سطحیت ، نقالی اور روایت پرستی زیادہ ہے ۔

۸۔ ابتدائی شعرا پر تنقیدیں عموماً فکر و نظر سے معری اور بے مغز ہیں لیکن بعض اپنی جدت و ندرت اور بعض اپنے مغز و وزن کے اعتبار سے اتنی اہم اور گراں قدر بھی ہیں کہ تاریخ کے کسی ذی وقار صحیفے کی زینت بن سکتی ہیں۔ نثر کے سلسلے میں اعجاز صاحب نے جگہ جگہ ادبی بصیرت اور دقت نظر کا ثبوت دیا ہے ۔ جدید افسانے پر ان کا نقد ، تنقید عالیہ کا درجہ رکھتا ہے ۔

۹۔ روابط و ضمائر کی کمی نے دوسری خامیوں کو واضح تر اور عبارت کو جگہ جگہ بہت بھدا اور مبہم کردیا ہے ۔

۱۰- یہی کتاب بڑی عجلت اور رواداری میں لکھی گئی ہے - تکمیل کے بعد مسودے پر غالباً نظر ثانی نہیں کی گئی - اس لیے طباعت کی بہت سی غلطیاں باقی رہ گئیں تھیں۔

۱۱- اس نوع کی غلطیوں کا جو بہ آسانی کاتب سے منسوب کی جاسکتی ہیں یہاں احتساب نہیں کیا گیا۔ لیکن جگہ جگہ ایسی لفظی اور نحوی غلطیاں نظر آتی ہیں جو ایک ادبی تصنیف میں کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتیں -

" عرض حال " کی عبارت خصوصیت سے معیوب انداز بیان کا ایک گنجینہ ہے - یہ عبارت اتنی بے سروپا و ولیدہ اور بے ربط و ضبط ہے کہ اس کو سلجھانا، ایک ایک فقرہ الگ کرنا اور ہر فقرے کی خامیاں گنوانا نہ صرف دشوار ہے بلکہ " کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مترادف بھی ہے - اس لیے میں اپنے کو اس کام کے لیے آمادہ نہ کرسکا۔ یہاں صرف یہ بتادینا کافی ہے کہ " عرض حال" کی عبارت اس انشاء کا نمونہ ہے جو تصنیف و تالیف کے احاطے اور نو آموزوں کی نظر سے ہمیشہ دور رکھنی چاہئے -"(۱)

اردو نثر کے عناصر اربعہ میں سرسید، آزاد، نذیر احمد اور شبلی کے نام اس حیثیت سے منفرد ہیں کہ یہ صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز کہے جاسکتے ہیں۔ صاحب طرز کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان کی تحریر بغیر ان کے نام کے دیکھی جائے تو مزاج شناسان ادب و زبان معاً پہچان لیں گے کہ یہ فلاں کی تحریر معلوم ہوتی ہے - سرسید ان سب میں ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے ہاں زبان میں ابتدائی حالت کے اثرات صاف محسوس ہوتے ہیں۔ آزاد کی اپنی الگ ہی شان ہے - تخیلی انداز بیان آزاد کے ذہن و

---

(۱) مخمور اکبر آبادی، " صحیفۂ اردو"، آگرہ : گیا پرشاد، ۱۹۲۳ء، ص ۵۸-۱۱

قلم پر بھی طرح چھایا رہتا ہے - خواہ وہ تنقید و تاریخ لکھ رہے ہوں یا لسان و ادب کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوں ، اکبر کے دربار کے حالات ہوں یا ملکی و سیاسی انتظامات و بندو بست کے معاملات فرض رزم ہو یا بزم آزاد کا انداز بیان خفیف تشبیہ کے سوا کوئی تبدیلی قبول نہیں کرتا۔ شاعرانہ خیال آرائیاں، استعارہ کا استعمال و رنگینی بیان جہاں شاعرانہ ماحول میں دل کشی کا موجب ہوتی ہے وہیں تاریخی و تنقیدی پس منظر میں شک و شبہ کی کیفیت پیدا کردیتی ہے - اس لیے مولانا شبلی کا یہ قول ان پر پوری طرح صادق آتا ہے :

"جانتا ہوں کہ تاریخ کا مرد میدان نہیں لیکن ادھر ادھر کی گپ مار دیتا ہے تو وحی معلوم ہونے لگتی ہے -"

ڈپٹی نذیر احمد نے اردو کی مختلف اصناف میں گراں قدر اضافہ کیا ہے - عورتوں کے لیے اب تک علاحدہ لٹریچر نہ تھا انھوں نے اس کی تخلیق کی - ناول اردو میں خال خال تھے۔ اور زیادہ تر ان کا انداز قدیم داستانوں سے جدا نہ تھا - ڈپٹی صاحب نے جدید اردو ناول کی بنیاد ڈالی - ان کے ہاں زبان و بیان اور اشارہ پردازی کا عجیب لطف پایا جاتا ہے - شوخی و ظرافت جیسی ان کی تحریروں میں ہے ان کے کسی دوسرے ہم عصر کے ہاں نہیں پائی جاتی - زبان اور بیان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں - محاوروں کے استعمال کا انھیں بے حد شوق ہے اور اس میں بعض جگہ حد اعتدال سے گذر جاتے ہیں۔ شبلی نعمانی اس گروہ میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں - ان کی عبارت دیکھ کر سرسید بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ :

ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔"

ان کی تحریر کے متعلق مولانا قادری کی رائے ہے :

"علامہ شبلی اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلوب تحریر کی اہمیت کو سمجھا۔ موقع و مقام اور موضوع و بیان کے مطابق اسلوب اختیار کرنے کے لیے صرف وجدان و ذوق کی رہنمائی شرط ہے ۔ قواعد صرف و نحو اور اصول معانی و بیان بھی بغیر ذوق سلیم اور ذہن متوازن کے کام نہیں دیتے ۔ علامہ شبلی ایسا ہی مذاق صحیح اور طبع لطیف رکھتے تھے۔ ہر موقع و محل کے لیے اسی کے مناسب طرز تحریر اختیار کیا ہے ۔ لطیف و نازک استعارہ و تشبیہہ سے بھی کام لیتے ہیں لیکن اس کے بغیر بھی الفاظ کے انتخاب ، مرکبات اور جملوں کی ساخت میں اس قدر حسن تناسب ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کی عبارت میں نہایت دل کشی و دلآویزی پیدا ہوجاتی ہے ۔ اس کے ساتھ لطافت خیال ، دقت نظر، وسعت تحقیق ، قوت استدلال سے مضمون میں ندرت و جدت اور تاثیر و دل فریبی پیدا کردیتے ہیں۔ عظمت و اہتمام کے موقع پر شان دار الفاظ اور موزوں ترکیبوں سے شان و شوکت دکھاتے ہیں ۔ دلائل اور مثالوں کے انتخاب و ترتیب میں ان کا حسن نظر اور ذوق سلیم نمایاں ہے ۔ جس موقع پر دوسرے مصنف معمولی سامنے کی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں، وہاں علامہ شبلی نادر و عجیب مثالیں تلاش کرکے لاتے ہیں۔" (۱)

مولانا قادری بحیثیت انشاء پرداز و ادیب :

مولانا قادری کی تصنیف و تالیف کا زمانہ نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ بالکل ابتدائی عمر کی تحریریں ان کی ادیبانہ صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے مواد فراہم نہیں کرسکتیں لیکن ان ابتدائی تحریروں کی تاریخی اہمیت ہوتی ہے اور اس سے ذہن و دماغ اور زبان و بیان کی تدریجی ترقی کے مطالعے میں مدد ملتی ہے ۔

انشا پردازی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا ذہن متوازن ہو، طبیعت معتدل ہو،

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۳۵-۲۳۴

مزاج افراط و تفریط سے بالا ہو اور اس کے ساتھ ہی زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہو۔ صرف انشاء ہی کافی نہیں بلکہ اگر تخیل کی بلند پروازی ، خیالات کی وسعت نظر کی گہرائی اور فکر کی گہرائی حاصل نہیں تو انشا پردازی یا تو خالی الفاظ کا ایک مجموعہ ہوکر رہ جاتی ہے یا بے اثر و بے کیف تحریر کا نمونہ ثابت ہوتی ہے ۔ محقق و نقاد کے لیے ادیب اور انشاء پر داز ہونا بھی ضروری ہے ۔ مولانا قادری کی انشا پردازی کے نمونے ان کی تمام تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ شاید ہی کوئی مضمون یا موضوع ایسا ہوگا جس کے متعلق لکھتے وقت ان کے ہاں انشا پردازی کا نمونہ نہ مل سکے۔ غرضیکہ باریکیاں ہوں یا بدیع و بیان کے نکتے، تنقیدی موشگافیاں ہوں یا تحقیقی معرکہ آرائیاں غرض ہر میدان میں ان کے قلم کی انشا پردازی نظر آجاتی ہے ۔ اردو مرثیہ نگاری کے متعلق لکھتے وقت پس منظر کے طور پر عرب کی شاعری کی کیفیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ان کی انشاء پردازی کی شان ملاحظہ ہو :

" عرب کی شاعری بھی ہر ملک و زبان کی شاعری کی طرح وہاں کے ملکی حالات طبعی خصوصیات ، ماحول و مناظر کا نتیجہ ہے ۔ شاعری کی عام تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں کی مختلف آوازیں ، ہوا اور آندھی کی سرسراہٹ اور اس سے پتّوں اور شاخوں کی حرکت اور آواز ۔ بارش کے پانی کا مختلف چیزوں (زمین ، درخت ، دریا ، پہاڑ وغیرہ) پر گر کر مختلف آوازیں پیدا کرنا اور آندھی کے اثر سے ان آوازوں کی بلندی و پستی ، انسانی ناقوں اور مویشیوں کے گلوں کی آواز ، رفتار ، مختلف صنعتوں اور پیشوں کے اوزار اور ہتھیار کی مختلف مسلسل آوازیں ، غرض ہر وہ قدرتی آواز جو انسان کی اپنی معمولی آواز سے مختلف تھی انسان کو ابتدائے آفرینش سے دل چسپ اور جاذب توجہ معلوم ہوتی رہی ہے ۔ اور وہ اپنی آواز سے ان آوازوں کی نقل کرتا رہا ہے ۔ یہی موسیقی کا آغاز ہے ۔ اور موسیقی کی بے لفظ آواز کو الفاظ کے ذریعہ سے پیدا کرنا شاعری ہے ۔ یہی سبب ہے کہ شاعری انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

اور تمام عالم میں کوئی زبان ایسی نہیں جس میں شاعری موجود نہ ہو۔

عرب کا ملک بہت سی قدرتی آوازوں سے جن کی مختصر فہرست ہم نے اوپر لکھی ہے محروم ہے ۔ دریا و آب شار ، ندی و نالے، درخت اور پرند عرب میں کثرت سے اور عام طور پر موجود نہیں ہیں لیکن اونٹوں کے قافلے اور ان کی آواز ، رفتار روزمرہ کا مشاہدہ تھا۔ تگ گرمی کے دنوں میں عموماً رات کو سفر ہوتا تھا۔ ساری ساری رات چلتے رہتے تھے۔ عرب کے ریگستان ، اندھیری رات ، تمام رات کا سفر کوئی دل کش منظر نہ تھا۔ دل چسپی کے سامان نہ تھے۔ اونٹوں کی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ فطرت نے شتربانوں کو اسی آواز کی طرف متوجہ کردیا۔ اس آواز میں ایک قسم کی موسیقی کا احساس ہونے لگا اور اسی آواز پر عربوں نے اپنی لے ملانی شروع کردی۔ اور اپنے جذبات اسی لے میں ظاہر کرنے لگے، یہ موزوں و مقفی فقرے یا ابتدائی شاعری رجز کہلانے لگی اور یہ شتر سواروں کے خاص نغمے حدی۔ اب یہ کیفیت ہوگئی کہ اونٹ اپنے سواروں کے نغمے سن کر مست و بے خود ہونے لگے۔ جہاں شتربانوں نے دیکھا کہ اونٹ کو منزل بھاری پڑنے لگی فوراً زیادہ موثر لہجے کے ساتھ حدی پڑھنی شروع کردی، اور اونٹ پھر مست و محو ہوگئے ۔ اس رجز و حدی کا موضوع کیا تھا؟ان میں کن جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔" (۱)

اسی طرح اسی کتاب میں آگے چل کر میر انیس کے حال میں مرثیے کے متعلق بڑے کا خوب صورت انداز میں لکھتے ہیں :

" مرثیہ وہ لعل بے بہا تھا جو اپنی ابتدا(سولھویں صدی عیسوی کے آخر) سے میر حسن (اٹھارھویں صدی کے آخر) تک دوسو برس تقریباً کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں جو کچھ تبدیلی و ترقی ہوئی زبان کی ترقی کے زیر اثر ہوئی ورنہ اس پر فن کی حیثیت سے کسی نے توجہ نہیں کی ۔ آخر میر ضمیر نے اس کو صاف کیا ، چمکایا کہ اس کی قدر و قیمت نظر آنے لگی۔ لیکن

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا،" مختصر تاریخ مرثیہ گوئی"، کراچی : سور آرٹ پریس (ناشر) اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۴ع ، ص ۷۰۵

یہ خدمت میر انیس کے لیے وہ بہت تھی کہ انھوں نے مرثیے کو زبان اردو کے تاج کا سب سے بیش قیمت و گراں قدر گوہر بنادیا۔

مشہور ہے کہ " شاعری جزو یست از پیغمبری" یعنی شاعروں کچھ پیغمبرانہ اوصاف بھی ہوتے ہیں۔ پیغمبری کیا چیز ہے؟ تمام صفات پیغمبری کا خلاصہ اور جامع صفت یہ ہے کہ قدرتی طور پر پیغمبر کو " توازن دماغ " حاصل ہوتا ہے۔ جس کو عیار کامل اور نقد صحیح بھی کہہ سکتے ہیں یعنی پیغمبر کے دماغ میں اس طرح کی موزونیت ، تناسب ، فکادیت ہوتی ہے کہ کسی خیال ، کسی ارادے، کسی فعل ، کسی قول کا مناسب ، برمحل ، جائز ، صحیح ہونا خود اس کی طبیعت و فطرت بغیر غور و فکر کے بتادیتی ہے - یہی صفت فطری و حقیقی شاعر میں بھی ہوتا ہے کہ کسی تخیل ، کسی لفظ ، کسی بندش ، کسی طرز ادا کی صحت و فصاحت ، حسن و لطافت کو جانچنے ، پہچاننے کے لیے اس کو فکر و تامل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی شاعرانہ فطرت خود آن واحد میں ادارک کرلیتی اور فیصلہ کردیتی ہے - پیغمبر کو اس صفت سے کام لینے اور منصب پیغمبری کو پورا کرنے کے لیے عصمت پیغمبری عطا ہوتی ہے - یعنی راہ راست اور صراط مستقیم سے منحرف ہونا پیغمبر کے لیے نا ممکن ہوتا ہے - خطا و انحراف کبھی اس کے تصور میں بھی نہیں آتا۔ شاعر اس صفت میں پیغمبر کا شریک و مساوی نہیں ہے - شاعر میں یہ عزیمت کم زور اور یہ عصمت ناقص ہوتی ہے - پیغمبر میں شاعری کی اصلی روح اس قدر خالص اور لطیف ہوتی ہے کہ وہ عمر بھر کوئی شعر نہ کہے پھر بھی اعلا سے اعلا شاعر سے زیادہ صحیح تخیل اور فصیح بیان کا مالک ہوتا ہے - پس اگر پیغمبر شاعری کرنے لگے تو اس کے لیے یہ مرتبۂ تنزلی ہے - اسی لیے فرمایا ہے :" وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ ط " لیکن شاعر اگر اپنی شاعری کے اندر پیغمبرانہ توازن ذہنی و قوت تمیز، پیغمبرانہ تخیل و اسلوب بیان پیدا کرسکے تو یہ اس کی معراج کمال ہے اسی لیے کہا گیا ہے :" الشعراء تلامیذ الرحمن"۔

انہیں تلامیذ الرحمن میں میر انیس بھی تھے۔ یہ صفت کم و بیش ہر اچھے شاعر میں ہوتا ہے - اسی کے کمال و نقصان پر شاعر کی بلندی و پستی منحصرہے۔ لیکن یہ کمال خدا کی دین ہے - صرف علم و فضل اور کسب فن سے حاصل نہیں

ہوتا ۔ مثلاً ناسخ و ذوق کو اس صنعت میں سے بہت ہی کم حصّہ ملا تھا۔ اس لیے باوجود استاد فن ہونے کے دونوں کا اکثر کلام بھدا اور بے مزہ ہے ۔ حضرت ناسخ فرماتے ہیں :

آتا نہیں ہے دن کو بجز شب وہ ان دنوں
بدلا ہے شوخی سے مزاج آفتاب کا

حضرت ذوق کا ارشاد ہے :

اے غم! مجھے تمام شب ہجر میں نہ کھا
رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے

جن شاعروں کا مایۂ ناز اس طرح کی تخیل ہو وہ ماہر فن اور پہلوان سخن سہی لیکن شاعری چیزے دیگر است ۔ مرزا دبیر میں بھی یہ صنعت میرانیس سے کم تھا۔ میر انیس کو یہ کمال ان کے باپ میر مستحسن خلیق ، دادا میرحسن ، پردادا میر ضاحک سے وراثت میں ملا تھا۔" (۱)

مولانا کی یہ شان انشاء پردازی ہر جگہ بحال رہتی ہے ۔ مطالب اشعار میں انشا پردازی کا زیادہ موقع نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات انشا پردازی سے تشریح اشعار میں خلط مبحث کا اندیشہ ہوسکتا ہے ۔ لیکن مولانا نے تشریح اشعار کے ساتھ جس موقع پر انشاء پردازی کا جلوہ دکھایا ہے وہاں نہ صرف یہ کہ تحریر میں ایک خاص دل کشی و تاثیر پیدا ہوگئی ہے بلکہ خود شعر کے مطلب اور وضاحت میں گوناگوں اضافہ ہوگیا ہے ۔ انتخاب دیوان مومن سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

" کتنا شعاع مہر نے حیران کیا ہمیں
تکتے ہیں کب سے روزن دیوار کی طرف

یہ تخیل اور اسلوب دونوں بہت خوب ہیں۔ روزن دیوار میں جلوۂ یار یا جلوۂ یار سے روزن دیوار کا روشن ہونا خود مومن نے اور دوسروں نے لکھا ہے ۔ لیکن اس شعر میں

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " تاریخ مرثیہ گوئی"، محولہ بالا ، صص ۳۲-۳۰

بڑا نادر خیال ہے - اور بیان میں مومن کا خاص رنگ موجود ہے - یعنی حیرانی کا سبب بیان نہیں کرتے - مفہوم یہ ہے کہ جلوۂ یار آفتاب سے کم نہیں ہے - جب کبھی ہمارا محبوب روزن دیوار کے پاس ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعاع آفتاب روزن میں آگئی ہے - یہ کیفیت ہمیشہ کی ہے - آج روزن دیوار میں شعاع آفتاب تھی، ہماری نظر جو اس طرف اٹھی ، معاً خیال ہوا کہ روزن کے پاس دوست کھڑا ہے - اس کے جلوے کی روشنی ہے - حیران ہوکر تکنے لگے - ظاہر ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہوسکتا - پھر بھی اس میں ایک لطف اور ایک تاثیر ہے محض اس وجہ سے کہ یہ ایک جذبہ ہے اور اس مضمون و بیان میں ندرت ہے - محبت کے جذبے و تخیل میں مزہ ہوتا ہے - محبت کی بات اور نادر خیال خود ایک لذت اور ایک کشش رکھتے ہیں - کسی شعر یا شاعری کا اگر اور کوئی مقصد نہ ہو تو اس کا جذبہ اور تخیل شعریت اور ادبیت خود ایک مقصد اور ایک قدر ہے - مضمون کی واقعیت اور اصلیت بلا شبہ نہایت پر اثر ہوتی ہے لیکن کبھی واقعہ کے قریب ہونا لطف و اثر پیدا کردیتا ہے - اس شعر میں شاعر شعاع مہر پر روئے یار کا دھوکا بیان کرتا ہے - یہ دھوکا تو بے شک نہیں ہوسکتا لیکن شعاع مہر کو دیکھ کر جو عاشق کو روئے یار یاد آیا اور اس کا تصور بندھا اور حسن و جمال کی نشاط انگیزی نے دل و دماغ پر جو محویت کا اثر پیدا کیا وہ آفتاب کی تابانی سے نہایت مشابہ ہے -

مومن کے اس مضمون داغ نے دوسرے انداز سے لکھا ہے - کہتے ہیں :

بے پردہ اگر جلوہ نما وہ نہیں گھر میں

بجلی سی چمک جاتی ہے کیوں روزن در میں

روزن در میں تو بجلی نہیں چمکتی تھی لیکن پڑھنے والے کے دل میں اب بھی بجلی سی چمک جاتی ہے ~~- مومن تو ایک غزل اور بیان حسن و عشق کا یہی مقصد اور یہی ماحصل~~

ہے۔ میرے نزدیک غزل اور بیان حسن و عشق کا یہی مقصد اور یہی ماحصل ہے۔ واقعیت شرط لازم نہیں۔" (۱)

مولانا کی انشا پردازی میں بھی صداقت اور واقعیت کی شان برقرار رہتی ہے۔ اور یہ کسی مورخ اور نقاد کے کمال کی دلیل ہے کہ تحریر شگفتہ و بے ساختہ ہونے کے ساتھ ساتھ سچائی سے خالی نہ ہو۔ مولانا کے یہاں حقیقت نگاری اور انشا پردازی قدم بہ قدم چلتی ہیں۔"داستان تاریخ اردو" سے چند اقتباس ملاحظہ کیجئے :

" آزاد با کمال " خدا ساز" ہستیوں میں تھے، ان کا ذہن زبان و محاورہ الفاظ و بندش کے انتخاب کے متعلق صحیح توازن و تناسب رکھتا تھا۔ اور ان کی طبیعت میں ندرت آفرینی و جدت طرازی اعلا درجے کی تھی۔ زبان و بیان کی شیرینی و نرمی، میں کوئی ادیب ان کا شریک نہیں ہے۔ اس لیے آزاد اپنے زمانے کے پہلے صاحب طرز ہیں۔ آزاد کے طرز کو شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں بیان کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ آزاد تنہا " طرح دار " ادیب ہیں۔ ان کی تحریر کا بانکپن، سچ یہ ہے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ کہا :

" مزا یہ دل کے لیے ہیں، نہیں زبان کے لیے"

اسی جدت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ علامہ آزاد نے طرز عبارت کی ایجاد کے علاوہ مضامین و موضوعات کی ترتیب و تالیف میں وہ جدتیں پیدا کی ہیں جو ان سے پہلے موجود نہ تھیں، اور یہ اولیات آزاد ہیں۔ مثلاً :

۱۔ شعرا کے تذکرے آزاد سے پہلے بھی بہت لکھے گئے ہیں، لیکن سب نہایت مختصر تھے۔ اکثر میں حروف تہجی کی ترتیب تھی، کسی میں زمانے کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تو مجمل اور سرسری طور پر، کسی میں حالات و کلام کے متعلق تحقیق و تفصیل نہ تھی۔ مقابلہ و موازنہ نہ تھا زبان و محاورہ اور طرز کلام کا تجزیہ و ارتقا نہ تھا۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " انتخاب دیوان میر"، علی گڑھ :انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۵۶ء، صص ۷۸-۷۷

آزاد کو سب سے پہلے ان تمام اجزاء و لوازم کی تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے " آب حیات" میں یہ سب خامیاں رفع کردیں۔ اور ایسی کتاب لکھدی کہ آج بھی کوئی تذکرہ نویس " آب حیات" کے استفادے سے بے نیاز نہیں ہے - پھر اس میں اگر کچھ غلط بیانیاں اور بے جا طرف داریاں بھی ہیں تو ان سے آزاد کے فضل تقدم اور " آب حیات" کی اولیت میں فرق نہیں آتا۔

۲- زبان کی ساخت اور ارتقا کے متعلق آزاد کی " سخندان فارس" اور " مقدمۂ آب حیات" سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی - آزاد کی زبان دانی شوق تحقیق اور قوت ایجاد نے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصانیف پیدا کردی ہیں۔

۳- رمزیہ و تمثیلی مضامین اور ان کے اسالیب نگارش کا اس قدر تنوع اور ایسا کمال آزاد کے " نیرنگ خیال" سے پہلے نظر نہیں آتا - آزاد نے اس پیرایہ میں مسائل مذہبی و علمی و ادبی کی تحقیق بھی کی ہے اور نقد و تبصرہ بھی - طعن و طنز بھی کیا ہے اور اخلاق بھی سکھائے ہیں۔

۴- اگرچہ مولانا شبلی کی تاریخ و سیرت کی تصانیف " الفاروق" وغیرہ کے سبب سے علامہ آزاد کی " دربار اکبری" کو اولیت کا درجہ حاصل نہیں ہے ، تاہم تاریخ میں ادبی شان پیدا کرنا اور اور افسانہ و ناول سے زیادہ دل چسپ بنادینا آزاد ہی کا پہلا کمال ہے - خصوصاً اکبر بادشاہ کے حالات خاص اہتمام سے لکھے ہیں ، اگرچہ آزاد نے اکبر کی بے دینی اور علما کی نوجیں کو بہت سراہا ہے۔
اس لحاظ سے آزاد کا مرتبہ موجد کا بھی ہے ، نقاد کا بھی، صاحب طرز کا بھی - آزاد سب سے پہلے انشا پرداز ہیں، پھر مورخ ، تذکرہ نویس ، سیرت نگار - ان کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جاسکتا ہے ، لیکن ان کی انشا پردازی سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اس لیے بقائے دوام کے اعتبار سے آزاد بہ حیثیت انشا پرداز کے زندۂ جاوید ہیں - زبان و بیان کی دل کشی میں ان کی ہر کتاب سدا بہار گل زار ہے - مطالعہ و حوالہ کے لیے ان کی ہر کتاب مفید و ضروری ہے - لیکن تحقیق و تنقید کی نظر میں ان کی ہر کتاب پرانی ہوچکی ہے - " آب حیات" کے نظریے بدل چکے ہیں، اور بہتر تبصرے لکھے جاچکے ہیں۔ " سخن دان فارس " کے تجزیے اور تعریفیں اب قول فیصل نہیں رہیں - دربار اکبری تاریخ کے طالب علموں اور استادوں کے لیے پہلے بھی کچھ مجوبہ نہ تھی اب تو

بہت سا اصول مفصل و مکمل تاریخیں موجود ہیں۔ نگارستان فارس (تذکرہ شعرائے فارسی) صرف آزاد کے شغف و عشق فارسی کا ایک چھینٹا ہے ۔ لیکن اتنا ہلکا پڑا ہے کہ خود آزاد کی تالیفات میں بھی اس کا کوئی درجہ نہیں۔ قدیم تذکرات "تذکرہ دولت شاہ سمر قندی" ، " آتشکدہ آذر" ، سرو آزاد"، وغیرہ کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے ۔ چہ جائیکہ مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کی تالیفات سے مقابلہ ہوسکے۔ نیرنگ خیال آزاد کی دوسری کتابوں سے زیادہ دیرپا ہے ، اس لیے کہ یہ نہ تاریخ ہے ، نہ تذکرہ ، نہ سیرت ، نہ فلسفۂ زبان، بلکہ صرف انشاء ہی انشا ہے ۔ اگرچہ یہ طرز رمز و تمثیل مستقل مقالہ نگاری کی صورت میں رائج نہیں ہے ۔ لیکن یہ شان مجاز اور صرف استعارہ شعر و ادب کا جزو عنصر ہے اور اب بھی فسانے اور ناول مزاحیات و طنزیات ، بلکہ تنقیدیں اور تبصرے، اور ادبیات و علمیات بھی نیرنگ خیال کے رنگ تحریر کے نمونے ضمنی و جزئی طور پر اپنے اندر رکھتے ہیں۔"(۱)

آزادی کے حال سے ایک اور مختصر اقتباس ملا حظہ ہو :

" یہ تفصیل اس لیے لکھی گئی ہے کہ علامہ آزاد کی یہ حالت جذبات و بے خودی صرف مصائب و آلام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ مادہ" ان کے آب و گل میں خمیر تھا، اور بقول سید جالب کے " آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی۔" یہ اللہ تعالی کی نعمت و رحمت تھی کہ جب آخر کار ان کی یہ حالت ہونے والی تھی تو پہلے ہی سے ان کے دل و دماغ میں الٰہیات و تصوف کا شوق پیدا کردیا تھا کہ اس عالم میں بھی بے کیف و بے فیض نہ رہیں۔ قاعدہ ہے کہ اس حالت سے پہلے جیسے خیالات دل و دماغ پر چھائے ہوتے ہیں، وہی اس عالم میں جم جاتے ہیں اور زبان سے نکلتے ہیں۔ آزاد کو ہندوؤں کے فلسفہ و الٰہیات سے خاص شغف تھا۔ چناں چہ ان کی اس عالم کی تصنیف "سپاک و دماک " میں بھی اس کا اثر ہے ، اور یہ فلسفۂ الٰہیات تو اول سے آخر تک اسی رنگ میں ہے۔" (۲)

انشا پردازی کا لازمہ بعض اوقات طول کلام بھی سمجھ لیا گیا ہے ۔ بعض انشاء پردازوں کی تحریروں میں طول لا طائل کی کثرت ہے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ تکرار اور اعادہ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا: "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، صص ۴۷۲-۷۳

(۲) ایضاً، ص ۵۱۵

بھی اسی طوالت کے شبے میں پایا جاتا ہے ۔ مولانا قادری کی تحریر کی بڑی خصوصیت بیان کا مربوط اور ہم آہنگ اور جملوں کا یک دیگرے باہم پیوست ہونا ہے ۔ وہ صرف اتنی ہی بات کہتے ہیں جتنی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن اس مختصر سی بات میں تمام جزئیات کا کمال چابک دستی سے احاطہ کرلیتے ہیں۔ ویسے بات کا اختصار سے کہنا قابل تحسین بات ہے ۔ لیکن اگر اس میں ادیبانہ انشا پردازی کی شان بھی ہو تو وہ انفرادی خصوصیت سمجھنی چاہیے ۔ اسی مختصر طرز تحریر لیکن ادیبانہ شان اور انشاء پردازانہ کمال کا مختصر سا نمونہ یہ ہے :

" پرانی تعلیم کے زیر سایہ اور نئی روشنی کی صبح صادق میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیب بیان پیدا ہوسکتے تھے ، وہ سرسید سے شبلی و شرر تک پیدا ہوگئے ۔ اس امر میں سرسید کی جامعیت حیرت انگیز ہے ۔ اکیلے سرسید کی تحریر میں عالمانہ و فلسفیانہ ، متین و ظرافت ، نرم و گرم ہر طرح کا اسلوب موجود ہے۔ شبلی اپنے اسلوب کے توازن و تناسب ، صحت و پختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں ، لیکن سرسید کے جوش کی ان میں کمی ہے ۔ حالی ان دونوں کے درمیان میں ہیں ، اگرچہ جوش ان میں بھی نہیں ہے ۔ حالی نے سرسید کی صحت و صفائی کو آگے بڑھایا ، لیکن حسن و موزونیت میں شبلی سے پیچھے رہے۔ نذیر احمد اور آزاد اپنے اپنے رنگ کے مُوجِدُ و خاتِمُ ہوئے ۔ سرشار و سجاد حسین " پنچ" طرز ظرافت کے خداوند تھے۔

بیسویں صدی میں اقسام کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اسالیب بیان ایجاد ہوئے اور تقریباً سب انگریزی زبان و علوم سے متاثر ہیں۔ عصر حاضر میں مغربی تعلیم سے اردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا ، اور زبان و ادب کی اصلی خدمت ہوئی وہ یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس ، تاریخ و سیرت ، ادب و انشاء ، تبصرہ و تنقید ، ناول و افسانہ وغیرہ مختلف موضوعات کے لیے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہوگئے ۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یا خال خال تھی ، جتنا کہ ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ان دو زمانوں (انیسویں

صدی کا آخری اور بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ) مصنفوں میں عجیب و دل چسپ فرق یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء و معاصرین کو جو اسلوب پسند تھا وہ انھوں نے ابتدائے تحریر سے اختیار کرلیا ، اور آخر تک اس پر قائم رہے ۔ آزاد ، نذیر احمد ، حالی ، شبلی کا انداز و طرز ان کی پہلی تصانیف سے موجود ہے ، اس کی تکمیل و پختگی میں البتہ کچھ دیر لگی ، لیکن اتنی ہی جتنی کسی اسلوب کے ہم وار ہونے اور منجھنے میں لگتی ہے ۔ برخلاف عصر حاضر کے کہ اس زمانے کے سب نہیں تو بہت سے مشہور اہل قلم اسلوبوں اور اندازوں کے پیچھے دوڑتے پھرے ۔ پھر کہیں مدت کے بعد کوئی روش اختیار کرسکے ۔

ابوالکلام آزاد کی " عالمانہ شان دار نثر " الہلال سے شروع ہوکر تفسیر قرآن تک رہی ، پھر ہلکی پڑ گئی ۔ نیاز فتح پوری کی " نثر میں شاعری " اور " ظرافت " کچھ عرصے جاری رہ کر ختم ہوگئی اور " نثر میں نثر " لکھنے لگے ۔ خواجہ حسن نظامی نے زبان میں چٹکلوں کا مزہ پیدا کیا ۔ چٹکیاں لیں ، گدگدیاں کیں ۔ لیکن ان کی بھی حد ہوئی ۔ ملا رموزی نے اردو کو گلابی رنگ دیا یعنی " گلابی اردو " کے نام سے ملا یانہ لفظی ترجمے کا طرز لکھا ، لیکن یہ رنگ پختہ نہ تھا ، ڈھل گیا ۔ پھر مزاحیہ شوخ رنگ اختیار کیا ، آخر وہ بھی اداسی ہوگیا ۔ رشید احمد صدیقی نے ظرافیات میں انفرادی رنگ نکالا ۔ شوخی میں ادبیت پیدا کی ، لفظوں کے معنی اور معنوں کے لفظ ایجاد کیے لیکن یہ اسلوب تھکا دینے والا تھا ، چناں چہ تھک تھکا کر بیٹھ رہے اس طرح کے تغیرات اور الٹ پھیر اور اسالیب اور اہل قلم میں بھی ہوئے ، یہ چند نام مثال کے طور پر لکھے گئے ہیں ۔ ان میں یک رنگی قائم نہ رہنے کا سبب یہ تھا کہ یہ سب روشیں اصل میں تحریر کی " جولانیاں " تھیں ، لکھنے والوں کے شباب تک رہیں ۔" (۱)

<u>مولانا قادری بحیثیت نقاد :</u>

ادب اپنے معاشرے سے نہ الگ ہوتا ہے نہ بے نیاز ہوسکتا ہے ۔ انسان کو ایک خاص ماحول میں رہنا ہوتا ہے اور اکثر یہ عمل اس کے اختیار و ارادے سے باہر ہوتا ہے ۔

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، " داستان تاریخ اردو " ، محولہ بالا ، ص ۹۳۹-۴۱

یہ ضرور ہے کہ بعض قومی طبائع اپنے ماحول کو متاثر کرتی ہیں اور اس طرح رد و قبول
اور اثر پذیری و اثر اندازی کے باہمی عمل و رد عمل سے فرد اور معاشرہ دونوں کی ترقی
و تبدیلی ناگزیر ہوجاتی ہے ۔ جس طرح زندگی ایک متحرک ناماتی اور رواں دواں قوت ہے۔
اسی طرح معاشرہ بھی تبدیلی کا شکار ہوتا رہتا ہے ۔ اور ادب اس معاشرے میں رہنے
والے افراد ہی تخلیق کرتے ہیں اس لیے یہ قوانین فطرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی
عہد کا تمام تر ادب اس عہد کی تحریکات ، رجحانات ، میلانات اور اثرات سے مبرّا ہو۔ اس
بیان میں تمام تر ادب کے الفاظ قابل لحاظ ہیں۔ چوں کہ انسان کی طبائع مختلف ہیں
اس لیے اس کی قوت مشاہدہ اور قوت پذیری بھی یکساں نہیں ہوتی۔ یہ عام تجربے کی بات
ہے کہ نہ کسی ایک ادیب کی تمام تر تخلیقات اس کے عہد کی مکمل آئینہ دار ہوتی ہیں۔
اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی ادیب کی تمام تر تخلیقات اس عہد کے اثرات و مشکلات ، مصائب
و نوائب ، رنج و راحت اور دیگر معاشی و معاشرتی مسائل سے یکسر عاری ہوں۔ افراط و تفریط
کو چھوڑ کر کم و بیش ہر ادیب و شاعر کے ہاں ایسے صری اثرات ڈھونڈے جاسکتے ہیں یہ
ضرور ہے کہ بعض کے ہاں تلاش و جستجو کے بعد کم ملتے ہیں اور بعض کے ہاں بہت ۔

یہی حال ادب اور تنقید کا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ادب تخلیق کرتا ہے وہ
احساس سے بے بہرہ نہیں ہوسکتا کہ اچھا ادب کیا ہے اور برا کیا؟ یہ الگ بات ہے کہ جو
دوسری سماجی و اخلاقی اقدار اس عہد و معاشرے میں رائج ہیں ان کی پابندی کے لحاظ سے
اس کے ہاں اس قسم کی تحریر و تقریر نہ مل سکے جس کی آج توقع کی جاتی ہے ۔

اردو ایک خاص معاشرے کی پیداوار ہے اور اس کا ادب بھی اسی سے فیضیاب ہے
اس لیے لازمی ہے کہ تنقید بھی اس سے بے بہرہ نہ ہو ۔ چناں چہ اردو میں تنقید کا فن
جس طرح اس عہد میں پایا جاتا ہے ۔ ابتدائی دور میں ایسا نہ تھا ۔ لیکن شعر کی خامی

فن کی ناپختگی کو زبان کی ثقاہت بیان کا نقص یا اس کے برخلاف اس کی خوبیاں ہمیشہ سے دو صورت لکھنے والوں بلکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں بھی موجود رہی ہیں۔

چنانچہ اس کے اولین نمونے ہم کو اردو شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں خواہ وہ سراسر تحسین ہو یا سراسر تنقیص ، ذاتی رجحانات کی آئینہ دار ہو یا معاصرانہ چشمکوں کی پروردہ لیکن بہر طور اس عہد کے لحاظ سے اسے تنقید ہی کہنا پڑے گا ۔

اردو کے ادبی حلقوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا یہ فقرہ بہت مشہور ہوا ہے کہ :" اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے ۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔" (۱)

تنقید کی ابتدا کے لیے تذکروں کا ذکر ناگزیر ہے ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اپنی محولہ بالا کتاب " اردو تنقید پر ایک نظر" میں پرانے تذکروں کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں :

" اردو میں تذکرے تو بہت ہیں۔ پرانے اور نئے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک اردو تنقید تذکرے کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھتی۔ پرانے تذکرہ نگار سیدھے سادے طریقے سے دسبحاگخوشی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ آج کل زور شور، ہنگامہ ، طمطراق زیادہ لیکن اندر خلا ہی خلا ہے ۔ ترتیب اور مناسبت کا لحاظ کچھ زیادہ ہے لیکن تنقید اب بھی نہیں ملتی۔

تذکروں میں شاعروں کا ذکر عموماً باعتبار حروف تہجی ہوتا ہے مختلف رنگ اور مختلف پایے کے لوگ نزدیک ، شانہ بہ شانہ اکٹھا ہوجاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ پراگندگی ہے ۔ ضروری باتیں جیسے اردو شاعری کی ابتدا اور ترقی کے مختلف مدارج ، کسی جلیل القدر شاعر کا اثر اپنے معاصروں یا شعرائے مابعد پر ، شاعری اور شاعروں کے بدلتے ہوئے احوال یہ باتیں مفقود ہیں ، تذکرہ نگار بس یہی چاہتا ہے کہ جتنے شاعروں سے اسے ذاتی واقفیت ہے یا

---

(۱) کلیم الدین احمد ، پروفیسر ، " اردو تنقید پر ایک نظر"، لاہور : عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ع ، ص ۱۰

جتنے شاعروں کے اس نے حالات سنے یا دیکھے ہیں، انہیں کا مجمل یا مفصل ذکر اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کریں۔ اس مجمل یا مفصل ذکر میں بھی انصاف سے اکثر کام نہیں لیا جاتا اور غیر جانب داری کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے -

گردیزی اپنے تذکرے کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" از ملاحظۂ تذکرہ ہائے اخوان زمان کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویان عہد محرر ساختہ اند و علت غائی تالیف شان خردہ گیری ہم زبان و ستم ظریفی با معاصر آن است - بخاطر فاتر ریخت کہ تذکرۂ مرقوم سازد و بے رنجیدگی از روئے انصاف خالیا عن الاعتاب -"

اور لطف یہ ہے کہ خود بھی ما انصافی اور جانب داری سے اپنے دامن کو پاک نہیں رکھتے ہیں - میر کو وہ دو تین سطروں کا مستحق سمجھتے ہیں:

" فقیر میر اشتعارش نمودہ و چشمے آب دادہ - حقا کہ دران تلاش معنئ بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بروئے کار آوردہ -"

انہیں لفظوں میں حشمت کا بھی ذکر ہوتا ہے - اس کے علاوہ جہاں سجّاد کے کلام کا نمونہ گیارہ صفحوں میں پیش ہوا ہے - وہاں میر کا صرف ایک مبتذل شعر نقل کیا گیا - غنیمت ہے کہ یہ نقص اچھے تذکروں میں کم یاب ہے - لیکن کچھ دوسری خامیاں اور بھی ملتی ہیں - شاعروں کے مختلف مراتب کا صاف و مدلل بیان کہیں نہیں پایا جاتا اور ان کا ایک دوسرے سے موازنہ بھی کہیں نہیں ملتا۔ سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ شاعروں سے متعلق جو بیان ہوتا ہے اس میں تنقید کا عنصر کم یا ملتا ہے -

نمونہ کلام کے علاوہ تذکروں میں جو مختصر سا بیان ہوتا ہے - اس میں تین اجزاء ہوتے ہیں :" ایک شاعر کی زندگی ، دوسرے شاعر کی شخصیت اور تیسرے شاعر کے کلام پر تنقید -" ان اجزاء کا الگ الگ جائزہ لینا مناسب ہے -

١- شاعر کی زندگی :

بہت مختصر ہوتی ہے - پرانے تذکروں میں اس قدر بے جا اختصار ہوتا ہے کہ یہ حصہ بیشتر ناکام رہتا ہے - کبھی کبھار تو شاعر کے نام کا بھی ذکر نہیں - میر، آزاد کے بارے میں کہتے ہیں :" ہم عصر ولی بود ؟ میر حسن کہتے ہیں :" مسافر تخلص نمی دانم از کیست و کجائیست بلکہ این قدر می دانم کہ از معاصرین مَن است"۔ مصحفی کہتے ہیں : " عشقی مرادآبادی فقیر اورا در آنولہ دیدہ بود" کبھی کبھار کچھ زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ لیکن وہ بھی تشفی بخش نہیں ہوتی - سودا کے بارے میں میر حسن بس اسی قدر کہتے ہیں : " مولدش شاہجہان آباد، سن شریفش بہ ہفتاد رسیدہ باشد، نوکری پیشہ ، الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بوسیلۂ فن شاعری سرفراز است ، در علم موسیقی نیز ماہر است ۔"

پھر "گلشن بے خار" میں سودا کا ذکر دیکھیے :

" مرزا محمد رفیع نام ، اصلش از کابل و مولد و منشا لیش جہان آباد است بہ سن شباب بہ لکھنو رفت و حَصر(؟)درآن جا وفات یافت - وفاتش را زمان بسیار آمدہ از مقربان بارگاہ وزیرالملک نواب آصف الدولہ بہادر بود ۔"

اسے سودا کی " زندگی" نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کچھ نکتے البتہ ملتے ہیں اور ہر۔ پھر مختلف تذکروں کے بیانوں میں تناقض ہوتا ہے - ظاہر ہے کہ یہ "زندگی " ناکافی ہے - وہ شاعر کی پیدائش یا خاندان ہو یا اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی زندگی کی واردات ہیں وہ اس کی تصنیفات ہوں یا اس کا ماحول ہو کسی چیز کے بارے میں بھی تشفی بخش مواد نہیں ملتا۔ تذکرہ نویسی میں یہ قدرت نہیں کہ وہ واقعات کو اس طرح بیان کریں کہ شاعر کی تصویر میں جان آجائے اور وہ بولنے لگے۔ یہ حالات نہایت خشک ، بے ربط اور غیرمتعلق ہوتے ہیں - ان کی اہمیت تاریخی ہے - ادبی مطلق نہیں اور ماحول کی کمی سے علمی زمین

نا پید ہوتی ہے اور شاعر کی ہستی گویا معلق فضا میں آویزاں نظر آتی ہے ۔

۲۔ شاعر کی شخصیت :

شخصیت کی تصویر بھی ناکافی ہوتی ہے ۔ بسا اوقات اس طرف توجہ بھی نہیں ہوتی ۔

میر :۔ میاں حسن علی شوق تخلص از شاہجہاں آباد است ۔ سپاہی پیشہ ، شاعر ریختہ ، شاگرد ، خان صاحب سراج الدین علی خان ۔ بندہ را بخدمت او ربط الیت ۔ اکثر اتفاق ملاقات می افتد ۔"

میر حسن :۔ جلال الدولہ جلال الدین وکیل مرہٹہ مشیر نواب عمادالملک ۔

مصحفی :۔ محتشم علی خان حشمت پسر میر باقی اصلش از شاہجہاں آباد است شعر فارسی بسیار بہ لطافت می گفت و گاہ گاہ خیال ریختہ هم داشت ۔

شیفتہ :۔ سلام تخلص نجم الدین علی خان بہام از اکبر آباد است ۔"

یہ مثالیں بلا تخصیص پیش کی گئی ہیں۔ اس قسم کی مثالوں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ کبھی کبھار کسی شاعر کی شخصیت دو چار لفظوں میں بیان کی جاتی ہے ۔ لیکن یہ الفاظ ایسے عام قسم کے ہوتے ہیں کہ مخصوص شخصیت کی تصویر نہیں ہو پاتی۔

اگر بھولے سے کسی شاعر کی شخصیت میں اهتمام اور تکلف سے کام لیا جاتا ہے تو پھر لفظوں کی زیادتی ہوتی ہے ۔ با اثر رعب دار، رنگین ، شیریں مجلسی لفظوں کی فراوانی ہوتی ہے ۔ لفظوں کے انتخاب میں کاوش ہوتی ہے ۔ اهتمام و تکلف ہوتا ہے ۔ لیکن کام باہر دور ہی رہتی ہے ۔ لفظوں کا ایسا جال بچھا یا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ اس جال میں پھنس جاتی ہے ۔ الفاظ معانی سے زیادہ اہم ہوجاتے ہیں اور عبارت کی دل فریبی میں هم ایسا ڈوب جاتے ہیں کہ گوهر مدّعا هاتھ نہیں آتا ۔ میر حسن درد کی تصویر کھینے

رنگین چمکتے ہوئے لفظوں میں کھینچتے ہیں :

" سالک مسالک مکاشفات دینی و ناہج/مناہج مجاہدات یقینی از عرفائے عالی مقام و فقہائے ذوی الاحترام بر آسمان سخن مانند خورشید فرد حضرت خواجہ میر المتخلص بہ درد از عالمان جوش ذات و از درویشان نیکو صفات ، طنطنۂ فضل و کمال دبدبۂ جاہ و جلال او بفلک رسیدہ طناب فکر عالیش چون کنگ شعاع مہر از مشرق تا بمغرب کشیدہ در بحر ضمیرش ہمہ گوہر ناسفتہ و برگفتۂ او عقل آفرینہا گفتہ ، مرشد بوادیٔ حقیقت و رہبر بمیدان شریعت دل آگاہے مخزن اسرار خدائی صفائے باطنش محرم کعبۂ کبریائی ، خسرو اقلیم حال و قال جامع صفات جلال و جمال ۔ اکثری از دست صرت پریشان شدہ بطرفی رفتند لیکن آن ثابت قدم تکیہ بر توکل نمودہ قدم از جاپر نداشت تا حال کو در شاہجہان آباد مقیم است ۔"

عبارت کی رنگینی سے قطع نظر ، مطلب بس اسی قدر ہے کہ درد صوفی تھے ، شاعر تھے اور قناعت پسند تھے ۔ نہ تو ان کی شخصیت میں جان پڑتی ہے اور نہ ان کا ماحول اجاگر ہوتا ہے ۔

مصحفی سوز کی شخصیت ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں :

" کمال ہائے این بزرگ ماورائے کمالِ شاعری و درویشی بسیار اند ، چنان چہ در تیر اندازی و سواری اسپ و نوشتن خط نستعلیق و شفیعانہ نازک بندی و نزاکت فہمی شعر و آداب و سلاطین و ظرافت طبع و خندہ روئے و ندامت پیشگی و تحصیل معاش و گفتن کلمۃ الخیر در حق دیگری و با این ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصہ شعر است نظیر خود ندارد ۔ گاہے گاہے کہ بافقیر ملاقات می شود بسیار مہربانی می فرمایند و غائب و حاضر ازین ہیچ مدان حظ دادی برداشتہ بے تکلف در ستائش دوستانہ می افزاید ۔"

مصحفی دل فریب عبارت کا جال نہیں بچھاتے ۔ بیان میں مغز زیادہ ہے لیکن بے اثر ۔ سبب یہ ہے کہ مصحفی نے سوز کے کمالات کی فہرست مرتب کردی ہے ۔ شاعری ،

درویشی، گھڑ سواری، خوشخطی، نازک بندی شعر، آداب سلوک و سلاطین کی واقفیت، ظرافت، ندامت پیشگی، تحصیل معاش، دوسروں کے حق میں کلمۂ خیر کہنا، استغنا، یہی کمالات ہیں۔ لیکن سوز کی جیتی جاگتی تصویر ہم نہیں دیکھ پاتے۔" (۱)

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ادب و معاشرے میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور تنقید و ادب میں بھی ایسا ہی گہرا ربط ہے ۔ انگریزی اقتدار کے ہاتھوں ہندوستان میں جہاں کے ساتھ ہی یہاں کی قدیم تہذیب و معاشرت میں بھی رخنے پیدا ہوئے اور انگریزی تعلیم و تخیل ، درسیات و نصاب اور افکار و خیالات نے رفتہ رفتہ اپنا قبضہ جمالیا ۔ اور ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک اور مغربی سرحد درۂ خیبر سے لے کر آسام و بنگال کی سرحدوں تک انگریزی اقتدار کا پرچم لہرانے لگا۔ اردو کی تمام اصناف اس سے متاثر ہوئیں، نظم و نثر اور ان کی جملہ اصناف ۔ غزل و نظم کا چولا بدلنے لگا۔ اور افکار کے نئے سانچوں میں تخلیقات ڈھلنے لگیں ۔ اسی طرح نثری ادب میں ناول، افسانہ ، تاریخ ، سوانح ، تنقید سب متاثر ہوئے ۔

" آب حیات " کی ابتدائی تنقید میں لکھا جاچکا ہے کہ اس کا انداز بھی تنقیدی طور پر تعریف و تحسین سے آگے نہیں بڑھتا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی رائے میں جدید تنقیدی ادب کی ابتدا اردو میں حالی سے ہونی چاہیے ۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں :

" اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے ۔" پرانی تنقید" محذوف و مقصود کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی ۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر

---

(۱) کلیم الدین احمد ، پروفیسر، " اردو تنقید پر ایک نظر" ، محولہ بالا، ص ۲۱-۱۶

غور و فکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے
استفادہ کیا۔ اپنے زمانے ، اپنے ماحول اور اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ
کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے ۔ وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اردو
کے بہترین نقاد بھی ہیں۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے گا کچھ اس سے حالی کی
تحقیر مقصود نہیں ان کی تاریخی اہمیت اظہر من الشمس ہے ، ان کی فکر
بلند پایہ ہے ، ان کا خلوص زبردست ہے ۔ لیکن ادبی دنیا بہت آگے بڑھ
گئی ہے اردو ادب کو اگر بلند کرنا ہے تو نئے نئے خیالات ، نئے اصول تنقید
سے استفادہ کرنا ہوگا۔ ایسے خیالات ایسے اصول جن کی حالی کو خبر نہ تھی
اور نہ ہوسکتی تھی۔" (۱)

اردو تنقید میں دور جدید کا بانی حالی ہی کو تسلیم کیا گیا ہے ۔ پروفیسر اختر انصاری دہلوی اپنی کتاب " حالی اور نیا تنقیدی شعور" میں اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

" مقدمہ شعر و شاعری کے مختلف مباحث اور موضوعات کی چھان بین سے یہی پتا چلتا ہے کہ حالی کی تنقیدی فکر ان کے ترقی پسندانہ تصور حیات اور ترقی پروردہ ادبی شعور کی پوری طور پر آئینہ دار تھی ، اور یہ کہ مقدمہ کا کوئی پہلو یا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس پر حالی کے مجددانہ اور درایت پسندانہ طرز فکر کی چھاپ نظر نہ آتی ہو ۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا بالکل قدرتی بات ہوگی کہ حالی اردو میں صرف تنقید کے بانی ہی نہیں بلکہ ترقی پسندانہ تنقیدی فکر کے بانی بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو ادب میں عملی تنقید کی بنیاد رکھی، بلکہ آغاز کار ہی سے تنقید اور تنقیدی فکر کو ایک نیا اور اہم موڑ بھی دیا۔ اور ایک نئے اور اہم نظریاتی شعور سے بھی آشنا کیا۔ یوں وہ ایک عہد آفرین بصیرت کے ادیب تھے اور ادبی تنقید کی دنیا میں ان کی آواز ایک عصر آفرین آواز تھی۔

حالی کی ناقدانہ اہمیت کے اس بنیادی احساس کے ساتھ دو باتوں کا ذہن

---

(۱) کلیم الدین احمد ، پروفیسر" اردو تنقید پر ایک نظر"، محولہ بالا ، ص ۸۷

میں رکھنا بہت ضروری ہے ۔ اول تو یہ کہ حالی اپنی تنقیدی فکر و نظر کے صراتی میلان ، سائنٹفک انداز، بلند دانشورانہ معیار، وسعت اور گہرائی کی بنا پر اپنے ہم عصر نقادوں سے واضح طور پر ممتاز و افضل نظر آتے ہیں ..... حالی کی تنقید اور اس کی ذہنی سطح کو نظر میں رکھ کر دیکھیے تو اس دور کی بقیہ تنقید بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی ہے ۔

دوسری بات یہ کہ گو حالی کے بعد اردو تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہوا ہے اور صنفی اعتبار سے نہیں تو مقدار کے لحاظ سے تو یقیناً ہمارا تنقیدی ادب کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے ، لیکن اس سلسلے میں جو کام حالی سے بن پڑا ہے مطلب یہ کہ مجموعی طور پر تو ہماری تنقید حالی کے زمانے کی تنقید سے بہت آگے ہے مگر حالی کی تنقیدی کار گزاری اپنے وزن اور گراں مایگی کے لحاظ سے آج تک منفرد اور بے مثال ہے ۔ مقدمۂ شعر و شاعری اردو تنقید کی خشت اول ہونے کے باوجود بعد کے تمام تنقیدی کارناموں پر فائق ہے ۔ وہ تنقید کے میدان میں ایک منارۂ نور ہے ، بلند ، عظیم اور برگزیدہ بھی اور ضو ریز و ضیا پاش بھی ۔ " (۱)

تنقید میں حالی کے بعد مولانا شبلی کا بھی خاص درجہ ہے مولانا شبلی نے تنقیدی اصولوں سے بحث کی ، شعر کے اجزاء اور عناصر اور ترکیب و ہیئت پر گفتگو کی پھر اس کو "موازنۂ انیس و دبیر" اور اس سے زیادہ " شعرالعجم " میں برت کر دکھایا۔ اس طرح شبلی کی تنقید عملی تنقید بھی ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ معیار سب مشرقی ہیں اور مشرقی نمونوں کو ہی پرکھنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ شبلی کے بارے میں پروفیسر کلیم الدین احمد اپنی محولہ بالا ، کتاب میں رقم طراز ہیں :

" حالی کے بعد شبلی کا نام آتا ہے ۔ شبلی نے بھی بعض بنیادی مسئلوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی اور مشرقی و مغربی نقادوں سے استفادہ کیا۔ وہ کہتے ہیں :

---

(۱) اختر انصاری دہلوی، پروفیسر: حالی اور نیا تنقیدی شعور"، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء ، ص ۹۱-۸۹

" شاعری کیا چیز ہے ؟ یہ ایک نہایت مفصل اور دقیق بحث ہے - ارسطو نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی میں ابن رشد نے کیا اور اس کا بڑا حصہ چھپ کر شائع ہوچکا ہے - ابن رشیق ، قیروانی اور ابن خلدون کککہ نے بھی اس پر بحث کی ہے - انگریزی زبان میں نہایت اعلا درجے کی کتابیں اس مسئلے پر لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض میری نظر سے بھی گذری ہیں گو میں ان سے اچھی طرح مستفید نہیں ہوسکتا۔"

یہ تو ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ وہ انگریزی کتابوں سے اچھی طرح مستفید نہیں ہوسکے اور نہ ہوسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی مغربی خیالات سے سطحی واقفیت رکھتے ہیں۔ اور یہ سطحیت ناگزیر تھی۔ وہ شعر و شاعری کے عناصر ، محاکات و تخیل حسن الفاظ وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھتے ہیں لیکن ان کی باتوں میں بھی گہرائی نہیں، جدت نہیں ، باریکی نہیں۔ اسی قسم کی باتیں ہیں جو حالی نے کہی ہیں۔ اس لیے میں تفصیل کے عوض چند باتوں پر اکتفا کروں گا۔ کہتے ہیں :

" خدانے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں - ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں۔ ادراک اور احساس - ادراک کا کام اشیاء کا معلوم کرنا اور استدلال و استنباط سے کام لینا ہے - ہر قسم کی ایجادات ، تحقیقات ، انکشافات اور تمام علوم و فنون اس کے نتائج ہیں۔ احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلے کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے - اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی موثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہوجاتا ہے - غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے ، خوشی میں سرور ہوتا ہے ، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے ، یہی قوت جس کو احساس ، انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کرسکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے - یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے -"

اس عبارت سے ایک زبردست مغالطہ کا پتا چلتا ہے - یعنی دماغ اور دل میں فرق

کہا جاتا ہے اور شاعری کا لگاؤ دل سے خیال کیا جاتا ہے اور دماغ یا عقل یا ادراک کو ہر قسم کی ایجادات ، تحقیقات ، انکشافات اور تمام علوم و فنون کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے گویا جذبات دل سے وابستہ ہیں ادراک اور اس کے نتائج دماغ سے شاعری کا تعلق جذبات یا دل سے ہے ، علوم و فنون کا تعلق ادراک یا دماغ سے - یہ زاویۂ نظر درست نہیں اور یہ شاعری کی ماہیت سے ناواقفیت پر مبنی ہے - شاعری اضطراری کیفیت کا نتیجہ نہیں ، تمام علوم و فنون کی طرح یہ بھی دماغی تحریکات کا نتیجہ ہے - شاعری میں اعلا ترین دماغی تحریکات کا پرتو ہوتا ہے - شاعری میں ادراک کا وجود ضروری ہے - اسی قدر ضروری ہے جس قدر دوسرے علوم و فنون میں ادراک شاعری کے لیے روح رواں ہے - شاعر اپنے زمانے میں ادراک کے سب سے بلند مقام پر ہوتا ہے - یہ صحیح ہے کہ حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ " انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں" اور اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انسان کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی - لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ جب انسان پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے - " حیوانات جب آواز یا حرکت کے ذریعے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو یہ آواز یا حرکت محض ایک اضطراری عمل ہوتی ہے -" شیر گرجتا ہے ، مور چنگھاڑتے ہیں ، کوئل کوکتی ہے ، طاؤس ناچتا ہے ، سانپ لہراتے ہیں" انسان بھی چیختا ہے - تڑپتا ہے ، بول اٹھتا ہے - لیکن اس چیخ ، اس تڑپ ، اس بول اٹھنے اور شعر میں مشرقین کا فرق ہے -

پھر یہ بھی سمجھنا چاہیے آواز یا حرکت ہر حیوان کے بس کی بات ہے جیسے

ہر انسان کو نطق اور گویائی پر دسترس ہے ۔ ہر شیر گرجتا ہے ، ہر سور چنگھاڑتا ہے، ہر کوئل کوکتی ہے ، ہر طاؤس ناچتا ہے ہر سانپ لہراتا ہے، لیکن ہر انسان شعر نہیں کہتا ہے اور نہ کہہ سکتا ہے ۔ حیوانات ہر جذبے کو کسی آواز یا حرکت کا جامہ پہناتے ہیں۔ شاعر ہر جذبے کو الفاظ کا جامہ نہیں پہناتا ہے ۔ وہ تو اہم اور قیمتی جذبات کو چن لیتا ہے اور یہ انتخاب وہ اپنے ادراک کی مدد سے کرتا ہے اور اسی ادراک کلی کی مدد سے وہ اپنے جذبات کی صحیح کامیاب مکمل اور حسین ترجمانی بھی کرتا ہے ۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ہم اپنے ہر قول و فعل میں ادراک سے کام لیتے ہیں لیکن شاعری کے لیے جو دماغ کی بہترین اعلا اور قیمتی تحریکات کی پیداوار ہے ادراک کو ضروری نہیں سمجھتے۔

شبلی کے خیال میں شاعری کے اصلی عناصر محاکات اور تخیل ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

" محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے ۔" پھر محاکات پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگرچہ محاکات اور تخیل دونوں شعر کے عناصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخیل کا نام ہے ۔ محاکات میں جو جان آتی ہے تخیل ہی سے آتی ہے ۔ جب حقیقت یہ ٹھہری کہ شاعری دراصل تخیل کا نام ہے تو پھر تخیل کی مفصل و مکمل تعریف بھی لازمی ٹھہری ۔ ورنہ شاعری کی ماہیت پر کوئی روشنی پڑسکتی ۔ شبلی قوت تخیل کی مختلف صورتوں پر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں لیکن کسی جگہ بھی تخیل کی صحیح اور جامع تعریف نہیں ملتی۔ تخیل کے بعض پہلوؤں کا ذکر البتہ ملتا ہے اور تخیل جو صورتیں اختیار کرتا ہے ان کا بیان بھی ملتا ہے ۔ ایک بات بہت کام کی بھی کہہ جاتے ہیں :

" شاعر قوت تخیل سے تمام اشیاء کو نہایت دقیق نظر سے دیکھتا ہے ۔ اور وہ ہر چیز کی ایک ایک خاصیت ایک ایک وصف پر نظر ڈالتا ہے پھر ان چیزوں

سے ان کا مقابلہ کرتا ہے ۔ ان کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالتا ہے ۔ ان کے مشترک اوصاف کو ڈھونڈھ کر ان سب کو ایک سلسلے میں مربوط کرتا ہے ، کبھی اس کے برخلاف جو چیزیں یکساں اور متحد خیال کی جاتی ہیں ان کو زیادہ نکتہ سنجی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں فرق و امتیاز پیدا کرتا ہے۔"

یہ بہت کام کی بات ہے لیکن ساتھ ساتھ شبلی کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخیل کی ماہیت سے واقف نہ تھے۔ مثلاً جب وہ تخیل کی بے عنوانی کا بیان کرتے لگتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو وہ تخیل سمجھے ہیں اس کا تخیل سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ۔

" احساس جب شعر کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے ۔" اس لیے شعر میں الفاظ کی اہمیت ظاہر ہے ۔ شبلی کو الفاظ کی اہمیت سے واقفیت ہے لیکن اس جگہ بھی وہ لغزش کرتے ہیں۔ " کتاب العمدہ" کے باب فی اللفظ و المعنی کا وہ خلاصہ درج کرتے ہیں جس میں ایک بہت اہم جملہ ملتا ہے "لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے " دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کم زور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی" لیکن اس کے بعد بھی وہ لکھتے ہیں:-

" حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے ۔ " گلستان" میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کردیا ہے انہیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔"

یہ بے خبری ہے ۔ خیالات اور جذبات اور الفاظ کے ناگزیر تعلق سے بے خبری ہے یوں وہ کہتے تو ہیں کہ اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہئے ۔ اور معنی سے بالکل بے پروا ہو جانا چاہئے لیکن ان کی تحریر سے صاف ظاہر ہے

کہ وہ الفاظ کو اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ الفاظ کو فصیح و غیر فصیح ، مانوس و نامانوس، سلیس و ثقیل الفاظ میں تقسیم کرتے ہیں اور فصیح ، مانوس اور سلیس الفاظ کا استعمال جائز سمجھتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ بظاہر نامانوس، ثقیل اور غیر فصیح الفاظ اگر موقع و محل سے کلام میں لائے جائیں تو نامانوس ، ثقیل اور غیر فصیح باقی نہیں رہیں گے۔

بنیادی مسئلوں پر تفصیلی بحث کے ساتھ شبلی نے ایک مخصوص صنف مرثیہ اور ایک مخصوص شاعر میر انیس کے کلام پر تفصیلی ریویو بھی کیا اور میر انیس کے کلام کا مرزا دبیر کے کلام سے موازنہ بھی کیا ۔ اس میں وہ حالی سے ایک قدم آگے بڑھے اور " موازنۂ انیس و دبیر" کا اثر بھی " شعرالعجم" سے زیادہ ہوا۔ اور جو سانچہ شبلی نے پیش کیا اسے آج بھی اردو نقاد استعمال کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سانچے کی قدر و قیمت کیا ہے ؟ اور اس میں کہاں تک نئی تنقید اور نئی تکنیک کی جھلک نظر آتی ہے ؟۔

کہنا پڑتا ہے کہ شبلی کا زاویہ ، شبلی کی تنقید کا ساز و سامان ، شبلی کا اسلوب ان سب چیزوں میں پرانی تنقید کی صاف کارفرمائی ہے ۔ نئی تنقید کے اصول ، نئی تنقید کا زاویۂ نظر ، نئی تنقید کی تکنیک ، یہ سب چیزیں کہیں نہیں ملتیں۔ وہ میرانیس کی شاعری کی خصوصیت ایسے عنوانات کے تحت میں بیان کرتے ہیں ۔ فصاحت ، روزمرہ اور محاورہ ، بلاغت ، استعارات و تشبیہات ، انسانی جذبات یا احساسات ، مناظر قدرت، منظر ، واقعہ نگاری، رزمیہ وغیرہ ۔ پہلی بات تو یہ ہے ، اور اس بات کا شبلی کو بھی احساس ہے کہ انسانی جذبات ، مناظر قدرت ، منظر ، واقعہ نگاری، رزمیہ الگ الگ چیزیں نہیں۔ مثلاً منظر اور رزمیہ واقعہ نگاری میں داخل ہیں۔ اس لیے ان موضوعات پر الگ الگ لکھنے کی منطقی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔

اصل نقص یہ ہے کہ ان چیزوں پر جو پرانی تنقید کی جاگیر ہیں زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا ہے ۔ پہلے فصاحت ، روزمرہ ، محاورہ ، بلاغت ، استعارات و تشبیہات کا مفصل

ذکر ہوتا ہے اور ان سے زیادہ اہم چیزوں کا ذکر پیچھے اور ضمناً ہوتا ہے ۔ فصاحت اور
بلاغت پر صفحے کے صفحے سیاہ کردیے جاتے ہیں لیکن انسانی جذبات یا احساسات کے تحت
میں بس اسی قدر تنقید ملتی ہے :

" یہ شاعری کی اصلی روح رواں ہے اور اگر مل صاحب کی رائے تسلیم
کی جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے ۔ انسانی جذبات کی سیکڑوں
قسمیں ہیں اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہیں ۔ میر انیس کے مرثیوں
میں نہایت کثرت سے ان جذبات اور ان کے مختلف مدارج کا ذکر ہے لیکن جس
جگہ جس چیز کو لیا ہے اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا
پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ۔"

اس کے بعد صرف مثالیں ہیں ۔ اس کے علاوہ فصاحت و بلاغت ، یعنی الفاظ کے
استعمال اور ان کی اہمیت پر جو کچھ لکھتے ہیں وہ قدیم نقطۂ نظر پر مبنی ہے اس میں
کوئی جدت تازگی اور باریکی نہیں ۔ کہتے ہیں :

" فصاحت علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو
حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو ، الفاظ نامانوس نہ ہوں ، قواعد صرفی کے خلاف
نہ ہو ۔"

پھر علمائے ادب کے اس قول کی تشریح کرتے ہیں :

" لفظ در حقیقت ایک قسم کی آواز ہے اور چونکہ آوازیں بعض شیریں ،
دلآویز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطی و بلبل کی آواز اور بعض مکروہ و ناگوار
مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز ۔ اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض
شستہ سبک ، شیریں اور بعض ثقیل ، بھدے ، ناگوار ۔ پہلی قسم کے الفاظ کو تو
فصیح کہتے ہیں اور دوسری کو غیر فصیح ۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ
فی نفسہٖ ثقیل و مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں
ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے ۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کیے
جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کو فن بلاغت کی اصطلاح میں

کہتے ہیں اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔"

"علمائے ادب" اور شبلی سمجھتے ہیں کہ الفاظ خلا میں بستے ہیں۔ اس لیے انہیں فصیح ، غیر فصیح اور غریب قرار دیتے ہیں۔ الفاظ خلا میں سانس نہیں لیتے ہیں اور نہ لے سکتے ہیں وہ ہمیشہ کسی چیز کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے سے کسی خاص خیال کو بیان کیا جاتا ہے ۔ ہر لفظ وہ فصیح ہو یا غریب و غیر فصیح کسی مناسب موقع و محل پر حسین اور موزوں معلوم ہوسکتا ہے ۔

بات تو یہ ہے کہ شبلی مشرقی حدود کے اندر بھی لغزشیں ، زبردست لغزشیں کرجاتے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ وہ باتیں صحیح کہتے ہیں لیکن ان باتوں کے منطقی نتائج سے آگاہ نہیں ہوتے ۔ مثلاً وہ کہتے ہیں :

" بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو" مقتضائے حال کے موافق ہونا ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسباب آجاتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں :" میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجے کی ہے لیکن یہ ان کے کمال کا اصل معیار نہیں۔ ان کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے ۔" حالاں کہ اگر بلاغت کا مفہوم یہ ہے کہ " کلام اقتضائے حال کے موافق ہو" تو میر انیس کا کلام بلکہ سارے مرثیے ، بلاغت سے معّرا ثابت ہوں گے ۔ مرثیوں میں اشخاص عربی ہیں ، مقام کربلا ہے لیکن اس اقتضائے حال کا خیال کسی مرثیہ گو کے دل میں نہیں گزرتا ۔ مرثیہ گو لکھنو کے شادی و غمی کے رسوم عرب پر منطبق کرتے ہیں۔ وہ جو ہی اور بیلے کے پھول عراق کے جنگل میں بچھادیتے ہیں۔ وہ حضرت امام اور ان کے اہل حرم کے اصل کیریکٹر پر بھی پردہ ڈال دیتے ہیں ۔ اگر بلاغت کا پہلا فرض یہ ہے کہ جو واقعہ فرض کیا جائے وہ ایسا ہو کہ وقت اور حالت کے لحاظ سے اس کا واقع ہونا یقین ہونے کے برابر ہو اس کے ساتھ واقعہ کے جزئیات اور کیفیات جو بیان کئے جائیں وہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہوں تو مرثیہ میں بلاغت ممکن ہی نہیں۔ واقعہ کربلا کے تصور اور اس کی جزئیات دونوں مقتضائے حال کے ناموافق ہیں۔ پھر کیسے شبلی کو

مرثیوں کے امکانات و حدود سے صحیح واقفیت نہیں۔ مثلاً وہ مرثیوں کی ان خامیوں سے بالکل بے خبر ہیں جن کا ذکر " اردو شاعری پر ایک نظر " میں ہے ۔

حالی نے پرانی تنقید سے الگ ہوکر نئی تنقید کی ابتدا کی ، شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں۔" (۱)

پروفیسر کلیم الدین احمد کی یہ تنقید اور شبلی کا تجزیہ خود کافی متنازعہ فیہ ہے۔

یہ توقع کرنا کہ شبلی مغربی ادب سے (اس سے انگریزی دان طبقے سے مراد علی العموم انگریزی ادب ہوتا ہے) اسی طرح واقف ہوں گے جیسے آج کل کے انگریزی ادب کے فارغ التحصیل یا ایم ۔ اے تو یہ لا یعنی بات ہے ۔ وہ اگر واقف بھی ہوتے اور ان اصولوں کا اطلاق اردو یا فارسی کے قدیم اور کلاسیکل ادب پر کرتے تو نہایت غیر معتدل اور غیر متوازن نتائج برآمد ہوتے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی محولہ بالا تحریر کا آخری فقرہ ہے ۔" شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں۔"

حالی اور شبلی کے بعد اہم نام ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا سامنے آتا ہے۔

مولوی صاحب کے ہاں تحقیق و تنقید دونوں ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد ان کے انداز فکر و نظر کے متعلق لکھتے ہیں :

" عبدالحق صاحب پختہ کار ہیں وہ عجلت سے کام نہیں لیتے ہیں۔ محنت اور غور و فکر ان کی عادت ہے ۔ وہ عموماً اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے ہیں اور جب تک بات کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے رائے زنی نہیں کرتے ہیں۔ اپنی حدود کے اندر ذوق صحیح رکھتے ہیں ، اچھے برے کھرے کھوٹے میں تمیز کرسکتے ہیں۔ وسعت نظر بھی موجود ہے۔ مغربی ادبوں سے تو واقفیت نہیں لیکن مغربی اصول تحقیق سے واقفیت ہے ۔ جزئیات سے کافی شغف ہے اور معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔ ان کے طرز

---

(۱) کلیم الدین احمد ، پروفیسر، " اردو تنقید پر ایک نظر"، محولہ بالا ، ص ۲۰-۱۱۲

تحقیق کا ایک نمونہ "مقدمۂ باغ و بہار" ہے - " باغ و بہار" فارسی قصہ " چہار درویش" کا ترجمہ ہے - میر امن بھی کہتے ہیں - لیکن عبدالحق صاحب نے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ کتاب فارسی قصہ کا ترجمہ نہیں ہے - وہ کہتے ہیں :" قصہ وہی ہے لگ مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اردو کی کتاب " نو طرز مرصع " ہے - وہ رائے زنی نہیں کرتے بلکہ " چہار درویش" ، " نو طرز مرصع" اور " باغ و بہار" کا مقابلہ کرتے ہیں- جس سے ان کے قول کی پوری تصدیق ہوجاتی ہے - جو ثبوت وہ پیش کرتے ہیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں - " (۱)

مزید مولوی عبدالحق صاحب کے لیے ان کی رائے یہ ہے :

" عبدالحق صاحب کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے - وہ انگریزی سے واقف ہیں ، حالی سے کچھ زیادہ ہی واقف ہیں- اگر وہ چاہتے تو انگریزی ادب ، مغربی اصول تنقید سے بہت کچھ واقفیت حاصل کرسکتے تھے- اس واقفیت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے بھی انھوں نے یہ واقفیت حاصل نہ کی یہی ان کی سب سے بڑی کمی ہے اور اسی وجہ سے ان کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے - وہ مشرقی ادب کی محدود اور مقامی مشرقی معیار سے جانچتے ہیں اور کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتے ہیں- تنقید میں بھی تحقیق کا رنگ جھلکتا ہے- جس کتاب پر تنقید لکھتے ہیں اس پر کامل غور کے بعد قلم اٹھاتے ہیں اور عموماً بے لاگ رائیں دیا کرتے ہیں- کتاب کی خوبیاں اور خامیاں ، دونوں پہلوؤں کا بیان کرتے ہیں اور غیر جانب داری سے کام لیتے ہیں- اپنی تنقید کو مثالوں سے جامع کرتے ہیں اور کج فہمی و کککک کوتاہ نظری سے اپنے دامن کو آلو دہ نہیں کرتے ہیں- میر صاحب کی خصوصیتوں کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

" الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی ترتیب و ترکیب ، زبان میں موسیقی پیدا کردیتی ہے - اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر

---

(۱) کلیم الدین احمد ، پروفیسر، " اردو تنقید پر ایک نظر"، محولہ بالا ، صص ۲۲-۱۲۱

کا رتبہ بلند ہوجاتا ہے ۔ میر صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔
اور اس کے ساتھ ہی ان کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر
چوٹ لگتی ہے ۔ جو لطف سے خالی نہیں ہوتی .... ان کی شاعری عاشقانہ
ہے لیکن کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی ،
صفائی اور خوبی سے ادا کرجاتے ہیں جس پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں
قربان ہیں۔ یہ خاص انداز میر صاحب کا ہے ۔"

ان جملوں سے مختصر مگر جامع طور پر میر کے کلام کی خصوصیتوں کا بیان ہے ،
موسیقی سادگی، سوز و گداز میر کی شاعری کی اہم خصوصیتیں ہیں۔ " فغان شوق" پر
تنقید کرتے ہیں اور کیسی صحیح تنقید کرتے ہیں :

" ان کا دیوان اور غزلیں اگر دیکھیے تو مذاق جدید اور جذبات نگاری
سے بالکل الگ ہیں۔ قدیم رنگ نمایاں ہے اور وہ بھی خاص ہے لکھنو کا فرسودہ
رنگ .... رعایت لفظی کا تو اتنا زیادہ نہیں مگر محاورات ، ضرب الامثال ، بول
چال ، نظم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آورد کو آمد بنانے کی بھی ۔ یہی ان کے
دیوان کا امتیازی رنگ ہے ۔ اس پر شگفتگی اور برجستگی بہت ہے اور یہ مشاقی
کی دلیل ہے کہ کلام گنجلک نہیں ہونے پاتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل زمینوں
میں طبع آزمائی کا خاص ذوق رکھتے ہیں ۔ ان کا زور زیادہ تر لفظی صنائع اور
فنی خوبیوں تک ہے لیکن شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعر کی اصل روح جو
انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچادے وہ نہیں ہے اور ہے تو بہت کم ۔"

ا اس قسم کی سلجھی ہوئی تنقید اکثر ملتی ہے ۔ خیالات کے بیان میں متانت ہوتی
ہے سنجیدگی ہوتی ہے ۔ متانت کبھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی کسی خاص خیال یا
زاویۂ نظر کی کورانہ تقلید بھی نہیں ملتی۔ عبدالحق صاحب جو کچھ کہتے ہیں وہ سمجھ
بوجھ کر ، صداقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی رائیں بے لاگ
ہوتی ہیں اور خارجی واقعات سے متاثر نہیں ہوتیں۔ لکھنو اسکول کے بارے میں لکھتے ہیں :

" اصل بات یہ ہے کہ ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے ، اس کی جھلک اس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے اگر ہم اسی زمانے کے لکھنو کو دیکھیں اور اس کے تمدن پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اہل لکھنو کے کھانے ، پینے، رہنے سہنے، لباس ، آداب و اطوار غرض تمام طرز معاشرت میں سراسر تصنع اور تکلف پایا جاتا تھا۔ انھیں سچ سمجھ کر کسی خاص امتیاز کے پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو عام روش زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی تھی اس میں ان کا علم و ادب بھی رنگا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ منطق و فلسفہ اور علم کلام کی مزاولت نے ان کے علم و ادب پر اثر ڈالا لیکن اس سے قبل دلی میں بھی ان علوم کا چرچا تھا اور دور دور سے طالب علم ان علوم کی تحصیل کے لیے وہاں آتے تھے - لیکن وہاں کی بول چال اور نظم و نثر پر بھی کچھ ایسا برا اثر نہیں پڑا مگر اس زمانے کے لکھنو کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی اور یہ ان کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے - وہ نئی تراش خراش اور جدت پر مٹے ہوئے تھے اور عوام و خواص میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ اس لیے سب کے سب ادھر ڈھل گئے اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کردی۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی، میر اور ان کے ہم عصروں کا اثر زائل ہوگیا اور ان کے بجائے دوسرے استاد پیدا ہوئے جو اس سوسائٹی کے سپوت اور اس تمدن کے پروردہ تھے۔ حضرت ناسخ اور ان کے بعد خواجہ وزیر، صبا ، رشک اور امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع جگت ، لفظی مناسبت اور تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں۔ نثر میں اس کا سب سے عمدہ نمونہ مرزا رجب علی سرور کا فسانۂ عجائب ہے - اس دور کا اثر شاید اب بھی لکھنو کی سر زمین میں کہیں کہیں باقی ہے - لیکن یہ چلنے والی چیز نہ تھی ، آخر زور ٹوٹا۔"

یہاں شعرائے لکھنو کی کمی کا صاف صاف بیان ہے اور غالباً پہلی مرتبہ تمدن کا جو اثر شاعری اور ادب پر ہوتا ہے اس کا اظہار کیا گیا ہے - اور اس میں صرف حقیقت و صداقت کو پیش نظر رکھا گیا ہے -

بے جا نکتہ چینی عبدالحق صاحب کا شیوہ نہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان ہی سے لغزش ہوتی ہے ۔ محقق اور نقاد بھی انسان ہیں اس لیے ان سے اکثر لغزشیں ہوجاتی ہیں لیکن لغزشوں کی وجہ سے ان پر بے جا سرزنش انصاف کے خلاف ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

" غلطی تحقیق و جستجو کی گھات میں رہتی ہے ۔ ادب کا کامل ذوق سلیم ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے نقاد اور مبصر فاش غلطیاں کرجاتے ہیں لیکن ان سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا ہے ۔ غلطی ترقی کی مانع نہیں ہے بلکہ وہ صحت کی فطری رہنمائی کرتی ہے پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو رستہ بھٹکنے سے بچادیتی ہے ۔"

شرط یہ ہے کہ غلطی کو غلطی سمجھا جائے نہ یہ کہ خامیوں کو محاسن تصور کرلیا جائے ۔ پھر کبھی عبدالحق صاحب کسی کی بے جا سرزنش نہیں کرتے ہیں۔ وہ غلطیوں کا انکشاف البتہ روا سمجھتے ہیں لیکن اس طریقے پر کہ اس سے مصنف کی تحقیر نہیں ہوتی اور نہ اس پر استہزا کیا جاتا ہے :

" بعض بعض باتیں اس کتاب میں عجیب ملتی ہیں جس سے ہمارا یہ شبہ قوی ہوجاتا ہے کہ قابل مولف جن کتابوں کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں ان کا مطالعہ یا تو انھوں نے بالکل نہیں کیا ہے یا کیا ہے تو محض سرسری ، مثلاً نورس کے متعلق لکھتے کہ ..... پہلا بادشاہ تھا جس نے اردو میں لمبی نظم لکھی ہے اس کا نام نورس ہے اور موضوع موسیقی ہے ۔ نورس کو اردو کی کتاب کہنا ایسا ہی جیسے کوئی " گیتانجلی" کو اردو کی کتاب کہے ۔ نورس ٹھیٹ ہندی زبان میں ہے اور اسے اردو سے کوئی تعلق نہیں۔" (۱)

مولانا قادری کی حیثیت محقق اور نقاد دونوں کی ہے ۔ پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ " داستان تاریخ اردو" کے طبع ہونے سے قبل یہی سمجھا جاتا تھا کہ نظم کی طرح نثر کی

---

(۱) کلیم الدین احمد ، پروفیسر، " اردو تنقید پر ایک نظر"، محولہ بالا ، صص ۳۲- ۱۲۸

ابتدا بھی دکن سے ہی ہوتی ہے ۔ اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب " معراج العاشقین" کو ہی پہلی کتاب بتایا جاتا تھا۔ پہلی بار مولانا نے خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (متوفی ۸۰۸ہجری/۱۴۰۵ء) کے رسالے کو جو اخلاق و تصوف کے موضوع پر ہے اور ۷۰۸ ھجری میں تحریر کیا گیا اردو کی پہلی کتاب قرار دیا۔ پہلے اس پر بعض اصحاب نے شک و شبہات کا اظہار کیا لیکن اب عام طور پر اس کو ہی اردو کی پہلی تصنیف سمجھا جاتا ہے ۔

" داستان تاریخ اردو" میں مولانا نے اس کے نمونے جگہ جگہ دیے ہیں۔ " داستان تاریخ اردو" سے پہلے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں عام طور پر اردو کے ابتدائی دور کا ذکر کرنے کے بعد انگریزوں کی آمد ان کے اثرات اور ان کے اقدامات پر بحث کی گئی ہے ۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کا ذکر ملتا ہے اور بہت تفصیل سے اس پر لکھا گیا ہے ۔ ہم بھی سابقہ اوراق میں " فورٹ ولیم کالج" کی اہمیت اور اس کی خدمات کے ذکر کرچکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو نثر کو ترقی دینے میں اس کو آگے بڑھانے اور صاف و سلیس بنانے میں" فورٹ ولیم کالج" کا بڑا ھاتھ ہے ۔ مگر " داستان تاریخ اردو" سے قبل یہ تاثر عام تھا کہ یہ تمام اقدامات اور کوششیں صرف کالج اور ارباب اقتدار کی جانب سے ہی ہوئیں ۔ اور کالج کے دور سے لے کر سرسید کے عہد تک ایک خلا معلوم ہوتا تھا ۔ جسے بعض اصحاب نے عہد تاریک کا نام بھی دیا ہے ۔ وجہ یہ تھی کہ کسی نے تحقیق کرکے ان مصنفین کے حالات بہم نہ پہنچائے جو " فورٹ ولیم کالج" سے غیر متعلق رہ کر از خود آزادانہ اردو کی خدمت کرتے رہے تھے۔

مولانا قادری نے پہلی بار داستان میں ایک پورا باب " مصنفین بیرون کالج" قائم کیا اور اس میں تفصیل سے ان مصنفین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس نام نہاد، عہد تاریک میں

علم و ادب کے چراغ جلائے رکھے ۔ مولانا تحریر کرتے ھین :

" اسی زمانے مین جب کہ فورٹ ولیم کالج مین تصنیف و تالیف کا محکمہ جاری تھا ھندوستان کے دوسرے شھرون مین بھی اصحاب علم و ادب انفرادی طور پر نظم نثر اردو کی کتابین لکھنے مین مصروف تھے۔ دکن کے اسی عھد کے بعد مصنفین نثر (شرف الدولہ ، بدرالدولہ وغیرہ) کا ذکر "دکن مین عھد مغلیہ کے بعد کے دور" مین آچکا ھے ، دھلی، لکھنؤ، آگرہ وغیرہ مقامات مین بھی ارباب قلم رفتار اردو کی ترقی مین سعی بھم کر رھے تھے ۔ لیکن کالج سے باھر کے مصنفون کو مطبع و اشاعت کی آسانیان میسر نہ تھین ۔ کالج مین دارالترجمہ کے ساتھ مطبع قائم ھوگیا ، اور ١٨٠٣ع سے کتابین چھپنی شروع ھوگئین ۔ لیکن فورٹ ولیم کالج سے باھر ١٨٣٧ع مین دھلی مین مطبع کھلا ۔ اس کے بعد کتابون کو طباعت و اشاعت نصیب ھوئی ۔ اس سبب سے دھلی، لکھنو وغیرہ مین قیام کالج سے پہلے ، اور زمانہ کالج ، بلکہ اس سے کچھ عرصہ بعد تک جو کتابین لکھی گئین وہ مشہور و عام نہ ھوسکین ۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ ترقی اردو انیسوین صدی کے شروع مین بھی تنھا " فورٹ ولیم کالج " ھی کی احسان مند نھین ھے بلکہ بیرون کالج بھی اردو کی رفتار کو تیز کرنے کی کوششین جاری تھین ، چند نام اٹھارھوین اور انیسوین صدی کے گنائے جاتے ھین :

١- ھرن‌ھرپرشاد مصنف " بدائع الفنون" (١٨٢٣ع / ١٢٣٦ھجری)

٢- بندابن متھراوی(متوفی ١٧٥٧ع /١١٦٧ھ) مصنف تذکرہ معاصرین۔

٣- محمد حسین کلیم دھلوی(١٧٥٣ع / ١١٦٧ھ مین زندہ تھے) (مترجم فصوص الحکم)

٤- نادر علی شاہ قادری مصنف " رسالہ تصوف" (١٧٧٦ع/١١٩٠ھ)

٥- مولوی قدر عالم بن مولوی بدر عالم مصنف فقہ " محفوظ خانی" (١٧٨٥ع /١١٩٩ھ)

٦- حکیم محمد شریف خان دھلوی(متوفی ١٨٠٧ع / ١٢٢٢ھ) (مترجم قرآن مجید)

٧- محمد جعفر مصنف " روح الایمان و اسلام" (١٧٨٩ع / ١٣٠٢ھ)

٨- مولوی کریم الدین دھلوی مترجم تاریخ " ابی الفدا"(١٨٠٠ع/١٢١٥ھ)

۹- مولوی حافظ احمد مصنف " سراج ایمان" (۱۸۰۰ع/۱۲۱۵ھ)
۱۰- مولوی محمد صفا مصنف" زاد آخرت" (۱۸۰۲ع / ۱۲۱۷ھ)
۱۱- مولوی حافظ محمد علی مصنف " راہ نجات" (۱۸۰۳ع /۱۲۱۸ھ)
۱۲- مولوی محمد حیات مصنف " سراج الحیات" (۱۸۰۶ع/ ۱۲۲۱ھ)
۱۳- مولوی عبدالقادر مصنف " گلشن دین" (۱۸۱۲ع/ ۱۲۲۷ھ)
۱۴- مولوی محمد خالق اکبر آبادی مصنف " مخزن القواعد" (۱۸۱۳ع / ۱۲۲۸ھ)
۱۵- مولوی قادر بخش بادی پتی مصنف " مختصر التجهد" (۱۸۲۶ / ۱۲۳۲ھ)

یہ سب فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور ساتھ کے مصنفین ہیں۔" (۱)

داستان میں ہی پہلی بار مولانا قادری نے سرسید کے مخالفین کو ان کا جائز مقام دیا۔ ان کے حالات فراہم کیے اور تفصیلی تنقید کی - مثلاً مولوی محمد علی تحصیل دار کے حالات میں لکھتے ہیں :

" سرسید کی مذہبی تحریروں نے علمائے ہند کو نہایت مضطرب کردیا تھا۔ ہر طرف سے ان کی مخالفت میں کتابیں اور اخبار شائع ہورہے تھے - حد اعتدال کو قائم رکھنا عالم و جاہل دونوں کے لیے دشوار ہوتا ہے ، چناں چہ جوش مخالفت میں سرسید پر کفر کے فتوے لگادیئے گئے پھر جب ۱۸۸۰ع سے سرسید نے تفسیر قرآن کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو مخالفت اور بڑھ گئی - ان مخالفین میں ایک زبردست مخالف مولوی محمد علی صاحب بھی تھے انھوں نے سرسید کے ایک ایک فقرے ، ایک ایک بات کا جواب لکھنا شروع کردیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحوں کی کئی جلدیں تصنیف کیں یہ مجلدات " البرہان" کے نام سے مشہور ہیں۔ پورا نام یہ ہے :" اَلبُرہَانُ عَلٰی تَجہِیلِ مَن قَالَ بِغَیرِ عِلمٍ فِی اُلقرآن" - اب نہ سرسید کی تفسیر کوئی پڑھتا ہے نہ اس کا رد دیکھنے کی کسی کو ضرورت ہے - لیکن اس قسم کا لٹریچر بھی انیسویں صدی کی

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، صص ۲۳-۱۶۲

عجیب و غریب پیداوار ہے ۔ مولوی محمد علی صاحب بڑے عالم اور باخبر بزرگ تھے۔ اس زمانے میں ایک طرف عیسائی اسلام پر حملے کر رہے تھے۔ دوسری طرف سرسید اور مولوی چراغ علی نے عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں اسلام کے بعض مسلّم قوانین و اصول کی توجیہ اور رائے زنی شروع کردی۔ ایسے معرکۂ آرا میں مطابق حدیث شریف " اختلاف امتی رحمۃ " (میری امت کا اختلاف رائے و اجتہاد بھی رحمت ہے) کبھی ایک فریق حق پر ہوتا ہے کبھی دوسرا۔ بہرحال مولوی محمد علی صاحب نے عیسائیوں اور (بقول خود) نیچریوں، دونوں کے جواب لکھے ۔ ۱۸۷۳ء میں کان پور سے ایک رسالہ " نورالآفاق " اسی مذہبی مناظرے اور مناقشے کے لیے جاری ہوا تھا۔ اس میں بھی مولوی صاحب نے مضامین لکھے ۔" (۱)

تنقید میں مولانا قادری کا خاص مرتبہ ہے جو سب سے جدا ہے ۔ مولانا نے اپنے مسلک کو اپنے مضمون" انقلابی شاعری" (مطبوعہ " نگار"، لکھنو، ۱۹۳۳ء) میں بڑی خوب صورتی سے بیان کردیا ہے ۔ اس مضمون کے طویل اقتباسات آئندہ صفحات میں پیش کیے جائیں گے ۔ یہاں ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں مولانا اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں :

" میں اپنے مذہب،اخلاق و معاشرت،ادب اور شاعری سب میں نہایت " کٹّر" واقع ہوا ہوں، میں اپنے مذہب کو " الہامی" اپنی تہذیب کو " توفیقی" اور اپنے شعر و ادب کو " روایتی" سمجھتا ہوں اور ان میں سے کسی کے متعلق اپنے نظریے و عمل کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ میں زندگی کے ہر پہلو، انقلاب کی ہر تحریک اور شعر و ادب کی ہر تجدید کو اپنے اصول پر جانچتا پرکھتا ہوں۔" (۲)

یہ مختصر مگر جامع بیان مولانا کے نظریے، اسلوب اور اصول کی بنیاد فراہم کردیتا ہے۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا: " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص: ۹۵-۳۹۳

(۲) حامد حسن قادری، مولانا: " انقلابی شاعری"، " نگار" (ماہنامہ) ، لکھنو: جنوری و فروری، ۱۹۳۳ء ، ص: ۸۵

اس بارے میں الفاظ کا واوین میں ہونا خاص معنی رکھتا ہے یعنی جب وہ یہ کہتے ہیں کہ " میں اپنے ادب کو " روایتی " سمجھتا ہوں" تو اس فقرے میں روایتی کا لفظ واوین میں تحریر کرتے ہیں اس لیے اس کی خاص اہمیت ہوجاتی ہے اور اس کے خاص معنی بھی ہیں۔ روایتی اس معنی میں کہ دوسرے لوگ اسے روایتی سمجھتے ہوں تو سمجھیں مگر اصل میں یہ روایتی نہیں۔ اس کی تصدیق اسی مضمون کے اگلے فقرے سے بھی ہوجاتی ہے - جب وہ یہ کہتے ہیں کہ " میں زندگی کی طرح شعر و ادب میں بھی انقلاب کو ناگزیر سمجھتا ہوں ۔ لہذا اگر کوئی ادیب انقلاب کو زندگی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ نہ تو قدامت پسند ہوسکتا ہے نہ روایتی ہی کہا جاسکتا ہے - اور جو شخص ادب و شعر میں بھی انقلاب کا نہ صرف قائل ہو بلکہ اسے ناگزیر حل بھی سمجھتا ہو اسے تو کسی بھی طرح روایتی یا قدامت پسند کہا ہی نہیں جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے روایتی کے لفظ کو واوین میں لکھنا پسند کیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اسی مضمون میں اس فقرے سے پیشتر ہی مولانا نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ " میں بڑھاپے کی نسبت سے بہت بڑھ کر قدامت پسند بلکہ " پرست " ہوں ۔" اس فقرے میں بھی مولانا نے لفظ " پرست " کے لاحقے کو واوین میں تحریر کیا ہے - ان بیانوں کی مطابقت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ مولانا کو مشرقی اقدار ، تہذیب اور معاشرہ عزیز تھا۔ اور جو صالح عناصر ان اقدار میں شامل تھے ان کی شکست و ریخت انھیں گوارا نہ تھی۔ اور محض تجدد پسندی کے نام پر معاشرے کی بیخ کنی ان کے نزدیک فعل مستحسن نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے اس نیک رویے کو قدامت پسندی بلکہ پرستی سے تعبیر کیا۔ حالاں کہ جس کا نظریہ یہ ہو کہ وہ معاشرے کا خاموش تماشائی نہیں ہوسکتا اور اگر ادیب و شاعر و نقاد ہے تو شعر و ادب کے میدان میں شکست خوردہ ماضی کی طرف منہ کرکے نہیں بیٹھ سکتا۔

مولانا کی تنقید میں ہمیں ماضی اور مستقبل دونوں کے صالح اور صحت مند عناصر پیوستہ نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنی فکر و نظر پر اعتماد ہے اپنے اصول و اساس تنقید پر بھروسہ ہے اس لیے ان کی رائے میں پختگی و اصابت ، خیالات میں گیرائی و گہرائی ، نظر میں وسعت و بلندی اور لب و لہجے میں ہم آہنگی و صداقت ہے ۔ مولانا قادری نے بعض ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن پر شبلی لکھ چکے تھے۔ لیکن علامہ شبلی کے بعض حیرت ناک تسامحات کو انھوں نے صاف صاف بیان کیا ہے اور سخت سے سخت تنقید میں بھی انصاف پسندی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے " علامہ شبلی اور مرزا دبیر" کے عنوان سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

" علامہ شبلی ہندوستان میں بہترین نقاد گزرے ہیں ان سے زیادہ مذاق سلیم ہونا ان سے بہتر استدلال کرنا مشکل ہے ۔ لیکن ان کی طبیعت میں ایک عجیب بات تھی جو نقاد و مورخ کی شان سے بعید ہے ۔ یعنی ہیرو پرستی و رجحان پسندی ۔ اور اپنے ناپسندیدہ شخص کی ہنر پوشی و عیب کوشی ۔ انھوں نے اپنے " موازنہ " میں انیس کے متعلق جو رائے قائم کی ہے ۔ انیس کے جس قدر محاسن دکھائے ہیں وہ حرف بحرف صحیح و درست ہیں۔ لیکن دبیر کے معاملے میں ان سے ذراسی لغزش ہوگئی ۔ ان کا یہ تعجب بالکل بجا ہے کہ " اس کا فیصلہ نہ ہوسکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔" بلا شبہ انیس کی ترجیح کھلی ہوئی ہے ۔ لوگوں نے ترجیح کے مفہوم پر نظر نہیں رکھی۔ اور دبیر کے کلام پر اصول تنقید کے لحاظ سے نظر نہیں کی اس لیے فیصلہ نہ ہوسکا۔ تاہم خود شبلی سے یہ پہلو نظر انداز ہوگیا کہ ترجیح کے لیے یہ شرط نہیں کہ غیر مرجح شخص میں کوئی خوبی نہ ہو یا اس کی خوبیوں سے چشم پوشی کی جائے۔ یا ان کو کم کر کے دکھایا جائے۔ اس معاملے میں مولانا نے عجیب و غریب پریشان خیالی کا

اظہار کیا ہے ۔ دبیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ " فصاحت ان کے کلام کو چھو نہیں گئی ۔ بلاغت نام کو نہیں ۔ کسی چیز یا کسی کیفیت یا کسی حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ قطعا بالکل عاجز ہیں۔" اس کے بعد فرماتے ہیں " ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ ان کے کلام میں کثرت سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں۔ لیکن گفتگو قلت و کثرت میں ہے ۔" جب گفتگو قلت و کثرت میں تھی تو یہی بات کہنی چاہئے تھی یہ الفاظ (چھو نہیں گئی ، نام کو نہیں ، بالکل عاجز ہیں) لکھنے ہی مناسب نہ تھے۔ اس لیے کہ خلاف واقعہ ہیں۔ مولانا نے ان الفاظ سے جو اثر مرزا دبیر کے خلاف پیدا کرنا چاہا ہے وہ بھی درست نہیں ہے ۔ دبیر کے کلام میں فصاحت و بلاغت و تخیل لطیف و محاکات انیس کے مقابلے میں کم اور بہت کم سہی ۔ پھر بھی ہے اور بہت ہے ۔

موازنہ کا حق یہ تھا کہ علامہ شبلی دبیر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرکے بجائے ایک دو واقعات یا چند اشعار کے وہ کلام تمام یا اکثر حصے پیش کرتے جہاں دبیر انیس سے بڑھ کر یا برابر کام یاب ہوئے ہیں۔ یہ ہوتا تو پھر مولانا سے کوئی شکایت نہ ہوتی اور ان کی رائے ترجیح پر بھی درست ہی رہتی۔

یہ کام چودھری نظیرالحسن صاحب رئیس سہاور نے بڑی کاوش و اہتمام سے اپنی نہایت دل چسپ و مفید تصنیف " المیزان" میں کیا ہے ۔ اگرچہ چودھری صاحب بھی دبیر کے متعلق اسی مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں جس میں مولانا آزاد و مولانا عبدالحئی وغیرہ ہیں۔ " المیزان" میں شبلی کے اعتراضات کے جواب بھی دیئے گئے ہیں جو بعض جگہ صحیح ہیں اور بعض جگہ غلط ۔ صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں ۔ مرزا دبیر کی شیپ ہے :

ارباب سخن پر جو سخن ور ہے ہمارا
القاب سخن سنج و سخن ور ہے ہمارا

علامہ شبلی کا اعتراض ہے کہ " لقب کی بجائے القاب باندھا ہے -" مصنف " المیزان" جواب دیتے ہیں کہ " القاب کو محاورے میں مثل واحد استعمال کرتے ہیں اور اس کے لیے فعل واحد لایا جاتا ہے -" پھر مثال میں تعشق ، دل گیر، مونس ، دلفس کے چار شعر لکھے ہیں - مونس کا شعر یہ ہے :

خط میں القاب کیا سبط نبی کو یہ رقم

قبلۂ کون و مکان پشت و پناہ عالم

باقی تینوں اشعار میں بھی القاب اسی معنی میں استعمال ہوا ہے - یہاں چودھری صاحب سے ذراسی غلطی ہوگئی - مکتوب کا " القاب " واحد ہی بولا جاتا ہے - اس لیے ان اشعار میں صحیح ہے لیکن دبیر کے شعر میں خط لکھنے کا مضمون نہیں ہے کہ یہ معنی ہوسکیں کہ خط میں ہم کو سخن سنج و سخنور القاب لکھا جاتا ہے ، بلکہ وہاں دوسرے معنی ہیں یعنی لقب اس نام کو کہتے ہیں جو کسی صفت کے سبب سے مشہور ہوجائے جیسے بابا شیخ فرید کا لقب گنج شکر یا خاقانی کا حسان عجم - اور اس مفہوم کے لیے القاب کو واحد لکھنا جائز نہیں -

بہرحال " المیزان" میں مرزا دبیر کے محاسن نہایت خوبی کے ساتھ نمایاں کیے گئے ہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب بہت قابل قدر ہے - ہم نے آئندہ صفحات میں " المیزان" سے بھی مثالیں اخذ کی ہیں-

جس فصاحت کو علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ دبیر کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی وہ کہیں کہیں ایسی اعلا ہے کہ اگر ان بندوں کو میر انیس کے کلام میں ملادیا جائے تو پہچان مشکل ہے - مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام کے رجز کے یہ چند بند :

مانا یزید صاحب دولت ہے ہم نہیں   پر وہ وہی ہے اور شرافت میں ہم ہیں

ہوتی ہے آسماں کے مقابل کہیں زمیں   وہ تخت کا مکیں ہے تو ہم عرش کے مکیں

ممکن ہے زور و زر سے یہ رتبہ کسی کا ہو

چاہے جسے خدا وہ مولا سبھی کا ہو

فوج اس کے پاس بھی ہے یہ فوج خدا کہاں   صاحب علم ہزاروں یہ عباس سا کہاں

بیٹے بہت یہ اکبر گلگوں قبا کہاں   لاکھوں میں ایک ، ثانی خیرالوریٰ کہاں

بھائی یزید کا کوئی مثل حسن بھی ہے

زینب سی عابدہ کوئی اس کی بہن بھی ہے

فرش اس کا جبرئیل کا پر ہو، نہ ہونے کا   عرش بریں پہ اس کا گذر ہو، نہ ہونے کا

سلطان دیں وہ باغیٔ شر ہو نہ ہونے کا   دنیا اگر ادھر کی ادھر ہو ، نہ ہونے کا

بولے غلط سناتے ہیں مذہب پلید کے

وحی خدا بھی آتی ہے گھر میں یزید کے ؟

یہ جد ، یہ کد ، یہ سعی ، یہ کوشش یہ اہتمام   یہ صف کشی ، یہ مورچہ بندی ، یہ قتل عام

اس پر کبھی مٹے جو سب کہ مٹے پنج تن کا نام   داحق ، جہت ، نشاں مرا قائم ہے تا قیام

حاشا ! کبھی جو آل رسول امم مٹیں

قرآں مٹے کسی کے کیے مٹائے تو ہم مٹیں

حضرت علی اکبر ماں سے اجازت جنگ لیتے ہیں اور پھوپھی سے نہیں لیتے - ان

کے دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے - اس کے اظہار کا انداز دیکھیے :

اکبر کے سدھانے کو یہ کہتی تھی زباں سے   اے عون و محمد تمہیں لاؤں میں کہاں سے

جو کام کیا وہ جو کہے مجھ سوختہ جاں سے   اب قدر ہوئی بھاوج کی جب چھٹ گئے ماں سے

کیا جان کے دم بھرتی تھی ہم شکل نبی کا

سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

پھر بانو کے پاس آکے یہ فرمایا بہ رقت   لو بھابی یہ ملبوس یہ اکبر کی امانت

بچپن کو بھی کرتے تھیں مجرائی کے بھی خلعت   اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت

تم والدہ ان کی ہو پدر سرور دیں ہیں
یہ آج کھلا ، ہم کوشی اکبر کے نہیں ہیں

پھر رونے لگی پیٹ کے واں زینب ناچار — ہم شکل نبی لوٹنے یہ کہتے ہوئے اک بار
میری بھویں اماں مری مالک ، مری مختار — میں تو ہوں غلام آپ کا ، کہیں آپ ہیں بیزار
ہم چاہتے ہیں تمہیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ ! اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو — دم رکتا ہے ، باہیں ہیں گلے میں مرے ڈالو
ماں بیٹھی ہے وہ ، جاؤ گلے اس کو لگالو — بانوکی خوشامد کرو ، مرنے کی رضا لو
میں پیار نہیں کرتی ، میں قربان نہیں ہوتی
جاؤ میں تمہاری بھویں اماں نہیں ہوتی

بھائی
جیتی رہیں ~~[illegible]~~ ، وہ ہیں حق دار تمہاری — میں کاہے کو ہونے لگی مختار تمہاری
جاؤ نہ سواری تو ہے تیار تمہاری — اٹھارہ برس کی ہوں پرستار تمہاری
کس سے کہوں کیا خون جگر پیتی ہوں ہے ہے
دل پر تو چھری چل گئی اور جیتی ہوں ہے ہے

ان بندوں میں روزمرہ و محاورے کی خوبی اور بندش کا حسن بھی قابل دید ہے -

حضرت زینب کے فرزند عون و محمد علم لینے کے آرزو مند ہیں لیکن ماں کے سمجھانے سے رضائے امام پر راضی ہیں- حضرت امام حسین ، حضرت عباس کو علم عنایت فرماتے ہیں- یہاں مرزا دبیر نے ایک نیا واقعہ لکھا ہے - لیکن دیکھیے کس خوب صورتی سے لکھتے ہیں :

جاسوس نے معرکے جو دیکھا یہ ماجرا — جاکر کہا عمر سے خواہد کچھ سنا ؟
بولا وہ کیا ؟ کہا کہ مبارک کرے خدا — واں تفرقہ سپاہ حسینی میں پڑ گیا
منصب جو اپنے جد کا نہ پایا خفا ہوئے
جعفر کے پوتے فوج خدا سے جدا ہوئے

گردن اٹھا کے کہنے لگا شمر بد شعور — ہاں سچ تو ہے ، کنڑ ہیں الگ سب سے وہ غیور
اس نے کہا کہ ان کا ملا لینا ہے ضرور — تجھ کو ہے جڑ توڑنا اپنے بہت غرور
ہاں ہدیۂ یزید کو تک زینب کے لال لا
دو لخت دل حسین کے دل سے نکال لا

سنتے یہ ہاتھ رکھ کے پکارا وہ بدشیم　　یہ بھی ہے کوئی کام، ابھی لائے ان کو ہم
اچھے سے اچھے اس نے چنے جلد دو علم　　پٹکے میں جن کے نصب جواہر تھے یک قلم
دو کشتیاں تھیں ایک میں تو سرو جام تھے
اور ایک میں چنے ہوئے میوے تمام تھے

خم ہو کے غم قدر یہ کہا شمر نے کلام　　اے وارثان حیدر و جعفر مرا سلام
یہ آن بان مان گئے رستمان شام　　واللہ آج تم پہ ہے جرات کا اختتام
یہ بانکپن نظر میں کھبا جی میں کڑ گیا
سکہ دلوں پہ آپ کی غیرت کا پڑ گیا

حیران ہیں سب یہ آپ کے ماموں نے کیا کیا　　تم کو نہ حامل علم مصطفی کیا
منصب تمہارا بھائی کو اپنے عطا کیا　　لشکر سے ان کے آپ اٹھ آئے بجا کیا
سمجھیں نہ جب بزرگ تو خوردوں کو چارہ کیا
الفت خدا کی دین ہے اس میں اجارہ کیا

یہ سن کے آپ میں نہ محمد رہے نہ عون　　دو عرش کانپنے، یا تہ وبالا ہوئے دو کون
غصے سے سرخ ہو گیا یاقوت رخ کا لون　　شیر خدا کے شیر جو بپھریں سنبھالے کون
تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں
آدھی سروہیاں کمروں سے نکال لیں

نعرہ کیا علی کے نواسوں نے یک بیک　　بس بس زیادہ منہ سے نہ اب واہیات بک
چپ نابکار چپ، سرک اپنی ادب سرک　　ہیں رعب و حکم سے اب کانپ اٹھے فلک
بہکا انھیں، خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں
ظالم یہ ان سے کہہ جو تجھے جانتے نہ ہوں

ان کو علم ملا تو ہمیں کو ملا علم　　خاطر ہماری ایسی ہے ان سے کہیں جو ہم
ادنا کو بخشش دیں علم سرور امم　　پر ہم تو خوش ہیں اب کہ شرف دو ہوئے بہم
سردار ایک ماموں علم دار دوسرا
ہم سا بھی ہے جہان میں نمودار دوسرا

کلثوم ماں کھڑی تھیں پس پردہ بے قرار　　ان سے کہا دلیروں نے یہ ہو کے شرم سار
ہیں تو ہر اک وقت ہے بندہ قصور وار　　پر اس گھڑی قصور نہیں اپنا زینہار
اماں کے دل میں شک جو پڑا ہو نکال دو
دونوں کو ان کے پاؤں پہ لجا کے ڈال دو

جب حضرت زینب کو یہ حال معلوم ہوا تو :

دوڑیں وفور طیش سے خود زینب حزیںؑ   فرمایا میں تو آپ کو تھی ڈھونڈتی کہیں
کیا مشورہ تھا شمر سے، وہ بولے کچھ نہیں   فرمایا خوب! لوگوں میں چرچا ہے جا بجا کہیں
شمر لعیں سے صلح جو ٹھہرائی ہوئے گی
مرضی تمہاری تشنگی بہت پائی ہوئے گی
مالک سے اپنے پوچھ لیا تھا؟ جواب دو   زینب نے تم کو اذن دیا تھا؟ جواب دو
اکبر سے ان کا ذکر کیا تھا جواب دو   اس دن کو میرا دودھ بہا تھا جواب دو
اب سوچ ہے نجات جو دنیا سے پاؤں گی
جنّت میں فاطمہ کو میں کیا منہ دکھاؤں گی
ہے ہے مجھے تو اور بھی وسواس اب ہوا   شاید علم وہ ملنے کا تم کو تعجب ہوا
عباس کھلا جو علم کیا غضب ہوا   گزرا جو ناگوار خلاف ادب ہوا
آئے گی شے بلا وہ پدر کی کمائی ہو
قربان تم ہوئے مرے عباس بھائی ہو
لیلٰے کو ہاتھ اٹھا کے پکاریں وہ مہ لقا   اماں بروئے کعبہ کہ خادم ہیں بے خطا
سن لیجئے حضور، تو پھر ہو جیسے خفا   جن کو حضور پالیں گی وہ ہوں گے بے وفا؟
چاروں ملکجو مالک تقدیر سے پھریں
ہم دونوں بھائی حضرت شبیر سے پھریں
شمر زبان دراز یہ تھا xxxx اختیار کیا   کچھ یاد بھی نہیں کہ کیا تھا کار کیا
کاذب کے قول و فعل کا ہے اعتبار کیا   ہم تو وہی ہیں* آپ کو پھر اضطرار کیا
ایسے دیے جواب کہ نقشہ بگڑ گیا
جیتا زمیں پہ صورت قاروں وہ گڑ گیا

اس بیان میں پیرزبان کی سلاست و صفائی ، لطافت، دل کشی موجود ہے - بجز ایک دو مقام کے ہر جگہ بندشیں چست اور محاورے درست ہیں۔

حضرت امام حسین اپنے شیر خوار بچے علی اصغر کو میدان جنگ میں لے جاتے ہیں۔ اور ان کی حالت دکھا کر ان کے لیے فوج اعدا سے پانی مانگتے ہیں - صرف اس ایک موقع پر

علامہ شبلی کو مرزا دبیر کی ترجیح کا اعتراف ہے ۔ لکھتے ہیں :

" مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے
اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے ، کسی سے آج تک نہ ہوسکا۔"

ہراک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفی   لےتو چلا ہوں فوج عدو سے کہوں گا کیا
وہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا   منّت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبراکے رہ گئے   چاہاکریں سوال پہ شرماکے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے   چادر پسرکے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکاکے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گرمیں بقول عمرو شمر ہوں گناہ گار   یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
ششماہہ ، بے زبان ، نبی زادہ ، شیرخوار   ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار

سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زباں ہے ، تمہیں کچھ خیال ہے   در حقیقت ہے یہ ساقی کوثر کا لال ہے
لوبان لو تمہیں قسم ذوالجلال ہے   یثرب کے شاہ زادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علی کا تم سے طلب گار آب ہے
دے دو کہ اس میں نامورؐ ہے ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زباں کے چومے جھکاکے سر   رو کر کہا ، جو کہنا تھا سو کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر   سوکھی زباں تم بھی دکھا دو نکال کر

بھیری زباں لبوں پہ جو اس نورعین نے
تھرا کے آسماں کو دیکھا حسین نے

مرزا دبیر نے ہر قسم کے جذبات اور ہر نوع کے اصلی و فرضی واقعات لکھے لکھے اور بعض
مقامات پر بڑی کامیابی کے ساتھ لکھے ۔ لیکن مناظر قدرت کی مصوری صرف قوت متخیلہ کا کام
نہیں۔ یہاں جذبات و واقعات کی طرح پرانا تجربہ اور سابق مشاہدہ کام نہیں آتا بلکہ

تخیل کے ساتھ قوت کلکا محاکات ، اور توازن دماغ اور اندازۂ بلاغت کی ضرورت ہے یعنی جس طرح کسی واقعہ کے بیان سے وہ واقعہ نظر کے سامنے آجاتا ہے ۔ اسی طرح قدرتی منظر بھی آنکھوں کے میں پھر جائے ۔

اس محاکات و مصوری سے مرزا دبیر قاصر ہیں۔ یہاں ان کی وضاحت بے کار اور بلاغت ضائع ہے ۔ انھوں نے قوت علم و زور طبع سے جو مضمون آفرینی و خیال آرائی کی ہے اس میں لطف و اثر مطلق نہیں۔ دبیر بلاشبہ انیس سے زیادہ عالم تھے۔ مطالعہ زیادہ وسیع تھا۔ علوم و فنون مستحضر تھے اور بالطبع تخلیق معانی اور ایجاد مضامین کی طرف مائل تھے۔ چناں چہ منظر کشی میں تشبیہی و تلمیحی اور تفرشی (صنعت شبہم شاداب) کا مضامین میں اتباع کیا اور رجب علی بیگ سرور و ناسخ کی زبان اختیار کی ۔ اور ان سب پر اپنی قوت ایجاد سے اضافے کیے۔ نتیجہ یہ نکلا :

صبح کا سماں :
==========

گلگونہ شفق جو ملا حور صبح نے — اسپند مشک شب کو کیا نور صبح نے

گرمی دکھائی روشنیٔ طور صبح نے — ٹھنڈے چراغ کردیئے کافور صبح نے

لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی

افشاں جبیں سے نجم درخشاں کی چھٹ گئی

طلوع آفتاب :
=========

روز سفید یوسف آفاق شب نقاب — مغرب کی چاہ میں تھا جو وہ زیر آفتاب

سقائے آسماں نے کیا دلو آفتاب — اور ریسمان شعاع کی باندھی بآب و تاب

یوسف کو دلو مہر میں ہانڈلا کے چاہ سے

کھینچا فلاح شرق میں مغرب کی راہ سے

منظرِ شب :

جس وقت ہوا سکۂ شبِ سیم قمر پر   پھر کوئی نہ واقف ہوا خورشید کے زر پر
مریخ کا خنجر جو چلا ترکِ سحر پر   بن بن کے شفق خوں چڑھا چرخ کے سر پر
کیواں علم، ایوانِ فلک ، اور چاند نگیں تھا
آفاق سلیماں کی طرح زیرِ نگیں تھا

گرمی کی شدّت :

مٹی خراب چرخ پہ ہے ہیچ آب کی   رنگت ہے ہیچ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ پھٹ گئی ہے حباب کی   حدّت ہے مج مج میں تپ شہاب کی
قزاق کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
ماہی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

شوکت الفاظ عجب دھوکے کی چیز ہے ۔ عام طور پر شوکت الفاظ کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں ہوں جن سے سننے والے پر رعب چھا جائے ۔ بے شک یہ معنی بھی ہیں اور شاعری میں اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن شوکت الفاظ کی صرف ایک یہی صورت نہیں ہے اور اس کے لیے بھی حدبندیاں ہیں۔ ہم چند صحیح و غلط صورتیں دکھاتے ہیں :

۱۔ منظر صبح اور طلوع آفتاب کے متعلق دبیر کے جو بند اوپر آئے ہیں ان میں بھی شوکت الفاظ ہے ۔ اسی قسم کا ایک بند اور دیکھیے :

پیدا شعاعِ مہر سے مقراض جب ہوئی   پنہاں درازیٔ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیٔ زہرہ لقب ہوئی   مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لیے

اس مطلع میں بھی عربی و فارسی کے شان دار الفاظ اور زور دار ترکیبیں ہیں جن سے سامعین واقعی مرعوب ہوسکتے ہیں اور بے ساختہ شاعر کی ایجاد مضامین و اختراع تشبیہات

کی داد منھ سے نکل جاتی ہے اسی سے مرعوب ہوکر لوگوں نے دبیر کی شوکت الفاظ کو سراہا ہے ۔ لیکن اصل میں شوکت الفاظ کا یہ استعمال بے محل ہے اول تو یہ منظر شان و شوکت اور دھوم دھام کی چیز نہیں ۔ دوسرے ان الفاظ سے طلوع صبح و آفتاب کا سماں آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ تیسرے ان چند مصرعوں میں مختلف صورتوں سے صرف اتنی بات کہی ہے کہ "رات ختم ہوئی۔ دن نکل آیا۔"

۲۔ ہنگامۂ جنگ اور حملہ کا زور شور دکھانے کے لیے شوکت الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ الفاظ کا رعب و داب اور تخیل کی خلاقیت حد محاکات اور ضرورت واقعہ نگاری سے بڑھنے نہ پائیں ۔ مرزا دبیر لکھتے ہیں :

برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کے ہے آمد   ہر موجۂ لرزاں ہے سلیماں کی ہے آمد
فرعونیوں یہ موسیٰ عمراں کی ہے آمد   تیغوں کے جہازوں یہ بھی طوفاں کی ہے آمد
جن سحر کو نکلے تھے یہ ضیغم سے ملے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اڑے ہیں

۳۔ شوکت الفاظ کا ایک موقع وہ ہے جب کسی بہادر کے حلیہ یا زور و طاقت کا اظہار کیا جائے ۔ مرزا دبیر نے اس موقع پر صحیح قوت تخیل و انتخاب الفاظ سے کام لیا ہے ۔ دشمن کے ایک بہادر کے متعلق فرماتے ہیں :

نکلا ہے اک شجاع بڑھا فوج شام سے   لرزاں تھی روح سام کی جس کی حسام سے
پرویز کو گریز تھی اس کے دام سے   گردان روم کان پکڑتے تھے نام سے
جز عیب کفر محض ہنر وہ دلیر تھا
منھ پر جھلم پڑی تھی کہ برقع میں شیر تھا

پہلو میں ابن سعد کے تھا ایک نابکار   بدشکل و بدلیاقت و بدوضع و بدشعار
اژدر خصال، دیو نژاد و سیاہ کار   مکار و پرفریب وستم گار و بادہ خوار
تن میں زرہ تھی، خود سر بے شکوہ پر
وہ زین پر مکیں تھا کہ اژدر تھا کوہ پر

۴- رجز کے لیے بھی شوکتِ الفاظ درکار ہوتی ہے ۔ ... مرزا دبیر نے اس کا بھی خوب حق ادا کیا ہے ۔ دیکھیے :

ہیں ہم مکین دوش نبی ہر مکاں کا فخر　　　شیر خدا کا لال ہیں نوشیرواں کا فخر
کوثر کی آبرو ہیں اور اہل جناں کا فخر　　　کعبہ کا نور، عرش کا اوج ، آسماں کا فخر
نام و نسب سے قدر عجم اور عرب کی ہے
رونق ہماری ذات سے نام و نسب کی ہے

یہ فضل و شرف پر فخر تھا ۔ شجاعت کے متعلق رجز دیکھیے :

وارث ہیں ہم جناب شہ ذوالفقار کے　　　کامل ہوئے ہیں جن سے ہنر کار زار کے
لی مرحبا فرشتوں نے مرحب کو مار کے　　　عنتر کو تر لہو میں کیا سر اتار کے
یکتا تھا عبد ود کا پسر اپنے ڈھنگ میں
پر کیسی منہ کی کھائی ہے خندق کی جنگ میں

۵- مرزا دبیر نے بعض جگہ تشبیہیں اور استعارے بھی نہایت لطیف و موزوں لکھے ہیں۔ مثلاً :

تھے آس پاس یوں رفقا اس جناب کے　　　تار شعاع جیسے ہوں گرد آفتاب کے

کیا حسن ہے کیا نور ہے کیا جلوہ گری ہے　　　یاں شب کی طرح صبح ستاروں سے بھری ہے

خاصان حق کے خاص ہو، نیکوں کے نیک ہو　　　مثل نگاہ تم مری آنکھوں میں ایک ہو

نیزہ بکف ان پر وہ شقی یک بیک آیا　　　گویا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک آیا

سرہلتا ہے پر حرکت پاؤں میں جمی ہے　　　جنبش میں ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

لیکن ندرت پسندی و جدت آفرینی کے تک زور و جوش میں ایسی بھدی تشبیہیں بھی پیدا کر دی ہیں :

رن کی صفوں کا خوف سے ستھراؤ ہو گیا　　　پانی ہوئے یہ زہرے کہ چھڑکاؤ ہو گیا

جوہر میں طرفہ ہیبت تیغ دلیر ہے　　　مچھلی کے جال میں یہ مگر کوئی شیر ہے

چھپی سے بھی صف لشکر بھی دور کی　　بت خانہ سے شباہت منبر بھی دور کی

پیدا کمر سے کنہ جناب الہ ہے　　یہ بال چشم ذات کا نظارگاہ ہے

=====

گیا جو فوق سے تحت الثری کو آب حسام　　بنا خزانۂ قارون خرابۂ حمام

فلک نے تفتۂ بریاں رکھا زمیں کا نام　　ہوا رطوبت اطوبات سے زمیں کو زکام

دماغ خاک پہ نزلہ بصد وفور گرا

گیا جو عطسہ تو قارون نکل کے دور گرا

یہ دماغ کا عدم توازن اور ذوق سلیم کی کمی مرزا دبیر کے ہاں نہایت کثرت سے ہے اور ہر جگہ ہے - تشبیہہ و استعارہ میں بھی ، جذبات و واقعہ نگاری میں بھی، تخیل و محاکات میں بھی اور مثال کیجے دیکھئیے :

تائید خدا پشت پہ ہے فتح و ظفر پیش　　جس طرح سے اک حرف پہ ہو زیر و زبر پیش

مومن کو سبق سورۂ توحید کا درپیش　　ہے سورۂ اخلاص جدا شام و سحر پیش

واں سورہ میں اک زیر ہے ، یاں شان جدا ہے

یاں زیر نہیں پشت پہ تائید خدا ہے

یہ بند مرزا دبیر کے مہملات کی ایک عجیب مثال ہے - اس میں بالکل خاقانی کی سی تخیل اور مضمون آفرینی ہے - وہ بھی ایسی ایسی باتیں ڈھونڈھ کر نکالتا ہے جو خواص کو بھی نہ سوجھیں اور عوام کی تو سمجھ میں ہی نہ آئیں - مرزا دبیر کو بھی یہی شوق ہے - اس بند کی ترکیب و بندش ہی کون سی خوب صورت ہے ، پھر مضمون سنیے، فرماتے ہیں کہ سورۂ اخلاص یعنی قل ھو اللہ میں صرف ایک جگہ لم یلد کلمے میں زیر ہے - باقی ہر جگہ جگہ زیر و پیش نہیں- لیکن حضرت امام صاحب کی شان جدا ہے کہ یہاں زیر(یعنی پستی یا شکست) نہیں بلکہ پشت پر تائید خدا ہے - سبحان اللہ! میر انیس کے ہاں اس طرح کی ایک مثال بھی نہیں مل سکتی -

ناسخ کی طرح دبیر بھی مضمون ذہن میں آنے کے بعد اس کو جانچتے پرکھتے نہیں،

نظم کرنے سے غرض رکھتے ہیں ۔ ایک ہی مرثیے میں تلوار کے متعلق یہ خوب صورت مضمون بھی لکھا ہے :

اللہ رے صفا صاف کیا خون عدو کا　　　دھبا نہ لگا دھار میں کافر کے لہو کا

اور ایسا مبتذل بھی ۔

جب سو ہوئی سیدھی، تو میوہ خری تھی
پھر تیغ کے پھل تھے نہ سناں تھی نہ چھری تھی

ایک جگہ حضرت امام صاحب کی زبان سے اس ضبط و صبر کا اظہار کرتے ہیں :

اب نہر علقمہ کی جہت روکتے ہیں راہ　　　سگ مرا تو قتل ہوا پیاسا بے گناہ

کیوں تیغیں تیز کرتے ہیں شرم و حیا نہیں　　　کہدو کہ اب ادھر کوئی پیاسا رہا نہیں

اور دوسری جگہ اس بے صبری کا اظہار کرتے ہیں :

فرمایا کہ اب قہر کی ہے تشنہ دہانی　　　جلتا ہے کلیجا ، ارے پانی ارے پانی

کہیں تلوار کی تعریف میں یہ لطافت بیان اور صحیح طرز ادا ہے :

جس سر پہ یہ ٹھہری تو وہ سرتن پہ نہ ٹھہرا
تن زین پہ اور زین بھی توسن پہ نہ ٹھہرا
توسن کا قدم دشت کے دامن پہ نہ ٹھہرا
اور شرع میں خون تیغ کی گردن پہ نہ ٹھہرا
قاضی عدالت عمل تیغ نکو تھا
جو منکر یکتائی حق تھا ، وہی دو تھا
پھل اڑ گئے جو ڈھالوں کے خرمن سے جاملی
پھر سر تھا سو قدم پہ ، جو گردن سے جاملی
رگ رگ الگ الگ ہوئی، جس تن سے جاملی
کڑیاں جدا ملیں، جو یہ جوشن سے جاملی
تاثیر چشم زخم بدن کو دکھا گئی
مثل نظرہ بدن کو لگی اور کھا گئی

اور کہیں وزیر و لیاقت کی سی مکروہ رعایت لفظی اور عامیانہ تخیل بھی :

جو تیغ زن کہ طاق تھے شام و عراق میں وہ جفت مرگ ہوگئے کفر و نفاق میں

بھیجی بڑے مشقت مالا یطاق میں عبرت کو سب نے رکھ دیا تیغوں کے طاق میں

نے قصر تھے، نہ طاق وہ تیغوں کے رہ گئے

یہ آبرو رہی کہ بدن ساتھ بہہ گئے

وہ تیغیں ذوالفقار کے فقروں میں آگئیں جوہر کی ننگ چشمی سے آنکھیں چرا گئیں

یکسر شکست فاش سرودست کھاگئیں تھیں آپ کم حیا کہ عرق میں نہا گئیں

تیشہ بنی یہ تیغوں کے دندانے کے لیے

تیغوں کے دانت نکلے تھے بل کھانے کے لیے

مولانا شبلی نے بہت سی مثالیں لکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے مرزا دبیر کی طبیعت میں اصول بلاغت کا لحاظ نہ تھا، ذہن صحیح طور پر متوازن نہ تھا، اور مذاق اصلی حد تک سلیم نہ تھا۔ وہ بے محل اور خلاف موقع بات کہہ جاتے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کیا بات کہنی یا کس طرح کہنی چاہیے تھی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ و آلہ وسلم کی زبان سے مرزا دبیر نے یہ مضمون ادا کیا ہے :

محبوب ہوں خدائے ذوالاحترام کا نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا

آنحضرت کی زبان سے امام صاحب کے لیے علیہ السلام کا لفظ کس قدر نا موزوں ہے۔ "المیزان" میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ شعر مرزا دبیر کا نہیں ہے۔ لیکن مرزا دبیر ایک اور جگہ بھی یہی غلطی کرتے ہیں۔ میدان کربلا میں ایک مسافر اترتا ہے اور حضرت امام صاحب سے ان کا نام پوچھتا ہے۔ مرزا دبیر کے قول کے مطابق امام صاحب جواب دیتے ہیں:

"ہمیں حسین علیہ السلام کررد ہیں"

خود اپنے آپ کو علیہ السلام کہنا اور بھی نا مناسب ہے۔ اسی موقع پر میرانیس

لکھتے ہیں :

یہ تو نہ کہہ سکے کہ نہ مشرقین ہوں   مولا نے سرجھکاکے کہا میں حسین ہوں

۲۔ حضرت شہربانو حضرت عباس کی نعش پر نوحہ کرتی ہیں :

ہے ہے مری دیور، مری دیور، مری دیور!

یہ عامیانہ لب و لہجہ مرزا دبیر ہی کا حصہ ہے ۔

۳۔ مرزا دبیر فرماتے ہیں :

کہا سجاد سے کبریٰ نے یہ اس دم رو رو   بھائی صاحب مرے دولہا کو بھی اب دفن کرو

اس پر مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ " ایک رات کی بیاہی عورت کا اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے دولہا کو بھی دفن کرو کس قدر خلاف عادت ہے۔" مصنف " المیزان" کا یہ جواب صحیح نہیں کہ " یہ کہنا رسم عرب کے مطابق ہرگز خلاف عادت نہیں ۔ مرثیوں میں کہیں مراسم ہند اور کہیں مراسم عرب کے مطابق تخیل ہوتی ہے۔" جب اہل حرم کی عادات و مراسم ہندوستان کی شریف زادیوں کے مثل فرض کرلیے گیے اور نکاح و بیوگی کے متعلق ہندوستانی مراسم کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ امر کیونکر درستی کے خلاف ہے کہ ایک شخص کے عادات و خیالات کہیں عربی رنگ میں ہوں اور کہیں ہندوستانی میں ۔

۴۔ مرزا دبیر کا مصرع ہے :

زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے

یہ ترکیب فی نفسہ کچھ خوب صورت اور لطیف و نازک نہیں، لیکن میر انیس کے اس مصرع کے سامنے بہت بھدی ہوجاتی ہے :

" کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے "

مصنف " المیزان" کا اس کے متعلق بھی وہی جواب ہے کہ یہ مصرع مرزا دبیر کا

نہیں ہے ۔ نہ سہی ، لیکن مرزا کے دماغ میں یہ پیدا ہی ضرور تھا۔ اس مصرع میں مرزا دبیر پر اصول بلاغت کی رو سے یہ اعتراض ہے کہ جو اقوال ضرب المثل کی شان رکھتے ہوں ان کے الفاظ نہایت صاف و رواں اور سلیس و لطیف ہونے چاہئیں اور جب ایک بات فصاحت و سلاست کے ساتھ کہی جاسکتی ہے جیسے کہ میر انیس نے کہی تو پھر اس کو عربی فارسی ترکیبوں میں کیوں ادا کیا جائے۔

ایسی ہی ایک اور مثال دیکھیے ۔ حضرت علی اکبر زخمی ہوتے ہیں اور حضرت امام حسین علیہ السلام ان کے پاس پہنچتے ہیں ۔ اس موقع کے متعلق مرزا دبیر لکھتے ہیں :

حسین بیٹے سے لپٹے تو بولا وہ ذی جاہ　　غلام صدقے ہو خیمے میں لے چلو شاہ
پھوپی کو دیکھ لوں قدموں پہ سر کو پھوڑا لوں　　جناب والدہ صاحب سے دودھ بخشالوں

اس " جناب والدہ صاحب" کا کیا جواب ہے ؟ ہماری رسم و عادت ہے کہ کسی غیر آدمی کے سامنے ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں " والدہ نے یہ فرمایا" یا والدہ صاحبہ کا یہ ارشاد ہے" ، لیکن اپنے بھائی کے سامنے یہ تکلف اور یہ القاب و آداب قائم رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور بے تکلف کہتے ہیں کہ " اماں نے یہ کہا " اس بنا پر بیٹے کا باپ کے سامنے یہ تکلف برتنا کس قدر بلاغت کے خلاف ہے ۔" (۱)

اس بیان میں تنقیدی خوبیاں ابھر کر ہوکے سامنے آگئیں ہیں۔ شبلی کے فضائل اور ان کے ادبی تسامحات بھی واضح ہوگئے اور کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نقاد ، شاعر یا اس کے نکتہ چین کسی سے بھی کسی قسم کی پرخاش رکھتا ہے ۔ اسی بیان کے سلسلے میں مولانا قادری کی تنقیح کا انداز ملاحظہ ہو :

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا ، مختصر تاریخ مرثیہ گوئی" ، کراچی : سیر آرٹ پریس (ناشر) ، اردو اکیڈمی سندھ ، ۱۹۶۴ع ، ص ۱۷-۱۳

" انیس و دبیر کے بہت سے مرثیے پڑھنے اور موازنہ و " المیزان" کا مطالعہ کرنے کے بعد ہماری یہ رائے ہے کہ :

۱- علامہ شبلی نے مرزا دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یا ان کے کلام کا کثرت سے مطالعہ نہیں کیا یا دیدہ و دانستہ ان کے محاسن پر پردہ ڈالا۔

۲- مصنف " المیزان" کے ذہن میں بلاغت کا مفہوم اور ذوق سلیم کا معیار راسخ نہیں ہے - وہ مرزا دبیر کی مضمون آفرینی و دقت پسندی ، لفاظی و صناعی سے مرعوب ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ بہت کہنا یا ہرقسم کے مضامین لکھنا استادی نہیں ہے بلکہ بے عیب یا کم سے کم عیب کے ساتھ لکھنا کمال ہے -

۳- مرزا دبیر نے مرثیہ کا صرف ایک جزو(یعنی مناظر فطرت) ہرجگہ معیار سے پست لکھا ہے اور میر انیس کے مقابلے میں نہایت ادنا اور بالکل بے لطف ، باقی تمام اجزاء حصص(یعنی روز مرہ و محاورہ ، صنائع لفظی و معنوی، استعارہ و تشبیہ، جذبات و احساسات حقائق و واقعات اور لوازم بزم) فصیح و بلیغ بھی لکھے ہیں اور غلط و بے محل بھی، اعلا بھی ، ادنا بھی ، پر اثر بھی ، بے تاثیر بھی - لیکن ان میں بے محل و ادنا یا ثقیل و گراں ، یا پیچیدہ و غلط یا بے لطف و بے اثر اس کثرت سے ہیں کہ کسی باکمال و مکمل استاد کے یہاں نہیں ہونے چاہئیں - دبیر کا کوئی مرثیہ اٹھا لیجئے مشکل سے دس بیس بند ایسے ملیں گے جو بے عیب ہوں جن میں کوئی حرف دبتا یا گرتا نہ ہو، یا تعقید نہ ہو یا معنی میں پیچیدگی نہ ہو - یا طرز ادا خلاف بلاغت نہ ہو ، یا بے محل شوکت الفاظ نہ ہو، یا ناکام خیال آرائی نہ ہو،

یا بے لطف و اثر بیان نہ ہو -

۴- میر انیس کا کلام بھی عیوب سے خالی نہیں ہے - لیکن ان کے ہاں عیوب اس قدر کم ہیں کہ بالکل غیر محسوس ہیں اور سعی و جستجو سے ملتے ہیں- مرثیے کے پڑھتے چلے جائیے - دبیر کی سی خامیاں خال خال کہیں نظر آئیں تو آئیں- حتی کہ مصنف " المیزان" بھی بڑی کوشش کے بعد صرف چند مثالیں پیش کرسکے - حالاں کہ خود انھوں نے " المیزان" میں شدید محنت سے دبیر کا جو بہترین کلام منتخب کیا ہے اس میں بھی کتنے اغلاط و عیوب موجود ہیں - جن میں سے ہم نے بعض یہاں درج کیے ہیں اور اکثر کو اختصار کے سبب سے نظر انداز کردیا ہے -

۵- باوجود اس کے مرزا دبیر کا جو کلام اچھا ہے - بعض بعض جگہ میر انیس سے بھی بہتر ہے - اکثر حصہ میر انیس کے برابر ہے - بہت سے ایسے بند ہیں کہ میر انیس کے کلام میں شامل کردیے جائیں تو امتیاز نہ ہوسکے - دقّت آفرینی و شوکت الفاظ جہاں حدّ اعتدال سے نہیں بڑھی ہے ، بہت پر زور و شان دار ہے - بلند مضامین جدید استعارے - عجیب تشبیہیں جہاں ذوق سلیم کی مدد سے تیار ہوئی ہیں نادرات ادبی کا درجہ ر رکھتی ہیں- روزمرہ و محاورہ ، لطف سلاست و صفائی، جہاں عامیانہ و مبتذل انداز سے محفوظ ہے ، سہل ممتنع کی حد تک پہنچ گئی ہے ، یہ خوبیاں کتنی ہی کم سہی، قابل قدر ہیں مرزا دبیر کا کلام اس قدر کثیر ہے کہ تھوڑی خوبیاں بھی مل کر بہت ہوجاتی ہیں- اس لیے ساقط برائیوں کے سبب سے چالیس خوبیوں پر پانی پھیردینا انصاف کے خلاف ہے-

۶- میر انیس کو بلا شبہ مرزا دبیر پر ترجیح و فضیلت حاصل ہے-" (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، " تاریخ مرثیہ گوئی"، محولہ بالا ، صص ۳۵-۱۳۴

تاریخ مرثیہ گوئی میں ایک اور مقام پر حاشیہ میں مولانا لکھتے ہیں :

" مولانا شبلی نے موازنہ میں تنسیق الصفات کی یہ تعریف بتائی ہے " جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوجاتا ہے ۔" یہ تعریف بالکل غلط ہے ۔ صحیح تعریف وہ ہے جو ہم نے لکھی ہے ۔ مولانا شبلی نے جو مثالیں درج کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے :

کوفہ میں بھی معرکہ دین بحر نظر آیا

شمر آیا ، سناں آیا ، حر آیا ، عمر آیا

یہ مثال اصلی تعریف کے اعتبار سے بھی غلط ہے اس لیے کہ اس میں ایک قسم کے الفاظ سہی لیکن ایک وزن کے نہیں ہیں۔ مولانا شبلی نے اس صنعت کی اور مثالیں جو لکھی ہیں ان میں سے اکثر صحیح ہیں ۔ مثلاً تلوار کی تعریف :

دم خم بھی لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی

ابرو بھی ، ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی " (۱)

"داستان تاریخ اردو" سے ایک اور حاشیہ ملاحظہ ہو :

" اس فقرے میں یہ غلطیاں ہیں کہ (۱) ۱۱۱۳ھ عالم گیر کا اڑتالیسواں سال جلوس نہیں ہے ۔ (۲) مادہ تاریخ " ادخلی جنتی " میں ۱۱۱۳ھ نہیں نکلتا۔

تاریخوں کے بیانات اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ سنین واقعات کا متعین و مطابق کرنا دشوار ہوجاتا ہے ، ایسی حالت میں تاریخی مادے بڑے کار آمد ثابت ہوتے ہیں ، اگرچہ علامہ شبلی جیسے بے پروا مورخ تاریخی مادے بھی غلط نقل کرکے دھوکے میں ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً "مقالات شبلی" جلد سوم (تعلیمی) کے صفحہ ۹۲ پر ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ کا سال وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے اور تاریخ وفات کا یہ مصرع لکھا ہے :" ملک بجد و بیک حرکت ملک گشت " لیکن اس میں سنہ وفات سے کئی سو زائد نکلتے ہیں۔ اب اگر کسی کو ملا صاحب

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا "تاریخ مرثیہ گوئی" ، محولہ بالا ، ص ۵۷

کا سنہ وفات یاد نہ ہو اور علامہ کا لکھا ہوا مصرع یاد ہو اور وہ سنہ دریافت کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ مزید لطف یہ کہ اس مضمون سے دس برس بعد علامہ نے ایک اور مضمون " درس نظامیہ " لکھا ہے ۔ اس میں ملا صاحب کی اس تاریخ وفات کا پورا قطعہ درج کیا ہے ۔ اس مصرع تاریخ یہ لکھا ہے " ملک بود و بیک حرکت ملک شد" یہ صحیح ہے لیکن اس میں ذراسا تغیر ہوگیا ہے ۔ مصرعہ یوں ہونا چاہئے " ملک بودہ بیک حرکت ملک شد" اب ۱۱۶۱ھ پورے ہوجائیں گے ۔

بہرحال ہم سخن" زیب النسا" میں تاریخ گوئی کا سنہ اختیار کرتے ہیں ۔ کسی قدیم تاریخ گو نے عالم گیر کے متعلق یہ تاریخیں نکالی ہیں :

تاریخ ولادت :۔ آفتاب عالم تاب (۱۰۲۸ھ)

تاریخ جلوس :۔ آفتاب عالم تاب (۱۰۶۸ھ)

تاریخ وفات :۔ آفتاب عالم تاب مں (۱۱۱۸ھ)

اس حساب سے سال جلوس ۱۰۶۸ ہوتا ہے ، تو اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوا۔ تاریخوں سے بھی یہی ثابت ہے اور خود علامہ شبلی کی ایک اور تحریر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ یعنی ملا نظام الدین مذکور الصدر کے حالات صفحہ ۹۳ پر ملا صاحب کے بھائیوں کے نام عالم گیر کا فرمان نقل کیا ہے ۔ اس میں یہ الفاظ ہیں " ۳۷جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ" اس کے مطابق بھی اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوتا ہے ، زیب النساء کا انتقال ۲۹ ذی الحجہ ، ۱۱۱۳ھ کو ہوا لیکن مادۂ تاریخ " ادخلی جنتی" میں ۱۱۰۸ھ نکلتا ہے ۔ اگر یہ تاریخ اسی زمانے میں نکالی گئی ہے تو اتنا بڑا فرق نہیں ہوسکتا۔ اس کی ایک ہی تاویل و تطبیق ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ ۲۹ ذی الحجہ کو انتقال ہوا ہے ۔ ۱۱۱۳ھ کے ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا ایسی صورت میں تاریخ گو سال گذشتہ

آئندہ کا مادۂ تاریخ کہہ سکتا ہے ۔ چناں چہ اس تاریخ کو بھی ۱۱۱۲ھ کا مادۂ نکالا ہے ۔ وہ اس طرح سے کہ اس آیت کے شروع میں ("و") بھی ہے ۔ اس لیے " واؤ" سمیت تاریخ نکالی ہے " وادخلی جنتی" میں ۱۱۱۲ھ نکلتے ہیں۔ تاریخوں میں نقل ہوتے ہوتے واو عطف چھوٹ گیا ، ویسے ہی علامہ شبلی نے نقل کردیا۔ ان کو اعداد نکالنے سے بڑی کوفت ہوتی ہے ۔ اپنی یہ عادت عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھ چکے ہیں۔ ان کی والدہ کی تاریخ وفات نکالنے سے معذرت کی تھی ۔ مرثیہ کہدیا تھا۔" (۱)

مولانا کی تنقیحی تنقید کا انداز یہ ہے کہ وہ پہلے مصنف کی خوبیوں کو سراہتے ہیں ، پھر اس کے بیان کو پیش کرتے ہیں اور پھر اس پر تنقید کرتے ہیں ۔ لیکن اگر انہیں اس سے اختلاف ہو تو وہ صرف اس کے نقائص و اختلافات کو بیان کرکے ہی ختم نہیں کردیتے بلکہ اپنے اعتراض اور موقف کی تائید میں دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور یہی تنقیحی تنقید کا مسلک ہے ۔ مثال کے طور پر " شعرالعجم" کے ایک حصے پر تنقید کرتے ہوئے مولانا تحریر کرتے ہیں :

" شعر العجم حصہ اول کے آغاز میں علامہ نے فارسی شاعری کے آغاز کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور سب سے قدیم اشعار لکھے ہیں ۔ علامہ اس حصۂ تاریخ کو کچھ اہمیت نہ دیتے تھے ۔ ان کا اصل مقصود تنقید شاعری تھا اور ضمناً تاریخ شاعری۔ اس لیے انہوں نے آغاز شاعری کے متعلق ذاتی تحقیق نہیں کی ، بلکہ "مجمع الفصحاء"، " تذکرہ دولت شاہ " وغیرہ کی مفروضہ و " سفینہ بہ سفینہ " روایات کو سرسری طور پر بیان کردیا۔ لیکن اس میں علامہ شبلی تنہا قابل الزام نہیں ہیں ۔ ان کا تو یہ مقصود اصلی ہی نہ تھا۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۸۷۰-۷۲

پروفیسر براؤن وغیرہ مستشرقین یورپ جن کا کام ہی کرید اور چھان بین ہے ، ان کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہوسکی۔

ایران والوں نے " کتاب الفردواد " ، " تاریخ سیستان" وغیرہ کے حوالے سے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے ۔ رضا زادہ شفق نے " تاریخ ادبیات ایران" لکھی ہے ۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ عہد اسلام میں فارسی شاعری کی بنیاد حکومت بنی امیہ کے ابتدائی زمانے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ یزید بن معاویہ کے عہد حکومت (۶۰-۶۴ھ/۶۷۹-۸۳ء) میں یزید مفرغ نے زیادکی ماں سمیہ پر ان مزین فقروں میں طعن کیا تھا:

" آبست نبیذ است ۔ عصارت زبیب است ۔ سمیہ روسپید است "

اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے آغاز (۱۰۸ھ/۷۲۶) میں جب اسد بن عبداللہ القساری القلاقی نے خاقان کے ہاتھ شکست کھائی تو خراسان کے بچوں نے ان مزین الفاظ میں ان کا مذاق اڑایا :

از ختلان آمدیہ — برو تباہ آمدیہ

آبار باز آمدیہ — خشک نزار آمدیہ

پھر ابوالینبغی عبّاس بن ترخان جو جعفر برمکی اور فضل برمکی (وزائے خلیفۂ ہارون رشید) کا درباری شاعر (۱۸۷ھ/۸۰۲ء) تھا۔ اس نے شہر سمر قند کے متعلق یہ شعر کہے تھے۔:

سمر قند کند مند — بزینت کے افگند

از شاش نہ بہی — ھمی شہ نہ جہی

" شعرالعجم" کی پہلی تین جلدوں میں فارسی شاعری کی ابتدا یعنی شعرائے طاھریہ (تیسری صدی ہجری اور دسویں صدی ہجری عیسوی) تک کا تذکرہ ہے ۔ لیکن دوسرے تذکروں کی طرح تمام شاعروں کا احاطہ نہیں کیا ، بلکہ صرف چیدہ شاعر چن کر

ان کے تذکرہ و تبصرہ کو تین جلدوں کے سات سو اٹھائیس صفحوں پر پھیلا یا ہے - بعض ممتاز شعرا پر ساٹھ ساٹھ ستر ستر صفحے لکھے ہیں - فردوسی پر پہلی جلد میں ۷۵ صفحے لکھے ہیں، اور پھر شاہنامہ پر چوتھی جلد میں ۷۰ صفحے - گویا پانچ جلدوں میں سے تقریباً ایک جلد اکیلے فردوسی پر ہے - حقیقت میں تذکرہ لکھنے کا یہی حق تھا۔ اور تذکرے اس مقابلے میں (بقول علامہ) " بیاض اشعار" ہیں۔ علامہ کے حسن انتخاب اور خوبی نقد و نظر کو قدیم و جدید کوئی تذکرہ نہیں پہنچتا۔ چوتھی جلد میں شاعری کی حقیقت اور فارسی شاعری کے محاسن و معائب سے بحث کی ہے - آخری جلدیں جن میں مضامین شاعری کے مختلف اصناف عشق و حسن ، اخلاق ، فلسفہ ، تصوف ، مدح و غنا پر ریویو کیا ہے " فن تنقید میں ایجاد نو " ہے - اس کی نظیر فارسی لٹریچر میں موجود نہ تھی چنانچہ طہران میں آقائے محمد تقی فخر داعی گیلانی نے "فارسی جدید" میں ان کا ترجمہ شائع کیا ہے -

" شعر العجم" کے متعلق یہ دعوا ہے کہ جن شاعروں کا اس میں تذکرہ لکھا گیا ہے، ان سے بہتر کوئی شاعر باقی نہیں رہا یہی جواب ہے اس اعتراض کا کہ علامہ شبلی نے خاقانی ظہیر فاریابی اور جامی کو مستقل تذکرہ کے قابل نہیں سمجھا۔ قصیدہ میں خاقانی و ظہیر کی عظمت علامہ کو تسلیم ہے ، جیسا کہ انھوں نے پانچویں جلد میں ریویو کیا ہے، لیکن خاقانی کا ذہن قصیدے کے لیے صحیح طور پر متوازن نہ تھا - اس کے قصائد میں " بھاری بھرکم" ہونے کے سوا کوئی وصف نہیں۔ ظہیر نے قصیدہ میں جو محاسن پیدا کیے ان کو سلمان ساؤجی نے بہت بڑھا دیا تھا۔ جب انتخاب ٹھہرا تو ظہیر و سلمان میں سے سلمان بہتر تھا۔ نظامی و خسرو کی مثنویوں کے سامنے جامی کی مثنویوں کا یقیناً تیسرا درجہ ہے - اور غزل میں خسرو، حافظ ، نظیری وغیرہ کے مقابلے میں جامی کے تیسرا درجہ بھی نہیں ہے-"(۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا: "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص: ۳۸-۸۳۶

حالی کے یہاں میں مولانا کی شگفتہ نگاری اور تنقید نگاری دونوں کی خوبیاں سامنے آگئی ہیں ۔ اقتباس ملاحظہ ہو :

" مولانا کی سب سے پہلی تصانیف " تریاق سموم" وغیرہ مفقود ہیں کہ ان کے اسلوب تحریر کا اندازہ ہوسکے۔ سب سے قدیم کتابیں مولود شریف اور مجالس النساء ۱۸۷۴ء موجود ہیں۔ ان میں " مجالس النساء" خاص چیز ہے ۔ یہ دہلی عورتوں کے لیے اخلاقی و تعلیمی مسائل فسانہ کے پیرایے میں لکھے ہیں اس سے پہلے مولانا نذیر احمد کی " مراۃ العروس " (۱۸۶۹ء) وغیرہ شائع و عام ہوچکی تھیں۔ اس لیے ان کو دیکھ کر مولانا حالی کو لکھنے کا خیال آیا ہوگا۔ چناں چہ وہی انداز بیان اور دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان لکھی ہے ۔ لیکن وہ مولانا نذیر احمد کے مغلق الفاظ ہیں نہ عامیانہ محاورات و امثال ۔

اس سے دس برس بعد " حیات سعدی" (۱۸۸۳ء) اور اس سے دس برس بعد مقدمہ شعر و شاعری لکھا۔ ان میں مولانا کی اصلی شان تحریر نظر آتی ہے ۔ زبان و محاورہ کی صحت،طرز بیان کی بے تکلفی اور لب و لہجے کی نرمی اور لوچ نمایاں ہے ۔ ان کے ہاں سرسید کا جوش ، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور و شور اور ظرافت نہیں ہے ، لیکن قوت بیان اور فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے ۔ حالی کا طرز سرسید سے زیادہ مشابہ ہے ۔ حالی نے سرسید کے اسلوب اور زبان کی قدامت کو زبان حال کے مطابق کردیا ہے ۔ لیکن سرسید کے جوش بیان، تیزی طبع ، ملکۂ ایجاد اور تنوع اسالیب کی حالی کے یہاں کمی ہے۔ مولانا حالی واقعی مولانا تھے۔ صاحب دل ، درویش مزاج ، خاموش ، متین ۔ ان کے علم و فضل میں وسعت اور ذہن و فکر میں روشنی تھی، لیکن دل اور مزاج میں گرمی اور تیزی نہ تھی ۔ انھوں نے غور و فکر کے ساتھ اردو زبان و ادب کا جائزہ لے کر ، اس کی خامیوں کو دیکھ کر ، ضرورتوں کو سمجھ کر ، دوسری زبانوں سے مقابلہ کرکے ، جدید موضوعات کی

کتابیں لکھ دیں ، لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لیے کوئی روش خاص پیدا نہ کرسکے۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں تقلید کو چھوڑ کر موجود پیدا ، موجودہ روش سے بغاوت کرنا ، اور اپنی راہ الگ نکالنا یہ اس وقت ہوتا ہے ، جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اپج ہو اور اس کی ایک دھن ، شوق ، جوش ہو ۔ انشا اللہ خاں ، مرزا غالب ، سرسید ، آزاد ، نذیر احمد ، شبلی کی ایجادیں اور اختراعیں اسی صفت کے مظاہر و آثار ہیں۔ اور اسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکا اللہ اور مولانا حالی " صاحب طرز " نہیں ہیں۔ لیکن اس طرح کا " صاحب طرز" ہونا ادیب کی ذات تک محدود رہتا ہے ۔ جیسا غالب ، آزاد اور نذیر احمد کے طرز کے ساتھ ہوا۔ نہ ان طرزوں کی بعد کو تقلید ہوگی نہ ضرورت تھی۔

مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدت ، بیان کی صداقت ، ٹھیٹ زبان کی صحت ، اسلوب کی صفائی ، دلائل کی قوت ، تمثیلات کے برجستگی سب کچھ ہے اور اکثر بے عیب ہے ، بلکہ بعض جگہ نادر و جدید بھی ہے ۔ لیکن ان کی عبارت پڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی ، انشا پردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم ان کی جچی تلی تحریر کا اثر ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو رواج پانے کے لیے حالی اور شبلی ہی کا ملا جلا طرز تھا۔

اسلوب حالی کی ایک لطیف خصوصیت انتخاب الفاظ ہے ۔ خصوصاً ہندی الفاظ کا استعمال اور ان کی بے ساختگی و برجستگی مثلاً:

۱- " جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا ، اس باغ میں پت جھڑ شروع ہوگئی تھی ، کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہوچکے تھے ۔" (یادگار غالب)

یہاں لکھ سکتے تھے کہ " اس باغ میں خزاں شروع ہوگئی تھی" اور مفہوم وہی رہتا

لیکن پت جھڑ کا لفظ اپنے لفظی مفہوم (پتوں کا جھڑ کر منتشر ہونا) کے اعتبار سے آئندہ

فقرے کے کسی قدر مناسب ہے کہ " کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے

رخصت ہوچکے تھے۔"

۲۔ " قدیم اسلوب جو کلاموں میں رچ گئے ہیں، ان کو بدستور قائم رکھا جائے۔
(مقدمہ شعر و شاعری)

۳۔ " وہ طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہر گز نہ ٹوٹنے دے، ورنہ وہ
بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر میں وہی اثر پھر پیدا دیتے ہیں
جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔" (مقدمہ شعر و شاعری)

یہ ہندی کے الفاظ اور محاورے حالی کی نظموں میں نثر سے بھی زیادہ تاثیر

پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ایک بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے ۔ یعنی انگریزی الفاظ کا غیر

ضروری استعمال حالی بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے ، حالاں کہ یہ انگریزی زبان سے

محض نا آشنا تھے۔ چند مثالیں یہ ہیں :

۱۔ " اس کے ایک بند میں ایک پوائنٹ عمدگی سے بیان ہوسکتا ہے لیکن ہر
پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی۔" (مقدمہ و شعر و شاعری)

۲۔ " ان کے بچوں میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت میں کوئی ایسی
خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔" (حیات جاوید)

۳۔ " جس کی پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے قائم سرور سمجھا ہے تو کسی
نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے ۔" (حیات جاوید"

۴۔ " اپنی جنرل انفورمیشن کو وسعت دے ۔" (مضامین حالی)

اسی طرح میٹریل (مواد ، مسالہ) ایمجینیشن (تخیل) ۔ ورکس (عادتیں)

ججمنٹ (فیصلہ) وغیرہ بکثرت و بے تکلف لکھتے ہیں۔ یہ روش سب سے پہلے سرسید نے

نکالی تھی۔ پھر حالی و نذیر احمد زیادہ اور عبدالحلیم شرر لکھنوی کم ، اسی راہ پر

پر چل نکلے۔ ان بزرگوں میں سرسید تو "انگریز و انگریزی پرستی" کی دھن میں کسی بات کی اچھائی برائی پر نظر نہیں کرتے تھے۔ مذہب ، معاشرت ، زبان، تعلیم سب کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ نذیر احمد کوئی با اصول آدمی نہ تھے ۔ انھوں نے مولوی ذکاء اللہ کے لیے لکھا ہے کہ " وہ سیّد احمد خاں کے پٹھو تھے" لیکن یہی لقب خود ڈپٹی نذیر احمد پر بھی صادق آتا ہے ۔ پھر نذیر احمد ظریف طبع بلکہ " مسخرے " تھے ۔ اور انگریزی کی بھرمار بھی ان کے مسخرے پن کی ایک ادا تھی ۔ حالی جیسے متین و با اصول ادیب کے لیے اس طرز کو اختیار کرنے کا بجز تقلید سرسید کوئی سبب نہ تھا۔ لیکن اسی جذبے نے ان کو نہ سوچنے دیا کہ وہ اور ان کا زمانہ ادبیات جدید کے لیے پیشوا اور رہنما ہیں ان کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو باقی اور جاری رہنے کے قابل ہو۔

علامہ آزاد اور مولوی ذکا اللہ تو قدامت پسند تھے ۔ ان کا انگریزی الفاظ استعمال نہ کرنا کسی غور و فکر اور بحث بحثی کی بنا پر نہ تھا۔ البتہ علامہ شبلی کے ذوق صحیح اور نباضی ادب و انشا کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے اس کج روی کو سمجھ لیا اور اس سے بچ کر چلے ۔" (۱)

مولانا قادری کی نثر نگاری کا معتدبہ حصہ شعر و شاعری کے فن زبان و بیان کے دقایق اور فن عروض کی باریکیوں سے متعلق ہے ۔ عروض مشکل فن ہے اور اس پر عبور اس کی فہم سے بھی زیادہ مشکل ہے ۔ مولانا کو نہ صرف اس پر مکمل عبور تھا بلکہ اس کی باریکیوں اور پیچیدگیوں پر بھی نظر تھی۔ طبعاً جس قدر اس میں مشکلات ہوتی تھیں وہ اتنا ہی اسے پسند کرتے تھے۔ انھیں مشق و مزاولت اور مطالعہ و ژرف نگہی سے اتنا اعتماد حاصل ہوگیا تھا کہ اس معاملے میں اگر کسی سے بھی سہو یا غلطی ہو جاتی تھی تو وہ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا : داستان تاریخ اردو، محولہ بالا، ص ۲۱-۷۲۷

بلا تامل و برملا اس کا اظہار کردیتے تھے ۔ مگر اس میں صرف فن و ادب کی نکتہ پروری کو دخل ہوتا تھا شاعر کی ذات سے کوئی بحث نہ تھی۔ اسی دور میں علامہ سیماب اکبر آبادی بھی فن عروض کے بڑے ماہر گذرے ہیں لیکن جہاں علامہ موصوف سے سہو ہوا ہے مولانا نے واضح طور پر اس کی نشان دہی کی لیکن دونوں کے باہمی تعلقات اخوت و مودت میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔

عروضی غلطیاں کے عنوان سے مولانا نے غالب سیماب اور جوش کی عروضی تسامحات کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ پہلے آپ نے عروض کی اہمیت اور غایت و مقصد پر مدلل کلی بحث کی ہے ۔ آپ لکھتے ہیں :

شاعری کے لیے " عروض " بمنزلہ پیمانہ و ترازو ہے ۔ اس فن کی مہارت باقاعدہ سیکھنے سے حاصل ہوتی ہے ، اور اس کی نزاکتیں اور باریکیاں کا احاطہ مشق سے پیدا ہوتا ہے ، لیکن حکیم سخن آفریں نے موزونی طبع اکثر انسانوں کو فطرتاً عطا فرمادی ہے ۔ تعلیم پڑھے لکھے ، بلکہ جاہل آدمی بھی موزوں طبیعت رکھتے اور شعر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں سے بعض بحور و اوزان میں غلطی سرزد ہوجانے کا امکان رہتا ہے ۔ اسی لیے اساتذۂ قدیم نے فن عروض کی تحصیل واجب و ناگزیر قرار دی تھی۔

اردو شاعری اور اس کے اوزان و بحور فارسی شاعری سے ماخوذ ہیں اور فارسی میں عربی سے لیے گئے ہیں۔ فارسی دانوں نے عربی اوزان میں اپنے مذاق کے مطابق ترمیم کرلی۔ پھر اردو ذوق موزونیت و ترنم سے کچھ کم و بیش تھے۔ وہ فارسی شاعری میں جاری و مستعمل رہے ۔ لیکن اردو میں ترک کردیے گئے ۔ اس قطع و برید کے ساتھ اردو شاعری چارسو (۴۰۰) برس سے مسلسل جاری اور روز افزوں ترقی پذیر ہے ۔ تمام اقسام نظم ، اصناف اسلوب اور انواع تخیل اردو میں کام یابی کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ :

" اردو کہنے والوں کو پنگل کے اوزان میں کہنا چاہئے ، جو زبان ہندی
کے اوزان طبعی ہیں .... ہندی زبان عربی کے اوزان میں ٹھونس کر شعر
کہا کرتے ہیں ، اور ہندی کے جو اوزان طبعی ہیں ، اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ
ویسا ہی ہے جیسے کوئی انگریزی قصیدہ بحر طویل میں کہے کہ کوئی انگریز اسے
موزوں نہ کہے گا .... اس کے برخلاف پنگل کے سب اوزان ہم کو بھی
موزوں معلوم ہوتے ہیں ۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ سب اوزان ہمارے اوزان
طبعی ہیں ، اور جن اوزان کو ہم نے اختیار کرلیا ہے ، ان وزنوں میں بہ تکلف
ہم شعر کہتے ہیں۔ اور ہماری شاعری میں اس سے بڑی خرابی پیدا ہوگئی ہے ،
جس کو ہمیں خبر نہیں۔" (۱)

اردو شاعری صرف ہندی کے الفاظ و محاورات سے مرکب نہیں ہے ، بلکہ اس میں
عربی و فارسی کے الفاظ، اضافتیں اور ترکیبیں بھی شامل ہیں۔ یہ چیزیں پنگل (ہندی
شاعری کا عروض) کے اوزان میں نہیں کھپ سکتیں۔ اردو شاعر عربی و فارسی کے الفاظ میں
ٹھمریاں اور گیت نہیں کہتے جن کے لیے پنگل کے اوزان ضروری ہوں۔ ہندی زبان جس
قدر اردو میں شامل ہے ، نہایت آسانی کے ساتھ فارسی اوزان میں سماتی رہی ہے اور
اس سے کبھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی ۔ غالب کا ایک مطلع ہے :

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

اس کے الفاظ کو پنگل کے اوزان میں نظم کریں تو ایک مضحکہ انگیز اعجوبہ بن
جائے گا ۔ یہ الگ مسئلہ رہا کہ اردو شاعری سے یہ الفاظ ہی نکال دیے جائیں۔

پنگل کے اوزان ہم کو بھی موزوں معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس کا سبب یہ نہیں ہے
کہ وہ ہمارے اوزان طبعی ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہمارے کان دوہوں، گیتوں، کہاوتوں کی لے

---

(۱) نظم طباطبائی، " شرح دیوان غالب "۔

اور ترنم سے آشنا ہوتے ہیں۔ بچپن سے ان چیزوں کو گاتے اور پڑھتے سنتے ہیں۔ طبیعت میں اس کا مزہ پیدا ہوجاتا ہے - لیکن اگر ہم خود نغمہیان اور دوہے نظم کرنا چاہیں تو اتنی ہی محنت کرنی پڑے گی جتنی فارسی اوزان میں کرنی پڑی ہوگی - ہم کو عربی اور انگریزی کے اوزان موزوں نہیں معلوم ہوتے، لیکن ان زبانوں کے عروض کو سیکھ لیتے ہیں یا پڑھتے پڑھتے ان سے مناسبت پیدا کرلیتے ہیں، تو موزوں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح جب عرب اور انگریز فارسی و اردو کی شاعری اور ترنم کے خوگر و آشنا ہوجاتے ہیں تو ان کو بھی موزوں معلوم ہوتے ہیں اور لطف آتا ہے - میں نے ایک عرب کو اردو غزل ہندوستانی ترنم میں گاتے سنا ہے - پنگل کے اوزان کا "طبعی" ہونا ان لوگوں کے حق میں صحیح ہے، جو اردو فارسی نہیں جانتے اور ان کی شاعری سے لگاؤ نہیں رکھتے، صرف ہندی پڑھتے ہیں اور ہندی ہی میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کو طبعاً ہندی کے عروض سے مناسبت ہوتی ہے ، اور اکتساباً فارسی و اردو سے ہوسکتی ہے -

تاہم اس میں شک نہیں کہ طبیعت چوں کہ ماحول و فضا سے بنتی ہے ، اس لیے جو اوزان و بحور اختیار کرلیے گئے ہیں اور طبیعت کو ان سے مناسبت پیدا ہوگئی ہے ، ان میں آسانی سے شعر کہے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے جن اوزان میں لچک ہے حرکت و سکون کے تغیر سے ادھر ہوجاتے ہیں، یا ذرا سی کمی بیشی سے بھی موزوں رہتے ہیں، یا نامانوس وغیرمستعمل ہیں ان میں شعر کہنے سے غلطی کا احتمال رہتا ہے - اور کبھی کبھی استادوں سے بھی فروگذاشت ہوگئی ہے - پس غیر مشہور اور اجنبی اوزان البتہ غیر طبعی ہیں۔ لیکن سب اوزان کے لیے یہ فتوی درست نہیں -

مرزا عزیز بیگ سہارن پوری کی تضمین دیوان غالب میں ایک یہ عجیب بات نظر آئی کہ غالب کی ایک نامانوس وزن کی غزل پر جو مرزا صاحب نے خمسے کہے تو اکثر مصرعے ناموزوں

ہوگئے اور مرزا صاحب کو خبر بھی نہ ہوئی ۔ یہ اغلاط تفصیل کے ساتھ میری " تنقید تضمین" میں درج ہیں۔ میں نے اس میں مرزا صاحب کے اس مصرع کا بھی ذکر کیا ہے :

" چال یہ مرزا نے تری پائی ہے غالب "

یہ مصرع اس وقت موزوں ہوسکتا ہے جب (تری) کی جگہ (تیری) ہو ۔ لیکن ہو بہو یہی غلطی خود غالب سے بھی ہوئی ہے یعنی غالب کی اسی تضمین والی غزل کا تیسرا شعر بلا استثنا دیوان کی تمام قدیم و جدید اشاعتوں میں اور خود غالب کے تصحیح کردہ دیوانوں میں اس طرح درج ہے :

گر یہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو

ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

حالاں کہ صحیح وزن میں، جو اس مصرع کے علاوہ غزل کے ہر مصرع میں قائم رکھا گیا ہے (تری) نہیں، بلکہ (تیری) درست آتا ہے ۔ ورنہ وزن کا دوسرا رکن بدل جائے گا۔ اور یہ جائز نہیں کہ نظم کے کسی شعر یا مصرع میں ایک رکن ہو اور کسی میں دوسرا۔ دونوں رکن اپنی اپنی جگہ پر موزوں ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ایک صورت کو اختیار کرکے آخر تک نباہا جائے ۔ وہ دو وزن یہ ہیں :

(۱) مفتعلن فاعلات مفتعلن فع

(۲) مفتعلن مفتعلن مفتعلن فع

غالب کی ساری غزل پہلے وزن میں ہے ۔ صرف اس مصرع میں (تری) رکھنے سے دوسرا رکن بھی مفتعلن ہوجاتا ہے ۔ اور اگر (تیری) ہو تو (فاعلات) ہی رہے گا۔ بات یہ ہے کہ (تری) اور (تیری) میں ایسی لچک ہے کہ دونوں صورتوں میں لفظ و معنی درست رہتے ہیں ۔ اور اس وزن میں بھی ایسی لچک ہے کہ دونوں میں سے جو لفظ ہو

بیک نظر ہر شخص کو فرق کا احساس نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہ غلطی غالب کے کاتب اول سے ہوگئی ہو اور غالب اور ان کے طابعین و ناشرین میں کسی کی نظر نہ پڑی ہو ۔ بعد کے لوگوں کا تو یہ کمال ہے کہ مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی نے اپنی شرح میں اس غلطی کو بتایا ۔ پھر بھی کسی شارح نے اس کو درست کرکے نہ لکھا۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود غالب ہی کو اس غلطی کا احساس نہ ہوا ہو، اس لیے کہ انھوں نے دوسری جگہ اس سے سخت تر و فاحش تر غلطی کی ہے ، یعنی ان کی ایک رباعی کا پہلا شعر ہے :

دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالب

دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالب

دوسرے مصرع میں ایک (رک) زائد ہے ۔ یوں ہونا چاہیے " دل رک کر بند ہوگیا ہے غالب " وہاں ایک حرف کی صرف حرکت کا ادل بدل تھا، یہاں پورے دو حرف بڑھ گئے ۔ کچھ عرصہ ہوا رسالہ " نگار" میں اس غلطی کے متعلق دل چسپ مضمون شائع ہوا تھا۔ مقالہ نگار نے بڑی تحقیق کرکے دیوان غالب کے قدیم سے قدیم مطبوعہ اور قلمی نسخے دیکھ کر ثابت کیا تھا کہ یہ غلطی کاتب کی نہیں۔ غالب ہی کی ہے ۔ میرے نزدیک اس غلطی کو غالب سے منسوب کرنے کے علاوہ ان خارجی دلیلوں کے ، ایک ثبوت اس غلطی کے اندر ہی موجود ہے ۔ اس موقع کے لیے محاورہ (رک رک کر) ہی ہے (رک کر) نہیں ہے ۔ غالب کے ذہن میں یہ مضمون صحیح روزمرہ کے ساتھ آیا اور انھوں نے بغیر کسی فکر کے وہ مصرع موزوں کردیا۔ مصرع نہایت بے تکلف ، برجستہ اور چسپاں تھا۔ کوئی لفظ کھٹک پڑھ نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ وزن کے اندر آگیا۔ ذراسی زیادتی اور اس کی ناموزونیت کا احساس نہ ہوا۔ اگر یہاں صحیح و فصیح محاورہ (رک کر بند ہونا) ہوتا تو بے ساختہ یہی ذہن میں آتا اور یہی قلم سے نکلتا۔

بہرحال یہ عروضی غلطیاں پرانے لوگوں سے بھی کچھ نہ کچھ ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً صبا شاگرد خواجہ آتش لکھنوی کا شعر ہے :

دلایا گیا فاتحہ جام پر
ہوا ہے کسے میں پیالہ ہمارا

پہلا مصرعہ بقدر دو حرفوں کے وزن سے کم ہے ۔ دوسرا مصرعہ قافیہ و ردیف کی وجہ سے بھی غزل میں یکساں ہے ۔ ٹھیک بالکل ایسا ہی ریاض خیرآبادی کا یہ شعر ہے :

ریاض اور ہی رنگ میں مست ہیں
سدا ہے پیالہ پیا ہے کسی کا

ریاض کے دیوان (ریاض رضواں) میں ردیف " ی " کی ایک غزل اسی بحر کی ہے۔ اس میں متعدد پہلے مصرعوں میں یہ عیب پیدا ہوگیا ہے ۔ اب ان بزرگوں کو کیا کہا جائے۔ اور جب ان کو کچھ نہیں کہا جاسکتا تو پھر بعد کے غلطی کرنے والوں کو کیوں کچھ کہا جائے۔ یہ فروگذاشتیں اور مسامحات صرف تذکرہ اور یادگار کے قابل ہیں کہ یہ شاعر کو انسان ثابت کرتی ہیں۔

ہمارے زمانے میں جناب سیماب اکبر آبادی فن عروض کے بڑے ماہر اور شاعری کے بڑے صناع ہیں۔ ان سے بھی ایک جگہ عروضی سہو ہوگیا ہے ۔ میں نے کہ صناع اس لیے کہا کہ انھوں نے اپنے دیوان (کلیم عجم) میں ایک غزل اس صنعت کے ساتھ لکھی ہے کہ اس کا ہر مصرع دو وزنوں میں پڑھا جاسکتا ہے ۔ لیکن کسی اتفاق سے صرف مقطع کے پہلے مصرع میں یہ " کاریگری" باقی نہیں رہی ۔ مقطع یہ ہے :

" فصل رنگیں کا ہوا سیماب اثر جلوہ نما
اڑ کے پروانہ گیا شمع فروزاں کی طرف

وہ دو وزن یہ ہیں :

(۱) فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلن

(۲) فاعلاتن ، فعلاتن ، فعلاتن ، فعلن

سیماب صاحب کے مقطع کا پہلا مصرع صرف پہلے وزن میں پڑھا جاسکتا ہے - دوسرے وزن کے مطابق نہیں ہے - ذرا سا تغیر ہوجائے تو دونوں طرح موزوں ہوجائے گا - مثلاً یہ صورت ہو :

" فصل رنگیں کا ہے سیماب اک اثر جلوہ نما "

میں سیماب صاحب کی اس غلطی کو ایک مضمون میں پہلے لکھ چکا ہوں ، جس کو سیماب صاحب نے اپنے رسالہ " شاعر " میں شائع فرمایا تھا - لیکن اس کو اپنی غلطی تسلیم نہیں کیا تھا - رسالہ میں اس پر نوٹ لکھا تھا کہ ان کا مصرعہ درست ہے - دوسرے وزن میں بھی پڑھا جاسکتا ہے - میرے پیش کردہ مصرعہ کو تقطیع سے خارج بتایا تھا - لیکن ان کی رائے غلط ہے - ان کا مصرعہ ایک وزن میں پڑھا جاتا ہے اور میرا دونوں میں - اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں ہے - لیکن میں سیماب صاحب کو غلطی کے اصرار پر معذور سمجھتا ہوں کہ یہ بات بھی انسان ہی سے ہوتی ہے -

اسی طرح جناب جوش ملیح آبادی سے ایک نظم میں بالکل ایسی ہی غلطی ہوئی ہے - جیسی مرزا عزیز بیگ صاحب سہارن پوری کی تضمین میں ہے - جوش صاحب کے مجموعۂ کلام " نقش و نگار " کی پہلی نظم ایک ترجیع بند مخمس ہے - اس کی بحر میں بھی ایسی لچک ہے کہ ذرا ذرا سے فرق سے دو بحریں نکلتی ہیں - شاعر کو پوری نظم ایک بحر میں پہلے بند کے پہلے تین مصرعے ایک بحر (متقارب) میں ہیں اور چوتھا مصرع دوسری بحر (متدارک) میں - پہلا بند یہ ہے :

یہ کون اٹھا ہے شرماتا　　رین کا جاگا نیند کا ماتا
نیند کا ماتا، دھوم مچاتا　　انگڑائیاں لیتا بل کھاتا
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

چوتھے مصرع میں مزید عیب یہ ہے کہ بحر متدارک میں اس وقت پڑھا جاسکتا ہے جب انگڑائیاں میں سے آخر کے "ان" دونوں گرادیے جائیں ۔ نون غنہ تو گراہی کرتا ہے، لیکن اس سے پہلے کا الف گرانا نہایت مکروہ و معیوب ہے۔ پہلے بند کے بعد بعض بند ایک بحر میں اور بعض دوسری میں ہیں۔ دونوں کا ایک ایک بند نقل کیا جاتا ہے:

(۱) رخ پہ سرخی آنکھ میں جادو　　بھینی بھینی بو میں خوش بو
بانکی چتون تنتے ابرو　　نیچی نظریں، بکھرے گیسو
یہ کون اٹھا ہے شرماتا
(۲) ڈوبا ہوا رخ تابانی میں　　انوار سحر پیشانی میں
یا آب گہر طغیانی میں　　یا چاند کا ٹکڑا پانی میں
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ناظرین کو وزن اور تقطیع کے جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اوپر کے پہلے بند کا پہلا مصرع اور دوسرے کا دوسرا مصرعہ لے کر ایک شعر فرض کرلیں اور پڑھ کر دیکھ لیں مثلاً

رخ پر سرخی آنکھ میں جادو　　انوار سحر پیشانی میں

یہ دونوں ایک بحر میں نہیں ہیں، ایک مبتدی بھی پڑھتے ہی محسوس کرلے گا ایک نظم میں یہ اختلاف بحر یا مصرعہ کی کسی شاعر کے لیے بے شک عیب ہے لیکن بہرحال ان اتفاقی فروگذاشتوں سے اس کے شاعرانہ کمالات اور کارناموں پر پانی نہیں پھر سکتا۔ ورنہ مرزا غالب، صبا لکھنوی، ریاض خیرآبادی، سیماب اکبرآبادی سب پر حرف آتا ہے ۔ دوسروں نے تو کسی دعوے یا اہتمام کے ساتھ وہ غزلیں یا نظمیں نہیں لکھیں لیکن

سیماب صاحب نے خاص سعی و کاوش کے ساتھ صنعت مثلثی (ذو بحرین) میں غزل لکھی تھی - پھر بھی غلطی سرزد ہوگئی - لیکن میرے نزدیک یہ محض سوء اتفاق تھا۔ ان کی مہارت فن میں پھر بھی کلام نہیں ہوسکتا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ سیماب صاحب نے اپنے رسالہ میں جوش کے " نقش و نگار" کی تنقید شائع فرمائی تھی۔ اس میں ایک یہ فقرہ بھی تھا :

" کیا نقش و نگار کی اشاعت کے بعد جوش ملیح آبادی شاعر انقلاب تو درکنار، فنی اعتبار سے صرف " شاعر" بھی کہلانے کے مستحق ہیں۔"

جوش صاحب جیسے باکمال اور بے نظیر شاعر کے لیے یہ فقرہ سیماب صاحب اور تنقید نگار دونوں کی ناشناسی اور ناانصافی کا ثبوت ہے - سیماب اکبرآبادی صاحب کا اس سے ہم رائے و ہم آواز ہونا ظاہر ہی ہے - " فنی اعتبار" سے مراد اگر فن عروض ہے تو اس میں سیماب صاحب بھی جوش صاحب کے شریک ہیں اور " نقش و نگار" کے تبصرہ نگار بھی - رسالہ " شاعر" کے اسی مضمون میں جوش کے پرجوش نقاد نے عروضی غلطیاں بتانے میں غلطیاں کی ہیں۔

مثلاً وہ جوش کے چوتھے بند کو (جو اوپر نقل کیا گیا ہے) درست مانتے ہیں لیکن پانچویں، آٹھویں، نویں بندوں کے بعض مصرعوں پر اعتراض کیا ہے - حالاں کہ ان کی حالت بھی چوتھے بند کی سی ہے - غلط ہیں تو سب ہیں ورنہ کوئی نہیں - اور حقیقت بھی - یہی ہے کہ ان میں وہ اغلاط نہیں ہیں جو نوجوان نقاد نے تلاش کیے ہیں اور سیماب صاحب نے شائع فرماکر ان پر صاد فرمایا ہے -

نقاد " شاعر" یہ پانچواں بند نقل کرتے ہیں :

رخسار پہ صبح رنگینی   تھی چاندنی، سچی چینی

آنکھوں میں نقوش خود بینی　　مکھڑے میں سحر کی شوخی

یہ کس ادا تا ہے شوماتا

اور فرماتے ہیں کہ اس کا پہلا ، تیسرا ، اور چوتھا مصرع اس طرح پڑھا جاتا ہے :

" رخ سا یہ صبح رخشندہ "، " آنکھوں میں نقش خود بینی "،
" مکھڑے یہ سحر کی شوخی "

نقاد یہ کہ یہ کم علمی و نا انصافی ستم ہے ۔ ناظرین غور کریں کہ پہلے مصرع کی یہ صورت " رخ سا یہ صبح رخشندہ " کیوں کر موزوں ہوسکتی ہے ۔ اگر (یہ) کو (یہ) ہٹالیا جائے تو وزن میں آسکتا ہے ، لیکن (یہ) کو باقی رکھ کر اور (رخسار) کی (ر) کو قائم رکھ کر جوش صاحب کا مصرع موزوں ہے ۔ اور نقاد صاحب کا اعتراض رواداری کے خلاف ہے ۔ میں نے " رواداری " اس لیے کہا کہ ان قابل اعتراض مصرعوں کو وزن کے اندر لانے کے لیے وزن میں ذرا تغیر کرنا پڑتا ہے ، اور وہ بالکل جائز ہے ۔ یعنی اوپر کے بند کا دوسرا مصرع ، جس پر نقاد کو اعتراض نہیں ہے ، اس وزن میں ہے :

" فَعْلُنْ ، فَعْلُنْ ، فَعْلُنْ ، فَعْلُنْ " (چاروں میں عین ساکن) لیکن پہلے ، تیسرے اور چوتھے مصرعوں کا وزن یہ ہے :

" فَعْلُنْ ، فَعِلُنْ ، فَعْلُنْ ، فَعْلُنْ " (دوسرے رکن میں ع متحرک باقی میں ساکن) ۔

یہ تغیر ہمیشہ سب کا معمول رہا ہے ۔ اس طرح پہلے مصرع میں (ر یہ مو) تیسرے میں (میں نقو) اور چوتھے میں (میں سحر) فعلن کے وزن پر درست ہیں ۔ اور اعتراض غلط ۔

یہ صورت جوش کے اکثر بندوں میں ہے ۔ اس لیے نقاد نے آٹھویں بند پر جو اعتراض کیا ہے ، وہ بھی اسی بنا پر ناروا ہے ۔ اسی طرح یہ عنوان اور آخری بند نقل کیا ہے :

ہل چل میں دل کی بستی ہے　　طوفاں جذبوں میں ہستی ہے

آنکھ میں شب کی مستی ہے　　اور مستی کو دل کو ڈستی ہے

یہ کیں اندا ہے شرماتا

اور یہ اعتراض فرمایا ہے کہ " دوسرے مصرعہ میں جذبوں کی بجائے صرف " جذ"
اگر رہ جاتا ہے " ۔ یہاں بھی ان کو وہی دھوکا ہوا۔ (ن جذبوں) کو فعلن کے
وزن پر کیوں نہ پڑھا کہ موزوں نظر آتا ۔

اس بند کے تیسرے مصرع پر البتہ فاضل نقاد کے یہ اعتراض درست ہے ۔ کہ اس میں
کمی رہ گئی ۔ اس طرح پڑھنے سے صحیح ہوتا ہے :۔ " آنکھوں میں شب کی مستی ہے"

جوش کی اس نظم میں یہ دوسری قسم کا سہو ہے ۔ اس میں بحر نہیں بدلی،
بلکہ مصرع ہی پیمانہ سے چھوٹا رہ گیا۔ یہ بے شک غلطی ہے ، لیکن بڑی پر لطف ہے اور
اس کا سبب بڑا دل چسپ ہے ۔ یعنی یہ چھوٹا مصرع اگر اس بند کا ایک مصرع ہو تو
بے شک دوسرے مصرعوں سے چھوٹا اور یہاں ناموزوں ہے ۔ لیکن اگر اس کو اس کے بعد کے
مصرع سے ملاکر ایک بڑا مصرع فرض کیا جائے اور اس بند سے الگ کرکے پڑھا جائے :

" آنکھ میں شب کی مستی ہے اور مستی دل کو ڈستی ہے "

تو بالکل صحیح اور موزوں ہے ۔ اس لیے کہ اس وزن کے اول یا آخر میں سے بقدر دو حرف
کے کم کرسکتے ہیں۔ اور اس کمی پر بھی موزوں سمجھا جاتا ہے ، اور شاعروں نے اس التزام
کے ساتھ غزلیں کہی ہیں، مثلاً سید افتدار حسین صاحب کا یہ شعر دیکھیے :

سچ پوچھو تو محشر کا میدان کچھ ایسا دور نہیں

بیچ میں بس ہم سنتے ہیں اک شہر خموشاں بستا ہے

اس شعر کے دونوں مصرعے جوش صاحب کے اس بڑے مصرع کے برابر ہیں یہی سبب ہے

جوش صاحب سے غلطی واقع ہوجانے کا ۔ انھوں نے اپنے مصرعے گنگنا کر کہے اور دو دو مصرعے ایک سانس میں پڑھے ۔ چوں کہ ان کا تیسرا اور چوتھا تک مصرع ملاکر پڑھنے سے فی نفسہ موزوں تھا ، اس لیے ان کو ذراسی کمی کا احساس نہ ہوا شاعر اور شاعری کا نقصان ہے ۔" (۱)

مزاح و ظرافت :

مزاح و ظرافت اگر تحریر میں مناسب و معقول اور معتدل و محتاط انداز سے شامل ہو تو لطف و اثر بڑھ جاتا ہے ۔ مولانا کی طبیعت میں نہایت شائستہ اور لطیف انداز کی ظرافت پائی جاتی تھی۔ یہی کیفیت مناسب مقامات پر ان کی تحریروں میں بھی پیدا ہوجاتی ہے ۔ اگر نثر نگار کی تحریر مزاح و لطیف مزاح و ظرافت سے یکسر خالی ہو تو نہایت خشک و بے کیف ہوجاتی ہے ۔ مولانا ذکاء اللہ کی تحریریں اس کی آئینہ دار ہیں۔ برمحل مزاح اور باموقع ظرافت سے تحریر میں شگفتگی پیدا ہوجاتی ہے ۔ مزاح و ظرافت صرف تفریح کے لیے ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے ادیب و انشا پرداز مختلف کام لیتے ہیں۔ کبھی کسی نکتے کی وضاحت کبھی کسی مسئلے کی تصریح ، کسی مقام پر صرف چند اشارے ہی جو تہہ در تہہ لطیف طنز کی کیفیت رکھتے ہیں طول طویل تحریروں سے زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہی مولانا کا اصل فن ہے ۔ غالب کے احوال میں "داستان تاریخ اردو" میں رقم طراز ہیں :

" غالب نے نثر کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا ، اس کے مسائل ذہن نشین تھے ، اصطلاحیں بر زبان تھیں ، باتیں کرنے اور باتیں بنانے کا بہت شوق تھا ، سخن آرائی اور سخن پروری کی بڑی مشق تھی۔ اسی کا اثر ان کی باتوں اور

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا " نقد و نظر" ، آگرہ : آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۳۲ء ، صص ۱۷-۱۰۵

ان کی شاعری سے نمایاں ہے ۔ فارسی و اردو کلام میں تصوف کے مسائل بہت لکھے ہیں ، لیکن ان میں تصوف کی زبان تو ہے صوفی کا دل نہیں۔ خواجہ میر درد اور غالب کے متصوفانہ کلام کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درد دل سے کہتے ہیں ، اور غالب زبان سے ۔ درد اس عالم میں پہنچے ہوئے ہیں ، اور غالب کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی ۔ غالب " حقیقت حقہ ، وحدت وجود" کے بڑے قائل ہیں اور فرماتے ہیں :

" زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں ۔"

لیکن یہ کہنا کسی صاحب حال کا سا کہنا نہ تھا بلکہ ایسا تھا کہ :

" پڑھاپھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے"

غالب کے مذہب کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں :

" مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے ۔"

مولانا آزاد دھلوی (صاحب آب حیات) کی رائے ہے :

" مگر اھل راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذھب شیعہ تھا ، اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبت میں تھا ، نہ کہ تبرا و تکرار میں ۔"

لیکن غالب کا ایک فقرہ اس سے بھی زیادہ کا پتا دیتا ہے ۔ فرماتے ہیں :

" مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں ، مشرک وہ ہیں جو مسلیمہ کو نبوت میں ختم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں ، مشرک وہ جو نو مسلموں کو ابوالآئمہ کا ہم سر جانتے ہیں ۔"

" ابوالآئمہ" سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور جن بزرگوں کو حضرت علی کا ہم سر مانا جاتا ہے ان کو " نو مسلم " کہا ہے ۔ اور جو لوگ مانتے ہیں کہ ان کو " مشرک " ٹھہرایا ہے ۔" (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا : تاریخ اردو" محولۂ بالا ، ص ۳۹-۲۳۸

اس اقتباس میں جس لطیف انداز میں مولانا نے غالب کے دعویٰ تصوف پر تنقید کی ہے وہ ان کی شگفتہ نگاری کی اچھی مثال ہے ۔ اور اس میں مزاح و ظرافت کے علاوہ آخری فقروں میں طنز کی لہریں پیدا ہوگئی ہیں۔ مگر ہر انداز اپنی حد میں اور ہر فقرہ اپنے معیار پر ہے ۔

غالب ہی کے بیان میں جہاں مولانا نے غالب کے دو متضاد بیانات کا تذکرہ متعلق بہ استاد عبدالصمد کیا ہے وہاں فرماتے ہیں :

" ان دونوں بیانوں میں مطابقت نہیں ہوسکتی بجز اس کے کہ دوسرا بیان بطور ظرافت ہے ، یا یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہے کہ غالب زبان و ادب فارسی میں کسی کے شاگرد نہ تھے، اور یہی واقعہ معلوم ہوتا ہے ۔ پہلا بیان چند فارسی محاوروں کے سلسلے میں ہے جن کے معنوں میں غالب اور نواب خلد آشیان کے درمیان اختلاف تھا۔ نواب صاحب ہندوستانی مصنفین لغات کے معنوں کو درست سمجھتے تھے ۔ غالب اسی خط کی آئندہ سطور میں ان سب فرہنگ نویسوں کو نالائق اور غیر معتبر ٹھہراتے ہیں۔ یہ غالب کی انشا پردازی ہے کہ کسی اہم بات کے لیے شان دار اور فیصلہ کن الفاظ لکھتے ہیں ۔ چناں چہ نواب صاحب کا منہ بند کرنے کے لیے لکھ دیا کہ " میں اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے، اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے ۔" گویا " حقائق و دقائق پارسی" لطائف تصوف اور اسرار معرفت تھے کہ ایک مرشد کامل نے دو سال میں سارا سلوک طے کرادیا ، یا سینہ سے لگاکر " علم لدنی" آن واحد میں عطا کردیا ، اور اس سے " نفس مطمئنہ " حاصل ہوگیا۔ بلا شبہ غالب کو " امور خاص میں نفس مطمئنہ " حاصل تھا ، اور اکثر ان کی رائے درست ہوتی تھی، لیکن یہ بات ان کو کافی مطالعہ کے بعد حاصل ہوئی ہوگی ، یہ ضرور ہے کہ عبدالصمد ایرانی سے دوسال تک جو فارسی گفتگو کی ہوگی ، شعر و شاعری کا ذکر و فکر رہا ہوگا ، اس سے ایک گونہ بصیرت پیدا ہوگی۔ جس نے ذوق سلیم ، فکر صحیح اور مطالعۂ وسیع کے ساتھ مل کر آئندہ رائے صائب کا ملکہ پیدا کردیا ۔" (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری ، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۳۲-۲۳۳

مندرجہ بالا عبارت میں خط کشیدہ فقرں کی شوخی و ظرافت قابل داد ہے ۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ اس لطیف انداز میں جو بات کہنی چاہتے ہیں وہ بھی بطریق احسن ادا کردی ہے ۔

طنز ایک دو دھاری تلوار کی طرح ہے جو دو طرفہ کاٹ کرتی ہے ۔ اس سے ہر طرح کے کام لیے گئے ہیں ۔ لیکن ایسا لطیف طنز جس سے جذبات مجروح نہ ہوں اور جو بات کہنی ہے وہ صاف طور پر ادا بھی ہوجائے بڑی مہارت کا طالب ہے ۔ مولانا کی تحریروں میں اسی قسم کا طنز ہمیں جا بجا ملتا ہے ۔

نواب وقارالملک کے حالات میں "داستان تاریخ اردو" کا ایک حاشیہ ملاحظہ ہو :

" مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی اے نے اپنے ترجمہ " تاریخ ادب اردو" میں نواب وقار الملک کو " خلافت علی گڑھ کاخلیفہ ثانی " لکھا ہے ۔ اس تشبیہ کا ایسی کتاب میں جس کا مناظرہ و مناظرہ مذہبی سے تعلق نہیں، کوئی محل نہ تھا خاص کر جب کہ ترتیب صحیح کی بنا پر غلط بھی ہے ۔ یعنی علی گڑھ کالج کے سکریٹریوں میں نواب وقارالملک کا چوتھا نمبر ہے ۔ یاد رہے کہ سرسید کے بعد سید محمود باقاعدہ سکریٹری ہوئے تھے ۔ اگرچہ چند روز کے بعد ہی ان کو دست کش ہونا پڑا۔ اس لیے سید محمود کو شمار سے حذف نہیں کرسکتے۔" (۱)

آزاد کے بیان میں " داستان تاریخ اردو" میں لکھتے ہیں :

" دوسرے ذوق کے مذہب کو چھپایا ہے اور اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے چناں چہ فرماتے ہیں :

" فقراء اور بزرگان دین کے ساتھ انہیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے تھے اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو" محولہ بالا ، ص ۳۲۷

اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا ۔"

حالاں کہ آزاد کے والد اور استاد دونوں ہم عمر و ہم مکتب تھے ۔ اور (بقول آزاد) " وہ رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور آخیر وقت تک ایسا بڑھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا ۔ " آزاد اکثر سارا سارا دن ذوق کی خدمت میں گذارتے تھے ۔ ان کے وضو، نماز، وظیفے سب کا ذکر کیا ہے ۔ اس پر بھی آزاد کو اور اہل دہلی کو ان کے مذہب کا حال نہ کھلا کہ سنی تھے یا شیعہ " ۔(۱)

تنقید کے اندر طنز و مزاح کا اعلا مصرف یہی ہے کہ نقاد جو بات کہنی چاہتا ہے اس میں مزید زور و اثر پیدا ہوجائے ۔ بعض جگہ نقاد کا کام طبیب و جراح کا سا ہوجاتا ہے ۔ اور ایسے موقع پر ہی طنز کا نشتر کار آمد ثابت ہوتا ہے ۔ ایک ایسے ہی نشتر کا چرکہ ملاحظہ ہو :

" دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

یہ شعر غالب کے بہترین اشعار میں ہے اور بہت مشہور ہے ۔ خود مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں اس کے معنی بیان کردیے ہیں کہ ہماری ہمت دونوں جہان لے کر بھی بس نہ کرتی ، لیکن ان سے تکرار کرنے اور زیادہ مانگنے سے بھی شرم آئی ۔ پھر تکرار کرنا قناعت کے بھی خلاف تھا ۔ اس لیے خاموش ہوگئے ۔ کچھ نہ کچھ کہا نظم صاحب نے اس پر کچھ اضافہ کیا ہے اور وہ بھی صحیح ہے ، یعنی " ہمارا دعوا تو یہ تھا کہ ایک اس سے مفارقت نہ ہوتی اور یہ کچھ نہ ملتا ۔" ~~کچھ~~

لیکن آسی صاحب نے جو مضمون لکھا ہے وہ عجائبات فکر و فہم سے ہے ۔ فرماتے ہیں :

" ہم نے دونوں جہان کو اس کے مقابلے پر ہیچ سمجھا تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ خوش ہے ، حالاں کہ دونوں جہان کا چھوڑنا ہم کو

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، " داستان تاریخ اردو" ، محولہ بالا ، ص ۳۸۲

بہت شاق گذرا تھا۔ مگر شوم یہ تھی کہ اس کا یہ خیال ہے تو یہی سہی۔ اب تکرار کیا کریں سمجھنے دو۔ چپ ہو رہو - سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے -"

آسی صاحب خود ہی اپنی شرح کی شرح فرمائیں تو سمجھ میں آئے - ویسے تو بے معنی عبارت معلوم ہوتی ہے - مولانا حالی وغیرہ نے پہلے مصرع کو نثر کی ترتیب میں اس طرح سمجھا ہے -" وہ دونوں جہان دیے کے سمجھے یہ خوش رہا" لیکن آسی صاحب کے مطلب کے مطابق یہ نثر ہوتی ہے - " وہ سمجھے یہ دونوں جہان دیے کے خوش رہا" بے شک مصرع کے الفاظ کو اس ترتیب سے بھی رکھا جاسکتا ہے ، لیکن ایک تو اس میں بے جا تعقید لازم آتی ہے جب کہ پہلی صورت میں مصرع خود ہی نثر ہے - یا زیادہ سے زیادہ ایک لفظ (وہ) سب سے پہلے رکھ دیا جائے - دوسرے اگر ~~فقط~~ آسی صاحب ہی کا مفہوم مان لیا جائے پھر بھی انھوں نے شرح میں عجیب پریشان خیالی کا اظہار کیا ہے - یعنی کہتے ہیں کہ " ہم نے دونوں جہان کو اس کے مقابلے پر ہیچ سمجھا تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ خوش ہے " - یہاں تک بات ٹھیک تھی، یعنی وہ سمجھے کہ یہ شخص دونوں جہان چھوڑ کر اور ہم کو لے کر بہت خوش ہے - لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں : حالاں کہ دونوں جہان کا چھوڑنا ہم کو بہت شاق گذرا تھا۔ یعنی ہم خوش نہ تھے - یہ کیا بات ہوئی! دونوں جہان کو اس کے مقابلے پر ہیچ بھی سمجھا تھا اور ان کا چھوڑنا شاق بھی تھا۔ اور پھر آگے کہتے ہیں کہ مگر شوم یہ تھی کہ اس معاملے سے ہمارے ناخوش ہونے کے باوجود وہ ہم کو خوش سمجھتے ہیں تو اب تکرار کیا کریں، یہی سہی ، سمجھنے دو - بہت اچھے رہے! کیا کہنا ہے آسی صاحب کی سمجھ کا -" (۱)

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا "نقد و نظر"، محولہ بالا ، ص ۲۶-۲۵

غالب کی شرحوں کے سلسلے میں ہی ایک اور لطیف طنز ملاحظہ ہو :

" مولوی علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی لکھنوی کی شرح سب سے
بہتر اور بڑی حد تک مکمل ہے ۔ لیکن جیسا کہ میں نے آسی صاحب کی شرح کے
متعلق پہلے لکھا ہے ۔ نظم صاحب نے بھی ادھر ادھر کی غیر ضروری باتوں سے
اپنی کتاب کو طول دے دیا ہے ۔ کہیں مذہبی مسائل بیان کیے ہیں، کہیں
عرب کی شاعری پر بحث کی ہے ۔ کہیں دہلی و لکھنو کی زبان کا مسئلہ
چھیڑ دیا ہے ۔ کہیں لطیفوں پر لطیفے لکھ دیے ہیں ۔ ایک جگہ غالب کے
اس مصرع پر " ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے " ڈیڑھ درجن مصرعے
اپنے چسپاں کردیے ہیں ۔ جن میں سے ایک ایک مصرع خواجہ وزیر اور آغا امانت
کی ارواح پر فاتحہ خوانی کر رہا ہے ۔ اسی کے سلسلے میں ایک اور مصرع (اس
لیے عصیر جاناں ہم نے کھچوائی نہیں) پر ۲۱ مصرعے لگادیے ہیں اور یہ بھی
لکھنو اسکول کا فوٹو گروپ ہیں ۔" (۱)

طنز و مزاح اور ظرافت تینوں عناصر کا لطیف امتزاج مولانا کے مضمون " جوش
ملیح آبادی کا شوق اصلاح" میں ملاحظہ ہو :

" جناب نوح ناروی کی غزل پر بھی جوش صاحب نے اپنی استادی کی زور آزمائی
فرمائی ہے ۔ جناب نوح کا شعر ہے :

لطف جب تھا ہر گھڑی پھرتی وہ چشم شوق میں
دیکھتا میں جلوۂ دیدار اٹھتے بیٹھتے

اعتراض جوش : — چشم شوق میں پھرنے سے مطلب کیا ۔ اس سے تو مراد یاد
آنے سے ہے ۔ اصلاح :

لطف جب تھا ہر گھڑی رہتا وہ میرے سامنے
دیکھتا میں جلوۂ دیدار اٹھتے بیٹھتے

تبصرہ : ۔ جوش صاحب شاعرانہ نزاکتوں اور لطافتوں کو نہ سمجھ سکیں تو کوئی
ذریعہ ان کو سمجھانے کا نہیں ہوسکتا ۔ اس لیے کہ یہ چیز محض ذوقی و وجدانی ہے ۔
معلوم ہوتا ہے جوش صاحب کے نزدیک " سپاٹ" کہنے کا نام شاعری ہے ۔ جوش صاحب نے

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا " نقد و نظر"، محولہ بالا، ص ۳۱-۳۰

جہاں جہاں اصلاح دی ہے اشعار کے استعاریے ، کنایے ، جدت ادا ، ندرت خیال کے نقش و نگار کو ملاکر " سلیٹ " بنادیا ہے - " چشم شوق میں پھرنے" سے مطلب صرف یاد آنا نہیں بلکہ یاد رہنا اور ہر وقت تصور رہنا ہے - اور چوں کہ محاورے میں " پھرنے" کا لفظ ہے اس سے جوش صاحب نے وہ مضمون پیدا کردیا -

جناب جگر مرادآبادی کو بھی جوش صاحب نے فیضان سے محروم نہیں رکھا - جگر صاحب جذباتی شاعر ہیں۔ اور اپنے جوش جذبات اور والہانہ انداز میں آج وہ ہندوستان میں تنہا غزل گو ہیں۔ انھوں نے ایک سادہ جذباتی غزل لکھی ہے جس پر جوش صاحب نے اصلاح دی ہے - جگر صاحب کا مطلع ہے :

بے تاب ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل مچھلی بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

اعتراض جوش :- دل ماہی بے آب ہے تو اس کی رعایت بھی لازمی ہے - اساتذہ کا یہی قانون ہے - لفظ بے خواب بھی بے کار ، بے تاب کافی ہے -

اصلاح :

دریا یہ بھی بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہی بے آب ہے ، معلوم نہیں کیوں

تبصرہ :- یہاں جوش صاحب کی استادی کی معراج ہوگئی - ماہی بے آب کی رعایت سے یہ کہنا " دریا یہ بھی بے تاب ہے " شاید خواجہ وزیر اور آغا امانت کو بھی نہ سوجھتا - یہ جوش صاحب کے تغزل و شعریت کا کمال ہے -

شعر جگر مراد آبادی :

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہ آب ہے معلوم نہیں کیوں

اعتراض جوش :- " آج بھی " بے رعایت ہے، کشتی سی تہ آب اس وقت موزوں ہوگی جب سینہ غرق ہوگا اور ربط بھی دونوں مصرعوں کا حسب اصلاح ہوگا۔

اصلاح :

کیوں سینہ لیے دل کو ہے اس بحر بدن میں
کشتی سی تہ آب ہے معلوم نہیں کیوں

تبصرہ :- جگر صاحب کا کیسا نازک ، نادر لطیف اور پرتاثیر شعر تھا جس کو جوش صاحب ~~xxxxxx~~ نے اپنے گرداب استادی میں ڈبودیا " کشتی سی تہ آب " ثابت کرنے

کے لیے سینہ کو بحر بدن میں غرق کرنا، داد اور فریاد دونوں سے بالاتر ہے - جوش صاحب نے ان شاعروں کی بڑی بڑی غزلوں پر اصلاح دی ہے - میں نے صرف نمونہ دکھایا ہے -"(۱)

مولانا قادری کا مقام جدید تنقید میں :

مولانا علمی تنقید کے دورِ جدید میں منفرد مقام کے مالک ہیں- اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے وہ خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی کی صف کے ادیب ہیں- مغربی ادب کے مطالعہ، اور مغربی تنقید کے صالح عناصر کو اپنانے میں وہ بعض جوان تر نقادوں سے بھی آگے ہیں- بادی النظر میں ان کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوسکتا ہے کہ وہ روزمرہ، محاورہ، الفاظ کے استعمال اور فقروں کے در و بست کے زیادہ قائل ہیں- حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اجزاء ادیب و شاعر کے لیے اس کے اوزار و آلات کا درجہ رکھتے ہیں- اور ادیب و شاعر نقاد و مورخ یعنی فن کار و ہنر مند بھی ہوتا ہے اور جو فن کار ہنر مندی کے ساتھ اپنے پیشے کے آلات کا استعمال نہ کرسکے گا تو ظاہر ہے کہ اس کی تخلیقات بھدی و بے ہنگم ہوں گی - لیکن مولانا کی تحریروں کو بغور دیکھنے سے ان کے نقطۂ نظر کی صاف وضاحت ہوجاتی ہے - وہ روح و جسم دونوں کے قائل ہیں اور دونوں کی اہمیت ان کے حدود میں تسلیم کرتے ہیں- جدید نظم، نظم معری، نظم آزاد وغیرہ کو ان کے ہم عصر اور ہم عمر نقادوں میں سے صرف معدود چند نے ہی بالغ نظری کے ساتھ دیکھا اور وسعت نگاہی کے ساتھ پرکھا- مولانا نے علامہ نیاز فتح پوری کی فرمائش پر ایک طویل مضمون میں "نئی شاعری اور نئے رجحانات" کا جائزہ لیا ہے - اس کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مولانا اپنے ہم عصر بعض جوان تر نقادوں سے زیادہ فراخ دل اور بصیرت کے حامل ہیں- یہ مضمون بعنوان "انقلابی شاعری" ماہنامہ

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا، "نقد و نظر"، محولہ بالا، ص ۳۲-۱۳۰

"نگار" لکھنؤ کی جنوری و فروری ، ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوچکا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

" میں زندگی کی طرح شعر و ادب میں بھی انقلاب کو ناگزیر سمجھتا ہوں۔ اس کی ہر نئی شکل ، نئے اسلوب ، نئے موضوع کو نظر استحسان سے دیکھتا ہوں، لیکن فوراً اس ظاہر کے اندر باطن پر نظر ڈالتا ہوں اور باطن ہی کا تعطر و تعفن میری نظر میں اس کو گوارا یا ناگوار بناتا ہے ۔

انیسویں صدی کا تین چوتھائی حصہ گذرنے تک اردو شاعری کا مقصد بجز شاعری یا دربار داری کے کچھ نہ تھا۔ " شاعرانہ پیغام " اس زمانے میں کوئی چیز نہ تھا۔ ملکی و سیاسی کا کیا ذکر ، مذہبی ، قومی، معاشرتی اصلاح بھی پیش نظر نہ تھی۔ شاعری کرتے تھے اس لیے کہ سب کرتے ہیں۔ شاعری کرتے تھے اس لیے کہ اور کچھ نہ کرسکتے تھے۔ شاعری کرتے تھے اس لیے کہ اور کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ ان کی شاعری "روایتی" تھی تو ایسی ہی سمجھی جاتی تھی ، زندگی کی کوئی تعمیر یا تخریب نہ ان کو مقصود تھی نہ ان کی شاعری سے اس پر کوئی اثر پڑتا تھا۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت خواجہ میر درد مسند رشد و ہدایت پر متمکن تھے اور ہزار ہا بندگان خدا کو راہ پر لا رہے تھے۔ اور صدہا کو صاحب دل اور روشن ضمیر بنادیا تھا (خواہ اس کو نیاز صاحب نہ مانیں) لیکن یہ بزرگ بھی غزل لکھتے تھے تو حسن و عشق کے کھلے معاملات اور عریاں جذبات بے تکلف لکھ جاتے تھے اس لیے کہ ان کے زمانے میں ہر قال کو حال سمجھ لینے کا دستور نہ تھا۔ اسی لیے نہ میر و سودا کو کسی نے ملعون کیا نہ رنگین و جان صاحب پر انگلیاں اٹھیں اسی لیے ان کی شاعری سے نہ اخلاق بنتے تھے نہ بگڑتے تھے۔ نہ معیشت و سماج میں کوئی جزر و مد پیدا ہوتا تھا۔ نہ مذہب کی کشتی ڈانوا ڈول ہوتی تھی۔ سبب ظاہر ہے کہ وہ اپنے کو مذہب و ایمان

سے مطمئن تھے - اپنی تہذیب و معاشرت سے خوش تھے۔

اس کے ساتھ اس زمانے کی ایک اور حقیقت بھی نہایت اہم اور قابل لحاظ ہے - حیات و معاشرت کا ایک جزو لاینفک عورت ہے - جس کی افتاد و رفتار پر انسان کی ذاتی و اجتماعی حیات و مسرت کا انحصار ہے - اگلے زمانے میں عورت ذات ایک مبارک جمود و جہالت کی حالت میں تھی، اپنی زندگی پر قانع و مطمئن ، مردوں کے اعمال سے بے نیاز اور ان کی شاعری سے بے خبر - اگر شاعری و ادبیات میں کوئی عنصر تھا تو اس کا اثر چار دیواری کے اندر نہ پہنچتا تھا۔ اس لیے اس زمانے کی تمام زندگی " بیرون در" اور " درون خانہ " امواج مدو جزر کی طرح چل رہی تھی۔

اس حالت کا عصر حاضر سے مقابلہ کیجئے - مذہب سے بے اطمینانی، وضع قدیم سے دشمنی ، اخلاق سے آزادی، جذبات کی بے باکی ، تعلیم کی غلط رفتار، مخلوط تعلیم، سیاسی بے چینی، تحریکات اشتراکیت وغیرہ کا غلط استعمال ، سرمایہ داری کا اعمال و اخلاق پر اثر۔ صنعت و تجارت کی مسابقت کا سوسائٹی پر اثر ، یورپ کی کورانہ تقلید، عریانی و بے حیائی کی ترغیب و تشویق، جنگ سابق و حال سے زندگی کی دشواریاں ، مردوں کی کمی، عورتوں سے ان کی خانہ بری۔ یورپ کی زنانہ تحریکات کا ہندوستان میں رواج ، ایسی کتنی باتیں ہیں جن سے ہماری ذاتی ، خانگی، مجلسی، قومی، ملکی زندگی اور ہماری ادبیات اور شاعری متاثر ہورہی ہے - انہی کے زیر اثر جدید رجحانات پیدا ہو رہے ہیں اور انقلابی شاعری کا حشر برپا ہو رہا ہے - دنیا کے بعض نظریے اور تحریکیں جو مغربی و مشرقی و انقلابی اردو شاعری کا موضوع بنی ہیں - ان پر صرف ایک سرسری نظر اور مختصر اشارے اس وقت ممکن ہیں۔

۱- سب سے بڑی تحریک خدا سے بے زاری ہے - مذہب کا سب سے بڑا کام

انسان کے قوائے ذہنی و عملی کی تہذیب اور روک تھام ہے - انسان ایسی بے پناہ مخلوق،
ایسا وحشی حیوان اور خطرناک درندہ ہے کہ اس کو ایک حد کے اندر رکھنا بڑی سخت جکڑ
اور پکڑ کا کام تھا - خدا کا تصور اور مذہب کے قوانین کا یہی مقصد تھا - خدا سے
بغاوت ہمیشہ ہوتی رہی ہے - لیکن کبھی حکومت اور کبھی سوسائٹی اور ان سے زیادہ
خود خدا کا تصور، جو سماجی اور مذہبی طور پر طبائع میں جاگزیں ہوچکا تھا، اس
شورش کو دباتا رہا - XXX علما اور حکما نہ صرف یونانی وغیرہم بلکہ اسلامی بھی، خدا
کی ہستی اور ذات و صفات میں بحث کرتے رہے ہیں- لیکن یہ صرف علم و حکمت کا ایک
مسئلہ تھا- عملی اور اجتماعی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہ تھا- پھر انیسویں صدی میں
بعض مغربی اہل حکمت و سائنس نے اس مسئلے کو جدید نظریات کی روشنی میں پیش کیا-
اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ایسی ہر تحریک عالم گیر بننے کے لیے آمادہ تھی- خیال و رائے
کی آزادی عام ہو رہی تھی- حکومت اور سوسائٹی اپنے اثرات کو استعمال کرنے کے لیے دست
کش ہو رہے تھے چنانچہ بیسویں صدی کے آتے آتے یہ آگ مغرب سے مشرق اور ہندوستان
میں آگئی - بیسویں صدی نے اپنی آزادی کے پنکھوں کا رخ بھی ادھر پھیردیا- انسان
عجیب تضاد سے مرکب ہے - جنگ، بے امنی، مصائب، قحط، افلاس، جہاں خدا کو یاد
دلاتے ہیں، خدا سے برگشتہ بھی کردیا کرتے ہیں- ہندوستان پر ان آفات کے علاوہ غلامی
کی بلا اور فرقہ بندی و تفرقہ اندازی کا وبال بھی تھا، ہندوستان کے مفکرین نے ان امراض
کا سبب مذہب کو قرار دیا- اور یہ علاج تجویز کیا کہ خدا کو ہندوستان سے نکال دیا
جائے اور مذہب کا استیصال کردیا جائے تو ہندو مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی سب
صرف ہندوستانی رہ جائیں گے اور ایک قوم و ایک حکومت ممکن ہوگی-

خداوند مذہب سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہونے کے بعد قدیم رسم و رواج، سماج،

روایت ، اخلاق سب سے آزاد ہوجانا آسان ہوجاتا ہے - عورتوں میں اس خیال کی کارفرمائی شرم و حیا اور عفت و عصمت کی بندشوں کو توڑ دینا سہل کردیتی ہے - آج کل کے نوجوان مردوں اور عورتوں کے اخلاق نمایاں طور پر اس تحریک سے متاثر اور ان کی شاعری پر موثر ہیں-

۲- دوسری زبردست تحریک سرمایہ داری اور صنعت و حرفت کی مسابقت ہے - سرمایہ داری کا اثر ملک پر، حکومت پر ، دولت پر ، مزدوروں پر ، غلامی و آزادی پر، افلاس و خوش حالی پر ، جو کچھ ہے ظاہر ہے اور بارہا بحث میں آچکا ہے - لیکن اس پہلو پر کم غور و تامل کیا گیا ہے کہ سرمایہ داری کی لعنت انسان کے ذاتی و اجتماعی اخلاق پر بھی چھا جاتی ہے - مذہب و اخلاق سے بے زاری ، عزت و آبرو سے بے پروائی ، نفس و ہوس کی شعلہ افگنی تمام اعمال حسنہ کی تباہی میں اعانت کرتی ہے - تمام مغرب و مشرق اور ہندوستان میں یہی ہوا ہے - مغرب کے سرمایہ دار اور صناع و تاجر کے پیش نظر اصل میں اپنی دولت افزائی تھی- لیکن صناع و تاجر اپنے مقصد کے لیے دنیا کی تمام تحریکات سے کام لیتا ہے - وہ دیکھتا ہے کہ عیش پرستی و ہوس ناکی کا جوش خود بینی و خود آرائی کا شوق آزادی و بے باکی کا زور عالم گیر ہے - چناں چہ وہ اس جذبے کا ابھارنے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے صنعت کے ذریعہ ایجادات کرتا ہے اور تجارت کے وسیلے سے ان کو عام کردیتا ہے - ایک عیورش و لپ اسٹک سے لے کر سنیما تک تمام آرائش و آسائش ، تعیش و تفریح کے سامان میں اسی سرمایہ داری و تجارت کی کارفرمائی ہے - ملک کے دولت مند عیش پرست ان سرمایہ داروں اور صناعوں کے گویا اعزازی ایجنٹ ہوتے ہیں- جن کے ذریعہ سے متوسط اور ادنیٰ طبقہ اسراف و تعیش میں مبتلا ہوتا ہے ملک کے اخبار، صحف، شاعر، اشتہار چھاپ کر - جنسیات کی کتابیں ، افسانے اور ناول لکھ کر ، فلمیں شائع کرکے انہی سرمایہ داروں کی گویا بالمعاوضہ خدمت انجام دیتے ہیں- ہندوستان کا افلاس اور بدحالی قوت عمل کا اضمحلال ، جسم و دماغ کی ناتوانی ، اخلاقی پستی سب کے سب بظاہر بالواسطہ

لیکن اصل میں بلاواسطہ اسی سرمایہ داری کے کرشمے ہیں۔ یہ میں نے عصر حاضر کی "ہیئت کذائی" اسباب و علل اور نتائج و عواقب کا صرف ایک رخ بطور خاکہ پیش کیا ہے۔ رفتار زمانہ اور انقلاب عالم کی رو سے ان کا ناگزیر ہونا اور قضائے مبرم کی طرح نازل ہونا مجھے تسلیم ہے لیکن واقعات کے اس دور و تسلسل سے بھی انکار نہیں ہوسکتا اور میرا مسلک بھی در مع الدھر کیف ما دار نہیں ہے -

انقلابی شاعروں نے " ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی " پر بحثیں کی ہیں۔ اور صرف دوسرے نظریے و اصول کو اپنا مسلک قرار دیا ہے - یہ زندگی جس کی وہ شعر و ادب کے ذریعہ سے اصلاح و ترقی چاہتے ہیں کہنے کے لیے تو جملہ شعبوں کو محیط ہے - علم و تعلیم ، اعمال و اخلاق ، معیشت و معاشرت ، قحط و افلاس ، مزدور اور کسان سب ان کے احاطۂ عمل میں شامل ہیں ، لیکن جائے تامل یہ ہے کہ وہ فی الواقع غریب ہندوستان کی کیا اور کتنی خدمت اپنے شعر و ادب سے کر رہے ہیں اور کس قدر فرائض اپنے عمل سے انجام دے رہے ہیں۔ قدیم شاعروں کی یہ بڑی جہت تھی کہ ان سے کوئی شخص یہ سوالات نہیں کرسکتا تھا وہ شعر برائے شعر کہتے ہیں یا برائے گفتنی - لیکن اب شاعروں نے پیغام بری ، رہنمائی اور انقلاب انگیزی کے مناصب اپنے لیے تجویز کرلیے ہیں - تو حیات عملی پر نظر کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کوئی ایک انقلابی شاعر اپنا تن من دھن تج کر اصلاح ملک و قوم کا بیڑا اٹھائے ہوئے نہیں ہے - اب رہی شاعرانہ پیغمبری یا پیغمبرانہ شاعری ، تو دلوں کا حال تو اللہ جانے لیکن شاعری کو پڑھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اگر نظم و شعر میں دل کا درد منتقل ہوسکتا ہے تو بلا استثنا کسی ایک شاعر کی ایک نظم میں بھی درد دل اور سوز جگر کا وجود نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے جب تک ان شاعروں کے حالات وہ نہیں جو ہیں۔ حالات سے میری مراد سیرت و اخلاق نہیں ، بلکہ

ان کی بے علی اور زبانی باتیں ہیں۔ اب وہ زمانہ ہے کہ شاعر و شعر میں شخص و عکس
کی نسبت ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو تو شاعر شاعر نہیں اور شعر شعر نہیں۔ یہاں شاعر
سے میرا مقصود نوجوان انقلابی شاعر ہیں جنھوں نے نظموں میں نئے رجحان ، نئے موضوع ،
نئے اسلوب اختیار کیے ہیں۔ ان سے زیادہ پرانے اور پختہ کار شاعر کبھی کبھی استثنائی
شان پیدا کردیتے ہیں اور صحیح فکر و تدبر کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے
انقلابی شعرائے سابقین میں صرف ایک اقبال کو کلا کامل استثنا و انفرادیت حاصل ہے - جو
صرف ہندوستان و ایران میں نہیں بلکہ تمام ممالک اسلامی میں تنہا مفکر اعظم اور شاعراعظم
تھا۔

دور جدید کے انقلابی شاعری کے ارتقا فکر رفتار تخیل اور ایجاد اسالیب کی تاریخ
پر نظر ڈالی جائے تو الگی ورق گردانی کرنے سے ورق اول پر اقبال ہی نظر آئیں گے - اقبال
کی زندگی اور شاعری کے دور آخر میں تمام عرب اور ایشیا میں انقلاب عظیم برپا ہوگیا تھا۔
حکومت و تمدن رفتار و کردار ، ذہن و فکر سب بدل رہے تھے۔ اسلامی حکومتیں خاص طور پر
اس سیلاب کی زد میں آگئیں تھیں۔ اسلامی روایات ، اسلامی نظریات حیات ، اسلامی اصول
معیشت اس رو میں بہنے شروع ہوگئے تھے اور یہ تمام دفتر عالم ، یہ پورا صحیفہ انقلاب تمام
مفکروں اور شاعروں کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ عرب و ایران کا ہر مبصر اس کتاب کو ویسی ہی
آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتا تھا جیسے ہندوستان کا دیدہ ور - لیکن حیرت انگیز و
بصیرت افروز حقیقت یہ ہے کہ ایک پلے میں تنہا اقبال کی فارسی و اردو نظمیں اور دوسرے
پلے میں ایران کی تمام جدید انقلابی شاعری، ترازو کو اٹھایا جائے تو اقبال کی گراں قدری
کے مقابلے میں تمام عجم نہایت سبک ثابت ہوتا ہے - زبان و محاورہ میں نہیں - سبک ایرانی
میں نہیں، اصناف سخن میں نہیں۔ اشکال نظم میں نہیں - بلکہ پیام شاعرانہ میں روح نظامی

میں حکمت و تدبر میں ، زمانہ کی نبض شناسی میں ، مستقبل بینی میں ، صحت اصلاح و تبلیغ میں ، رفعت تخیل ، جدت اسلوب میں یہ بات صرف میں نہیں کہتا خود اہل ایران کو اس برتری اور پیغمبری کا اعتراف ہے -

اب دوبارہ ایرانی شاعری کے بدلے میں اس کی جگہ تمام اردو کی جدید انقلابی شاعری کو رکھ کر تو لیے پھر بھی اقبال ہی من تلک موازنہ کے زمرے میں آتے ہیں - اس بات سے شاعری کے کسی مبصر کو انکار نہ ہونا چاہئے - لیکن اگر ہو تو پھر یہ میرا ہی دعوا سہی - میرے نزدیک اقبال کی اس فضیلت کا سبب ان کے ذوق صحیح کے ساتھ ان کا قلب سلیم بھی ہے - اسی سلامت قلب نے بالاخر ان کے گفتار و کردار میں تطابق پیدا کرکے ان کو صحیح مفکر اور حقیقی شاعر بنادیا تھا - مجھے اس وقت اقبال کا تذکرہ کرکے اپنی بات کو گوش گذار کرنا تھا کہ حقیقی شاعری اور پیغمبرانہ شاعری کے لیے شاعر کو اپنی روح اور اپنی شاعری کی روح کو "یکجان و دو قالب" کرنا لازم ہے - یہ بات اقبال میں تھی اور ان کے علاوہ ہندوستان کے کسی بوڑھے ، جوان اور نوجوان شاعر میں نہیں ہے - لہذا عصر حاضر کے زندہ موجود شعرائے اردو میں کوئی فرد واحد " پیغمبر شاعر" نہیں ہے - اس پیغمبری کے لیے ادراک کی صحت ، احساس کی شدت ، جذبہ کی واقعیت ، تجربے کی واردیت کے ساتھ اسباب پر گہری نگاہ ، نتائج پر دور میں نظر ، حقائق کا صحیح تجزیہ ، حوادث پر درست تنقید کی ضرورت ہے ، اور اس سے زیادہ ذہن عام سے بلند تر تخیل ، الہامی بیان ، پیغمبرانہ اسلوب لازم ہے - اور اس سے بھی بڑھ کر پیام شاعرانہ کی محکمیت " نسخۂ کیمیا" کی قطعیت اور قال و حال کی مطابقت ناگزیر ہے - کوئی مصلح و مبلغ ، کوئی ہادی و پیغمبر صرف باتیں نہیں بناتا - اپنے " پیغام " کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کہتا - اپنے عمل سے اپنے قول کی صداقت کو ثابت کرتا ہے - اور بالاخر زمانہ کے اہل بصیرت اور دیدہ ور نقاد اس کے پیغام کی یکسانی و ہم واری کا اعتراف کرتے ہیں - اس کے

دشمن اس کے قول پر عمل نہ کریں - لیکن اس کے عمل یقین اور ثبات و استقلال کو ماننے پر مجبور ہوتے ہیں- یہ پیغمبرانہ اوصاف آج صرف ہندوستان میں نہیں تمام عالم اسلامی کے کسی شاعر میں نہیں؟ اس داد حق اور موہبت عظمی کا بالفعل دور " ظفرہ " اور عہد تمثّل ہے - جب تک :

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند "

لیکن میں شاعری کو صرف اس قسم میں محدود نہیں سمجھتا - شاعری کام بھی ہے اور کھیل بھی- شاعری برائے زندگی بھی ہے اور برائے شعر و ادب بھی اور برائے لاشے بھی- مشرق و ہندوستان کا نظریۂ شاعری مغرب سے بالکل مختلف رہا ہے اور ہے اور رہے گا- جب تک ارض دہج و یونان کی طرح ہندوستان اور ہندوستانیت کا تختہ نہ الٹ جائے - بعض ہندوستان کا شاعر کبھی اس طرح بھی شعر کہتا ہے کہ اس کے پیش نظر نہ زندگی کا کوئی مسئلہ ہوتا ہے نہ شعر و ادب کی ترقی بلکہ اس کو شعر کی موزونیت پسند ہوتی ہے - شعر کہنے کو اس کا جی چاہتا ہے - شعر کہنا اس کے لیے باتیں کرنے کے برابر آسان ہوتا ہے اسی شوق و شغف میں لوگوں نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کردیا ہے - مثنوی مولانا روم کو اردو میں نظم کردیا ہے - مسائل فقہ اور قواعد صرف و نحو نظم میں لکھ دیے ہیں- آپ ان چیزوں کو شاعری سے تعبیر کریں گے - میں بھی آپ سے متفق ہوں لیکن ان کے نظم ہونے سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا- یورپ کی شاعری میں ایسے کارنامے نہیں ہوتے لیکن ہندوستان کی شاعرانہ ذہنیت کی تاریخ میں ان سے صرف نظر ممکن نہیں، ہندوستان کے سے مشاعرے یورپ میں کہاں ہوتے ہیں- غزلوں کے گل دستے، انگلش ، فرنچ ، جرمن زبانوں میں کب شائع ہوتے ہیں- فی البدیہہ نظم کہنے کا رواج وہاں کہاں- ہندوستان میں باتیں کرتے کرتے تاریخ یا رباعی کہہ دیتے ہیں- چلتے پھرتے غزل موزوں کرلیتے ہیں- کتابوں اور مقالوں میں برمحل

شعر لکھتے ہیں۔ تقریروں میں شعر پڑھتے ہیں۔ خطوں میں شعر لکھتے ہیں۔ عوام بازاروں میں شعر گاتے چلتے ہیں۔ خواص بے تکلف صحبتوں میں شعر سنتے سناتے ہیں۔ فقروں کا توازن اور نظم کے قوافی ہندوستان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کی کہاوتیں اور مثلیں موزوں اور مقفی ہیں۔

ان میں سے بیشتر کو اعلا شاعری سے خارج کیا جاسکتا ہے لیکن ہندوستان کے شاعرانہ ماحول سے باہر نہیں نکالا جاسکتا۔ کسی طفل شیر خوار کو ہندوستان سے لے جاکر انگریزوں کے سپرد کردیا جائے تو وہ بالآخر خواب بھی انگریزی میں دیکھا کرے گا لیکن اس طرح کا مسخ فطرت ہندوستان میں رہنے والوں کے لیے مستقبل بعید میں بھی امکان وقوع نہیں رکھتا۔ لیکن ہمارے انقلابی شاعر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی رفتار بدل دی ہے تو گویا ہندوستان کی افتاد طبع بھی بدل گئی -

میرا مقصود یہ ہے کہ انقلاب جدید کے اثر سے اردو شاعری کے قدیم موضوعات میں تغیر ہوجائے - قدیم اصناف تبدیل ہوجائیں ، نئے تجربات لکھے جائیں، نئی انفرادیت پیدا ہوجائے ، کوئی مضائقہ نہیں - لیکن ہندوستانیت فنا نہ ہونی چاہیے - مشرقیت تباہ نہ ہوجائے، قدیم طرز تخیل اور اسلوب بیان میں خرابیاں بھی تھیں جو زمانے کی "نظر بندی" کے سبب سے ان لوگوں کو محسوس نہ ہوتی تھیں ، اور اب فکر و نظر کی آزادی کے سبب سے نمایاں ہوگئی ہیں، مغربی شاعری کے موضوع خیالات ، اسالیب سب کچھ اردو شاعری میں لیے جاسکتے ہیں اور لینے چاہئیں ، لیکن وہ جو ہندوستان کی فطرت میں جذب ہوسکیں اور زبان میں سموئے جاسکیں - انقلابی شاعر بس اسی نکتے کو بھولے ہوئے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ میدان سیاست میں تو یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم سب سے پہلے ہندوستانی ہیں پھر اور کچھ ہیں - لیکن شاعری میں ان کا دعوا یہ ہے کہ ہم کچھ ہیں یا

نہ ہیں ہندوستانی ہرگز نہیں ہیں۔

نئی شاعری کی جدت آفرینی کے مختلف اوضاع و عناصر ہیں۔ اور ان کی الگ الگ حیثیت اور اہمیت ہے مثلاً تحریر میں مصرعوں یا مصرعوں کے ٹکڑوں کو الگ الگ لکھنا ، نیچے اوپر لکھنا ، ایک مصرع چند سوال و جواب سے مرکب ہو تو ان کو افسانہ کے مکالمہ کے طور پر لکھنا ۔ یا نظم کے بندوں میں قافیوں کی نئی ترتیب پیدا کرنا۔ یہ سب ظاہری باتیں ہیں۔ باطنی شاعری سے ان کو کچھ تعلق نہیں۔ لباس کی قطع و تراش ہے ، کمرے کے فرنیچر کی ترتیب ہے ، مختلف وضع و قطع کے لباس یکساں طور پر بھلے معلوم ہوتے ہیں ، کمرے کو بہت صورتوں سے آراستہ کیا جاسکتا ہے ۔ اصل چیز لباس اور کمرے میں ہیئت کی موزونیت اور ذوق کی لطافت ہے ۔ میرے نزدیک مصرعوں کی ہر ترتیب جائز ہے ۔

دوسری جدت بے قافیہ نظم کی ہے میں اس کو ہندوستانی مذاق کے خلاف سمجھتا ہوں ۔ ترک قافیہ کے لازم و ناگزیر ہونے کا میں قائل نہیں ظاہر میں ترک قافیہ آسان تو ہے مگر، دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں" خود انقلابی شاعر قافیہ کی پابندی کے ساتھ بہت آسانی سے نہایت خوب صورت نظمیں لکھ لیتے ہیں ۔ یورپ کی شاعری میں " بلینک ورس " طویل نظموں اور ڈراموں کے لیے اختیار کی گئی تھی اور وہاں اس کی ضرورت تسلیم کی جاسکتی ہے ۔ اس لیے کہ قافیہ کی پابندی نہ ہونے سے نظم کو نثر کی ترتیب سے قریب تر لایا جاسکتا ہے ۔ اور افراد افسانہ کے مختصر مکالمے اور طویل تقریریں نثر سے جس قدر مماثل اور روزمرہ سے جس قدر مطابق ہوں بہتر ہے ۔ لیکن وہاں بھی وہ نظم سرتا سر نظم نہیں ہوسکتی ۔ یہاں اردو کی مختصر نظموں میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں ۔ نظم کو نثر کی ترتیب کے ساتھ موزوں کرنا نظم کے محاسن میں نہیں ہے ، بلکہ نظم کا نثر سے ممتاز ہونا ہی اس کا حسن ہے ۔ بہرحال میں بے قافیہ نظم کا شدید مخالف نہیں نظم کے مقفی یا معری ہونے کو میں نفس شاعری سے خارج سمجھتا ہوں ۔ میں تھیٹھ نثر

میں شاعری کا قائل ہوں۔ قدیم و جدید نثر نگاروں کے صدہا فقرے ہیں جن کو میں اشعار سے بہتر شعریت کا حامل سمجھتا ہوں۔ وہ نثر اگر کسی وزن میں رکھدی جائے تو میں زیادہ متاثر ہوں گا اور اگر مقفی ہوجانے سے تاثیر میں فرق نہ آئے تو اور زیادہ لطف اندوز ہوں گا ۔ قافیہ سے لازم طور پر تاثیر میں فرق آجانے کا میں قائل نہیں۔

تیسری انقلابی شان آزاد نظم ہے ۔ یہ عجیب ہیولی ہے اور عجیب بے تکی و بے ڈول چیز ۔ یعنی اس میں قافیہ کے علاوہ وزن سے بھی آزادی ہے یا کم از کم وزن کی آزادی حاصل ہے کہ ایک ہی نظم میں مختلف وزنی شکلیں ہوجاتی ہیں یا ایک وزن کسی مصرع میں پورا ہو کسی میں چوتھائی ، کبھی وزن کا نقش بالکل توڑ دیا جاتا ہے اور اس کی کڑیاں بکھری رہتی ہیں، یعنی بجائے نظم کے نثر ہی کو آزاد نظم کہا جاتا ہے ۔ لیکن اس میں اتنا امتیاز پیدا کردیا جاتا ہے کہ الفاظ کی ترتیب سے ایک قسم کا لحن یا آہنگ پیدا ہوجاتا ہے ۔ اس کو انگریزی میں " فری ورس" (آزاد نظم) کہتے ہیں ۔

آزاد نظم یورپ و امریکہ کی ایجاد ہے ۔ لیکن اس کا وجود ہماری زبانوں میں بھی ہے ۔ قرآن مجید لحن و آہنگ سے بھرا ہوا ہے ۔ گلستان کے بہت سے فقروں میں آہنگ موجود ہے ۔ آزاد نظم کے آہنگ کو انگریزی میں کیڈنس (Cadence) کہتے ہیں اس کے لیے عربی الفاظ تلحین و تجوید" ہیں۔ قرآن کا لحن یا تجوید مشہور ہے ۔ لیکن اس کو نظم کہنا ہمارے تصور شاعری کے بھی خلاف ہے اور قرآن مجید کے لیے بھی کسر شان ہے۔ بقولہ تعالی وما ینبغی لہ " قرآن کا اعجاز یہی ہے کہ نظم میں نثر ہے ۔ لیکن عرب کے شاعروں نے اس نثر کو سن کر اپنی نظمیں پھاڑ کر پھینک دی تھیں اور قرآن مجید کا تو ذکر ہی کیا ہے کوئی شاعر گلستان کے فقروں کو نظم کردے تو ہم نثر کے بدلے میں اس نظم کو لینے کے لیے تیار نہیں ۔ یہی بات اردو آزاد نظم کے حمایتی بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ صرف حمایت اور خالی کہنا ہی کہنا ہوگا۔ کاش وہ واقعی ایسا کہنے کا حق رکھتے ۔

پھر پرانے خیال کے لوگوں میں کم سے کم ہیں تو ان کی آزاد نظم کو آنکھوں سے لگاتا اس لیے کہ میرے نزدیک نثر میں بھی شاعری ہوسکتی ہے - لیکن میری رائے میں شاعری مضمون اور بیان دونوں کے اعجاز کا نام ہے یا واضح تر یوں سمجھئے کہ جو خیال ، جذبہ یا تجربہ ہو ، شاعر کا ذاتی احساس اور اس کی اپنی دریافت ہو - احساس میں شدت اور دریافت میں جدت ہو - وہ بات کہی جو دوسروں نے نہ کہی ہو اور اس طرح کہی کہ اس سے بہتر نہ کہی جاسکے - لیکن سننے والا جانے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا- یعنی یہ محسوس کرے کہ یہ بات بلاشبہ اسی طرح کہنے کی تھی اور اس پر متحیر ہو کہ یہ نکتہ شاعر نے کہاں سے پیدا کیا اور یہ پیرایۂ بیان کس طرح ذہن میں آیا- خلاصہ یہ کہ سن کر روح وجد میں آجائے اور دماغ ادبی مسرت سے سرشار ہوجائے -

لیکن انقلابی شاعروں کی آزاد نظم کیا پابند نظم میں بھی شاعری کی یہ روح اور نظم کے یہ اجزاء بہت کم ملتے ہیں- با وزن و باقافیہ نظم کے تو میری نظر میں اور عبارت بھی ہیں - ادبیات میں اس کے لیے بہت گنجائش ہے - لیکن آزاد نظم جس میں اور کچھ نہیں ہے اگر اس میں یہ بھی نہ ہو تو پھر ادب میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں - شاعری کا تعلق معنی و مفہوم تخیل و تجربہ، بیان و اسلوب سے جہاں تک ہے نثر میں بھی ممکن ہے - لیکن دنیا کی ہر زبان میں شاعری کا وجود ہے - نثر میں شاعری کہیں کافی نہیں سمجھی جاتی تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی مابہ الامتیاز ہے اور وہ بجز وزن لحن اور لے کے کچھ نہیں - اس لیے وزن نظم کے لیے پہلی شرط ہے - یہ بحث ہی فضول ہے کہ لوازم شعر و نظم میں وزن کا کیا درجہ ہے - پہلا درجہ ہے سب سے پہلا -

اب وزن اور لحن کا یہ حال ہے کہ نظم اس کی ساخت کے تابع ہے اور اس کی پسندیدگی اہل زبان کی طبیعت اور عادت پر منحصر ہے - انگریزی گانا گایا جاتا ہے تو

یہ معلوم ہوتا ہے کہ بے سری چیخ رہے ہیں۔ حالاں کہ انگریز اسی کو سن کر جھوم جھوم جاتے ہیں۔ ہم نے بعض عربی بحریں مسترد کردی ہیں اس لیے کہ ان سے ہمارا ذوق نغمہ پورا نہیں ہوتا۔ تو اب اردو میں آزاد نظم کو گوارا کرنے کے لیے ہمارے مذاق اور طبیعت میں تغیر ہونا چاہیے۔ یہ جب تک نہ ہو ہمیں اس آزادی سے معاف رکھا جائے۔

اسیری ز پرواز گل زار بہتر بکنج قفس ، بال و پر می فروشم

آزاد نظم کی بے وزنی اور پریشان وزنی کا اندازہ ان چند نمونوں سے ہوسکتا ہے۔

۱۔ میراجی اپنی نظم (ترغیب) میں لکھتے ہیں :

رسیلے جرائم کی خوش بو	فعولن فعولن فعولن
مرے ذہن میں آرہی ہے	فعولن فعولن فعولن
مجھے حد ادراک سے دور لے جارہی ہے	فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن
جوانی کا خون ہے	فعولن فعولن

قوانین اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آرہے ہیں

فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن

اس وزن کا ایک مصرع چار فعولن سے بنتا ہے - لیکن اس نظم میں کہیں یہی وزن کا ۱/۲ ہے کہیں ۳/۴ کہیں ۱ ۱/۴ اور کہیں ۱ ۳/۴ لیکن بعض مصرعے پورے بھی ہیں جو میں نے نہیں لکھے - تاہم اس میں یہ خصوصیت ہے کہ ایک ہی وزن کے رکن سے مرکب ہونے کے سبب سے تمام نظم میں وزن ٹوٹتا نہیں اور لے منتشر نہیں ہوتی - اسی وزن کی ایک نظم میں ایک شاعر نے نہایت طویل مصرعے مرتب کیے ہیں۔

۲۔ وشوا متر عادل کی نظم (راہرو) کے بعض متفرق مصرعے دیکھیے :

بکھری ہوئی چاندنی اپنے خاموش ہونٹوں سے سرگوشیاں کر رہی ہے ۸ بار فعولن

وہ سرگوشیاں جن کو سنتا ہوں لیکن یہ ظاہر کیے جارہا ہوں   ۷ بار فعولن

نہیں ان کو میں نے سنا ہی نہیں ہے   ۴ بار فعولن

میں پیچھے پھسلتے ہوئے راستے پر کہانی کے ذرے کی رنگین قبریں بنی جارہی ہیں   ۱۰ بار فعولن

========

لیکن اگر وزن مختلف ارکان سے مرکب ہو تو یہ ہم آہنگی قائم نہیں رہ سکتی۔

دیکھئے :

۴۔ میراجی کی نظم (اونچا مکان) کے بعض مصرعے ہیں :

(۱) بےشمار آنکھیں کو چہرے پہ لگائے ہوئے استادہ ہے اک نقش عجیب
فاعلاتن فعلاتن فعلن تن معلاتن فعلات

(۲) اے تمدن کے نقیب   فعلاتن فعلات

(۳) تیری صورت ہے مہیب   فاعلاتن فعلات

(۴) ذہن انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا   فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

(۵) ذہن کے لہروں میں کئی گیت سنائی مجھے دیتے ہیں مگر
فاعلاتن فعلاتن فعلن تن فعلن

(۶) ان میں اک جوش ہے بیدار کا فریاد کا اک عکس دراز
فاعلاتن فعلاتن فعلن تن فعلات

(۷) اور الفاظ میں افسانے ہیں بے خوابی کے   فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

========

یہ سات مصرعے نظم کے آغاز کے ہیں ، اور مسلسل ہیں، منطق نہیں ۔ ان میں

سے چوتھا اور ساتواں مصرع وزنی متعارف میں پورا ہے ۔ پہلے پانچویں اور چھٹے میں

اضافہ کیا گیا ہے ۔ لیکن تیسری جگہ وزن کے آخری حصے سے بڑھایا ہے ۔ یہ بھی اک

اصول کی بات ہے ۔ دوسرے مصرعوں یا ٹکڑوں میں وزن کے پہلے حصے سے بچی اور ادھوری

ارکان لیے گئے ہیں۔ اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن ان تمام و ناتمام مصرعوں کو مسلسل پڑھنے سے لے اور لحن کی وہ یکسانی نہیں رہتی جو پہلے دو نمونوں میں (فعولن) کی تکرار کے سبب سے تھی۔ وزن اگر مختلف ارکان سے مرکب ہو تو سب مصرعے بالکل برابر ہونے چاہئیں - وزن مقرر کو کتناہی بڑھایا جائے لیکن اضافہ تمام مصرعوں میں یکساں متوازن اور متوازی ہونا چاہیے -

یہ اشارہ غالباً بے محل نہ ہوگا کہ وزن کو حد مقرر سے بڑھانا جدید شاعروں کی ایجاد نہیں ہے - اگلے شاعروں نے بھی بڑے لمبے لمبے مصرعے مرتب کیے ہیں اور قصیدے کے قصیدے لکھ دئیے ہیں۔ لیکن اپنے عروض اور شاعری کے اصول کو قائم رکھا ہے - ایک صاحب نے تو اس قدر لے بڑھائی تھی کہ ان کے ایک شعر کے دو مصرعے ٹائپ کے ایک صفحے میں نہیں سما سکتے تھے۔ میں نے تیس سال ہوئے جس پرچے میں دیکھے تھے وہ چھوٹی تقطیع کا تھا اور اس کے تین صفحوں میں دو مصرع چھپے تھے - یہ عروض کی پہلوانی ہے - شاعری نہیں لیکن ایک حد کے اندر وزن کو حد سے بڑھایا جاسکتا ہے - جیسا مولوی غلام امام شہید نے کیا ہے - انھوں نے فارسی نثر و اردو کے دو قصیدے نعت شریف میں لکھے ہیں۔ ان میں بھی اوپر کے تیسرے نمونے کا وزن بڑھایا گیا ہے - شہید کے اردو قصیدے کا مطلع یہ ہے :

یہ سحر کیسی ہے پر نور کہ جمہور ہیں مسرور ہراک باغ میں معمور ہے سامان بہار

گل جھکتا ہے چمن زور مہکتا ہے تھکتا ہے ہراک شاخ تروتازہ سے فیضان بہار

اور فارسی قصیدے کا مطلع ہے :

این شہید است جگر تفتہ و پژمردہ و افسردہ و غم دیدہ و شوریدہ و آشفتہ دماغ

کہ بہ دیوانگی و وحشت و سوداو جنون و فہم و احوال زبون است غزل خوان بہار

اس کا وزن یہ ہے :

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات

یہ وزن حد سے بڑھ کر بھی حد کے اندر اس لیے ہے کہ چار رکنوں سے ایک مصرع کا مرتب ہونا معمول و متعارف ہے - شہید نے دو مصرعوں کا ایک مصرع بنادیا ہے- اسی کو حد سے باہر اس شاعر نے کردیا تھا جس نے فعلاتن کی تکرار دو سو مرتبہ کردی تھی-

بہرحال ان نمونوں سے آزاد نظم کے آہنگ کا اندازہ ہوگیا ہے اس آہنگ کا قائم رکھنا ذرا مشق اور توجہ کا کام ہے - میرا جی اور دوسرے شاعروں سے کہیں کہیں یہ لے ٹوٹ بھی گئی ہے لیکن اس موضوع پر زیادہ رد و قدح کرنا مقصود نہیں ہے - میں بذات خود نظم کی اس آزادی کو بھی گوارا کرسکتا ہوں بشرطیکہ شاعری کے اصلی محاسن موجود ہوں- لیکن تلخ صداقت یہ ہے کہ کسی انقلابی شاعر کا پیام تو کیا متعین ہوتا، کوئی ایک مقصد و مسلک بھی مقرر نہیں- یہ لوگ اپنے آپ کو سیاسی رہنما بھی کہتے ہیں- سماج کا مصلح بھی، مفکر و مدبر بھی، شاعر و مصور بھی - لیکن اکثرا ایسا ہوتا ہے کہ جب یہ حضرات کوئی سیاسی یا سماجی ، جذباتی یا خیالی نظم کہتے ہیں تو یہ بات بھول جاتے ہیں کہ وہ شاعر بھی ہیں اور شاعری و موزونیت میں بڑا فرق ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظم میں سیاست ، اصلاح انقلاب جو کچھ ہو شاعری نہیں ہوتی - میرا یہ تبصرہ آزاد و پابند دونوں قسم کی نظموں کو شامل ہے جو گزشتہ پندرہ بیس سال میں لکھی گئی ہیں بعض نمونے دیکھیے :

ن - م - راشد مشہور انقلابی آزاد نگار شاعر ہیں - اردو میں آزاد نظم کے بانی اور شاعر اول ہیں ان کی ایک عجیب نظم ملاحظہ ہو جس میں وطن پرستی اور ہوس پرستی کا تضاد یکجا کیا گیا ہے -

انتقام

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں،
اک شبستاں یاد ہے

اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج!
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
ان بتوں کی بے حسی پر خشمگیں
اجلی اجلی اونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار

جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ!
اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم!
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

اس میں شاعری کیا ہے؟ اچھوتا پن کیا ہے؟ کیا یہ وطن پرستی کا صحیح جذبہ ہے؟ کیا اربابِ وطن کو اسی طرح انتقام لینے کی ہدایت مقصود ہے؟

راشد صاحب اس نظم کو اپنا شاہکار نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے میں ان کی بہترین نظم (دو بجے کے قریب) ہے لیکن بہت طویل ہے، اس لیے درج نہیں کرتا۔ مجھے اس میں اتنی بھی ندرت اور جدتِ نظر نہیں آتی جتنی انتقام میں ہے، صرف ان کا جدید ہوا جدید رجحانات کے نمونے کے طور پر نقل کرتا ہوں۔ ن ۔ م ۔ راشد دریچے کے قریب والی نظم میں کسی کو "میری جان" کہہ کر اپنے پاس دریچے کے قریب بلاتے ہیں۔ اور شہر کے مختلف مناظر دکھاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

اسی مینار کے سایہ تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں

ایک عفریت اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

خدا کی بے کاری اور بے سودی کی تبلیغ بھی انقلابی شاعری کا ایک عنصر ہے۔

میں راشد صاحب کی ایک اور نظم کو ان کی اکثر نظموں سے بہتر سمجھتا ہوں - یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام (ماورا) کی آخری نظموں میں ہے -

اجنبی عورت
++++++++

ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاش اک دیوار ظلم
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ عمارات قدیم
یہ خیاباں ، یہ چمن ، یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دست غارت گر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاش اک " دیوار رنگ "
میرے ان کے درمیاں ماثل نہ ہو
یہ سیہ پیکر برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوب صورت عورتوں کا زہر خند
یہ گزرگاہوں پہ دیوانہ ساجواں
جس کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل بے باک مزدوروں کا سیلاب عظیم
ارض مشرق ! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں

==========

اس نظم کا مرکز خیال بہت خوب صورت ہے ، ایک مغربی عورت کا ایشیا کے حال زار پر افسوس ، دست غارت گر کی شکایت ، دیوار ظلم و رنگ کے حائل ہونے پر تاسف بڑی صحت اور موزونیت کے ساتھ لکھا گیا ہے - آخری چار مصرعے نظم کی جان ہیں اور نہایت موثر ہیں - مغرب و مشرق کا مقابلہ نہایت حسرت آمیز الفاظ میں کیا گیا ہے اور بہت دل کش و بصیرت افروز ہے - لیکن میرے نزدیک اس میں نظم کا کوئی لطف نہیں یہ مضمون

کامل مترنم اور مقفا مصرعوں میں لکھا جاسکتا تھا اور سامعین پر زیادہ اثر کرتا ۔

دوسرے مشہور و مقبول انقلابی شاعر میراجی ہیں۔ لیکن حسن کا " نظریۂ افادیت " جو یورپ کا مفروضہ اور ہمارے شاعروں کا مختار و معمول ہے اگر یہی ہے جو ان کی نظموں میں میں ہے ، جیون۔ م ۔ راشد کی مندرجہ بالا نظم (انتقام) میں ہے ، جو میراجی کی اپنی منتخبہ بہترین نظم (اونچا مکان) میں ہے ۔ تو صرف ہندوستانیت نہیں ، انسانیت کا خاتمہ ہے اور بہیمیت و سبعیّت کی حکومت ۔ میراجی کا شاہکار (اونچا مکان) پڑھنے سمجھنے اور غور کرنے کی چیز ہے ۔ لیکن اس قدر طویل ہے کہ سب کا نقل کرنا طول امل ہے۔ میراجی ایک اونچے مکان میں اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لیے پہنچتے ہیں اور اونچے مکان سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں :

پھر اعصاب کی تصویر کا اک نقش عجیب

میں یہ سمجھتا تھا ترے جسم کا انبار ہے بستر پہ بچھا   جس کی صورت سے کراہت آئے

اور اک نازنیں لیٹی ہے وہاں تنہائی   اور وہ بن ترا مدّ مقابل پل میں

ایک پھیکی سی تھکن بن کے گھس جاتی ہے   ذہن انسانی کا طوفان کھڑا ہوجائے

ذہن میں اس کے مگر وہ بے تاب   اور وہ نازنیں بے ساختہ بے لاگ ارادے کے بغیر

منتظر اس کی ہے پردہ لرزے   ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے

پھر ہیں ایک ڈھلکتا ہوا بادل بن جائے   شب کے بے روح تماشائی کو ۔

اور در آئے اک ان دیکھی انوکھی صورت   بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ

کچھ غرض اس کو نہیں ہے اس سے   منحصر لغزش چشم در سے

دل کو بھاتی ہے نہیں بھاتی ہے   ریگ کے قصر کی مانند سبکسار کی

آنے والے کی ادا ـــــــ   پھر اعصاب کی تصویر کا اک نقش عجیب

اس کا ہے ایک ہی مقصود وہ استادہ کی   ایک گرتی ہوئی دیوار کے مانند لچک کھا جائے

یہ نظم تشریح و تنقید سے بالاتر ہے - اس کے مضمون و موضوع سے ناظرین لطف اندوز ہوں اور زندگی کی اس عکاسی میں انقلاب و افادیت کے حسن و جمال کا مشاہدہ کریں - مجھے تو صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس نظم کو شاعری سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں نثر کی شاعری کا بھی وجود نہیں۔

اسی سلسلے میں ایک اور نوجوان کے انقلاب پرور خیالات دیکھئے - شریف کنجاہی لکھتے ہیں کہ اپنی نظموں میں سے مجھے " پسپائی" سب سے زیادہ پسند ہے - مرد کی خواہش کے سامنے عورت کی " پسپائی " یا بقول میراجی ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنا ملاحظہ ہو۔

پسپائی

+++++++

کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں امیدوں کو؟ آپ اس ہستی کو تاریک بنا رکھا ہے

رہنے دو کہ اتنا نہ احسان کرو اس کو تاریک ہی تم رہنے دو

میں تو پردیسی ہوں اور آئی ہوں دو دن کے لیے دل کی دنیا میں اجالا نہ کرو

کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی میری امیدوں کو مدہوش پڑا رہنے دو

اور پھر آنے کا امکان نہیں تم نہیں مانو گے ؟

روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں تم دیکھتے ہی جاؤ گے ؟

کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں امیدوں کو؟ اچھا دیکھو!

کیوں جگاتے ہو مرے دل کے چراغ ؟ لو جلاؤ مرے سینے کے چراغ دل کی ہستی میں اجالا کر دو

میں نے یہ سارے دیے خود ہی بجھا رکھے ہیں پھر مرے جینے کا — یا مرنے کا — سامان کر دو

==========

شاعری کے اعتبار سے یہ بھی بالکل سپاٹ ہے - پہلی نظم سے زیادہ بے لطف —

اور اس میں آزاد نظم کا آہنگ بھی یکساں نہیں (تم نہیں مانو گے) وزن کا ابتدائی حصہ ہے

(تم دیکھتے ہی جاؤ گے) وزن کا آخری حصہ ہے ۔ اس کے بعد (اچھا دیکھو) بحر آخری حصہ ہے ۔

یہ عریانی یہ فحاشی قدیم شاعری میں بہت زیادہ، بہت کھلی ہوئی ہے ۔ اور ایسی ہی قابل اعتراض ہے جیسی یہ نظمیں لیکن وہاں وزن کا ترنم ہے ۔ قافیہ کی دل کشی ہے ۔ شاعرانہ تخیل ہے اسلوب کا اچھوتا پن ہے ۔ یہاں ان میں سے ایک بات بھی نہیں۔ صرف ہوس انگیزی اور محض لذت گناہ ہے ۔

میرے نزدیک " ادب برائے ادب " اور " ادب برائے زندگی " میں تضاد نہیں ہے ، ان کا اجتماع ممکن ہے ۔ ادب و شاعری، نثر و نظم اپنی ادبی و شعری تکنیک کا ایک معیار رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک درجہ یا ایک انداز و اسلوب اکمل اعلا اور بہترین ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر تصور میں نہیں آسکتا۔ یہ درجہ اور اسلوب ہمیشہ ایک اور یکساں رہتا ہے ۔ بدل نہیں سکتا۔ خیالات تجربے موضوعات نئے نئے ہوں بدلتے رہیں مگر ان کے اظہار کا بہترین طریقہ نہیں بدلتا۔ ایک کامل شاعر، فطری شاعر، پیغمبر شاعر، ہمیشہ وہی طریقہ پسند کرتا ہے ۔ یہ ادب برائے ادب اور شاعری برائے شاعری ہے ۔ اب اگر وہ تجربے اور موضوع زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہیں تو وہ شاعری برائے زندگی بھی ہوجائے گی اور برائے شاعری بھی رہے گی ۔ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جب ایک ہی طریقہ بہترین ہوگا تو ہر تجربہ و خیال ایک ہی طریقہ سے بیان کیا جاسکتا ہے ۔ اس لیے کہ دو تجربے کبھی ایک سے نہیں ہوتے ۔ نہ دو شخصوں کے دو تجربے نہ ایک شخص کے ایک ہی چیز کے متعلق دو بار کے تجربے احساس تخیل اور تجربے بھی ہر شخص کا الگ ہوتا ہے اور ہر آن کا علاحدہ ہوتا ہے ۔ اس لیے جتنے تجربے اتنے ہی ان کے بہترین اسلوب ، نہ تجربات کی حد نہ اسالیب کی انتہا ۔

البتہ یہاں ایک اور پہلو قابل غور ہے ۔ سر ڈینی سن راس نے ڈاکٹر اقبال کی

وفات پر جو اظہار خیال کیا تھا اس میں کہا تھا :

" شاعری اگر اعلا درجے کی ہو تو وہ بذات خود ایک مقصد بن جاتی ہے اور ناظرین پر اس کے عملی پیغام کا اثر کم ہوتا ہے ۔" یعنی شاعری برائے شاعری ہوجاتی ہے۔ برائے مقصد نہیں رہتی ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب اس مقصد اور پیغام میں جان نہ ہو ۔ ورنہ پیغام کی معنویت ، ضرورت اور قوت اثر کے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ بہرحال اس صورت میں " ادب برائے ادب " کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کا کوئی اور مقصد نہ ہو ۔ زندگی کے کسی شعبے سے متعلق نہ ہو ۔ کوئی مادی و غیر مادی طمع مقصود نہ ہو ۔ گویا شاعر فطرت و قدرت ، وقائع و حوادث ، تخیلات و جذبات سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ تاثر اس کی شاعرانہ فطرت کا تقاضا ہے ۔ بہت سے مفکر اور نقاد شاعر اور ادیب اس نظریے کے قائل ہیں اور یہ بھی شاعری کا ایک جدید رجحان ہے ۔ میں اس نظریے کو تسلیم کرتا ہوں ۔ لیکن اس نظریے پر بعض شاعروں کے عمل سے مجھے اختلاف ہے ۔

ایک قسم مبہم شاعری کی بھی انقلاب پسندوں نے شروع کردی ہے ۔ یعنی ساری نظم پڑھنے کے بعد یا تو کوئی مدعا و مقصود ہی ہاتھ نہیں آتا ۔ یا صرف مرکزی خیال اور اصل مضمون تو مل جاتا ہے لیکن خیالات کی کڑیاں مربوط نہیں ہوتیں کنایہ و ابہام میں مطلب ادا کیا جاتا ہے ۔ مثلاً ڈاکٹر دین محمد تاثیر کی اس نظم (رس بھرے ہونٹ) کو دیکھئے :

رس بھرے ہونٹ

پھول سے ہلکے

جیسے بلور کی صراحی میں

بادہ آتشیں نفس جھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغوانی قطرہ
شفق صبح سے درخشندہ

===XXX====

دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل ڈھلکے
رس بھری ویجنت بھی لرزتے ہیں
بن لرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راہی
پاؤں چھلنی نگاہ متزلزل
ولت! صحرائے بیکراں کہ جہاں
سنگ منزل تھا نہ آج نہ کل
دفعتاً دور - دور - آنکھ سے دور

شفق شام کی سیاہی میں
قلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک جھلک اٹھے
ایک دھوکا سراب صبح نور!
رس بھری ویجنت دیکھ کر تاثیر
رات دن کے تھکے ہوئے راہی
بن ترستے ہیں بن لرزتے ہیں!

اس نظم میں تشبیہہ، ترکیب، تلفظ کی خامی سے قطع نظر کرکے بھی پورا مضمون مبہم و غیر واضح ہے - نظم مہمل نہیں ہے شاعر کے تصور اور خیالات کی رفتار میں تسلسل پیدا کیا جاسکتا ہے - لیکن نمایاں نہیں ہے - " متزلزل" پنجابی تلفظ کے ساتھ نظم ہونا قابل اعتراض ہے اس کو بدلا جاسکتا تھا - " بادہ" کی صفت " آتشیں نفس" بے وجہ ہے " صبح شراب " کو " نفس آتشیں" کہہ سکتے ہیں - اس کے متعلق ابھی کچھ اور عرض کروں گا - پہلے ایک مبہم شاعری اور دیکھ لیجئے - پروفیسر فیض احمد فیض کی نظم (تنہائی " ہے :

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھادو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

یہ تنہائی کا تصور ہے - لیکن صاف و مسلسل نہیں اگرچہ ن - م - راشد اس نظم

کو حسین اور انتہا درجے کی اثر آفرین نظم قرار دیتے ہیں" خوابیدہ چراغ " کی ترکیب یہاں موزوں نہیں۔ " خاموش " کا مضمون ہوتا تو خوابیدہ درست ہوجاتا۔ " لڑکھڑانے " کے لیے غنودگی کی ضرورت تھی ۔ " بے خواب کواڑوں" کی ترکیب مجھے پسند آئی ۔ یعنی اس مکان کے کواڑ جس میں اب تک خواب کا گذر نہیں ہوا۔ یہ انتقال صفت موصوف اصلی سے اس کے کسی متعلق قریب کی طرف اردو فارسی میں نامانوس نہیں ہے لیکن انگریزی میں متعلق بعید کی طرف بھی انتقال صفت بہت عام ہے ۔ اور نہایت معنی خیز ہوجاتا ہے ۔ " بے خواب شخص " کی بجائے " بے خواب بستر " ، " بے خواب کمرہ " ، " بے خواب مکان" مستعمل ہیں " بے خواب کواڑوں" میں بعد ذرا زیادہ ہوجاتا ہے ۔ لیکن معنویت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

میراجی کی کسی نظم میں تنہائی کو " پھیکی سی ٹھنڈک" کہا گیا ہے ۔ یہ استعارہ اور تشبیہ دونوں دل کش ہیں ٹھنڈک میٹھی بھی ہوتی ہے پھیکی بھی ۔ تنہائی پھیکی ٹھنڈک ہے ۔ انتظار محبوب کو میٹھی ٹھنڈک کہہ سکتے ہیں ۔ پروفیسر فیض صاحب نے کسانوں کے افلاس اور خستہ حالی کے لیے اس شعر میں کیا خوب استعارہ کیا ہے :

یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے
غلہ پیدا کرکے بھی بھوکے رہتے ہیں تو ان کے لیے تو گویا بھوک ہی اگتی ہے

اس نوع کا اسلوب تخیل ، ترکیب بلاشبہ شعر و ادب میں قیمتی اضافے ہیں۔ ان کو سمجھ کر اختراع و استعمال کیا گیا تو سکۂ رائج بن جائیں گے ۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور اسلوب بھی نئی تخیل کی بدولت وجود میں آیا ہے ۔ یہ پیرایہ کہ غزل جدید میں پیدا کیا گیا ہے ۔ مثلاً اس شعر کو پڑھیے :

دم لے رہی تھیں حسن کی جب سحر کاریاں
ان وقفہ ہائے کفر کو ایماں بنادیا

اس کا مطلب سوچیے ۔ شاعر کیا کہتا ہے ؟ حسن کی سحرکاریوں کا دم لینا کیا؟

اور دم لینے کے لمحے وقفہ ہائے کفر کیوں؟ اور ان وقفوں کو ایمان بنا دینا کیا؟ سوچ لینے کے بعد خود شاعر کی مندرجہ ذیل تشریح پڑھیے :

" کفر و ایمان کے الفاظ کافی فرسودہ ہیں - حسن کائنات و حیات کا زندہ احساس کفر ہے - یعنی وہ لطیف رنگین نازک اور شدید دہریت جسے لوگوں نے (کم از کم میں نے) کفر کہا ہے - یونانی پیگنزم بھی کفر ہے - لیکن اس حسن کا عکس تاریخ انسانی کے بعض دوروں میں شعور انسانی کے آئینہ میں دکھائی نہ دیا - یہی وقفہ ہائے کفر ہیں - یعنی وہ وقفے ہیں جب حسن کی سحرکاریاں گویا دم لیتی ہیں - انہیں وقفوں میں آسمانی خدا کا محدود اور غلط تصور وحدت اور ایمان کے نام سے مرتب ہوا - میوانیت اور رہبانیت اور زہد خشک کا دور ایمان اور مذہب کے نام پر قائم رہا - جب حسن سحرکاری کا عکس تھراتا ہوا عکس پھر تاریخ کے آئینے میں پڑا تو ایک زندہ دہریت یعنی کفر کا نیا جنم شروع ہوا - دنیا میں ایک مرتبہ پھر فلسفۂ دہریت جگمگا اٹھا - اسی حقیقت کی طرف اس مختصر شعر میں اشارہ ہے -"

اب اس شعر کو پھر پڑھیے - کیسا بانکا شعر معلوم ہوتا ہے - لیکن کیا یہ بانکپن تشریح معلوم ہونے سے پہلے تک بھی ان الفاظ میں تھا؟ یہی مرے نزدیک ابہام ہے - اس شعر کے مفہوم پر مجھے تنقید کرنی نہیں ہے -

کفر ان کو عزیز اور ایمان ہمیں　　　　کل حزب بما لدیہم فرحون

یہ شعر پروفیسر فراق گورکھپوری کا ہے - مع تشریح رسالہ "زمانہ" کان پور میں شائع ہوا تھا - پروفیسر صاحب نے اپنی شاعری میں تنقید حیات کی کوشش کی ہے - اور حقائق حیات و کائنات سے متاثر ہوکر شعر لکھے ہیں - یہ فنی خوبی ، بہت دل چسپ اور نہایت قابل تحسین چیز ہے - لیکن یہ چیز اگر غزل کے ایک شعر میں ہو تو الفاظ کی دلالت واضح و صریح ہونی ضروری ہے - ورنہ شعر مکمل نہ رہے گا - دوسرے اسلوب بیان ہمیشہ شاعرانہ ہونا چاہیے - ہر واقعہ سادہ پیرایے میں بیان ہونے سے دل کش و موثر نہیں ہوتا - مثلاً فراق صاحب کا یہ شعر دیکھیے :

دیکھ رفتار انقلاب فراق   کتنی آہستہ اور کتنی تیز

اس بیان میں کوئی شعریت ، کوئی لطف کوئی تاثیر نہیں اور شاعر کی اس تشریح

کے بعد بھی شعر ویسا ہی بے مزہ رہتا ہے ۔ فراق صاحب توضیح فرماتے ہیں :

" مشہور عالم فرانسیسی شاعر رومان اولاں نے انقلاب فرانس کے متعلق ایک ڈراما لکھا ہے ۔ جس میں ایک جگہ یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ انقلاب فرانس ہونے کے چند لمحے پہلے تک جمہور کو وہم ہی نہیں آتا تھا کہ انقلاب ہونے والا ہے ۔ اس موقع پر اس ڈرامے میں ناقابل فراموش فقرہ آیا ہے کہ انقلاب ہونے والا ہوتا ہے تو انقلاب سے زیادہ کوئی چیز انہونی یا غیر متوقع نہیں معلوم ہوتی ۔ یہ شعر اسی جملے کے مطالعے کا اثر ہے ۔ دوسرے مصرع میں اس زبردست حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ کتنی آہستہ آہستہ اور کتنی تیز" کتنی غیر متوقع اور کتنی قریب ۔"

پہلا شعر شاعرانہ تخیل اور حسن بیان کی وجہ سے بہت خوب صورت ہوگیا تھا۔ اس شعر میں کوئی حسن نہیں اس لیے کہ فکر شاعر نے مشاطگی نہیں کی اور نفس مضمون میں کوئی تاثیر تھی ہی نہیں۔ یہ شعر فرد ہونے کی بجائے کسی نظم کا جزو ہوتا جس میں انقلاب کی آہستہ و تیز رفتاری دکھائی جاتی تو اس جگہ یہ شعر موزوں اور برمحل اور پر لطف ہوجاتا ۔ " (۱)

مولانا قادری کی نثری خصوصیات :

مولانا کی تحریر میں بڑی سلاست ، روانی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ مورخ

کے واسطے اسلوب کا انتخاب اور الفاظ کی ترجیح کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے ۔ موضوع خواہ

---

(۱)   حامد حسن قادری ، مولانا ؛ " انقلابی شاعری " ، " نگار " (ماہنامہ) ، لکھنؤ : جنوری ، فروری ، ۱۹۴۴ء ، ج ۴۵ ، ش ۱ و ۲ ، ص ۱۰۴-۸۵

ادب کی تاریخ ہو یا عام تاریخ افسانوی طرز سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے - اور افراط
و تفریط سے یا تو مورخ کی تحریر پائے اعتبار سے گرجاتی ہے یا خشک اور بے مزہ ثابت ہوتی
ہے - اول الذکر کی مثال مولانا محمد حسین آزاد کے ہاں بکثرت ہے - آزاد کا انداز بیان
اس درجے رنگین اور افسانوی ہے کہ تاریخ و تذکرے سے زیادہ اساطیر و صنمیات کے لیے موزوں ہے
ثانی الذکر کی مثال مولوی ذکاء اللہ کی تحریریں ہیں - بالکل خشک اور بےمزہ - مولانا قادری
کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ خواہ وہ ادب کی تاریخ لکھ رہے ہوں یا عروض و بلاغت کے حقائق
و دقائق بیان کرتے ہوں، نثر نگاری پر تبصرہ ہو یا شعر و شاعری پر تنقید، ہر جگہ ان کی
تحریر میں شگفتگی اور دل کشی ہے - نہ ایسی رنگینی ہے جو قاری کے ذہن کو اصل موضوع
سے ہٹادے نہ ایسی خشکی و یبوست ہے کہ تحریر کے چند صفحے پڑھنے محال ہوجائیں- مولانا
کی تحریروں کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شیریں چشمہ
ہے جو نرم روی کے ساتھ گل و گل زار و مرغ زار کے درمیان بہہ رہا ہے - اگر خس و
خاشاک اور سنگ و خشت سے بھی گذرتا ہے تو خوش گوار ترنم پیدا کردیتا ہے - مولانا کی
بڑی خصوصیت ان کا اعتدال ہے - اسی میں ان کی شخصیت کا مکمل عکس نمایاں ہے -

تشبیہہ و استعارہ کا استعمال مولانا کی نثر میں بھی موجود ہے مگر اس درجہ
نہیں کہ نثر کو نظم کی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت پیش آئے -

اصابت فکر، ورف نگاہ ، احاطۂ فن، کمال کی حد تک مولانا کی تحریروں سے ظاہر
ہوتا ہے -

مولانا نے عملی تنقید کے اصولوں کو اچھی طرح پرکھا اور برتا ہے - مغربی تنقید کے
صحت مند اجزاء کو اپنی تحریر میں اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ مشرقی انداز فکر و نظر کا

ہی حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا نے داستان تاریخ اردو میں پہلی مرتبہ ہر ادیب کی تحریروں کا تفصیلی جائزہ لیا ۔ اس کے ذاتی و ذہنی حالات کی اہمیت کو واضح کیا اور خاندان، تربیت ، وراثت ، ماحول اور افتاد طبع کے اثرات جو نفسیاتی طور پر غیر شعوری انداز میں مزاج و عادات پر مرتب ہوتے ہیں انہیں بیان کیا۔ ان کی تحریروں کا تجزیہ کیا اور ہر جزو کو تنقیدی نگاہ سے پرکھا اور پھر اس جزو کو کل کے ایک حصے کے طور پر رکھ کر اس کا تمام تر اور مجموعی تاثر بیان کیا اور دوسرے ادیبوں کے نمونوں سے اس کی وضاحت کی ۔

داخلی جذبات ، ذاتی تجربات کس طرح ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اور پھر ادیب و شاعر کے مزاج اور خصلت و طبیعت کی تشکیل کرکے اس کی تخلیقات کے ذریعے ماحول و معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اس کو مولانا نے بہتر سے بہتر طور پر شعر و ادب کی تنقیدوں میں بیان کیا ہے ۔ مولانا نے شاعر کے رنگ پر جو بحث کی ہے اسے بعض مثالوں کے ذریعے سے اچھی طرح واضح کردیا ہے ۔

مولانا کی تحریریں ٹھوس اور پرمغز ہوتی ہیں۔ اپنے علم و فضل کی نمائش اور فن و کمال کی نمائش کے لیے وہ ثقیل و دقیق الفاظ کا ڈھیر نہیں لگاتے نہ دوسروں کو مرعوب کرنے کی خاطر مغربی نقادوں اور ادیبوں کے نام کی فہرست گناتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں فرانس ، جرمنی اور انگلینڈ کے مفکرین کے نظریات اور ان کی تحریکوں کا اشارہ بھی نہیں ملتا لیکن وہ اپنے عہد کی بیش تر تحریکوں سے واقف ہیں اسی لیے ان کا ذہنی افق اپنے ہم عصرو ہم عصر نقادان فن سے وسیع تر ہے لیکن ان تحریکات کا انہوں نے سمجھنے اور پرکھنے کی خاطر بغور مطالعہ کیا اگر کہیں ان کو کوئی ایسا عنصر یا جزو دکھائی دیا جو ان کے

مشرقی انداز فکر اور مشرقی ادبیات سے مطابقت رکھتا ہو یا کم سے کم اس میدان میں مفید ہی ثابت ہوسکے تو اس کو انھوں نے ضرور اپنایا ہے - اور یہ ان کی تحریر کی بڑی خوبی ہے - کہ بظاہر سراسر مشرقی انداز میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً اور معناً وہ اپنے دور کی وقیع تحریکات اور اپنے عصر کے رجحانات سے خالی نہیں-

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اردو تنقید میں ایک ایسے مقام کے حامل ہیں جس کو ابھی تک صحیح طور پر نہ پہچانا گیا ہے اور نہ شایان شان اس کا ذکر کیا گیا ہے - اس بات کی نشان دہی اردو کے مایۂ ناز ادیب و نقاد اکثر اپنی تحریروں اور تقاریر میں کرچکے ہیں-

تمت بعون الملک الوہاب

فہرست کتب و جرائد حوالہ و استفادہ

ا- کتب:

۱- احسن فاروقی، ڈاکٹر،
"فانی اور ان کی شاعری"، کراچی: جاوید پریس، ۱۹۶۳ع

۲- احسن مارہروی، مولانا،
"تاریخ نثر اردو"، علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی پریس، ۱۹۳۰ع

۳- احسن مارہروی، مولانا،
"نمونۂ منثورات"، علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی پریس، س ن

۴- اختر انصاری دھلوی، پروفیسر،
"حالی اور نیا تنقیدی شعور"، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ع

۴- (مترجمہ انجمن ترقی اردو ہند)،
"خطبات گارسین دتاسی"، اورنگ آباد (دکن): انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۳۵ع، حصہ اول

۵- امین زبیری، محمد (و) یوسف قیصر، سید محمد (مرتبین)،
"خطوط شبلی بنام عطیہ فیضی، زہرا بیگم صاحبہ فیضی"، آگرہ: شمس مشین پریس، س ن

۶- انشا، سید انشا اللہ خان،
"دریائے لطافت"،

۷- آمنہ صدیقی،
"افکار عبدالحق"، کراچی: انجمن پریس، ۱۹۶۲ع

۸- ثاقب اکبر آبادی، (و) احسن اللہ خان، پروفیسر (مرتبین)،
"مکتوبات امیر مینائی"،

۹- حامد حسن قادری، مولانا،
"ابراھام لنکن"، کراچی: انجمن پریس، ۱۹۵۷ع

۱۰- حامد حسن قادری، مولانا، (مرتب)،
"انتخاب دیوان مومن"، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۵۹ع

-۱۱ حامد حسن قادری، مولانا،

"ایرانی افسانے"، آگرہ :آگرہ اخبار پریس، ۱۹۳۳ء

-۱۲ "آثارالتواریخ "(مخطوطہ) مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری، پسر مولانا حامد حسن قادری، حال ساکن لندن یونی ورسٹی، لندن، برطانیہ۔

۱۳ "باغ باں"، (ترجمہ منظومات رابندر ناتھ ٹیگور) ، کلکتہ :میکملن اینڈ کمپنی، ۱۹۲۳ء

-۱۴ "پھولوں کی ڈالی"، کراچی :سپر آرٹ پریس ، ۱۹٦۸ء

-۱۵ "تاریخ مرثیہ گوئی"، کراچی :(ناشر) اردواکیڈمی سندھ، (پریس) سپر آرٹ پریس ، ۱۹٦۳ء

-۱٦ "تاریخ و تنقید"، آگرہ : آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۳۹ء

-۱۷ "تاریخ و تنقید"، کراچی :ٹائمز پریس ۱۹٦٦ء (دوسرا ایڈیشن)

-۱۸ "جامع التواریخ " (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری

-۱۹ "جواہر امثال"(قطعات) ، (غیر مطبوعہ) ، مملوکہ جناب ماجد حسن فریدی پسر مولانا حامدحسن قادری، حال ساکن کراچی

-۲۰ "داستان تاریخ اردو"، آگرہ : عزیزی پریس ۱۹۵۷ء

"داستان تاریخ اردو"، کراچی :ایجوکیشنل پریس ، (ناشر) اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹٦٦ء

-۲۱ "دفتر تاریخ "(غیر مطبوعہ) ، مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری

-۲۲ "شور محشر "، آگرہ : آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۵۱ء

-۲۳ "صبح و صباحہ" ، آگرہ :(ناشر) لکشمی نرائن اگر وال، آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۳۲ء

-۲۴ "کمال داغ "، آگرہ :آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۵۹ء

-۲۵ "مراۃ سخن " (دیوان غزلیات) ، (مخطوطہ) مملوکہ ڈاکٹر خالد حسن قادری پسر مولانا حامد حسن قادری -

-۲٦ "نظم روشن، یعنی قصہ قاضی جی پور"، رام پور : پریس و سن ندارد

-۲۷ "نقد و نظر"، آگرہ :آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۳۲ء

۲۸- زور، ڈاکٹر محی الدین قادری،

" روح تنقید"، لاھور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۳ء ، (چھٹا ایڈیشن)

۲۹- ساحر سھسوانی،

" ملھم تاریخ "، مراد آباد (یوپی ، بھارت) :دارالعلوم ، ۱۹۱۱ء

۳۰- سرور، پروفیسر آل احمد ، " تنقید کیا ھے ؟"، دھلی :راجانی پریس ، ۱۹۳۷ء

۳۱- شبلی نعمانی، علامہ ،

" شعرالعجم "(جلد چھارم) ، اعظم گڑھ :ندوۃ المصنفین، س ن

۳۲- شمس الرحمن (مرتب) ،

" اردو خطوط " ، دھلی :آزاد پریس، ۱۹۳۷ء

۳۳- صبا متھراوی ،

" ترویج فن تاریخ "، کراچی :مکتبہ اردو، ٹک ، ۱۹۶۰ء

۳۴- طاھر فاروقی، ڈاکٹر مولوی محمد ،

" بزم اقبال " آگرہ :آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۳۳ء

۳۵- مشاھیر بچھرایوں"،(مخطوطہ) ، مملوکہ مولف -

۳۶- عبادت بریلوی، ڈاکٹر ،

" اردو تنقید کا ارتقا"، کراچی :انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ۱۹۶۱ء

۳۷- عبدالشکور،

" اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ "، آگرہ :عزیزی پریس ، ۱۹۵۱ء

۳۸- عبدالغنی ، پروفیسر محمد ،

" تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطین مغلیہ "(جلد سوم) ،

مقام و سن اشاعت ندارد

۳۹- عسکری، مرزا محمد (مترجم) ،

" تاریخ ادب اردو" از رام بابو سکسینہ ، لاھور :منظور پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۷ء

۴۰- غلام عباس (مرتب) ،

" انتخاب بچول"، مقام و سن اشاعت ندارد

۴۱- غلام مصطفی خاں، ڈاکٹر ،

" حالی کا ذھنی ارتقا"، لاھور :مکتبہ کارواں، ۱۹۵۶ء

۴۲- کشفی، ڈاکٹر سید ابوالخیر،
" ہماری عہد کا ادب و ادیب "، کراچی: جامعہ پریس ، ۱۹۷۱ء

۴۳- کلیم الدین احمد ، پروفیسر،
" اردو تنقید پر ایک نظر"، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس ، ۱۹۶۵ء

۴۴- ل - احمد اکبر آبادی،
" ادبی تاثرات "، کلکتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) ، ۱۹۴۳ء

۴۵- مجنوں گورکھپوری ،
" ادب اور زندگی "، کراچی: مشہور آفسٹ پریس ، ۱۹۶۹ء

۴۶- محمود الرحمن ،
" بچوں کا ادب "، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، س ن

۴۷- محمود خاں شیرانی ، حافظ ،
" پنجاب میں اردو"، لاہور: انشا پریس ، س ن

۴۸- مخمور اکبر آبادی،
" صحیفہ اردو"، آگرہ: گیا پرشاد اینڈ سنز ۱۹۳۳ء

۴۹- مسعود حسن خاں، ڈاکٹر ،
" تاریخ زبان اردو" ، دھلی: آزاد کتاب گھر ، ۱۹۵۴ء

۵۰- مہر نقوی،
" انیس کی تاریخ گوئی "، (مخطوطہ)

۵۱- نصیرالدین ہاشمی،
" یورپ میں دکھنی مخطوطات "، حیدرآباد (دکن): شمس المطابع،
۱۹۳۲ء

۵۲- نظم طباطبائی لکھنوی، مولوی علی حیدر ،
" شرح دیوان غالب " ،

۵۳- یوسف حسین خاں، ڈاکٹر ،
" روح اقبال"، حیدرآباد (دکن): (ناشر) ادارہ اشاعت اردو،
(طابع) قدوائی مشین پریس ، ۱۹۴۴ء (طبع ثانی)

۵۴- ...،نامعلوم ،
" تاریخ اردو" ، آگرہ: آگرہ اخبار پریس ، ۱۹۴۳ء

۲- جرائد (روز نامہ، پندرہ روزہ ، ماہنامہ) :

۱- برہم گورکھپوری، حکیم (مالک و مدیر) ،

" فتنہ و عطر فتنہ "، گورکھپور: (بہ تفصیل ذیل) :

فروری، ۱۹۱۰ع ، ج ۲۵، ش ۵

فروری، ۱۹۱۰ع ، ج ۲۵، ش ۲

اپریل، ۱۹۱۰ع ، ج ۲۵، ش ۱۵

یکم فروری، ۱۹۱۱ع ، ج ۲۲، ش ۵

۲- حامد حسن قادری، مولانا ، (مالک و مدیر) ،

" اشہار سعید"، کان پور : ۱۵ مارچ ، ۱۹۱۸ع

۳- حامد حسن قادری، مولانا (مدیر) ،

" شفق "، آگرہ : ۱۹۳۹ع ، ج ۳، ش ۱۱(سال نامہ میگزین)

۴- حقی، شان الحق (مدیر) ،

" اردو نامہ " (سہ ماہی) ، کراچی : ترقی اردو بورڈ ، جنوری تا مارچ ، ۱۹۲۵ع ، شمارہ ۱۹

۵- خلیل الرحمن ، میر (مالک وایڈیٹر ان چیف) ،

" جنگ " (روز نامہ) ، کراچی: ۵ جون، ۱۹۲۵ع

۶- " جنگ " (روز نامہ) ، کراچی: ۲۳ جون، ۱۹۲۵ع

۷- دل گیر اکبر آبادی، شاہ نظام الدین (مدیر) ،

" نقاد" (ماہنامہ) ، آگرہ :(میوہ کٹرہ) ، مئی، ۱۹۱۹ع

۸- سیماب اکبر آبادی(مدیر) ،

" شاعر " (ماہنامہ) ، آگرہ : ستمبر، ۱۹۳۲ع

۹- صابری، فضل حسین (مدیر) ،

" دبدبہ سکندری"، رام پور : ۱۹۰۳ع

۱۰- صلاح الدین ، مولانا(مدیر) ،

" کتابی دنیا"، لاہور : جون ، ۱۹۲۳ع

۱۱- طفیل محمد(مدیر و مالک) ،

" نقوش " (سہ ماہی) ، لاہور: جنوری، ۱۹۵۵ع، شمارہ جات ۴۸-۴۷ (شخصیات نمبر)

۱۱الف- " نقوش "(سہ ماہی) ، جنوری، ۱۹۷۲ع ، (سال نامہ)

جرائد (جاری) :
==============

۱۲- عبدالحق ، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی ، (مدیر) ،

" اردو" (سہ ماہی) ، دھلی : جولائی ، ۱۹۳۵ء

۱۳- عبدالقادر ، سر شیخ (و) اکرام ، شیخ محمد (مدیران) ،

" مخزن" (ماھنامہ) ، لاھور : ستمبر ، ۱۹۰۸ء

۱۴- فرمان فتح پوری ، ڈاکٹر (مدیر)

" نگار" ، کراچی : ۱۹۶۷ء (سال نامہ) ، (اصناف ادب نمبر)

۱۵- ماجد حسن قادری (و) سرور اکبر آبادی (مدیران) ،

" شفق " کراچی : جون ، ۱۹۷۳ء ، (قادری نمبر)

۱۶- بابائے اردو (نگران) ، (و) مشفق خواجہ (مدیر) ،

" قومی زبان" (پندرہ روزہ) ، کراچی : یکم اکتوبر ، ۱۹۵۸ء ، ج ۱۳ ، ش ۷

۱۷- نگم ، پنڈت دیا نرائن ، (مدیر) ،

" زمانہ " (ماھنامہ) ، لاھور : مارچ ، ۱۹۱۹ء

۱۸- نیاز فتح پوری ، (مدیر و مالک) ،

" نگار " (ماھنامہ) ، کراچی : ۱۹۶۳ء ، (خاص نمبر)

۱۹- " نگار" (ماھنامہ) ، لکھنو : ستمبر ، ۱۹۲۵ء

۲۰- " نگار" (ماھنامہ) ، لکھنو : جون ، ۱۹۲۷ء

۲۱- " نگار" (ماھنامہ) ، لکھنو : جنوری- فروری ، ۱۹۳۳ء ، جلد ۲۵ ، شمارہ جات ۲-۱

===

" دلوی" (۵)/

۲۱-۵-۱۹۷۸ء

فہرست تصنیفات مولانا حامد حسن قادری

مطبوعہ تصانیف

اخلاقیات :

۱- رفیق تنہائی ،
۲- گلدستۂ اخلاق

افسانوی ادب :

۳- ایرانی افسانے،
۴- صید و صیاد ،

بچوں کا ادب :

۵- پھولوں کی ڈالی،
۶- ترانۂ حمد ،
۷- جادو نگری ،
۸- حسن بچپنی ،
۹- ستارۂ حمد
۱۰- کاغذ کے کھلونے ،
۱۱- گدڑی کا لال ،
۱۲- گم شدہ طالب علم ،
۱۳- ہمّت کا پھل ،

تحقیق و تنقید :

۱۴- انتخاب مومن،
۱۵- تاریخ و تنقید ،
۱۶- تاریخ مرثیہ گوئی ،
۱۷- داستان تاریخ اردو،
۱۸- شاہ کار انیس ،
۱۹- کمال داغ ،
۲۰- نقد و نظر ،

درسی کتب :

۴۱- اختر اردو ،
۲۲- انتخاب مراثی انیس و دبیر
۲۳- بی اے ، پرشین کورس ،
۲۳- پیکر اردو،
۲۵- جمال اردو،
۲۶- جوہر اردو،
۲۷- چمنستان ادب، ،
۲۸- چمنستان اردو،
۲۹- حرف نو ،
۳۰- داستان رستم و سہراب ،
۳۱- دامن گل چیں،
۳۲- معیار نظم ،
۳۳- گوہر اردو،
۳۴- مطالب سیرت و تبصرۂ مصنفان عجم و عرب
۳۵- مظہر اردو،
۳۶- نقش تازہ (نظم و نثر)
۳۷- نہال اردو،
۳۸- ہلال اردو ،
۳۹- Selected English Pieces for Urdu Translation.

تراجم :

۴۰- الکحل اور زندگی ،
۴۱- باغ بان ،

(بسلسلہ مطبوعہ تصانیف مولانا قادری)

تراجم (جاری):

۳۲- فطرت اطفال ،

سیر و سوانح :

۳۳- ابراہام لنکن ،

۳۴- حسنین ،

مذہب :

۳۵- مجمع الکرامات ،

نظم :

۳۶- قصیدۂ مختار ،

۳۷- مرثیہ شور محشر -

غیر مطبوعہ تصانیف از مولانا قادری

۳۸- ادبی مقالات ،

۳۹- اسبق الظفر ،

۵۰- انتخاب اکبر الہ آبادی،

۵۱- انتخاب راز رام بخشی،

۵۲- انتخاب رسا رام بخشی،

۵۳- انتخاب دیوان غالب (اردو) ،

۵۴- انتخاب دیوان غالب (فارسی) ،

۵۵- انتخاب مرزا بیدل ،

۵۶- انتخاب میر درد ،

۵۷- آثار التواریخ ،

۵۸- تصویر التواریخ ،

۵۹- تذکرۃ الواقعات ،

۶۰- تذکیر و تبصیر ،

۶۱- جامع التواریخ ،

۶۲- جلوہ گاہ تضمین ،

۶۳- جوہر شناسی اور دوستی انسانی،

۶۴- خزانۂ رباعیات ،

۶۵- خزینۂ رباعیات ،

۶۶- خلاصۂ تواریخ ،

۶۷- دفتر التواریخ ،

۶۸- دیوان غزلیات قادری،

۶۹- رباعیات قادری،

۷۰- شجرۂ الانبیاء ،

۷۱- شجرۂ الاولیاء ،

۷۲- کنز الکرامات ،

۷۳- گل صد برگ ،

۷۴- گنجینۂ تواریخ ،

۷۵- مثنوی نمونۂ عبرت ،

۷۶- مذہبی باتیں ،

۷۷- مراۃ شعر و سخن ،

۷۸- مقالات قادری ،

۷۹- میزان التواریخ ،

۸۰- نوادر منتخبۂ شعر و ادب ،

۸۱- یوسف زلیخا ،

۸۲- Oriental Rhetoric

---

* نقش *(۵)

۳۲۲۷۸-۵۵۳۳